یادوں کی برات



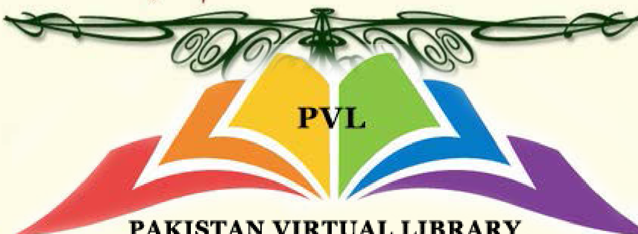
بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں قارئین کے مطالعے اور دعوتی واصلاحی مقاصد کے لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔



یادوں کی برات

جوش ملیح آبادی

ناشر

آئینۂ ادب لکھنؤ

پرنٹر

لیتھو آرٹ پریس لکھنؤ

قیمت ـــــــــــــــــــ پندرہ روپیہ -/15

اطراف و جہات کو مُرتّب کر لے
روداد حیات کو مرتّب کر لے
اس سے پہلے کہ بھول جائے سب کچھ
یادوں کی برات کو مُرتّب کر لے

یک جا ہے تمام آفرین و توبیخ
دل داری ناہید و جفائے مریخ
آنکھوں میں ہیں یادایں وآں کے آنسو
قطرے کر طوفاں کی لکھ رہے ہیں تاریخ

زندگی خواب پریشاں ہے کوئی کیا جانے
موت کی لرزش مژگاں ہے کوئی کیا جانے
رامش ورنگ کے ایوان میں لیلائے حیات
صرف اک رات کی مہماں ہے کوئی کیا جانے
گلشن زیست کے ہر پھول کی رنگینی میں!
دجلۂ خون رگ جاں ہے کوئی کیا جانے
رنگ و آہنگ سے سجتی ہوئی یادوں کی برات
رہ رو جادۂ نسیاں ہے کوئی کیا جانے

فہرست

چند ابتدائی باتیں

سب سے پہلے یہ باتیں سن لیجئے ان سے آگے چل کر، میرے سمجھنے میں آپ کو مدد ملے گی

(۱)

میں نے اپنے حالاتِ زندگی قلمبند کرنے کے سلسلے میں، کامل چھ برس تک زیادہ تر مسلسل اور گاہ گاہ غیر مسلسل، عرق ریزی کی ہے۔ ڈیڑھ برس کی محنت کے بعد پہلا مسودہ تیار کیا، اسے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا پھر ڈیڑھ پونے دو سال صرف کر کے، نو سو صفحوں کا تیسرا مسودہ تحریر کیا، اور تین ہزار میں اس کی کتابت بھی مکمل کرا لی، مگر جب اس پر غائر نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ اس مسودے کو بھی میں نے ایک ایسے گھبرائے ہوئے آدمی کی طرح لکھا ہے، جو صبح کو بیدار ہو کر، رات کے خواب کو، اس خوف سے، جلدی جلدی الٹا سیدھا، لکھ مارتا ہے کہ کہیں وہ ذہن کی گرفت سے نکل نہ جائے۔

اور خدا خدا کر کے، اب یہ چوتھا مسودہ شائع کیا جا رہا ہے۔

اور میرے دل کی بات آپ پوچھیں تو یہ بھی کہہ دوں کہ میں اس چوتھے مسودے سے بھی مطمئن نہیں ہوں۔ لیکن کیا کروں اب مجھ میں دم باقی نہیں ہے کہ دو برس مزید عرق ریزی کر کے پانچواں مسودہ لکھوں، اور اسے بھی قلم زد کر دوں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ سوچتا ہوں کہ اب میرے چل چلاؤ کا وقت سر پہ آ پہنچا ہے، اور "جرس فریاد می دارد کہ بربندید محمل ہا"، کی آوازیں برابر کانوں میں چلی آ رہی ہیں، اور یہ مصرعہ کہ:۔ "نسیم، جاگو، کمر کو باندھو، اٹھاؤ بستر، کہ رات کم ہے" دل میں گونجتا رہتا ہے، اس لئے ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ____ تحریر ہی میں خدا کے فضل و کرم سے، موت آ جائے اور مسودہ نا تمام پڑا رہے اس لئے اب جیسا بھی ہے، یہ چوتھا مسودہ پیش کر رہا ہوں۔

حافظے کا ضعف

میں کبھی قوی حافظے کا مالک نہیں رہا۔ اور اب تو یہ عالم ہو گیا ہے کہ رات کو کیا چیز کھائی تھی، صبح کو یہ بھی یاد نہیں رہتا ____ کئی مہینے کی بات ہے کہ، تاروں کی چھاؤں میں ٹہلنے کے لئے نکلا تھا، واپسی میں اپنے گھر کا راستہ بھول گیا، وہ تو کہئے ایک میرے ہم عمر ٹہلتے مل گئے، میں نے ان سے پوچھا کہ یہیں کہیں برساتی نالے کے کنارے جو ایک گنبد والا مکان ہے، کیا آپ اس کا راستہ بتا سکتے ہیں؟ انہوں نے کہا کیا آپ جوش صاحب کے مکان جانا چاہتے ہیں، میں نے کہا جی ہاں، اور ان نیک حضرت نے مجھ کو میرے گھر تک پہنچا دیا ____ اور رخصت ہوتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا آج سے چالیس بیالیس برس پیشتر میں

نے جوش صاحب کو اگرچہ کبھی دیکھا تھا، میرا نام بھی سن رکھا ہے جوش صاحب سے میرا سلام کہہ دیجئے گا۔ اور میں نے فرط شرم سے یہ نہیں بتایا کہ میں ہی جوش ہوں اور تو اور، آپ کو مشکل سے یقین آئے گا کہ ایک روز ایک خط لکھنے کے بعد جب دستخط کی نوبت آئی، تو اپنا تخلص بھول گیا، چند سکنڈ تک مجھ پر عجیب کرب کی کیفیت طاری رہی، دل دھڑ دھڑ کرنے لگا، اور اگر دو چار سکنڈ کے اندر اندر اپنا تخلص نہ یاد آجاتا، تو یقین فرمائیے کہ میرا دم نکل جاتا۔ میں نے یہ بات اس واسطے لکھ دی کہ اگر میری زندگی کے کسی واقعہ میں کمی، بیشی، یا تقدیم و تاخیر نظر آئے، تو آپ اسے میرا ارادی فعل نہ سمجھیں، اور میری حالت پر ترس کھا کر، اسے معاف کر دیں۔

(۳)

حالات قلمبند کرنے کی جگر کاویاں

پچھتر برس کی پہاڑ سی زندگی کا احاطہ کرنا بچوں کا کھیل نہیں۔ میں نے بجھے ہوئے حافظے کے تہ در تہ پیچیدہ اور گھور اندھیروں میں ٹٹول ٹٹول کر، یہ سفر طے کیا ہے۔ ان اندھیاروں میں میرے حالات اس قدر الجھے، اور ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے ملے کہ یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ کون واقعہ مقدم ہے اور کون مؤخر۔ اور نسیان کا غول بیابانی مجھے کس طرف لے جا رہا ہے۔ میں ٹھٹک ٹھٹک کر قدم رکھتا آگے بڑھتا رہا، اپنی پیری کو لڑکپن کی سرحدوں تک کھینچ کر لے گیا، لڑکپن سے ریعان شباب کی جانب باگ موڑی، ریعان شباب سے بھرپور جوانی اور جوانی سے ادھیڑ عمر کے کوہ و بیاباں طے کرتا ہوا۔ بڑھاپے کے اس سپہر تک آ گیا۔ کیا بتاؤں اس جانکاہ سفر میں کیا کیا جتن کرنا پڑے ـــــ میں نے اپنے بڑھاپے کو بچہ بنا کر، اپنے ماں باپ کے آغوش میں بٹھایا، اپنے گھر کی انگنائی میں کلیلیں کیں، پرانی برساتوں کو جگایا، اپنے مدرسوں اور بورڈنگ ہاؤسوں میں گیا، اپنے لنگوٹیا یاروں کو پکارا، اپنے موت کی نیند سوئے ہوئے، مور خانِ شباب کے شانے ہلائے، اپنے دورِ افتادہ دوستوں کو اشاروں سے قریب بلایا، اپنے جوانی کے شبستانوں میں پہنچا، جہاں زلفوں کی شمیم اب تک مچل رہی ہے، اور ٹوٹے پیمانوں اور بجھی شمعوں کے انبار لگے ہوئے اور گیسوؤں سے گری ہوئی افشاں کے ذرے اب تک دمک رہے ہیں، وہاں پہنچ کر اپنے بچھڑے ہوئے معشوقوں کو اس مسند پر بٹھایا قوس قزح اور کہکشاں کے رنگ جس کا طواف کیا کرتے تھے ـــــ اور ماضی سے اپنے کو جب ڈسوا چکا تو قلم کو خون میں ڈبو ڈبو کر، سب کچھ قلم بند کر لیا ـــــ اور آپکو سنانے بیٹھ گیا۔

کہتے ہیں لکھنؤ میں ایک بڑے مرزا صاحب رہتے تھے، جنہوں نے حضرت جان عالم واجد علی شاہ کی آنکھیں دیکھی تھیں، ایک بار چند نوجوانوں نے اصرار کیا کہ مرزا صاحب قبلہ کچھ پرانے حالات سنائیے انہوں نے سینہ پیٹ کر کہا لڑکو مجھ سے وہ داستان نہ سنو، ورنہ میری چھاتی شق ہو جائے گی، تمہاری تھوڑی دیر کی دلچسپی ہو جائے گی اور میں پہروں کے لئے بیکار ہو کر رہ جاؤں گا۔ لیکن جب ان نوجوانوں

نے ان کے قدم پکڑ لئے، تو ماضی کی طرف پلٹنے پر مجبور ہو گئے اور حالات سناتے سناتے، تھوڑی دیر میں ان کا یہ عالم ہو گیا کہ گلا رندھ گیا، ہچکیاں لے لے کر رونے لگے، اور ہائے جانِ عالم، کہہ کر بے ہوش ہو گئے سو بندہ پرور، اپنا حال سنا کر، میں بھی اسی طرح ہچکیاں لے لے کر رو رہا ہوں۔ ہائے ماضی کے ڈنک!!

اپنے کبھی کے رنگ محل میں، جو ہم گئے   آنسو ٹپک پڑے، در و دیوار دیکھ کر

(۲)

خودکشائی

میری زندگی کے چار بنیادی میلانات ہیں:۔ شعرگوئی۔ عشق بازی۔ علم طلبی۔ اور انسان دوستی ـــ ان سب کو، سلسلہ وار دیکھ لیجئے تاکہ آپ سمجھ لیں کہ میں کیا ہوں۔

۱ شعرگوئی ـــ میں نے شاعر بننے کی تمنا کبھی نہیں کی، بلکہ۔ شعر، خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما۔ میں شاعری کے پیچھے نہیں دوڑا، شاعری نے خود میرا تعاقب کیا، اور نو برس کی عمر ہی میں مجھ کو پکڑ لیا۔ اگر شاعری کوئی اچھی شے ہے تو واللہ میں کسی آفرین کا مستحق نہیں ہوں، اور وہ اگر کوئی بری چیز ہے، تو خدا کی قسم، میں کسی ملامت کا بھی سزاوار نہیں۔

بارہا گفتم و بار دگرے می گویم   کہ من دل شدہ ایں راہ نہ خود می پویم
در پس آئینہ، طوطی صفتم داشتہ اند   آنچہ استادِ ازل گفت، بگو، می گویم

شاعری، میری حاکم ہے، میں محکوم۔ وہ جابر ہے میں مجبور، وہ قاہر ہے، میں مقہور، وہ آمر ہے، اور میں مامور۔ شاعری کے باب میں بعض بزرگوں نے ایک خالص دینی مصلحت کی بنا پر جس کی شرح کا یہاں موقع نہیں، یہ عجیب کلیہ ہے کہ صرف اس موزوں کلام پر وضع فرمایا شعر کا اطلاق ہوگا جو بالقصد، کہا گیا ہو ـــ اگر یہ کلیہ تسلیم کر لیا جائے، تو چوں کہ میں نے آج کی تاریخ تک، ایک مصرع بھی بالقصد موزوں کرنے کا ارتکاب نہیں کیا ہے، اس لئے آپ کو اختیار کامل حاصل ہے کہ میرے تمام کلام کو، شاعری سے کلیتہً خارج فرما کر، میرے غیر شاعر ہونے کا اعلان فرما دیں۔ میں خوش میرا خدا خوش۔

آپ نے مجھ کو شاعر ہونے کا انعام ہی کب دیا تھا کہ اب مجھے نا شاعر تسلیم فرما کر، اس انعام سے محروم فرما دیں گے۔ اس سلسلے میں ایک بات اور بھی سن لیجئے ـــ شاعری بھی وہ بد بلا ہے جو ہر موزوں طبع تخلص دار کے کان میں یہ افسوں پھونک دیتی ہے کہ بیٹا تم اپنے دور کے سب سے بڑے شاعر ہو اور اس لئے باورچی ٹولہ کا ہر لونڈا، اپنے کو نعمت خان عالی سے بڑا سمجھنے لگتا ہے۔

جھوٹ کیوں بولوں، میرے گوش مبارک میں بھی، شاعری یہ افسوں پھونک چکی ہے کہ حضورِ اقدس و اعلیٰ، اس بیسویں صدی کے سب سے عظیم شاعر یعنی اشعر الشعراء ہیں ـــ لیکن قوتِ حیات

کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری عقل بیمار نہیں ہے، اور وہ مجھ سے، نہایت سنجیدگی و دیانت کے ساتھ کہتی ہے کہ خاں صاحب بہادر انائے شاعری کے فریب میں نہ آجائیے گا اور نہ جو کچھ کان میں پھونک رہی ہے اس سے پھول نہ جائیے گا۔ بے شک یہ ہو سکتا ہے کہ آپ شاعر، یا بہت بڑے شاعر ہوں، لیکن، اُس طرح اس کا بھی مساوی امکان ہے کہ آپ، معمولی شاعر، بُرے شاعر یا سرے سے شاعر ہی نہ ہوں اس لئے دانائی یہی ہے کہ ابھی اپنے آپ اپنے باب میں کوئی قطعی رائے قائم نہ کریں۔

ذہن انسانی میں عمل انتقاد برابر جاری ہے، آپ کی موت کے سو ڈیڑھ سو برس کے بعد نقادان ادب کا ذہن اس سطح پر آجائے گا کہ وہ آپ کے متعلق فیصلہ کر سکیں۔ اس لئے سر دست دانش مندی یہی ہے کہ آپ گو مگو میں رہیں۔ عقل کا مشورہ باون تولے، پاؤ رتی کا ہے، اس کی معقولیت میں شبہ کرنا حماقت ہے لیکن میں اس وقت اعراف میں بیٹھا ہوا ہوں، ایک طرف کھوکلا انائے شاعرانہ ہے، ایک طرف ٹھوس عقل سلیم۔ جب انا کی طرف سے ہوا آتی ہے تو اکڑ کر باون گز کا ہو جاتا ہوں اور جب عقل کی جانب سے ڈانٹ پڑتی ہے، تو سکڑ کر بالشتیا بن جاتا ہوں۔۔ دو عملی میں ہمارا آشیاں ہے۔

۲۔ عشق بازی ـــــ ہوش آتے ہی اچھی صورتیں میری نگاہوں کو اپنی طرف کھینچنے لگی تھیں اور یہ شعر، سب سے زیادہ مجھ پر صادق آتا تھا۔

ہوئے جوان تو مرنے لگے حسینوں پر ہمیں تو موت ہی آئی، شباب کے بدلے

یہ سچ ہے کہ عشق فطرت کا ایک بہت بڑا فریب ہے، جو اس لئے دیا جاتا ہے کہ انسان افزائش نسل کے توسط سے، موت کے مقابلے میں حیات، پیدا کرتا رہے۔ اپنے وجود میں کمی اور آبادی کے تن و توش میں اضافہ کرے، اپنی جوانی گھٹائے، اور فطرت کے بچوں کو، اپنا بچہ سمجھ کر پالے، اپنا جوہر گھٹائے، دنیا کی رونق بڑھائے اور جب تک جوان رہے۔

مرا مہر سیہ چشماں، ز سر بیروں نہ خواہد شد

قضائے آسمانست ایں دو دیگر گوں نہ خواہد شد

کے نعرے لگاتا رہے اور پھر امرتے دم تک، شیرہ ٹپکی ہوئی جلیبی کی طرح بڑ بڑا رہے۔

،، لیکن یہ بات بہت دیر میں سمجھ میں آئی ہے۔ کل دور عشق میں روتا تھا، اب عہد عقل میں اپنے پر ہنستا ہوں۔ لیکن اب کیا فائدہ ”جب چڑیاں چگ گئیں کھیت“ چالاک فطرت دھوکا دیکر مسکرا رہی ہے اور میں، ایک فریب خوردہ انسان کے مانند جھینپا ہوا بیٹھا ہوں۔

پر جھڑ گئے، دم گر گئی، اچھرتے ہیں للّٰہ ورے



(دائیں سے بائیں کرسیوں پر) نمبر۲ خلیفہ عبدالحکیم۔ نمبر۴ روش صدیقی نمبر۵ ساغر نظامی
نمبر۶ سر عبدالقادر۔ نمبر۷ مصنف نمبر۸ قدیر لکھنوی۔ نمبر۹ سراج لکھنوی
دوسری قطار نمبر۱ البھو رام جوش۔ نمبر۳ احسان دانش نمبر۴ مولانا حامد علی خاں
نمبر۵۔ مولانا تاجور نجیب آبادی نمبر۶ میاں بشیر احمد نمبر۸ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم
تیسری قطار نمبر۳ عرش ملسیانی۔ لاہور



مصنف اور بیگم جوش



(کرسی پر بائیں سے دائیں) احسان دانش۔ مصنف شوکت تھانوی (کھڑے ہوئے) مشرف الدین احمد مجاز لکھنوی
سعید جعفری، وغیرہ شملہ ۱۹۴۴ء



مصنف، فانی بدایونی اور جگر مراد آبادی۔ پشت پر محمود علی خاں



نواب محمد احمد خاں بہادر (مصنف کے دادا)



نواب محمد بشیر احمد خاں (مصنف کے والد)



رئیس احمد خاں (مصنف کے چھوٹے بھائی)



مصنف بہ زمانہ تعلیم سینٹ پیٹرز کالج آگرہ ۱۹۱۵ء



مصنف بہ دوران ربد و اتقا۔ ملیح آباد ۱۹۱۸ء

مصنف



لیکن ماہ رخوں کی ناشکری اور سلونیوں کی نمک حرامی ہوگی اگر میں اس بات کا اعتراف نہ کروں کہ انکے عشق کے بغیر، میں آدمی بن نہیں سکتا تھا، میرا تمام کلام اور بالخصوص جمالیاتی شاعری کی کج کلاہی انہیں متوالیوں اور مدھ ماتیوں کی جوتیوں کا تصدق ہے، اگر ان کی نظروں کے بان میرے دل کو چھلنی کر کے گداختگی نہ پیدا کر دیتے تو خدا کی قسم، مرتے دم تک میں گنگوہ شریف کا مولوی عبدالصمد ہی بنا رہتا۔

میں نے کوئے بتاں میں، جس قدر بھی اپنی دولت، صحت، جوانی اور زندگی مٹھیاں بھر بھر کر، لٹائی ہے، اس سے کہیں زیادہ ذہنی کمائی کر چکا ہوں، اور مکھڑوں کے خد و خال چن چن کر میں نے اپنے گرد و پیش اس قدر عظیم سرمایہ جمع کر لیا ہے، جسے آج تک، گھر بیٹھے کھا رہا ہوں اور مرتے دم تک کھاتا رہوں گا۔

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

رب شباب کی سوگند کہ آج بھی جب کسی نکیلے مکھڑے کو دیکھ لیتا ہوں، وہ مکھڑا انی بن کر میرے سینے میں کھچ سے چبھ جاتا ہے۔

جانتا ہوں کہ بد توفیق صالحین، میری یہ بات سن کر، منہ بنائیں گے، لیکن ڈنکے کی چوٹ پر یہ کہتا ہوں کہ ہر چند میرے بال سفید ہو چکے ہیں، لیکن بحمداللہ کہ میرا نامۂ اعمال ابھی تک سیاہ ہے۔ اور آج بھی یہی کہہ رہا ہوں

گرچہ پیرم، تو چناں تنگ در آغوشم گیر کہ سحر گہ ز کنار تو، جواں برخیزم

۳۔ علم طلبی ــــ عشق کی طرح، مجھ کو حصول علم کا چسکا بھی لڑکپن ہی سے تھا۔ میرے باپ چاہتے تھے کہ مجھ کو گھر کے مکتب ہی میں پڑھائیں، اور نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ لیکن میں نے اتنا ہنگامہ مچایا کہ، وہ مجھ کو باہر بھیج کر پڑھانے پر مجبور ہو گئے۔ اگر میرے دل میں علم کی لگن نہ ہوتی تو دیگر رئیس زادوں کے مانند جاہل رہ جاتا۔ میں نے بچپن میں بھی کوئی کھیل نہیں کھیلا، اور ہوش آتے ہی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔

جوانی کی اندھیری برساتوں میں بھی، ہر چند میری جھنجھناتی راتیں، سارنگیوں کی روں روں، مجیروں کی کھن کھن طبلوں کی ٹکوروں اور گھنیری زلفوں کی مہکتی چھاؤں میں بینگ لیا کرتی تھیں، لیکن میرے دن کتابوں کے مطالعے، شعر کی تخلیق، اور علماء و شعراء کی صحبتوں میں بسر ہوا کرتے تھے اور جب دن کے وقت میرے منچلے دوست رامش و رنگ کی دعوت دیتے تھے تو میں ان سے کہا کرتا تھا کہ یاروں کا تو یہ اٹل اصول ہے کہ دن کو سو بجے دیپا ہی بن کے رہو اور راتوں کو لو فرد او باش رہو۔

میرے دل میں، جوانی آتے ہی، دین سے بغاوت کا میلان پیدا ہو گیا تھا۔ اور میرے راسخ العقیدہ باپ تک جب یہ خبر پہنچی تھی کہ میں بعض مسلمات کا مذاق اڑاتا ہوں تو انہوں نے میرے منھ پر تھپیڑ مار کر فرمایا تھا کہ مجھے اس کا خوف پیدا ہو گیا ہے کہ تو آگے چل کر گمراہ ہو جائے گا (العیاذ باللہ) لاکھ لاکھ شکر کہ میرے باپ کا خیال درست نکلا، اور میں "گمراہ" ہو گیا۔ اسے فضل کبیر نہیں تو کیا کہئے)

ستاروں کے مشاہدے سے میرے تفکر کی ابتدا ہوئی تھی۔ تارے دیکھ کر میں بار بار سوچتا تھا کہ یہ ہیں کیا؟ ان کی چمک دمک کا راز کیا ہے؟ انہیں کس نے بنایا ہے اور کیوں بنایا ہے۔ شاید یہ تارے ہی ہیں جو سب سے پہلے بچوں کا دل موہ کر ان سے پوچھتے ہیں ننھے میاں بھلا بتاؤ تو ہم کیا ہیں۔

جب سن آگے بڑھا، فکر کا میدان بھی وسیع ہو گیا، پورے نظام شمسی پر نظر پڑنے لگی، اور اس بات کی لگن لگ گئی کہ علت العلل کا سراغ لگاؤں، ذات و صفات کے تمام مسائل کو الٹوں پلٹوں، پگھلاؤں، کھرچوں، کریدوں، ناپوں، تولوں، جانچوں، پرکھوں، ٹھونکوں، بجاؤں، کوٹوں چھانوں، پھٹکوں، اساؤں، چھوؤں، چکھوں، سونگھوں، ہلاؤں، سنوں اور دیکھوں

مجھے خوب یاد ہے کہ اندھیری راتوں کو جب تاروں بھرے آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتا تھا، تو بار بار یہ سوال دل کو برمانے لگتا تھا کہ ارے یہ سب کچھ ہے کیا؟ یہ سب کچھ ارادی ہے کہ اتفاقی؟ یہ سب کچھ کسی حکیم و عادل کا کارخانہ ہے، یا کسی اندھی توانائی کی فقط اچھل کود؟ اور یہ سب کچھ آخر ہے کیوں، اس کی پشت پر آخر کوئی مقصد ہے کہ نہیں؟ اور اپنے رب کی موجودگی میں یہ بے چارہ مربوب اس قدر پامال و مغلوب کیوں ہے؟

میں نے ان مسائل پر غور کیا، بار بار غور کیا، دم گھٹنے کی حد تک غور کیا ــــ اس کوچے میں برسوں پاپڑ بیلے، کتابوں پر کتابیں پڑھیں۔ ہندو، مسلم، یہودی، زرتشتی، بدھی، جینی اور عیسائی علماء کے سامنے برسوں دریوزہ گروں کے مانند، کاسۂ گدائی بڑھایا، علم کی بھیک مانگی، آگاہی کے واسطے ان کے آستانوں پر ناک رگڑی، گڑگڑا گڑگڑا کر دامن پھیلایا، لیکن کچھ بھی حاصل نہ ہو سکا۔

اس کے بعد مدعیان معرفت یعنی صوفیا و مشائخ کے دروازے کھٹکھٹائے، ان کی جوتیاں سیدھی کیں، لیکن چند اشراقی اشاروں کے سوا کچھ بھی پلے نہ پڑا اور وہ اشارے بھی کیا، سارے کے سارے وجدانی فریب

اس طرح عمر گزرتی رہی، اور جوانی ڈھلتی گئی اور آخر کار پیری آ گئی۔ پیری آتے ہی سر کے بال گر گئے اور کھوپڑی میں آگہی کا اکھوا پھوٹ آیا، ناتوانی نے، توانائی پیدا کر دی، اور بالآخر میں نے

علم کے قلعے کو فتح کر لیا، آپ سمجھے کیوں کر؟ یعنی مجھے اس بات کا پورا پورا علم حاصل ہو گیا کہ میں جاہل، اور بے پناہ جاہل ہوں۔

بندہ نواز ارتقاء کی اس ابتدائی طفلانہ و تاریک منزل میں ایک نیم وحشی انسان کو اپنے جہل کا پتا چل جانا ہی سب سے بڑی سعادت ہے۔

سن ہو گئے کان، تو سماعت پائی   آنکھیں پتھرائیں تو بصارت پائی

جب علم کے سب کھنگال ڈالے قلزم   تب دولتِ عرفان جہالت پائی

گواہ رہنا اے زمین و آسمان کہ میں نے علم کو ڈھونڈا، لیکن پایا نہیں، میں جاہل پیدا ہوا تھا اور جاہل ہی مروں گا۔ تجھ پر ہزار افسوس اے خلیفہ رحمٰن، اے ظلوم و جہول انسان

۴۔ انسان دوستی (الف) ہاں انسان۔ کرۂ ارض کی جان ـــــ انسان دشمنی، عظیم عدو اللہ ـــــ

حبّ انسانی جز ایمان۔ انسان کا چہرہ، گیتا اور قرآن۔ اور لا سلطان الا الانسان

اور مجھے "کافر باللہ" کہنے والو، تم کو معلوم نہیں کہ یہ "کافر" مومن بالانسان ہے خود تمہارا دین کہتا ہے کہ اللہ کی رحمت سے بعید نہیں کہ وہ کافروں کو معاف کر دے لیکن حقوق العباد کے پامال کرنے والے یعنی کافر بالانسان کی بخشش کے بارے میں، خدا نے اپنا اقتدار بندوں کو بخش دیا ہے، اور جب تک مظلوم، اپنے ظالم کو معاف نہیں کرے گا اسے بخشا نہیں جائے گا۔ کافر باللہ کے لئے تو

شنیدم کہ در روز امید و بیم   بداں را، بنیکاں بہ بخشد کریم۔

کا سہارا موجود ہے، مگر کافر بالانسان کے واسطے، جب تک کہ انسان اس کو معاف نہ کر دے بخشش کا کوئی امکان ہی نہیں ـــــ دوستو، انسان دوستی، کوئی ہنسی کھیل نہیں اس کوچے میں، ہر قدم پر خون تھوکنا پڑتا ہے۔

رہ رو راہ محبت کا خدا حافظ ہے   اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

تمہاری نیت مجاہدانِ نفس کے سامنے حور و قصور اور کوثر و طہور کے پردے جے ہوتے ہیں لیکن میرے جذبہ حبِ انسانی کی نگاہ، حوران مقصورات کے خیموں کی طرف نہیں مڑتی، براہ راست دار کی طرف جاتی ہے۔

جی ہاں میں خود اپنے تجربوں کی بنا پر اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ عشق شہوانی بھی ایک ایسی بلائے بد ہے کہ انسان، بلبلا اٹھتا اور کہتا پھرتا ہے!-

وہ نہیں بھولتا، جدھر جاؤں   ہائے میں کیا کروں، کدھر جاؤں

اور ایک عشق کی مار ہی نعرہ زن ہوتی ہے۔

جو سکھی میں جانتی کہ پیت کرے دکھ ہوئے۔ نگر ڈھنڈورا پیٹتی کہ پیت کرے نا کوئے

لیکن عشقِ شہوانی اور حبِّ انسانی کے شدائد کو جب توڑا جائے تو عشق کا پلا، آسمان سے باتیں کرنے لگتا ہے اور حبُّ کا پلہ زمین پر جنبش نہیں کرتا۔ عشق ایک آنی تشنج ہے جسم کا، اور حبّ، ایک ابدی اضطراب ہے روح کا ـــــ عشق کا تعلق ہوتا ہے، صرف ایک ذات، یعنی محبوب سے، اور حب کا تعلق ہوتا ہے روئے زمین کے اربوں انسانوں سے ـــــ عاشق اپنی جنسی تسکین چاہتا ہے، اور محب انسان تمام دنیا کے افراد کی تسکین کا طلبگار ہوتا ہے۔ عاشق پر جب معشوق مہربان ہو جاتا ہے تو اسکے دل کی آگ بجھ جاتی ہے لیکن محبِّ انسانیت کو روزگار، مہربان ہو کر جب، کسی نعمت خاص سے نوازتا ہے، تو وہ چاروں طرف گھبرا کر دیکھتا ہے کہ دوسروں تک وہ بھی نعمت پہنچی کہ نہیں، اور جب اوروں کو اس سے محروم دیکھتا ہی تو عین محلِ شکر میں وہ شکایت کرتا اور چیخ اٹھتا ہے

صد رفیق و صد ہمدم، ہر شکستہ دل تنگ   داد را، نہ می زیبد، حالِ دیر من تنہا

اور خیب کان کھول کر یہ بھی سن لیجئے کہ عشق کا عقاب اڑتا ہے قیس و فرہاد کے سروں پر، اور حبُّ انسانی کا قرآن نازل ہوتا ہے رحمۃ للعالمین کے دھڑکتے ہوئے دل پر، ببیں تفاوت رہ، از کجاست، تا بکجا۔ پہلے میں عشق کے موذی مرض میں گرفتار تھا اب حبِ انسانی کے مہلک مرض کا صید زبوں ہوں، کل محبوب کی مفارقت میں تکیے بھگویا کرتا تھا، اب انسان کے مصائب پر رویا کرتا ہوں۔

ہر چند مستقبلِ انسانی بے حد روشن ہے، اور مجھ کو یقین کامل ہے کہ یہ دوزخ زمین ایک دن جنت بن جائے گی، یہ درندہ آدمی، انسان کے مرتبے پر فائز ہو کر دم لے گا، نہ عدالتیں ہی رہیں گی،

نہ فوجیں، نہ پولیس، نہ اسلحہ سازی کے کارخانے، پیری، مستقل جوانی بن جائے گی، اور موت کا گلا گھونٹ دیا جائے گا، زندگی کی پیشانی پر حیاتِ ابدی کا تاج رکھ دیا جائے گا شمس و قمر ہمارے پاؤں چوما کریں گے، ہم مشتری میں اگر ناشتہ کریں گے تو زہرا میں رات کا کھانا کھائیں گے، اور قرابے کائنات خدمت گاروں کے مانند، ہمارے برآمدوں میں کھڑے رہا کریں گے لیکن اس میں لگیں گے ابھی لاکھوں سال جب میری ہڈیاں تک باقی نہیں رہیں گی ـــــ"

اس تصور سے جو ایک دن ایک ٹھوس حقیقت بننے والا ہے، ہر چند میرے دل کو بڑی تسکین

---

(۱) شہوانی کے علاوہ، عشق اور کچھ ہوتا ہی نہیں ہے، اور جسے "پاک عشق" کہا جاتا ہے وہ جذبۂ شہوانی کا ایک ایسا شدید تموج ہوتا ہے کہ آدمی سُن ہو کر رہ جاتا ہے اور کچھ کر ہی نہیں سکتا ہے۔ اے کاش اگر پہلے سے یہ معلوم ہوتا کہ عشق کرنے سے دکھ ملتا ہی تو میں سارے شہر میں یہ ڈھنڈورا پیٹ دیتی کہ کوئی عشق نہ کرے (میرا بائی)

ہوتی ہے، پھر بھی یہ خلش رہ جاتی ہے کہ:۔

ہم نے مانا کہ کل وہ آئیں گے عقل حیران ہے، آج کیا کیجئے

آج تو انسان اس قدر آفات میں گھرا ہوا ہے کہ دل چٹکیوں میں ملا کرتا ہے ... چھوٹے کنبے والے کے مصائب بھی چھوٹے ہوتے ہیں، اور کنبہ جس قدر بڑا ہو جاتا ہے، اس کے مصائب میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے، اور جو نامراد کا کنبہ تو ساری دنیا کا احاطہ کئے ہوئے ہے، غور فرمائیے کہ میرے مصائب کیا ہوں گے۔

جب کسی مفلس کے گھر کے چولھے میں آگ روشن نہیں ہوتی میرے سینے سے دھواں اٹھنے لگتا ہے، جب کسی یتیم کی پسلیاں نکلی نظر آتی ہیں، میرے بدن میں خود اپنی ہڈیاں چبھنے لگتی ہیں، جب کسی گوشے سے رونے کی آواز نکلتی ہے، میری کمبخت آنکھیں آنسو برسانے لگتی ہیں، اور جب کسی گھر سے بھی جنازہ نکلتا ہے، تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ جنازہ خود میرے ہی گھر سے نکل رہا ہے۔

ہر چند امریکہ ظالم ہے، اور ویٹ نام کے مظلوم شہیدوں پر ہی نہیں، امریکہ کے ظالم مقتولوں پر بھی ماتم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ اللہ کرے کہ کسی بدبخت کے سینے میں ابوالانسان کا دل دھڑکنے لگے۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ سارے جہاں کا درد، ہمارے جگر میں ہے

(ب) اس دردمندی کا دوسرا پہلو بھی ملاحظہ فرمائیے۔

یہ ایک ناقابلِ ابطال حقیقت ہے کہ انفس و آفاق یعنی تمام ذی حیات و غیر ذی حیات، واحد العناصر، واحد الخمیر، واحد القوام، واحد العلت، واحد النسل، اور واحد الاصل ہیں اور اس طرح، واحد النسل ہیں، جس طرح پلاسٹک کے کھلونے، اور پلاسٹک کے پھول، ہر چند اسما، اشکال اور اجسام کے اعتبار سے تمام کھلونے اور تمام پھول، ایک دوسرے سے قطعی طور پر مختلف و متضاد نظر آتے ہیں لیکن اگر انہیں پگھلا دیں گے تو پلاسٹک کے سوا اور کچھ باقی ہی نہیں رہ جائے گا۔

اور سب سے بڑی قیامت تو یہ ہے کہ جاہل، ہوس پرور اور سُم سیاست نے اپنے شیطانی جذبات کی آسودگی کی خاطر، انفس و آفاق کی اس وحدت کو ایک دوسرے سے نفرت کرنے والی کثرت میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔

فوجی درندگی کے بل بوتے پر فتنے برپا کرنے والے ارباب سیاست کا یہ خیال ہے کہ دانائی اسی میں ہے کہ نادانوں کو ثقافت، لسان، اوطان، اور ادیان میں الجھا کر

چھوٹی، چھوٹی، برسرِ جنگ ٹولیوں میں تقسیم کر دیا جائے اور پھر بڑے اطمینان کے ساتھ ان پر فرماں روائی کی جائے۔

انہوں نے انتہائی بددیانتی کے ساتھ "بین الاقوام" کی ترکیب تراشی ہے، اور نوعِ انسانی کو جو مشرق سے لے کر مغرب تک صرف ایک قوم ہے، زبانوں، وطنوں، دینوں اور رنگوں کی آویزشوں میں مبتلا کر کے پوری دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے، ان ظالم مسخروں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ:۔

لفظ اقوام میں کوئی جان نہیں ۔۔۔ اک نوع میں ہو دوئی، یہ امکان نہیں
جو منکرِ یزداں ہے وہ ناداں ہے فقط ۔۔۔ جو منکرِ انساں ہے، وہ انسان نہیں

لطف تو یہ ہے کہ وہ بانیانِ فساد، خود تو سلامتی کے گوشوں میں دبکے بیٹھے ہیں، اور روٹی کی خاطر، اپنے بھائیوں کی جانیں لینے والی فوجوں کو للکار دیا ہے کہ وہ خون کی ہولی کھیلتے پھریں۔

مضحکہ خیز بات تو یہ ہے کہ ان روٹی کے مارے، اور حبِ وطن کے فریب کھائے ہوئے سپاہیوں کو، جن کی کہنیوں سے ان کے بھائیوں کا تازہ خون ٹپک رہا ہے، فیلڈ مارشل قومی ہیرو اور غازیِ اعظم کے خطابات مرحمت فرمائے جا رہے ہیں۔ جہالت کی لے اس قدر بڑھ چکی ہے کہ خود بڑے بڑے تعلیم یافتہ افراد بھی اس دھوکے میں آ چکے ہیں کہ ہم پاکستانی، ہندوستانی، افغانستانی، ترکستانی، اور انگلستانی ہیں، اور اسی کے ساتھ ساتھ ہر فرد یہ سمجھتا ہے کہ میں ہندو ہوں، مسلمان ہوں، عیسائی ہوں، زرتشتی ہوں، یہودی ہوں لیکن ان سادہ لوحوں کے ذہنوں میں یہ تصور جاگزیں ہی نہیں ہوتا کہ میں انسان ہوں، سب سے پہلے انسان ہوں، اور اس کے بعد اور کچھ۔

پروپیگنڈے کی طاقت تو دیکھئے کہ دین و ملک کے چکر میں آ کر، ہم اپنی انسانیت کو قطعاً فراموش کر چکے ہیں، اور یہ دیکھ کر بڑی بے پایاں حیرت ہوتی ہے کہ انسانیت کی اس اکائی ہی سے، اعداد کا یہ بے شمار لشکر کہاں سے نکل پڑا، عینیت کے اس چشمۂ شیریں میں یہ غیریت کا زہر کس نے ملا دیا۔ اور اس کعبۂ وحدت میں خنزیرِ شرک کیوں کر داخل ہو گیا (ہو جنت عقل از حیرت، کہ این چہ بوالعجبی است) اب دیکھئے بنسرا رخ ۔۔۔ سرمایہ داری کا نظام، ایک زبردست تن و توش کی جونک کے مانند عامۃ الناس کی گردن میں منہ گاڑے ۔۔۔ بڑے مزے سے کس کا خون چوس رہا ہے۔

اس منحوس نظام نے آنکھوں سے مروت، لہجے سے نرمی، خیالات سے ہمدردی کو

اور دلوں سے دھڑکنیں؟ چھین لی ہیں، اور ہوس کاروں کو ٹھوس چٹانوں میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔

یقین فرمائیے کہ جب تک آدمی احجاج، ہلاکو، چنگیز، نادر، نیرو، ابن زیاد اور یزید کے ہاتھ پر بیعت نہیں کر لیتا، سرمایہ دار و صنعت کار بن ہی نہیں سکتا۔

اس فریب میں نہ آجائیے گا کہ مزدوروں، کسانوں، مفلسوں، اور اسی قبیل کے کروڑوں انسانوں پہ جو بیت رہا ہے، اس سے وہ بے خبر ہیں۔ جی نہیں، ان کو سب کی دردمندیوں کا علم ہے، اور یہ بھی سن لیجئے کہ وہ اس علم سے، ترس کھانے کے بدلے الٹے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

جب ان کے دسترخوان پر مرغ و ماہی کی قابیں چنی جاتی ہیں تو وہ اس تصور کی چٹنی چاٹ چاٹ کر اپنے کھانوں کی لذت اور بھی بڑھا لیتے ہیں کہ اس وقت لاکھوں آدمی روکھے سوکھے ٹکڑے کھا رہے ہوں گے۔ اور راتوں کو جب وہ اپنے اپنے گرم ریشمی لحافوں میں دبک کر، یہ سوچتے ہیں کہ اس وقت اللہ کے لاکھوں بندے، فٹ پاتھوں پر سردی سے اکڑ رہے ہوں گے، تو ان کے لحافوں کی گرمی میں اضافہ ہو جاتا ہے، اور جس وقت وہ ناداروں کو موٹے جھوٹے کپڑے پہنے دیکھتے ہیں تو ان کے حریر و پرنیاں کے لباس کی نرمی ہزار چند بڑھ جاتی ہے۔ لیکن روزگار کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس سے ان کی نیندیں بھی حرام ہو کر رہ گئی ہیں وہ اپنے بینکوں میں رکھے ہوئے سکوں اور اپنے کارخانوں کی چلتی ہوئی مشینوں کے ناقابل برداشت وزن کے نیچے دبے پڑے ہوئے، بری طرح کراہ رہے ہیں۔ ایک بار دہلی کے ایک بہت بڑے سرمایہ دار صنعت کار نے، اپنے چاندی کے سے سفید بالوں کو نوچ نوچ کر مجھ، سے کہا تھا، جوش صاحب آپ کوئی (شاعر) ہیں کویوں کے سر پر بھگوان کا ہاتھ ہوتا ہے، آپ میرے مر جانے کی دعا کریں، اور جب میں نے ان سے یوں کہا تھا کہ اس ہندوستان کے کروڑوں آدمی اس آرزو میں گھلے جا رہے ہیں کہ آپ کی دولت کا سواں حصہ بھی ان کو مل جائے، تو انہوں نے کہا تھا کہ ان لوگوں کو میری بپتا نہیں معلوم، نہیں تو وہ میرا سا بننے کا کبھی خواب بھی نہ دیکھتے، اور جب میں نے ان سے یہ پوچھا تھا کہ آخر آپ کی بپتا کیا ہے تو آنکھوں میں آنسو بھر کر انہوں نے یہ جواب دیا تھا کہ جوش صاحب آپ دیکھتے ہیں کہ میرے چاروں طرف سونے چاندی کے پہاڑ کھڑے ہوئے ہیں، مگر ان کو چین نہیں، ہر روز جب صبح کو جاگتا ہوں تو میرا دل گڑگڑا، گڑگڑا کر مجھ سے کہتا ہے لالہ جی آج دو پیسے اور کما لو ــــــ!!

دیکھا آپ نے فراوانی دولت کا انجام۔ اور افراط زر کی ناداری

زر دار کا خناس نہیں جاتا ہے ۔۔۔ ہر آن کا دسواس نہیں جاتا ہے
ہوتا ہے جو شدت ہوس پر مبنی ۔۔۔ تا مرگ وہ افلاس نہیں جاتا ہے

ہاں بہت جلد وہ ساعت آنے والی ہے کہ سوشلزم کے تند جھونکے، ان کے چراغوں کو بجھا کر آواز بلند کریں گے۔

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را ۔۔۔ چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کنند

(د) اب چوتھا رخ بھی ملاحظہ فرمائیے ــــــ اور وہ ہے موت کا یقین کامل

چو پردہ دار، بشمشیر می زند ہمہ را ۔۔۔ کسے، مقیم حریم حرم نہ خواہد ماند

گدا سے لے کر شاہ تک، اور خرابات سے لے کر خانقاہ تک دنیا کے ہر سر اور ہر در پر موت کا خونی گدھ منڈلا رہا ہے۔ اور ہر کوچے سے "رام رام ست ہے۔ اور انا للہ وانا الیہ راجعون"، کی صدائیں چلی آرہی ہیں۔ انسان نفس مطمئنہ کا طلبگار ہے، اور تسکین خاطر پر جان دیتا ہے، لیکن اس کو یہ دولت کہیں بھی نہیں ملتی، اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ

بقدر ہر سکوں راحت بود بنگر مراتب را ۔۔۔ دویدن، رفتن، استادن نشستن، خفتن، مردن

تو اس کی سانس رکنے لگتی ہے، اور نبضیں ڈوبنے کے قریب ہو جاتی ہیں، اور جب اسکے کانوں میں یہ آواز بھی گونج اٹھتی ہے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا، تو کدھر جائیں گے

تو وہ زندگی در گور ہو کر رہ جاتا ہے۔

ایسی زندگی کس کام کی، جس کے ایک سکنڈ کے کروڑ ویں حصے میں بھی یہ اطمینان نہیں ہوتا کہ ابھی ہم کو موت نہیں آئے گی۔

موت ایسی حیات سے اچھی

(س) اور ان تمام بے شمار آفات کے ساتھ ساتھ ــــــ اللہ اللہ یہ نوجوان بیوہ کی ٹوٹتی چوڑیاں ــــــ یتیم بچوں کی یہ کچھ ڈھونڈنے والی آنکھیں۔ نادار بیماروں کی یہ ابھری ہوئی پسلیاں۔ دولھاؤں کے زانوں پر یہ جھکتی کی دلہنوں کی آخری ہچکیاں ــــــ براتوں کی یہ بھری ہوئی ڈوبتی کشتیاں، عاشقوں کے سامنے، معشوقوں کی یہ اسٹی بیتابیاں ــــــ ماؤں کے آغوش میں یہ پھول سے بچوں کے ڈھلتے ہوئے منکے ــــــ اور

بوڑھے باپوں کے کاندھوں پر یہ جواں مرگ بیٹوں کے، بچھاتے جنازے ———
اور اس کے دوش بدوش، یہ جراثیم - یہ بچھو - یہ سانپ - یہ بستیوں کو بھسم کر دینے والی آتش زدگیاں - یہ قحط - یہ کال - یہ سیلاب - یہ طوفان - یہ وبائیں۔ یہ زمہریری و جہنمی ہوائیں یہ آتش فشاں پہاڑ اور شہروں کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دینے والے یہ بھیانک زلزلے - الامان والحفیظ ___ فطری طور پر، دل میں یہ سوال بار ہا مچلتا ہے کہ بادران آفات ارضی وسماوی کی پشت پر کوئی معقول برہان اور کوئی حکیم وعادل اور رحمٰن کارفرما ہے کہ نہیں؛ ارے اس زمین اور اس آسمان پر ہے کوئی جو دکھیا انسان، قدرت کے سوتیلے بیٹے، انسان کو اپنی پناہ میں لے لے، یہ گڑگڑاتی آواز، لاکھوں برس سے، اس بوڑھے آسمان کی بوسیدہ ڈاٹ کے نیچے گونج رہی ہے، لیکن ایک ابدی سناٹا چھایا ہوا ہے، کسی طرف سے بھی کوئی آواز نہیں آتی -

میرؔ درد نے تڑپ کر بادِ صبا سے کہا تھا

یہی احوال درد کا کہیو — گر صبا کوئے یار میں گزرے
کون سی رات، آن ملیے گا — دن بہت انتظار میں گزرے

میرا بھی یہی عالم ہے مدت سے کسی مددگار کا انتظار کر رہا ہوں لیکن کسی مددگار کی چاپ سنائی نہیں دے رہی ہے، قدموں کی چاپ تو بڑی چیز ہے، کوئی آواز پر آواز بھی نہیں دے رہا ہے۔ اے اتھاہ سناٹے، ہاں تو ضرور کچھ بول رہا، اور میں کچھ سن بھی رہا ہوں - لیکن اسے زبان تک لانے کی جرات نہیں کر سکتا ___ احمقانہ شہادت پر میں تیار نہیں اور گلا پھاڑ پھاڑ کر یہ چیخ رہا ہوں کہ

ایں سپہر سید کہ ہر غالب، ناکام، چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت
الرے میں نامراد اپنا دردِ دل کس سے کہوں
دلالہی دارم بسے، یارب کرا ادا در کنم !

بنامِ قوت و حیات

میرا حادثۂ ولادت

میں اس یونہ بھر زندگی کو بھوگنے، اور اس بظاہر رنگین و بباطن خون آلودہ زندان کون فساد میں اُدھ بھنے کے واسطے کب لایا گیا، اس امر کو صحت کے ساتھ، بیان نہیں کر سکتا اس لئے کہ میرے خاندان میں بچوں کی تاریخ ولادت کے درج کرنے کا رواج ہی نہیں تھا۔

البتہ میری دادی جان نے، جو خاندان کی مؤرخ تھیں، مجھ سے، میری ولادت کا جو سن، بتایا تھا، وہ سن عیسوی کے حساب سے، ۱۸۹۶ء تھا، یا ۱۸۹۸ء، یہ بھی یاد نہیں رہا۔ بہرحال اپنی عمر کو دو برس بڑھا دینے میں نقصان ہی کیا ہے، اس لئے آپ یہ سمجھ لیں کہ میں ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوا تھا ——— (دو برس اور بوڑھا ہو گیا، ہو جانے دیجئے۔ دھوتی کی نوک سے)

البتہ یہ بخوبی یاد ہے کہ دادی نے فرمایا تھا کہ بیٹا تو صبح چار بجے[۱] پیدا ہوا تھا۔

میرا وطن:۔

آم کے باغوں کی رومانی اور گھنیری چھاؤں میں جھومتا، بور کی بوئے مسانہ سے مہکتا، کوئیلوں کی کوکو، اور پپیہوں کی پی ہو، پی ہو سے چہکتا ملیح آباد، ہندوستان کی تہذیبی جنت، یعنی لکھنؤ سے فقط تیرہ میل کی مسافت پر یہ جگہ واقع ہے۔

یہ خالص پٹھانوں کی بستی ہے، جس کے ایک گوشے میں، ہم لوگ، یعنی دَرۂ خیبر سے آئے ہوئے آفریدی اور دوسرے گوشے میں، قندھار سے آئے ہوئے، قندھاری آباد ہیں۔

ہندوستان آکر بھی، اور جوارِ لکھنؤ میں رہنے کے باوصف، ہم نے اپنی جنگ جوئی کی عادت نہیں چھوڑی، اور آفریدیوں اور قندھاریوں کے مابین ایک مدت دراز تک، تلوار

---

[۱] شاید یہی علت ہو میری سحر پرستی کی

چلتی رہی، اور زنگیوں نے آکر، جب تلوار چھین لی، تو لٹھ بونگا ہونے لگا
ہندوستان آکر، اور خصوصاً لکھنؤ کی تہذیب سے متاثر ہو کر ہم لوگ، ایک عجیب
گنگا جمنی قوم بن گئے۔

ہمارے خون میں، درّہ خیبر کی شعلہ بادروبیر، مچلتی رہی، اور ہمارے سروں پر،
اودھ کی سلونی شام، گل باریاں کرنے لگی ——— اور ملیح آباد، لکھنؤ کی شائستگی و تہذیب
اور قبائلی علاقوں کی بربریت ودحشت کا ایک عجیب نقطۂ اتصال بن گیا۔

ہمارے یہاں، ایک طرف تو لکھنؤ کی دیلی ٹوپیاں، ململ اور ریشم کے کڑھے کرتے، شربتی
انگرکھے، سلمے ستارے کی رضائیاں، مخمل کے لحاف، چوک کا عطر، قنوج کا تیل پھلیل، اور
مشروع کے پائجامے راہ پاگئے۔ اور پتنگ بازیاں، مرغ بازیاں، اور ان کی پالیاں ہونے لگیں۔
اور ہم نے، "السلام علیکم" کے بجائے آداب تسلیمات، کورنش اور بندگی کو اختیار کر لیا
اور اس کے ساتھ ساتھ بیت بازیاں اور مشاعرے بھی ہونے لگے اور صحت زبان کے
تصور نے بھی آنکھیں کھول دیں ———

اور دوسری طرف "اللہ دے، اور بندہ لے"، قسم کے ہنگامے بھی جاری رہے اور
آئے دن فوج داریاں اور خون خواریاں بھی برابر ہوتی رہیں

مدتوں تک ہمارا یہ عالم رہا کہ اگر کسی راہ رو کو اتفاقاً کھانسی آجاتی تھی، اور وہ کسی
کے دروازے کے سامنے تھوک دیتا تھا، تو صاحب خانہ صاحب لٹھ لے کر گلی میں آجاتے تھے
کہ خاں صاحب آپ ہمارے مکان میں تھوک رہے ہیں اور تھوکنے والے خاں صاحب اکڑ کر
یہ جواب دیتے تھے کہ جب نہیں تھو کا تھا، تو اب تھوک رہے ہیں آخ تھو، آخ تھو، اور دونوں
کے درمیان بڑے زور شور سے لٹھ چلنے لگتا تھا۔ اور اگر کسی شادی بیاہ میں دو حریف گروہ
آمنے سامنے کھٹولوں پر بیٹھے حقہ پیتے تھے۔

ان میں سے جب ایک گروہ کا آدمی "کڑکڑ، کڑکڑ، کڑاک"، کی آواز نکال کر حقہ پیتا تھا، تو
دوسرے گروہ کے تمام آدمی، اس کو اعلان جنگ سمجھ کر، اس سے بھی زیادہ زور سے کڑکڑ، کڑکڑ
کڑکڑ کڑاک، کڑاک، کڑاک"، کی آوازیں نکال کر، اس قدر زور سے حقے پیتے تھے کہ چلموں
سے آنچیں نکل آتی تھیں، اور اس صدم صدا کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا تھا کہ پل بھر میں فریقین
کے سر لہولہان ہو کر رہ جاتے تھے۔

لہ ہم لوگ آفریدی، آدم خیل اور آدم خیلوں کی ایک شاخ علی خیل سے تعلق رکھتے ہیں
ٹہ اونچی اور چوڑی چارپائی

لکھنؤ کے کمشنر، باگو رنے ملیح آباد کے باب میں، یہ جملہ نہایت ہی خوب لکھا تھا کہ ملیح آباد، درہ خیبر کا ایک ایسا جزو ہے، جس کا، ہندوستان سے ابھی تک الحاق نہیں ہو سکا ہے۔

میرے خاندان کے انحطاط کے بعد ملیح آباد کی کمر ٹوٹ کر رہ گئی ہے، متعدد ڈیوڑھیوں میں سے اب ایک ڈیوڑھی بھی باقی نہیں رہی ہے ــــــ اور ملیح آباد کی دھاک دم توڑ چکی ہے۔

پھر بھی میرے ملیح آباد کے تیور ابھی تک مجھ سے نہیں پائے ہیں ہر چند زمینداری اور تعلقہ داری کی مینیخ، فضا پر ایک عبرت ناک سناٹے کی طرح چھائی ہوئی ہے۔ مگر لوگوں میں پھٹولی کا دم خم، اور سپہ گری کا طنطنہ آج تک باقی ہے۔

اب ملیح آباد کی حالت لکھنؤ کے ان میر صاحب کی سی ہے جو شباب میں اس قدر خوبرو اور گبھرو تھے کہ بڑی بڑی تک چڑھی بر ہی جاماؤں تک کے غرور جمال کی پنڈلیاں ان کے روبرو کانپنے لگتی تھیں، لیکن شباب ڈھلنے کے بعد جب وہ کسی شہر کی سرائے میں جا کر ٹھہرے اور برآمدے میں بیٹھ کر حقہ پینے لگے، اور بھٹیاری کی لڑکیاں، ان کے حقہ پینے کے انداز، سرکش پر ان کے گالوں کے نشیب فراز پر ہنسنے لگیں، تو انہوں نے جھلا کر کہا، ہنس لو کانی کلوٹی ٹھوکر لو، جی بھر کے ہنس لو۔ اگر جوانی میں تم مجھے دیکھ لیتیں تو ہائے مرے اللہ ہائے مرے اللہ کہہ کر زمین پر بیٹھ جاتیں اور پچھاڑیں کھانے لگتیں

اس طرح میرا ملیح آباد بھی زبان حال سے کہہ رہا ہے

یاراں کہ سرکشند، ز نخوت، بر آسماں
برآستان مے کدہ، شامم ندیدہ اند
آں ہا کہ آدرند شبک در نظر مرا
بے جامہ گاں، بکوئے مغانم ندیدہ اند

میری حویلی کی اندرونی فضا۔

ہر طرف روشنی تھی، رنگینی تھی، چہل پہل تھی ــــــ لونڈیاں، باندیاں، مامائیں، اصلیں، مغلانیاں، انائیں، دوائیں، کھلائیاں ــــــ استانیاں، پنکھوں کی ڈوریاں کھینچنے اور راتوں کو کہانیاں سنانے والیاں، چاروں طرف چلتی پھرتی اور ہنستی بولتی نظر آتی تھیں۔

اس مستقل آبادی کے علاوہ شریف گھرانے کی غریب عورتیں بھی، چند سے اچھے دن گزارنے کے لئے آئے دن بطور مہمان آتیں، ایک ایک دو دو مہینے رہتیں، اور جب چلی جاتیں تو نئی مہمان عورتیں ان کی جگہ آ کر پر کر لیتی تھیں۔

بیرونی فضا

خدمت گاروں، رکاب داروں، فراشوں، سپاہیوں، مونیوں، ماسٹروں، مصاحبوں داستان گویوں، منشیوں، صلوہ داروں، اور کارندوں کا ہر طرف ایک ہنگامہ سا برپا رہتا تھا
ان کے علاوہ بیرونی دلکھنوی شاعروں میں سے دو چار ہمیشہ بطور مہمان رہتے اور آئے دن، مشاعرے ہوا کرتے تھے۔

اور ہم بیچ مزا لیا کرتے تھے، اپنے گھر کی ہتھنی سے جس کو ہم گنے کھلاتے تو وہ جھومتی، اور جب ہم اس کو پوری انڈا کہہ کر چڑھاتے تھے، تو وہ غصے کے مارے زنجیر بسا تڑانے لگتی تھی،

میرا مجموعہ اضداد، مزاج

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں بچپن میں کیا تھا! شعلہ تھا کہ شبنم، حدید تھا کہ حریر، نوک خار تھا کہ برگ گل، خنجر تھا کہ ہلال، چنگیز خاں کا علمبردار تھا کہ دورحمۃ للعالمین، کا پرستار
ایک رخ سے تو میں اس بلا کا سریع الاشتعال تھا کہ ذرا ذرا سی بات میں جامے سے باہر ہو جاتا اور جو بھی سامنے آتا اس کو پھاڑ کھایا کرتا تھا۔

اور ایک رخ سے اس قدر بے پناہ صاحب مہر و وفا اور اس حد کا سرچشمہ لطف و عطا تھا کہ دوسروں کے واسطے، بڑی بڑی قربانی پر آمادہ رہا کرتا تھا۔

میرے غیظ و غضب کا یہ عالم تھا کہ ساتھ کھیلنے والے بچوں سے، اگر کسی بات پر بگڑ جاتا، تو بید مار مار کر ان بے چاروں کی کھال کھینچ دیا کرتا تھا۔

اور جب ماسٹر بن کر اپنا پڑھا ہوا سبق، ساتھ کے بچوں کو پڑھاتا، اور دوسرے دن ان سے آموختہ دہرواتا، اور وہ دہرا نہ سکتے تو ان کو ڈنڈوں سے پیٹتا، اور ان کے کاندھوں پر سوار ہو کر ان کو خچروں کی طرح ______ اس قدر سرپٹ دوڑایا کرتا تھا کہ ان کی جانوں پر بن جایا کرتی تھی ______

اپنی چھوٹی بہن انیس جہاں سے تو میرے ایسے ایسے زبردست ہنگامے ہوا کرتے تھے کہ اللہ کی پناہ، وہ بھی بچپن میں میری ہی طرح اس قدر بدمزاج، زود غضب اور چڑچڑی تھی کہ ہنگامہ جنگ وہ میرا گریبان پکڑ کر چاک کر دیتی، اور میں اس کے جھونٹے نوچ کر پھینک دیا کرتا تھا۔

ہر تیسرے چوتھے روز جب انیس[1] سے میری مہابھارت ہوا کرتی تھی، اور انگنائی میں کنویں

---

[1] اور اب وہی انیس مجھے سب سے زیادہ چاہتی ہے، اور جب لکھنؤ جا کر اس سے ملتا ہوں وہ میرے گلے لگ کر جل تھل بھر دیتی، اور ٹکٹکی باندھ کر مجھ کو اس طرح، دیر تک دیکھتی رہتی ہے گویا اپنے دل کے زخموں کے ٹانکے لگا رہی ہے۔

گردوپیش کا عصر، ہمارا پانی پت کا میدان تھا، اور ایسا میدان کہ اگر ماما ئیں اصلیں آکر ہمیں چھڑا نہ دیتیں تو ہم ایک دوسرے کو ہلاک کر کے رکھ دیتے۔

میری ماں، اپنے تمام بچوں میں، سب سے زیادہ مجھ کو چاہتی تھیں، اور دودھ اور شہد کا پیالہ ہر صبح کو مجھے، اپنے ہاتھ سے پلایا کرتی تھیں، اور اگر کسی دن دودھ کے پیالے میں کوئی ذرہ نظر آجاتا تھا، تو میں، کم بخت، پیالے کو تڑ سے زمین پر ٹپک دیا کرتا تھا اور وہ رونے لگتی تھی

میں، اپنے باپ سے بے حد ڈرتا تھا اور اس قدر کہ جب ان کے سامنے جاتا تھا، تو میری چال بدل جایا کرتی تھی، لیکن اس کے باوجود۔ جب ایک روز میں خربوزے کی قاشیں چاقو کی نوک سے اٹھا اٹھا کر کھا رہا تھا، اور انھوں نے ڈانٹ کر کہا تھا کہ یہ کیا کر رہا ہے گدھے، چاقو کی نوک اگر تالوں میں چبھ گئی تو ناچتا پھرے گا سارے گھر میں ——— تو مجھے اس قدر غصہ آگیا تھا کہ میں نے باپ کی طرف چاقو اس طرح نشانہ باندھ کر پھینک مارا تھا کہ اگر وہ ان کے سینے میں چبھ جاتا تو لہو لہان ہو جاتے۔

اس طرح، میں نے ایک بار اور بھی، اپنے باپ کے ساتھ گستاخی کی تھی،

میرے باپ کا، سختی کے ساتھ، یہ حکم تھا کہ ہم بچوں میں سے کوئی بھی، ان کی اجازت کے بغیر پھاٹک سے باہر قدم نہ رکھے، اور جب وہ ہمیں باہر جانے کی اجازت دے دیتے، تو چار پانچ سپاہی ہمارے ساتھ کر دیا کرتے تھے۔ ایک روز وہ باغ تشریف لے جا چکے تھے، ان کی غیبت سے فائدہ اٹھا کر، میں مشیر احمد خاں رامپوری کے گھر، جو بالکل میرے پھاٹک کے سامنے تھا چلا گیا مشیر خاں کی ماں، اپنے پوتے، یعنی میرے دوست مختار کو کھانا کھلا رہی تھیں، مجھے بھی انہوں نے دسترخوان پر بٹھا لیا، اور اپنے ہاتھ سے لقمے بنا بنا کر مجھے بھنڈی[1] کھلائی۔

جب مزے کی بھنڈی کھا کر گھر آیا۔ دیکھا کہ میرے باپ باغ سے آگئے، اور آرام کرسی پر، لیٹے ہوئے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے بڑی خشونت کے ساتھ پوچھا کہاں گئے تھے، میں نے کہا شیر خاں کے گھر، انہوں نے پوچھا اور میری اجازت کے بغیر میں نے کہا آپ یہاں تھے، کہاں، انہوں نے فرمایا میرے گھر آنے کا انتظار کرتے اور گئے بھی تھے تو سپاہیوں کو ساتھ کیوں نہیں لیا میں نے کہا میاں دو قدم کے لئے سپاہی لے جا کر کیا کرتا، انہوں نے برافروختہ ہو کر فرمایا مجھ سے منطق بگھار رہا ہے یہ کہہ کر وہ اٹھے اور بید کی پتلی سی جریب، اس زور سے، میری پیٹھ پر ماری

---

[1] اس بھنڈی کا مزا اب تک زبان پر تازہ، اور حافظے میں محفوظ ہے، اور جب کبھی، بھنڈی کھاتا ہوں تو میرے منہ سے نکل جاتا ہے بے ساختہ "ہائے شیر خاں کی ماں"

کہ بلبلا گیا، اور انتہائی بے بسی کے عالم میں، مجھ نالائق کی زبان سے، بے ارادہ نکل گیا،
"اللہ کرے مر جائیں میاں"

یہ سنتے ہی میرے باپ غصے کے مارے دیوانے ہو گئے، کھڑکھڑاتے مجھے اندر لے گئے اور جریبوں پر جریبیں مارنے لگے، وہ تو کہئے میری دادی جان آ گئیں اور انہوں نے میرے باپ کی پشت پر لکڑی مار کر، کہا کیا مار ڈالے گا بچے کو۔ اور میرے باپ نے فوراً ہاتھ روک لیا۔

معلوم نہیں کیوں، مگر "میاں نسبت"، میری چڑھ تھی ——

ایک روز میرے باپ کے کمرے میں، ایک بڑی خوفناک داڑھی کے مولانا، اونچا سا عمامہ باندھے اور موٹے تال کی عینک لگائے، کسی مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے کہ میں ادھر آ نکلا۔ مجھے دیکھتے ہی مشیر خاں نے، ان مولانا کے کان میں کچھ کہہ کر، میری جانب اشارہ کیا۔ مولانا نے جھپٹ کر مجھے گود میں بٹھا لیا۔ اور میرے سر پر، بڑی شفقت کے ساتھ ہاتھ پھیر کر کہا "کہو میاں نسبت کیا کھاؤ گے" یہ سنتے ہی میں نے ان کی داڑھی پکڑ لی، اور "ابے مار ڈالوں گا"، کا نعرہ لگا کر، اس زور سے ان کی داڑھی کو جھٹکا دیا کہ ان کا عمامہ، عینک سمیت، فرش پر گر پڑا۔ ان کے منہ سے دردناک چیخ نکل گئی، مشیر خاں ہنستے ہنستے بے دم ہو گئے، اور میرے باپ نے زور لگا کر، ان کی داڑھی میری گرفت سے چھڑا دی۔ اور میں "اوف اوف" کرتا باہر نکل گیا۔

ایک روز میں اپنے پھاٹک پر، بڑی سی ہوائی بندوق بھرے کھڑا ہوا تھا کہ ایک نائی کا لڑکا، میرے سامنے سے گزرا، لیکن مجھے سلام نہیں کیا، اس کی گستاخی پر مجھے تاؤ آ گیا میں نے اس پر، دن سے فائر کر دیا، بڑا سا چھرا اس بیچارے کی پیٹ میں پیوست ہو گیا، اور وہ گر کر تڑپنے لگا اور مجھ شقی نے، اس کے تڑپنے پر رحم کھانے کے عوض، اس کی پسلی پر، زور سے ٹھوکر مار کر کہا ابے دو کوڑی کے نائی اٹھ، اور سلام کر، اور جب وہ غریب کراہتا اٹھا، اور جھک کر مجھے سلام کیا، تو میرا غصہ ٹھنڈا ہو گیا

ایک روز، یاد نہیں، کسی خطا پر میں اپنے گھر کے غلام حسین بھشتا کو، زنانے مکان کے صحن میں کھڑا مار رہا تھا، چھڑیوں سے تڑاتڑ، تڑاتڑ تراتڑ کہ ڈیوڑھی سے دادا میاں تشریف لے آئے۔ دم نکل گیا ان کو دیکھ کر کہ اب وہ مجھے ماریں یا ڈانٹیں گے، لیکن یہ دیکھ کر بڑی مسرت آمیز حیرت ہوئی کہ دادا میاں، مسکراتے آئے، میرا ہاتھ پکڑا، مجھے میرے باپ کے کمرے میں لے گئے اور میرے باپ سے کہا بشیر میں تم کو مبارک باد دیتا ہوں کہ تمہارا یہ منجھلا بیٹا بڑا سورما نکلے گا، اور بادشاہوں تک سے ٹکر لے گا اور جب میرے باپ نے پوچھا بابا یہ اندازہ کیسے ہوا، تو انہوں نے فرمایا کہ یہ غلام کو مار رہا تھا، اور ایسے تیوروں سے مار رہا تھا کہ سورماؤں کے سوا ایسے تیور کسی کو میسر نہیں ہو سکتے، بشیر، ہم پٹھان ہیں، سورماؤں اور بزدلوں کے تیوروں کو ہم سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا ہے

اسلئے کہ:۔ سو پشت سے ہے، پیشہ آبا سپہ گری ؛۔

اور پھر مجھ سے فرمایا کہ رب[1] کعبہ میں دو گاؤں اور دو باغ تیرے نام براہ راست لکھوں گا اور یہ دو گنیاں، اس کی مٹھائی کھانا، اور اس میں سے پانچ روپے اس غلام زادے کو دیدینا جس کو تو ابھی مار رہا تھا۔

آپ نے میرا غیظ و غضب دیکھ لیا۔ اب میری مہر و وفا اور جود و سخا کا رخ بھی دیکھ لیجئے ؛

میرے بچپن تک میرے گھر میں چائے کا رواج نہیں تھا۔ ناشتے میں ہم نہایت خستہ روغنی روٹیاں بالائی، اور انڈے کھاتے، اور شہد آمیز خالص دودھ پیا کرتے تھے۔ اور جاڑوں کے زمانے میں ناشتے کے بعد، جب ہماری جیبوں میں چھلے چلغوزے اخروٹ کی گری، کشمش، باداموں کا مغز اور صاف کیے ہوئے پستے، بھر دیئے جاتے تھے تو میں باہر آ کر آواز دیا کرتا تھا کہ "برف کے چھڑ ویو چلو" پہلے اس نعرے کو سمجھ لیجئے۔

میرے دادا کے برف خانے کی چھت پر مٹی کے کورے ظروف سال لگا کر رکھ دیئے جاتے تھے، جن میں پچھلے پہر تک، برف جم جاتی تھی اور منہ اندھیرے، برف خانے کے آدمی پکارتے تھے مزدوروں کو اے برف کے چھڑ ویو چلو (اے برف کے چھڑانے والو، آؤ) اور وہ مزدور آ کر، برتنوں سے برف کھرچ کھرچ کر، چھڑاتے، اور کھتوں میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا کرتے تھے اور ان کھتوں میں جست کی صراحیاں دبا دی جاتی تھیں ـــــ اور یہ سمجھ لینے کے بعد، اب یہ سنئے جیسے ہی میں "برف کے چھڑ ویو چلو"، کا نعرہ لگاتا تھا، لونڈیاں اور ماماؤں کے تمام بچے دوڑ دوڑ کر میرے پاس آ جایا کرتے تھے، اور میں کہہ کہہ کر "اے میرے ٹمٹھگنو، چنے چباؤ"، اپنا سارا میوہ انہیں کھلا دیا کرتا تھا اور جب کبھی سمندر[3] تالاب کے جوگی، منہ اندھیرے

قفس کاٹا۔ چمن بویا۔ تری رحمت کا ہوں جویا ـــ محمد، یا رسول اللہ

جوانی میں بہت سویا۔ بڑھاپا دیکھ کر رویا۔ محمد، یا رسول اللہ

دسواں پایا دیا کھویا ـــــــ محمد یا رسول اللہ

گاتے ہوئے میرے دروازے پر آتے تھے، میں، جھنکارے کے سے ترارے بھرتا، گھر جاتا، اور ماں جی کا بنتی آواز میں کہتا، اماں ہمارے دروازے پر جوگی کھڑے ہوئے ہیں انہیں بھیک دے

---

[1] ان کی مخصوص قسم تھی

[2] موت نے ان کو ایفائے عہد کی فرصت نہیں دی۔

[3] ملیح آباد کا تالاب۔

دو۔ میری ماں کو، میری اس ادا پر بہت پیار آتا تھا، اور وہ بٹوے سے نکال کر دو روپے میرے حوالے کر دیا کرتی تھیں۔

ایک تھے ہمارے سپاہیوں میں ساٹھ پینسٹھ برس کے بوڑھے حیدر خاں ــــ ایک روز میں نے دیکھا کہ ان کے چولھے پر دودھ کی پتیلی کڑ کڑا رہا ہے۔ اور وہ کوئی کالی کالی گولی پیالی میں گھول رہے ہیں۔ میں نے پوچھا حیدر خاں یہ کیا چیز ہے انہوں نے کہا افیم گھول رہا ہوں میں نے پوچھا افیم کیا چیز ہوتی ہے، انہوں نے کہا یہ دوا ہے مگر بچے بھیا یہ چیز امیروں کی ہے یہ روز پاؤ بھر ملائی (بالائی) مانگتی ہے، میں غریب آدمی ہوں، ملائی کہاں سے لاؤں ... حیدر خاں کی اس بے کسی پر مجھے بڑا ترس آیا ان سے کچھ نہیں کہا، سیدھا گھر کے اندر گیا اور ظہورن بوا کی نظر بچا کر پیالہ بھر بالائی چرا کر باہر لے آیا ــ بالائی کا بھرا پیالہ دیکھ کر حیدر خاں کے افسردہ مسکین سرخ سپید چہرے کی جھریوں کے اندر شگفتگی و تشکر کی جو لہریں دوڑنے ــــــــ لگی تھیں، وہ میرے حافظے کے افق سے آج تک رنگ برسا رہی ہیں۔ اس روز سے میرا یہ معمول ہو گیا کہ میں ہر روز صبح کو بالائی کا ایک پیالہ چرا کر لاتا اور حیدر خاں کے حوالے کر دیا کرتا تھا۔

ایک روز حیدر خاں کو بالائی کا ایک پیالہ دے کر گھر پہنچا تو دیکھا گل زادہ[1] بوا، میری ماں سے کہہ رہی ہیں کہ بی بی میں دیکھ رہی ہوں کہ روز ملائی کم ہو جایا کرتی ہے، میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ ظہورن کے سوا اور کسی کی ہمت پھیری نہیں ہو سکتی، وہ مردار بڑی چٹوری ہے، بی بی، کل میں نے اپنے آنکھوں سے خود دیکھا کہ وہ اپنا کھیر کا کٹورا چٹ کر کے نفیسن کا کٹورا بھی، ہپک ہپک کر اندر مار کر رہی تھی ــ

میری ماں نے ظہورن کو بلایا، وہ دوڑی آئی، اور میری ماں کے بگڑے تیور دیکھ کر سہم گئی۔

اب مجھ سے ضبط نہیں ہوا۔ میں نے کہا اماں ظہورن نہیں، میں بالائی اٹھا کر لے جاتا ہوں یہ کہہ کر میں نے سارا ماجرا بیان کیا۔ گل زادہ بوا نے سنا تو، بگڑ کر کہا، بھاڑ میں جائیں حیدر خاں بچے کو پھسلا کر روز ملائی چاٹتے ہیں، خاک کھائیں۔ انگارے کھائیں حیدر خاں، علی کی تیغ ٹوٹے ان پر

میری ماں نے فرمایا! اے ہے گل زادہ اتنی سی ملائی کے چلتوں اس قدر کڑے کڑے کوسنے دے رہی ہو ایک پیالہ ملائی کی حقیقت کیا ہے، تم یہ نہیں سوچتیں کہ اتنی سی ملائی دے کر ننھے کا دل ہاتھ بھر کا ہو جاتا ہے۔

ماں کی یہ بات سن کر میں بشاش ہو گیا، اور اب کھلے بندوں بالائی لے جانے لگا ــــ

و حیدر خاں، اب تم اس ترسانے والی دنیا میں نہیں ہو، مگر تمہاری دعاؤں کی چاندنی آج تک

---

[1] باورچی خانے کی نگراں تھیں۔

میرے دل میں چھٹکی ہوئی ہے)

جب میرا چھوٹا بھائی پیدا ہوا تھا، تو اس کو دیکھتے ہی میرے دل میں اس کی محبت پیدا ہو گئی تھی اور میں نے اس کا للّو نام رکھ دیا تھا۔

ایک روز میں "بڑے باغ" میں ٹہل رہا تھا کہ دیکھا، آب رسانی کی نالی کی کیچڑ میں ایک جوتا دھنسا ہوا ہے اسے اپنے مالی "بُراجی" سے دھلوا کر میں نے اپنے مخملی کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ بُراجی نے کہا "ارے بھیا یہ کیا کرت ہو، جیب کھراب ہو جئے" ارے بھیا یہ کیا کر رہے ہو، جیب خراب ہو جائے گی، میں نے کہا میں یہ جوتا اپنے للّو کو پہناؤں گا ——— وہ ہنسنے لگا۔

اور جب اپنی ماں کے زچہ خانے میں پہنچ کر، میں نے وہ جوتا جیب سے نکالا، اور چاہا کہ اسے للّو کے پاؤں میں پہنا دوں، تو میری پھپھی زاد بہن "امی" نے چیخ مار کر کہا "ارے ممانی غضب خدا کا یہ مخملی کوٹ اور اس کی جیب میں یہ کیچڑ دھرا جوتا اور پھر اس کو سنبھلا اپنے بھائی کے پاؤں میں پہنانا چاہ رہا ہے، یہ سن کر میری ماں ہنسنے لگیں، ساری عورتوں نے مجھ کو گھیر لیا، سب نے مجھ پر قہقہے مارے ——— لیکن کسی نے میرے اس دردِ دل کی داد نہیں دی کہ میں اس جوتے کو للّو کے پاؤں میں پہنا نہ سکا میرے دل میں اس قدر گداختگی اور اتنی زود آشنائی تھی کہ جب گھر سے کوئی مہمان رخصت ہونے لگتا تھا، میری آنکھیں آنسو برسانے لگتی تھیں۔

مجھے، آج کی تاریخ تک بے انتہا قلق یاد ہے کہ میرے نانا جان جب میری بڑی بہن کی شادی میں شرکت کے بعد آگرے جا رہے تھے تو میں ان کے رہڑو کمپارٹمنٹ میں گھس کر بیٹھ گیا تھا اور جس وقت ایک زبردستی ہاتھ لگانے والے کو وہاں سے دیوار میں ٹھنسا ہوا گیلا، کے مانند، چھڑا کر باہر کھینچا تھا تو مجھ پر غشی طاری ہو گئی تھی۔

ایک روز ہماری ڈیوڑھی کے ایک بٹیر پالنے پر مامور سپاہی، بندہ علی خان، اپنے برابر کے دوسرے سپاہی سے یہ کہہ رہے تھے بھائی صاحب محمد خاں، میری لڑکی کے بیاہ کے واسطے خاں صاحب (یعنی میرے باپ) نے جو چھ سو روپے مجھ کو دیئے تھے وہ میں جوئے میں ہار گیا۔ اور اب میرے واسطے صرف یہی ایک بات رہ گئی ہے کہ اس شرمندگی میں کچھ کھا کر سو جاؤں۔

بندے علی خاں کی زبان سے جب میں نے یہ بات سنی، میرا دل دھڑکنے لگا۔ ان سے میں نے ایک حرف بھی نہیں کہا، منہ لٹکائے زنانے میں چلا گیا۔ اور دراز ہو کر سوچنے لگا کہ ان کی جان

۱؎ رئیس احمد

کیونکہ بچاؤں دیر تک سوچتا رہا، کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنے میں ایک چھپکلی میری ماں کے تکیے پر بیٹ سے آ گری، میں نے اس چھپکلی کو مارنے کے لئے تکیے پر جوتہ کھینچ کر مارا، تکیہ نیچے گر گیا، چھپکلی بھاگ گئی، اور یہ دیکھ کر میری نبضیں تیز ہو گئیں کہ ماں کے سرہانے سونے کی جڑاؤ چمپا کلی جگ مگ، جگ مگ ہو رہی ہے میں نے چھپکلی کی دکھائی ہوئی چمپا کلی جھٹ سے اٹھا کر، نیفے میں ٹھونس لی۔ اور ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسے بندے علی خاں کو جا کر دے آؤں کہ یکایک سہ دری سے میری ماں آ گئیں، اپنا تکیہ زمین پر، اور چمپا کلی غائب دیکھ کر، انہوں نے مجھ سے پوچھا نخھے تو یہاں کب سے ہے، میں نے کہا بڑی دیر سے انہوں نے دریافت فرمایا اور کوئی ادھر مامایا لونڈی تو نہیں آئی تھی، میری چمپا کلی غائب ہو گئی ہے میں نے کہا کوئی نہیں وہ سر جھکا کر، بیٹھ گئیں، ماں کا یوں سر جھکا کر بیٹھ جانا، مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا، میں نے اپنے نیفے سے نکال کر چمپا کلی ان کے حوالے کر دی، انہوں نے کہا تو نے اچھا کیا کہ چمپا کلی اپنے پاس رکھ لی، نہیں تو کوئی لونڈی باندی اڑا کر لے جاتی۔

میں نے بندے علی خاں کی ساری داستان سنا کر، یہ کہا کہ اس لئے اٹھائی تھی کہ بندے علی خاں کو دے دوں گا، میری ماں نے کہا انھیں تو فقط چھ سو روپے کی ضرورت ہے اور یہ چمپا کلی تو تین سوا تین ہزار کی ہے ــــــــ یہ کہہ کر میری ماں کچھ سوچنے لگیں، اور پھر، بڑے دلوے کے ساتھ، سر اٹھا کر کہا، کوئی بات نہیں، یہ چمپا کلی انہیں کی تقدیر کی تھی، جا دے آ۔ اور جب میں خوشی میں بھرا ہوا دوڑتا باہر جانے لگا تو میری ماں نے مجھے آدھے راستے سے بلا کر، چپکے سے ارشاد فرمایا نخھے تو نے میری چمپا کلی، مجھ سے مانگے بغیر اپنے پاس رکھ لی، اس کا نام ہے چوری شریف بچے کبھی چوری نہیں کرتے، میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر قسم کھا کہ اب کبھی ایسی گٹھیا بات نہیں کرے گا میں نے ماں کے سر پہ ہاتھ رکھ کر قسم کھائی۔ اور یہ سوچ کر کہ میں چور ہوں میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

جب باہر جا کر، اور سب کی نظر بچا کر، وہ چمپا کلی میں نے بندے علی خاں کے حوالے کی ان کے دل کی کلی کھل گئی، ان کے مرجھائے چہرے پر سرخی دوڑ گئی، اور دونوں ہاتھ اٹھا کر، انہوں نے مجھے دعائیں دینا شروع کر دیں کہ الہیٰ سنجھلے بھیا کی عمر دراز ہو، یہ در دربار میں سرخرو ہوں، اور ان کے دروازے پر ہاتھی جھومیں۔ یہ سچ ہے کہ بندے علی خاں کی خدمت کر کے مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی لیکن اگر دل میں یہ کانٹا نہ کھٹکتا کہ میں چور ہوں، تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔

میری انا لکھنؤ کی میدانی تھیں اور مجھ کو ان سے اس قدر محبت تھی کہ میری دودھ بڑھائی

کے بعد جب وہ لکھنؤ چلی گئیں، تو میری آنکھوں میں دنیا ویران ہو کر رہ گئی۔ اور میں مکان کے گوشے میں انا جان، انا جان، کہتا پھرنے لگا۔ اور آخر کار اتنا ہڑک گیا کہ مجھے بخار آنے لگا۔ میرے باپ نے لکھنؤ آدمی بھیج کر، کئی بار انا کو ڈھونڈوایا، لیکن ان کا پتہ کہیں چلا ہی نہیں، میری پچاسی برس کی کھلائی عباسی خانم، جو مجھ سے بے پناہ محبت کرتی تھیں، روئی کی ایک بڑی سی گڑیا بنا کر، میرے پہلو میں لٹا دیتی کہ بیٹا تیری انا آگئی، اور میں اس گڑیا سے چمٹ کر سو جایا کرتا تھا۔

نہ جانے مجھ میں یہ بات کیوں تھی کہ جو لوگ، ریل میں، میرے ہم سفر، یا گانے بجانے کی محفلوں میں میرے ندیم، یا موسلا دھار پانی برسنے کے وقت میرے ہم نشیں ہوتے تھے، مجھے ان تمام لوگوں سے محبت ہو جایا کرتی تھی،

چنانچہ ایک روز جب کہ بڑے دھوم دھام سے روم جھوم پانی برس رہا تھا اولتیاں ٹپک رہی تھیں، پرنالے دھڑا دھڑ چل رہے تھے، انگنائی کے بھرے ہوئے ... پانی میں جا بجا بلبلے پڑ رہے تھے کہ محمد شیر خاں سپاہی نے لہک لہک کر ملہار گانا شروع کر دیا[۱] "مدنا موہن بن، کل ناہیں پڑے رے۔ اری او سکھی، اری او سکھی"

ہائے بھیگے در و دیوار، مستانہ بوچھار، جھڑی کا سناٹا، پی ہو کی پکار، گھائی جھنکار، اور محمد شیر خاں کا ملہار ـــــ خدا ہی جانے کیا چوٹ لگ گئی میرے معصوم دل پر کہ میں رونے لگا زار و قطار۔

ابھی میں برکھائی جھڑی، اور ملہار کے جھولے میں جھول رہا تھا کہ سارا مزا خاک میں ملا کر رکھ دیا ظہور علی خاں نے یہ کہہ کر محمد شیر خاں تم کو خاں صاحب بہادر (میرے باپ) یاد فرما رہے ہیں۔ میں ہے کر کے رہ گیا۔ کھن سے چکنا چور ہو گیا، میرا ساغر سرشار، اور چھٹ سے ٹوٹ گیا میرا جھما جھم کا تار۔

اور جب میں نے یہ سنا کہ میرے باپ محمد شیر کو، زور زور سے ڈانٹ رہے ہیں کہ میں نے کہا تھا کہار بلا لاؤ، اور تم ابھی تک نہیں گئے تو جھرجھری لگا کر، میں اپنے باپ کے کمرے میں جا کر بے اختیار رونے لگا، میرے باپ اس گریہ بے اختیار سے بے چین ہو گئے، اور بڑی حیرت سے پوچھا بیٹا کس بات پر رو رہے ہو، میں نے رک رک کر کہا۔ میاں یہ محمد شیر خاں یہ کہتے ہی میری آواز رندھ گئی، میرے باپ نے چارپائی سے اٹھ کر مجھے اپنے زانو پر بٹھا لیا، اور بہت چمکار

ع۱ مدن موہن کے بغیر اے سکھی مجھے قرار نہیں ہے۔

کر پوچھا بیٹا جلدی بتاؤ کیا بات ہے۔

میں نے رہانسی آواز میں کہا، میاں پیٹے کا پانی برس رہا ہے، یہ ابھی ملہار سنا رہے تھے، اور اب ان پر ڈانٹ پھٹکار ہو رہی ہے۔

یہ سنتے ہی میاں نے مجھ کو چھاتی سے لگالیا، اور کہا بیٹا تو آگے چل کر شاعر ہو جائے گا اور ہمارے خاندان کا نام تجھ سے روشن ہو گا ــــ محمد شیر جاؤ، اس کو ملہار سناؤ، اور ظہور علی کو بھیج دو کہار بلانے کے لئے۔

آپ نے میرے دل کی سختی اور نرمی، یعنی میری حدیدیت و حریریت، اور میری شعلہ افشانی و شبنم چکانی، یہ دونوں چیزیں ملاحظہ کر لیں ــــ اب میرے محبت و غضب کے مرکب جذبے کو بھی دیکھ لیجئے۔ جو ایک بڑی انوکھی سی بات ہے۔ آب و آتش، بہم آمیختہ از لب لعل۔

میں اپنی بچاسی برس کی کھلائی عباسی خانم کا ذکر کر چکا ہوں، جن کو میں ''بڑی بی'' کہا کرتا تھا ہم دونوں ایک دوسرے پر جان نچھاور کرتے تھے مجھ کو برفی بے حد پسند تھی اور ''لبنیا'' ''یا اللہ حلوائی'' کی دوکان سے، ہر صبح کو برفی کا ایک دونا آجایا کرتا تھا۔ یہ کیوں کر ہو سکتا تھا کہ میں برفی کھاؤں اور بڑی بی کو نہ کھلاؤں ــــ اور یہی نہیں، میری یہ تمنا ہوتی تھی کہ آدھا دونا میں کھاؤں، اور آدھا دونا اپنی بڑی بی کو کھلاؤں لیکن میری الٹی کھوپڑی میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ بڑی بی کی سی پھونس بوڑھی عورت آدھا دونا کیوں کر کھا سکتی ہیں، اور جب برفی کی چار ڈالیاں کھا چکنے کے بعد وہ مزید کھانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیتی تھیں کہ ننھے اب مٹھائی کھائی نہیں جا رہی ہے تو فرط محبت کے باعث مجھ کو ان پر اس قدر غصہ آجاتا تھا کہ ان بے چاری کے، روئی کے سے بال پکڑ کر ان کا سر زمین سے ملا دیا کرتا تھا، اور وہ چیخیں مار مار کر کہتی تھیں، کہ ارے خدا کا واسطہ کوئی اللہ کا بندہ آ کر مجھ کو بچائے، ارے ننھا مجھ کو مارے ڈال رہا ہے۔ اور مامائیں اصیلیں، دوڑ کر میرے پنجے سے ان کو چھڑا لیتی تھیں ــــ عذار سانی کے سلسلے میں اللہ کے متعلق فقط سنا ہی تھا کہ:

ور نہ ستانم، بستم می دہد، اور ''دو ننھے''، کو اس پر عمل کرتے دیکھ لیا وارے ننھے، اخلاق الٰہی کا پورا اتباع کر کے دکھایا۔ ایں کار، از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

ؔ بڑی بی تم مٹی کے نیچے دبی پڑی ہو، اور تمہارا ''ننھا'' ابھی تک زندگی کو بھوگ رہا ہے زندگی کے بوجھ سے تمہارے ننھے کے شانے ٹوٹے جا رہے ہیں میری اچھی بڑی بی اپنے بوڑھے ننھے کو بلا لو اب تو بلا لو اپنے پاس

میرے کھیل

کوئی ایک کھیل بھی جم کر، میں نے کبھی نہیں کھیلا، یوں تو دوسروں سے پھڑ ایا دلا کر پتنگ بازی بھی کی، بھدے طور سے گوٹیاں بھی کھیلیں، آنکھ مچولی میں بھی حصہ لیا فٹ بال اور ٹینس بھی برا بھلا کھیلا، اور ست گھرے کے خانوں میں بھی اچھلا کودا مگر دو دو چار چار کھیل کر سر کھیل ترک کر دیا تھا۔ اپنا پڑھا ہوا سبق، اپنے ہم عمروں کو پڑھانا، داغ و امیر کے دیوان پڑھانا اور اپنے کمرے کو سجانا یہ تھے میرے محبوب کھیل ــــ پڑھاتا تھا، میز کرسی پہ بیٹھ کر میز کے سامنے، دادا میاں کی عدالت کا کٹہرا لگا رہتا تھا ــــ داغ و امیر کے دیوان، بچکا ٹکے ہوئے، مخمل کے جزدان میں رکھتا تھا، اور میرے کمرے کی سجاوٹ کیسی تھی، اسے بھی ملاحظہ فرما لیجئے

ــــ میرے خاصے چوڑے، لیکن چوڑے سے زیادہ لانبے کمرے میں ایک جانب تو تختوں کا چوکا تھا، چوکے پر گدا، گدے پر سفید چاندنی، چاندنی پر زریں قالین مخمل کے گاؤ تکیے سنگ مرمر کے میز فرش، دائیں بائیں سیاہ پالش اور سنہری دھاریوں کی پتلی پتلی کرسیاں، کرسیوں کے سامنے چھوٹی چھوٹی میزیں، میزوں پر گلدان، ادھر ادھر چاندی کے اگالدان، پختہ فرش پر سرخ دری آسمانی چھت گیری، چھت گیری جیسی رنگ برنگے تھے، ایک اونچے اسٹول پر گراموفون، دوسرے پر آگرے کے سنگ تراشوں کا بنایا ہوا تاج محل، ایک ایسی نہایت خوب صورت زریں دمخملی کرسی جس پر بیٹھتے ہی باجہ بجنے لگتا تھا، دروازوں پر چکیں، سامنے چاندی کے فریم میں جڑ قد آدم آئینہ آئینے کے تختہ پر ارگن بجانے والی ٹائم پیس، پیتل کا عود دان، لکھنے کی میز پہ بلور یں دوات قلم، ایک بہت بڑا خوبصورت لیمپ پیتل کے گلوب میں جھاڑوں کے سے رنگین قلم، دیواروں پر بڑی بھڑکیلی دیوار گیریاں الماری میں شعراء کے دیوان، الماری کے دروازے پر گوند سے چپکائی اور کپڑوں کے تھانوں سے پھڑائی ہوئی سنہری چٹھیاں یہ تھی میرے کمرے کی آرائش

ؔ دادا میاں آنریری مجسٹریٹ بھی تھے

ؔ ان میں سے ایک چٹھی کا آدھا حصہ الماری کے دروازے پر آج تک چپکا ہے، اب اس کمرے میں میرا چھوٹا بھائی رئیس احمد رہتا ہے، جس نے اپنی بے پروائی کے ہاتھوں، اسے اجاڑ کر رکھ دیا ہے ... جب بھی بیج آباد جا کر اس کمرے میں قدم رکھتا ہوں تو اس کے ذرات [illegible] اٹھتے ہیں

میرے زمانے کے واہم

میرے خاندان کی خواتین پر خوفناک تصورات منڈلایا کرتے تھے۔ یوں تو ہر محل میں "ارواحِ خبیثہ" کی عملداری تھی ـــ لیکن وہ محل، جس میں دادا میاں رہتے، اور جس کا نام تھا "بڑا محل"، وہ تو خصوصیت کے ساتھ ـــ دنیا بھر کے شہید مردوں، ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے تمام مقتول گوروں۔ بھوتوں پریتوں پلیدوں، دیووں، چڑیلوں، بھتنیوں، پچھل پائیوں، بڑ سروں، خبیثوں اور جنوں کی راجدھانی سمجھا جاتا تھا۔

اور تمام خواتین کو اس امر کا یقین تھا کہ آدھی رات کے اندھیارے میں اس محل کے تمام گوشوں، کونوں کھدروں، کوٹھڑیوں، انجانوں، طاقوں صحنچیوں، سہ دریوں، زینوں، گلیوں، نالیوں اور ناغولوں سے نکل نکل کر خبیث روحیں دھما چوکڑیاں کیا کرتی ہیں۔ مہیب آوازیں نکال نکال کر سونے والوں کی چارپائیاں الٹتی، ان کے گلے گھونٹتے، دانت کٹکٹاتی اور جبڑے ہلاتی پھرا کرتی ہیں۔

ـــ اور لطف یہ کہ یہ تمام باتیں سنائی اور قیاسی نہیں، بلکہ بڑی بوڑھیاں، بڑے خوفناک تیوروں سے، اس بات کا دعویٰ کرتی تھیں کہ وہ ان تمام کرشموں کی عینی شاہد ہیں ـــ اور ایک دفعہ بھی نہیں نہ بارہا ان خبیث روحوں سے دوچار اور نگاہ ہو چکی ہیں۔

رات کے کھانے کے بعد، اکثر بھوتوں، اور چڑیلوں کے تذکرے ہوا کرتے تھے، اور خواتین کے ساتھ ساتھ، تمام لونڈیاں باندیاں اور مامائیں اصیلیں بھی اپنے اپنے ذاتی تجربات بیان کیا کرتی تھیں۔

ایک دن بہت تڑکے، جبکہ دادی جان اپنے کھٹے پر بیٹھی حقہ پی رہی تھیں کہ ایک نوخیز چھوکری ہانپتی، کانپتی ان کے پاس آئی اور سہمی آواز میں کہنے لگی، بڑی بی بی آدھی رات کو جب گھنٹہ بارہ

ارے ہمارے سب پچھلے چھپا آگئے اور جب الماری کے پٹ پر جیکی ہوئی دھندلی سی جھجھی کے آدھے ٹکڑے کو دیکھتا ہوں؛ تو اس جھجھی کے اندر سے الکرا میری صورت کا ایک لڑکا، جرمنی ٹوپی پہنے برآمد ہو جاتا ہے، اور اس لڑکے کو دیکھ کر، میری ہچکیاں بندھ جاتی ہیں اور اس عالم میں رئیس کا خوب صورت کوکارنادر حسین رہتا ہے امیرے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔

جس کے رخسار سے میرے لبوں نے اس کمرے میں بوسے کا اولین تجربہ حاصل کیا تھا۔ اور کھڑکی سے بڑی بی کی تھرتھرائی آواز آنے لگتی ہے کہ منے آؤ، اماں دودھ کا پیالہ بھرے بیٹھی ہیں۔"

ہائے، ہائے ہائے ہائے۔

بجار ہا تھا، ٹھٹن ٹھٹن ٹھٹن ۔ کیا دیکھتی ہوں کہ انگاروں کے سے دیدے اور بڑے بڑے دانتوں والی ایک کالی کلوٹی، مینگن لوٹی، دھم دھوسڑ جڑ مڑ، انگنائی میں کھڑی ہے، اپنے جھونٹے نوچ رہی ہے، جھم جھم ـــــ اور پھر جھونٹے نوچتی ہوئی مرمرے بھرے تھیلے کی طرح، ہائے اللہ میری طرف سمسائی اور سنسناتی چلی آرہی ہے اے بڑی بی، میری چھاتی دھک دھک کرنے لگی۔ اور جیسے ،، ہتنی چلی پورے پورے قدم رکھتی ہوئی، میرے پلنگ کے قریب آکر کھڑی ہو گئی ـــــ میری اوپر کی سانس اوپر، نیچے کی نیچے ہوکر رہ گئی، جی میں آیا، چیخ مار کر، گھر بھر کو جگا دوں، مگر ڈر کے مارے گلے میں گونجے سے اٹک گئے۔ کتنا کتنا زور لگایا، صدا آواز نہیں نکلی۔ دانت بیٹھ گئے، گھگھی بندھ گئی اور میرا دم نکل جانے میں بس ذرا ہی سی کسر باقی تھی، کہ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ وہ تو سہ دری کے، سبز عمامہ اور لال جریب والے شہید مرد ہیں، وہ سہ دری سے نکل کر کھڑاؤں کھٹ کھٹ کرتے آ گئے اور آتے ہی انھوں نے اس مردار کی کھوپڑی پر اس کس کے جریب ماری کہ وہ چھتنی بلبلا اٹھی اور اچھا آج نہیں تو کل کھا جاؤں گی، آج نہیں تو کل کھاؤں گی، کہتی ہوئی بھاگ اور دھواں بن کر، چائے خانہ کی نالی کے اندر غائب ہو گئی ۔ دادی جان نے یہ ماجرا سن کر، اس چھوکری سے کہا سہ دری والے شہید مرد، اس محل میں بہت سی جانیں بچا چکے ہیں، دیکھ ان کی نیاز دلا کر ان کا طاق بھر دینا ـــــ اری تو، تو کل کی چھوکری ہے میں تو اس محل کے سیکڑوں کرشمے دیکھ چکی ہوں جب میں یہاں نئی نئی بیاہ کر آئی تھی، تو اس محل کے کوٹھے سے کبھی رات گئے لف رائی، لف رائی (لفٹ رائٹ) کی آوازیں بڑے زور سے آنے لگتی تھیں۔ اور جب سپاہی بندوقیں بھر بھر اکر اوپر جاتے تھے، تو وہاں کوئی بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اور ان کے اترتے ہی پھر دہی اودھم ہونے لگتا تھا ایک عامل کہتے تھے کہ غدر کے زمانے میں جن گوروں کو یہاں مارا گیا تھا، کبھی کبھی ان کی روحیں آکر ،، لف رائی، لف رائی ،، کیا کرتی تھیں ۔

ایک رات کو جب کہ محرم کی نویں تاریخ کو ہمارے امام باڑے میں چراغاں ہو رہا تھا کہ ہمارے گھر کی لونڈی سکونت نے انگنائی میں چھت کی طرف دیکھ کر چیخیں مار مار کر کہنا شروع کیا،، اری تو، تو کون ہے، اری تو کون ہے، اری تو کون ہے ،،

گھر بھر میں ہلچل مچ گئی، تمام عورتیں آنگن میں جمع ہو گئیں، اور پوچھنے لگیں، اری سکونت یہ تو کس سے باتیں کر رہی ہے، اس نے کہا بیبیو میں نے دیکھا ایک بڑے بڑے دانتوں کی چھتنی اوپر کی منڈیر سے جھک جھک کر تعزیہ دیکھ رہی ہے اور جب میں نے اس سے پوچھا اری تو کون ہے، تو اس نے تسمنا کر دور ہوا شتفل ہم زیارت کرنے آئے ہیں۔ اور یہ کہتے ہی وہ غائب ہو گئی ۔

یہ باتیں سن سن کر میں اس قدر سہم گیا تھا کہ رات کو گھر سے باہر قدم رکھنا تو درکنار، جب شام کے وقت مردانے مکان میں جاتا تھا تو ڈیوڑھی کے اس دروازے سے لے کر اس دروازے تک کوئی نہ کوئی ماما مجھ کو پہنچانے جایا کرتی تھی اور کھلا نہ جاتا تو ماما دروازے پر سے بار بار آواز دیا کرتی تھی کہ بھیا ہم دروازے پر کھڑے ہیں، ڈرنا مت

تقریباً دس گیارہ سال کی عمر تک میری بزدلی کا یہ عالم رہا کہ جب تک بڑی بی گڈمڑا کر میری پائنتی لیٹ نہیں جاتی تھیں میں سو ہی نہیں سکتا تھا، اور جب کبھی رات کے وقت چڑیل والی کلیا[1] کی طرف آنکھ اٹھ جاتی تھی، تو میں تھرا جاتا، اور بجلی کی فوراً آنکھیں بند کر لیا کرتا تھا

دادی جان کا یہ ایک بندھا ٹکا اصول تھا کہ وہ ہر رات کو، سوتے وقت بلا ناغہ کچھ پڑھ پڑھ کر اور دور دور تک حصار کھینچ کر تین بار، تالی بجایا کرتی تھیں اور جب کبھی اس تالی کی آواز میرے کانوں میں پڑ جاتی تھی، میرا دل دھڑکنے لگتا، اور چڑیلوں کی صورتیں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی تھیں۔

اور آج بھی، جبکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور ارواح خبیثہ کو وہم کی خلاقی کے سوا اور کچھ بھی نہیں سمجھتا، پھر بھی میرا یہ عالم ہے کہ ابھی سال گزشتہ جب ملیح آباد میں دادامیاں کا محل دیکھنے کو گیا تھا، تو ہر چند دن کا وقت تھا، لیکن دو چار آدمیوں کو ساتھ لئے بغیر، میں اندر قدم ہی نہ رکھ سکا۔ اللہ اکبر، کس قدر ان مٹ ہوتے ہیں، بچپن[2] کے اثرات۔

---

[1] ہمارے گھر کے ایک گوشے میں ایک کلیا یعنی سی جگہ، تھی کہد یا جاتا تھا کہ اس میں چڑیل رہتی ہے

[2] میرے نزدیک بچپن کے کبھی نہ مٹ سکنے والے اثرات ہی ہیں، جو نوع انسانی کو ہندو مسلم عیسائی بدھ، زرتشتی موسوی جینی اور سکھ بنائے ہوئے ہیں اسی وجہ سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ دادامیاں کے محل سے نکلنا آدمی کا نہیں، دیو کا کام ہے۔

میری بسم اللہ

ارے میں اپنی بسم اللہ کا حال لکھنا تو بھول ہی گیا، اسے پہلے ہی آنا چاہیئے تھا خیر، اب سن لیجئے ذرا سی بات ہے ہی ــــ اس موقع پر کیا کیا رسمیں ہوئی تھیں، بالتفصیل یاد نہیں ہیں۔ بس اسی قدر خیال ہے کہ کم عمری میں، میری بسم اللہ ہوئی تھی۔ چاندی کی تھال میں سونے کی دوات، سونے کے خول کا قلم میرے سامنے رکھا گیا تھا، اور میرے اولین معلم مولوی نیاز علی خاں نے مجھ سے کہا تھا میاں صاحب زادے کہئے "بسم اللہ" اس کے بعد حاضرین کے گلوں میں ہار ڈالے گئے تھے، اور مٹھائی تقسیم کی گئی تھی ــــ دادا میاں بھی موجود تھے، جنہوں نے باآواز بلند یہ مصرع پڑھا تھا۔ "قلم گوید کہ من شاہ جہانم" ــــ اسی رات کو زنانے میں ڈومنیوں کا گانا، اور مردانے میں طوائفوں کا مجرا ہوا تھا ــــ اور میں دولھا بنا کر بیچ میں بٹھا دیا گیا تھا۔

میرے معلمؔ

میرے فارسی کے معلم تھے مولوی نیاز علی خاں اردو کے معلم تھے مولانا طاہر عربی کے معلم تھے مولوی قدرت اللہ بیگ اور انگریزی کے معلم تھے ماسٹر گومتی پرشاد

مولوی نیاز علی خاں ایک روکھے سے خشک مزاج آدمی تھے، مولانا طاہر بڑے ہی شگفتہ مزاج تھے اور شاعر بھی ان کا یہ ایک شعر اب تک یاد ہے:

شہرہ جو سنا حسن کا طاہر کی زبانی   نادیدہ میں عاشق ہوا تجھ پر مری جانی

مولوی قدرت اللہ بیگ فارسی اور عربی کے زبردست عالم تھے۔ میرے پاس ان کی ایک مثنوی موجود ہے، جو غالباً پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور حیرت ناک بات یہ ہے کہ اس مثنوی کے تمام اشعار ایسے ہیں کہ ان میں ایک لفظ بھی نقطہ دار موجود نہیں ہے جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے انکے بے پایاں ذخیرہ الفاظ اور فرماں روائی لغات کا۔

اب رہے ماسٹر گومتی پرشاد، سو وہ بڑے ہی مسکین اور خاموش آدمی تھے، لیکن اس اسلوب سے پڑھاتے تھے کہ حرف حرف دل نشین ہو جاتا تھا۔ اس کے بہت دن کے بعد میرے باپ نے

حضرت مانی جائسی کو میرا ٹیوٹر مقرر فرمایا تھا

طلوعِ صبح کا اولین دیدار

ہمارے گھر کے اندر لطیفوں، نقلوں اور کہانیوں کی بنا پر دن رہتا تھا، رات گیارہ بجے تک اور رات رہتی تھی دن کے بارہ ایک بجے تک ـــــ اس لئے اس غیر فطری ماحول میں پلا ہوا بچہ واقف ہی کیوں کر ہو سکتا تھا، صبح کی رنگینیوں سے۔

کیوں کر مالامال ہوا میں اس دولت بیدار سے، اور کیوں کر یہ قرآن اتمام میری آنکھوں پر اس کی روداد بھی سن لیجئے۔ میرے باپ، ربیع و خریف کے زمانے میں دو بار اپنے علاقے کے دورے پر تشریف لے جایا کرتے تھے، اور ان مواقع پر وہ سو رہتے تھے آٹھ نو بجے رات کو اور جاگ اٹھتے تھے صبح تین چار بجے۔

ایک بار جب وہ دورے پر جانے والے تھے، تو میں نے درخواست کی تھی کہ میاں، ہمیں بھی ساتھ لیتے جائیے گا۔ تو انہوں نے میری یہ درخواست منظور کر کے لو الحافظن کو مامور فرما دیا تھا کہ مجھ کو بہت تڑکے جگا دیں۔

اب سنئے اللہ کا کرنا کیا ہوتا ہے ـــــ جب لحافظن بوا نے بہت تڑکے مجھ کو جھنجھوڑ کر جگایا کہ بھیا اٹھ بیٹھو، میاں کے ساتھ گاؤں جانا ہے، تو میں اٹھ بیٹھا ـــــ اور آنکھیں مل کر، نگاہ اٹھائی، تو بڑی حیرت کے ساتھ جب یہ دیکھا کہ دھندلے سنگ مرمر کی تراشیدہ، اور دھوپ چھاؤں کی پروردہ، نیم پیدا نیم پنہاں، گنگا جمنی پریاں، نقابوں کے سہروں کو چٹکیوں میں تولے، رسماتے آسمان پر الہسماتی زمین کی طرف اڑتی چلی آرہی ہیں۔ تو میرے دل نے پوچھا ارے یہ کیا ہو رہا ہے، اور یہ سب کچھ ہوا کیا جا رہا ہے؟ ـــــ دن ہے نہ رات اندھیرا ہے نہ اجالا۔ اندھیرے میں اجالا ـــــ اجالے میں اندھیرا ـــــ صباحت میں ملاحت، ملاحت میں صباحت۔ سرمئی نقاب کندنی مکھڑا ـــــ سرخی میں، گدرائی فضا کی انگڑائیاں آدھے جلوے آدھی جھائیاں ـــــ ظلمات میں آبِ حیات کا سرشار۔ آبنوس کے شہر میں، مصر کا بازار ـــــ

ایک طرف افشاں، سلمہ ستارہ، فنتقہ، غازہ، گوٹا، کناری، سونا چاندی، مرمر، لیچکا، پٹھا، ابیر۔

لہ ایک مدت دراز سے میں سو رہتا ہوں، رات کے آٹھ نو بجے اور جاگ اٹھتا ہوں صبح کو تین چار بجے جس کے یہ معنی ہیں کہ میرے گھر میں ربیع و خریف کی فصل ہمیشہ رہتی ہے اور میں ہر روز اپنے علاقے کے دورے پر جاتا رہتا ہوں باپ کا علاقہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ یائے سخن۔ سدا ہے جاری

اور گلال، فضا پر سنہرے تاروں کا جال، اور بڑی آہستگی کے ساتھ، ابھرتا ہوا کندن کا تھال
شلنگیں بھرتا، نیم کے پیچھے گیا، شاخ پر چہچہاتی چڑیاں بھرا مار کر اڑ گئیں، ہاتھ پھیلا
کر، نیم کو چھاتی سے لگایا، ڈالی کو سر جھکا کر اس کی پتیوں کو چوم لیا۔ مرغان سحری کی بانگ
نے خون کو گرم کر کے رکھ دیا ——— دیوانہ وار مردانے میں پہنچا ——— دیکھا کہ میانہ صحن میں
رکھا ہے میانہ مخمل نظر آیا۔ کہارے چلمیں پی پی کر کھانس رہے ہیں۔ ان کی کھانسی بھی اچھی لگی،
سپاہی دولا الٰہ الا اللہ کہہ کہہ کر منھ دھو رہے ہیں ان کے چھینٹوں کی آواز نے دل موہ لیا۔
پھاٹک کے قریب گھوڑے ویں ہلا رہے ہیں۔ کنوئیں کے پاس کھڑی ہوئی ہتنی جھوم رہی ہے۔
الاؤ کے گرد پاسی بیٹھے تاپ رہے ہیں، الاؤ کی اچھلتی آنچ میں زہرا کی کمر لچک رہی ہے۔ اور
یہ سارا اسماں اندر کے اکھاڑے میں تبدیل ہو گیا ——— میں وحشی چکارے کے مانند دوڑ
کر سامنے کے کمرے میں داخل ہو گیا۔
کمرے کی سوئی ہوئی گرمی سردی سے جی خوش ہو گیا ——— میں ذرا سا مڑ کر اور ایک
قد آدم آئینہ کے سامنے جا کر، اپنا منھ دیکھے گا۔ گالوں پر سرخی کے بلکورے، آنکھوں
میں گلابی ڈورے ——— چھریرا بدن، پتلی کمر، گھونگریالے بال، پتلے پتلے ہونٹ
لانبی لانبی پلکیں —— بر میں ریشمی کرتہ، کرتے پر روئی بھری مخملی صدری، سر پر آڑی جرنیلی،
ٹوپی، ٹوپی کے گرد، آنگرکھے کا سنہرا فیتہ، اور داہنے کان میں ہلتا ہوا سونے کا جھلا جھل جھل
اف میں کس قدر حسین ہوں۔ زندگی میں پہلی بار، اس کا پتا چلا۔ اللہ کھل کر سے طلوع صبح
کی رنگینی کا، جس نے میرا پوشیدہ اجمال، مجھ پر آشکارا کر دیا۔
وہ جمال۔ جو آگے چل کر زمین پر پاؤں نہ رکھنے والے مغرور حسینوں کے سروں کو
اپنے قدموں پر جھکا لیتے۔ اور ایک دن پریاں حاضر نا اٹھائے، ہائے جوانی، ہائے نہ مانے،،
کا نعرہ لگانے والا تھا۔ اور وہ آنی فانی جمال کہ اب اس اردل عمر میں، جب کبھی
وہ یاد آ جاتا ہے ——— تو ہر چند میرے مفکر شبیر حسن خاں پر قطعی ملال طاری نہیں ہوتا
لیکن میرے شاعر، جوش ملیح آبادی کے دل سے، خون کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں اور وہ چیخ اٹھتا ہے کہ

هم پر بھی، حسینوں کا کرم تھا، اک روز
اس قوم میں، اپنا بھی بھرم تھا اک روز
بے زار نگاہوں کی گزرگاہ ہے اب
وہ چہرہ کہ نظروں کا حرم تھا اک روز

لہ ایک ادنیٰ قوم جس سے زمیں دار پولیس کا کام لیتا ہے

کردگارا! پھول سے چہروں کو، ہڈوں کی شکل میں تبدیل کر دینے سے، آخر، تجھے کیا مزا آتا ہے؟

گاؤں کا پہلا نظارہ ۔

گھر سے چھوٹتے ہی ہمارا قافلہ چل کھڑا تھا میرے باپ آڑھو کہاروں والے میانے میں،
ضلعدار[1] اقربا گھوڑوں پر، میرے بڑے بھائی میر احمد خاں رام پوری اور میں ہتھنی پر،
باقی خدمتگار سپاہی؛ اور گماشتے[2] پیدل

پانچ چھ میل کی مسافت طے کر کے جب ہمارا قافلہ حدود سید آباد[3] میں داخل ہوا تو چونکہ اس سے پیشتر میں نے کبھی گاؤں دیکھا ہی نہیں تھا۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

اللہ اللہ تا حد نظر، جھومتے، لہلہاتے اور گنگناتے کھیت کھیتوں میں دھرتی ماتا کی اگی ہوئی تمنائیں اور مستجاب دعائیں بیچ بیچ میں مانند زلف بتاں پیچ و خم کھاتی ہوئی پگڈنڈیاں جیسی بیڑیوں اور دو پر اہیوں،، کی بدولت گہری گہری نالیوں میں، شہر کے چولہوں کو آگ بخشنے والے بہتے پانی کی گڑ بڑ، گڑ بڑ۔ سنہری اور ملائم کرنوں سے جھیل کی موجوں میں، ان کی رہ رہ کر ڈبکیاں، اور ملائم دوش پر۔

کھیتوں کی تراوٹ اور بالیوں کی خوشبوئیں اٹھائے ہوئے ٹھنڈے جھونکوں کی پاکیزگی و لطافت اور کھیتوں سے دور کچے پکے، لیپے پتے مکانوں کے جھنڈ۔ اونچے اونچے کھلیان — نکائی کرتی نوانی جوان جوان عورتیں، اور گدرے گدرے چھوکریاں، ادھر طوفان، ادھر الغاؤ[4] ان کے لال پیلے لہنگے، اودی اودی چندریاں، ان کے خالص ہوا، اور مسلسل محنت کے پروردہ جھلکتے شاداب چہرے اور گٹھے گٹھے، چٹکتے بدن کہ پوری طرح کسمسا کر انگڑائی آئے تو جلد مسک کر رہ جائے،

اور دیکھنے والے کے دل میں یہ آرزو دھوم مچائے کہ انہیں چھو کر بھی دیکھ لیا جائے کہ یہ بنی ہیں کن عناصر سے، یہ سماں دیکھ کر میرے سینے کی تمام کھڑکیاں کھل گئیں۔ رگ رگ میں بشاشت کے فوارے چھوٹنے لگے، نچلے پپوٹوں کے نیچے خنکی دوڑ گئی۔ آنکھیں جیسے ایک دم سے بڑی ہو گئیں، نگاہیں جھکیں تو اپنے چہرے کی سرخی نظر آ گئی، پور پور میں تازگی، انگلیاں چٹخانے لگی

---

[1] زمیندار کا مقرر کردہ تحصیلدار

[2] وہ پاسی جو گاؤں میں پولیس کے فرائض انجام دیتے تھے

[3] ہمارے علاقے کا سب سے بڑا تخت گاؤں جس کا لقب تھا "چاندی کا پرنالہ"

[4] تعلقہ داروں اور زمینداروں کی قیام گاہ

سانس لینے کا غیر محسوس عمل، ایک محسوس عیاشی بن گیا اور میرے جسم کے اندر پھوٹنے لگی۔
سویرا ہو گیا اسی عالم میں ہمارا قافلہ کھیتوں کے بیچ و خم سے گزرتا ـــــ صد ہا زمیں بوس سلاموں کا صرف ایک سر کی جنبش سے جواب دیتا ـــــ ہتنی کی بار بار بڑھتی ہوئی سونڈ میں ٹوٹے گنوں کی چٹاخ چٹاخ سنتا۔ کورے برتنوں کی کچی کچی لپٹوں میں جھومتا ـــــ اور اور بیتل کی جھلکتی، جھلکتی گاگروں کے پیچھے، صراحی دار گردنوں اور پتلی پتلی کمروں کی لچک، دیکھتا ہوا بالآخر ٹھکانے[1] پہنچ گیا

ہمارے ٹھکانے پہنچتے ہی رعایا جوق در جوق آتی، اور ہم دونوں بھائیوں کے پاؤں چھو چھو کر نذرانے دینے لگی۔ اور ہم نذر کے روپیوں کو سامنے کے پڑے تخت پر بڑی بے پروائی[2] کے ساتھ کھنا کھن، اور چھنا چھن پھینکنے لگے ـــ اور تھوڑی دیر میں پیانو کے قدموں کے سے چمکتے سکوں کا تخت پر انبار لگ گیا، پہاڑی سی بن گئی۔

رعایا جب روپیہ برسا چکی، تو سید پور کے بستہ قد مہاجن، جھلڑ شاہ ہاتوں میں سونے کی انگوٹھیاں پہنے، اور چاندی کی شام، اور لوہے کے گوٹے کی ہردنی باندھے، جھلکے جھلکے آئے۔ اپنے خادم کے سر سے روپیوں کا بھرا ہوا جوٹی دار تھال اتارا ـــــ اسے ہم دونوں بھائیوں کے سر پر تین بار بطور صدقہ گھمایا اور پھر ایک بار کھنا کے سے تھال کا تمام روپیہ فرش پر گرا دیا۔ خالص چاندی کے کھنکتے روپے فرش پر ادھر ادھر ناچنے اور دوڑنے لگے ـــــ اور ہمارے خدام نے حسب دستور قدیم وہ تمام روپیہ لوٹ لئے اس ہنگامہ رقص طلا کے بعد اب دوپہر کے کھانے کا وقت آ گیا۔ جبر علی فقیر[3]، دسترخوان پر اپنے ہاتھ کا پکایا کھانا چننے لگا اور پھر ہیں ہمارے مرادئی، اہیر اور برہمن کاشت کار اپنے اپنے سروں پر پکوان اٹھائے ہوئے آ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہی ہمارے سامنے پوریوں، کچوریوں، بھانت بھانت ترکاریوں، تلی مچھلی کے ٹکڑوں، گلگلوں، پھلکیوں، دودھ دہی کی ہانڈیوں، مٹھائیوں اور ساول کی بڑی بڑی لپٹوں کا ایک ... انبار لگ گیا۔

خاصہ تناول فرما کر، میرے باپ، حسب معمول اندر کمرے میں جا کر سو گئے۔ میں بھی

---

[1] تعلقہ داروں اور زمیں کی قیام گاہ.

[2] لکشمی دیوی اپنی اس اہانت کا مجھ سے اب انتقام لے رہی ہیں لیکن یاد رکھو دیوی جی میری پیشانی تمہاری چوکھٹ پر کبھی جھکی ہے، نہ جھک سکے گی۔

[3] ہمارے دس پانچ مسلم کاشتکاروں میں سے ایک تھا۔ جو بہت اچھا کھانا پکانا جانتا تھا۔

تکان محسوس کرنے کی بنا پر جا رہا تھا کہ تھوڑے دیر کے واسطے لیٹ جاؤں کہ باہر سے عالم گیر پھوپا[1] کی گرجتی آواز سنائی دی ــــــ باہر گیا تو یہ دیکھا کہ ایک، سر سے لے کر پاؤں تک جھریوں میں لپٹا ہوا کاشت کار اپنے بیٹے کے شانے پر ہاتھ رکھے پھپا سے اپنی زبان میں یہ کہہ رہا ہے کہ خاں صاحب بہادر آپ خود میری سامنے کھڑی ہوئی بیوی کو دیکھ لیں، اس کو سوکھے کا روگ لگ رہا تھا، اسکی دوا دارو نے مجھ کو کھنگ کر دیا ہے، آدھا لگان اب لے لیجئے آدھا دوسری فصل پر ادا کر دوں گا۔

اس کا یہ عذر سن کر پھپا نے اس کو ایک موٹی سی گالی دے کر کہا اب ایک آنہ بھی کم نہیں لوں گا، پورا لگان ادا کر پورا ــــــ اس بوڑھے بھوس نے تھر تھرائی آواز میں کہا بھگوان کی قسم آدھے لگان سے زیادہ میرے پاس ایک جھنجھی کوڑی بھی نہیں ہے۔ یہ سنتے ہی پھپا اٹھے اور ایک تھپیڑا اس کے منھ پر اتنے زناٹے سے مارا کہ وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا اس کی مرجھائی ہوئی بیوی کی آنکھوں سے ڈھل ڈھل، آنسو بہنے لگے، اس کے بیٹے نے شرم سے آنکھیں جھکا لیں۔

گرے ہوئے بوڑھے نے اپنی روتی ہوئی بیوی، اور اپنے جھینپے ہوئے بے بس لڑکے کو ایسی نظر سے دیکھا کہ میری سانس امیرے گلے میں الجھ گئی، اور پھر ایک دردناک چیخ مار کر میں تھانے میں داخل ہو کر اپنے سوتے ہوئے باپ کے سرہانے جا کر کھڑا ہو گیا، اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگا میری ہچکیوں سے ان کی آنکھ کھل گئی، اور انتہائی گھبراہٹ کے ساتھ، انہوں نے مجھ سے پوچھا ارے کیا ہوا، ارے کیا ہوا۔

میں نے اس بوڑھے کسان کی حالت اور پھوپا کی شقاوت کا سارا ماجرا بیان کیا۔ میرے باپ کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں، صالح محمد خاں کو حکم دیا کہ اس بوڑھے کسان کو میرے پاس بلا لاؤ، وہ بوڑھا میرے باپ کے قدموں پر گر کر، کہنے لگا دہائی خاں صاحب بہادر کی اتنے میں اس کی بیوی بھی، اپنے فرزند کے ساتھ آ گئی، اور وہ دونوں بھی زار و قطار رونے لگے۔ میرے باپ نے انہیں تسلی دے کر، گمٹیتے کو حکم دیا کہ ماتا دین بٹواری کو بلا لاؤ بٹواری آ گیا، تو انہوں نے فرمایا، ماتا دین، سیاہے میں اس مراؤ کے لگان کی پوری بیباقی درج کر لو، اور اسی وقت رسید اس کے حوالے کر دو ــــــ

میری باپ کے ترحم آمیز برتاؤ کو دیکھ کر، بوڑھے کسان، اس کی لاغر بیوی اور اس کے

---

[1] پھپا ہمارے پورے علاقے کے صدر ضلع دار بے حد شعلہ خو دشنام کار انسان تھے

بیٹے کی آنکھیں شکر یئے کے آنسوؤں کی جھڑی برسانے لگیں۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے دل کے زخم پر مرہم رکھ دیا ہے اور جب وہ تینوں آدمی جے کھان صاحب بہادر کی اے بھگوان کھان صاحب بہادر کا راج گنگا دھار تک رہے۔ کہتے چلے گئے — تو میرے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مجھے اپنے بہادر باپ کی صورت اور بھی اچھی لگنے لگی، اور عالمگیر بھیا سے ایسی نفرت ہوئی کہ جب میرا زمانہ آیا، تو بڑے لطف حیلے کے ساتھ میں نے ان سے تھلعداری نکال کر اپنی پھوپھی زاد بہن کے فرزند، خواجہ حسن خاں کے سپرد کر دیا۔ لیکن خواجہ حسن بھی بُرے ثابت ہوئے، اچھر باشگی تلوار تھے، تو وہ میٹھی چھری نکلے۔ غرضکہ — رعایا کو آرام نصیب نہ مل سکا خیر، یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ جب رات کا وقت آیا تو میں کھانا کھا کر چارپائی پر دراز ہو گیا۔ اور کہانی سنانے والے، کہانیاں سنانے لگے۔

میرزا یعقوب بیگ اور بنو خاں کے بعد جب ظہور علی خاں کی باری آئی، تو انہوں نے ایسی دلچسپ کہانی سنائی، جس کے بعض حصے اب تک یاد ہیں۔ آپ بھی سن لیں:

— ایک بار اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ ایک خوبصورت گبھرو جوان تاردوں کی چھاؤنی میں نوکری کی تلاش کرنے کے واسطے اپنے گاؤں سے ایک شہر کی طرف روانہ ہوا —

لق و دق میدانوں، گہری ندیوں اور گھنے جنگلوں کو طے کرتا وہ اس وقت شہر کے کنارے پہنچا، جبکہ چیل انڈا چھوڑ دیتی ہے — تو دیکھا کہ عالیشہر شہر کے ایک چھوٹے سے مکان کی دیوار پر ایک کبوتر سٹھا دم ہلا رہا ہے، بھوکا پیاسا تو تھا ہی جی میں آیا کبوتر کو مار کر بھونوں اور کھا جاؤں اس تمنا میں دن سے جبر کر دیا — مقدر کی بات کہ گولی کھا کر کبوتر ادھر نہیں، ادھر مکان کے اندر گر گیا۔ سپاہی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بندوق کا کندہ لگا کر دیوار پر چڑھ گیا دیوار سے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی، کوئی نظر نہیں آیا دھم سے کود پڑا — کودتے ہی دیکھا کہ ایک خوب صورت جوان پٹھانی عورت دالان سے نکل کر بال بکھرائے اسی کی طرف چلی

---

[1] دراصل وہ تمام نظام ہی اس قدر ظالمانہ تھا کہ اس سے کسی نوع کی شرافت کا تصور ہی وابستہ نہیں کیا جا سکتا تھا خدا بھلا کرے حکومت ہند کا کہ اس نے ہر پٹی دار، ہر نمبر دار، ہر تعلقہ دار، ہر جاگیر دار اور دیسی ریاستوں کے ہر تاجدار کو دار پر چڑھا کر اللہ کے کروڑوں بندوں کی گلو خلاصی کر دی۔

ہر چند شیخ جاگیرداری سے تباہی مجھ پر آئی۔ لیکن کوئی پرواہ نہیں ایک میری بربادی نے بے شمار انسانوں کو آباد کر دیا جہاں آنکھ کھل گئی سویرا ہے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

آرہی ہے، سپاہی سٹی بھول گیا، زمین نے قدم پکڑ لیے، بھاگنے کی طاقت سلب ہو گئی، گھبرا کر گھوم گیا، اور اس عورت کو دیکھنے لگا ـــــ عورت ڈھیٹ تھی، ڈری نہیں۔ اور سپاہی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی، "پرائے گھروں میں کود پڑے دھم سے یہ کون سی بھلمنسی ہے تم کوئی چور ہو، اٹھائی گیرے ہو، بہت پھرے ہو، ڈاکو ہو، اچھال چھکا ہو یا دیوانے" ـــــ سپاہی نے سر جھکا کر سارا ماجرا بیان کر دیا۔ اور کہا جو چاہو سزا دے لو، ٹھوکر میں مجھ سے بڑی بھول ہو گئی عورت نے کہا میں نے تمہاری سزا سوچ لی ہے، ادھر آؤ میرے پیچھے پیچھے دالان میں۔ سپاہی نے دل میں کہا اس کی مار میں بھی مزا آئے گا۔ اس کے پیچھے گردن ڈال کر روانہ ہو گیا ـــــ دالان میں پہنچ کر عورت نے کہا چٹائی پر بیٹھ جاؤ، سپاہی چٹائی پر بیٹھ گیا تو اس نے یہ کہہ کر اس کے سامنے کھانا رکھ دیا کہ پہلے کھانا کھلاؤں گی پھر تم کو، اس گھر میں کود پڑنے کا مزہ چکھاؤں گی، جب سپاہی کھانا کھا چکا، ہاتھ دھو چکا تو اس عورت نے کہا اب میں تمہاری ناک چھیدوں گی اور اس میں نکیل ڈال دوں گی سپاہی اس کا منہ دیکھنے لگا، اس نے گردن جھکا دی۔ پھر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اس عورت نے اس کے گلے میں باہیں ڈال کر پوچھا تم کون ہو، گھبرو کی سانس تیز تیز چلنے لگی، اس نے اپنا نام بتایا عورت نے پوچھا کس کام کے لئے یہاں آئے ہو، اس نے کہا میں سپاہی ہوں، کسی رئیس کی ڈیوڑھی میں نوکری کروں گا عورت اس سے الگ ہو کر بیٹھ گئی اس کے منہ سے نکل گیا، "ارے"، عورت نے مسکرا کر کہا تمہاری سزا یہ ہے کہ آج سے تم میرے نوکر ہو گئے ہو، کھانا پینا، کپڑا لتا، میرے ذمے رہے گا ـــــ تنخواہ تمہاری ایک روپیہ روز ہو گی، تم کو منظور ہے، سپاہی نے ریشہ خطمی ہو کر کہا، جان و دل سے منظور، عورت نے کہا لیکن ایک شرط یہ ہے کہ جب میرے میاں کے آنے کا وقت ہو گا، اس سے آدھے یا ایک گھنٹہ پیشتر ہی، تم میری سہیلی کے گھر جا کر، ایک کوٹھڑی میں سو جانا، جب وہ چلا جائے گا، تو میں تمہیں بلا لیا کروں گی ـــــ یہ دیکھو، کونے میں سہیلی کے گھر کی کھڑکی ہے ـــــ یہ کہہ کر وہ اٹھی اور اپنی سہیلی کو بلا لائی، اور ساری بات اس کو سمجھا دی ـــــ اور پھر اس نے سپاہی سے یہ کہا، شام ہوتے ہی نہا دھو کر میری سہیلی کے ساتھ ایک تنبولی کی دکان پر جانا، اور ایک روپے کی گلوری مانگنا ـــــ گھوم پھر کر، پھر گھر چلے آنا ـــــ چنانچہ شام ہوتے ہی سپاہی نہایا دھویا، عورت نے اس کو ایک ریشمی لنگی اور ململ کا دھلا ہوا ایک کرتہ دیا۔ اور ایک جریب۔ اس کے سر میں تیل ڈالا کنگھی کی، کرتے میں عطر ملا اور ایک سہیلی کے ساتھ بازار روانہ کر دیا۔ سہیلی نے دور سے اشارہ کر کے تنبولی کی دکان بتا دی۔ سپاہی عطر کی مہک میں ڈوبا گیا اور ایک روپیہ اس کے تھال پر پھینک کر کہا، اے تنبولی، ایک روپیہ کی ایک گلوری۔

اس زمانے میں ایک پیسے کی ایک گلوری ملا کرتی تھی، اس لئے تنبولی ایک روپے کی ایک گلوری کی سن کر بھونچکا ہو کر رہ گیا، دل میں سوچنے لگا، ہو نہ ہو یہ کوئی بھولا بھالا رئیس زادہ ہے لیکن اس نے سوچا رئیس زادے بازاروں میں ننگی باندھے کب پھرتے ہیں ـــــ سپاہی نے تنبولی کو سوچتے دیکھا تو گرج کر کہا اے تنبولی، ایک روپے کی ایک گلوری، جلدی کر ـــــ تنبولی نے اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا میاں تم کون ہو، اس نے کہا ہم سپاہی ہیں سپاہی، تنبولی نے دریافت کیا میاں کس ڈیوڑھی پر نوکر ہو؟ سپاہی نے کہا، پورب کی طرف سے آتے ہوئے، جو سب سے پہلا لال اینٹوں کا مکان ہے، اس مکان کی مالکن کا سپاہی ہوں ـــــ تنبولی نے گلوری تو اس کو دے دی، مگر دل میں سوچنے لگا کہ یہ سپاہی جو مکان بتا رہا ہے، وہ تو میرا ہی مکان ہے کیا میری عورت بگڑ گئی ہے، لوگوں نے سچ کہا تھا کہ تم ادھیڑ ہو کر جوان عورت سے شادی نہ کرو نہیں تو دھوکا کھاؤ گے۔ ان تمام باتوں پر غور کر کے تنبولی نے وقت سے پہلے ہی اپنی دکان بند کر دی اور افتاں و خیزاں جا کر، اپنا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔

میاں کے قبل از وقت آنے سے تنبولن گھبرا گئی، سپاہی نے بندوق اٹھالی، تنبولن نے بندوق چھین لی، کہا جلدی سے بندوق سمیت اس سامنے والی کٹھیا میں جا کر کود پڑو ـــــ سپاہی کٹھیا میں کود پڑا۔ تنبولن نے سر میں پٹی باندھ لی اور دروازہ کھول کر کراہنے لگی تنبولی نے پوچھا دروازہ کھولنے میں دیر کیوں کی، تنبولن نے کہا ارے دیکھو میرے سر کی پٹی، درد کے مارے سر پھٹا جا رہا ہے، گڑگڑاتی پڑی تھی، کھٹ کھٹ سن کر بڑے جتن کر کے اٹھی ہوں تنبولی، چپ منو، گھر میں گھسا اور چراغ ہاتھ میں لے کر ادھر ادھر گھومنے لگا، تنبولن نے کہا ارے تجھے آج کیا ہو گیا ہے کہ سارے گھر میں چراغ لئے چھو چھو کرتا پھر رہا ہے، تنبولی نے بگڑ کر کہا تیرے یار کو ڈھونڈ رہا ہوں ـــــ یہ سنتے ہی تنبولن نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اور چھاتی پر گھونسا مار کر کہا یا اللہ یہ بھی سننا تھا مجھ کرموں جلی کو، ارے میں اور یار، اگر میں ایسی بات ہو تو بجلی گر پڑے مجھ پر۔

علی کی تیغ ٹوٹے مجھ نگوڑی پر ـــــ تنبولی نے کڑک کر کہا، اگر تیرا کوئی یار نہیں، تو پھر میری دکان پر یہ ایک روپے کی گلوری کھانے والا کون آیا، اور میرے مکان کا پتا اس کو کس نے بتایا تھا تنبولن نے سر پیٹ کر کہا ارے مورکھو، اب میں بات کی تہ کو پہنچ گئی، یہ سارا اسوانگ اس موئے کا بھرا ہوا ہے، جو چاہتا ہے مجھ سے تجھ سے جھٹم جھٹا ہو جائے، تو مجھے فارخطی دیدے اور تھو تھو سات سمندر پار، پھر وہ مجھ سے بیاہ رچالے، ارے اس موئے کے منہ کو نوکا اگر تو خدانہ کرے شیطان کے کان بہرے مجھے چھوڑ بھی دے گا پھر بھی اس اٹھائی گیرے کے منہ پر

کبھی نہیں تھوکوں گی۔ وہ تو دو کوڑی کا بھوڑا ہے، میں تو کان پکڑ کر اور توبہ توبہ کر کے کہتی ہوں
کہ تیرا منھ دیکھ کر اب کسی ہفت اقلیم کے بادشاہ کا منھ بھی نہیں دیکھوں گی۔

تنبولی نے کہا بتا وہ ہے کون بدمعاش۔ تنبولن نے منھ پر انگلی مار کر کہا میرے قریب
کان لا۔ اور پڑوس کے گھر کی طرف اشارہ کر کے کہا یہ سارا بس اسی بدمعاش کا بویا ہوا ہے اس کی
گھر والی، تو جانتا ہے کہ میری بڑی اچھی سہیلی ہے، خود اس نے میرے کان میں کہا تھا کہ میرے
خصم کا کچھ بردانت ہے، ہشیار رہنا۔ مرا تو ابھی چپ رہنا، میں اپنے چاروں بھائیوں کو
بلا کر اس کی ایسی مرمت کرا دوں گی کہ اس کا سارا نشہ ہرن ہو جائے گا۔

تنبولی کو یقین آ گیا کہ بس یہی بات ہے، اور اسی بدذات نے یہ شوشہ چھوڑا ہے، اس
نے پشیمان ہو کر سر جھکا لیا۔ اور جب تنبولن نے دیکھ لیا کہ اس کا جادو چل گیا ہے، تو وہ منھ ڈھانپ
کر رونے لگی، اور تنبولی کہنے لگا اری مجھ سے بڑی چوک ہو گئی کہ ادل فول بکنے لگا، معاف کر دے
مجھے تنبولن نے، ڈھیلے ہاتھ سے اسکے منھ پر تھپڑ مار کر کہا، جا بڑے پیر کی نیاز دلا دوں گی، بازار
سے لڈو لے آ ـــــ یہ انہیں کی برکت ہے کہ میری بات، تجھ مورکھ کی سمجھ میں آ گئی۔

تنبولی جب باہر چلا گیا لڈو لانے، تنبولن نے کٹھیا میں منھ ڈال کر کہا، تھوڑی دیر اور
سسیٹا بیٹھا رہ، ابھی تجھے تازے تازے لڈو کھلواؤں گی اور جب موا بڈھا چلا جائے گا تو تجھ
کو باہر نکال لوں گی، اس کے بعد کھڑکی میں منھ ڈال کر اپنی رازدار سہیلی کو بھی اس نے اپنے پاس
بلا یا اور یہ سارا ماجرا اس کو سنا دیا۔ جب تنبولی بڑے سے دونے میں لڈو لئے خوش خوش اور
جھینپا جھینپا آیا سب سے پہلے اسکی سہیلی نے اس پر بڑے پیر صاحب کی نیاز دی، پھر
تینوں نے مل کر لڈو کھائے اور جب آدھے سے کچھ کم لڈو رہ گئے تو اس نے اپنے میاں سے کہا
تو بڑا نشانہ باز بنتا ہے، تو سہی کٹھیا کے اندر لڈو پھینک، اگر ایک لڈو بھی نیچے گر گیا تو تو ہار جائے
گا، اور سالونیا اُتے ہی لڈو تو پھر لائے گا۔

تنبولن نے ایک ایک کر کے تمام لڈو کٹھیا کے اندر اتار دیئے، اور قہقہہ مار کر کہا اری
دیکھا میرا نشانہ تنبولن نے اٹھ کر تنبولی کی پیٹھ ٹھونکی، اور پڑوسن کی طرف دیکھ کر آنکھ مار دی۔

جب دوسری شام آئی، سپاہی نہا دھو کر پھر تنبولی کی دوکان پر پہنچا، سپاہی کو دیکھ کر
تنبولی کی آنکھوں میں خون اتر آیا، مگر وہ غصہ پی گیا ـــــ سپاہی نے دو روپے جیب سے
نکال اس کے تختے پر پھینک دیئے اور کہا اے تنبولی دو روپے کی ایک گلوری ـــ
تنبولی نے رندھے گلے کے ساتھ کہا، دو روپے کی ایک گلوری،،
سپاہی نے کہا ہاں ہاں دو روپے کی ایک گلوری ــــ

تنبولی نے گلوری دے کر کہا میاں سپاہی، یہ تم کو یہاں روپیے دے کر کون بھیجتا ہے؟ سپاہی نے کہا ارے وہی لال اینٹوں کی مکان والی، جس نے ہم کو نوکر رکھا ہے تنبولی نے پوچھا میاں سپاہی کل بھی وہاں گئے تھے؟ اس نے کہا گئے کیوں نہیں تھے، ہم نوکر بھی اس بات کے ہیں اور یہ کہہ کر اس نے گذشتہ رات کا سارا ماجرا اس کو سنا دیا، اور پھر قہقہہ مار کر کہا عورت ہو تو ایسی، اس نے اس سالے کے ہاتھوں سے مجھے کٹھیا میں لڈو بھی کھلوا دیے

—— تنبولی کا خون کھولنے لگا اور سپاہی جانے لگا تو اس نے دانت پیس کر کہا، میاں سپاہی، آج بھی وہاں جاؤ گے؟ سپاہی نے بگڑ کر کہا، بیر بیر دوبارہ بار کا پوچھنا کیا ابے کہہ تو دیا کہ ہم نوکر ہی اسی بات کے ہیں۔

تنبولی کے تن بدن میں آگ لگ گئی جلدی جلدی دکان بند کی راستے میں مٹی کے تیل کا پیپا لیا، دیا سلائی جیب میں رکھ لی، گھر آتے ہی دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ تنبولن نے یار کو بڑے سے صندوق میں چھپا کر دروازہ کھول دیا۔ اس نے گھر میں قدم رکھتے ہی تنبولن کو گالیوں پر دھر لیا۔ تنبولن نے کہا ارے کیا آج چرس پی کر آیا ہے۔ تنبولی نے کہا تیرا خون پینے آیا ہوں، کل تو نے اپنے دھگڑے کو کٹھیا میں چھپا کر، میرے ہاتھ سے اس حرامی کو لڈو کھلوائے، لے چھنال آج میں دریا میں پھونکے دیتا ہوں، یہ کہہ کر اس نے ہر طرف تیل چھڑک کر مکان کو آگ لگا دی، اور پھر گھر دھڑ دھڑ جلنے لگا۔ پڑوسن بھی آ گئی دو ایک پڑوسی بھی دوڑ کر آ گئے، تنبولن نے ان سب سے کہا ارے لوگو یہ تو دیوانہ ہو گیا ہے۔ ارے جس صندوق میں اس موے کے باپ دادا کے کاغذات گھر کا سارا زیور اور مال تال رکھا ہوا ہے، ایسے تو ہاتھ لگا کر نکال لاؤ ابھی ادھر آگ نہیں گئی ہے، اگر وہ صندوق بھی جل گیا تو غضب ہو جائے گا۔ پڑوسیوں نے مل جل کر وہ صندوق باہر نکال کر انگنائی میں رکھ دیا اور جب صندوق باہر آ گیا تو بی تنبولن اپنے بال نوچ نوچ اور اپنی چھاتی کوٹ کوٹ کہنے لگی، ارے خدائی خوار اسکے پورے ہو گئے اس بدمعاش کے ارے میری سہیلی سے پوچھ کہ اس کی تہہ میں یہ بات کیا تھی۔ تنبولی دوڑا ہوا سہیلی کے پاس گیا، اس نے اس کے کان میں کہا جب تو کٹھیا میں لڈو پھینک رہا تھا، میرا پاپی خصم موکھے سے جھانک رہا تھا

اس نے اپنی آنکھوں سے سارا تماشا دیکھا، اور اپنے گھر گئے کو تیرے پاس بھیج دیا کہ وہ تیرے سامنے رات کی ساری بات دہرا دے اور تجھ کو یقین آ جائے کہ تیری بیوی بگڑ چکی اور دھگڑا پالے ہوئے ہے اور آخر تو اس کو فارخطی دے دے لعد وہ کل چھرے اڑانے لگے

وہ جو کہتے ہیں کہ بات پوچھو، بتا مادہ کے تو نے ٹھنڈے دل سے بات نہیں سنی اور تیہیے میں آکر، لاکھو کا گھر خاک میں ملا دیا ــــ تنبولی سر پکڑ کر خاک پر بیٹھ گیا، اور ندامت کے مارے پسینے ہو گیا، اتنے میں تنبولن آئی اور کہا اب پچھتائے کا موت ہے، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ دیکھ لیا تو نے، اگر میرا دھکڑا یہاں ہوتا، تو اس کی جلی ہوئی لاش تو تیرے سامنے آجاتی۔

سہیلی نے آکر کہا ارے دیر نہ کر، یہ سامنے کے موڑ پر ٹیٹوں اور لٹا لھڑوں کی دکان ہے۔ جا کچھ ٹٹیاں اور لٹا لھڑے آ۔ جسے مکان کے چاروں طرف لگا دیں، اور جو ایک کوٹھڑی جلنے سے رہ گئی ہے اس کو بھی رہنے کے لئے اچھی طرح گھیر لیں ـــ نہیں تو رہے گا کہاں

تنبولی، لٹا لھڑا ٹٹیاں لینے کے لئے جب چلا، تنبولن نے جھٹ سے صندوق کھول کر پسینے میں تر بتر سپاہی کو باہر نکال لایا، اور گھونگھٹ میں دے کر سہیلی کے گھر پہنچا دیا۔
،، بھیا ایسی ہوتی ہیں چلتر باز عورتیں یہ کہہ کر ظہور علی خاں نے کہانی ختم کر دی۔

چوتھی کی دلہن یعنی طلوع سحر کا دوسرا دیدار

چوکی دار کی آواز سے جب منو اندھیرے آنکھ کھلی تو دیر تک یہ بات سمجھ ہی میں نہیں آئی کہ آخر یہ میں ہوں کہاں ــــ آنکھیں مل کر بڑی حیرانی کے ساتھ بدلے ہوئے ماحول کو دیکھنے لگا۔ اور دس پندرہ منٹ کی حیرت کے بعد حافظے کا مطلع جب صاف ہوا تو یاد آگیا کہ میاں کے ساتھ میں سید ابود آبادی ہوں ــــ طلوع سحر کا مزا تو منو کو لگ ہی چکا تھا، میں بستر سے اٹھا، اور تھانے کی چھت پر چڑھ گیا۔ تھانہ سطح مرتفع پر بنا ہوا تھا، جس کی چھت سے تمام گاؤں نظر آتا تھا

چھت پر گیا تو نسیم صبح، میری رضائی میں آکر چلنے لگی۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے، سردی زیادہ تھی، نہ کہ ایک طرب انگیز جھرجھری سے غنچہ خاطر چٹک گیا ــــ دل میں وہ داگنی بھڑک گئی جس کو انسانوں کے گلے، یا سازوں کے تار گرفت میں نہیں لا سکتے۔ دھندلکے نے اپنے گھونگھٹ کے پٹ کھول دیے آسمان نے زمین پر موتی رول دیئے۔ ولولۂ نشاط نے مور کی طرح ناچنا شروع کر دیا۔ آسمان کی طرف نگاہ کی دیکھا کہ فضا کی محل سرا کے سیاہ پردے، ایک ایک کر کے اٹھ رہے ہیں لیلائے شب مستی کی دھوا اور اختاں چھوڑ کر اور رنگین آنچل سے کاجل پونچھ کر سرخ شگوفہ کا پہن رہی ہے سرخ وادیوں میں

مقیش کے پیمے نصب ہو رہے ہیں۔ تارے کانپ کانپ کر کجلائے چلے جا رہے ہیں ـــــ افق کے ملگجے پردوں کے پیچھے ایک نیم روشن دائرہ نور گھوم رہا ہے۔ اور اس کے گرد، ایک سنہرا ساہالہ بنتا جلا جارہا ہے ـــــ اور چند لمحوں کے بعد پھر یہ دیکھا کہ مشرق کا گہ بیان مسکنے لگا ـــــ اور مسکنے مسکتے چرسے پھٹ گیا ـــــ پھر وہ دائرہ نور، سونے کا تھال بننے لگا۔ تھال کا ایک سرا کسی غرفے سے جھانکنے والی کی پیشانی کے مانند دور سے دمکنے لگا ـــــ پھر اس کو ایک سیاہ جونا صاف کرنے لگا ـــــ پھر وہ جونا غائب ہوگیا ـــــ آدھا تھال سامنے آگیا ـــــ اور ایسا نظر آیا کہ ماہ کنعاں کا ماتھا کنوئیں سے نکل کر جگمگا رہا ہے۔ پھر کیا تھا، چڑیاں چہکنے، ڈالیاں جھلنے، اور مرغان سحر بانگ دینے لگے ـــــ کعبہ نور میں اذان ہونے لگی۔ آسمان دائرہ بجانے لگا۔ زمین چوڑیاں کھنکانے لگی ـــــ جھیل نے انگڑائی لی، پانی سونا بننے لگا۔ دولھا گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ براتی دھومیں مچانے لگے ـــــ اور کرڑم دھم، کرڑم دھم کی زمین پر، شہنائیوں کی پھوار پڑنے لگی ـــــ اری آج آئے سیاں۔ مرے آج آئے سیاں۔ سکھی، سوئے بھاگ جاگے ـــــ مرے من میں راگ جاگے ـــــ مری تھامنے کو بہیاں، مرے آج آئے سیاں مرے آج آئے سیاں

میرا ختنہ:۔

لیجئے ابھی بسم اللہ کی طرح میں اپنے ختنے کا بھی ذکر کرنا بھول کر آگے بہت آگے نکل گیا ـــــ کیا کروں، اب سنائے دیتا ہوں کوئی بنواڑا تو ہے نہیں ـــــ میرا ختنہ کمسنی میں ہوا تھا۔

ـــــ اور خوب یاد ہے کہ دادا میاں نے فرمایا تھا کہ دیکھو بیٹا رونے کی آواز منھ سے نکلنے نہ پائے۔۔۔۔ لیکن لال ڈاڑھی کے جان علی حجام نے گھوڑی چڑھا کر، جب کھٹ سے میرا ختنہ کر دیا ـــــ میری جو چیخ نکل گئی تھی، دادا میاں کے ماتھے پر بل پڑ گئے جب یاد آجاتے ہیں تو دل پر کٹاریاں سی چلنے لگتی ہیں۔

ہر چند میرے ختنے کی رسم بڑی دھوم دھام سے منائی گئی تھی ـــــ دیگیں چڑھی تھیں۔

طوائفوں کے مجرے ہوئے تھے کشمیریوں نے نقلیں کی تھیں مگر میرے دل کی کلی مرجھائی سی رہی تھی اس مرجھاؤ کے دو اسباب تھے۔ پہلا سبب تو وہی تھا مرے ختنے کے وقت کی چیخ تھی اور دوسرا سبب یہ تھا کہ میرے ختنے کی خوشی میں جس وقت ملیح آباد کے ایک لہار نے ایک بڑی خوبصورت

اور جھلملاتی کرنج بطور نذر پیش کی تھی، تو اس کرنج کو ہاتھ میں لیتے ہی مجھ پر ایسا جنون طاری ہو گیا تھا کہ میں نے اپنے غلام زادے حسین بخش کے ننگے سر پر وہ کرنج کھینچ سے ماردی تھی، اور اس بے چارے کے سر سے دھل دھل خون بہنے لگا تھا۔ پھر اس کی تو فوراً مرہم پٹی اور اسکے باپ کی منہ بھرائی کر دی گئی تھی، لیکن میرے دل کا زخم بھر نہیں سکا تھا ___ اور مجھے خوب یاد ہے کہ کاشمیریوں کی ہنسانے والی نقلیں بھی مجھ کو ہنسا نہیں سکی تھیں۔ دل ہی تو ہے۔

موسموں کے تاثرات اور میرے زمانے کے تہوار

موسم گرما

اے پیٹے سے منحوس کا موسم گرما ___ دھوبیا وند کیا، دہکاریا ___ پسینیا، نچوڑیا بھاڑیا بھبھوریا تنوریا چنگڑیا چنگاری ___ اگل کھرا جل ککڑا، گھُنا ___ اوڑھا: برہ تا، سبڑا۔ ہبڑا، بھینگا، برہ تا ___ شیاطین کی آنکھ کا تارا لو کا راج دلارا، الاؤ کا ہوارہ اور شعلوں کا فوارہ ___ خونی ریچھ، لاگو بھیڑیا، اور زبڑیلا سور۔

نفرت ہے مجھ کو اس محرور المزاج، مغضوب، مبغوض، معتوب، اور مردود شہدے، ___ اس کی صبحیں بھی چنگاریاں، اس کی شامیں بھی کیاریاں ___ اس کا شعلہ خو آفتاب دریچہ افق سے ایک بدتمیز گنوار کے مانند، جھت سے نکل کر فوراً آگ برسانے لگتا ہے۔ اسکی بے مہر کرنیں، عیاذاً باللہ ___ گویا جہنمی پاپی اور بوڑھے سود خوار لالہ رام لال کی نگاہ

اس چٹخنے چمار موسم میں جب حرامزادی لو کے جھکڑ غاؤں غاؤں، اور ہو ہو، ہو ہو کرتے چلتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ساتوں جہنم کے گنڈے فرشتے، آتشیں گرز مار مار کر زمین کو ماں بہن کی گالیاں دے رہے ہیں۔

جب یہ خبیث موسم آ جاتا تھا تو دوپہر سے بیشتر ہی، ہم سب بچوں کو مرغیوں کی طرح کھڑی کھڑی کر کے خس خانے میں بند کر دیا جاتا تھا۔

سقفی پنکھے کی سرسرتی جو جوں کا ٹٹیوں پر پانی چھڑکے جانے کی جھنکار، ننھی ننھی بوندیوں کی ٹپکار ___ خس کی سوندھی سوندھی، اور عطر خس کی بھینی بھینی مہکار ___ ان سحر کاریوں کے آغوش میں ایسی ٹھنڈی میٹھی، مہکتی اور گہری نیند آ جاتی تھی کہ شام سے پہلے، ہم میں سے

کسی کی آنکھ کھلتی ہی نہ تھی۔

اور جب شام کو ہم خس خانے سے نکلتے تھے، انگنائی کے چھڑکاؤ کی سوندھی سوندھی خوشبو ہمارا استقبال کرتی تھی ــــ ہم سب بھائی بہن، تختوں کے چوکوں، اور آرام کرسیوں پر آبیٹھ جاتے، اور تار کے بڑے بڑے پنکھے حرکت کرنے لگتے تھے ــــ تربوزوں اور خربزوں کی قاشوں، بالائی کی قلفیوں اور آبخوروں، نمش کے کھلوں۔ اور فالودے کے برف میں بھیگے گلاسوں سے ہم سب کی ضیافت کی جاتی تھی اور رات کو بڑے سے آنگن میں، ہم سب کے پلنگ، اونچے اونچے کھمبوں پر لٹکے ہوئے جھالر دار پنکھوں کے نیچے بچھا دیے جاتے اور علاقے سے باری باری آنے والی عورتیں[1]، صبح تک پنکھوں کی ڈوریاں کھینچا کرتی تھیں۔

موسم سرما

آیا کنوار جاڑے کا دوار

آہا جاڑا ــــ چمپئی شربتی گلابی جاڑا۔ کندن سی دہکتی انگیٹھیوں کا گلزار بچکے پھٹے کی رضائیوں میں لپٹا ہوا دلدار ــــ دل کا سرور آنکھوں کا نور۔ دھندلکے کا راگ جھٹپٹے کا سہاگ ــــ زلیخا کا خواب، یوسف کا شباب ــــ خدیو بربط و چنگ، شاہزادہ رائش و رنگ ــــ روئی ددی کا سبتیا، مسلم کا قرآن، ہندو کی گیتا ــــ اور صبح کو سونے کا جال رات کو چاندی کا تھال ــــ

قصیر النہار طویل اللیل ــــ تنگ آستیں، دراز گیسو ــــ موتی کی آب، پھپتیے کی اداس ــــ رگوں میں چٹکیاں لیتی سردی، جسموں پر انگڑائیاں لیتی سرخی۔ مہکتے لحافوں کی نیند ــــ

---

[1] یہ بات مجھ کو آج تک یاد ہے کہ ایک بار پنکھے پر دھماکوں سے میری آنکھ کھل گئی تھی اور یہ دیکھ کر میرے دل پر سانپ لوٹ گیا تھا کہ ہمارے گھر کی ملازمہ حیدری خانم نوخیز پنکھا جھلنے والی کی پیٹ پر یہ کہہ کر گھونسے مار رہی ہیں کہ مردار بیٹھا پنکھا جھلنے آئی ہے یا پاؤں پسار کر خراٹے لینے کے لئے بوڑھی حیدری خانم کی بے مہری اور نوخیز پاسن کی بے کسی دیکھ میرے دل پر ایسی چوٹ لگی تھی کہ میں سو بھی نہیں سکا تھا اس واقعے کے بہت دن کے بعد، ہمارے گھر کی کسی تقریب میں جب ایک طوائف نے یہ ٹھمری شروع کی ہماری جھمیو دلا دے جاؤ بنیا، دلا دے جاؤ بنیا ہماری جھمیو دلا دے جاؤ بنیا، پنکھا جھلتی رہو، ورنہ ماری جاؤ گی۔ تو اس گدبدی نوخیز پاسن کی پیٹ پر حیدری خانم کے دھما دھم گھونسوں کی یاد نے میرے دل کو رلا دیا تھا کہ پرانی یادیں، ہائے پرانی چوٹیں، دل کو چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا جب چلی سرد ہوا میں نے تجھے یاد کیا!

چٹکتے انگاروں کا ناچ ـــــ شمس دراستیں، قمر جبیں ـ ـ ـ ٹھنڈی تارا، ماتھے چاند، ماہ رو، موہن خو، گبھرو، بچکیلا، چھریرا، چٹکیلا، مدھ بھرا، بانکا، ترنکا، ترچھا، نکیلا، لپیٹا، سیلا، چھبیلا، سجیلا، سانولا سلونا، اور سہانا جاڑا ـ

ہائے وہ چراغاں موم بتیوں، شمعوں، کوں، اور جھاڑوں کی پردہ نشیں، لجاتی اور بامروت ٹھنڈی روشنی ـــــ ایسی روشنی جو اپنی جھکی ہوئی نظروں سے در و دیوار کو تو جگر جگر کر دے مگر کیا مجال کہ نیند بھری آنکھوں میں چبھے ـ ـ ـ

ہائے وہ ماہ پوس کی کالی کالی زلفوں والی یخ بستہ چھلی، انگیٹھیوں کی معمولی مولی جاڑ بھری خاموش لمبی لمبی راتیں ـــــ وہ اونچے اونچے دروں کے بھاری بھاری پردے مسہریوں کے سامنے وہ تختوں کے چوکے، جوکوں پر وہ مخمل کے گدّے اور گاؤ تکیے اور تکیوں پر ٹیک لگائے اور پاؤں پر دوشالے ڈالے وہ گھر کی بڑی بوڑھیاں ـــــ وہ پاس بائیں چاندی کے اونچے اونچے اگالدان رہ رہ کر کھلتے اور بند ہوتے پاندان، اور وہ ڈلی کے کٹنے کی کٹا کٹ آواز یہ دوسرے تخت پر، وہ رضائیاں اوڑھے ہوئے کہانی کہنے والی ـ ان کے پیچھے اونچے اونچے موہاڑوں کی ماماؤں، اصیلیں، اور لونڈیاں باندیاں، پشت پر، اگر دان، بیچوں بیچ انگیٹھی، انگیٹھی میں چٹکتے کوئلوں کی جھنکار اور سنہری آنچ کا ناچ ـ

اور ہائے مواقع و مناظر کے بیان کرتے وقت کہانیاں کہنے والیوں کے وہ بار بار نئے نئے روپوں میں ڈھلتے چہرے، آنکھوں کے بار بار بدلتے اشارے اور حسب حال بڑھتے گھٹتے ابھرتے ڈوبتے لہجوں کے کٹاؤ اور ٹھہراؤ کے ساتھ وہ کہانیوں کا ان الفاظ میں آغاز ـ

کہانی سی جھوٹی کوئی بات نہیں کہانی سی میٹھی کوئی چیز نہیں ـ جھوٹ سچ کہانی بنانے والے کی گردن پر کہانی بنانے والے پر عذاب، سننے والوں کو ثواب آدھی رات ادھر آدھی رات ادھر سوئے سنسار جاگے پاک پروردگار ـــــ ایک تھا بادشاہ ـــــ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ ـ اس بادشاہ کی ایک چاند سی لڑکی تھی ـ سو اللہ کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ وہ شاہزادی ایک دن سہیلیوں کے ساتھ باغ میں ٹہل رہی تھی کہ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

ہر چند اب وہ دن ہیں نہ وہ راتیں لد چکے ہیں وہ زمانے، بیت چکی ہیں وہ گھڑیاں اور موت کی نیند سو چکی ہیں وہ کہانی کہنے والیاں ـــــ اور قبر کی جانب مڑ چکی ہیں، ساری عمر لیکن ان کہانیوں کے بھوتوں کے غل غپاڑے ـ ان کے اندر کے اکھاڑے ـ ان کی پریوں کے غول ان کے گل فاموں کی ٹٹول ـ ان کے ابا بتیاں کے اشارے ان کی ادائیں کے مڑتے ـ ـ ـ

دھارے ان کے طوفان میں پھنسے بجرے، ان کی پہاڑوں کے دُو بڑے ان کے موتی برسانے سویرے، ان کے ہو نکلتے جنگلوں کے اندھیرے۔ اُن کی کے شاہوں کا جاں، ان کی شادادیوں کا میوال، ان کا فراق وہ حال۔ ان کی آہیں اور کراہیں، ان کے گانا اور شاد یانے ہو کیسے دل ہیں ٹوٹے ہوئے شیشوں کے نکیلے ٹکڑوں کے مانند، آج بھی چبھنے اور کھٹکتے رہتے ہیں۔

یا اللہ کیا کروں اے میرے بچپن کی اداسی اینٹھی۔

جن کو لبھا چکی ہیں، ہماری جوانیاں ــــ اب ان میں مجھ کو یاد ہیں کتنی کہانیاں

موسمِ برشگال

روم جھوم، بدرا برسے۔ پی درشن کو جی ترسے

روم جھوم، بدروا برسے

او ہو جھومتی، جھمکتی، جھومتی، جھرجھراتی، جھم جھماتی، جھم جھم برستی جیون دائی جھومتی برسات۔ گھپ اندھیرا اور گھنگھور گھٹائیں چھاؤں میں، گھرتی، گھومتی، گھر میں، گھنورائی، بجلی ہوائیں جتی، گونجتی، گھڑگھڑاتی، گھونگرو والی برکھا۔

آسمان کو گھماتی زمین کو نچاتی، فضا کو جلاتی شمس و قمر کو کپکپاتی، چوپایوں کو کھیتی کو تھپتھپاتی طوفانوں پر طوفان اٹھاتی، زلفیں جھٹکاتی، گجریاں سناتی کھیتیاں لہلہاتی، زمین پگڈنڈیں جھنجھناتی، اور جھرنے کو کمرے سے بجاتی برکھا ابر سیاہ، بیاباں در بیاباں، گلستاں در گلستاں گل جکاں، گوہر فشاں رقصاں پراں، غلطاں، رواں دواں آسماں پا بجولاں زمین کشاں کشاں لگے بال کنا و نعرہ زناں، اور سر سے پاؤں تک دھواں ہی دھواں۔ اف وہ بجلیوں کی کڑک، وہ بدلیوں کی لٹک۔ اور وہ بانکی دھنک۔ وہ مینڈکوں کا شور، پروا کا زور، وہ مست گھٹاس گھنگھور وہ جھینگروں کی جھنکار وہ موروں کی پکار اور نہروں پر وہ مرغابیوں کی قطار اندر قطار ــ وہ شاخ ساروں کی گلنجب، وہ انبیوں کی ٹپاٹپ ــــ وہ امریوں کے جھولتے جھولے، وہ الھڑوں کے گھومتے کولہے ــــ وہ برستے گیت پریت، وہ مچلتی پیت کا ریت وہ بادلوں کے پیچھے وہ نگاروں کے قہقہے ــــ وہ آڑی ترچھی پھولدیں وہ ستاروں کی آہیں، آدین ــــ وہ ہوا کی گھوم وہ بوچھار کی دھوم ــــ وہ متوالی پی ہو، وہ نشیلی کوکو ــــ وہ جگنوؤں کے غول، وہ بارہ ماسوں کے بول ــــ وہ روپ کا

ملہ میری نظم انگیٹھی ملاحظہ فرمائیے جو میرے کسی مجموعہ میں چھپ چکی ہے

تحمل، وہ بیر بہوٹیوں کی ہلچل ـــــــ وہ جل تھل میدان، وہ برنالوں کا ہیجان ۔۔۔ وہ موجوں کی روانی وہ دھرتی پورانی ـــــــ وہ چھاجوں پانی، وہ جھونکوں سے چھیڑ خانی، اور وہ ہائے نہ ملنے ہائے جوانی ۔

اللہ اللہ وہ چلتی گھٹائیں، وہ چڑھتے دریا، وہ گرجتے نالے وہ تھرکتے دلوے، وہ کوئی ترنگیں وہ ابلتی امنگیں وہ چمکتے رنگ ـــــــ اور وہ زبردست دبر شور وہ نگوڑے، اور ایسی گرجتی پروائی کہ دھرتی بولے رام دہائی! جب موسلا دھار پانی برسنے لگتا تھا، میں رسّاں تڑا کر انگنائی میں آجاتا تھا، عورتیں چیختی تھیں کہ ارے نہ بھیگ بخار آجائے گا، میں کسی کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ صحن کے گوشے گوشے میں قلقاریاں مارتا، دھوم مچاتا، اچھلتا کودتا، دندناتا، تالیاں بجا بجا کر پرسوام دھڑا کے سے "

اور، "کوڑی گئی ریت میں، پانی گیا کھیت میں کے نعرے لگاتا پھرا کرتا تھا ۔

جب پانی برس کر کھل جاتا تھا تو باورچی خانے کے برآمدے میں کڑھائیاں چڑھ جاتیں، اور برساتی پکوان، یعنی پوریاں، کچوریاں، اندریاں، پھلکیاں، دہی بڑے پہیاں، چنے کا بھرتہ، اندرسے، گلگلے، چلے دندال مصری اور موتی کے پتے پکنے لگتے تھے ـــــــ اور انگنائی کی، نہائی ہوئی کڑوی کڑوی خوشبو والی نیم کی بھیگی شاخوں میں جھولے ڈال دیئے جاتے اور ہم سب لوٹتی شوخیوں کے ساتھ، جھولنے لگتے تھے ـــــــ اور ایسی لال، پیلی چندریوں والیاں ہم کو، پینگ دے دے کر گانے لگتی تھیں جن میں کچھ شہوبند کلیوں کے مانند کچی، کچھ گدر، اور کچھ ایسی جوالا مکھی کی سی جوانیوں والی ہوتی تھیں کہ اگر بھر پور انگڑائی لے لیں، تو انگیا کے بند ٹوٹ جائیں اور، اور مسک کر پارہ پارہ ہو جائے ۔

ہائے وہ پانی برکھا کے نکیلے کا فرگیت ـــ جو ٹھنڈی ہوا، اور رنگین فضا سے، تیرتے میرے کانوں تک آتے اور میرے طائم سینے میں ایرچ سے مچو جایا کرتے تھے ۔۔۔ اور جب ان بولوں کے کٹاؤ، ان دیکھے منظروں اجنبی کھڑوں میں تبدیل ہو ہو کر، میری نظروں کے سامنے سے بڑی تیزی کے ساتھ گزرنے لگتے تھے، تو حیرت اس بات پر ہوتی تھی کہ یہ ان دیکھے پربت، یہ کھیت، یہ جل تھل میدان، اور یہ اجنبی جگہ جگہ کھڑے کس دیس کے ہیں اور آخر اس وقت مجھ کو یہ رونا کیوں آ رہا ہے ۔

اسی برکھا رت میں ہماری انگنائی کے بیچوں بیچ، ایک روز، آنسوؤں اور ہچکیوں کا ایسا موسلا دھار پانی برسا تھا، کہ ہمارا سارا گھر اس میں ڈوب گیا ۔

سنئے اس کی داستان ۔

ایک دن جب وقت کہ ہم لوگ جھول جھول کر، کجریاں سن رہے تھے، اور باورچی خانے کے برساتی پکوانوں کا نمکین دھواں، نیم کی شاخوں کے نیچے مچل رہا تھا کہ میری کھلائی ہا بنتی کا بنتی نکڑیاں ٹیکتی آئیں، گانے والوں سے کہا، بچیو ذرا ٹھہر جاؤ، آج یہ مچھوس بڑھیا گائے گی، وہ سب کی سب پیچھے سرک سرک کر بیٹھ گئیں۔ بڑی بی نے اپنے سر کی چادر پھینک دی ان کے سفید بال اڑنے لگے اور اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بڑے درد ناک لہجے میں گانا شروع کر دیا۔ گانا نہیں یہ نوحہ شروع کر دیا۔ ہائے مرے بنا برکھا نا سہائے ارے مورے کلکتے کے جو یار اللہ تمہیں لائے، ہائے، اللہ تمہیں لائے۔

اللہ تمہیں لائے، اللہ تمہیں لائے بڑی بی کو گاتے اور روتے دیکھا تو میں جھولے سے کود بڑا ان کے سینے سے جا کر لپٹ گیا، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میرے روتے ہی تمام گانے والی چھوکریاں بھی منھ پر پلو رکھ کر رونے لگیں، گھر کی تمام خواتین، انتہائی سراسیمگی کے ساتھ دوڑ پڑیں، اور پوچھنے لگیں، ارے خدا کے واسطے جلدی بتاؤ کیا ہو گیا ہے۔ بڑی بی کوئی جواب ابھی نہیں دے سکی تھیں کہ رونے کا شور سن کر، میری انتہائی، مغلوب الغضب پھوپی نواب بیگم بھی دوڑی ہوئی وہاں آگئیں اور بے حد غصے کے عالم میں کہنے لگیں بھاڑ میں جائے ایسا سوا گیت

؎ ہائے تمہارے بغیر برکھا بھی نہیں لگتی اے میرے کلکتے جانے والے اللہ تمہیں لائے یہ گیت حضرت جان عالم واجد علی شاہ کی یاد میں کہا گیا تھا۔ اور میرے بچپن میں جب برسات آئی تھی تو، ودھ کی گلی گلی میں، یہ گیت گایا اور دھوم سے ماتم کیا جاتا تھا۔ کیا انسانی تاریخ پیش کر سکتی ہے حضرت جان عالم کا سا کوئی محبوب بادشاہ جس پر یوں صدی تک اس قدر آنسو بہائے گئے ہوں اے جان عالم فرنگی نے آپ کو تباہ بھی کیا، اور بدنام بھی کیا آپ جتنے اچھے تھے، اتنے ہی برے بتا دیئے گئے۔

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

اے میرے فرض شناس، جفاکوش، عدالت پناہ اور فقر منش بادشاہ اے میرے شرافت پنج، سبزود نکتہ رس، علم نواز اور ادب پرست شاعر اور اے میرے صبح کے سپاہی و شہر یار اور اے میرے شالد کے موسیقار فن کار مالک آپ کے سپہ سالار اور گورنر فقیر محمد خاں گویا کا یہ پر پوتا جوش ملیح آبادی آپ کے آستان خالی پر سر رکھتا ہے اس بندہ درگاہ کا ناچیز سلام قبول فرمایئے۔

؎۲ ہائے بڑی بی کی آواز کا درد جب وہ اللہ کہتیں تو اللہ کے لام کی آواز کو بلند نہیں ہونے دیتیں اور ایسے دبے اور درد ناک کھٹکے کے ساتھ اللہ کہتی تھیں، گویا وہ اپنے کلیجے سے بجھا ہوا نیزہ نکال رہی ہیں۔

ارے بڑی بی یہ نہیں دیکھتیں کہ بھلا کس قدر جھکوں ہیکوں رو رہا ہے، اے آگ نہ لگے ایسے گیت کو۔

بڑی بی پر جب یہ ڈانٹ پڑی تو ان کا لتا پتا دل جو بیاسی برس سے مسلسل دھڑک رہا تھا برے طرح زخمی ہو گیا۔ انھوں نے اپنی بیٹھے ہوئے کنوؤں کی سی خون بار آنکھیں اٹھائیں اور کھرا تی آواز میں کہا بنن بی بی میں سر جھکائے دیتی ہوں، اچھا ہو تو مجھ آج نہیں تو کل مری بڑھیا کو جی بھر کے مار لو۔ میں تو آدھی سے زیادہ قبر میں اتر چکی ہوں لیکن بنن بی بی ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں ذرا انصاف سے کام لو، اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ سوچو تو کہ برکھا رت مٹھو برسائے اور ہائے جان عالم پیا کی یاد نہ آئے۔ ہائے قیصر باغ میں برکھا کے جھولے میں خود دیکھے ہوں، میری آنکھوں میں پھر رہی ہیں وہ بہاریں..... ہائے میرے جان عالم پیا۔ موئے فرنگیوں نے گلا گھونٹ کر تم کو مار ڈالا..... ہائے لکھنو کا سہاگ لٹ گیا۔ ہائے قیصر باغ کی بارہ دری اندھیرے میں ڈوب گئی ہائے شاہزادیاں ٹھوکریں کھاتی پھرنے لگیں۔۔۔۔ اتنا کہہ کر بڑی بی نے اپنا آنکھوں پر دوبارہ پلو رکھ لیا اور رو رو کر گانے لگیں ہائے مترے بنا۔ ہائے مترے بنا، برکھا۔ نا سہائے نا سہائے، ارے مورے کلیجے کے جو یا اللہ تمہیں لائے اللہ تمہیں لائے۔

بڑی بی کے اس درد دل نے پورے گھر کو ہلا کر رکھ دیا، سب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے میری ماں نے چیخ ماری، میری غضب ناک پھپھی کی بھی ہچکیاں بندھ گئیں، دادی جان بھی منھ پر آنچل رکھ کر رونے لگیں، اور گانے والیاں پھوکریوں کا تو برا حال ہو گیا، اور گھر کا ذرہ ذرہ چیخنے لگا: ”اللہ تمہیں لائے، ہائے اللہ تمہیں لائے، اللہ تمہیں لائے اللہ تمہیں لائے۔۔۔

ہولی[1]

بادش بخیر، ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ ہولی دوالی فقط ہندوؤں ہی کے نہیں، ہمارے بھی

---

[1] ان کو ہم لوگ آپا اور ماما ئیں وغیرہ بنن بی بی، کہتی تھیں۔

[2] ایک دور وہ بھی تھا کہ ہندو مسلم سرد شکر تھے رام رام اور السلام علیکم نے آداب عرض کا لباس زیب تن کر لیا تھا، کعبہ و کاشی نے ایک دوسرے کی گردن میں باہیں ڈال دی تھیں، گنگا و جمنا کو ملا کر ایک گنگا جمنی عظیم لسانی تہذیبی اور ثقافتی سنگم تعمیر کر دیا گیا تھا، مسلمان، ہندوؤں کے اور ہندو مسلمانوں کے تہوار (صہ ۵۳ پر)

تہوار تھے ہولی کھیلنے کا بہت پہلے سے اہتمام کیا جاتا تھا، ہر سال، نئی پچکاریاں بنوائی جاتی تھیں، بڑی بڑی دیگوں میں رنگ بھرا جاتا تھا اور ایسی پچکاریاں چلتی تھیں کہ ہم سب کے کپڑے شور بور اور گھر کے تمام در و دیوار رنگین ہو جاتے تھے

ہولی کھیلنے کی ابتدا یوں ہوتی تھی کہ ہمارے رعایا میں سے دس بیس اونچے طبقے کے ہندو عورتیں صبح ۹۔ دس بجے، ابیر گلال کے جھل جھل تھال سروں پر اٹھائے، ہمارے گھر میں گاتی ہوئی آتی تھیں۔ میری دادی اور میری ماں کے ماتھوں پر رنگین ٹیکا لگا کر ان دوپٹوں کے پلووں پر رنگ، پھر کہ ہماری انگنائی میں حلقہ باندھ کر وہ ہوری آج چلے، جا ہے کال چلے۔ مورا کنور کنھائی مو سے آن ملے۔ ہوری آج چلے۔ جاہے کال چلے "گانا شروع کیا کرتی تھیں اور اس گانے کی گونج میں ایسی دھوم سے پچکاریاں چلنے لگتی تھیں کہ کسی کو تن بدن کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ اور چراغ میں بجے بڑے ہی ملیح آباد کے تمام ہلیارے پوریاں کچوریاں اور مٹھائیاں سروں پر اٹھائے گاتے بجاتے، ناچتے اور ڈھرک بجاتے، ہمارے مردانے احاطے میں نذر کے واسطے آیا کرتے تھے۔ اور بڑی دیر تک بڑا جھمکس رہا کرتا تھا۔

عام ہلیاروں کے بعد قرب وجوار کے ہندو زمین داروں میں لالہ صاحب مادھو پور کی شخصیت نمایاں تھی، اپنی اپنی رعایا کے ساتھ آتے، ان کا گانا سنواتے، اور مٹھائیوں کے تھال پیش کیا کرتے تھے اور اس کے بعد ہمارے وہاں ان کی دعوت ہوتی تھی، جس میں ایک دو بجے رات تک طوائفوں کا ناچ گانا ہوتا رہتا تھا،

دوالی

دوالی میں معمولی سے زیادہ دھوم دھڑکا ہوا کرتا تھا ـــــ آنگن کے ایک گوشے میں بڑے

سناتے تھے اور دونوں نے انتہائی وسعت قلب کے ساتھ اپنی اپنی زبانوں میں کتر بیونت کر کے ایک ہندوستانی گیر زبان، یعنی اردو کی طرح ڈال دی تھی اور آج یہ عالم ہے کہ ہندو مسلمان جب دوسرے کو دیکھتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے صد حیف فرنگی نے جو ہندو مسلم نفرت کا بودا بویا تھا، ہم آج اس کے پھل کھا کھا کر باگل ہو چکے ہیں اور اس قدر پاگل کہ اب ہم ایک دوسرے سے یہ پوچھ بھی نہیں رہے ہیں کہ:۔

کبھی ہم میں تم میں بھی پیار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد

بڑے رنگین گھروندے بنائے[1] جاتے تھے ۔۔۔ ان بلند و خوبصورت گھروندوں کو شیشوں اور چینی کے ٹکڑوں سے سجایا جاتا تھا ۔ جن میں مرمرے ، چرمرے ، کھٹیاں، گٹے ، اور مٹھائی کے حسین اور باریک حلوے بڑے سلیقے کے ساتھ ہر طرف چن جاتے تھے ۔ شام ہوتے ہی پہلے ان گھروندوں اور پھر پورے مکان میں چراغاں کیا جاتا تھا ۔ اور ہر گوشہ جگمگ جگمگ کرنے لگتا ___ اور عین اس وقت جب کہ چراغاں کی پلکیں، جھپکاتی روشنی میں خالص گھی کے چراغوں کے تعاں دھویں کی خوش بو، ہوا میں ترنے لگتی تھی، عین اس وقت ہمارے بڑے دالان میں ڈھولک پر تھاپ پڑتی اور ڈومنیاں اور مراثنیں گانا شروع کر دیا کرتی تھیں ___ آئی دوالی آئی دوالی مدھو ماتی جوبن والی آئی دوالی، آئی دوالی، آہا، سر پر تھالی، منہ پہ لالی، آئی، دوالی، آئی دوالی ۔ جگمگ، جگمگ، جگمگ کرتی، دیپک والی، آئی دوالی، آئی، آہا ہا ہا، آئی دوالی ۔ اوہو، ہو، ہو، آئی دوالی، ڈھولک دھم ۔ دھم ۔ پائل چھم چھم، بھولی بھالی، آئی دوالی، آہا ہا ہا، آئی دوالی، اوہو، ہوہو، آئی دوالی ۔

ادھر ڈومنیوں کا تال سم، ادھر مٹھائیوں کی چر ندم خور ندم ___ منہ میں مٹھائی کانوں میں گیت زبان و گوش دونوں شیرینی میں غرق ۔

ایک بار جب ادھر ڈومنیاں گا رہی تھیں، اور ادھر میرے دانتوں کے نیچے، مٹھائی کے کھلونے ٹوٹ ٹوٹ کر "کرم کرم" کی آواز پیدا کر رہے تھے تو ایک بات یاد آ کر، مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی تھی، اور وہ بات یہ تھی کہ ایک روز جب بڑی دھوم کے ساتھ پانی، برس رہا تھا، اور بڑے انداز سے پروائی سنک رہی تھی تو میرے ایک ملازم سالک رام ، حضرت امیر مینائی کا یہ شعر لہک لہک کر گا رہے تھے ۔

سب کرشمے تھے جوانی کے، جوانی کیا گئی
وہ امنگیں مٹ گئیں وہ بلبلا جاتا رہا

اس پر میں نے پوچھا تھا کہ سالک رام یہ "بلبلا جاتا رہا" کیا کہہ رہے ہو تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ بھیا جب ہم "بلبلا" کہت ہیں (کہتے ہیں)، تو سینے کے اندر بڑا انجا ادت ہے دمزا[2] آتا ہے ۔

---

[1] ہولی آج کھیلی بالکل جلے اپر وا نہیں ، مگر ، میرا کنور تھا ، مجھ سے آن ملے

[2] گھروندوں کی قبر کا نام ایک ہفتے پیش تر شروع ہو جایا کرتا تھا ۔

سو میرا بھی اس وقت یہی عالم تھا کہ گانا سننے کے ساتھ ساتھ جب مٹھائی کے کھونے میرے منھ میں، ٹوٹ ٹوٹ کر گھل رہے تھے تو مجھ کو اپنے منھ کے اندر بڑا مزا آرہا تھا۔

شب برات

شب برات سے ایک مہینہ پیشتر ہی ملیح آباد کا سب سے بڑا آتش باز جس کو بارود سے ایک ہاتھ اڑ جانے کی بنا پر "ٹنڈا آتش باز" کہا جاتا تھا۔ ہمارے واسطے آتشبازی تیار کرنا شروع کر دیا کرتا تھا۔ اور شب برات سے دو روز قبل ہی تمام آتشبازی ہمارے گھر پہنچ جاتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ مزدور آجاتے کے ایک گوشے میں ایک لمبی چوڑی اور گہری سرنگ کھود کر، وہ اس میں بھر دیتا، اور سرنگ پر ایک قلعہ تعمیر کر دیتا تھا۔ اور شب برات کے دن غروب کے بعد جب تاریکیوں کا دامن دراز اور بوجھل ہو جاتا تھا، نوکروں چاکروں کی کڑی نگرانی میں کوئی حادثہ پیش نہ آجائے ــــــ پھلجھڑیوں گھن چکریوں، گولوں، غباروں، پٹاخوں ہوائیوں ٹوٹوں اور اناروں کی رنگین اور طلسمی جگمگاہٹوں کے ساتھ ساتھ، شائیں شائیں، غائیں غائیں، غوں، غوں سر سر سراہٹ، دھم دھم دھماک، تڑ تڑ تڑاق، اور شر شر شراق سے دور دور تک ایک قیامت خیز ہنگامہ برپا ہو جایا کرتا تھا ــــــ

شروع شروع میں آتش بازی کی روشنی پھیکی پھیکی سی نظر آتی تھی، لیکن جب اندھیرا بہت زیادہ گاڑھا ہو جاتا تھا، آتش بازی کا رنگ نکھر اور ابھر جایا کرتا تھا۔

اس کے بعد کھانا چن دیا جاتا تھا، کھانا وانا کون کھاتا، بس ذرا سا منھ جھٹال کر کے، ہم لوگ نیاز کے حلوے پر ٹوٹ پڑتے تھے۔

رمضان

جہاں تک کہ روزہ رکھنے کا تعلق ہے۔ رمضان ہمارے گھر آتا ہی نہیں تھا لیکن جہاں تک

۱؎ امیر نے تو یوں کہا تھا کہ: "وہ امنگیں منڈلا رہی تھیں، وہ ولولہ جاتا رہا، کو سالک دام "ہلبلا جا بار بار" کہہ رہے تھے۔ ۲؎ آتشبازی اور عقائد میں کس بلا کی مماثلت پائی جاتی ہے جس طرح آتشبازی، روشنی میں زرد زرد اور پھیکی پھیکی نظر آتی ہے اور تاریکی بڑھ جائے تو اس کا جوبن ابھر آتا ہے۔ بالکل اسی طرح عقائد اعلم فکر دانگے صفحہ پر)

کہ انحصار کا تعلق ہے، رمضان ہمارے گھر میں اس دھوم دھام سے آتا تھا کہ اور کہیں آتا ہی نہ ہوگا عقائد کے اعتبار سے میرے آباؤ اجداد اس قدر پکے مسلمان تھے کہ تمام دینی انجمنوں کو جی کھول کر ہر ماہ چندے دیا کرتے، اور اسلام کے نام پر تن، من، دھن قربان کر دینے پر ہر وقت آمادہ رہتے تھے۔

لیکن اعمال کے اعتبار سے، رئیس زیادہ اور مسلمان بہت ہی کم تھے ——— اور اسی وجہ سے روزہ نہ رکھنے کے باوجود، ہمارے گھر میں دس بارہ قسم کی افطاری پکائی جاتی، اور اذان سے پیشتر، مردانے صحن کے تختوں نے چوکوں پر چن دی جاتی تھی اور کم و بیش سو ڈیڑھ سو افراد اور احباب اور ملازمین ، ہمارے یہاں روزہ افطار کیا کرتے تھے۔ اقربا و احباب میں اکثریت ہوتی تھی روزہ خوروں کی البتہ نوّے فی صدی ملازم رکھتے تھے۔ اور افطار کے بعد شاعری کی محفل گرم ہو جایا کرتی تھی۔

ہمارے سپاہیوں اور خدمتگاروں کے افطار کا انداز ساری دنیا سے نرالا تھا ——— ایک بڑی سی چٹائی پر ان کی افطاری چن دی جاتی تھی، اور ان کے سامنے پکھوا کو کے چالیس پچاس ڈیڑھ چلے، مداری حقے رکھ دیئے جاتے تھے اور ان کی پشت پر چھ سات بہشتی، بھری ہوئی، مشکوں کے ساتھ کھڑے کر دیئے جاتے تھے ——— اور جب اذان ہوتی تھی۔ تو وہ افطاری کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے، اور حقوں پر ٹوٹ پڑا کرتے تھے، اور اس قدر کھینچ کھینچ کر وہ کڑ کڑ کڑ کڑ کڑ کڑاک، کڑ کڑ کڑ کڑ کڑاک حقے پیتے تھے کہ بوڑھے تو بوڑھے جوانوں تک کے گالوں میں گڑھے پڑ جایا کرتے تھے، چلموں سے بالشت بالشت بھر کی لویں نکلنے لگتی تھیں۔

بسا اوقات، چلمیں، چھٹ کر دو ٹکڑے ہو جایا کرتی تھیں، ان کے منھ سے جھاگ نکلنے لگتے اور آخر کار وہ بے ہوش ہو کر گر جایا کرتے تھے۔ اور اس عالم میں بہشتی، اپنی اپنی مشکوں کے دہانے کھول کر ان کے منھ پر، پانی چھڑکنے لگتے تھے، میرے باپ رمضان بھر میں، کبھی بیلا اور کبھی سنبھلا روزہ رکھتے تھے ———

میرے لڑکپن میں رمضان گرمیوں میں آیا کرتا تھا۔ اور روزے کے دن میرے باپ سہ پہر تک خس خانے میں سوتے رہتے تھے ——— جس دن ان کا روزہ ہوتا تھا، خدا جانے گھر والوں کو کیا کیا

کی روشنی میں چھبیلے چھبیلے اور مدھم مدھم نظر آتے ہیں اور جس کی ترنگ میں جگمگانے اور موچھوں پر، تاؤ دینے لگتے ہیں۔

یہ صرف رمضان کے مہینے میں ان کو میرے باپ کے سامنے حقہ پینے کی اجازت مل جایا کرتی تھی۔

تلخ تجربے ہو چکے تھے کہ اس دن صبح سے شام تک، تمام گھر پر، ایک دہشت ناک سناٹا چھایا رہتا تھا کسی کے منہ سے بھاپ تک نہیں نکلتی تھی، اشاروں اشاروں میں باتیں ہوا کرتی تھیں۔ اور لونڈیاں باندیاں، نیم کے پیڑ کے پاس سگے لئے کھڑی رہتی تھیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی چڑیا اس کی شاخوں پر بیٹھ کر آواز نکالنے لگے۔

عید

آیا عید ـــ اللہ اللہ رمضان کی انتیسویں، یا تیسویں شام ـــ صبح عید کا پیغام اور رویت ہلال کا اہتمام۔ ایک بلند چبوترے پر گھر کی تمام بیبیاں، چاند دیکھنے کی تمنا میں جمع ہو جاتی تھیں اور چاند نظر آتے ہی، سب کی سب، جھٹ سے آنکھیں بند کر لیتیں، درود پڑھتیں ہاتھ اٹھا اٹھا کر، زیر لب، دعائیں مانگتیں، دعائیں مانگ کر، اپنے اپنے چہروں پر ہاتھ پھیرتیں اور پھر ایک دوسرے کے منہ پر چاند دیکھا کرتی تھیں [1]۔

اس کے بعد "عید مبارک، عید مبارک" کے نعروں سے در و دیوار گونجنے، چوڑیاں کھنکنے، اور چہروں کے رنگ چمکنے لگتے تھے اور مردانے میں گولے چھوٹتے۔ اور بندوقیں چھٹنے لگتی تھیں، اور مرد تلواروں میں اپنا منہ دیکھنے لگتے تھے اور دروازے پر نوبت بجنے اور شہنائی کی آوازیں ہوا پر مچلنے لگتی تھیں۔

---

[1] اس رسم کی پشت پر یہ واہمہ کارفرما تھا کہ چاند دیکھنے کے فوراً بعد جس کے چہرے پر نگاہ اولیں پڑے وہ عورت بھاگوان ہو تا کہ پورا سال خوشی میں گزرے، اور اسوقت اگر کوئی بھاگوان عورت موجود نہیں ہوتی تھی تو کسی ہرے بھرے درخت یا پھول پر نگاہ جمائی جاتی، یا آئینہ ہی میں، خود اپنے منہ پر چاند دیکھ لیا جاتا تھا۔ منحوس عورتوں کی طرح بچوں کے منہ پر بھی اس واہمے کی بنا پر چاند نہیں دیکھا جاتا تھا کہ اگر ایسا کیا گیا تو وہ سال بھر تک ٹھوکریں کھاتے اور گرتے رہیں گے۔ اگر انتیسویں کا چاند نظر نہ آتا تو اس خیال سے عورتیں افسردہ ہو جاتی تھیں کہ نہ ہو چاند کسی بلا میں پھنس گیا ہو اور جب وہ تیسویں کو نظر آتا تھا تو سب کی سب بڑی سریلی آوازوں میں یہ کہنے لگتی تھیں کہ آج کی رات کا چاند حضرت صاحب کے گریبان میں چھپا، آستین میں چھپا گریبان سے نکلا جیسے چاند کی بلا ٹلی ویسے ہی سب کی بلا ٹلے، آمین۔ (چاند دیکھنے کے فوراً بعد کسی رفیق کے چہرے کی طرف نظر اٹھانے کو (کسی کے) منہ پر چاند دیکھنا کہتے ہیں۔

چاند دیکھ چکنے کے بعد، میرے سرہانے کے اسٹول پر سنہری جرمنی ٹوپی، جھکتا ریشمی جوڑا، اور پائینتی کے اسٹول پر ردئی کا ساڈامن کا چمکیلا جوتہ رکھ دیا جاتا تھا۔

عید کی خوشی میں نیند کسے آتی تھی۔ بس ایک ذرا سی جھپکی سی آتی، اور بار بار آنکھ کھل جایا کرتی تھی ـــــ بار بار اپنی سنہری ٹوپی کے ایک ایک پھول کو دیکھتا، جی میں آتا کہ ابھی ٹوپی پہن لوں خیال آتا کہ جھوٹی ٹوپی ہو جائے گی ـــــ جھر تہ کیے جوڑے پر، بڑی آہستگی کے ساتھ بار بار ہاتھ پھیرتا اس کی نرمی کا لمس تمام بدن جھرجھری بن کر دوڑ جاتا۔ پھر جوتے کی نظر پھیلا دینے والی چکنائی پر انگلیاں دوڑاتا اور اس کو سونگھ بھی لیا کرتا

اور جب دھندلکے کا ہیجانی رنگ، فضا پر کروٹیں لے لے کر، میرے خون کی گردش میں شریک ہو جاتا تھا، تو سینے میں نشاط کی گھنٹیاں، ٹن ٹن، ٹن ٹن، بجنے لگتی تھیں اور میں بستر سے جست کر کے، انگنائی میں اس طرح آ جاتا تھا، جیسے اسپرنگ دار گڈا، ڈبیا کا ڈھکن کھلتے ہی ٹن سے کھڑا ہو جاتا ہے۔

ہائے، دل میں وہ صبح عید کی دھومیں، انگنائی میں وہ رنگوں کی گھومیں ـــــ وہ سقف دبام کے قہقہے، وہ زمین آسمان کے چہچہے ـــــ وہ رگ وپے میں خوشی کی سرسراہٹیں، وہ سینے میں کسی اتھرکا سی آہٹیں، وہ لبوں پر بے اختیار مسکراہٹیں ـــــ وہ فواروں کی سی اچھلتی امنگیں، وہ ترنگوں کی غزالان رسیدہ کی سی شلنگیں ـــــ سانس اندر کھینچتا تو جگر تک ٹھنڈک جاتی، اور

۱؎ حضرت اکبر الہ آبادی کے اس شعر سے، ڈامن کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بوٹ، ڈامن نے بنایا، ہم نے اک مضمون لکھا ـــــ ملک میں مضمون نہ پھیلا اور جوتہ چل گیا

۲؎ آپ نے کبھی اس مسئلے پر بھی غور کیا ہے کہ خصوصیت کے ساتھ بچوں کو عید کی خوشی کیوں ہوتی ہے؟ میرا تو یہ ناچیز خیال ہے کہ چونکہ بچے ماں باپ کی زبان سے، تواتر کے ساتھ یہ سنتے رہتے ہیں کہ عید کا دن بڑی خوشی کا دن ہوتا ہے تو اسی حدیث متواتر سے متاثر ہو کر وہ بے سمجھے بوجھے، عید کے دن خوشیاں منانے لگتے ہیں۔ اور یہ بات صرف عید ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ دنیا کی بے شمار باتیں جن کو ہم حقیقت کبریٰ سمجھے بیٹھے ہیں وہ اسی آبائی پروپیگنڈے کے بطن سے پیدا ہوتی ہیں اور ہمارا ایمان بن جایا کرتی ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ انسانوں کی ایک جماعت کثیر ایمان لے آئے ہوئے ہو ان باتوں پر جو کھو پڑی، یعنی فکر پر نہیں فقط کانوں، یعنی اقوال پر مبنی ہوتی ہیں۔ اے جھوٹے جذباتی انسان تیرے یہ کان تیری کھوپڑی پر کب تک حکومت کرتے رہیں گے۔

سانس باہر لاتا تو کڑام دھم، کڑام دھم کی صدا آتی

حمام سے بالیدہ روح، اور بے وزن جسم کے ساتھ، جب نکلتا تھا، تو ایسا محسوس ہونے لگتا تھا کہ میں کسی مثنوی کا شہزادہ گل فام ہوں، جس کو پریاں اڑا کر، پرستان لے آئی ہیں، اور تیتلیوں کے پروں کی کشتی میں بٹھا کر، پنکھڑیوں کے دریا کو سیر کرا رہی ہیں۔

عید گاہ جاتا تو خوشی، ایسی حیرت ناک منزل تک پہنچ جاتی تھی کہ عید گاہ کے ملاؤں کے ترشے لب اور جلاہوں کی بھی داڑھیاں تک اچھی لگتی تھیں۔ عید گاہ سے پلٹتا تو یہ دیکھتا کہ، بڑی سریلی آواز میں، میرے پھاٹک پر نوبت بج رہی ہے، میرے باپ کا دربار جما ہوا ہے، احاطے میں وہ اژدحام ہے کہ تل دھرنے کی جگہ بھی باقی نہیں ہے۔" صحن کے ایک گوشے میں، گوٹے پٹھے کے انگرکھے پہنے اور، سروں پر گول گول مندیلیں رکھے ہوئے پھلب دار ادف بجا بجا کر۔

"برتو این محفل شاہانہ مبارک باشد"

گا رہے ہیں: اور چاندی کے ورق سے ڈھکے ہوئے، سوئیوں، اور شیر خرمے کے تھال حاضرین کے درمیان رکھے ہوئے ہیں، اور خاص دان و عطر دان گردش کر رہے ہیں،

جو میرے کی تمباکو کے، ہاروں میں لپٹے ہوئے حقوں اور عطر خس کی لپٹوں سے تمام احاطہ بھرا ہوا ہے ______ اور سپاہی، برہنہ تلواریں، ہاتھ میں لئے لاسان دے، اور انعام لے رہے ہیں۔

بقرعید

اللہ اکبر۔ چلتی چھریوں، تڑپتے جانوروں، اور بہتے خون میں ڈوبا ہوا یہ تہوار ______

جب موت کے خوف سے لرزتے اور چیختے، بیکس و معصوم بکروں، سمنوں، دنبوں، اور بچھڑوں کو، کان پکڑ پکڑ کر، ایک دوسرے کے سامنے، بڑی سختی کے ساتھ، کھینچا جاتا ہے، اور پھر انہیں چت لٹا کر، ان کی گردنوں پر، انتہائی صارح شقاوت کے ساتھ، اللہ کا نام لے کر چھری چلائی جاتی ہے۔ خون کا فوارہ ان کی گردنوں سے پھوٹ نکلتا ہے۔

ان کی آنکھیں سفید ہو جاتی ہیں، اور پھر وہ اپنے ہی خون میں تڑپ تڑپ کر دم توڑنے لگتے ہیں۔

میں، لڑکپن میں، سوچا کرتا تھا کہ یہ سارا ظلم اللہ میاں کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔

اور پھر بھی وہ ان ظالموں کو کوئی سزا نہیں دے رہے ہیں۔ ایک دن، ڈرتے ڈرتے میں نے اپنے باپ سے پوچھا تھا میاں ہمارے گھر میں، بقر عید کے دن یہ کیا ہونے لگتا ہے؟ ____ میاں نے، آنکھیں نکال کر، ارشاد فرمایا تھا خاموش رہو، یہ اللہ کا حکم ہے۔ اور میں سوچنے لگا تھا کہ میرا اللہ ایسے حکم بھی دیتا ہے۔

ہر چند جہاں تک زبان کے چٹخارے کا تعلق ہے، یہ تہوار بڑا ہی لذیذ ہوتا ہے۔ اور ہم کو، ان کی ماؤں کے سامنے ذبح ہونے والے، حلواؤں کی جوکور، بوٹیوں کا پلاؤ، خوب گلے ہوئے گوشت، سفوف کی حد تک پسے ہوئے، بوٹیوں کے سیخ کباب، اور انگاروں پر بھنی ہوئی رانیں کھلاتا ہے ____ مگر کیا کروں، جب یہ ساری چیزیں دستر خوان پر آتی تھیں، تو زبان کے مزوں کے تصویر پر آنکھوں کی دیکھی لاشوں کا منظر غالب آجاتا تھا۔

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروز عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے، وہی لے ثواب الٹا

محرم

اس کو "تہوار" نہیں ماہ عزا کہنا چاہیئے ____ میرا پورا خاندان سنّی ہے۔ ہر چند میرے پردادا کے زمانے ہی سے ہم لوگوں میں شدید قسم کی تفضیلیت راہ پا چکی ہے لیکن میری دادی کے آنے سے بیشتر ہمارے گھر میں عزاداری کا مطلق رواج نہیں تھا۔ ____ اور یہ میری شیعہ دادی تھیں، جنہوں نے امام باڑہ تعمیر کرا کے ہمارے گھر میں عزاداری کی طرح ڈالی تھی

ہر چند وہ اپنے بچوں کو شیعہ نہیں بنا سکیں، پھر بھی انہوں نے ان کو، اور ان کے ساتھ گھر کی تمام عورتوں کو حسین کا سوگ دار ضرور بنا دیا۔ یہاں تک کہ خود دادا میاں بھی امام باڑہ میں آتے، اور نوحے سن سن کر آنسو بہانے لگتے ____ اور انہوں نے پورے گھر کو اس قدر متاثر کر دیا تھا کہ محرم کا چاند دیکھتے ہی تمام بہو، بیٹیاں اور مامائیں، اصیلیں تک زیور بڑھا دیتیں، پان کھانا ترک کر دیتیں۔

۱؎ الائچی لونگ کتھا چونا اور زردہ ملا کر کھایا جاتا تھا۔

ہمارے امام باڑے میں رات کو نو بجے دادی کی قیادت میں ماتم ہوتا تھا، جس میں میری ماں بہنوں وغیرہ کے علاوہ ملیح آباد کی شیعہ سیدانیاں اور مغلانیاں بھی شریک ہوا کرتی تھیں۔

پہلی محرم کا ماتم اس نوحے سے شروع ہوتا تھا "پھر چاند محرم کا نمودار ہوا ہے، سر پیٹو مومنوں" اور نویں محرم کے ماتم کا آغاز اس نوحے سے شروع ہوتا تھا۔ آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے" اور محرم کی گیارھویں کو ہماری ضریح، تین بجے سہ پہر کو اٹھتی اور اس آخری نوحے پر بڑی پیٹس کا ماتم ہوا کرتا تھا۔ اے مومنو، اٹھاؤ، جنازہ حسین کا

اور جب ماتم و شیون کی گونج میں ہم لوگ ضریح کو باہر نکالتے، اور زنانے کے آخری پھاٹک کے سامنے بچھے ہوئے تخت پر اس کو دیتے تھے، تو لکھنؤ کے ایک مانے ہوئے مرثیہ خواں ضریح کے سامنے، "سر کھول کر" جب خاتمہ بخیر ہوا، فوج شاہ کا" پڑھتے تھے، تو ڈیوڑھی میں، خاک نشیں و برہنہ سر خواتین پر اس قدر رقت طاری ہو جاتی تھی کہ اللہ کی پناہ۔ در و دیوار سے سے رونے کی صدا آتی تھی۔

اس کے بعد، کوئی چار بجے ضریح اٹھتی، اور بازار سے گزرتی ہوئی، رات کے دو یا تین بجے، ڈاک بنگلے کے بالمقابل، میدان میں ٹھنڈی کر دی جاتی تھی۔

ضریح ٹھنڈے کرتے وقت ظہور علی خاں سپاہی کی سرکردگی میں بڑے زور شور سے حسین، حسین، حسین کے دردناک نعروں کے ساتھ سینہ زنی ہوا کرتی تھی، جس میں مقامی و بیرونی، سیکڑوں شیعہ سنی، اور ہندو شریک ہوا کرتے تھے۔

اس گیارھویں محرم کے جلوس میں ایک بار، جو انقلاب انگیز ہنگامہ برپا ہو گیا تھا، وہ بھی سن لیجئے۔

یہ غالباً ۱۹۱۲ء کی بات ہے کہ ہماری ضریح جب بازار کے چوراہے تک پہنچی تو معلوم ہوا کہ مولوی عبدالشکور کے چند گرگے، ضریح کے سامنے "جھنڈا" پڑھنا چاہتے ہیں، اور ہمارے

لے ملیح آباد میں انے گنے چند شیعہ خاندان بھی تھے

لے لکھنؤ کے مرثیہ خواں، چونکہ عشرے کے دن ملیح آباد نہیں آ سکتے تھے، اس لیے ہماری ضریح گیارھویں تاریخ کو اٹھائی جاتی تھی۔

لے اس فعل کو اس بنا پر "جھنڈا" کہا جاتا تھا کہ چار سو جھنڈا گڑا ہے، چار یار باک کا ہے اس کا آغاز ہوتا تھا، اور یہ شوشہ چھوڑا تھا فرنگی نے تاکہ شیعہ سنی لڑتے رہیں۔ حکومت نے ایک طرف تو دہلی کے ایک شیعہ مولوی مقبول حسین کو تبرہ بازی اور دوسری طرف لکھنؤ کے ایک سنی مولوی عبدالشکور کو جھنڈا بازی پر مامور کر دیا تھا، وہ شیعوں کو تبرے پر اکساتے رہے سنیوں کو جھنڈے پر ابھارتے، اور اس غداری کے صلے میں روز

خاندان کے کچھ افراد بھی، ان کی پشت پناہی پر آمادہ ہیں۔ میں بھی لونڈا تھا، یہ سن کر میرا خون کھول گیا، اور میں نے بڑے طنطنے کے ساتھ پکار کر کہا، کس کے منھ میں اتنے دانت ہیں کہ وہ ہماری ضریح کے سامنے جھنڈا ابڑھے۔ اگر ایسا کوئی سورما ہے تو سامنے آئے اور اپنے حمایتوں کو بھی ساتھ لائے۔

میری اس للکار سے چند افراد کے شانوں میں جنبش پیدا ہوگئی، اور غضب کی شکنیں ماتھوں پر ابھر آئیں۔ اور ایک کم رو سا آدمی ایک صاحب کا اشارہ پاکر جھنڈا بڑھنے کو ضریح کے سامنے آگیا۔ میں نے برابر کو اشارہ کیا۔ انھوں نے جھپٹ کر اس کی بکرے کی سی ڈاڑھی پکڑلی، اور اس کے کالے سے منھ پر، تڑاق سے ایک طمانچہ رسید کر دیا۔

اس کے حمایتوں میں کھلبلی مچ گئی۔ اور شور برپا ہو گیا کہ ہم ایسے برداشت نہیں کر سکتے کہ اتنے میں عالمگیر چچا، جن کی دور دور تک دھاک بیٹھی ہوئی تھی، مجمع کو چیرتے ہوئے ضریح کے سامنے آگئے انہوں نے اپنے ڈنڈے کو زمین پر کھٹکھٹا کر کہا آپ لوگ لڑکوں سے جھگڑا کر رہے ہیں۔ بشیر احمد خاں (میرے باپ) کے پاس جائیے، ضریح ان کی ہے، وہ اگر اجازت دے دیں تو جھنڈا بڑھیے لوگوں نے چچا کی بات مان لی، اور سیدھے میرے باپ کے پاس چلے گئے۔

تھوڑی دیر میں میرے باپ نے سپاہی بھیج کر جب مجھے طلب فرمایا، تو میں ضریح کے ارد گرد کے سپاہیوں کو یہ حکم دے کر جب تک میں نہ آؤں ضریح یہاں سے جنبش نہ کرے اور کسی کو جھنڈا بڑھنے کی اجازت نہ دی جائے، اپنے باپ کی جناب میں سر جھکائے پہنچ گیا۔

انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کیا تم نے جھنڈا روک دیا ہے، میں نے کہا، جی ہاں میاں انھوں نے فرمایا، "کیوں" میں نے جواب میں عرض کیا کہ میاں، پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے اسکول کے ہم جماعت شیعہ لڑکے میرے بلانے سے یہاں شریک ہونے آئے ہیں، اگر ان کے منھ پر جھنڈا بڑھا گیا تو ان بھائیوں کی دل شکنی ہو گی، اور دوسری بات یہ ہے کہ دادی جان شیعہ ہیں جب وہ سنیں گی کہ ان کی ضریح کے سامنے جھنڈا بازی ہوئی ہے، تو ان کے دل کو دھکا لگے گا۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ میاں یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ امام حسینؑ کی شہادت سے جھنڈے بازی کا تعلق کیا ہے۔ جنازے ـــــــ کے ساتھ رونا ـــــــ

گھر بیٹھے وظیفے کھاتے تھے۔ فرنگی فقط ہندوؤں اور مسلمانوں ہی کو نہیں لڑاتا تھا بلکہ ہندوؤں کو ہندوؤں اور مسلمانوں کو مسلمانوں سے بھی ٹکراتا تھا، ادھر آریہ سماجوں اور سناتن دھرمیوں، ادھر سنیوں اور شیعوں کو ایک دوسرے کی خون ریزی پر للکارا کرتا تھا۔ اے فرنگی کار روائیوں اور دین، اپنے ہی دام کھوٹے پر رکھنے والے کر گیا دشمن یہ مان لیا کہ وہ لڑواتا تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ ہم لڑتے کیوں تھے۔

پیٹنا ہوتا ہے، یا لوگوں کی تعریف کے جھنڈے بڑھائے جاتے ہیں۔

میاں نے سیدھے ہو کر ان لوگوں کے چہروں کی جانب نگاہ اٹھائی، جو میری شکایت لے کر آئے تھے۔ اور مجھے مخاطب کر کے ارشاد فرمایا شبیر، تم معقول بات کہہ رہے ہو فرما کر میاں اٹھ کھڑے ہوئے ان کے اٹھتے ہی تمام حاضرین اور سپاہی کھڑے ہو گئے اور کمرے سے نکلتے ہوئے ارشاد فرمایا میں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں اور یہ دیکھنا ہے کہ وہ ایسا کون سا شخص ہے جو تمہارے ساتھ جھنڈے بڑھانے کی جسارت کر سکے۔

اس کے بعد کس کی مجال تھی کہ میرے باپ کے سامنے جھنڈا بڑھتا ______ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جھنڈا تو بڑھا نہیں جا سکا، لیکن رافضیت جھنڈے پر چڑھ گئی ______ اور پیش خیمہ بن گئی میرے تنسیخ نکاح کے مقدمے کا جس کا ذکر آئے گا۔

لکھنؤ کا پہلا سفر

لکھنؤ جانے کے واسطے جب ہم سب ملیح آباد اسٹیشن پہنچے ریلوے کے عملے میں ہلچل مچ گئی۔ اسٹیشن ماسٹر دوڑا آیا، میرے باپ کو، جھک کر سلام کیا، ویٹنگ روم نہیں تھا، پلیٹ فارم پر کرسیاں، بنچیں، اور اسٹول رکھ دیئے گئے۔ اور ہم سب حسب مرتبہ ان پر بیٹھ کر ریل کا انتظار کرنے لگے۔

گاڑی کا انتظار، الامان والحفیظ۔ ایک ایک دقیقے میں، لاکھوں صدیوں کا فتان اعصاب پیمارہ رہ کر، اینٹھن سی ہو رہی تھی۔ کوئی میٹھے ڈال رہا تھا کلیجے کو جدھر سے گاڑی آنے والی تھی، ادھر گھبرا گھبرا کر دیکھتا، بار بار مشیر احمد خاں سے پوچھتا اب گاڑی کب آئے گی، اور وہ ہر بار مسکرا کر جواب دیتے کہ بس اب آ ہی رہی ہے۔ میں ابھی دیکھ رہا تھا کہ ریلوے کے ایک بنگالی ملازم نے ٹن، ٹن، ٹن، گھنٹی بجا کر نعرہ مارا کہ "رحیم آباد سے گاڑی چھوڑا"۔

میں نے مشیر خاں سے پوچھا یہ "گاڑی چھوڑا" کیا کہہ رہا ہے، انہوں نے ہنس کر کہا یہ آدمی بنگالی ہے، بنگالی اس طرح بولتے ہیں — میں نے دریافت کیا، اب گاڑی میں کتنی دیر ہے انہوں نے کہا بس پانچ منٹ کی دیر ہے۔ میرا دل، بلیوں اچھلنے لگا۔

تھوڑی دیر میں دیکھا کہ گاڑی، گڑ گڑاتی اور دھواں اڑاتی گھڑ گھڑ، گھڑ گھڑ چلی آ رہی ہے مجھے اس کے دھوئیں میں گلستاں سے ناچتے نظر آنے لگے — اور جب وہ پلیٹ فارم سے دھن دھن، دھڑا، دھڑ دھڑا دھڑ کرتی گزرنے لگی، تو پلیٹ فارم تھرانے لگا، پلیٹ فارم

۱؎ میرے باپ کے ہم سفر تھے، مشیر احمد خاں رامپوری، عبدالغفور خاں، صفدر حسین خاں، نبی احمد خاں محمد مقیم خاں داروغہ، شیخ امید علی، سپاہیوں میں محمد مشیر خاں۔ صالح محمد خاں، مرزا ایوب بیگ ابو خاں، بجو خاں، دو تین خدمتگار اور ایک باورچی۔

۲؎ پرانے لوگ ریل کے وقت سے آدھ گھنٹے پیشتر ہی اسٹیشن آ جایا کرتے تھے۔

۳؎ ملیح آباد اور سندیلے کے درمیان، کوئی چار میل کے فاصلے پر ایک سگنل اسٹیشن ہے۔

کی طمطراق سے میرے خون میں دوڑنے لگی، اور گرد کے ذرے اچھلنے کودنے لگے، اور میرا دل نعرہ زنوں سے دھڑکنے لگا۔

جب ہم سب اطمینان کے ساتھ بیٹھ گئے گارڈ نے جھنڈی ہلائی، اس کی جھنڈی دیکھ کر میری امنگیں کہروا ناچنے لگیں۔ جھنڈی ہلا کر، گارڈ نے سیٹی بجائی۔ ہائے کیا سریلی سیٹی تھی اسکے جواب میں انجن نے سیٹی دی۔ چوں چوں کے ساتھ، پہیوں کو حرکت ہوئی، اور گاڑی، بڑے ٹھسے کے ساتھ چلنے لگی چھک چھک، چھک، چھک ـــــ اور دل سے آواز آنے لگی بھک بھک بھک، بھک، ـــــ اور جب گاڑی کی رفتار میں تیزی آگئی تو ہوا کے ٹھنڈے جھونکے میرے چہرے سے یوں ٹکرانے لگے کہ میرے دل میں ایک انوکھا سرور سرسرانے لگا، اور جب رفتار اور بھی تیز ہو گئی، تو پٹری کے کھمبے اور آموں کے باغ گھومنے جھومنے اور ناچنے لگے اور پٹری کے نیچے کی نالی، اس قدر تیزی کے ساتھ دوڑنے لگی گویا ریل سے ریس کر رہی ہے ـــــ یہ سماں دیکھ کر، میرے دل پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی، میں زیر لب گنگنانے لگا چھک۔ چھک۔ چھک۔ چھک گانے دو۔ گانے دو۔ گانے دو۔، چھک، چھک چھک چھک جانے دو، جانے دو چھکی جانے دو۔ آہاہا گانے دو، او ہو، او ہو جانے دو۔

اور جب گاڑی کا کوری کے پل سے گرڈام گرڈام، گرڈام کرتی گزرنے لگی تو میرے دانتوں کے نیچے دوانی کی مٹھائی کے کھلونے ٹوٹنے لگے کرم کرم کرم ـــــ ملیح آباد اور لکھنؤ کے مابین فاصلہ ہی کیا ہے، لے دے کر صرف تیرہ میل اور اسی قرب کی بناء پر ہماری گاڑی سیکڑوں کھڑی ہوئی گاڑیوں کی قطاروں کے درمیان سے گھوم گھوم شائیں شائیں کرتی، اور صدہا لائن بدلنے والی، انقلابی پٹریوں کو پیچ و تاب دیتی، پیچ پیچ جھجکاتی، اور کٹ کٹا کٹ، کاٹتی اور تراشتی ہوئی کوئی تیس منٹ کے اندر ہی چار باغ (لکھنؤ جنکشن) پہنچ گئی۔

الاماں والحفیظ ـــــ چار باغ کی طوفان بدوش و قیامت در آغوش ہلچل، گھما گھمی دھکا پیل، افراتفری، نفسی نفسی، چیخ پکار، گاؤں گاں، الالاہٹیں، گڑگڑاہٹیں، ریل پیل ہٹائیں شائیں، غائیں غائیں، دھڑام دھڑام اور دھوم دھوم، ڈھائیں، ڈھائیں

ـــــ پھر اس پر دوڑتے قلیوں کی جگہ خراش، گڑگڑاہٹیں، قلیوں کی قلی قلا کے نعروں کے ساتھ کنگوری جیبیں، بدحواس، مسافروں کے اتراتے، خوانچے والوں کا شور و غوغا، ٹکٹ چیکروں، پولیس والوں، ریلوے افسروں، بوجھ اٹھائے قلیوں اور بچوں کو کاندھوں پر بٹھائے۔ بدحواس مسافروں کے مابین دھکم دھکا۔ شنٹنگ کے دھماکے ہزاروں سیٹیوں کی ـــــ ـــــ

لہ وہ میرے آغاز شاعری کا لمحہ اولیں تھا۔

آوازیں دھوئیں کے پکے گچھوں میں گھسے ہوئے تر بتر برنڈوں اور جلتے ہوئے تیل کی بد بو، فرنگیوں کے چھوکرے غرور میں ڈوبے ہوئے روکھے پھیکے، چنگیزی چہرے اور میموں کی سایہ شاخ گل میں بنی ہوئی، چھلاسی کمریں ـــــ میں تو دیوانہ ہو گیا بیٹ فادم پر قدم دیکھتے ہی فرنگیوں کی اکڑ فوں دیکھتا تھا، تو میری ٹھنوڑی کی زبان پر موٹی سی گالی آجاتی تھی، اور میموں کی طرف نگاہ اٹھاتا تھا، تو میرے منہ سے شاعر کے منہ سے "ہائے جانی" نکل جاتا تھا۔

اور جب اسٹیشن کا شور و غل، جو اس پر دباؤ ڈالتا تھا، تو میموں کی کمریں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتیں، اور دہشت میرا احاطہ کر لیتی تھی۔ اور میرا عالم "کہ یاراں فراموش کردند عشق" کا سا ہو کر رہ جاتا تھا۔ میں ابھی اس بے غیر انگلش شور و غوغا اور اس حرارت شکن بھیڑ بھاڑ میں بگڑا ہوا کھڑا تھا کہ شیر احمد خاں نے دوڑ کر میری انگلی پکڑ لی ـــــ اور ہمارا قافلہ اپنے سپاہیوں کے سنگین حلقے میں، باہر جانے کے واسطے رینگنے لگا۔ ابھی ہم چند قدم ہی چلے تھے کہ ـــــ کہ حامد علی خاں، بیرسٹر دوڑ کر میرے باپ سے ہم آغوش ہو گئے۔ اتنے میں ایک نہایت چمکیلے سائن بورڈ نے میری آنکھوں میں زنجیر ڈال دی، میں نے نظر جما کر اسے دیکھنے لگا، باپ سے کہا میاں ہم کو یہ بوتل لے دیجئے۔ میاں انگریزی نہیں جانتے تھے، انہوں نے حامد علی خاں سے پوچھا یہ کس چیز کا اشتہار ہے، انہوں نے زور سے قہقہہ مار کر کہا، ہونہار برواکے چکنے چکنے پات مبارک ہو خاں صاحب کہ صاحبزادے بفضل خدا، ابھی سے شراب کی بوتل مانگ رہے ہیں۔

الغرض بصد ہزار دشواری، ہم باہر آئے، ہم لوگ متعدد گھوڑا گاڑیوں اور ملازمین اکوں میں، اپنی جائے قیام کی جانب روانہ ہو گئے۔ میاں کی گاڑی میں شیر احمد خاں تھے۔ اور میں، میاں سامنے کی سیٹ پر اور ہم دونوں کو شجاعان کے طرف کے سیٹ پر بیٹھ گئے، میاں کا بھرا حقہ ان کے سامنے، اور پانی کا کٹورے سے ڈھکا ہوا لوٹا، پیچھے رکھ ـــــ دیا گیا۔

چلم کی آگ سے مجھے تکلیف پہنچ رہی تھی، مگر لکھنؤ آنے کی خوشی کی اس قدر فراوانی کہ مجھ کو اس تکلیف میں بھی مزا آرہا تھا۔ اور جب سڑک کے نشیب و فراز سے لوٹے پر ڈھکا ہوا کٹورا کھن اٹھتا تھا، تو میرے دل میں گھنگھرو سے بجنے لگتے تھے۔

لہ تعجب نہ فرمائیں قاری صاحب کہ بہ سن اور ہائے جانی کا دلولہ جی ہاں خاکسار باوجود عاشق
ستھرا مرد ہے کے باشندے ہونے کے باوجود ایک مخلص انسان تھے۔

جب ہماری گاڑی عیش باغ کے موڑ سے گزرنے لگی تو، سامنے کے ایک بہت بڑے تالاب کو دیکھ کر میں پوچھا، میاں اگر ہم اس میں کود پڑیں، تو کیا ڈوب جائیں گے؟ یہ سنتا تھا کہ ان کے چہرے کا رنگ، ہلدی کا سا ہوگیا، اور فرمایا بیٹا بدشگونی کی بات کبھی زبان پر نہ لانا چاہیئے، اللہ تمہاری عمر دراز کرے اب ہماری گاڑی اکبری دروازے کے سامنے جاکر کھڑی ہوگئی۔ اور ہمارا اسامان بانس والی سرائے میں جانے لگا۔ اور ارباب لکھنؤ ہمارے افغانی خط وخال، ہمارے قد وقامت، ہمارے سپاہیوں کی سج دھج، ان کے بڑے بڑے پگڑ، ان کے موٹے موٹے لٹھ، دیکھنے کے لئے ٹھٹ لگاکر، ہمارے گرد وپیش جمع ہوگئے۔

میں نے اکبری دروازے میں جیسے ہی قدم رکھا تو یہ دیکھا کہ اس چوڑے چکلے دروازے کے داہنے بائیں، لکڑی کے تختوں پر مٹی کے اس قدر اجل حسین، سبک اور نازک کھلونے اوپر تلے رکھے ہوئے ہیں کہ بایدوشاید ـــــ انہیں دیکھ کر یہ خیال ہونے لگا کہ قریب جاؤں گا تو ہر کھلونا بکیں ـــــ

لے اور کیوں نہ مانگتا۔ مجھے دیکھ کر، کہتی تھی میری دایا یہ لڑکا قدح خوار پیدا ہوا ہے۔ ہائے کمبخت حافظ نے کیا خوب کہا ہے۔

دوش دیدم کہ ملایک، در مےخانہ زدند   گل آدم بسرشتند وبپیمانہ زدند

سے اس بدشگونی کے باعث میرے سر سے صدقہ اتار اگیا تھا کہ میاں کاش آپ کی دعا قبول نہ ہوتی اور میں جوانی ہی میں رخصت ہوجاتا۔ آپ خوش قسمت تھے کہ آپ کو جوانی میں موت آگئی میں بدنصیب ہوں کہ بوڑھا ہوکر بے شمار روح فرسا یادوں کا ڈسا ہوا، اور زندگی کے تپتے ریگستان میں پڑا ایک مدت سے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں اور میری ناقدر شناس قوم، میرے احاطہ وجود کے گرد، اصحاب فیل کے مانند گھیرا ڈالے پڑی ہوئی ہے۔ لیکن اے قوت حیات کے مالک، میرے اصحاب فیل کو حملہ ابابیل سے محفوظ رکھنا کہ یہ سراسر جہل ہیں سے وہ چوک کے ایک دروازے کا نام

شے وہ سرائے، جو اب ڈھا دی چکی ہے لکھنؤ کی درجہ اول کی پختہ اور صاف ستھری سرائے تھی جس کے تین بالائی کمروں کو میرے باپ نے مستقل کرایہ کے بدلے ریزرو کر لیا، اور وہاں ایک چوکیدار کو مامور فرمادیا تھا اس وقت تک لکھنؤ میں "برلنگٹن اور امپیریل ہوٹل" کے سوا اور کوئی ہوٹل تھا ہی نہیں اور چونکہ وہ دونوں ہوٹل بدنام تھے کہ وہاں شراب پی جاتی، اور سور کی چربی کا کھانا کھایا جاتا ہے اس بنا پر قرب وجوار کے تمام شرفا کی طرح میرے باپ بھی ان ہوٹلوں کی طرف کبھی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔

جھپکانے اور باتیں کرنے لگے گا، اور گجریا لجاؤ بتانے لگے گی۔ اور سقوں کو اگر ذرا سا بھی چھویا تو ان کی بھری مشکوں سے ڈھل ڈھل پانی بہنے لگے گا۔

کھلونے خرید کر، جب میں نے چوک میں قدم رکھا، عود، اگر اور لوبان کی لپٹوں نے میرا استقبال کیا۔ آگے بڑھا تو سونے چاندی کے ورق کوٹنے کی، بنی ٹنی کھٹا کھٹ نے میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔ وہ مرتب و منظم کھٹا کھٹ ایسی معلوم ہوتی، گویا طبلے پر بول کٹ رہے ہیں پھر ہار والے کی سریلی آواز آئی" ہار ـــــ بیلے کے، پھول، چمپا کے۔ وہاں سے آگے بڑھا تو کیا بتاؤں کیا کیا دیکھا۔ ہائے تنبولیوں کی وہ جھلملاتی ترچھی کلاہیں، وہ دبلی ٹوپیاں، وہ شربتی انگرکھے وہ گھٹنے گھٹنے پٹے ـــــ وہ چوڑی دار پاجامے شانوں پر وہ ریشمی بڑے بڑے رومال ـــــ آڑی ترچھی مانگیں۔ کلوں میں دبی ہوئی معطر گلوریاں۔ ساقیوں اور ساقنوں کے ہاتھوں میں وہ خوش بودار تمباکو کے حقے، حقوں پر وہ لپٹے ہار، ہاروں سے پانی کے قطروں کا وہ ترشح وہ بجتے کٹورے، وہ سارنگیوں کی تھرتھراہٹ کے ہولوں میں ہلکورے، وہ ٹھمکتے ہوئے طبلے بالاخانوں کے چھجوں سے، وہ مکھڑوں کی برستی ہوئی چاندنی اور زلفوں کے سیاہ آبشار ـــ کوٹھے والیوں میں کوئی گوری، کوئی چمپئی، کوئی سانولی سلونی ـــــ خد و خال اس قدر باریک گویا ہیرے کے قلم سے ترشے ہوئے۔ کوئی چمپئی، کوئی سانولی سلونی کوئی نوجوان، اور کوئی ان دونوں کے درمیان، گویا، مہکتی ہوئی اٹھان، کوئی گٹھے جسم کی اور کوئی دھان پان ـــ کسی کی ناک میں نتھ، کسی کی ناک میں نیم کا تنکا ـــــ تماشائیوں کا ہجوم، شانے سے شانے چھلتے رہیلے، اور کوٹھوں پر نظر جمائے ہوئے مخالف سمتوں سے آنے جانے والوں کے سینوں کا ٹکراؤ اور ٹکراؤ پر وہ دست بستہ عذر خواہیاں میں ابھی اس دریائے طلسم میں غوطے کھا رہا تھا کہ مشیر خاں نے میرا ہاتھ پکڑ کر، اپنی طرف کھینچا میں ساحل پر آگیا۔

سارا طلسم ٹوٹ گیا اور میں سب کے ساتھ میاں کے پیچھے پیچھے، سر جھکا کر سرائے آگیا۔ سرائے میں قدم رکھتے ہی دم سا گھٹنے لگا میں نے بڑی لجاجت کے ساتھ کہا، میاں ـــ ہم سپاہیوں کو ساتھ لے کر پیچھے گھوم آئیں" مشیر خاں مسکرائے اور میاں نے بڑی خوف آمیز سنجیدگی سے کہا چوک، بچوں کے ٹہلنے کی جگہ نہیں ہے میں کلیجہ

لہ اب نہ وہ قدردان ہیں نہ وہ کاریگر اور نہ وہ کھلونے۔ لٹ گئی ساری بہار

مسوس کر رہ گیا۔

اتنے میں صاحب محمد خاں، دھوتھے کو ساتھ لئے آ گئے۔ اس نے جست کی بڑی بڑی تقلیوں کو دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں بڑے ماہرانہ انداز سے گھما گھما کر اور بالائی کے کاغذی آبخوروں کو مٹی کی سوندھی سوندھی رکابیوں میں کھول کھول کر پیش کیا۔ اور مٹی کے کورے کورے پنچے بھی سامنے رکھ دیئے۔ کیا بتاؤں ان قلفیوں اور ان آبخوروں کی لذت و لطافت نہ بان نے اس سے پیشتر کبھی کوئی ایسی چیز چکھی ہی نہیں تھی، ان کے مزے کو بیان کروں تو کیونکر، اور تشبیہ دوں تو کس چیز سے ــــ اور لطافت کا تو یہ عالم تھا کہ ان کو صرف ہونٹوں اور تالو سے گھلایا اور نظر کی حرارت سے پگھلایا جا سکتا تھا۔ رات ہوتے ہی، ہمارے باورچی کے بکائے ہوئے کھانوں کے ساتھ ساتھ ــــ عبداللہ کی دکان کی پوریاں کچوریاں، احمد کی باقر خانیاں، سعادت کی شیرمالیں، شیراتی کے اٹھارہ اٹھارہ پرتوں کے پراٹھے، چھمن رکاب دار کے بھنے ہوئے مرغ، شاید کا پہیڑوں کا پلاؤ، حیدر حسین خاں کے پھاٹک کی گلی کا اناس کا مزعفر، غلام حسین کے پل کباب، کپتان کے کنوئیں کی بیج لیتے بادام کی مٹھائی، اور حسین آباد کی بالائی، اور نہ جانے اور کیا نعمتیں، ہمارے دستر خوان پر چن دی گئیں ــــ اور ہم کھا پی کر سو رہے۔

لکھو دھرشن کی چاٹ تو بڑی ہی چکی تھی۔ میں سب سے پہلے بیدار ہو کر بالاخانے کی چھت پر چڑھ گیا۔ صبح کا استقبال کرنے کو جیسے آسمان کی طرف نظر اٹھائی، شہر کی اونچی اونچی عمارتوں کے باعث طلوع کی رنگینی دور ــ دور بھی نظر نہیں آئی۔ آنکھیں مرجھا گئیں۔

مڑ کر دیکھا تو مرغ پھٹ رہی ہے اور مرغ بھی بانگ دے رہے ہیں۔ لیکن پو پھٹنے میں سہانا پن ہے اور نہ مرغوں کی بانگ میں توانائی ــــ زمین سے آسمان تک ایک ٹھیکا پن چھایا ہوا ہے اور سانس لیتا ہوں تو دھانس بھری، موٹی موٹی ہوا سینے کو کھرچ، اور دل پر بوجھ ڈال رہی ہے نسیم صبح چل رہی ہے مگر اس کے جھونکے میں بالکل دھاری نہیں ہے عروس قدرت کے پاؤں میں نہ چاندی کے گھنگھرو ہیں نہ سر پہ چھپکا۔ میرے دولہے ایسی بھی ملگجی، کھوئی کھوئی پھیکی پھیکی، اپلی اپلی سٹپٹی سٹپٹی اوندھی اوندھی، گونگی گونگی، جھنجی جھلنجی، اور میری بھی صبح کو دیکھ کر گم ہو گئے اور دھواں دینے لگے ــــ اور میں اس نامراد عاشق کی طرح جس کا معشوق اس کو دغا دے کر غائب ہو گیا ہو، بھاری دل کے ساتھ ــــ

---

* لکھنؤ کا سب سے بہتر قلفی والا جو لفٹیننٹ گورنر کی پارٹیوں میں بلایا جاتا تھا۔

نیچے آیا اور منہ ہاتھ دھونے لگا۔ منہ پر بار بار چھینٹے مارے دل کی کلی نہیں کھلی۔

اتنے میں ناشتہ آگیا۔ روغنی روٹی، انڈوں کے سالن سے، بالائی، شیرمال اور بسکٹ کا ناشتہ کرکے فارغ ہوا تو میرے صاحب نے دو سپاہیوں اور مسٹر خان کو ساتھ کر کے مجھے لکھنؤ کی سیر کے لئے روانہ کر دیا۔

میں لکھنؤ کے ہفتہ عشرے کے قیام میں مندرجہ ذیل مقامات دیکھے۔ حسین آباد کی شاہی کوٹھی، اس کا کلاک ٹاور[1]، حسین آباد کا امام باڑہ، اس کی بھول بھلیاں، آصف الدولہ کا امام باڑہ، رومی دروازہ، حضرت عباس کی درگاہ، نجف اشرف، تال کٹورے اور کھول کٹورے کی کربلائیں، سبطین آباد، عجائب خانہ، شاہ پیر محمد کے ٹیلے کی مسجد، شاہ مینا کا مزار اور موتی محل، حضرت گنج، چینی بازار، امین آباد[2]، گومتی، ٹھنڈی سڑک، لوہے کا پل، لال باغ، سکندر باغ، ہنومان باغ، دلکشا باغ اور بنارسی باغ، اور چھتر منزل[3] کا فقط وہ حصہ جو سڑکوں سے نظر آتا ہے۔ ہر چند میری لڑکپن کی نگاہوں میں یہ تمام مقامات بڑے عجیب تھے ـــــ لیکن ان تمام عجیب مقامات سے بڑھ کر عجیب تو نظر آئے لکھنؤ کے وہ روشن علماء اور با شرفا اور شعراء جو میرے صاحب کے پاس آتے یا وہ ان کے وہاں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اللہ اللہ وہ ان کے جھک جھک کے سلام، وہ ان کی نشست و برخاست کے پاکیزہ انداز، وہ ان کی تہذیب میں ڈوبی وضع قطع، وہ ان کے لباس کی انوکھی تراش خراش، وہ مسائل علمی و ادبی کی توضیح کے ہنگام، ان کے الفاظ کا اتار چڑھاؤ، وہ ان کے لہجوں کے رکھ رکھاؤ، اثنائے غزل خوانی میں، وہ حسب مفہوم شعر ان کی آنکھوں کا رنگ، اور ان کے چہروں کا اتار چڑھاؤ، وہ قہقہوں سے دامن کشی، ان کا ہلکا ہلکا تبسم، وہ ان کا انکسار کے سانچے میں ڈھلا ہوا وقار، اور باوجود کمال وہ ان کا ہاتھ جوڑ جوڑ کر اپنی ہیچ مدانی کا اعتراف یہ ساری باتیں دیکھ کر میں نقش بدیوار ہو کر رہ گیا ـــــ وہ تمام لوگ اس قدر شائستہ، شستہ اور گداختہ تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کرہ خاک کے نہیں کسی کرہ نور کے باشندے ہیں۔

۱؎ وہ کلاک جس پر ملکہ صاحبہ نے بندوق لگائی تھی اور ۱۸۵۷ء میں سپاہ نے اسکو گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔

۲؎ اس وقت امین آباد کا پارک معرض وجود میں نہیں آیا تھا

۳؎ ہندوستانیوں کو وہاں داخلے کی اجازت نہ تھی۔

انھیں بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کرکے میں نے شائستگی سیکھی، ادب اور زبان شناسی نظر پیدا کی اور یہ ذراسی شد بد جو آج مجھے ادب و زبان پر حاصل ہے، یہ انھیں کی صحبت کا اثر ہے۔

اب وہ لکھنؤ ہے نہ لکھنؤ والے ——— ایک ایک کرکے چلے گئے سب خاک کے نیچے، کھا گئی مٹی ان کے جوہروں کو ——— بہت دن ہوئے میں نے ایک رباعی کہی تھی۔

جلتی ہوئی شمعوں کو بجھانے والے | جیتا نہیں چھوڑیں گے زمانے والے
لاش دہلی پہ لکھنؤ نے یہ کہا | اب ہم بھی ہیں کچھ روز میں آنے والے

سو، جو میں نے کہا تھا وہی ہو گیا، گزشتہ سال جب لکھنؤ گیا تو لکھنؤ کی اداسی دیکھ کر دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگیں ——— آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر طرف دیکھا۔ کوئی جانی پہنچانی صورت نظر نہیں آئی۔ اور ان کی جگہ پر دیکھا کہ ناتراشیدہ کندوں کے سے کھردرے، اور بکونے چہروں کے وحشی افراد بار بار اپنے الجھے ہوئے بال کھجاتے اور دائیں بائیں تھوکتے چلے جارہے ہیں ——— نہ وہ شاندار فٹنیں ہیں، نہ عمدہ قسم کی بند گھوڑا گاڑیاں، نہ اعلیٰ درجے کے تانگے ———
لے دے کر چند گھٹیا قسم کے اکے اور بے رنگ و روغن کے چوں چوں کرتے تانگے ہیں، جن میں گھوڑوں کے عوض چوہے جتے ہوئے ہیں اور چند کھڑکھڑ کرتی کارکشائیں ہیں، جن کو نہ جانے کس زمین کے ہوش لونڈے چلا رہے ہیں۔ اور وہ تمام اس قدر ذلیل ہیں کہ ان پر اگر سکندر اعظم تک کو بٹھا دیا جائے، تو وہ بھی کسی دیہاتی رنڈی کے بھڑوے نظر آنے لگے۔

سہ پہر تک نخاس[1] گیا۔ نخاس کی وہ سڑک جو لکھنوی تہذیب کا گہوارہ تھی، اداس اداس نظر آئی، حکیم صاحب عالم کے مطب کے بارہ دری کی طرف نگاہ اٹھائی، جیسے دل پر کسی نے گھونسا مار دیا ایک ایک کرکے وہ تمام یاران جشن آنکھوں سے گزرنے لگے ——— جنھوں نے وہاں میرے ساتھ راتیں جگائیں اور دھومیں مچائی تھیں ——— اور دیکھا کہ یگانہ چنگیزی، حکیم صاحب عالم، مجاز، حکیم محمود اور عطا حسین قزلباش، کفنی اوڑھے زینے سے اترتے چلے آرہے ہیں۔ آنکھوں میں آنسو آگئے، آنسو پونچھتا، ہانپتا، سرائے کی جانب مڑا ——— پرانی یادیں سر پٹخنے لگیں اور جب اسی نئی سڑک سے گزر کر جو سرائے منہدم کرکے اس کی قبر پر بنائی گئی ہے چوک میں قدم رکھا تو کلیجہ تھام کر رہ گیا۔

---

[1] حقیقی لکھنؤ نخاس تک ہے، امین آباد اور حضرت گنج والوں کو بیرونی سمجھا جاتا ہے۔

کوتاہ اندیش مسلمان اخلاق کے اجاڑے ہوئے چوک نے آنسو بھر کر مجھے سلام کیا ہائے وہ چوک جو شبستان رنگ و بو تھا اب بھائیں بھائیں کر رہا ہے جن کمروں میں پریاں رہتی تھی کالے دیووں کو وہاں آباد کر دیا ہے۔ جو فضا رسا رے گا ما کے جھولوں میں جھولا کرتی تھی، اب اس پر "اے بائی (اے بھائی) جلندھر سنگھا۔ اور "اپے ہاپج (حافظ گھڑائی) بکس (خدا بخش) کے نعروں کو سوار کر دیا گیا ہے۔ ہائے جن چھجوں پر زلفیں لہرایا کرتی تھیں، وہاں داڑھے جھٹکارے جا رہے ہیں، جہاں طبلے کھنکتے تھے وہاں خارشیے کتے بھونک رہے ہیں جہاں چاندنی رہا کرتی تھی وہاں دھوپ بسا دی گئی ہے۔

ایک جملہ معترضہ :۔

اس کج اندیشی میں ہر طرف ایک شور برپا ہے کہ نکال دو شہر سے طوائفیں مسمار کر ڈالو مے خانوں کو اور اجاڑ کر رکھ دو شبستانوں کو ــــــــــ اور یہ فتنہ اٹھایا ہوا ہے مہاتما گاندھی کا، بے شک گاندھی جی میں بے شمار خوبیاں تھیں، وہ ہندوستان کے عظیم محسن اور سب سے بڑے دوست تھے ــــــــ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ انسانی شادمانی کے بدترین دشمن تھے۔

انہوں نے جب بازار حسن و خرابات مغاں کے خلاف غیر عاقلانہ آواز اٹھائی، اور انسانی مسرت کا گلا گھونٹ دینے کی مجرمانہ تحریک چلائی تو لنگر لنگوٹ باندھ باندھ کر دوڑ پڑے۔

ان کی آواز پر وہ تمام گزندگان اخلاق، مخنثین کرام جو قطعی طور پر توفیق گناہ سے یکسر محروم تھے اور جن کے دلوں میں اس بات کی لگن لگی ہوئی تھی کہ وہ "ضا لحین" کا روپ بھر کر گاندھی جی کو رجھائیں، جاہل عوام کے ووٹ اڑائیں، اقتدار کی گدیوں پر براجمان ہو جائیں، اور دولت کے دریا میں غوطے لگائیں۔

"نیک نفس" مہاتما اور ان کے ہوس پرور چیلوں کی سمجھ میں یہ بات مطلق نہیں آئی،

کہ مسرت کی تمنا اور حسن کی آرزو، نوع انسانی کی جبلت میں داخل ہے اور فطرت نے، تولید و تناسل کا سلسلہ قائم رکھنے کے واسطے انسان کی جوانی کو مست و سرشار ہنے اور بوس و کنار کی موجوں میں بہنے پر اس استحکام کے ساتھ مامور و مجبور کر دیا ہے کہ اگر تمام قوائے کائنات خم ٹھونک کر اس کے سامنے آ جائیں تو وہ لنگر ڈی مار کر انہیں چاروں خانے ۔ ۔ ۔

چپ گرداتا ہوا، آگے بڑھ جائے۔

نوعِ انسانی کے اس جبلی میلان، مسکرات و مستوجات کے ہوشلتے ہوئے طوفانی دریا پر بند باندھنے کے ارادے سے، اس دنیا میں کتنے اولیا اور اوصیا، اقطاب ابدال، امام اوتار اور انبیاء، کتنے معلم، مجدد، مفسر، مجتہد، متقنن، مبلغ، محتسب، مصلح اور ملا اور کتنے پادری، پاپا، پوپ، پروہت، پنڈت، پانڈے، یوگی، پیر اور پیغامبر ــــ ازل سے لیکر آج تک آچکے ہیں۔ لیکن تاریخ انسانی شہادت دے رہی ہے کہ جس نے بھی انسان کے اس بے پایاں تند و شدید ولولے سے ٹکر لی ہے، خود اس کا ماتھا لہولہان ہوکر رہ گیا ہے۔ آسمان کی ڈاٹ کے نیچے یہ آواز بڑے طنطنے کے ساتھ آج بھی گونج رہی ہے کہ:۔

ہاں سلسلۂ جام و سبو جاری ہے — اب تک وہی شغل ہاؤ ہو جاری ہے
کھائی ہے یہ انسان سے ٹکر ایسی — ادیان کے ماتھے سے لہو جاری ہے

اور تمام مصلحین کرام کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انسان آج بھی یہ نعرہ لگا رہا ہے کہ مرا، مہر سیہ چشماں، ز سر، بیروں نہ خواہد شد — قضائے آسمان است ایں، دگرگوں نہ خواہد شد اور کیوں نہ ہار ہو جب کہ حامیانِ ادیان سے لے کر، مسجد کے نابینا حافظ جی تک بفضلہ، اس "چوں بخلوت می روند" کے کاروبار میں، ازل کے دن سے آج تک مشغول ہیں ــــ تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس جذبے کو بے لگام چھوڑ دیا جائے، یا اس پر چند قیود عائد کر دیئے جائیں۔ چونکہ آدمی ابھی تک، حیوانی سطح سے فقط ایک بالشت بلند ہوا ہے، اس لئے ہم اپنے کو اس امر پر مجبور پاتے ہیں کہ جب تک نوعِ انسانی بالغ نہ ہو جائے، اس جذبے پر چند قیود ضرور عائد کر دیئے جائیں، لیکن وہ اس قدر سخت نہ ہوں کہ آدمی بلبلا اٹھے۔

---

[1] ہر چند اسلام نے زانی کے واسطے سنگسار ہی کی سی انتہائی سزا مقرر کر دی ہے، لیکن اس ناقابلِ برداشت جنسی ہیجان کے ساتھ بڑی حکیمانہ رعایت اور بڑی شریفانہ مروت سے بھی کام لیا ہے۔ یعنی دیگر جرائم کا انحصار صرف دو گواہوں پر کیا گیا ہے، لیکن اس معاملے میں چار گواہوں کی شرط لگا دی ہے۔ پچاس فیصدی رعایت تو پہلے ہی قدم پر کر دی گئی ہے، اور مجرم کو اشتباہ کا فائدہ پہنچانے کی خاطر اس پچاس فی صد رعایت کے حدود کو وسیع کر کے یہ شرط بھی عائد کر دی کہ اگر گواہ یہ کہیں کہ انہوں نے مرد کو اوپر اور عورت کو نیچے دیکھا تو اس شہادت سے زنا ثابت نہیں ہو سکے گا، اور اس سے بھی آگے بڑھ کر ــــــ

وہ قیود اور ان کے حدود دسرودست کیا ہوں، اور آگے چل کر ان کو کس رفتار کے ساتھ کام کیا جائے۔ اس سلسلے میں اگر چند بنیادی حقائق زبان پر لے آؤں تو ہر طرف کھڑبڑی مچنے لگے اور میں، دیکھتے ہی دیکھتے نکو بن کر رہ جاؤں۔

میں، جس ماحول میں زندہ رہنے کا ارتکاب کر رہا ہوں اور جہاں حقائق سے دامن بچانے اور حقائق سے آنکھیں چرانے ہی میں، ایمان کی خیر سمجھی جاتی ہے اور نجات کے خواب دیکھتے جاتے ہیں۔ میرے معاشرے کو آج تک یہ علم ہی نہیں ہے کہ ہمارے مرغوبات و مکروہات اور ہمارے ذہنی تعصبات، فکری ہیں کہ سماجی نیز جس ماحول کو اس بات کی بھی خبر نہ ہو کہ پاکی و ناپاکی گناہگاری و اطاعت شعاری، جواز و عدم جواز اور حرام و حلال کی وقت تو از زندہ اصطلاحیں اصطلاحات نے وضع کی ہیں یا مشہورات نے؛ یا مردوں کی پاکیزگی و پارسائی کے ضوابط، عورتوں کی عصمت و عفت کے قواعد، جنسی تعلقات کی حد بندی اور رسم و رواج کا رواج قدرت کا عطیہ ہے یا ہم لوگوں کا ایجاد ہے؟ ایسے ماحول میں چہرۂ حقائق سے پردہ اٹھانے والے کو نکو بن کر رہ جانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے اس لئے اب میرے واسطے صرف یہی ایک صورت رہ گئی ہے کہ اصول گفتنی کو ناگفتنی کے زمرے میں لے آؤں اور بس

افسوس اے شمار سخن ہائے گفتنی   خوف فساد خلق سے ناگفتہ رہ گئے

پر نگاہ کر کے ہیں، اپنے دور کی ذہنی سطح پر آجاؤں، سب کی ہاں میں ہاں ملاؤں اور کچھ بتاں و کوئے مغاں، دونوں کو بداخلاق کام کر کے ٹھہراؤں

بہت اچھا، تسلیم کر لیا میں نے ان دونوں اور اداروں کو بداخلاق کام کر، لیکن دیکھنا یہ ہے

اگر وہ یہ شہادت بھی دیں گے کہ ہم نے مرد کی کمر کے متواتر حرکات کو بھی دیکھا تھا پھر بھی زنا ثابت نہیں ہوگا۔ البتہ اگر وہ شہادت دیں گے کہ ہم نے یہ دیکھا تھا کہ مرد و زن کے مابین سلائی اور سرمہ دانی کا سا معاملہ ہو رہا تھا تب جا کر زنا ثابت ہوگا۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کریں گے ایک ایسے مزاج کا زانی، جو ایک کو نہیں چار چار آدمیوں کو اپنی طرف آتا دیکھے اور اس کے باوجود وہ عورت سے فورا جدا ہونے کے بدلے اس سے چمٹا رہے گا ——— اور اس کے ساتھ ساتھ، اپنے جسمانی حرکات کی وساطت سے اسکا بھی موقع دے کہ چاروں گواہ فریقین کی ہم بستگی کا تفصیلی منظر کر کے اپنی آنکھوں سے؛ یہ دیکھ لیں کہ ایک کی سلائی دوسرے کی سرمہ دانی میں آجاتی ہے کیا دانشمند ہی کہا جائے گا؟ اور کیا اس کے یہ معنی نہیں کہ سنگساری کی سزا زنا نہیں حماقت کی سزا ہے۔

کہ یہ ادارے جو اتنے ہی قدیم ہیں، جتنی کہ انسانی تمدن کی تاریخ ___ معرض وجود میں آئے ہیں
آسودگی تمنا کی بازی گاہ دنیا میں، ان اداروں کو جنہیں (تیج بستر پیران فرتوت)، مادرزاد
پرشکستہ جوانان صالح اور گرگان باراں دیدہ سیاسی افراد بد اخلاقی کے اڈے کہہ کہہ کر اپنا جی
خوش کرتے ہیں، معرض وجود میں لایا ہے، نوع انسانی کا پیدائشی ذوق مسکرات و مستورات،
کیونکہ اس مسئلے پر غور کرتا ہوں تو پتا چل جاتا ہے کہ اس مطالبہ درسہ اور تمنا داور یہ ہیجانی
ذوق انگیختہ کیا ہوا ہے اس ناقابل مقابلہ تند اور شدید حیوانی جبلت کا، جو انسان کو اکسا
کر وجود میں لاتی اور اس کی نسل بڑھاتی ہے، اور جس کی ناقابل فتح شدت کا یہ عالم ہے کہ
تاریخ تمدن سے لے کر آج تک ہزاروں ارضی و سماوی طاقتوں کے دانت کھٹے کر کے اور
کسی مادی یا روحانی طاقت کو اپنی پشت پر کاٹھی رکھنے کی اجازت دے کر، مونچھوں پر
تاؤ دے رہا ہے۔

اور جب نگاہ کرتا ہوں اس جذبہ گرم کی صلابت و حرارت پر تو دیکھ کر ہنسی آتی
ہے کہ آج کل ڈسٹرکٹ بورڈوں، میونسپلٹیوں اور کارپوریشنوں کے ان ووٹوں کی بھیک پر
جینے والے بونے اور اچھے ارکان پر جو اس خیال خام میں مبتلا ہیں کہ وہ ان "بد اخلاقی"
کے اداروں کو بند فرما دیں گے۔ یعنی، ڈھال تلوار باندھ کر، نام خدا، شیر کا شکار کرنے
گھروں سے نکل پڑتے ہیں۔

پرانے زمانے کو چھوڑیئے، اس دور میں بھی، پاک و ہند کے بڑے بڑے
شہروں میں طوائفوں کے اڈوں کو ڈھایا اور ان کے خانوں کے   میں قفل لگایا
جا چکا ہے پھر بھی طوائفیں معدوم اور ان کے خوار مفقود نہیں ہو سکے ہیں کوچہ
خوباں و کوئے مغاں کو ایک محلے سے نکال کر دوسرے محلے میں آباد کرنا بالکل اسی
نوعیت ---

لہ لوگ مسکرات کو شراب وغیرہ سے مختص کئے گئے ہیں حالانکہ سکر کے دائرے میں دنیا کی ہر وہ چیز
داخل ہے جو خون میں ہیجان اور دل میں نشاط کا طوفان برپا کرتی ہے۔ بچے کو پیار کرنا، چاندنی سے
لطف اٹھانا، پھول سونگھنا، پیٹ بھر کر کھانا کھانا، حسینوں کو آغوش میں لینا، یاروں کی
صحبت میں بیٹھنا، کھیل کھیلنا، عبادت کرنا، وظیفہ پڑھنا، گانا سننا، تماشے دیکھنا، صحائف پڑھ کر جھومنا
اور رو دینا۔ یہ بھی سکر ہی کی شاخیں ہیں اس کے یہ معنی ہیں کہ ذوق سکر ہمارے وجود کا احاطہ کئے ہوئے
ہے اور سکر کے بغیر درد رسیدہ انسان کا زندہ رہنا امکان سے باہر ہے۔

کی حماقت ہے کہ کسی کے پھوڑے کو گھٹنے پر منتقل فرما کر، اس بات کا یقین کر لیا جائے
کہ پھوڑا باقی نہیں رہا ہے۔

اس لئے دانش مندی اور انسانی فلاح اسی میں نظر آتی ہے کہ جہانتک
بازار حسن کا تعلق ہے۔ ماہر و سن رسیدہ ڈاکٹروں کے ہفتہ وار معائنے کی وساطت
سے اس ادارے کی تہذیب و تطہیر کا سائنٹفک بندوبست کر دیا جائے۔
اور ایسے ضابطے وضع کئے جائیں کہ صحت عامہ اور صحت جسمانی میں کوئی خلل نہ
پڑنے پائے۔

اب رہا مسکرات کا مسئلہ، سو حکومت کا یہ فرض ہے کہ اعلیٰ قسم کی ،
اور پختہ۔ لیکن سستی شراب کشید کرنے کے واسطے بھٹیاں قائم ۔ اور ایسے افراد
کے نام اجازت نامے جاری کر دے جو صحت جسمانی، سلامتی عقل،
اور شرافت نفس کی بناء پر بادہ خواری کی اہلیت رکھتے
ہیں۔

اگر اس برسوں کے سوچے سمجھے مشورے پر عمل نہیں کیا گیا تو یاد
رکھیئے اور کان کھول کر سن لیجئے کہ ایک طرف تو انسانی فطرت بغاوت پر کمر باندھ لے
گی ، گھر گھر بھٹیاں قائم ہو جا
ئیں ،اور اناڑیوں کے ہاتھ کی کھینچی ہوئی کچی شراب یعنی اسپرٹ پی پی کر لوگ جرائم پر
اتر آئیں گے اور دھڑا دھڑ مرنے لگیں گے۔

اور دوسری طرف جو طوائفوں کے اڈے بند کر دیئے جائیں گے تو ان کے
پاؤں کی زنجیر کھل جائیگی اور وہ اڈے شہر کا رخ کر کے گلی گلی میں پھیل جائیں گے
شہر کا ہر مکان بازار حسن میں تبدیل ہو کر رہ جائیگا۔ اور شہر کی ہر شریف زادی
خانگی کا روپ بھر کر طوائف سے بھی دو قدم آگے نکل جائیگی۔ اور عصمت فروشی کا
پانی اس قدر ٹوٹ ٹوٹ کر برسیگا کہ کالجوں کے احاطوں اور گھروں کی انگنائیوں
میں گھٹنوں گھٹنوں پانی کھڑا ہو جائیگا۔

فرنگی سے نفرت

ایک روز میں لکھنؤ کے نخاس والے مکان کی بالائی منزل کے برآمدے میں اپنی کھلائی ''بڑی بی'' کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ سڑک سے دفعتہً تڑاق تڑاق کی آوازیں آئیں۔ بڑی بی نے جھک کر دیکھا اور زار زار رونے لگیں۔ میں نے پوچھا —— "بیٹھے بٹھائے رونے کیوں لگیں بڑی بی" —— انہوں نے روتے ہوئے کہا "بیٹا! موا گاڑی والا گھوڑے کو چابک سے مار رہا ہے تڑاق تڑاق —— ہائے جان عالم پیا کے زمانے میں ان گھوڑوں کو رئیسوں کی آبرو سمجھا جاتا تھا، ان کو دودھ جلیبی اور ملائی کھلائی جاتی تھی، جب سے ان بندر فرنگیوں کا راج ہوا ہے، ان غازی مردوں کو چابکوں سے مارا جانے لگا ہے —— بیٹا یہ غازی مرد کس قطار شمار میں ہیں، ان بندروں کا جب سے دور دورہ ہوا ہے بڑے بڑے شریف زادے گلیوں میں جوتیاں چٹخاتے پھرنے لگے ہیں۔ انہوں نے کہتے کہتے اپنے بڑھاپے کے کھوکھلے سینے پہ ہاتھ مار کر کہا "ہائے ہمارے جان عالم پیا اب کبھی نہیں پلٹیں گے" بڑی بی کی یہ بات سن کر میرا جی بلبلا گیا اور فرنگی سے نفرت ہو گئی۔ اور وہی عالم لڑکپن کی نفرت آگے چل کر میری سیاسی نظموں کے روپ میں شعلہ افشانی کرنے لگی۔

میرے سو بچوں کے کونڈے[1] الحفیظ والاماں —— ہائے جوانی کا دہ

[1] میرے اودھ میں یہ رسم جاری تھی کہ جب لڑکوں کی مسیں بھیگنے لگتی تھیں تو ٹلی کے کونڈے کونڈوں میں چوتی "دار جلیبیاں بھر کر حضرت یوسف کی نیاز دلائی جاتی تھی۔

پیرانہ سر خواتین میں اس کی وہ معصومانہ مان دان ـــــ وہ ہر طرف سے
قربان ـــــ وہ رنگوں کے بیچ کھلتے سینکڑوں نشان ـــــ وہ کل یوم صواف الشان، وہ
چمکتی زمین، جھلملاتا آسمان ـــــ وہ مشک، وہ زعفران ـــــ وہ عود، وہ لوبان ـــــ وہ
ریحان، وہ رُمان، وہ عطر، پھول دان ـــــ وہ امنگوں کی پور پور کی کھلتی چٹخان ـــــ وہ
ترنگوں کے رگ رگ میں کٹتے دھان ـــــ وہ جھولتی گلیاں، وہ جھومتے میدان ـــــ وہ
امر بیلوں کی گھریاں، وہ برکھا کے بچان ـــــ وہ "پی ہو"، "کوکو"، سے دلوں کے شگوفوں کی
دکان ۔ وہ گھپ راتیں، وہ گل اوسان وہ گوکل بن کے جھٹپٹے، وہ بانسری کے سریلے بان
وہ رادھا جی کی مسکان ـــــ وہ ہالوں کا بازار، وہ گھنگھروں کی دکان ـــــ گاہے ـــ
لہو لہان ـــــ وہ کاہ پر قدم، کہکشاں بر گریبان ـــــ وہ عشوؤں کے گرداب
وہ عربدوں کے طوفان ـــــ وہ نرالے بانکے انوکھے بچان ـــــ وہ جھوٹے وعدے،
سچے پیماں ـــــ وہ پہاڑوں کی قول، پلکوں کی میزان ـــــ وہ کانٹوں کے حصار پھولوں
کے ایوان ـــــ وہ شیشوں کے در، وہ پتھر کے دربان ـــــ وہ ادھر سے سوال ہے
کوئی امکان ـــــ وہ ادھر سے جواب، الاباالسلطان ـــــ وہ تواتر خطا و نسیان ـــــ وہ
مسلسل عدوان ـــــ وہ سلسلہ انتقام بالاحسان ـــــ وہ قلزم حسن و عشق کا طغیان،
بینھما برزخ لا یبغیان ـــــ وہ بیباکیاں طرار، وہ کنواریاں نادان ـــــ وہ تیجوں
کی مرکیاں وہ لوگوں کی تیجان ـــــ وہ چھپڑیوں کے ڈوروں کی گویا زبان ـــــ وہ حوران
مقصورات فی الخیام کی شرمیلی آن بان ـــــ وہ صراحی دار گردنوں کے ڈوروں کی لچک
میں، ارجن کمان ـــــ وہ بوجھل پپوٹے وہ پنڈوں کے پھبان ـــــ وہ یخرج
منھما اللؤلؤ والمرجان ـــــ وہ چاہوں باہوں کا مرج البحرین یلتقیان ـــــ
وہ رات من ورنگ کے بوستان، وہ فیھما عینان تجریان وہ ہر اطوار حور، وہ ہر ادا امرد غلمان
ـــــ کافر زلفوں کی چھاؤں میں وہ مکھڑے کے قرآن ـــــ اور کانوں میں رہ رہ کر وہ
نغمہ فبای الاء ربکما تکذبان۔

اب ذرا میری موچھوں کے کونڈوں کا دھوم دھڑکا بھی دیکھ لیجئے ـــــ ادھر زنانے
مکان کے چوڑے چوڑے دروں اور اونچی اونچی محرابوں کے طویل و عریض دالان ـــــ میں
چاندنی کا فرش بچھا ہوا ہے، دیوار گیریاں، اکے اور گیس کے ہنڈے
جل رہے ہیں ـــــ
خواتین گاؤ تکیوں پر ٹیک لگائے بیٹھی ہیں ادھر ادھر فرشی اگالدان اور بڑے بڑے

چاندی کے پاندان رکھے ہوئے ہیں اور ان کے بالمقابل ڈومنیاں، ڈھاریں، سردونیاں اور میراثینیں نقل کر رہی ہیں اور نقلوں کے بعد ڈھولک پر گانا ہو رہا ہے اور گانے والیوں کو بیل دی جا رہی ہے۔

ادھر مردانے صحن میں دل بادل شامیانہ لگا ہوا ہے ــــــ شامیانے کے گرد نوکر چاکر وغیرہ پرے جمائے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف گیس کے بڑے ہنڈے سنسنا رہے ہیں مشعلچی مشعلیں اٹھائے ہمہ تن انتظار بنے بیچ بیچ میں کھڑے ہوئے ہیں ــــــ شامیانے کے نیچے شرکائے جشن، اونچے اونچے گاؤ تکیوں پر کہنیاں ٹیکے بڑے وقار کے ساتھ قالینوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور وہ دیکھئے، اپنے کاشمیریوں کے طائفے کے ساتھ پندرہ سولہ برس کا خوبرو اور شریں حرکات علی جان جس کے حسین چہرے کی شکر پر ہلکا سا نمک چھڑکا ہوا ہے۔ چلا آ رہا ہے، بڑی لٹک کے ساتھ، چھم چھم چھم چھم کرتا ہوا شامیانے میں قدم رکھتے ہی اس نے بڑے لوچ کے ساتھ فرشی سلام کیا ارباب محفل کو ــــــ سلام کرنے میں اس کی کلائی اس قدر لچکی کہ ڈر لگنے لگا کہیں ٹوٹ نہ جائے اور مظہر کا مصرع ؏

آہ مظہر ختم سلام کیے

یاد آ گیا ــــــ سلام کر کے وہ اپنے سازندوں کے آگے ایسے دل فریب گھاؤ سے بیٹھ گیا

میں جمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا

کی طرح سازندے اپنے اپنے ساز ملانے لگے۔ سازوں کا ملایا جانا ایک صبر آزما عمل ہوتا ہے یعنی ے

لہ اس انعام کو "بیل" کہتے ہیں جو شادی میں بالخصوص اور دیگر تقریبات میں بالعموم گانے والیوں کو دیا جاتا ہے اور اسکا قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی خاتون ان کو انعام دیتی تھی تو ڈھولک بجانے والی اسکے عطا کردہ روپیوں کو ڈھولک کے حاشیہ پر تین بار کھٹکھٹاتی، اور اس خاتون کے شوہر کا نام لے کر باآواز بلند کہتی "فلاں خاں صاحب کی بیل (یعنی اگر انعام دینے والی کے شوہر کا نام نواب احمد خاں ہوتا تھا تو ڈومنی پکار کر کہتی تھی"

نواب احمد خاں کی بیل"

سلہ یہ عجیب اتفاق تھا کہ جان علی حجام نے میرا ختنہ اور علی جان کاشمیری نے میرے ختنے کے جشن میں مجرا کیا۔

جان علی نے خون بہایا اور علی جان نے رنگینیوں کے دریا بہا دیئے۔

ہر چند سریلے نغموں سے جذبات جگائے جاتے ہیں
اس وقت کی تلخی یاد کرو جب ساز ملائے جاتے ہیں

لیکن کاشمیریوں (بھانڈوں) نے اپنی اچھل کود، اپنے قو، اد، او کے نعروں اور اپنی اپیٹ میں ڈال ڈال دینے والی نقلوں سے اس تلخی کو ڈھانپ لیا۔ اور اس قدر ہنسایا کہ لوگ لوٹنے لگے ـــــ اور جب ساز مل گئے اور ہنسی کے ڈونگرے رک گئے ـــــ تو علی جان پھر ہری نے کریوں کھڑا ہو گیا بھاؤ بتانے، جیسے پہلی کرن پھوٹتے ہی دریا سانس لے کر مچلنے لگتا ہے پل بھر میں، اچھی طرح ملے ہوئے ساز بجنے لگے، سارنگی کی روں روں ـــــ جوڑی کی دوں دوں اور مجیرے کی کھن کھن کھن کی ہنی تلی اور گھلی ملی آوازوں کے پر فسوں دائرے میں علی جان نے بھاؤ بتانے کے واسطے جب اپنے لچکیلے ہاتھ یعنی جھبوا اٹھائے، اپنے پھر ہرے جسم کی کشتی کھیلنے کے لئے تو کاشمیریوں نے اسے حلقے میں لے لیا۔ اور بڑی سریلی آواز میں کہنے لگے "ادھر دیکھو خوش وقتی، ادھر دیکھو خوش وقتی ـــ اللہ نے یہ دن دکھایا کہ خاں صاحب بہادر کی ڈیوڑھی پر علی جان کا طائفہ آیا ـــــ وہ محفل ویران، جہاں بھانڈ یہ نہ باشد اس پر بڑا قہقہہ پڑا۔

اس کے بعد سازوں کی منظم گونج میں علی جان کاشمیریوں کا حلقہ توڑ کر یوں اپنا چہرہ سامنے لایا۔ گویا کالی بدلی کو پھاڑ کر چاند نکل آیا ـــــ سامنے آتے ہی، اس پھلادے نے فرش پر یوں چھم سے پاؤں مارا کہ ابل پڑا زمین سے رقص کا فوارہ ـــ اور دائیں بائیں کھڑے ہوئے کاشمیریوں نے اس کے رقص کے ہر سم پر تالیاں بجا بجا کر کہنا شروع کر دیا "تاتاتاتا ٹھتئی ٹھتئی ٹھتئی ٹھتئی ـــــ اے تاتا تاتا ٹھتئی ـ

اور جب اس کے ناچ میں تیزی آئی تو کاشمیریوں نے آہاہاہا ـــــ اے بڑھ کے اے بڑھ کے بیٹیا بڑھ کے ـ ماں بڑھ کے بیٹا بڑھ کے ٹھتئی ٹھتئی ٹھتئی ٹھتئی، تاتار کے نعرے لگانا شروع کر دیئے اور بھاؤ بتانے اور ناچنے کے بعد جب اس نے، بن پانی کا چلا، جارے بجرا[1] گانا شروع کر دیا تو ایسا معلوم ہوا کہ وہ ایک بجرا ہے اور فرش پر ہچکولے کھا کھا کر بہتا چلا جا رہا ہے ـ ـ ـ ـ ـ

اور ساز اس کے بولوں سے اس قدر دست و گریباں اور ہم آہنگ ہیں گویا موتی کی اڑتی ہوئی سوئیوں میں جھلملاتے ـ ـ ـ ـ ـ

---

[1] اے بے پانی کے بجرے چلا جا چلتا رہ ۔

مقیش کے ڈورے پر دیے جا رہے ہیں ۔

علی جان کے دل نشیں مجرے کے بعد، شامیانے پر ایک سناٹا، ایک کھنکھناتا سناٹا چھا گیا ـــــ اس کے بعد چار طوائفیں، تابڑ توڑ آئیں، لیکن ان کے مجرے کا رنگ جما ہی نہیں ـــــ اور ایسا لگا جیسے حافظ شیرازی کے کلام کے بعد ذوق کی غزل پڑھی جا رہی ہے ـ یا شراب کے بعد خالی سوڈا پیا جا رہا ہے، یا لیلیٰ کی محمل کے بغیر بلبلاتا اونٹ، شتر غمزے کرتا پھر رہا ہے نجد کے میدان میں

خدا خدا کر کے اب پچھلے پہر، کوئی چودہ برس کی پانچویں طوائف آئی مجرے کے واسطے العظمۃ للہ، اس کا چمپئی مکھڑا، گویا، سرِ کوہسار آغاز بہار کی صبح طالع ہو رہی ہے ـ اور اس کے شربتی رخساروں کی سرخ و کاغذی جلد کے نیچے سے یوں صباحت پھوٹ رہی ہے گویا غرفے کے رنگین شیشے سے چاندنی چھن چھن کر آ رہی ہے ـ جب اس قتالہ عالم نے رقص کرنے کے لئے اپنے ترشتے ہوئے گھوٹے کے دلفریب کٹاؤ پر، بایاں ہاتھ رکھ کر چیتا سی کمر لچکائی تو ایسا نظر آیا گویا رقص کی دیوی کی سنہری رتھ کا دھرا بڑی لچک کے ساتھ گھوم رہا ہے ـــــ اور کرہ ارض کی گردش اس کا طواف کر رہی ہے

یا مصر کے بازار میں یوسف کا بانکپن دیکھ کر زلیخا کے غرور کی کمان ٹوٹی جا رہی ہے ـ

اور ہنگام رقص، جب اس کافر نے ایک قیامت انگیز جھانوئی کے ساتھ اپنی آنکھوں کے پٹ آدھے بھیڑ لئے تو ایسا معلوم ہوا، گویا خرابات کی انگنائی میں دفعتہً جھٹپٹا ہو گیا اور رطل گراں پر ہلکا سا دھواں مچلنے لگا ـــــ اور جب اس ظالم نے اپنی گردن کے باریک ڈورے کو راگنی کے بہاؤ کی طرف موڑ کر ذرا سی جنبش دی تو ایسا محسوس ہوا، گویا نسیم سحر کی مضراب خیط ابیض کو بجا رہی ہے ـ

اس کی جوانی کا سیب، ہنوز ڈال سے باہر نکالا نہیں گیا تھا ـ اس کے مکھڑے پر جوانی اور بالک پن، گلے مل رہے تھے ـــــ اس کا وجود ایک ایسا جھٹپٹا تھا، جس کی چھاؤں میں دھندلکا ہمک رہا تھا ـــــ اس کی ناک کی نتھ گواہی دے رہی تھی کہ اس کا بنڑا ابھی تک کورا ہے ـ

اور سینے پر اس کی ڈبی آنچل کے نیچے گویا ایک بلوا سا ہو رہا تھا ـ

وہ بہت کم سن تھی اور موسیقی میں خام ہونے کی وجہ سے اس کے گلے میں بے تالگی تھی لیکن اس کی نیم پختہ جوانی کی، وحشی آنکھوں کے شربتی ڈوروں میں وہ انوکھی راگنی چھڑی ہوئی تھی جس کو دنیا کے کسی ساز پر بجایا ہی نہیں جا سکتا، اور جس کو کانوں سے نہیں آنکھوں سے سنا جا سکتا ہے ـ

اور آخرکار ڈوبتے ستاروں کی چھاؤں میں، اس دخترِ قمر نے جب یہ غزل بھیرویں میں چھیڑی ـ

نسیم جاگو، کمر کو باندھو، اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

تو راگنی کی چلت پھرت، اس کی نیم رواں، اور بیچ گلے میں یوں گھومنے لگی، گویا، ہوا کے ملائم جھونکوں میں پیٹے سے کٹا ہوا چاند تارا فضا میں تیر رہا ہے ـ

اور جب ناچتے ناچتے، انعام کی خاطر، وہ ہچکولے کھاتی کشتی کے مانند آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگی تو میرا گلا رندھنے سا لگا ـ میری گردن کے ہاروں کی خوشبو تیز ہو گئی اور جب وہ ایک گھٹنا ٹیک کر جھم سے میرے سامنے بیٹھ گئی، تو اس کے کمسنی کے انفاس کی خوشبو، بیچ میں سے میرے سینے میں سما چھو گئی ـ اور اس کی پیشواز کا سرا، جب میرے ہاتھ کی پشت سے مس ہو گیا تو میرے بدن میں پو سی پھٹنے لگی ـ

میری زندگی کے اٹھارہ معاشقوں میں وہ میرا مبہم سا معاشقۂ اولیں تھا ـــــ جو عالمِ خواب میں شبنم کے مانند مجھ پر گرا، اور میرے تن بدن میں جذب ہو کر، گم ہو گیا ـ

اب اگر وہ زندہ بھی ہو گی تو میری ہی طرح بوڑھی ہو چکی ہو گی ـ اور ہم ایک دوسرے کو پہچان بھی نہیں سکیں گے ـ

ہائے ظالم وقت کا دھارا کتنے چاندوں کو غرق کر چکا ہے

لیکن اتنی طویل مدت گزر جانے بعد بھی جب اس مجرے کی یاد آ جاتی ہے تو میرے جھریوں بھرے ہاتھ کی پشت پر اس کی پیشواز کا دامن سرسرانے اور گدگدی سی لینے لگتا ہے

ہائے کیا کروں میرے اللہ!

کانوں سے سنا تھا کہ پشتِ رسالت پر مہرِ نبوت ثبت ہوا کرتی ہے، اور آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ میری پشتِ دست پر اس پیشواز کی مہرِ لمس آج تک دمک رہی ہے ـ

میرا، آگرے کا پہلا سفر:ـ

آگرے سے نانا جان کا دعوت نامہ آیا ـ میری ماں کی باچھیں کھل گئیں ـــــ سفر کی تیاریاں شروع ہو گئیں ـ اور پورے ایک ہفتے کے بعد جب رختِ سفر تیار ہو گیا تو لکھنؤ

سلہ پتنگ بازی کے ایک پیچ کا نام

سلہ ایک قسم کا پتنگ

آدمی جیسے کہ تین کمپارٹ منٹ، یعنی ایک فرسٹ، ایک سیکنڈ اور ملازموں کے واسطے ایک تھرڈ کلاس کی بوگی ریزرو ہو کر جو بیس گھنٹے بیشتر ملیح آباد اسٹیشن آ گئی، اور وہ تینوں ڈبے مال گودام سے پلیٹ فارم پر لگا دیئے گئے۔

پردے کا یہاں تک اہتمام کیا گیا کہ زنانے کمپارٹ منٹ کی تمام کھڑکیاں پہلے ہی سے بند کر دی گئیں اور صرف یہی نہیں، ان پر کو کا کیلوں سے ٹھونک ٹھونک، اندر سے چادریں بھی جڑ دی گئیں۔ دن بھر ان میں سامان لادا جاتا رہا۔ اور رات کو پہرہ بٹھا دیا گیا،
ہماری گاڑی صبح نو بجے جانے والی تھی، گھر بھر میں تڑکے سے ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور باقی سامان بھی اسٹیشن پہنچا دیا گیا —— گھر سے چلتے وقت دادی جان نے ہم سب کے بازوؤں پر امام ضامن باندھے، حیدری خانم قرآن کو ہاتھوں پر بلند کر کے انگنائی کے کنویں کی جگت پر جا کر کھڑی ہو گئیں، جس کے نیچے سے ہم سب ایک ایک کر کے گزرے ماماؤں، اصیلوں نے وہیں جھلی[۱] کی آوازیں بلند کیں، اور ہم سب اسٹیشن کی جانب گاڑیوں اور فینسوں میں روانہ ہو گئے —— زنانے ڈبے کے تینوں طرف قناتیں کھڑی کر دی گئیں خواتین اپنے اپنے درجے میں اور ہم سب اپنے ڈبے میں بیٹھ گئے۔

لکھنؤ اور کانپور ہوتی ہوئی، جب ہماری گاڑی ٹونڈلہ جنکشن پہنچی تو دودھ گرم —— دودھ گرم —— پوری کا جوڑی (دودھ گرم پوری کچوری) کے نعروں نے چونکا دیا، اور کانوں کو ان بگڑے لہجوں سے پتا چل گیا کہ ہمارا قافلہ اودھ سے بہت دور آ چکا ہے،
وہاں ہمارے ڈبے کاٹ کر آگرہ سے چلنے والی گاڑی کے بریک کے پیچھے جوڑ دیئے گئے گاڑی آگے بڑھ کر جب آگرے کی طرف مڑنے لگی تو میرے باپ نے اشارہ کر کے بتایا، "دیکھو یہ تاج محل ہے۔" میں نے ادھر نگاہ اٹھائی تو حیران ہو کر رہ گیا۔ جلال و جمال کی ایسی متناسب ہم آہنگی کبھی دیکھی ہی نہیں تھی۔ میں ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ دیکھتا رہا، پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ گاڑی ایک طرف مڑ گئی۔ تاج اوجھل ہو گیا —— اور گویا دودھ سا گیس کا ہنڈا جھٹ سے ٹوٹ گیا۔ آگرہ فورٹ اسٹیشن پر گاڑی رک گئی۔
ماموں نے جھپٹ کر مجھے گلے لگا لیا، زنانے ڈبے کے گرد قناتیں کھینچ دی گئیں۔
اور ہم سب، گڑھی منصور خاں کی طرف، جہاں نانا رہتے تھے، روانہ ہو گئے۔ میں نے اپنے نانا جان کے محل کو، جیسے کسی ——

---

[۱] اس کو آغازِ سفر کا نیک شگون سمجھا جاتا تھا، یعنی جس طرح دہوا اور جھلی میں ساز نگاری ہوتی ہے ہم سفر میں شامل حال رہے۔

فرانسیسی رئیس نے بنوایا تھا، اپنے آبائی محلوں سے مختلف پایا۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے محل دو منزلہ ہیں۔ یہ سہ منزلہ ہے۔ ان میں بڑے بڑے در اور دالان ہیں، یہ ایک دوسرے سے پیوستہ کمروں کا مجموعہ ہے۔ ان میں فقط روشندان ہیں۔ اس میں جا بجا کھڑکیاں ہیں ان کے صحن کشادہ ہیں۔ اس کا صحن نسبتاً چھوٹا ہے۔ ان میں سو ڈیڑھ سو آدمی رہ سکتے ہیں۔ اس میں چھ سات سو آدمیوں کی گنجائش ہے۔ اور ہر چند، یہ کنڑی مضوبہ خاں کی ڈھال پر واقع ہے مگر اس قدر بلند ہے کہ گرد و پیش کے تمام مکان اس کے آگے پست دکھائی دیتے ہیں اور اس کی مہتابی سے تاج محل نظر آتا ہے۔

تاج محل کا قریب سے دیدار دیکھئے۔

پرطادی دو ذہنی چیزیں، بعد اضافہ، اور قرب خفت پیدا کرتا ہے ــــــ بعد اجمال ہوتا ہے اور قرب تفصیل، اور اجمال تفصیل سے زیادہ حسین ہوتی ہے ــــــ لیکن تاج محل کو جب قریب سے دیکھا تو یہ کلیہ ٹوٹ گیا اور قریب سے وہ اس قدر حسین نظر آیا کہ جی چاہا اس روئی کے سفید کھلونے کو دانتوں کے نیچے کرٹم کرٹم چبا کر کھا جاؤں۔

اللہ اکبر، تاج محل کا ٹھاٹھ ــــــ آسمان سے باتیں کرتا ٹھاٹھ ــــــ جب خدام تاج میں سے کسی نے اس کی محراب کے نیچے "اللہ اکبر" کا نعرہ بلند کیا تو محراب میں ایک ایسی عظیم گونج پیدا ہو گئی کہ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور وہ گونج دیر تک باقی رہی ــــــ اور ایسا معلوم ہوا کہ گوش رسالت میں وحی کی جھنکار گونج رہی ہے۔

اس الوہی جھنکار میں ڈوبا ہوا جب اندر گیا اور تاج پر تفصیلی نگاہ ڈالی تو ایسا محسوس ہوا کہ خواب میں جنت دیکھ رہا ہوں۔ فواروں کی کھنک، سبزے کی لہک اور تاج کی چمک دمک نے دیوانہ کر دیا ــــــ میں یہ سوچنے لگا کہ وہ کیسے پنجے تلے، چوم لینے کے قابل ہاتھ ہوں گے جن کی فنکاری نے خطِ ابیض، خوابِ زلیخا، تابِ مرمر، سپیدۂ سحری اور جلوۂ کنعاں کو چاندی کی دیگ میں ڈال کر ستاروں کے انگاروں پر پگھلایا ــــــ موسم بہار کے سرشار جھونکوں میں سکھایا اور ہیرے کی نازک چھینیوں سے تراش تراش کر در و بام کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ خدا کی قسم بے ساختہ جی میں آیا کہ پھاوڑے لڑھکاؤں کمر بان چڑھے، اور ناچنے لگوں تھرک تھرک ــــــ لیکن جب کن انکھیوں سے باپ کی طرف دیکھا، ڈر کے مارے کلیجہ پکڑ کر رہ گیا کہ ناچوں گا تو باپ اس طرح عاق کر دیں گے جس طرح میرے پردادا نے اپنے ایک لڑکے کو، جو لونڈی کے بطن سے پیدا ہوا تھا، یہ سن کر عاق کر دیا تھا کہ وہ گاتا اور طبلہ بجاتا ہے۔

اپنے ولولۂ رقص کا گلا گھونٹ کر جب میں نے تاج کے دوسرے تماشائیوں کی طرف

نگاہ اٹھائی تو یہ دیکھ حیرت میں غرق ہو گیا کہ وہ لوگ بھی بڑی سنجیدگی کے ساتھ ثبات عقل و ہوش ناچ کا نظارہ کر رہے ہیں اور ان میں سے ایک فرد بھی ناچ رہا ہے تو میں سوچنے لگا کہ یہ سب کے سب کیا پتھر کے بنے ہوئے ہیں، یا یہ تمام لوگ بھی اپنے اپنے پٹھان باپوں کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔

خدا گواہ کر کے کہتا ہوں کہ اگر اس وقت میں اپنے باپ کے ساتھ نہ ہوتا تو گریبان کے پرزے اڑا کر ایسا ایسا اچھلتا، کودتا، ناچتا، قلابازیاں کھاتا، شلنگیں بھرتا، اور ایسے ایسے شدے اور دیوانے چارے کرتا کہ فوراً آگرے کے پاگل خانے بھیج دیا جاتا، اور وہاں جب کوئی پوچھتا یہ تو نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے، تو اچک کر کسی درخت پر چڑھ جاتا اور اس کی سب سے اونچی شاخ پر بیٹھ کر یہ نعرہ لگاتا سے

باحسنش، ایں جنوں کہ تو بینی تحمل است
ناصح، ملامتے مکن، ایں ناشکیب را!!

ولولۂ تعلیم

میرے ولولہ تعلیم نے میرے باپ کے دل کے ساتھ وہ سلوک کیا، جو بجلی خرمن سے کرتی ہے۔ بات یہ نہیں تھی کہ وہ مجھ کو جاہل رکھنا چاہتے تھے مگر سارا کھیل بگاڑ دیئے ہوئے تھی، ان کی غیر معمولی محبت بے حد و حساب محبت۔ وہ دل سے چاہتے تھے۔۔ کہ میں پڑھوں تو ضرور مگر ان کی آنکھوں سے پل بھر کے لئے بھی جدا نہ ہونے پاؤں ــ اور اس بے کراں محبت کی بنا پر جب میں، دانت نکال نکال کر ان کی خدمت میں عرض کرتا تھا کہ میاں مجھ کو پڑھنے کے لئے کہیں باہر بھیج دیجئے میں گھر پر نہیں پڑھ سکوں گا، مولوی الٹے مجھ سے ڈرتے ہیں ــــــ ڈرنے والے مولوی پڑھا نہیں سکتے" تو ان کے چہرے پر ایک شدید قسم کے کرب کا رنگ دوڑ جایا کرتا تھا۔ تنگ آ کر میں نے گھر کی تمام دیواریں، کوئلے سے، "تعلیم کا بھوکا شبیر" لکھ لکھ کر سیاہ کر ڈالیں۔ میاں نوکروں سے ان تحریروں کو مٹوا دیتے تھے، اور میں پھر لکھ دیتا تھا۔

آخر کار میں نے اپنی پھوپی زاد بھائی، اور تعلیم کے شیدائی صفدر حسین خاں کو پکڑا کہ آپ میاں سے میری سفارش کر دیں ــــــ صفدر بھائی "مدس حالی" کی نسل میں سے تھے انھوں نے میری امداد کا وعدہ کیا۔ ان کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھولوں گا ــــــ کہ انھوں نے میری تعلیم کے بارے میں میرے باپ سے بار بار کہا اور بڑے اصرار کے ساتھ کہا، لیکن میاں نے اس کان سے سنا، اس کان سے اڑا دیا۔

لیکن صفدر بھائی دھن کے پکے تھے، ہمت نہیں ہارے۔ اور ایک روز شام کے وقت میاں کو بڑے اچھے موڈ میں پا کر انھوں نے بڑی جسارت کے ساتھ یہاں تک کہہ دیا کہ ماموں اب زمانہ بدل چکا ہے۔ جو بچہ گھر کے رئیسانہ ماحول سے باہر نکل کر نہیں پڑھے گا۔ وہ

"شریفوں کی اولاد بے تربیت ہے کہ نہ مرے ہیں آکر تباہ ہو جائے گا، ماموں آپ خاندان بھر میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے اور عقلمند آدمی ہیں۔ اور پھر بھی تعلیم سے اس قدر غفلت برت رہے ہیں۔

یہ سن کر میاں بگڑ گئے، اور ارشاد فرمایا۔ "صفدر۔ ایک چھوٹا سا بچہ جو معلم اس کو پڑھا رہے ہیں اس عمر میں گلستان، بوستان، سکندر نامہ اور دیوان حافظ چاٹ چکا ہے اور گومتی پرشاد سے انگریزی بھی پڑھ رہا ہے کیا اسی کا نام ہے تعلیم سے غفلت؟"۔
صفدر بھائی نے ہاتھ جوڑ کر کہا "میں سر جھکائے لیتا ہوں، آپ چاہیں تو مجھ کو مار ڈالیں، مگر اس قدر ضرور عرض کر دوں گا کہ چار کیا، دس استاد بھی اس ماحول میں بے کار ہیں، ماموں بیٹیوں کے بچے مولویوں سے نہیں ڈر سکتے، بلکہ الٹے مولوی ان سے خوف کھاتے ہیں، ماموں یہ تو آپ کے سامنے کی بات ہے کہ نسیم نانا کے ایک نیچے کو باہر آتے ہوئے ایک استاد نے، جب ایک ہلکا سا تھپڑ مار دیا تھا تو انہوں نے اس کا ہاتھ فوراً تڑوا ڈالا تھا ــــ اس دن سے یہاں کے تمام استاد اور بھی ڈر گئے ہیں اور اپنے شاگردوں کو گھڑکی تک دینے کی جرأت نہیں کرتے۔" یہ سن کر میاں کچھ سوچنے لگے۔ صفدر بھائی نے، اشارے سے بتایا کہ آثار اچھے ہیں ــــ تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد میاں نے کہا صفدر یہ تو بتاؤ شبیر کو بھیجوں تو کہاں بھیجوں، لکھنؤ ہر چند قریب ہے مگر وہاں کے رنگین ماحول[1] میں یہ بگڑ جائے گا۔ صفدر بھائی نے کہا "ماموں یہ میں خود بھی نہیں چاہتا کہ ان کی تعلیم لکھنؤ میں ہو میں اپنے بیٹے اسرار الحسن کو سیتاپور میں پڑھا رہا ہوں، آپ شبیر میاں کو سیتاپور بھیج دیں۔ وہاں ملیح آباد کے بہت سے لڑکے یعنی عبدالباری، عبدالعزیز، تحمزالحسن پڑھ رہے ہیں اور شبیر میاں کا لنگوٹیا یار ابرار بھی وہیں تعلیم پا رہا ہے۔

---

[1] میاں کو یہ کب معلوم تھا کہ وہ جس شبیر کو مرد صالح بنانا اور بگڑنے سے بچانا چاہتے ہیں، وہ بگڑتے، بغیر مانے ہی گا نہیں اور اسکو اگر بسم اللہ کے گنبد میں بند کر کے اسکے پاؤں میں، "اخلاق جلالی" کی زنجیریں بھی ڈال دی جائیں گی۔ پھر بھی یہ شبیر گنبد اور ان زنجیروں کو توڑ پھوڑ کر حریم بتاں دبارگاہ متعاں میں پہنچ جائے گا۔ کاش میاں ہی کو نہیں، دنیا کے تمام باپوں کو یہ معلوم ہوتا کہ بیٹا بیٹے اور اسکے فطری میلان کے بیچ میں اگر کوئی باپ تا دیر ٹھہری نہیں سکتا۔ اس لئے کہ داخلی تقاضوں کو خارجی احکام نیچا نہیں دکھا سکتے۔ اگر کروڑوں انبیا پانی کو یہ حکم دیں کہ وہ نشیب کی طرف نہیں فراز کی جانب بہنے لگے، پانی ان کا حکم نہیں مانے گا۔ اور نشیب کی جانب ہی بہتا رہے گا۔ اگر یہ سن کر کوئی انسان کے ذی شعور، اور پانی کے بے شعور ہونے کی بات کرے گا تو غور کرنے کے بعد اس کو پتہ چل جائے گا کہ شعور بھی فطری تقاضوں اور جبلتوں کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔

میاں نے یہ سن کر ارشاد فرمایا "اچھا صفدر ـــــــ ایک مہینے کے بعد بشیر کو سیتاپور لے جانا میں اس ایک مہینے میں اپنے دل کو بھی سمجھا لوں گا" ـــــ یہ سنتے ہی میرا دل، قلقاریاں مارنے لگا۔

لیکن جب پورا مہینہ گزر جانے کے باوجود، میاں کا وعدہ ایفاد نہیں ہوا تو میری امید کو پر پانی پھر گیا۔

اسی اثنا میں جب لفٹنٹ گورنر سے ملنے کے لئے میاں لکھنؤ جانے لگے، میں بھی ساتھ ہو لیا، اور جب وہ لاٹ صاحب سے مل کر رخصت ہونے لگے ــــــ تو میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ لاٹ صاحب نے میرے باپ سے پوچھا "آپ کا لڑکا رو کیوں رہا ہے؟"، تو میں نے ان سے تمام ماجرا بیان ..... کر دیا۔ لاٹ صاحب نے بڑھ کر میرے سر پہ ہاتھ پھیرا، اور میرے باپ سے اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں، جو کہا اس کا مفہوم یہ تھا کہ خاں صاحب آپ بڑے خوش قسمت ہیں، ایسے علم کے شوقین لڑکے تو ولایت میں بھی نہیں ہیں، آپ اس کو ایک مہینے کے اندر اندر کسی اسکول میں داخل کر کے مجھے مطلع کر دیں" اتنا کہہ کر اس نے بڑے پیار سے میرے گال تھپتھپائے اور کہا ـــ "اگر خاں صاحب نے میری بات نہیں مانی، تو میں سرکاری وظیفہ دلا کر تم کو تعلیم کے واسطے لندن بھیج دوں گا۔

گورنمنٹ ہاؤس سے نکل کر، جب میاں گاڑی میں بیٹھے تو برس پڑے مجھ پر، فرمایا "مردود تو نے لفٹنٹ گورنر سے میری شکایت کی، اور وہ بھی میرے منھ پر ـــــ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ میں اس لال منھ والے بندر سے ڈر جاؤں گا؟ خوب کان کھول کر سن لے کہ اگر لفٹنٹ گورنر کے باپ بھی کہیں گے، تب بھی میں تجھ کو گھر سے باہر بھیج کر نہیں پڑھانے کا ــــ ایسی تیسی لاٹ صاحب کی ـــ یہ سنتے ہی میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، ہچکیاں بندھ گئیں، روتے روتے ـــ اور دوران گریہ فرط قلق سے میری سانس میرے گلے میں گھوم کر کچھ ایسے زبردست جھٹکے سے نکلی کہ میرے عاشق باپ کا منھ فق ہو گیا۔ فرط محبت سے ان کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ میرا دل بیٹھ جائیگا انہوں دیوانہ وار دونوں ہاتھ بڑھا کر مجھ کو اپنے سینے سے لگایا، اور انتہائی عجلت کے ساتھ کہا "تیرے سر کی قسم ایک مہینے کے اندر میں تجھ کو سیتاپور بھیج دوں گا۔ میری سانس ٹھہر گئی، ہچکیاں رک گئیں۔ آنسو تھم گئے ـــــــ میرے باپ نے مجھ کو بہت غور سے دیکھ کر پوچھا ـــ "بیٹا اب طبیعت کیسی ہے"۔

میں نے مسکرا کر کہا اچھا ہوں میاں۔ ان کے چہرے پر بحالی آ گئی۔ اور میں دل ہی دل میں سیتاپور جانے کے دن گننے لگا۔ ملیح آباد آتے ہی میاں نے صفدر بھائی کو بلا بھیجا اور کہا "صفدر تم بشیر کو جمعہ کے دن سیتاپور لے جاؤ" میرا دل خوشی کے مارے اچھلنے لگا۔ دو دن کے اندر اندر میرے ساتھ جانے والے باورچی کا جس کو بچے .... ہم سب پکارا۔

جاتا تھا، تقرر کر دیا گیا، اور صفدر بھائی نے چار پانچ دن کے اندر اندر میرے تمام نئے کپڑے لے کر درزی سے ہلکے پھلکے کپڑے ملبوس ہو کر کے سادہ جوڑے سلوا دیئے۔

خدا خدا کر کے جمعہ آیا۔ میرا تمام سامان گاڑی پر رکھوا دیا گیا۔ لیکن بڑی بی، دادی، ماں اور سب سے زیادہ میرے باپ کے رخصتی آنسوؤں میں گاڑی کا وقت بہہ گیا۔ اور میں کلیجہ تھام کر رہ گیا۔

دوسرا جمعہ آیا۔ میں گاڑی کے وقت سے دو گھنٹے بیشتر ہی تیار ہو گیا ــــــ دادی اور ماں نے میرے بازو میں امام ضامن باندھے۔ سب نے یکے بعد دیگرے مجھے گلے لگایا۔ بڑی بی نے بھی مجھ کو سینے سے چمٹا لیا۔ میاں نے اس قدر بھینچ کر مجھے سینے سے لگایا کہ میری پسلیاں لچک گئیں، اور میرے سینے پر ان کے دھڑکتے دل کی ضربیں پڑنے لگیں ــــــ آنگن میں پہنچ کر جب، حسب دستور قرآن کے نیچے سے نکلنے لگا تو میاں نے بھرائی آواز میں حکم دیا کہ ادھر آؤ بیٹا، میں ان کے پاس پہنچا، انہوں نے ارشاد فرمایا، "تھوڑی دیر کے واسطے بیٹھ جاؤ" اور چار منٹ کے بعد جب میں نے گھڑی پر نظر جمائی اور فرط اضطراب سے کسمسانے لگا تو میاں نے بڑی درد بھری آواز میں فرمایا ؎

می روی و گریہ می آید مرا ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

اتنے میں صفدر بھائی آ گئے، اور ہاتھ جوڑ کر کہا، "ماموں گاڑی چھوٹ جائے گی" ـ میاں نے میرے چہرے پر نگاہیں جما دیں، اور پھر اشارے سے مجھ کو رخصت کی اجازت دے کر سر جھکایا میاں کے ساتھ پورا گھر رونے لگا۔ میں نے آنسو بھری آنکھوں سے سب کو جھک جھک کر سلام کیا اور جب باہر جانے کے واسطے ڈیوڑھی سے گزرنے لگا تو ہچکیاں میرا تعاقب کرنے لگیں۔ اور میاں کی آواز سنائی دی۔

سرد سیما، بصحرا می روی سخت بے مہری کہ بے ما می روی

الغرض گھر سے باہر اس طرح آیا جیسے بھرے گھر سے جنازہ نکلتا ہے۔

تھرڈ کلاس اور آگے کا پہلا تجربہ :-

صفدر بھائی نے اسٹیشن جاتے ہوئے مجھ کو ایک لمبا لکچر پلایا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اب زمانہ بڑی تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے۔ امیری کی بو اپنے سر سے نکال دو، ماموں نے مجھ کو فرسٹ کلاس کا کرایہ دیا ہے، لیکن میں تم کو لے جاؤں گا تھرڈ کلاس میں۔ منظور ہے تمہیں مجھ کو معلوم تھا کہ تھرڈ کے مسافروں کو کن کن بلاؤں سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ میں نے ان کی تجویز منظور کر لی۔

لیکن تھرڈ کلاس میں قدم رکھا تو جی سن سے ہو کے رہ گیا۔ پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ سب سے پہلے اس ڈبے کی اس بدبو نے میرے دل پر گھونسا مارا، جس سے میں کبھی دوچار ہوا ہی نہیں تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ ڈبہ اوندھا اوندھا سا ہے ـــــ اور بے گدوں کی کھردری ذلیل بنچیں میرا منھ چڑھا رہی ہیں۔ اور ایک بنچ پر چند گنوار، حقہ مار کر تمباکو کی چلمیں پی پی کر، بری طرح۔ کھانس رہے ہیں۔ ناک میں ڈنک مارنے لگی تمباکو کی بدبو۔ مرتا کیا نہ کرتا، سر جھکا کر کھڑکی سیٹ پر بیٹھ گیا، سیٹ چبھنے لگی ـــــ سانس میرے سینے میں الجھ گئی، امام ضامن گرم ہو کر میرے بازو پر جم کے لگانے لگے۔ اور میں کھڑکی سے منھ نکال کر بیٹھ گیا ـــــ اور چار باغ سے نکل کر صفدر بھائی نے دو خبیث اکّے والوں کو اشارے سے بلایا ـــــ اور دو دو کوڑی کے ذلیل اکّے۔ اپنے گدھوں کے سے اینٹھی گھوڑوں کے ساتھ چوں چوں کرتے جب میری طرف رینگنے لگے تو مجھے ایسا لگا جیسے منھ کالا کر کے مجھے گدھے پر بٹھایا جا رہا ہے، صفدر بھائی نے میری حالت کا اندازہ لگا کر قہقہہ مارا اور ان کا وہ قہقہہ اضافۂ اہانت، بر جراحت کی طرح مجھے بہت ہی برا لگا ـــــ انھوں نے مجھ کو جز بز دیکھ کر کہا "بشیر میاں، یہ آپریشن بہت مفید ہے، اس سے تمہارے دل میں جو غرور کا مادہ فاسد ہے، وہ خارج ہو جائے گا، میں چپ ہو گیا۔

اکّا میرے قریب آیا تو میں نے کہا "صفدر بھائی، اس پر بیٹھوں کیوں کر ـ انھوں نے میری بغلوں میں ہاتھ دے کر مجھے بہزار دقت بٹھایا اور دوسرے اکّے پر سید یاور جی سامان سمیت سوار ہو گیا۔

اکّے کے چیکٹ گدے کی بو سے مجھے متلی ہونے لگی ـ اور یاد آ گیا حافظ کا یہ مصرع

صد منزل است و منزل اول قیامت است

اب چار باغ سے ہمارے ذلیل اکّے آغا میر کی ڈیوڑھی کی طرف رساں رساں رینگنے لگے جب ہمارا اکّا جھاؤ لال کے پل سے گزرنے لگا تو میری نظروں کے سامنے سے اپنے پردادا کا محلہ گزرنے لگا، جس کے پھاٹک پر "احاطہ نفیر محمد خاں" جلی حروف میں کندہ تھا۔ اس بورڈ کو دیکھ کر میرے تمام رونگٹے چھن سے ہو گئے، خیال آیا کہ ادھر سے دادا جان ہاتھی پر گزرتے اور ان کی سواری کے آگے نقیب بولا کرتے تھے، آج اسی طرف سے ان کا پوتا، ایک حقیر طوطا بنا ہوا اکّے میں بیٹھا، ٹرخ ٹوں، ٹرخ ٹوں گزر رہا ہے شرم کے مارے میں نے اپنا منھ چھپا لیا۔

---

[۱] اس زمانے میں سیتاپور جانے والی چھوٹی لائن کی گاڑی کے واسطے سٹی اسٹیشن جانا پڑتا تھا، جو آغا میر کی ڈیوڑھی میں واقع تھا۔

الغرض ہزار کوفت و ذلت سیتاپور پہنچ گیا ۔ ملیح آباد کے تمام لڑکے نہال ہو گئے، اور ابرار نے دوڑ کر میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں ۔

دوسرے ہی دن میرا نام بر اپنچ اسکول میں لکھا دیا ۔ صفدر بھائی نے ہائی اسکول کے فرشتہ سیرت ہیڈ ماسٹر بابو گھسیٹا ہی لال اور بورڈنگ کے ہنس مکھ انچارج گھوش بابو سے بھی مجھے ملا دیا اور میں ابرار دونوں دونوں کے ساتھ باقاعدہ اسکول آنے جانے اور جی لگا کر لکھنے پڑھنے میں سرگرم ہو گیا ۔

(ابھی سیتاپور آئے بمشکل پندرہ بیس دن ہی گزرے ہوں گے ۔ ایک روز شام کے وقت کیا دیکھتا ہوں کہ ہمارے گھر کے داروغہ شیخ امید علی چلے آ رہے ہیں شیخ صاحب کو دیکھ کر میں سمجھا کہ میاں سیتاپور تشریف لے آئے ہیں ۔ لیکن جب داروغہ صاحب نے میاں کا خط دکھایا تو معلوم ہوا کہ میاں نے فقط دو روز کے لئے ملیح آباد بلایا ہے ۔ دو دن کی چھٹی لے کر جب رات کی گیارہ بجے والی گاڑی سے ملیح آباد آیا اور اپنے مکان کی گلی میں پہنچا تو دیکھا کہ میاں صاحب ڈاکٹر عبدالکریم اور چند سپاہیوں کو لئے خلاف معمول، ؟ چکن اور ٹوپی کے بغیر لبادا ملک سے برآمد ہو رہے ہیں ۔ اور جیسے ہی مجھ پر ان کی نظر پڑی ،، ہائے میرا بیٹا، کہہ کر وہ جھپٹ پڑے اور مجھ کو سینے سے لگا کر رونے لگے، ڈاکٹر عبدالکریم کہا کر ،، خاں صاحب، آپ خوش ہونے کے عوض رو رہے ہیں ۔ میرے باپ نے ارشاد فرمایا ۔ ولا ڈاکٹر صاحب ہاکوری کے پل سے گزرتے ہی ریل ایک سنت جاریہ ہے کہ ریل ہمیشہ سیٹی دیتی ہے ۔ لیکن آج اس نے سیٹی نہیں دی ، اور میں یہ خیال کر کے دیوانہ ہو گیا کہ کہیں خدا نخواستہ پل تو نہیں ٹوٹ گیا ہے ۔ ڈاکٹر صاحب جس کا بیٹا ریل میں آ رہا ہو اس کے جی سے پوچھئے کر وقت مقررہ پر ریل کا سیٹی نہ دینا ۔ کیسے داہموں کو برانگیختہ کر سکتا ہے ڈاکٹر صاحب نے کہا ۔ خاں صاحب سچ کہا ہے کسی نے ۔ عشق است و ہزار بدگمانی

سیتاپور میں میری تعلیم کا سلسلہ سال ڈیڑھ سے زیادہ جاری نہیں رہ سکا، اور میری مفارقت کی تاب نہ لا کر غالباً ۱۹۰۸ء میں میرے باپ نے مجھ کو لکھنؤ طلب فرما کر حسین آباد ہائی اسکول میں داخل کر دیا ۔

لہ اس اسکول میں آغائی صاحب کے پوتے اور میرے ساتھی مرزا حبیب حسن ہیڈ ماسٹر کے حکم سے یہ امتیازی برتاؤ کیا گیا تھا کہ تمام لڑکے تو بنچوں پر بٹھائے جاتے تھے لیکن ہم دونوں کو کلاس ٹیچر کی میز کے داہنے بائیں کرسیوں پر بٹھایا جاتا تھا ۔ اور وہیں میں چھٹے اور ساتویں درجے کا ڈبل امتحان دے کر آٹھویں درجے میں آ گیا تھا ۔ سید محمد جواد صاحب ، ہمارے دینیات کے معلم تھے ہر چند مجھے دینیات سے

اور میرے قیام کے واسطے نخاس (جھٹیا بازار) میں سید اعجاز حسین صاحب کے مکان[2] کا بالائی اور کشادہ حصہ کرائے پر لے لیا گیا۔ میرے مکان کے نیچے ایک منشی واحد علی کی نوادر کی دکان تھی ان کی دکان کے سامنے، کسی بزرگ کا مزار تھا جس پر ہر جمعرات کو چراغاں ہوا کرتا، اور اس کے اطراف میں ہر اتوار کو چڑیوں کا بازار لگا کرتا تھا۔ اور میرے مکان کے عین سامنے حضرت ریاض خیرآبادی رہتے تھے۔

میں اس واقعے کو، آج تک بھول نہیں سکا ہوں کہ جس روز میں نے اس مکان کے چوڑے چکلے زینے میں، جس کے دونوں طرف نیچے سے اوپر تک بڑے شاداب گملے رکھے ہوئے تھے، پہلا قدم رکھا تھا، تو ہوائے سرد کے ایک تیز اور معطر جھونکے نے، میرا اس دل نوازی کے ساتھ استقبال کیا تھا کہ میرے سینے کی تمام کھڑکیاں تڑاتڑ کھل گئی تھیں، اور رگ رگ میں ایک ایسی نشہ اور خنکی محسوس ہوئی تھی کہ میں جھومنے لگا تھا۔

خدا گواہ کہ ہوائے سرد و شکریں کا، وہ پھولوں میں بسا، باریک دھار والا جھونکا، میرے سال خوردہ اور گرم و سرد کشیدہ سینے میں آج کی تاریخ تک محفوظ اور رسا بسا ہوا ہے، اور میرے تھکے ہوئے پھیپھڑے اس کی تازگی کو اس تحریر کے وقت تک فراموش نہیں کر سکے ہیں۔ اور اب بھی جب کبھی پاکستان سے لکھنؤ جاتا، اور اپنے وطن میں ایک پردیسی کے مانند گھومتا ہوا جب نخاس کی طرف نکل جاتا ہوں تو وہ سب سے پہلا جھونکا جھٹ پاکھر کے درختوں سے اتر کر نیچے آتا اور "ہائے میرے شبیر" کا دردناک نوحہ لگا کر، میری گردن میں باہیں ڈال دیتا اور ہچکیوں پر ہچکیاں لینے لگتا ہے جرنیلی ٹوپی اور سونٹے کے درکلہ وہ لڑکا، جو وہاں سے حسین آباد اسکول جایا کرتا تھا، میرے وجود کے احاطے سے نکل کر میرے سامنے آکھڑا ہوتا ہے اور بڑی رقت کے ساتھ پوچھتا ہے "کیا میں اب یہ ہو کر رہ گیا ہوں۔ اور اسی لمحے کے اندر میرا محبوب علاء حسین قزلباش، جو اب اس دنیا میں نہیں ہے اور ہر روز مجھ سے ملنے آیا کرتا تھا، سیاہ شیروانی پہنے اور آنکھوں میں آنسو بھرے اس ۔۔۔

کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ سید صاحب کے کلاس میں بڑے شوق کے ساتھ جاتا اور ان کی عربی و فارسی کی غیر معمولی قابلیت سے فیض یاب ہوا کرتا تھا مرزا حبیب حسن صاحب اور سید محمود جواد صاحب کی شخصیتوں اور شفقتوں کو میں عمر بھر یاد رکھوں گا، اور اللہ جنت نصیب کرے، مجھ میں اگر معصومیت ہوتی تو میں ان دونوں بزرگوں کے واسطے تمام عمر یہی دعا کرتا رہا۔

[2] وہ مکان شہید کر ڈالا گیا ہے اور اس کی بنیادوں پر ایک نیا مکان تعمیر کرا کے اب وہاں ایک مطہر پر رہنے لگی ہے، آگے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد۔

درد انگیز مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف آنکھیں اٹھا کر اپنا سر جھکا لیتا ہے، جس مسکراہٹ کی دھاریوں میں کروڑوں نوحے کروٹیں لیتے رہتے ہیں۔ ہائے کھائے جا رہی ہیں مجھ کو پرانی یادیں دل پھٹا جا رہا ہے میرا، اے میرے اللہ۔

اس زمانے میں، میرے مکان کے سامنے اور حضرت ریاض خیرآبادی کے مکان کی دیوار کے بیچ، دور تک گھوڑا گاڑیوں کا اڈہ تھا، جہاں چھبیس تیس گاڑی والے رہتے تھے اور ہر روز، بلاناغہ، صبح کے چار بجے، ایک صاحب دکٹوریہ روڈ کی طرف سے مولیٰ علی، امام علی مرتضیٰ علی گاتے ہوئے جیسے ہی میرے مکان کے سامنے سے گزرتے تھے تو گاڑی والے ٹھٹھکی دار آواز میں نعرہ لگایا کرتے تھے "نواب صاحب، بجا حاضر ہے۔ اور وہ نواب صاحب ان کو گالیوں پر دھر لیا کرتے تھے۔ لیکن کیا مجال کہ کوئی فحش لفظ زبان پر آجائے۔

جیسے ہی گاڑی والوں کی آواز بلند ہوتی تھی کہ "نواب صاحب بجا حاضر ہے"

ویسے ہی وہ بڑی سریلی اور ٹھہری ہوئی آواز میں کہنے لگتے تھے "اے آلِ رسول کے دشمنو، اے معاویہ کے دبنوائے ابن زیاد کے اونٹو، تم پر لعنت، تم پر آخ تھو، اے یزید کے بلو اے ابن ملجم کے بوکڑوا اے ہندہ جگر خوار کے بردو، تم پر لعنت، ہزار بار لعنت اے کنواریوں کے جنو، لعنت، لعنت ہزار بار لعنت، آخ تھو، آخ تھو، آخ تھو۔ اور ان ان گالیوں پر گاڑی والوں کے قہقہے بلند ہو جاتے تھے اور جب وہ گالیاں دیتے ہوئے گڑھے والی سرائے کی طرف مڑنے لگتے تھے تو گاڑی والے کی آواز پھر بلند ہو جاتی "نواب صاحب بجا حاضر ہے۔ نواب صاحب بجا حاضر ہے" اور وہ اسی نوع کی گالیاں دیتے ہوئے مڑ جایا کرتے تھے۔ اور اس طرف میرے گونڈے کے باشندے میاں نوروز باورچی کا بھی یہ معمول تھا کہ جب وہ "نواب صاحب بجا حاضر ہے" کی آوازیں سنتے تھے ___ تو چار پائی پر اٹھ کر بیٹھ جاتے اور بڑبڑاتے لگتے تھے کہ "ان سالے گاڑی والن (والوں) بر نالت (لعنت) روزنا روج (روز روز) بجا حاضر، بجا حاضر، چیکھا کرت ہیں (چیخا کرتے ہیں) یو ابر) کا دکیا) وائے ہات (واہیات)، پنا دین نام ہے سالے سویرے سویرے اللہ رسول کا نام تو لیت دیتے، ناہیں (نہیں) بجا حاجر کا گل (غل) مچائے رہت (رہتے) ہیں۔ تھوک ہے ان کی اوکات (اوقات) پر

ایک روز کا ذکر ہے کہ اس نواب صاحب بجا حاضر ہے، کے ہنگامے سے کوئی گھنٹے دو گھنٹے پیشتر میں اپنا سبق یاد کرنے کے بعد دیوان حافظ کے مطالعے میں غرق تھا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی، تارے جھلملا رہے تھے کہ سڑک پر میرے مکان کے نیچے سے بھیرویں میں ڈھلی، ایک تان لہراتی آئی۔

سحر، با باد می گفتم ، حدیث آرزومندی
خطاب آمد کہ واثق شو بالطاف خداوندی

اور یہ بھی عجیب اتفاقیہ بات تھی کہ میں بھی اس وقت یہی غزل پڑھ رہا تھا۔ صبح کا سہانا وقت نسیم سحر کے ہلکے ہلکے جھونکے ـــــ دھندلکے میں طلسمی شان اور اس پر ایسی درد بھری تان میرے تمام بدن میں راگنی دوڑنے لگی۔

ابھی میرا تمام بدن گنگنا رہا تھا کہ اسی لوچ کے ساتھ دوسری تان اٹھی۔

دعائے صبح و آہ شب کلید گنج مقصود است بایں راہ و روش می رو کہ با دل دار پیوندی

اب مجھ سے رہا نہیں گیا۔ ایک ایک چھلانگ میں دو دو تین سیڑھیاں طے کر کے سڑک پر آ گیا اور دیکھا کہ ایک گورے چٹے، سفید داڑھی کے دراز قامت بزرگ میرے مکان کے نیچے والی قبر کی طرف منہ کئے دھیمے سروں میں گا رہے ہیں۔

بایں راہ و روش می رو کہ با دل دار پیوندی

نہ جانے میرے دل پر کیا بیت گئی کہ میں ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ ان بزرگ نے بڑی حیرت کے ساتھ مڑ کر دیکھا تو مجھے موجود پایا۔ اور زیر لب کہا "اللہ اللہ، یہ عمر اور اس قدر درد مندی۔ میاں صاحب زادے، تم کون ہو؟" ـــــ میں نے کہا، طالب علم ہوں۔ وہ میرے قریب آ گئے اور کہا۔ صاحبزادے ذرا ادھر سڑک کی روشنی کے نیچے تو آ جاؤ۔" میں روشنی کے کھمبے کے نیچے آ گیا۔ انہوں نے مجھے بڑے غور سے دیکھا، بار بار دیکھا ـــــ اور اس طرح دیکھا جیسے کوئی چیز آنکی جاتی ہے۔ اور پھر کانپتی آواز میں دوبارہ پوچھا، صاحبزادے تم کون ہو، میں نے پھر وہی کہا" طالب علم ہوں" انہوں نے یہ سن کر آسمان کی طرف آنکھیں اٹھائیں اور بڑی آہستگی کے ساتھ کہا، "صاحب زادے، تم طالب علم نہیں، مطلوب علم ہو، مطلوب علم ہو" ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور ـــــ

در خرابات مغاں، نور خدا می بینم
ویں عجب ایں کہ چہ نورے ز کجا می بینم

کہتے ہوئے کڑہ ابو تراب خاں کی ڈھال کی جانب مڑ گئے۔ اور میں ہکا بکا، اس طرح مبہوت کھڑا رہا کہ گویا میں اس دنیا میں موجود نہیں ہوں، اور اس وقت بھی جب کہ میں اس واقعے کو قلم بند کر رہا ہوں، میرے رونگٹے کھڑے ہوئے ہیں، اور وہ چاندنی رات مجھ پر چھائی ہوئی ہے اور ان بزرگ کی آواز کڑہ ابو تراب خاں کے موڑ سے اس وقت بھی میرے کانوں میں آ رہی ہے

ویں عجب ایں کہ چہ نورے ز کجا می بینم

میرا نکاح

میرا نکاح، ایسا ویسا نہیں، بڑی دھوم دھڑکا، اور بڑی چوٹم چاٹا کا نکاح تھا اس صورت حال کی تھوڑی سی تفصیل بھی سن لیجئے۔ میرے دادا نواب محمد احمد خاں کے مختلف البطن بھائی تھے۔ نواب محمد نسیم خاں۔ ان دونوں بھائیوں کے مابین، حسب دستور خاندان بنی امیہ اور بنی ہاشم کے مانند، بڑی ان بن اور بڑی تن تھن رہا کرتی تھی۔ میرے خسر، نواب محمد نسیم خاں کے بیٹے اور میں، نواب احمد خاں کا پوتا تھا اس لئے میرے خسر کے بڑے بھائی نواب محمد علی خاں کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ ان کے چھوٹے بھائی کی لڑکی سے میرا نکاح ہو یہ لیکن چونکہ میرے خسر اور میرے باپ کے درمیان، دستور خاندان کے خلاف، بڑی گہری محبت تھی، اس لئے میرے باپ نے جب میرا پیام دیا تو انہوں نے منظور فرمالیا۔ اور ان کی منظوری سے میرے خسر کا تمام قبیلہ بگڑ گیا اور میرے چچا نواب محمد علی خاں کو خصوصیت کے ساتھ بے حد ملال ہوا ——— اور اس بنا پر میرے نکاح کے موقع پر، میرے نکاح کی خوشی کے ساتھ ساتھ یہ جذبہ بھی کارفرمائی کر رہا تھا کہ میرے خسر کے تمام قبیلے کے علی الرغم میرا نکاح ہو رہا ہے۔ اللہ اللہ میرے نکاح کا دھوم دھڑکا ——— بڑی دھوم سے مجرے ہوئے، دعوتیں ہوئیں، اور عین نکاح کے دن "دشمنوں" کو جلانے اور بتانے کے لئے اس قدر زور زور سے ڈھول پیٹے گئے، اس قدر شدت کے ساتھ تاشے بجائے گئے اور اتنے بڑے بڑے ہوائیں گولے چھوڑے گئے کہ ان کی دول دول، دنا دن دنا دن سے، دور دور تک زمین ہلنے لگی۔ ہائے پٹھانو کا مزاج؟

لیکن یہ نکاح، آگے چل کر، کیا رنگ لایا، کتنا بڑا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا اس کے بعد اور میرے سہرے کے پھولوں نے کتنے کانٹے بو دیئے میرے باپ کی رہ گزار حیات میں آگے اسکا ذکر آئے گا یوں تو نو برس کی عمر ہی سے شعر کی دیوی نے مجھ کو آغوش میں لے کر، مجھ سے شعر کہلانا شروع ———

---

[1] اس وقت میری عمر ہوگی، مشکل سے گیارہ بارہ برس کی

کر دیا تھا۔ لیکن آگے چل کر جب شاعری سے میرا انہماک بڑھانے لگا، تو شاید اس خیال سے کہ اگر میں شاعری میں ڈوب گیا تو میری تعلیم ناقص رہ جائے گی، میرے باپ کے کان کھڑے ہو گئے۔ اور انہوں نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ، "خبردار اگر تم نے شاعری کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا"[1] اور اس کے ساتھ انہوں نے زنانے میں بوا گلزار اور مردانے میں، داروغہ امید علی کو مامور فرمایا کہ وہ جب مجھے شعر کہتے دیکھیں تو ان کی جناب میں رپورٹ کر دیں۔ باپ کے اس حکم امتناعی اور زنانہ و مردانہ خفیہ پولیس کے تقرر[2] نے مجھ کو بوکھلا دیا۔

مشیت کا یہ فرمان کہ شاعری کر، شریعت کا یہ حکم کہ خبردار شاعری کے قریب نہ پھٹک میں اس کشمکش میں پڑ گیا کہ اپنی فطرت کا حکم مانوں، کہ اپنے باپ کا خارجی فرمان قبول کروں سوچنے لگا، میں اپنی ذات سے جدا کیونکر ہو جاؤں۔ شعر کہتا ہوں تو باپ بگڑتے ہیں، نہیں کہتا تو دل پر بگار آتے ہیں۔ ادھر باپ کا حکم واجب الاذعان، ادھر فطرت کا ناقابل تسخیر میلان ——— ادھر منشائے پدر، ادھر تقاضائے قضا و قدر کیا کروں، کیا نہ کروں؟ شعر کہوں تو باپ ڈانٹ بتائیں، اپنے دسترخوان پر کھانا نہ کھلائیں، اور شعر نہ کہوں تو دماغ کے پرخچے اڑ کر رہ جائیں۔

میری حالت آدم و ابلیس کی سی ہو گئی ——— آدم کو ممانعت کی گئی تھی کہ خبردار شجر ممنوع کے . . .

---

[1] میری نو برس کی جان، اور شاعری کے میلان پر تعجب نہ فرمائیے۔ ذرا سوچئے تو کہ وہ بچہ جس کا باپ بھی شاعر ہو دادا بھی شاعر ہو، دو سوتیلے چچا بھی شاعر ہوں، بڑی پھوپی بڑی بہن اور بڑا بھائی شاعر ہو جس کا حقیقی ماموں بھی شاعر ہو جس کے باپ کا ماموں بھی شاعر ہو جس کی مرزا غالب کی قرابت داری ہو اور اردو فارسی کے اشعار برمحل سناتی رہتی ہو اس کی انا خالص لکھنؤ کی ہو، اور رات کے وقت، "کھلی ہے کنج قفس میں مری زباں صیاد"، کی لوری دے دے کر اس کو سلاتی ہو، جس کے گھر میں آئے دن لکھنؤ کے شاعر آتے جاتے اور ہر تیسرے، چوتھے مہینے مشاعرے ہوتے رہتے ہوں اور جو شعرا کے دیوانوں کو پتنگ اور گولیوں کی طرح کھیل کر پروان چڑھا ہو وہ شعر نہیں کہے گا تو اور کیا کرے گا۔

[2] بوا گلزار اور داروغہ امید علی، جب مجھے شعر کہتے پکڑ لیتے تھے تو میں دانت نکال نکال کر استدعا کرتا تھا کہ خدا کے لئے میاں تک یہ بات نہ پہنچانا۔ لیکن وہ دونوں اس قدر بے مروت و بے درد تھے کہ میری، رپورٹ کرنے سے چوکتے ہی نہ تھے بوا گلزار نے میری چغلیاں کھا کھا کر اس قدر روپیہ جمع کر لیا کہ سونے جھونے سے اپنی بیٹی کا نکاح کیا اور داروغہ امید علی نے اس قدر انعام پایا کہ ایک آم کا باغ لگا لیا، اور بہت سی زمینیں بھی خرید لیں۔ شاعری نے مجھ کو برباد کر ڈالا اور میرے مخبروں کے گھر بھر دیے

قریب بھی نہ پھٹکنا، لیکن مشیت کا تقاضا تھا کہ اسے آدم لوٹ، جی بھر کے مزے لوٹے شجرِ ممنوعہ کے اور ابلیس کو حکم دیا گیا تھا۔ بلکہ جھک جا سجدے میں آدم کے روبرو لیکن مشیت نے آنکھ دکھا دی تھی کہ اسے اگر سجدہ کیا تو ناک کاٹ ڈالی جائے گی جڑ سے۔

سو، جس طرح آدم و ابلیس مخالفت، حکم سے روگردانی کر کے مشیت کے سامنے جھک گئے (اور مجال نہیں تھی کہ نہ جھکتے) اسی طرح میں حکم پدر سے روگردانی کر کے، فرمانِ قضا وقدر کے آستاں پر سر بسجود ہو گیا۔

اس لئے میں شاعری ترک نہیں کر سکا۔ لیکن چوری چھپے شعر کہتا، اور ادھر ادھر دیکھتا ہوا، کسی گوشے میں جا کر ان کو لکھتا اور پرچے اپنے صندوقچے کے اندر مقفل کر دیتا اور قاچاقیوں (اسمگلروں) کی طرح، اس صندوقچے کو اپنی ماں کے حوالے کر دیتا تھا کہ وہ اس چھپا کر رکھ دیں۔ میری ماں کو میری اس حالت پر بڑا ترس آتا تھا۔ مگر وہ اداس ہو جانے کے سوا اور کر ہی کیا سکتی تھیں۔

لیکن اس قدر مجرموں کی سی احتیاط کے باوجود، میں اندر اور باہر کئی بار عین موقع پر شعر کہتا پکڑا گیا۔ میرا جیب خرچ بند ہوا، باپ نے اپنے ساتھ کھانا کھلانا ترک کر دیا، اور اکثر تھپڑ بھی مارے۔ اپنی ہر ذلت کے بعد میں نے بارہا اپنے کان پکڑ پکڑ کر قسمیں کھائیں کہ اب کبھی شعر نہیں کہوں گا۔ اب کھائی سو کھائی، اب کھاؤں تو رام دہائی۔ لیکن جیسے ہی کہ میرے دل میں شاعری کی نگوڑی کا ہٹ ہونے لگتی تھی، میری تمام قسمیں چور چور ہو کر رہ جایا کرتی تھیں۔ اور حضرت وحشت کا یہ شعر مجھ پر صادق آجایا کرتا تھا۔

> مجال ترکِ محبت، نہ ایک بار ہوئی
> خیالِ ترکِ محبت تو بار بار آیا

شعر گوئی کی اجازت:۔

ایک بار میں اپنے صندوقچے میں، جیب سے پرزے نکال نکال کر رکھ رہا تھا کہ بوا گلزار نے دیکھا۔ وہ بھانپ گئیں ـــــ میاں کو خبر کر دی۔ میاں آئے میری ماں سے کہا شبیر کا صندوقچہ کہاں ہے؟ میری ماں کا رنگ ہلدی کا سا ہو گیا، میاں کا خوف اس قدر تھا کہ وہ انکار نہیں کر سکیں اور میرا صندوقچہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ میاں نے مجھ سے کنجی مانگی، کانپتے لرزتے ہاتھوں سے میں نے کنجی دے دی، انہوں نے صندوقچہ کھولا میرے پرزے، ایک ایک کر کے نکالے۔ میں اپنے باپ کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے گائے اپنے بچھڑے کو چھری کے نیچے دیکھ کر کانپنے لگتی ہے۔ اور جب انہوں نے میرے تمام پرزے چر چیر پھاڑ کر پھینک دیئے،

میرے منہ سے ایک بڑی دردناک چیخ نکلی اور میں بے ہوش ہو گیا، میری ماں دیوانہ وار مجھ سے چمٹ کر رونے لگیں۔ میاں کے حواس اڑ گئے، دادی جان نے آ کر میرے باپ کو ڈانٹا کہ کیا بچے کو مار ڈالے گا۔

ڈاکٹر عبد الکریم کو میرے بے ہوش ہو جانے کی خبر کی گئی، وہ فوراً آ گئے، انہوں نے میری نبض دیکھی، کہا "خاں صاحب گھرائیے نہیں، میں دوا ساتھ لایا ہوں" انہوں نے میرا منھ چیر کر دوا پلائی، رئیس کی اناں نے مجھ پر چھینٹے مارے اور دس پندرہ منٹ کے بعد مجھے ہوش آ گیا ــــ مجھے ہوش آتے ہی میرے باپ نے مجھ کو سینے سے لگا کر ارشاد فرمایا کہ بیٹا میں نے شعر کہنے کی تجھ کو اجازت دے دی ــــ میں تجھے خود اصلاح دیا کروں گا، ادھر آ کر دم بھر کے لئے اس پلنگڑی پر لیٹ جا۔ میں لیٹ گیا تو میرا جی بہلانے کے لئے انہوں نے مجھ سے کہا "بیٹا! اس شعر کے معنی بیان کر ؎

وہ جلد آئیں گے، یا دیر میں شب وعدہ
میں گل بچھاؤں کہ کلیاں بچھاؤں بستر پر

اب شعر کی اجازت مل جانے کے بعد میری طبیعت بحال ہو چکی تھی میں نے ذرا سا غور کر کے عرض کیا میاں یہ شعر بہت آسان ہے اس کے دوست نے وعدہ کیا ہے کہ آج میں آؤں گا، اب شاعر اس ششں و پنج میں ہے کہ میں گل بچھاؤں کہ کلیاں۔ اگر وہ ٹھیک وقت پر آنے والا ہے تو میں کھلے ہوئے پھول، اور اگر دیر میں آنے والا ہے تو میں بے کھلی کلیاں بچھا دوں۔

میاں نے پوچھا "ڈاکٹر صاحب معنی صحیح بیان کئے ہیں شبیر نے؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا اس سے زیادہ صحیح معنی بیان ہی نہیں کئے جا سکتے۔ میاں نے کہا مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے، لیکن طرز بیان میں اس نے دو ٹھوکریں کھائی ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا ــــ

صاحبزادے پھر تشریح کر دیجئے۔ میں نے پھر ایک ایک لفظ دہرا دیا ــــ ڈاکٹر نے کہا "میرے نزدیک تو صاحبزادے نے کہیں ٹھوکر نہیں کھائی ہے، میاں نے ہنس کر کہا "آپ لاکھ سخن سنج اور حالی کے ہم وطن سہی، پھر بھی جائے استاد خالیست ــــ سنئے اس کی پہلی غلطی تو یہ ہے کہ اس نے کھلے ہوئے پھول کہا ہے، کلی جب چٹک کر کھل جاتی ہے تو اس کو پھول کہا جاتا ہے کھلا وٹ تو پھول کی عین ذات ہے اس لئے "کھلے ہوئے پھول" کہنا حشو و زوائد میں داخل ہے، اور دوسری غلطی یہ ہے کہ اس نے کلی کے متعلق "بے کھلی کلیاں" کہا ہے،

حالانکہ کلی کو تو اسی لئے کلی کہتے ہیں کہ وہ ہنوز چٹک کر کھلی نہیں ہو اور بے کھلا پن اس کی عین ذات ہے۔ اس لئے "بے کھلی کلیاں" کہنا صرف اسراف الفاظ کا نہیں۔

ایک مہمل سی بات لکھی ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا "بے شک آپ کا خیال درست ہے، پھول اور کلی کے ساتھ ان توصیفی سابقوں کی کوئی ضرورت نہیں۔" اس کے بعد میاں نے ارشاد فرمایا "اچھا ایک اور شعر کے معنی بتا دو تو میں شعر فہمی کو مان جاؤں گا

آ رہے ہیں، لاش کے وہ ساتھ ساتھ اب ہماری قبر کتنی دور ہے

یہ شعر سن کر میں الجھن میں پڑ گیا۔ دونوں مصرعوں میں کوئی ربط نظر نہیں آیا اور سوچنے لگا، اور دس پندرہ منٹ سوچنے کے بعد میں خوشی سے اچھل گیا، بستر سے اٹھ بیٹھا۔ میں نے کہا "شاعر کے جنازے کے جلوس میں اس کا دوست شریک ہے۔ شاعر کو یہ خیال ستانے لگتا ہے کہ اس کے دوست کو پیدل چلنے میں تکلیف ہو رہی ہوگی اس لئے وہ شاعر سے اکتا کر پوچھ رہا ہے کہ اب ہماری قبر کس قدر فاصلے پر رہ گئی ہے۔" میاں نے جھک کر مجھے سینے سے لگا لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی مجھ کو بہت داد دی، اور اس امر کا اعتراف کر لیا کہ ان کو یہ شعر مہمل معلوم ہو رہا تھا، میاں نے مجھ سے کہا "تمہیں اس شعر میں فن کے نقطہ نظر سے کوئی عیب تو نظر نہیں آ رہا ہے۔" میں بے چارہ فن سے واقف ہی کب تھا، میں نے کہا "کوئی عیب نہیں ہے۔" میاں نے فرمایا "اس کے پہلے مصرع میں تعقید ہے" اور پھر مثالیں دے کر سمجھایا کہ تعقید کیا ہے۔

ڈاکٹر نے کہا "خاں صاحب آپ صاحبزادے کو شاعری سے باز تو نہیں رکھ سکتے لیکن یہ بات ضرور سمجھا دیجئے کہ تکمیل تعلیم سے بیشتر اس مشغلے پر زیادہ وقت صرف نہ کیا جائے۔"

میاں صاحب نے فرمایا "ڈاکٹر صاحب میں تعلیم سے بھی آگے کی بات سوچ رہا ہوں۔ یعنی شاعری وہ چیز ہے جو شاعر کو اس امر کی اجازت ہی دیتی کہ وہ شعر کہنے اور شاعرانہ زندگی بسر کرنے کے علاوہ، دنیا کا کوئی اور کام بھی کر سکے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ وہ بلا ہے کہ شاعر کے دل میں دولت کو اس قدر حقیر کر دیتی ہے کہ وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، جس کا یہ نتیجہ، برآمد ہوتا ہے کہ وہ مفلسی کا صید زبوں ہو کر رہ جاتا ہے ڈاکٹر صاحب، جی باوا کے پاس جس قدر جائیداد اور دولت تھی، وہ میرے پاس نہیں ہے؟ اور میرے پاس جو جائیداد اور دولت ہے، وہ میرے بعد اس کے سات بھائی بہنوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ اور اس کے پاس جائیداد کا جو حصہ آئے گا۔ وہ اس قدر بڑا حصہ نہیں ہوگا کہ شاعری کی بے نیازی کو تا دیر برداشت کر سکے۔" اتنا کہہ کر ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے انہوں نے میری طرف نگاہ کر کے دعا کے لئے ہاتھ بلند فرما دیئے کہ اے اللہ میرے بچے کو

---

[1] میرے باپ اپنے دادا یعنی حضرت گویا کو جی باوا کہتے تھے۔

تباہی سے بچانا، اور اس پر ایسی کرم کی نگاہ رکھنا کہ معاش خاطر اس کو شروں کا منھ نہ دیکھنا پڑے۔

لہ میاں آپ کی دعا قبول نہیں ہوئی، آپ نے دعا مانگی رہی تھی اس بارگاہ میں جہاں عمر خضر کی درازی کے علاوہ کوئی اور دعا قبول ہی نہیں فرمائی جاتی۔ آپ کو خبر نہیں کہ ڈیکی آنکھوں کا تارا شبیر ایک کثیر العیال وقفید المعاش بوڑھے کی صورت سے داوی غربت میں ٹھوکریں کھا رہا ہے نہ پاکستان آکر ایک معمولی سی تنخواہ پر زندگی بسر کر رہا تھا، لیکن اس جرم پر ملازمت اور دیگر وسائل معاش سے محروم کر دیا گیا ہے کہ وہ (۱) عزت نفس کے مرض میں مبتلا ہے (۲) کسی کے اقتدار کے سامنے سر نہیں جھکاتا (۳) وہ اپنے ضمیر اور قلم کو فروخت نہیں کرتا (۴) اسے اپنے آبائی وطن سے نفرت نہیں ہے (۵) اور اس کا سب سے بڑا قصور، جس سے بغاوت کی بو آتی ہے، یہ ہے کہ وہ فقط پاکستانیوں اور ہندوستانیوں ہی کو نہیں بلکہ روئے زمین کے تمام باشندوں کو وحدت کی زنجیر میں جکڑ کر ایک مستحکم اکائی اور ایک آفاقی ریاست بنانے کے شیطانی خواب دیکھتا رہا۔

میاں، کاش میں آپ کی زندگی ہی میں مر جاتا اور آپ میرا جنازہ اٹھاتے، اور مجھ کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا مگر کیا کیا جائے قضا و قدر کی ستم ظریفی کو ؎

طعنان نازمیں کہ جگر گوشہ خلیل
آرد بزیر تیغ و شہیدش نمی کند

پہلا مشاعرہ

یہ غالباً ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء کی بات ہے کہ میں اپنے باپ کی معیت میں، حضرت مولانا رضا فرنگی محلی کے مشاعرے میں سب سے پہلی بار شریک ہوا اور دنگ ہو کر رہ گیا۔

آیئے میں آپ کو مشاعرے میں لے چلوں، تاکہ آپ خود دیکھ لیں کہ شفاف چاندنی بچھی ہوئی ہے، چاندنی پر قالین ہیں، گاؤ تکیے، دیواروں سے لگے ہوئے ہیں۔ ادھر ادھر صاف ستھرے اگالدان، پنچوں میں ہار لپٹے حقے، شال، باف سے منڈھی ہوئی چھوٹی چھوٹی کوری ہانڈیاں ہانڈیوں میں چاندی کے ورق کی معطر گلوریاں اور الائچی دانے، تنباکو، اور قوام کی ڈبیاں رکھی ہوئی ہیں۔ شعراء زیادہ تر انگرکھے اور اکثر شیروانیاں پہنے اپنے اپنے مراتب کے لحاظ سے دوزانو بیٹھے ہوئے ہیں سب کے سروں پر ٹوپیاں ہیں۔ سامعین میں سے کوئی بھی ننگے سر نہیں ہے۔ آپس میں آہستہ آہستہ باتیں ہو رہی ہیں، گلوریاں کھائی اور حقے پیئے جا رہے ہیں ــــــ اور جو شاعر مشاعرے کے فرش پر قدم رکھتا ہے وہ حاضرین کو جھک جھک کر غیر ملفوظ سلام کر رہا ہے حاضرین اس کے حسب مرتبہ نیم قد، یا بر قد، جوابی سلاموں سے اس کا خیر مقدم کر رہا ہے ہیلے ــــــ لیجئے، اب میر مشاعرہ کے سامنے شمع آ گئی ہے اور مولانا رضا کی غزل سے حسب دستور مشاعرے کا آغاز ہو رہا ہے۔ اور داد سے چھت گونجنے لگتی ہے۔ کس کی یہ مجال ہے کہ اثنائے غزل خوانی میں کوئی مصرعہ اٹھائے حقہ پی لے، پان کھا لے، آپس میں سرگوشی کرنے لگے یا کوئی ادھر سے اٹھ کر ادھر بیٹھ جانے کی جسارت کر سکے۔

میر مشاعرے کے بعد، اب شمع گردش کر رہی ہے نو مشق نوجوانوں کی صفوں میں اور کمی بیشی کے ساتھ سب کو داد مل رہی ہے اور معمولی اشعار کے سروں پر بھی "ما شاء اللہ" کے سہرے

باندھے جا رہے ہیں، لیجئے، لیجئے تو منتقوں میں اب میری باری آگئی۔ ارے غضب ہو گیا، شمع سامنے رکھی ہوئی ہے۔ رعب محفل سے میں کانپ رہا ہوں۔ شعرا کی صفوں سے آوازیں آرہی ہیں "بسم اللہ صاحبزادے بسم اللہ"، لیکن صاحبزادے کا دم نکلا ہوا ہے کیا مجال کہ منہ سے ایک حرف بھی نکل سکے ـــــ اب میرے باپ مجھ سے فرما رہے ہیں، پڑھتے کیوں نہیں، پٹھان کا بیٹا تو بارہ برس کی عمر ہی سے رن میں تلوار چلانے لگتا ہے۔ اور ایک تم ہو کہ تم سے غزل نہیں پڑھی جا رہی ہے" اب میرزا محمد ہادی صاحب رسوا، اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پہلو میں آگئے ہیں اور میری پیٹھ ٹھونک کر فرما رہے ہیں۔ "صاحبزادے، آپ تو شاعر، شاعر کے بیٹے، شاعر کے پوتے اور شاعر کے پرپوتے ہیں۔ پڑھیئے اور گرج کر پڑھیئے ـــــ اب بڑی ہمت کر کے میں مطلع پڑھ رہا ہوں، مطلع پر داد مل رہی ہے!! اور داد کے نشے میں شعر پڑھ رہا ہوں

اے نسیم صبح کے جھونکے، یہ تم نے کیا کیا
میرے مست خواب کی زلفیں پریشاں ہو گئیں

اس شعر پر مطلع سے زیادہ داد پا رہا ہوں ـــــ اور دوبے کے ساتھ دوسرا شعر سنا رہا ہوں ؎

میری آنکھیں جا رہی ہیں، کرب افراط خوشی
خندہ زن دیکھا کسی کو اور گریاں ہو گئیں

اب داد کا غلغلہ زیادہ بلند ہو رہا ہے اور سبحان اللہ، ماشاء اللہ، سے مشاعرہ گونج رہا ہے۔ اور میرزا محمد ہادی رسوا، حضرت صفی سے کہہ رہے ہیں "مولانا، دیکھئے آپ نے اس شعر کے تیور، یہ عمر اور اتنی گہری بات ـــــ اور اب میں آخری شعر پڑھ رہا ہوں۔

ہائے میری مشکلو، تم نے بھی کیا دھوکا دیا
عین دلچسپی کا عالم تھا کہ آساں ہو گئیں

دیکھئے چھتیں اڑ رہی ہیں اور دھوئیں پار ہو رہے ہیں اس شعر کی داد سے ـــــ اور اساتذہ فرما رہے ہیں "اللہ نظر بد سے بچائے۔

مشاعرے سے داد کے رطل ہائے گراں پی کر جھومتا جھامتا گھر آیا خوشی کے مارے دیر تک نیند نہیں آئی ـــــ اور سو گیا تو خواب میں رات بھر یہ دیکھتا رہا کہ پریاں بھینچ بھینچ کر مجھے گلے لگا رہی ہیں۔

غسل مجھ پر واجب ہو گیا۔ صبح اٹھتے ہی حمام کیا اور ناشتے سے فارغ ہو کر، جب اپنے باپ کی جوابگاہ کے برآمدے سے ہو کر گزرنے لگا، تو باپ کی آواز آئی "، ادھر

جناب[1] دم نکل گیا اس آواز غضب سے ـــــ اور جب لرزتا ہوا ان کی خوابگاہ میں گیا تو انہوں نے بڑی آواز میں ارشاد فرمایا" دیکھئے صاحب! یہ میری دلی تمنا ہے کہ آپ اس دنیا میں پھلیں، پھولیں، عمر مسیح و خضر پائیں، آپ کی دولت میری دولت سے بڑھ جائے، آپ کا مرتبہ مجھ سے ہزار گنا فزوں ہو جائے آپ کی زندگی کے ہر شعبے میں سبقت لے جائیں مجھ سے ـــ مگر کان کھول کر سن لیجئے کہ میں اس کو برداشت نہیں کر سکتا کہ خاں صاحب آپ مجھ سے شاعری میں بھی بڑھ جائیں ـــ رات کے مشاعرے میں آپ کو مجھ سے زیادہ داد ملی، اب آپ کا میرے ساتھ مشاعرے جانا بند ـــ قطعی بند ـــ
ـــ غضب خدا کا، باپ سے زیادہ بیٹے کو داد ملے، میں یہ الٹی گنگا بہنے کا موقع نہیں دینے کا ـــ سنا خاں صاحب۔

میرے باپ میر کو غالب پر ترجیح دیتے، ہلکی پھلکی زبان میں شعر کہتے، اور داغ[2] کے اس شعر پر عامل تھے۔

کہتے ہیں اسے زبان اردو　　　جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

ایک روز میں نے ان کی خدمت میں اپنی ایک غزل اصلاح کے واسطے پیش کی۔ جس میں جا بجا فارسی ترکیبیں تھیں۔ اور ایک مصرع تھا۔

" ہماری زندگی یعنی وفائے رازداں تک ہے"

انہوں نے تیوریوں پر ڈال کر ارشاد فرمایا کہ "سبحان اللہ یعنی وفائے رازداں تک ہے اسد لعی" کی داد نہیں دی جا سکتی ـــ مجھے اس بات کا شدید خوف ہے کہ تم کچھ دن میں "شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا" تک آ جاؤ گے۔ خاں صاحب میں تمہیں اصلاح نہیں دوں گا۔ اور تمہیں عزیز صاحب کے سپرد کر دوں گا وہ بھی "یعنی وفائے رازداں" اور "شمار سبحہ" کے برتنے والوں میں سے ہیں، دونوں میں خوب نباہ ہو جائے گا ـــ یہ فرما کر انہوں نے عزیز صاحب کو بلا کر، مجھے ان کا شاگرد بنا دیا ـــ اور یہ سلسلہ تلمذ پانچ چھ برس کے اندر ہی منقطع ہو گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عزیز بہت ہی اچھے استاد اور بہت ذی علم بزرگ تھے۔ اور جہاں تک زبان کی صحت اور لہجے کی نجابت کا تعلق ہے، ان کی ذات سے مجھ کو نہایت کثیر فائدہ حاصل ہوا لیکن جب مجھ کو واضح طور پر یہ محسوس ہونے لگا کہ میری فکر کا جادہ ان سے مختلف ہے اور ہم دونوں کی تخیل ایک ہی سمت سفر نہیں کر رہی ہے اور ان کی اصلاحوں سے اشعار کا لفظی رنگ دردوغن تو ضرور۔

[1] غصے کے وقت یہی ان کا لہجہ ہو جاتا کرتا تھا۔ [2] غالباً یہ سچ کہا گیا ہے کہ ARTISSE FISH

ابھر آتا ہے لیکن معنویت دھندلی ہو کر رہ جاتی ہے۔ تو میں نے اصلاح لینا ترک کر دیا۔

لیکن اس سے میرے اور ان کے تعلقات میں کسی قسم کی تلخی راہ نہیں پا سکی، میں ہمیشہ ان کے روبرو سر جھکاتا، اور وہ ہمیشہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے۔

ایک دن جب کہ میں بڑے دن کی تعطیل میں گھر آیا ہوا تھا۔ میری ماں نے بڑے درد بھرے لہجے میں مجھ سے ارشاد فرمایا "ننھے، تمہارے باپ میرٹھ والی سے نکاح کرنا چاہتے ہیں میں سوتیا ڈاہ سہ نہیں سکوں گی، مجھے میرے باپ کے گھر پہنچا دو، ورنہ میں سنکھیا کھا کر سو جاؤں گی"۔ ماں کی یہ بات سن کر میرا دل کانپ گیا۔ میں نے عرض کیا اماں آپ گھبرائیں نہیں، میں آپ کو چھ سات دن کے اندر ہی نانا جان کے وہاں پہنچا دوں گا۔

اس کے بعد میں نے اپنے بڑے بھائی شفیع احمد خاں اور ابرار حسن سے مشورہ کیا اور ہاتھ بٹانے کو ــــ کہا وہ دونوں آمادہ ہو گئے ــــ لیکن سوال یہ تھا کہ اتنے بڑے اور بھی ریزرو کمپارٹمنٹ میں سفر کرنے کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا۔

ہم دو روز تک یہی سوچتے رہے کہ روپیہ کیونکر فراہم کیا جائے، لیکن کوئی صورت سمجھ میں نہیں آئی، تیسرے دن ابرار آئے اور کہنے لگے "کیا کہیں گے آپ بھی، روپے کی ایسی تدبیر سوچ کر آیا ہوں کہ بٹ ہی نہیں پڑ سکتی۔ آپ جانتے ہیں کہ بشیر ماموں (میرے باپ) اور محمد علی چچا کے درمیان آج کل ان بن ہے، آپ اسی وقت ان کے پاس چلے جائیں اور ساری داستان سنائیں اور مجھ کو یقین ہے کہ بشیر ماموں کی دل آزاری کے واسطے، وہ کھٹ سے ڈیڑھ دو ہزار روپے دیدیں گے۔

مجھے ابرار کی یہ تدبیر پسند آئی اور جی کڑا کر کے، محمد علی چچا کی طرف روانہ ہو گیا۔ اور جب ان کی کوٹھی کے لکڑی کے زینے کو طے کر کے اوپر پہنچا تو یہ دیکھا کہ وہ ایک جڑاؤ صوفے پر بیٹھے حقہ پی رہے ہیں، اور ان کے پہلو میں ایک بلا کی نوخیز طوائف بیٹھی گنگنا رہی ہے اور سامنے کے صوفے پر چچا کے مصاحب سکندر مرزا صاحب اس کے گلے کی داد دینے میں سرگرم ہیں، یہ سوچ کر کہ بے موقع آ گیا ہوں، میرا دل چاہا کہ الٹے پاؤں چلا جاؤں لیکن اس نوخیز طوائف کی صورت اور اسکی آواز نے پاؤں میں زنجیر ڈالدی اور میں نظر جمائے اور طاقت سماعت کو حاضر کئے اسکی صورت دیکھنے اور اسکا ترنم سننے لگا کہ اتنے میں چچا نے حقے کا ایک لمبا سا کش لیکر دروازے کی جانب نظر اٹھائی تو دیکھا میں کھڑا ہوا ہوں، اور حیرت و ترنم کے ساتھ بے ساختہ انکے منھ سے نکل گیا۔ "ارے غلام شبیر[1] تم نے

---

[1] میرا پہلا نام غلام شبیر تھا بشیر احمد ہو گیا، اور بعد کو میں نے اسے بشیر حسن میں تبدیل کر دیا لیکن چچا مجھ کو ہمیشہ میرے پہلے نام غلام شبیر سے پکارتے رہے۔

سلام کیا۔

وہ طوائف اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اور میرے دل پر شہاب ثاقب کی سی لکیر ڈالتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی اور سکندر مرزا صاحب بھی اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلے گئے۔

بچا سے میں نے تمام ماجرا بیان کر کے دو ہزار طلب کئے۔ انہوں نے زبان سے ایک حرف بھی نہیں کیا، اٹھے اور الماری سے دو ہزار کے نوٹ نکال کر میرے حوالے کر دیئے۔ میں نے چچا کو جھک کر سلام کیا، اور اس طوائف کو پھر ایک نظر دیکھ لینے کی تمنا لئے ہوئے گھر آ گیا۔

روپیہ آ گیا تو ابراہر کو لکھنؤ روانہ کر کے ایک سکنڈ کلاس کمپارٹ منٹ کو ریزرو کرا کے ملیح آباد منگا لیا، اور شام ہوتے ہی مکان کے عقبی دروازے سے نکل کر ہم سب اپنے کمپارٹ منٹ میں آ گئے، اور تمام کھڑکیاں اندر سے بند کر کے روشنی گل کر دی۔

تھوڑی دیر میں لکھنو جانے والی گاڑی آ گئی، ہمارا درجہ بریک کے پیچھے لگا دیا گیا۔ ابھی گاڑی چھوٹنے میں دو تین منٹ باقی رہے کہ پلیٹ فارم پر میرے باپ کی آواز گونج اٹھی۔ "اسٹیشن ماسٹر صاحب، کیا اس گاڑی سے میرے لڑکے سفر کر رہے ہیں۔"

اسٹیشن ماسٹر کو رشوت دے کر ہم اپنا چکے ہیں اس لئے کہا "خاں صاحب آپ کے صاحبزادوں میں سے اس گاڑی میں کوئی سفر نہیں کر رہا ہے۔"

میرے باپ کو اطمینان نہیں ہوا۔ اسٹیشن ماسٹر سے فرمایا۔ دو چار منٹ گاڑی رکوا لیجئے تاکہ میرے آدمی ایک ایک درجے کو دیکھ لیں، ممکن ہے آپ کی نظر نہ پڑی ہو ——— گاڑی رکوا دی گئی ——— اور نوکر چاکر اور اقرباء نے پوری گاڑی کھنگال ڈالی، ہم نہیں ملے ہم تو اندھیرے دو بجے ہیں۔ بریک کے پیچھے دبکے ہوئے تھے۔ کسی ڈھونڈنے والے اور خود میاں نے ہمارے ڈبے کی طرف اس خیال سے نظر بھی نہیں اٹھائی کہ وہ یہ سمجھے کہ وہ ڈبہ خالی جا رہا ہے۔

گاڑی تقریباً پانچ چھ منٹ تک ملیح آباد اسٹیشن پر کھڑی رہی، اور ان چند لمحوں کے اندر ہزاروں صدیوں کا مجموعی خوف ہمارا احاطہ کئے رہا ——— ہم سب اتنی دیر تک سولی پر ٹنگے رہے میاں کی آواز بجلی کی طرح ہمارے دلوں پر گر رہی تھی، اور میں اندر سے کھنچنے لگی کھڑکیوں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اب ٹوٹیں، اب ٹوٹیں ——— مجھ کو اپنے انفاس کی آمد و شد سے ڈر لگ رہا تھا پسینے پر پسینے آ رہے تھے، تمام جسم برابر بھیگتا چلا جا رہا تھا، اور دل یوں کھٹ کھٹ کھٹ دھڑک رہا تھا کہ ہر بار یہ گمان ہوتا تھا کہ سینہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

۱؎ خدا جانے کس نے مخبری کر دی تھی، یہ بات آج تک معلوم نہیں ہو سکی

خدا کی قسم، اس وقت اگر ڈائن موت جبڑا کھول کر سامنے آجاتی کہ میرے جبڑوں میں آ جاؤ گے یا باپ کے قبضے میں جاؤ گے تو میں فوراً اس کے جبڑوں میں گھس جاتا کہ اتنے میں، گاڑی نے سیٹی دی سیٹی کی آواز سے دل دہل گیا، پہیوں میں چوں چوں شروع ہوئی گاڑی رینگنے لگی، اوپر کی سانس نیچے آئی، کھڑے رونگٹے بیٹھنے لگے، سانس کا نظام درست ہونے لگا، اور جب کالکوری کے پل پر گاڑی پہنچ گئی تو میں نے جیسے ہی درجے کی روشنی کھولی تو یہ دیکھا کہ میری ماں سجدے میں ہیں۔ عباسی خانم معلانی فرش پر اوندھی پڑی ہوئی آہستہ آہستہ نادعلی پڑھ رہی ہیں۔ اور ابرار اور بڑے بھائی سیٹوں کے نیچے سے برآمد ہو رہے ہیں۔ یہ سماں دیکھ کر میری ہنسی نکل گئی ——— ابرار نے قہقہہ لگایا، اور بھائی صاحب کے تیوروں پر بل پڑ گئے ——— اماں میری، بلائیں لینے لگیں ——— لیکن عباسی خانم بدستور اوندھی پڑی رہیں ——— یہاں تک کہ چاد باغ آگیا۔

ڈونڈلہ جنکشن پر گاڑی رکی تو ایک لمبے تڑنگے، بڑی بڑی گچھے دار مونچھوں کے تھانیدار صاحب آٹھ دس پولیس والوں کے ساتھ آئے اور بڑے تحکمانہ انداز سے پوچھا "آپ کا نام کیا ہے؟ ———"

میں نے بگڑ کر کہا "رستم دوراں شبیر حسن خاں" سر سے لے کر پاؤں تک اس نے مجھ کو دیکھا اور کہا "میں آپ سب کو یہاں اتار لینے کے واسطے آیا ہوں" میں نے تن کر جواب دیا۔ "کس کی مجال ہے کہ ہم کو اتار لے!" اس نے حکم دیا سپاہیوں کو کہ ان کا سامان اتار لو، میں، میرے بھائی اور ابرار ڈنڈے لے کر پلیٹ فارم پر کود پڑے، اور میں نے پولیس والوں سے ڈانٹ کر کہا، "خبردار ہمارے درجے میں قدم نہ رکھنا۔" اتنے میں ہمارے درجے کے سامنے لوگوں کے ٹھٹ لگ گئے تھانیدار نے انگلی بلند کر کے کہا "میں اسباب اتروائے بغیر نہیں مانوں گا" میں نے ڈنڈا زمین پر مار کر کہا "اگر ہمت ہے تو سامان اتار کر دیکھ لو۔" تھانیدار نے کہا "آپ نہیں مانیں گے" میں نے کہا، "جب تک زندہ ہوں نہیں مانوں گا۔" لوگوں کا ہجوم اور ہماری آوازوں کا زور شور اسٹیشن کے انگریز سپرنٹنڈنٹ کو ہمارے درجے کی طرف کھینچ لایا۔ آتے ہی اس نے تھانیدار سے انگریزی میں پوچھا، "معاملہ کیا ہے ———؟" تھانیدار نے بڑی نرم آواز میں جواب دیا کہ "میں ان لڑکوں کے باپ اور نانا کا ملنے والا ہوں ان کے باپ نے مجھے تار دیا ہے کہ وہ دوسری گاڑی سے یہاں آ رہے ہیں، میں ان کے خاندان کو یہاں اتار لوں۔" ریلوے سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا، "گرفتاری کا وارنٹ آپ کے پاس ہے" تھانیدار نے جھینپ اور ڈر کر جواب دیا کہ "یہ باپ اور بیٹوں کا پرائیوٹ معاملہ ہے اس میں وارنٹ کی کیا ضرورت ہے" سپرنٹنڈنٹ نے بگڑ کر کہا: "آپ قانون کی گرفت میں آچکے ہیں، پولیس افسر ہو کر آپ ایسی خلاف قانون بات کر رہے ہیں اور وہ بھی ریلوے پلیٹ فارم کے سے پبلک مقام پر ——— آئیے میرے دفتر میں"

اس کے بعد ہمارا ڈبہ آگرے جانے والی گاڑی میں جوڑ دیا گیا۔ اور ہم آگرے، اور آگرے سے دھول پور پہنچ گئے، اور نانا جان سے تمام ماجرا بیان کر دیا۔ ہماری داستان سن کر میری سوتیلی نانی نے نانا جان سے کہا تم بشیر احمد کے غصے کو نہیں جانتے، وہ بڑا غضبناک پٹھان ہے، اسی وقت ہمارا حرم کے پاس گئے اور حویلی کے گرد پولیس کا پہرا بٹھا دیا۔

دوسری گاڑی سے میرے باپ دھول پور آگئے، لیکن انتہائی دانش مندی کی بنا پر ڈاک بنگلے میں ٹھہر گئے اور اپنے بہنوئی نواب احمد خاں کو، جو میرے بڑے بھائی کے خسر تھے، نانا جان کی حویلی سن گن لینے کے لئے روانہ کر دیا۔

نواب پھوپا نے آ کر جب پہرے چوکی کا حال بتایا تو میرے باپ نے نواب پھوپا سے کہا، میں آپ کے ساتھ گاڑی میں چلتا ہوں، گاڑی کو باہر روک دوں گا۔ آپ نواب صاحب کے پاس جائیں میرا سلام کہیں، اگر وہ مجھے بلانے پر آمادہ ہو جائیں تو پھر کوئی دشواری ہی نہیں ہوگی، میرے بلانے پر انکار کریں تو آپ حویلی سے نکل کر ڈیوڑھی کے چبوترے پر کھڑے ہو جائیں اور کسی نوکر سے یہ کہیں کہ نواب صاحب نے اپنے داماد کو بلایا، وہ پھاٹک پر گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہیں، انہیں بلا لاؤ۔

یہ جادو چل گیا، میرے باپ انا نا کی حویلی میں پہرے داروں کا سلام لیتے ہوئے داخل ہوئے۔ نانا جان سنگ مرمر کی چوکی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے کہ کھلے ہوئے زینے سے میرے باپ کی پیشانی نمودار ہوئی، نانی نے چیخ مار کر کہا۔ ارے بشیر احمد،، نانا، نانی کی چیخ سن کر گھبرا گئے، ہاتھ لگا کر حقہ گر گیا اور چلم ٹوٹ گئی۔ ہم سب لوگ گڈ گڈا کر بھاگ کھڑے ہوئے اور سامنے کے سنگین کمرے میں داخل ہو کر اندر سے کنڈیاں لگا لیں۔ حواس غائب ہو گئے اور عباسی خانم کے پاس سے کھر اسند کے بھبکے آنے لگے۔

لیکن یہ دیکھ کر میاں نے نانا جان کو جھک کر سلام کیا، اور انکا ہاتھ سینے سے لگا کر روتے ہوئے یہ کہا کہ، بابا آپ کے سر عزیز کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے عقد ثانی کا کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا، نہ جانے کس نے کان بھر دیئے کہ یہ لوگ مجھ سے بگڑ کر یہاں آ گئے ہیں، اپنے والد مرحوم کی روح کی قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی بھر عقد ثانی نہیں کروں گا۔ اور سچے دل سے یہ کہتا ہوں کہ آپ کی صاحبزادی اور اپنے بچوں سے مجھے شکایت مطلق نہیں ہے کہ وہ سب یہاں کیوں چلے آئے۔ اگر ایسی افواہ سن کر وہ اپنی ماں کی مدد نہیں کرتے اور ان کو آپ کے قدموں تک نہ پہنچا دیتے تو میں ان کی شرافت سے مایوس ہو جاتا اور یہ سمجھ لیتا کہ جو بچے اپنی ماں کے وفادار نہیں، وہ میرے کیا ہو سکتے ہیں۔

یہ سن کر نانا کا چہرہ بحال ہو گیا، میری ماں کو آواز دی کہ اپنے بچوں کو لے کر یہاں آ جا ہم آئے تو میاں نے ہم سب کو گلے لگا لیا اور فرمایا: میرے گھر کے ڈوبے آفتاب یہاں مل گئے۔ خدا کی قسم میں تم سے

ناخوش نہیں ہوں، اور تم نے اپنی ماں کو ریزرو گاڑی میں لاکر میری لاج رکھ لی۔ اگر خدانخواستہ عام درجے میں لاتے تو میں زندگی بھر کسی کو منھ نہ دکھا سکتا۔

جب ہم سب ملیح آباد گئے تو میرے باپ نے میری ماں سے کہا آپ کو کچھ خبر بھی ہے کہ آپ کے یہ بڑے صاحبزادے یہاں کس شرط پر تشریف لائے ہیں۔ میری ماں نے پوچھا کس شرط پر کہ میں امانی گنج کا پورا باغ ان کے نام لکھ دوں " میری ماں نے چھاتی پیٹ کر کہا، " ہے ہے شفیع شریف بیٹے باپ سے بھی برتاؤ کرتے ہیں۔

میرے باپ، قول کے دھنی تھے، دوسرے ہی روز امانی گنج کا باغ لبھائی صاحب کے نام لکھ دیا اور فرمایا،"

شبیر کل اس کے جواب میں بڑا باغ جو اس سے آٹھ گنا بڑا ہے، تیرے نام لکھ دوں گا میں نے کہا،" میاں آپ مجھے خوش کرنا چاہتے ہیں تو میرے نام نہیں، اماں کے نام لکھ دیجیے" میاں نے میری پیٹھ ٹھونک کر کہا،" شاباش شاباش تو بڑے دل کا آدمی ہے ——— اور دوسرے دن بڑا باغ میری ماں کے نام لکھ دیا[1]۔

---

[1] میاں کے انتقال کے بعد جب میری ماں بڑا باغ میرے نام منتقل کرنے لگیں تو میں نے کہا اماں رئیس احمد کو بھی شریک کیجیے میری ماں نے ہم دونوں نام باغ لکھ دیا اور ہمکو ہماری نیت کا پھل مل گیا۔

علی گڑھ میں

ایم اے او کالج میں میرا داخلہ

میرا غالباً ۱۹۱۲ء میں وہاں کے اسکول میں داخلہ ہوا تھا، اور مجھے ممتاز ہاؤس کے نمبر ۲۴

۱؎ یعنی "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج"، یہ مسلمانوں کو غیر اسلامی خطاب دینے والا غلامانہ انگریزی نام، اس کالج کے بانی ان سید احمد نے دجن کے کاسہ سر میں "سر" کے خطاب سے ہندوستان شکار عقاب اپنا آشیاں بنا چکا تھا) اپنی ذہنیت کے اس نیشتر زبوں سے تراشا تھا جس سے حب وطن کے پہاڑ کاٹے جاتے اور "عشرت کدہ پرویز" کی جانب "جوئے شیر لائی جاتی ہے۔ اور جس کے باعث ہم آزاد ہو جانے کے باجود بزرگ کا موروثی اثر ہے جو آج تک ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔ اور جس کے باعث ہم آزاد ہو جانے کے باوجود آج بھی اپنے سرکاری محکموں، تہذیبی اداروں اور اپنے شہر کے محلوں کو۔ پی آئی۔ ڈی سی رائٹرز گلڈ۔ اور پی، ای، سی، ایچ سوسائٹی کے انگریزی نام عطا فرما کر فخر محسوس کرتے ہیں اور یہاں تک کہ اپنے ناموں کے سروں پر ٹی، پی عبداللہ۔۔ اے ڈی، اظہر۔ وائی، الیف، مجیب۔ اور ڈبلو، ڈبلو رحمٰن کے گندے ٹوکرے لا دلا کر اس آرزو میں مرے جا رہے ہیں کہ کوئی اللہ کا بندہ، ہم غلاموں کو، فرنگی یا کم سے کم کرسٹان ہی سمجھ لے اور ہماری کالی نیٹویت پر انگلستان کا گورا پن چھا جائے۔ دراصل علی گڑھ تحریک اٹھائی گئی تھی اس غرض سے کہ (۱) مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے بے تعلق ثابت کر کے اس امر پر مہر تصدیق ثبت کر دی جائے کہ مسلمانوں کا دل حب وطن کی سی ذلیل چیز سے قطعی آلودہ نہیں ہے (۲) مسلمانوں کو پیٹ پالنے کی خاطر فقط اسی قدر تعلیم دی جائے کہ وہ بابو، ڈپٹی کلکٹر بن کر بڑا بابو بن سکیں (۳) اپنی زبان کو فراموش کر کے انگریزی میں اس قدر غرق ہو جائے کہ وہ انگریزی میں سوچے اور انگریزی ہی میں خواب دیکھے (۴) وہ مغربیت اختیار کر کے مشرق سے اس قدر بیزار ہو جائے کہ اپنی معاشرت، اپنی زبان اپنے ادب، اپنے روایات، اپنی ثقافتی ولادت کو ذلیل اور یہاں تک کہ اپنے باپ دادا کو احمق ——

کمرے میں جگہ دی گئی تھی۔ اس کمرے میں کاکوری کے دو سگے بھائی ثابت علی اور ثامن علی پہلے سے موجود تھے۔ اور میرے قیام سے تثلیث پیدا ہو گئی تھی۔ اور ان دونوں بھائیوں کے چلے جانے کے بعد، رام پور کے دو سگے بھائی برکت اللہ خاں، اور محسن اللہ خاں میرے کمرے میں آ گئے ـــــ ہمارا وہ" دو سگے بھائیوں اور ایک دوسرے خاندان کے طالب علم والا کمرہ بورڈنگ ہاؤس کے سب پراکٹر مظہر علیم صاحب، فریدی آبادی کے کمرے سے ملا ہوا تھا۔ ہر چند مظہر علیم صاحب مہربان استاد تھے۔ مگر ایک ناگفتنی علت کی بنا پر ہمارے مابین رقابت پیدا ہو گئی تھی۔ اور وہ محسن اللہ خاں، عبد الجلیل خاں اور مجھ سے ناخوش رہا کرتے تھے۔

میرے زمانے میں قدیم وضعداری کے مکمل علم بردار، نواب وقار الملک سکریٹری، سید احمد کی آنکھیں دیکھے ہوئے، میر ولایت حسین صاحب پراکٹر، جن کا تمام کالج احترام کرتا تھا اور جن کی شفقت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا سب کے دلوں پر۔

ہمارے دور میں کالج کے ڈاکٹر تھے شفاعت اللہ صاحب، جن کو ہماری شریر پارٹی نے یہ دھمکی دے کر ہموار کر لیا تھا کہ اگر آپ ہم لوگوں کو ہمارے مطالبے پر فرضی بیماریوں کی چھٹیاں نہیں دلائیں گے اور ہماری فرضی بیماری کے مواقع پر ہمارے پرہیزی کھانوں میں کباب پراٹھے اور مرغ مسلم تجویز نہیں کریں گے تو ہم آپ کا نام، "ہلاکت اللہ" رکھ کر اس نام کو اس قدر شہرت دیں گے کہ معاینے کے بعد آپ جس بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہو گئے، وہاں کے در و دیوار "ہلاکت اللہ ہلاکت اللہ" کے نعروں سے گونجنے لگیں۔

اسی طرح ہماری مضبوط پارٹی نے ڈاک خانے والوں کو بھی اس قدر ڈرا دیا تھا کہ جب ہم علی گڑھ سے باہر سیر کرنے جانا چاہتے تھے تو وہ ہمارے گھروں سے بلادے کے فرضی تار ہمارے نام بھیج دیا کرتے تھے۔

ہمارے خاص معلم تھے واجد علی صاحب شیدا اور قاضی عبد الجلیل صاحب مراد آبادی۔ واجد علی صاحب بڑے مزے کے آدمی تھے، وہ جب کسی حسین طالب علم کو ڈھیلے ہاتھ سے

سمجھنے لگے ہیں۔ (۵) اور اس کا نتیجہ یہ برآمد ہو کر حکومت برطانیہ کو دوام حاصل ہو جائے اس میں کوئی شک نہیں کہ مزاج روزگار کی کار فرمائی کی بدولت اس شر سے خیر اور اس نقصان سے کچھ فائدے کے پہلو بھی نکل آئے۔ لیکن جب آخری حساب کتاب کے بعد "میزان کل" کی نوبت آئی تو پتا چلا کہ اس کاروبار میں نفع بہت کم اور گھاٹا بہت زیادہ ہوا ـــــ اور قلیل سود کا کثیر زیاں احاطہ کئے ہوئے ہے۔

ٹھپیڑ مارتے تو اس کے گالوں پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیر کر، دونوں آنکھیں بیچ لیا کرتے تھے، انہیں
کی فرمائش پر میں نے ایک انگریزی نظم "لارڈ یونیس ڈاٹر"، کا اردو نظم میں ترجمہ کیا تھا۔ وہ
میری غالباً پہلی یا دوسری نظم تھی، جو تلف ہو چکی ہے۔ اور ہمارے دوسرے معلم قاضی صاحب
بلا کے ظریف انسان تھے۔ اور ان کا یہ مزاحیہ دعویٰ تھا کہ انگریزی زبان، اردو کے بطن سے پیدا
ہوئی ہے ـــــ اور ابتدا میں ایک بوڑھا انگریز تھا جو اردو بولنے والوں کے الفاظ، اپنے نیچے
میں لکھ لیا کرتا تھا۔ اور اس کو وہی بیاض انگریزی زبان کا سرمایہ بن گئی۔
وہ کہتے تھے، یہ ڈاٹر، فادر، مدر. سرنڈر، اور ڈیکوریشن کے الفاظ دراصل دختر،
پدر، مادر، سرانداز، اور دیکھو رے سان، سے بنائے گئے ہیں، جن کا تلفظ بگڑ گیا ہے۔ اور
انگریزی میں طوالف کے لئے جو "پراسٹی چیوٹ" کا لفظ ہے، وہ ہماری ہی اردو کے "پرائے واسطے
کی"، کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔
میرے دور کا علی گڑھ ایسا نہیں تھا، جیسا کہ آج کل کا علی گڑھ ہے۔ اس زمانے کے
طالب علموں میں کوئی اودھی تھا، نہ پنجابی، بنگالی تھا، نہ بہاری صوبوں کے تعصبات کو کسی کو خبر ہی
نہیں تھی اور جتنے بچے تھے وہ سارے ایم اے او کالج کے بچے، اور آپس میں شیر و شکر تھے اور
ان کے مابین اس قدر مضبوط اتحاد تھا کہ سارے شہر پر دھاک بیٹھی ہوئی تھی ہماری۔ اور یہاں
تک پولیس بھی لرزہ براندام ہوتی تھی ہم سے۔ اور اگر کسی لڑکے پر کوئی آنچ آجاتی تھی تو سارا کالج
دوڑ پڑتا تھا اس کی امداد کے واسطے۔
اپنی پارٹی کے تمام ارکان کے نام مجھ کو یاد نہیں رہے ہیں۔ پٹنہ کے سید عباس علی سید مبارک علی،
رام پور کے محسن اللہ خاں جو اب علی گڑھ کے عبدالجلیل خاں کے نام فراموش نہیں ہوئے ـــــ اور یہ بھی
حافظے میں محفوظ ہے کہ اسی پندرہ بیس لڑکوں کی ٹولی کے سردار تھے عبدالجلیل خاں اور انکے نائب تھے محسن اللہ خاں
ایک بار جب ہم پانچوں لڑکے، یعنی عباس علی، مبارک علی، محسن اللہ، عبدالجلیل اور میں سالانہ
امتحان میں پاس ہو گئے تو ہم لوگوں میں یہ مسکرٹ ہوئی کہ پاس ہونے کی خوشی میں آگرے جا کر دہلی
دیکھیں۔
لیکن اس عیاشی کے واسطے روپیہ کہاں سے آئے؟ اور چھٹی کیونکر ملے؟ یہ بڑا ٹیڑھا سوال تھا
عباس علی نے یہ مشورہ دیا کہ ہم سب اپنے اپنے باپوں کو خط لکھ لکھ کر اپنے پاس ہو جانے کی خوشخبری
سنائیں اور نئے کورس کی کتابوں کی غلط سلط لمبی چوڑی فہرست بھیج بھیج کر اپنے اپنے گھروں سے
پانچ پانچ سو روپیے منگائیں ـــــ یہ تجویز پنچوں نے بہت ہی پسند کی۔ سب نے اپنے اپنے
باپوں کو اسی مضمون کے خط بھیجے میں نے بھی اپنے باپ کی خدمت میں اپنا خط روانہ کر دیا۔

سبق لکھتے جب چھ سات روز ہو گئے، تو ایک دن دیکھا کہ داروغہ امید علی چلے آ رہے ہیں انہیں دیکھتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا کہ ہو نہ ہو دال میں کچھ کالا ضرور ہے داروغہ صاحب کمرے میں آئے میں نے سلام کیا، سب کی خیریت پوچھی اور ان کے آنے کا سبب دریافت کیا۔ انہوں نے کہا "خاں صاحب منی آرڈر کر رہے تھے مگر۔ بڑے بھیا (میرے برادر بزرگ) نے کہا تم کسی کے ہاتھ براہ راست ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس بھیج دی جائے۔ میں سن سے ہو کر رہ گیا، لیکن چہرے سے پریشانی ظاہر ہونے دی۔ اور محسن اللہ کے پاس جا کر، جو اس وقت جلیل کے کمرے میں گئے ہوئے تھے سارا ماجرا بیان کر دیا۔ محسن تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد آئینہ دیکھنے لگے، میں نے کہا ماشاءاللہ میں مصیبت میں گھرا ہوا ہوں اور تم آئینہ دیکھ رہے ہو۔ انہوں نے مسکرا کر کہا، "تمہاری مشکل حل کرنے کیلئے ہی آئینہ دیکھ رہا ہوں" میں نے کہا مجھ سے مذاق کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا۔ تم تو چغد ہو، میری بات سمجھ ہی نہیں رہے ہو۔ میں آئینہ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ میں انگریزوں کی طرح خوب گورا چٹا ہوں اور ہماری خوش قسمتی سے پرانی مونچھیں بھی انگریزوں کی طرح کر لی ہیں میں نے کہا یہ کیا کہہ رہے ہو۔ کیا گھاس کھا چکے ہو؟ انہوں نے کہا، "تم بھی کتنی موٹی عقل کے آدمی ہو۔ جاؤ کمرے سے میرا کالا سوٹ، میرا بوٹ، ٹائی اور ہیٹ لے آؤ مگر اس طرح کہ کوئی دیکھنے نہ پائے۔ میں نے ان سے پوچھا وہ کیوں؟" انہوں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا "خاموش، وقت ضائع نہ کرو اور جو چیزیں میں نے کہی ہیں جلدی سے لا دو۔ میں ان کا سب سامان لے آیا۔ انہوں نے جلدی جلدی سوٹ پہنا اور سر پر ہیٹ لگا کر کہا، "آؤ میرے ساتھ" میں سٹپٹا گیا اور ان کے ساتھ ہو لیا۔ وہ سیدھے ہیڈ ماسٹر کے کمرے کے برآمدے میں داخل ہو گئے اور ہیڈ ماسٹر کے چپراسی سے کہا، "ہم اس وقت ایک مذاق کرنے آئے ہیں، ابھی ہیڈ ماسٹر کے آنے میں آدھ گھنٹہ باقی ہے، تم مجھ کو اجازت دے دو کہ میں ان کی کرسی پر بیٹھ جاؤں اور جب بشیر اپنے ساتھ ایک آدمی کو لے کر یہاں آئیں تو اس کو دروازے پر روک کر میرے پاس آؤ اور پھر کمرے سے نکل کر اس آدمی سے کہو، چلئے صاحب بہادر کے پاس، یہ کہہ کر محسن نے چپراسی کے ہاتھ پر پانچ روپئے رکھ دیئے۔ چپراسی نے بات مان لی اور محسن ہیڈ ماسٹر کی کرسی پر جا کر بیٹھ گئے اور میں دوڑتا ہوا ممتاز ہاؤس گیا اور داروغہ صاحب کو لے کر آ گیا، چپراسی نے حسب ہدایت اندر جا کر اطلاع کی اور باہر نکل کر داروغہ صاحب سے کہا۔ چلئے صاحب بہادر کے پاس۔

داروغہ صاحب نے ہیڈ ماسٹر کو سلام کیا، اور جیب سے میری فرستادہ فہرست کتب اور پانچسو کا نوٹ نکال کر ہیڈ ماسٹر کی میز پر رکھ دیئے اور پوچھا "حضور اس رقم میں کوئی کمی بیشی تو نہیں ہوئی" ہیڈ ماسٹر نے کہا "ول یہ رقم درقم (ایک دم دبا گول) ہمارا بر درست صحیح ہے، اچھا کمال صاحب سے

ہمارا اسلام بولنا — اب آپ جائیے۔

داروغہ امید علی، سلام کر کے میرے ساتھ باہر نکل آئے۔ اور جیسے ہی میں برآمدے کی سیڑھیوں سے اترنے لگا تو یہ دیکھا کہ بیچ پچ کا ہیڈ ماسٹر، تیز تیز قدم رکھتا چلا آرہا ہے اور چھوٹا ہیڈ ماسٹر غسل خانے کے دروازے سے نکل کر، منھ رومال سے ڈھانکے، انتہائی بزدلی کے ساتھ دوسری طرف بھاگتا چلا جارہا ہے تڑاتڑ، تڑاتڑ،

(۲) ایک بار مجھے اور محسن کو یہ شرارت سوجھی کہ چھت کے روشن دان سے مظہر علیم صاحب کے منھ پر پیشاب کیا جائے۔ چنانچہ رات کے بارہ بجے، ہم دونوں چھت پر چڑھ گئے، ان کے کمرے میں لیمپ جل رہا تھا، ہم نے جب یہ دیکھا کہ عین روشن دان کے نیچے ان کی چارپائی بچھی ہوئی ہے، تو ہم دونوں نے بڑے خضوع و خشوع کے ساتھ اپنے پاجامے کھولے اور نشانہ باندھ کر شرشراں کے منھ پر دھاریں مارنے لگے۔ سوتے میں ان کے منھ پر جب گرما گرم پیشاب کی دھاریں پڑنے لگیں، وہ چیخ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور روشن دان کی طرف سر اٹھا کر چیخنے لگے "ارے یہ کون بدمعاش ہے ارے، کون بدمعاش ہے — چوکی دار، چوکی دار، چوکی دار" چوکی دوڑا آیا، تو انہوں نے کہا "یہ کون بدمعاش چھت پر چڑھا ہوا ہے — جاؤ اوپر جاکر دیکھو۔ یہ شور سن کر ہم دونوں اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر، برآمدے میں آگئے، اور اپنے صیدنہ بوں سے بڑی معصومیت کے ساتھ ہم نے پوچھا "کیا ہوا ماسٹر صاحب؟" انھوں نے دانت پیس کر کہا "اس دکیا ہوا، کا صبح کو مزہ چکھادوں گا۔

صبح سید ولایت حسین صاحب، پراکٹر کے سامنے ہماری پیشی ہوئی۔ پراکٹر صاحب نے خشونت کے ساتھ بید اٹھا کر پوچھا صاف صاف بتادو یہ حرکت تم نے کی تھی؟ یا کسی اور نے، اگر جھوٹ بولے تو کھال کھینچ لوں گا۔ محسن نے کہا۔ "خدا کی قسم ہمیں کچھ بھی نہیں معلوم کہ یہ شرارت تھی کس کی، ہم دونوں بے خبر پڑے سو رہے تھے۔ شور ہوا تو ہماری آنکھ کھل گئی باہر آکر ماسٹر صاحب سے پوچھا، کیا ہوا؟ تو وہ، خواہ مخواہ، الٹے ہم پر برس پڑے، آپ ہم کو چاہیں تو مارلیں، آپ ہمارے باپ کے برابر ہیں، مگر قصور ہمارا کچھ نہیں ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ سب پراکٹر صاحب ہم پر تہمت کا الزام لگا کر ہم کو پٹوانا چاہ رہے ہیں۔"

پرصاحب بڑی کشمکش میں پڑ گئے، سر جھکا کر سوچنے لگے، اور کہا "اچھا تم دونوں جاؤ میں پوری تحقیقات کروں گا۔ اور اگر تمہاری خطا ثابت ہوجائے گی تو اس قدر ماروں گا کہ تم دونوں عمر بھر یاد رکھو گے" اور ہم دونوں دل ہی دل میں "سر سیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت" کہتے اپنے کمرے میں آئے، اور ایک دوسرے کے گلے لگ کر خوب ہنسے ۔۔۔ یہ خبر مسرت اثر سن کر شام کو جلیل ہمارے

کمرے میں آئے، ہم دونوں کو مبارکباد دی ـــ ہم سے کہا "تم دونوں کرسیوں پر بیٹھ جاؤ۔ ہم بیٹھ گئے" انہوں نے ہماری کرسیوں کے عین نیچے لوبان سلگا کر ہماری گردنوں میں ہار ڈال دیے۔ اور "ہپ ہپ ہرا" کہنے لگے۔

(۲۲) ناشتے اور دونوں وقت کے کھانے کے وقت، ہم لوگوں کو بلانے کے واسطے ڈائننگ ہال کے دروازے پر گھنٹہ بجایا جاتا تھا ـــ ایک روز، جب رات کے آٹھ بجے اور ڈائننگ ہال کا گھنٹہ نہیں بجا تو تمام لڑکے پریشان ہوگئے اور ڈائننگ ہال کے برآمدے اور صحن میں جمع ہو کر شور مچانے، اور عرب لڑکے "روٹی، روتی، روٹی، روٹی" کے نعرے لگانے لگے۔

اس ہنگامے کو سن کر ہمارے اور درمیانی گوشے کے دونوں سپرنٹنڈنٹ مظہر علیم صاحب اور فصیح الدین صاحب بھی وہاں آگئے اور چوکی دار سے پوچھنے لگے "گھنٹہ کہاں ہے ـــ ؟"

چوکی دار نے دیوار کی طرف اشارہ کرکے کہا "صاحب یہاں گھنٹہ لگا رہتا تھا، نہ جانے کون اڑالے گیا" اس پر فصیح الدین صاحب نے مظہر صاحب سے کہا "یا مظہر العجائب گھنٹہ غائب۔"

مظہر علیم صاحب نے چونک کر کہا "جلیل کہاں ہے؟ ہر طرف جلیل، جلیل، جلیل کی آوازیں بلند ہوگئیں جلیل ہوتے تو بولتے مظہر علیم صاحب نے چوکی دار کو حکم دیا کہ جلیل کو ڈھونڈھ کر لاؤ۔

چوکی دار نے آکر کہا، "وہ تو نماز کے ہال میں بیٹھے نماز پڑھ رہے ہیں" مظہر علیم اور فصیح الدین حیدر صاحب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ جلیل سجدے میں پڑے ہوئے ہیں، اور اسی عالم میں کوئی چیز اپنے کمبل میں لپیٹ رہے ہیں۔ مظہر علیم نے کمبل کا سرا پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا اور گھنٹہ بڑی جھنکار کے ساتھ فرش پر گر گیا، یہ دیکھتے ہی مظہر علیم نے سربسجود جلیل کے سر پر تڑاق سے ایک ٹیپ مار کر کہا "اٹھ کھڑا ہو مردود ـــ" جلیل نے دفعتہً کھڑے ہو کر چیخ ماری کہ یہ ہے اسلامی اسکول، جہاں عین سجدے کے وقت نمازی لڑکوں کے سر پر بیٹیں ماری جاتی ہیں یہ سنتے ہی مظہر علیم چانٹا تان کر جلیل کی طرف جھپٹے اور عرب لڑکے بھی آگئے مارنے کے واسطے جلیل نے یہ رنگ دیکھا تو "یا اللہ" کہہ کر ایک ایسی جست لگائی اور حکارے کی طرح چوکڑیاں بھرتے ہال سے اس طرح بھاگ کھڑے ہوئے کہ انہیں کوئی پکڑ ہی نہیں سکا۔

(۲۳) علی گڑھ میں بڑی دھوم دھام سے ہر سال نمائش ہوا کرتی تھی۔ ایک رات کو جب ہم بھٹیاری بڑا اٹھا کباب اور خوربے کی چٹنی کھا کر نکلے تو ہماری چنڈال چوکڑی ایک چاقو چھری بیچنے والے دکان کے سامنے جا کھڑی ہوئی ـــ نمائش کی تیز روشنی میں چھریاں اور چاقو ایسے جگمگ جگمگ ہو رہے تھے کہ میرا جی چاہا کہ میں انہیں بڑھ کر سینے سے لگاؤں۔ میں نے پٹھان دکاندار سے

پوچھا تو اس نے کہا "ایک روپیہ چار آنہ" محسن نے کہا "نہیں، دس آنہ" پٹھان نے کہا: "نائیں ایک روپیہ چار آنہ خوشی چاہے ٹیک (TAKE) خوشی چاہے تو نہ ٹیک (TAKE)"

ان آوازوں کو سن کر کالج کے دوسرے لڑکے بھی اسی طرف آ گئے اور ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے، دکان کے سامنے ــــ محسن نے پھر کہا "دس آنہ، دس آنہ" پٹھان نے پھر وہی جواب دیا "نائیں نائیں، ایک روپیہ چار آنہ، ایک روپیہ چار آنہ، خوشی چاہے ٹیک، خوشی چاہے نہ ٹیک" یہ سن کر محسن برافروختہ ہو گئے، تمام لڑکوں سے اشارہ کر کے کہا غازیو، بڑھو، ٹوٹ پڑو اور لوٹ لو مال غنیمت کو۔ یہ دعوت عام سن کر ٹوٹ پڑے تمام لڑکے چھریوں چاقوؤں پر، پٹھان جھپٹا، لڑکوں نے اسے دبوچ لیا، اور لٹنے لگی دکان دھڑا دھڑ۔ پٹھان نے پولیس، پولیس، پولیس، کے نعرے لگانے شروع کر دیئے ــــ پولیس والے جھپٹ پڑے۔ ہم نے چھریاں تان لیں، وہ ٹھٹک گئے۔ آتے ہیں ایک شامت کا مارا انگریز پولیس افسر، موٹر سائیکل پر بیٹھا ادھر آ گیا ــــ اور جب اس نے موٹر سائیکل سے ایک پاؤں اتارا کہ ہم کو ڈانٹنا شروع کر دیا تو ٹوٹ پڑے ہم سب اس پر اور اتنا پیٹا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر گیا ــــ اور ہم سب کے سب مال غنیمت لئے اور "خوشی چاہے ٹیک، خوشی چاہے نہ ٹیک" کے نعرے لگاتے وہاں سے بھاگ کر کالج آ گئے۔

(۲) ایک روز میرے ایک لکھنوی دوست اور میرے دوست پرنس میرزا عالمگیر قدر کا بھائی[1] جہانگیر قدر ہمارے پاس آیا فریادی بن کر، اور کہنے لگا "شیر، ایک فرسٹ ایر فول لڑکا فضل الٰہی ہے، وہ سالا اپنے حسن پر اس قدر مغرور ہے کہ سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتا، پیٹھ پر ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیتا تمہاری پارٹی ماشاءاللہ بڑی تگڑی ہے اس کو نیچا دکھاؤ تو میں تمہارا غلام ہو جاؤں۔"

ہماری پارٹی، لنگر لنگوٹ کس کر جہانگیر قدر کی مدد کے واسطے آمادہ ہو گئی۔ اتوار کے دن جہانگیر قدر کو دولہا بنا کر اور ہار پھول، سہرا، مصنوعی داڑھی اور ڈھولک لے کر ہم دس پندرہ لڑکے براتیوں کی طرح بجی پارک پہنچ کر، فضل الٰہی کے کمرے میں مبارک باد مبارک باد کے نعروں کے ساتھ دھڑا دھڑ گھس پڑے، فضل الٰہی نے جس کے متعلق ساری دنیا ایک طرف، فضل الٰہی ایک طرف کا غلغلہ ہر طرف بلند تھا۔ تیوریوں پر بل ڈال کر کہا "میں نے تو آپ لوگوں

---

[1] میرزا جہانگیر قدر کراچی میں رہتے تھے صد حیف کہ دو مہینے ہوئے کہ پچاسی چھیاسی برس کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کمبخت دنیا میں دولہا بھی مر جاتے ہیں اور دلہنیں بھی سدھار جایا کرتی ہیں۔

کو نہیں بلایا تھا۔ جلیل نے کہا دلہنیں بھی کسی کو بلایا کرتی ہیں جنیا، ہم جہانگیر قدر دولہا سے تمہارا نکاح پڑھانے آئے ہیں۔

اس لڑکے نے کوشش کی بھاگ نکلنے کی، ہمارے ساتھیوں نے اسے پکڑ لیا، دوپٹہ اسکے سر پر ڈال دیا۔ جہانگیر قدر کو ہار پہنائے جلیل نے جیب سے مصنوعی داڑھی نکال کر منھ پر لگائی اور قاضی بن کر اس لونڈے کا جہانگیر قدر سے نکاح پڑھا دیا اور نکاح پڑھا دینے کے بعد ساتھیوں نے ڈھولک بجا بجا کر بیچ سروں میں ستادیا نے گانا شروع کر دیئے۔ برآمدے میں لڑکوں کا میلہ لگ گیا اور ہر طرف قہقہے گونجنے لگے۔

اتنے میں کسی نے دیکھا کہ ہیڈ ماسٹر راؤنڈ لگاتا چلا آرہا ہے، ہم کو آگاہ کر دیا ہم سب خوف زدہ ہرنوں کے مانند بھاگ کھڑے ہوئے ـــ اور دولھا میاں ابھی اٹھ ہی رہے تھے کہ ہیڈ ماسٹر سر پر آ پہنچا ـــ فضل الٰہی نے اس سے فریاد کی۔ اس نے جہانگیر قدر سے پوچھا، تم کون ہو؟ ـــ

جہانگیر قدر کی زبان سے گھبراہٹ میں نکل گیا وہ SIR I AM BRIDEGROOM (جناب میں دولہا میاں ہوں) ـــ ہیڈ ماسٹر نے وہ دل مسٹر برائڈ گروم، دل مسٹر برائڈ گروم کہہ کہہ کر بیدوں پر دھر لیا۔

باقی تو صاف بچ کر نکل گئے، اور بے چارے برائڈ گروم صاحب پٹ گئے ـــ اور اس واقعے کے ایک ہفتے کے اندر ہم تینوں لڑکوں، یعنی محسن اللہ خاں، عبدالجلیل خاں اور آگے چل کر حضرت جوش، ملیح آبادی بننے والے شبیر حسن خاں کو بھی اسکول سے نکال دیا گیا ؏

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے نکلے

لکھنؤ میں دوبارہ آمد

علی گڑھ سے نکلا تو پھر لکھنؤ آگیا۔ بانہہ ٹوٹتی ہے تو گلے میں آتی ہے لکھنؤ آکر بار بار اور رئیس کی معیت حاصل ہوگئی۔ جوبلی ہائی اسکول میں داخل ہوگیا وہاں سے چرچ مشن اسکول اور چرچ مشن اسکول سے نکل کر، ریڈ کرسچین کا لجیئیڈیٹ اسکول میں داخلہ لے لیا۔

کچھ روز تک تو ہم لوگ لاٹوش روڈ کے اس دو منزلہ مکان میں رہے جس کو "بڑھیا والا مکان" کہا جاتا تھا۔ پھر چلے گئے راجہ ابو جعفر صاحب کی کوئینس روڈ والی کوٹھی میں اور وہاں سے منتقل ہوکر پھر پہنچ گئے کھجوے کے باغ کی کوٹھی میں۔

کھجوے کے قیام سے مجھے بہت فائدہ پہنچا، ایک طرف تو نارنگی کے باغ میں دوڑ لگاتے رہنے سے میری صحت بہت اچھی ہوگئی دوسری طرف مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ اور اسکول آتے جاتے حضرت پیارے صاحب رشید کی صحبت سے بہت علمی و ادبی فائدہ پہنچا اور تیسری طرف میرزا محمد ہادی صاحب رسوا لکھنوی (صاحب امراؤ جان ادا) سے میں نے باقاعدہ فارسی و عربی پڑھنا شروع کردی، عربی تو آنہ سکی، لیکن فارسی میں کسی قدر نظر پیدا ہوگئی اور اس کے ساتھ ساتھ میری اردو بھی خوب منجھ گئی۔

اور لکھنؤ آکر میرا بچھڑا محبوب عطا حسین قزلباش مجھ کو دوبارہ مل گیا۔ عطا حسین کی صحبت میں میری دادی نے جو شیعیت کے نقوش میرے دل پر بنائے تھے، وہ اور بھی ابھر گئے اور جیسا کہ اوپر بیان کرچکا ہوں، ناصر حسین صاحب قبلہ کی صحبت نے تو میری شیعیت میں پختگی پیدا کردی۔ اب میں برابر مجلسوں میں جانے اور ماتم کرنے لگا ـــــ اور میرے خاندان کی اصطلاح میں میری رافضیت مسلم ہوگئی، پھر بھی میرے باپ نے مجھ سے ناخوشی کا مطلق اظہار نہیں فرمایا۔

ے کھجوے میں آغائی صاحب کا ایک بہت بڑا نارنگیوں کا باغ تھا۔ اس میں قدیم وضع کی دو کوٹھیاں تھیں ایک کوٹھی میں ہم لوگ رہتے تھے، دوسری کوٹھی میں ناصر حسین صاحب قبلہ کا وسیع کتب خانہ تھا اور ہماری کوٹھی کے نیچے کے حصے میں آغائی صاحب کی لاش رکھی ہوئی تھی جو ایک معین مدت کے بعد کربلا بھیجی جانے والی تھی۔

میرے تبرائی شیعہ ہونے کا تیقن :۔

لیکن جب میرے باپ کے کان تک یہ خبر پہنچی کہ میں مقرہ جناب عائشہ کے جشن تبرا "میں بھی شریک ہوا تھا، تو یہ بات ان کو نہایت ناگوار گزری، انہوں نے میرے پھوپھی زاد بھائی امیر حسن خاں کی معرفت یہ پیغام بھیجا کہ میں تبرا ترک کر دوں، انہوں نے کہا "ماموں نے یہ فرمایا ہے کہ جہاں تک جب آل رسول کا تعلق ہے، میں اس کو جزو ایمان ہی نہیں، اصل ایمان نہیں سمجھتا اور رسول اللہ کے بعد حضرت علی کو سب سے افضل مانتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود صحابہ ثلثہ پر سب دشتم کو برداشت نہیں کر سکتا، اسلئے کہ اس فعل بد سے فقط خلفا، ہی کی توہین نہیں ہوتی بلکہ رسالت مآب کے فیضان صحبت پر بھی آنچ آتی ہے اور جب میں تبرے سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہیں ہوا تو میرے باپ نے وصیت نامے کی رو سے مجھ کو جائیداد سے محروم فرما کر فقط سو روپے ماہانہ کا گزارہ دار بنا دیا۔

اتنی بڑی جائیداد سے محروم ہو جانے کا میرے دل پر کوئی اثر نہیں پڑا، اور اس کے برعکس میں نے یہ سوچا کہ ناخوش ہو جانے کے بعد میرے باپ نے میرے نام سو روپے ماہانہ لکھ دیئے اگر وہ یہ بھی نہ کرتے تو میں کیا کر سکتا تھا۔ میرے باپ میں کس قدر شفقت تھی کا جوہر ہے

سچا خواب یا میرے تحت شعور کا فعال اضطراب

اس محروم الارث ہو جانے کے کوئی چھ سات مہینے کے بعد، ایک روز دوپہر کے وقت جبکہ شدید گرمی پڑ رہی تھی، اور میں کرٹہ ابوتراب خاں (لکھنؤ) کے مکان کے ٹھنڈے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا میں نے اللہ سے باتیں کرنا شروع کر دیں، میں نے کہا "سنتا ہوں کہ اے اللہ میاں جب کوئی تمہاری طرف ایک قدم اٹھاتا ہے تو تم اسکی جانب سو قدم بڑھ کر آتے ہو لیکن میرے ساتھ تمہارا معاملہ اس کے برعکس ہے، میں تمہاری طرف بڑھتا ہوں اور تم ہو کہ ٹس سے مس ہی نہیں ہوتے ہو، تمہیں خوش کرنے کے لیے میں نے

اپنے باپ کو ناخوش کر دیا، جائیداد سے محروم ہو گیا۔ اور تم مجھ سے یہ بتاتے ہی نہیں ہو کہ میں راہ راست پر ہوں یا گمراہ ہوں ارے اللہ میاں کچھ تو منہ سے بولو سر سے کھیلو۔ دل ہی دل میں یہ باتیں کرتے کرتے سو گیا۔

سوتے ہی خواب دیکھا کہ صبح کی گلابی روشنی پھیلی ہوئی ہے، آسمان سے سونا برس

لہ یہ مقرہ گولا گنج میں ہے جہاں تبرہ بازی کا ایک سالانہ جشن کیا جاتا ہے اور اکابر لکھنؤ شریک ہوتے ہیں

رہا ہے اور میں کسی سواری پر بیٹھا ایسی راہ سے گزر رہا ہوں جس کے دونوں طرف بڑے گھنے اور شاداب درخت نسیم سحر سے جھوم رہے ہیں اور ہزاروں چڑیاں ان کی شاخوں پر بیٹھی چہچہا رہی ہیں کہ مشرق کی طرف سے ایک جلوس بڑے تزک و احتشام کے ساتھ نمودار ہوا۔ میری نظریں اس جلوس پر جم کر رہ گئیں۔ اور جب وہ قریب آگیا تو رئیس جلوس کے چہرے کی تابناکی دیکھ کر میرے دل پر اس قدر اثر پڑا کہ میں اپنی سواری سے کود پڑا اور جھک کر سلام کیا۔ رئیس جلوس نے میری طرف آنکھیں اٹھائیں، ان کی آنکھوں سے کرنیں قطار در قطار نکلیں جو میرے دل میں پیوست ہو گئیں، اور وہ مسکرا کر میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے ایک سمت مڑ گئے۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ یہ کیسی غیر معمولی مقناطیسی شخصیت تھی کہ بے جانے پہچانے مجھ کو اس نے اس قدر متاثر کر دیا۔ کہ اتنے میں ایک دوسرا جلوس نمودار ہوا، اور اس عجیب صاحب جلوس کا بھی مجھ پر ویسا ہی اثر پڑا اور وہ بھی میرے سلام کا مسکرا کر جواب دیتا ہوا۔ اسی طرف روانہ ہو گیا جس طرف پہلا جلوس مڑ گیا تھا۔

جب دونوں جلوس نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو میں یہ بات سوچنے لگا کہ میں ان سے متعارف کیسے ہو سکتا ہوں؟ اور کیوں نہ ادھر مڑ جاؤں جدھر یہ دونوں جلوس مڑ گئے ہیں کہ دفعۃً میری پشت پر کسی نے ہاتھ مارا، میں اچھل گیا۔ اور مڑ کر دیکھا کہ ایک نورانی چہرے کے بزرگ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہے ہیں، میں نے پوچھا "آپ کون ہیں؟" انہوں نے کہا "ابوذر غفاری" میں نے سلام کر کے ان کے ہاتھ چوم لئے اور ان کے روبرو سر جھکا لیا۔ انہوں نے کہا "سر اٹھاؤ، یہ سر جھکنے کیلئے نہیں بنا ہے میں تم کو مبارکباد دیتا ہوں کہ تم کو سرور کونین محمد رسول اللہ اور ان کے جانشین مشکلکشا علی ابن ابو طالب کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے۔"

یہ سن کر میرے دل میں فخر کے فوارے چھوٹنے لگے اور آنکھوں سے مسرت کے آنسو برسنے لگے اور میں نے پوچھا "میں اپنے رسول اور امام کو ڈھونڈنے کدھر جاؤں؟" انہوں نے درخت کے ایک جھنڈ کی طرف انگلی اٹھا کر کہا "دیکھو وہ جو مسجد کا منارہ نظر آرہا ہے، اسی طرف چلے جاؤ، اللہ کا جواب تمہارا انتظار کر رہا ہے" یہ کہہ کر وہ غائب ہو گئے اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ ادھر روانہ ہو گیا۔ اور جب مسجد کے دروازے کی پہلی سیڑھی پر میں نے قدم رکھا تو یہ دیکھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم حوض کے کنارے آستینیں چڑھائے بیٹھے ہیں اور علی مرتضےٰ پانی کا ظرف ان کے پاس رکھ رہے ہیں۔ میری آہٹ سن کر رسول اللہ نے حضرت علی سے کچھ ارشاد فرمایا جسے میں سن نہیں سکا، رسالت مآب کا ارشاد سن کر وہ میری طرف اس طرح چلے جیسے کوئی

مژدہ سنانے والا چلتا ہے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے، وہ میرے پاس تشریف لائے اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر ارشاد فرمایا "وہ جو ہم سے محبت کرتا ہے، نہ تو اس کی دنیا ہی خراب ہوتی ہے نہ عقبیٰ۔ جاؤ بلندیاں تمہارا انتظار کر رہی ہیں" یہ خواب دیکھ کر میری آنکھ کھل گئی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے پھوٹ نکلے، اور دل بلیوں اچھلنے لگا۔ کہ بوا الحافظن نے آکر کہا "منجھلے بھیا میاں بلا رہے ہیں" میں دھڑکتے دل کو سنبھال کر اٹھا۔ جلدی جلدی منھ دھویا اور اپنے باپ کے روبرو جاکر کھڑا ہو گیا۔ میرے باپ کچھ لکھنے میں مشغول تھے قلم روک کر انہوں نے میری طرف نگاہ اٹھائی ان کی بڑی بڑی غلافی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ مجھ سے ارشاد فرمایا "بیٹھ جاؤ۔" میں بیٹھ گیا، اور وہ پھر لکھنے لگے۔ میں حیران ہو گیا کہ یہ معاملہ کیا ہے ان کا قلم بڑی تیزی اور روانی ولولے کے ساتھ دس پندرہ منٹ تک چلتا رہا، اور جب عبارت مکمل ہو گئی تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ "بیٹا یہ جائیداد ایسی کمبخت چیز ہے کہ اسے حاصل کرنے کیلئے بھائی بھائی کا گلا کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ میں نے تجھ کو جائیداد سے محروم کر دیا اور میں نے دیکھا کہ تیرے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی اور تیری اطاعت شعاری میں بھی یک سر مو فرق نہیں آیا۔ لے یہ دوسرا وصیت نامہ ہے جس کی رو سے میری جائیداد میں تجھ کو تیرا پورا حق مل جائے گا۔ تو بڑے کردار کا آدمی ہے، اس کردار کا آدمی اگر یہودی یا مجوسی بھی ہو جائے پھر بھی وہ اس امر کا مستحق ہے کہ اسکو سر آنکھوں پر جگہ دی جائے" یہ کہہ کر میرے باپ پر رقت طاری ہو گئی، اور رندھی آواز میں فرمایا "بیٹا میں تیرے کردار کے سامنے سر جھکاتا ہوں" یہ کہتے ہی میرے انسان باپ نے میرے سامنے سر جھکا دیا۔ میرے منھ سے دفعتاً ایک چیخ نکل گئی "ارے میرا باپ کتنا بڑا آدمی ہے" اور جھپٹ کر میں نے ان کے دونوں جوتے اٹھا کر سر پر رکھ لئے، سر سے اتار کر سینے سے لگائے پھر باپ کے قدموں پر منھ رگڑنے لگا اور میرے باپ نے مجھے چھاتی سے لگا لیا اور خود بھی رونے لگے۔

میرے نکاح کی تنسیخ کا مقدمہ۔ جب میری شیعیت یا یوں کہئے کہ میری "دور رافضیت" کا غلغلہ بلند ہو گیا تو میرے چچا نواب محمد علی خاں نے جن پر میرا نکاح نہایت شاق گزرا تھا، اپنے چھوٹے بھائی یعنی میرے خسر کو طلب فرما کر کہا۔

"غلام بشیر پکا رافضی بن چکا ہے ـــــ تم نکاح کی تنسیخ کا دعویٰ دائر کر دو، میں تمہارا پورا پورا ساتھ دوں گا" اور میرے حقیقی چچا نواب محمد اسحٰق خاں نے بھی میرے خسر سے کہا "دیکھو مقیم، اب پانی سر سے گزر چکا ہے جب بشیر[1] نے صریح کے ساتھ جھنڈا کھڑا کروا دیا تھا اسی دن میرا ماتھا ٹھنک گیا کہ آج نہیں تو کل وہ ضرور رافضی ہو جائے گا، اور

---

[1] چچا مجھے بشیر حسن کے بجائے ہمیشہ "غلام بشیر" کہا کرتے تھے اس لئے کہ وہی میرا پہلا نام تھا

اب تو وہ کھلم کھلا رافضی ہو چکا ہے تم تنسیخ نکاح کا دعویٰ کر دو، میں تمہارے ساتھ ہوں میرے خسر بھولے بھالے پٹھان تھے، آگئے بھرے میں اور دائر کر دیا مقدمہ ان پر مقدمہ دائر ہوتے ہی ایک قیامت برپا ہو گیا۔ اور ملیح آباد سے لے کر، لکھنؤ تک گونجنے لگا اس کے جرچوں سے میرے باپ نے اپنی سنت جاریہ پر عمل کرتے ہوئے پہلا کام یہ کیا کہ تمام درجہ اول کے وکلا، یعنی شیخ علی عباس ظہور احمد مرزا سمیع اللہ بیگ، سر وزیر حسن اور الہ آباد کے سر تیج بہادر سپرو، اور سر جان جیکسن کو پہلے ہی سے اپنا لیا، تاکہ فریق ثانی کو درجہ اول کا کوئی وکیل میسر نہ آسکے۔

وہ مقدمہ پورے چھ برس تک، مسٹر شرغا، منصف شمالی کے اجلاس پر بڑے زور و شور کے ساتھ چلتا رہا۔ میرے خسر کی جانب سے علمائے اہل سنت کے فتوے پیش کئے گئے تھے کہ رافضی کافر ہوتا ہے اس لئے کسی مسلمان لڑکی سے اس کا عقد ایک ناجائز امر ہے اور خلاف شریعت۔

ہماری طرف سے اس کی نظریں پیش کی گئی تھیں کہ زمانہ قدیم سے لے کر اب تک سینکڑوں شیعہ لڑکوں کے سنی لڑکیوں کے ساتھ نکاح ہو چکے ہیں۔ اور ان کی اولادیں ورثہ پا چکی ہیں۔ اور کیا ان تمام شیعہ لڑکوں اور سنی لڑکیوں کے سابق نکاحوں کو ناجائز قرار دے کر آج یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ اس نوعیت کے نکاحوں سے جو بچے پیدا ہو کر اپنے اپنے باپوں کی وراثت پا چکے ہیں ان کو اولاد ناجائز ٹھہرا کر وراثت سے محروم کر دیا جائے؟ اور ان سابق نکاحوں کے مواقع پر علمائے اہلسنت کو کیا ہو گیا تھا کہ وہ اس وقت بالکل خاموش رہے اور اس نکاح کی تنسیخ کا مقدمہ دائر ہوتے ہی اسلامی شریعت میں وہ کیا بنیادی انقلاب آگیا ہے کہ آج اس کے خلاف فتوے جاری کئے جا رہے ہیں؟ اور کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ مولوی عبدالشکور صاحب نے سنیوں اور شیعوں کے درمیان جو منافرت پیدا کرنے کی تحریک چلائی ہے، یہ تمام غلط فتوے اسی تحریک کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔؟؟

حیرت کی بات یہ ہے کہ تین پشتوں کے دیرینہ مراسم کے باوجود، مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی نے بھی ان فتووں کی تصدیق فرما دی تھی ـــــ لیکن میں آج تک شکر گزار ہوں کہ مولانا عبدالباری صاحب کے چچا شمس العلماء مولانا عبدالحمید صاحب اور نامی پریس لکھنؤ کے مالک حکیم خواجہ شمس الدین صاحب نے میری موافقت میں گواہی دی تھی۔

جس روز میرے مقدمے کی پیشی ہوتی تھی، تمام لکھنؤ ٹوٹ پڑتا تھا، سننے کے واسطے ـــــ اور میرے باپ اور میرے خسر کے ہمراہ جو تین تین، چار چار سو جاں نثار دو حامیوں

اور گواہوں کا لشکر آتا تھا، اس سے عدالت کے برآمدے اور صحن میں ایک میلہ سا لگ جاتا چاروں طرف سے خوانچے اور قلفی والے ٹوٹ پڑا کرتے تھے، اور ہر پیشی پر تقریباً دو تین سو روپے جرمدم خرمدم برالوٹا جایا کرتے تھے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ جس روز میرے باپ عدالت میں بیان دینے کے واسطے اپنی کرسی سے کھڑے ہوئے تھے، فریق مخالف کے وکیل بشیر ناطق صاحب نے عدالت سے کہا تھا کہ وہ خاں صاحب کے بیان سے پیشتر، میں یہ بات عدالت کے گوش گزار کر دینا چاہتا ہوں کہ میں ان کا تدیم نیاز مند ہوں، اس لئے مجھ کو معلوم ہے کہ وہ اس قدر شیریں بیان آدمی ہیں، کہ سننے والے پر جادو کر دیتے ہیں۔ اس لئے میری درخواست ہے کہ عدالت ان کی جادو بیانی سے متاثر نہ ہو اور وہ تاثر قانون پر حاوی نہ ہونے پائے۔ یہ سن کر مرزا صاحب ہنس پڑے تھے، اور یہ کہا تھا کہ "اب تو میں بڑے شوق سے خاں صاحب کا بیان سنوں گا اور میرے باپ کے بیان کے اختتام کے بعد مرزا صاحب کے بشرے سے جو تاثرات نمودار ہوئے تھے ان کو دیکھ کر بشیر ناطق صاحب نے میرے خسر کے کان میں کہا تھا "خاں صاحب اب آپ مقدمہ ہار جائیں گے، بہتر ہے کہ کہ صلح کر لیجئے۔

مجھے پتا نہیں کہ میرے خسر نے اس مقدمے پر کتنا روپیہ برباد کیا تھا، لیکن یہ معلوم ہے کہ میرے باپ کے چالیس پچاس ہزار روپئے صرف ہو گئے تھے۔

سینٹ پیٹرز کالج آگرہ

ابھی وہ مقدمہ چل ہی رہا تھا کہ میرے ریڈ کرسچین کالج کے ہیڈ ماسٹر نے یہ مشورہ دیا کہ میں آگرے کے سینٹ پیٹرز کالج میں داخل ہو جاؤں، وہاں سے سینئر کیمبرج پاس کروں اور سیدھا لندن چلا جاؤں۔

یہ بات میرے دل میں ترازو ہو گئی۔ اور میں سمجھ گیا کہ میں حساب اور جغرافیہ میں کمزور ہوں جو یہاں فیل ہو جاؤں گا۔ اس لئے سینئر کیمبرج کا پاس کر لینا میرے لئے آسان ہو گا، اور ولایت جانے کا راستہ نکل آئے گا۔

رئیس اور ابرار نے بھی اس مشورے کو پسند کیا، اور کہا ہم بھی آپ کے ساتھ آگرے

چلیں گے۔ جب یہ بات طے ہو گئی تو ابرار نے کہا "بشیر ماموں کے پاس چلنے سے بہتر، آیئے اس سامنے والی جنات کی کوٹھری میں چل کر دعا مانگیں کہ بشیر ماموں ہم کو آگرے بھیجنے پہ تیار ہوں" جوتے اتار اتار کر آگے آگے ابرار اور پیچھے پیچھے میں اور رئیس اس کوٹھری میں داخل ہو گئے، ابرار نے کہا "میں دعا مانگوں گا آپ لوگ "آمین" کہیں گے، اس کے بعد ابرار نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی کہ اے اللہ، ہم سب کے اچھے اللہ، میں اور شبیر حسن خاں اب تک جو گناہ کر چکے ہیں، ان سب کو معاف کر، ہم تیرے سامنے توبہ کرتے ہیں۔ ابرار نے یہ کہہ کر اپنے منہ پر، اور ان کو دیکھ کر ہم دونوں بھی اپنے اپنے منہ پر تڑا تڑ، تڑا تڑ، تھپڑ مارنے لگے اور چھ بار پٹنے کے بعد ابرار نے بڑی لجاجت سے کہا، اے میرے معاف کر دینے والے اللہ بشیر ماموں کے دل میں یہ بات ڈال دے کہ وہ ہم تینوں کو آگرے بھیج دیں" ہم دونوں نے "آمین آمین" کے نعرے لگائے، اپنے اپنے چہروں پر ہاتھ پھیرے اور پہنچ گئے میاں کے کمرے میں۔ میاں علیل تھے بستر پر لیٹے لیٹے انھوں نے ابرار کی طرف آنکھیں اٹھا کر فرمایا۔ "وہ گرو گھنٹال" کیا کہنے آئے ہو؟ ابرار نے ہاتھ جوڑ کر سینٹ پیٹرز کالج کے تمام محاسن اور وہاں کا آخری امتحان پاس کرنے کے بعد اس کے تمام مفید نتائج اور پھر ولایت سے بیرسٹری کی سند لے کر آنے کے درخشاں امکانات پر دل نشیں تقریر کر کے کہا۔ یہ ہماری آخری درخواست ہے اسے مان لیجئے اور ہم کو آگرے بھیج دیجئے۔ قرآن[1] مجید کی قسم، جب ہم بیرسٹر بن کر آئیں گے آپ کا دل باغ باغ ہو جائے گا۔

ہماری خوش قسمتی کہ میاں نے یہ درخواست فوراً قبول فرما لی، اور ہماری آگرے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ لیکن دو چار دن کے بعد، جب یہ معلوم ہوا کہ وہ خالصتہً فرنگی کالج ہے، جہاں ہندوستانیوں کو داخلہ نہیں ملتا تو ہمارے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی، اور ہم سب حامد علی خاں بیرسٹر کے پاس پہنچے کہ شاید وہ کوئی تدبیر نکال دیں۔ حامد علی خاں نے کہا، اگر ہمارا لفٹنٹ گورنر سفارش کر دے تو وہاں داخلہ ہو جائے گا۔

میاں نے لفٹنٹ گورنر سے سفارشی خط لے کر ہم تینوں کو آگرے بھیج دیا، اور ہمارے اینیں گونڈے والے نورو کو باورچی اور علی شیر خاں کو سپاہی کے طور پر ہمارے ساتھ کر دیا۔

آگرے پہنچتے ہی کالج میں ہمارا داخلہ ہو گیا۔ نانا کا محل چونکہ کالج سے بہت دور تھا۔ اس لئے "محلہ کٹڑہ اعظم خاں" میں ہم نے ایک دو منزلہ مکان کرائے پر لے لیا۔ اور جی لگا کر پڑھنے لگے۔ ہمارے کورس میں شکسپیر کا ڈرامہ "جولیس سیزر" داخل تھا۔ اور میں اس ڈرامے پر اس

---

[1] ابرار کی زبان سے قرآن مجید کے عوض ہمیشہ قران مجید نکلا کرتا تھا۔

قدر حاوی ہوگیا تھا کہ میرا پروفیسر، یوریشین طالب علموں سے کہا کرتا تھا کہ تم کو شرم نہیں آتی کہ یہ لڑکا ہندوستانی ہو کر "جولیس سیزر" کے مطالب کو تم سے کہیں بہتر سمجھتا ہے، اور جب اس کے متعلق میں اس سے کوئی سوال کرتا ہوں تو یہ اس کی ایسی اچھی شرح کرتا ہے گویا اس کے سینے میں شیکسپیر کا دل دھڑک رہا ہے۔ اس کالج کے ایک بوڑھے انگریز پروفیسر مسٹر گرن وڈ کو میں نے پرائیویٹ ٹیوٹر کے طور پر رکھ لیا تھا، جو ہر شام کو بگھی پر آتے تھے اور دو گھنٹے تک اس خوبی اور دلچسپی کے ساتھ پڑھایا کرتے تھے کہ ان کا ایک ایک حرف میرے دماغ کا جزو بن جایا کرتا تھا۔ اس دور کی ایک بات پر مجھ کو آج تک حیرت ہے، اور وہ عجیب بات یہ ہے کہ مجھ پر اس زمانے میں وہ چیز طاری ہو گئی تھی، جس کو دینی اصطلاح میں، "نیک چلنی" اور شاعرانہ اصطلاح میں "بدچلنی" کہا جاتا ہے۔ اور تو اور میں سینما تک سے مجتنب[2] ہوگیا تھا۔

میرا یہ معمول بن گیا تھا کہ طلوع سے پیشتر اپنے برڈس کے ایڈورڈ پارک میں جاتا، موذن کے حجرے سے اپنا مگدر نکالتا، دیر تک انہیں ہلاتا، اور دیر تک دوڑ لگاتا رہتا۔

اس پارک میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی بھر پور انگریز لڑکی بھی آیا کرتی تھی، اور کن انکھیوں سے مجھے دیکھتی رہتی تھی، اور اکثر پگڈنڈی کے موڑوں پر اس طرح ادبدا کر دوڑ لگاتی تھی کہ ہم ایک دوسرے سے ٹکرا بھی جایا کرتے تھے، لیکن میں اس قدر پارسا ہو چکا تھا کہ اس کی جانب ملتفت ہی نہیں ہوتا تھا۔ اور جب وہ حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر سر جھکا لیا کرتی تھی ـــ تو وہ زاہد خبیث، جس نے میرے دل پر قبضہ کر کے میرے شاعر جمال پرست کو کان پکڑ کر باہر نکال دیا تھا میری پیٹھ ٹھونکنے لگتا تھا۔

ایک خوفناک پیش بینی:۔

اس اثنا میں میرے باپ جب ہم لوگوں کو دیکھنے آگرے تشریف لائے اور تین چار دن[1] قیام فرما کر لکھنؤ جانے لگے تو ہم لوگ آگرہ سٹی تک انہیں رخصت کرنے گئے، اور جب وہ گاڑی میں

---

[1] ان کے منہ سے پڑھاتے وقت جب ہلکی شراب کی خوشبو آتی تھی میری طبیعت بگڑ جایا کرتی تھی اور میرا یہی حال اب تک ہے کہ بادہ خواری کے وقت جب کوئی بے توفیق میرے پاس آتا ہے تو منہ اس سے دور رہتا اور منہ قریب لا کر بات نہیں کرتا

[2] میرا یہ بدچلنی کا دور جب ڈیڑھ برس کے بعد ختم ہو گیا، تو میرے شاعر نے واپس آکر اور میرے منہ پر طمانچہ مار کر یہ کہا تھا کہ "اوے مردود، تو نے جس لڑکی کا دل توڑا تھا حشر کے دن اس کا ہاتھ ہوگا اور تیرا گریبان۔"

بیٹھ گئے، اور گاڑی رینگنے لگی تو دفعتہً میرے دل سے یہ صدا آئی کہ میاں کو جی بھر کے دیکھ لو کہ اب انہیں کبھی نہیں دیکھ سکو گے ـــــ یہ خیال آتے ہی میرا سر چکرانے لگا، اور دل تھام کر ایک قریب کی بنچ پر بیٹھ گیا ـــــ رئیس اور ابرار گھبرا گئے ـــــ نورون دوڑتا گیا اور پانی لے آیا میں نے پانی کے دو گھونٹ پئے، ابھو لگ گیا، ابرار نے میری پیٹھ پر گھونسے مارے اور رئیس میرا سینہ اور گلا سہلانے لگے۔ ابھو سے تو نجات مل گئی، لیکن اس خیال نے جو کانٹا چبھو دیا تھا دل سے نہیں نکلا۔ رئیس و ابرار نے پوچھا، یہ کیا ماجرا ہے، میں نے اصلی بات نہیں بتائی، ٹال دیا۔

اس واقعے کے بعد میں اداس اداس رہنے لگا ـــــ اور اس کے پھر سات دن کے بعد میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے باپ کی لاش محمد علی چچا کی موٹر میں لکھنؤ سے ملیح آباد جا رہی ہے۔ میرا دل، اس قدر زور سے دھڑکا کہ آنکھ کھل گئی، آنسوؤں سے بریز آنکھوں سے میں نے گھڑی دیکھی صبح کے چار بج رہے تھے میں نیچے آیا، ابرار اور رئیس کو جگایا، ابرار سے کہا، تم پہلی گاڑی لکھنؤ چلے جاؤ، اور میاں کی خیریت سے بذریعہ تار مطلع کرو۔

میرے باپ کا انتقال:۔

دوسرے دن تار آگیا میرے باپ کے انتقال کا ـــــ تار بجلی کی طرح مجھ پر گرا، ایک چیخ مار کر میں رونے لگا ـــــ رئیس نیچے سے دوڑ آیا، پوچھا "کیا ہوا؟" میں نے تار کی طرف اشارہ کر دیا اس نے فرش پر سے تار اٹھایا ـــــ ہم دونوں بھائی پلٹ کر دیوانہ وار رونے لگے اور پہلی گاڑی سے ملیح آباد روانہ ہو گئے ـــــ راستے بھر ہمارا کیا حال ہے کہ ایسے بیان کر سکے کانپور اسٹیشن پر جب ٹکٹ چیکر نے آ کر ٹکٹ مانگا۔ اس وقت پتہ چلا کہ فرط سراسیمگی میں ہم نے ٹکٹ لیا ہی نہیں اور پاؤں کی طرف نظر جھکی تو معلوم ہوا کہ ہم دونوں بھائیوں کے پاؤں میں جوتا بھی نہیں ہے ٹکٹ چیکر ہم کو، سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا اور کہا "صورتوں سے تو آپ لوگ شریف معلوم ہو رہے ہیں لیکن ۔۔۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر سارا ماجرا بیان کر دیا۔ وہ کسی اچھے خاندان کا آدمی تھا اس نے کہا، کوئی بات نہیں، آپ لکھنؤ چل کر کیا ٹکٹ کے دام دے دیں گے؟ میں نے کہا، یقیناً ـــــ لکھنؤ پہنچ کر ٹکٹ چیکر میرے ساتھ ہو لیا۔ میں سیدھا اپنے مقدمے کے وکیل ظہور احمد صاحب کے پاس پہنچا، انہوں نے ٹکٹ کے دام دے دیئے ٹکٹ چیکر نے رسید دیئے بغیر دام اپنی جیب میں رکھ لئے اور ظہور احمد صاحب سے مزید دس روپئے قرض لے کر ہم رات کی گاڑی سے ملیح آباد روانہ ہو گئے

برہنہ پا یتیموں کی مانند

اللہ اکبر! وہ رات نالوں سے گونجتی اور آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی رات ۔ وہ صاحب خانہ کے سدھار جانے کے بعد کی سر پیٹتی رات ۔ وہ ایک لٹے ہوئے قافلے کی بے قافلہ سالار رات !!

جب اپنے گھر کے اداس پھاٹک پر نظر پڑی، اور ہر آن شادیانوں سے گونجتے ہوئے صحن سے، جب نالہ و شیون کی ملی جلی آوازیں سنیں، دل پر گھن چلنے لگے ــ اور جب اس صحن میں کانپتی پنڈلیوں کے ساتھ قدم رکھا، جہاں شفقت پدری کی گھنیری چھاؤں میں میرا بچپن کھیلا کرتا تھا، تو ایک بہت بڑے کہرام نے میری پیشوائی کی ــ داروغہ امید علی دوڑتے اور چیختے آئے اور مجھ پر جھپٹ کر رونے لگے ۔ اور ہماری چیخوں نے بام و در میں زلزلہ پیدا کر دیا ۔ مکان کے اندر سے بھی ہائے ہائے کی صدائیں آنے لگیں ۔ دادی جان کی آواز آئی ــ "او بشیر جاگ اٹھ تیرے بچے آگرے سے آئے ہیں سلام کرنے کو" دادی کی یہ آواز سن کر، ایسا محسوس ہوا گویا ذروں سے لے کر تاروں تک ایک عظیم ماتم برپا ہے ۔ اور اس کرۂ ارض کے تمام پہاڑ میرے سینے پر رکھ دیئے گئے ہیں ۔ اور آسمان کی ڈاٹ کے نیچے تمام دنیا کے رونے والوں کے آنسو میری آنکھوں میں بھر دیئے گئے ہیں ۔ اتنے میں رئیس کی انا دوڑی آئیں، ہم دونوں کو سہارا دے کر گھر لے گئیں ۔ دادی اور ماں کی سوگ داری دیکھ کر، دل پر ایسا ناقابل، برداشت وزن پڑا کہ میں زمین پر گر پڑا، ایڑیاں رگڑنے لگا، گریبان پھاڑ دیا ۔ اور چیخ چیخ کر ہائے میاں، ہائے میاں، ارے میں کیا کروں کدھر چلا جاؤں؟ ارے کوئی اللہ کا بندہ مجھ پر ترس کھائے اور مجھ کو میرے میاں کی قبر میں لے جا کر دفن کر دے" یہ کہتے کہتے میں بے[1] ہوش ہو گیا ۔

میرے مقدمۂ تنسیخ نکاح کا فیصلہ :-

میرے باپ کی موت کے غالباً ایک ہفتے کے بعد مقدمے کا فیصلہ سنا دیا گیا ۔ اور میرے نکاح کو جائز قرار دیتے ہوئے عدالت نے مجھ کو یہ اختیار بھی دے دیا کہ، میں چاہوں

---

[1] کہتے ہیں وقت سب سے بڑا چارہ گر ہے ۔ لیکن میرے باپ کی رحلت پر نصف صدی سے زیادہ مدت گذر چکی ہے لیکن میرا زخم دل مندمل نہیں ہو سکا ہے ۔ تغیر مزاج زندگی کے شدائد و مکروہات کی یورش پیہم میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اس غم کو بھول چکا ہوں لیکن جب کبھی عمیق تنہائیاں میرے سینے پر زور سے ہاتھ رکھ دیتی ۔ (بقیہ صفحہ ۔ ۱۲۸ پر)

تو اپنے خسر ـــــــ اور ان کے گواہوں پر دروغ حلفی کا مقدمہ بھی چلا سکتا ہوں۔

فیصلہ سنانے کے وقت، عدالت کا کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ یہی نہیں کہ ہم لوگ ہی آب دیدہ تھے۔ میرے مخالفین اور خود میرے خسر بھی بے حد مغموم و پریشان نظر آ رہے تھے۔ مسٹر آغا حکم سنانے بیٹھے تو آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگے۔ خاں صاحب کو اس مقدمے کے جیتنے کی بڑی تمنا تھی، کاش میں ان کی زندگی میں ہی فیصلہ سنا دیتا" یہ سن کر اپنے تو اپنے غیروں کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپکنے لگے اور مجھ نامراد کو اپنی یہ فتح مندی لاکھوں شکستوں کے پہاڑوں کے نیچے دبی محسوس ہونے لگی ـــــ میں نے لاکھ لاکھ ضبط کرنا چاہا، مگر ایک دردناک چیخ میرے منہ سے نکل گئی ـــــ میرے خسر نے جھپٹ کر مجھے سینے سے لگا لیا، اور عدالت کا کمرہ مجلس عزا میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔

میری شادی، بعد از خانہ بربادی:-

اس فیصلے کے دوسرے دن حضرت مولانا عبدالباری صاحب قبلہ، فرنگی محل، میرے پاس تشریف لائے، اور فرمایا کہ "مجھ کو آپ کے والد گرامی کی ناوقت موت کا بے حد افسوس ہے اور اس بات کا بھی ملال ہے کہ میں نے مقدمے میں آپ کی مخالفت کی تھی، مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ فرنگی محل پر آپ کے جدّ امجد نواب فقیر محمد خاں بہادر کے جو احسانات ہیں میں انھیں بھول گیا ہوں۔ یہ

بقیہ صفحہ ۱۲۷ کا۔ میں تو میں درد سے تڑپ جاتا ہوں اور سینے کے زخم کی موجودگی کا پتہ چل جاتا ہے۔
کئی مہینے کی بات ہے کہ اخبار نے بتایا تھا کہ فلاں مقام پر ایک سو ساٹھ برس کا کوئی آدمی موجود ہے اس وقت میں نے دل ہی دل میں کہا تھا، کاش میاں کو بھی ایسی ہی طویل زندگی ملتی اور وہ اپنے گودوں کے پالے ہوئے اس بچے کو بوڑھا بھی دیکھ لیتے۔ اگر مسیح مل جائیں تو میں بچوں کی طرح بلک بلک کر ان سے کہوں دوا ے میرے اچھے حضرت مسیح میرے باپ کو زندہ کر دیجئے۔

اگر آں طائر قدسی ز درم باز آید　　عمر بگذشتہ، بہ پیرانہ سرم باز آید

اور کوئی نہیں بتاتا، کہ یہ کون ہے، جو محبت کے رشتوں میں جکڑے ہوئے بے چارے انسانوں پر موت کو مسلط فرما کر، اور ہمارے آنسوؤں کو موتیوں کی طرح پرو پرو کر اپنی گردن میں ہار ڈال رہا ہے لاکھوں گھروں کے چراغ بجھا کر جشن چراغاں منا رہا ہے۔ اور ہماری آہوں کو مضراب بنا کر اپنا ستار بجا رہا ہے!

بزم ترا، شمع و گل۔ خستگی بوتراب
ساز ترا زیر و بم واقعۂ کربلا . . .

اس کے بعد انھوں نے فرمایا کہ "میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ محمد مقیم میاں خاں (میرے خسر) اور ان کے گواہوں پر مقدمہ چلائیں گے کہ نہیں۔ میں نے کہا "مولانا اس دن کے لئے خدا مجھ کو نہ رکھے کہ میں مقیم چچا (آپ) اور ان کے گواہوں پر مقدمہ چلا کر انھیں جیل بھیجنے کی سعی کروں" مولانا میری یہ بات سن کر خوش ہو گئے۔ مجھے سینے سے لگا لیا اور کہا "آپ کی شرافت سے مجھے ایسی جواب کی امید تھی۔ اس کے بعد بڑی بزرگانہ ملائمیت کے ساتھ مسکرا کر انھوں نے یہ فرمایا کہ "آپ کیا یہ وعدہ بھی کرتے ہیں کہ اپنی بیوی کو شیعہ نہیں بنائیں گے" میں نے کہا: "مولانا دین میں اکراہ کو دخل نہیں ہے میں کبھی ان کو شیعہ ہو جانے پر مجبور نہیں کروں گا۔"

چاہیئے تو یہ تھا کہ باپ کی موت پر میں کم سے کم پانچ برس تک سوگ مناتا۔ لیکن حالات کی نوعیت اس قدر پیچیدہ اور اس قدر عجلت طلب تھی کہ مجبوراً یہ طے کرنا پڑا کہ جلد سے جلد رخصت کی رسم ادا کر دی جائے۔ اس لئے دسمبر ۱۹۱۶ء کے آخری ہفتے میں میری شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔

میرا سا بدبخت و بدنصیب دولھا کون ہوگا۔ شادی کا جوڑا مجھے اس وقت پہنایا گیا جب کہ میرے باپ کا کفن ابھی میلا بھی نہیں ہوا تھا۔ اور میرے سر پر اس وقت سہرا باندھا گیا جب کہ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں برس رہی تھیں۔ میرے پھاٹک کی شہنائیوں کی آوازوں میں نوحے تیر رہے تھے۔ میری ہتھیلی کی مہندی کے رنگ سے میرے دل کا خون ابل رہا تھا۔ تاشوں کی جھنکار کف افسوس مل رہی تھی، اور مجھ نامراد کی شادی کے دوشالے پر میرے باپ کا جنازہ رکھا ہوا تھا۔

میں جب ہاتھی پر بیٹھ کر براتیوں کے ساتھ اپنی سسرال کی جانب روانہ ہوا تو یہ دیکھا کہ میرے باپ سامنے کھڑے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں: "بیٹا! شادی مبارک ہو، میں نے جان دے کر تیرا سہرا دیکھا ہے"۔ اس وقت میں نے اس طرح ہچکیاں روکیں کہ میری پسلیوں میں درد ہونے لگا اور دل سے آواز آنے لگی۔ ہائے میرے باپ، ہائے میرے باپ۔" اور میرے سہرے کی مہکیں میرے سینے پر ڈنک مارنے لگیں۔

اے متاعِ درد در بازار جاں انداختہ — گوہر ہر سود در جیب زیاں انداختہ

تقسیم جائے داد :

میری اس تجویز سے میرے بڑے اور چھوٹے بھائی نے اتفاق کیا کہ سرکاری طور پر

۱؎ میری بیوی آج تک سنی ہیں اور میں نہ شیعہ رہا نہ سنی اور اب مسلمان بھی ہوں کہ نہیں؟ اس کا فیصلہ کون کرے!!

نہیں تھی طریقے سے جائے داد تقسیم کر لی جائے ۔ اور ماتا دین پٹواری کو حکم دیا گیا کہ مساوی قسم کی تین چٹھیاں بنادے، جب یہ کام مکمل ہوگیا تو پٹواری وہ چٹھیاں لے کر آیا اور ان کو تہ کر کے ایک صندوق میں بند کر دیا۔ اور ہم تینوں بھائیوں نے آنکھیں بند کر کے ایک ایک چٹھی اٹھالی۔

میں نے اپنی چٹھی کھولی، سمجھ میں نہیں آئی، ابرار کے حوالے کر دی اور جب انھوں نے وہ چٹھی پڑھی تو خوشی سے اچھل کر کہنے لگے "مبارک ہو شبیر حسن خان، آپ کی چٹھی سب سے بڑھیا ہے"۔ میں نے پوچھا "کس اعتبار سے؟" انھوں نے کہا۔ "آپ کے حصے میں قلمی باغ آیا ہے"۔ میں نے پوچھا۔ "میری چٹھی میں تھانہ بھی ہے؟" ابرار نے کہا۔ "ارے یہ آپ کیا پوچھ رہے ہیں؟ اس باغ کی ایک ایک پتی پر ہزاروں تھانے قربان کیے جا سکتے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں، باغ کی فصل دس دس بیس بیس ہزار روپے کی ہر سال فروخت ہوتی ہے۔ تھانے میں رکھا ہی کیا ہے۔ اس کی سالانہ مرمت میں الٹے آپ کی جیب سے ہر سال پان چھ سو روپے جایا کریں گے۔" میں نے کہا "ارے تھانے کو تم کیا سمجھتے ہو؟ اس کی چھت سے ایسے ایسے مناظر دکھائی دیتے ہیں کہ آدمی وجد کرنے لگے۔"

"یہ سن کر بڑے بھائی صاحب نے کہا۔ "میں تم کو اپنے بیٹے کے برابر سمجھتا ہوں۔ اپنا دل میلا نہ کرو۔ تھانہ میری چٹھی میں آیا ہے۔ لو بدل لو۔" یہ سن کر ابرار نے چیخ مار کر کہا۔ "شبیر حسن خان! ارے ایسا غضب نہ کر بیٹھیے گا، قرآن مجید کی قسم بڑا غضب ناک قسم کا دھوکا کھا جایئے گا۔" اس بات پر بڑے بھائی صاحب نے ابرار سے ڈانٹ کر کہا "تم کون ہوتے ہو ہم بھائیوں کے درمیان ٹانگ اڑانے والے۔" یہ کہہ کر بھائی صاحب نے اپنی چٹھی میری چٹھی سے بدل لی۔ اور ابرار غصے کے مارے وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔

تھیڑی زیخ گئی ملیح آباد بھر میں میری اس حماقت کی۔ لوگوں نے آکر کہا "ارے ہزاروں کی سالانہ آمدنی پر لات مار کر سالے تھانے کو ترجیح دی۔ تم کیسے آدمی ہو۔" میں نے کہا۔ "بھائی صاحب باغ لے کر نہال ہو گئے اور میں تھانے کے مناظر پاکر باغ باغ ہو گیا۔ ان کو باغ کی چاندی ملی۔ اور مناظر کا سونا۔ میرے ہاتھ لگا۔" جب میری یہ بات سنی تو میرے ایک قرابت دار محمد غنی خان نے جل کر جواب دیا کہ "بھائی شبیر حسن خان، شعر دیدہ میں تو خیر، باقی اور تمام باتوں میں تم مہا تما قسم کے چوتیے ہو۔"

سرکاری ملازمت کی پیش کش:۔

یوپی کے گورنر سر ہارکورٹ بٹلر میرے باپ کے بڑے دوست تھے۔ انھوں نے ان کے انتقال کی خبر سنی تو تار بھیج کر مجھ کو نینی تال بلا بھیجا۔ اور تعزیت کے بعد مجھ سے کہا "میں آپ کو بی۔ اے سے مستثنیٰ کر کے سرکاری ملازمت دینا چاہتا ہوں۔ آپ ڈپٹی کلکٹر بنیں گے یا اسسٹنٹ منیجر کورٹ آف وارڈز؟" میں نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش ہو گیا۔ بٹلر صاحب نے گھڑی دیکھ کر کہا "وقت کم ہے آپ جلدی انتخاب کریں۔" میں نے کہا آپ میرے باپ کے دوست تھے، اس لیے میرے چچا ہیں، میں آپ کا بہید

شکر گزار ہوں کہ آپ مجھ کو نوکری دینا چاہتے ہیں۔ مگر میں کوئی سرکاری نوکری قبول کرنے پر آمادہ نہیں"۔ بٹلر صاحب نے کہا: "آپ سینیئر کیمبرج تک پڑھے ہوئے ہیں انگریزی اچھی بولتے اور جانتے ہیں آپ اس کی پرواہ نہ کریں آپ بخوبی کام چلا سکتے ہیں۔ جلدی بتایئے آپ ان دو پیش کشوں میں کس کو ترجیح دیتے ہیں"۔ میں نے کہا: "جناب والا آپ میرے بزرگ ہیں، میں آپ کی پیش کش کو سر آنکھوں سے قبول کرتا مگر آپ کی حکومت غاصبانہ ہے۔ اس لئے میں آپ کی نوکری کو اصولاً غلط سمجھتا ہوں"۔

میرا یہ فقرہ سن کر بٹلر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ تنتنا کر کھڑے ہو گئے اور مجھ سے کہا: "باہر آیئے"۔ میں سمجھا کہ باہر جا کر وہ مجھ پر حملہ کریں گے اور حملہ کیا تو میں پٹھان ہوں ڈر دوں گا نہیں، ترکی بہ ترکی جواب دوں گا۔

کمرے سے نکل کر وہ نیچے لان پر لے گئے اور انگلی اٹھا کر کہا: "دیکھئے یہ یونین جیک جو اس چھت پر لہرا رہا ہے جب اس پھریرے کے اوپر سے خون کا دھارا گزر جائے گا، اس وقت ہندوستان آزاد ہونے کا خواب دیکھ سکے گا"۔ میں نے کہا: "جناب والا کو میں اپنا چچا سمجھتا ہوں۔ اگر گستاخی نہ سمجھئے تو جواب دوں"۔ بٹلر نے جواب دیا: "دیجئے جواب"۔ میں نے کہا: "ہندوستان کی رگوں میں اس قدر خون ہے کہ اس کے صرف ایک صوبے کا نہیں فقط ایک ضلع کا خون اس پھریرے کو آسانی کے ساتھ غرق کر کے رکھ دے گا۔

یہ سن کر وہ اور بھی سرخ ہو گئے اور کہا: "آپ میرے دوست کے لڑکے اور نوجوان آدمی ہیں اس لئے میں آپ کے ساتھ کوئی سختی نہیں برت سکتا لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ آپ کی قوم کا ہر فرد جنس فروختنی ہے ہم جس کو چاہتے ہیں پل بھر میں خرید لیتے ہیں"۔ میں نے کہا: "میں اس بات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں"۔ انھوں نے غصے میں آ کر میرے صوبے کے تین نہایت مقتدر آدمیوں کے نام لے کر مجھ سے کہا کہ ہم آپ کی قوم کے ان تین بڑے آدمیوں کو خرید چکے ہیں۔ آپ ہی کس خیال میں ہیں؟"

ان تین اکابر کے نام سن کر مجھ کو پسینہ آ گیا، میں گھبرا گیا کہ اب کیا کہوں لیکن پھر سنبھل کر یہ جواب دیا کہ "کم سے کم مجھے خریدا نہیں جا سکتا۔ بٹلر یہ سن کر غصے میں بھرے اور مجھ کو غور سے دیکھتے ہوئے کمرے میں چلے گئے۔ اور میں ان سے رخصت ہوئے بغیر گورنمنٹ ہاؤس سے باہر نکل گیا۔

گمنام خطوں کی بھرمار:

نینی تال سے میں سیدھا ملیح آباد گیا اپنا اور رئیس احمد کی جائے داد۔ بھائی صاحب کی سپردگی میں دے کر رئیس ابرار سمیت پھر آگرے چلا گیا کہ تعلیم کی تکمیل ہو جائے۔

تھوڑے ہی دن کے بعد گمنام خطوں کا تانتا بندھ گیا کہ آپ نے اپنی جائداد اپنے بھائی کے سپرد کر کے بڑی خطرناک غلطی کی ہے وہ آپ کی جائیداد کو خرد برد کر رہے ہیں آپ کے حصے کے درخت کٹوا کر اپنے کام چلا رہے ہیں اور آپ کے اچھے اچھے کاشتکاروں کو اپنے "محال" میں بسا رہے ہیں اور آپ

کی آمدنی جو ان کے پاس بطور امانت جمع ہو رہی ہے اس سے ہات اٹھائیے وہ آپ کو کبھی نہیں ملے گی۔ اول اول تو میں نے ان خطوں کو کوئی اہمیت نہیں دی اور یہ سمجھتا رہا کہ جیسی ملیح آباد کے پٹھانوں کی عادت ہے وہ بھائیوں کو لڑا کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہ رہے ہیں۔

لیکن مقیم چچا نے بھی اسی نوعیت کا خط لکھ کر ان گمنام خطوں کی تصدیق کر دی تو مجھ کو بڑی تشویش پیدا ہو گئی۔ اور مقیم چچا کے خط کے ساتھ گمنام خط بھی ابرار کو دکھا دیئے۔

خطوں کو پڑھ کر ابرار نے کہا۔ "قرآن مجید کی قسم ان خطوں کا ایک ایک حرف صحیح ہے"۔ اتنا کہہ کر ابرار اپنے منھ پر طمانچے مارنے لگے۔ میں نے پوچھا یہ کیا کر رہے ہو؟" انھوں نے کہا اپنے پر لعنت بھیج رہا ہوں کہ جب آپ شفیع احمد خاں کے سپرد اپنی جائداد کر رہے تھے اس وقت نہ جانے میرا جی کس کوٹھے میں تھا اور میری عقل کس کھٹکی میں بند ہو گئی تھی کہ میں نے اس وقت اس فعل سے آپ کو نہیں روکا۔" اپنی اس کوتاہی پر مجھے ایک پرانی بات یاد آ گئی۔ سنتے ہیں کوئی طوائف کسی شادی کی محفل میں گا رہی تھی کہ سہ

مجھ کو جنگل میں اکیلا چھوڑ کر قافلہ، مضطر روانہ ہو گیا

تو یہ شعر سن کر ایک ہینگ بیچنے والا کابلی پٹھان دھاڑیں مار مار کر رونے اور رو رو کر یہ کہنے لگا کہ جب یہ عورت اتنا زیور پہنے جنگل میں اکیلا رہ گیا تھا۔ اس وقت ہم کہاں جا کر مر گیا تھا کہ اس عورت کو لوٹ نہیں سکا۔

ملیح آباد کا قیام اور جائیداد کا انتظام :۔

اس کے بعد میں رئیس و ابرار سمیت ملیح آباد آ گیا۔ رئیس و ابرار نے پڑھنے لکھنے کی طرف پھر مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ رئیس موسیقی میں غرق ہو گئے، ابرار کورٹ آف وارڈ کے منیجر ہو گئے۔ میں نے ابرار کے بڑے بھائی خواجہ حسن خاں کو ضلع دار بنا کر اپنی جائیداد ان کی نگرانی میں دے دی۔ مولانا قدرت اللہ بیگ سے دوبارہ فارسی پڑھنا شروع کر دی اور شاعری کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب کا بطور خود مطالعہ کرنے لگا۔ اسی اثنا میں ایک روز میرے برادر بزرگ تشریف لائے اور تین دستاویزوں پر مجھ سے دستخط کر دینے کی فرمائش کی، میں نے ان پر بے پڑھے دستخط کر دیئے تاکہ بھائی صاحب کو یہ گمان نہ ہو کہ مجھے ان اعتماد[1] نہیں ہے۔ اس واقعے کے تیسرے روز یہ معلوم کر کے حیرت و عبرت نے میرا احاطہ کر لیا کہ، ان تینوں دستاویزوں میں دو رسیدیں تھیں اور ایک ہبہ نامہ۔ پہلی رسید تھی میری جائیداد کے اُن باون ہزار روپیوں کی جو ان کے پاس جمع اور ان کے ذمے واجب الادا

---

[1] بھائی صاحب میری فطرت سے واقف تھے کہ میں فرط سعادتمندی اور اظہار عقیدت میں آنکھیں بند کر کے دستخط کر دوں گا۔

تھے ۔ دوسری رسید تھی ان بہتر ہزار روپوں کی جو میرے باپ نے لالہ مادھو پور کو بطور قرض دیئے اور لالہ صاحب ان کو ادا کر کے بھائی صاحب سے رسید لے چکے تھے اور تیسری چیز وہ ہبہ نامہ تھا جس کی رو سے میں نے تقریباً آدھی جائیداد بھائی صاحب کے نام لکھ دی تھی ۔

مقیم چچا اور ابرار نے جب یہ ہولناک خبر سنی ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی ۔ وہ لکھنؤ چلے گئے اور جب وکیلوں سے مشورہ کر کے آئے تو انھوں نے کہا "تم یہ حلف نامہ لکھا کر کہ بڑے بھائی کی مروت کے دباؤ میں آ کر تم نے ان رسیدوں اور اس ہبہ نامے پر انکھیں پڑھے بغیر دستخط کر دیئے تھے ' مقدمہ دائر کر دو اور مادھو پور کو بھی نوٹس دو کہ انھوں نے کل روپیہ بھائی صاحب کے حوالے کیوں کر دیا ' جب کہ وہ صرف ایک تہائی کے حق دار تھے ۔ میں نے مقیم چچا اور ابرار کو ' ہر چند ٹکا سا جواب تو نہیں دیا ' لیکن اس قدر ٹال مٹول کی کہ آخر کار وہ دونوں سمجھ گئے کہ میں اس اقدام پر آمادہ نہیں ہو سکتا ۔

"قصرِ سحر" کی تعمیر[1] :۔

اپنے سوتیلے چچا آصف خاں سے میں نے امانی گنج کے میدان میں غالباً دو بیگھے زمین خرید کر ایک نہایت خوبصورت دو منزلہ کوٹھی بنوائی چونکہ یہ کوٹھی صرف اس لئے بنوائی گئی تھی کہ اس سے طلوعِ سحر تک کا جمال دیکھوں اس لئے اس کا نام "قصرِ سحر" رکھ دیا ۔

وہ کوٹھی ملیح آباد اسٹیشن کے قریب تھی اس کے بائیں طرف ایک بڑا خوبصورت تالاب تھا ۔ اور داہنے طرف ذرا سا ہٹ کر ریلوے لائن تھی ۔

میرے تقشّف کا آغاز :۔

یہ دنیا ہفت عجائب سے زیادہ حیرت ناک اور اس کم بخت کے امکانات کا دائرہ کائنات کے دائرے سے بھی وسیع تر ہے ۔

ارے ذرا خیال تو کیجئے کہ غالباً سنہ ۱۹۲۰ء میں "قصرِ سحر" آتے ہی ' خدا کا کرنا یہ ہوا کہ میرے سے مادر زاد معصیت کار پر دورہ پڑ گیا اور اس چیز کا جس کو نادان "تقویٰ" اور دانا بزدلی کے نام سے پکارتے ہیں اس تقوے کا ہلکا سا دورہ سینٹ پیٹرز کالج میں بھی پڑا تھا ۔ لیکن اس مرتبہ تو اس میں اس قدر شدت پیدا ہو گئی کہ میں بڑی سختی کے ساتھ نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے لگا ۔

---

[1] صد حیف کہ میری نادان بیٹی نے اس کوٹھی کو شہید کرا کے میرے دل کے ایوان کو ڈھا دیا ' میری ایک بہت بڑی یادگار مٹوا ڈالی ۔ اب میں اسے کہاں سے ڈھونڈھ کر لاؤں اور اپنے عنفوانِ شباب کی وارداتوں کو کس جتن سے جگاؤں ۔ اے میری بیٹی سورما تو نے میرے دل کو تباہ کر ڈالا ع کرم کردی الٰہی زندہ باشی !!

نمازوں کے وقت میں کمرہ بند کرکے عود اور اگر سلگاتا اور اس قدر طویل رکوع و سجود کے ساتھ نمازیں پڑھتا تھا کہ قرونِ اولیٰ کے سچے مسلمانوں کی روح وجد کرنے لگتی تھی۔

اور یہ پرہیزگاری کے لیے یہاں تک بڑھ گئی کہ قیمتی لباس ترک کرکے موٹے جھوٹے کپڑے پہننے لگا گوشت کھانا اور چارپائی پر سونا ترک کر دیا اور مجھ پر اس حد تک خدا کا قہر نازل ہوا کہ میں نے داڑھی کی سی کچھ چیز بھی رکھ لی اور بالکل مولوی خدا بخش نظر آنے لگا ؎

قیامت ہے کہ حُسنِ لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا
کہا حیرت سے اس نے یہ بھی ہوتا ہے زمانے میں

ارے کس بے پایاں حیرت کی یہ بات تھی کہ میرا سا دیوانہ کاکل و رخسار اور سجدۂ سجادہ میں گرفتار۔ میرا سا فریفتۂ چنگ و عود اور دشتِ رکوع و سجود۔ مجھ سا مرد خوش اوقات اور گرفتارِ صوم و صلوٰۃ۔ میرا سا امیرِ کاخ و کو اور اسیرِ سواک و وضو!! تفو برتو اے چرخِ گرداں تفو۔ کس قدر سچ کہا ہے، میر تقی میر نے ؎

دیر سے اٹھ کے کعبے گیا میر   جس کو چاہے خدا خراب کرے

میں اس زمانے میں پو پھٹنے سے بہت پہلے بیدار ہوا کرتا حافظ کا دیوان گنگنا کر پڑھتا۔ پھر نمازِ فجر ادا کرتا اور تاروں کی سہانی چھاؤں میں نکل جاتا امانی گنج کے لق و دق میدان میں وہاں پہونچ کر چکاروں کی طرح چھنتا چھلانگیں مارتا، صدر برگ کے پودوں کو گلے لگاتا۔ حافظ کے اشعار گنگناتا درختوں پر چڑھ جاتا اور پھر ان سے یہ کہہ کر اتر آتا کہ معاف کرنا میں نے بڑی تکلیف پہونچائی تم کو۔ اور اسی عالم میں گل رنگ آسمان کی جانب جب نظر اٹھاتا تو کیا دیکھتا کہ بڑی لانبی لانبی داڑھیوں کے فرشتے میرے سر پہ منڈلا کر "سلام علیکم یا لسان الصباح سلام علیکم یا لسان الصباح" کے نعرے لگا رہے ہیں۔

اور فرشتے جب سلام کر کرکے بلندیوں کی طرف اڑنے لگتے تھے تو عجیب قسم کی گھنٹیاں سی بجنے لگتی تھیں چاروں طرف، اور فضا میں تیرنے لگتی تھی یہ آواز ؎

دعائے صبح و آہِ شب کلیدِ گنجِ مقصود است
بایں راہ و روش می رو کہ با دل دار پیوندی

---

[۱] اور یہ دکھ اب بھی جاری ہے۔

[۲]۔ ایک محلہ جو میرے مکان سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر ہے۔

بیعت :-

اسی زمانے میں کاکوری کے فرشتہ صورت سجادہ نشین حضرت حبیب[1] حیدر شاہ کے ہاتھ پر
میں نے بیعت بھی کرلی تھی ۔ سالانہ عرس کے زمانے میں وہاں بڑی دھوم دھام ہوا کرتی تھی ۔ دور دور
سے مرید اور قوال آتے تھے ۔ اور جب قوال گاتا تھا تو در و دیوار جھومنے لگتے تھے اور تاروں
کی ہلکی روشنی اور رات کی چھٹتی ہوئی تاریکی میں جس وقت "آزادوں"[2] کی ٹولی اونچی اونچی ٹوپیاں
اور لانبی عبائیں پہنے حضرت تراب علی شاہ کے مزار کے روبرو صفیں باندھ کر حضرت علی کی منقبت میں

اے بادشاہ اولیا مستاں سلامت می کنند

گانا شروع کر دیتے تھے تو ایسا نظر آتا تھا کہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسالت مآب حضرت علیؑ
کی مولائی کا اعلان فرما رہے ہیں ۔

روح ادب

اسی دورِ تصوف و تقشف میں میری سب سے پہلی استرہ تصویروں والی مصور "تصنیف"
"روح ادب"[3] غالباً میتھوڈسٹ پریس لکھنؤ سے رفیع احمد خاں کے مقدمے اور حضرت اکبر کی رائے
کے ساتھ ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی اور ہاتوں ہات فروخت ہو گئی تھی ۔

"روح ادب" پر سب سے پہلے توصیفی تبصرہ کیا تھا میرے اس دور کے اجنبی اور اس دور کے
دوست اسرائیل احمد خاں اور میرے اس دور کے مداح اور اس دور کے معترض حضرت مولانا
عبدالماجد دریابادی نے ۔ اور سب سے پہلے اعتراض کیا تھا سجاد انصاری مرحوم نے ۔ اس
وقت "مسٹر عبدالماجد" "مولانا" عبدالماجد کی جانب سفر کر رہے تھے اور کفر سے منہ موڑ کر
اسلام کی جانب آچکے تھے ۔ اور سجاد[4] انصاری حلقۂ اسلام سے بھاگ کر کفر کی جانب افتاں
و خیزاں چلے جا رہے تھے ۔ اور فریقین کے مابین یہ غیر تحریری و غیر لفظی معاہدہ ہو چکا تھا کہ

---

[1] شاہ صاحب آلِ رسول کے علاوہ اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے [2] فقرا کا ایک گروہ جو تمام
قیود سے آزاد رہ کر مستانہ زندگی بسر کرتا ہے ۔

[3] اس کتاب پر لاگت آئی تھی چار روپے فی جلد اور فروخت کی گئی تھی تین روپے فی جلد میں نئی قسم کا تھا بیوپار

[4] میں نے کبھی ان کو دیکھا ہی نہیں حتیٰ کہ ان کا انتقال ہو گیا ۔ لیکن ان کے مضامین سے یہ اندازہ
ہوا کہ وہ اپنے زندہ رہتے تو اردو کی فکری ادب میں بہت اچھا اضافہ ہو جاتا ۔

وہ ایک دوسرے کے خلاف لکھیں اور ایک دوسرے کے ممدوح پر سب وشتم کریں گے۔

اور چونکہ مولانا عبدالماجد نے اپنی محبت کی بنا پر مجھ کو غالب و ٹیگور کی صف میں پہنچا دیا تھا اس لئے سجاد انصاری پر یہ فرض ہو گیا کہ وہ مجھے شیاطین کے زمرے میں شامل کر دیں۔

اسی زمانے میں میرے محترم بزرگ حضرت اقبال نے بھی ایک طویل خط لکھ کر میری شاعری کی مدح سرائی فرمائی اور دل کھول کر داد دی تھی، اور پنجاب یونیورسٹی سے "روح ادب" کے تین سو نسخوں کا آرڈر بھی بھجوایا تھا۔ اور اسی کے ساتھ یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ "ہر چند میرے ساغر بالکل نئے ہیں اور ایسے نئے کہ انھیں دیکھ کر غبطہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ان میں شراب بھری ہوئی ہے وہی پرانی" اس لئے مجھ کو چاہئے کہ میں حافظؔ اور ٹیگورؔ کی پیروی ترک کر کے فکری شاعری کی طرف آجاؤں اور حافظؔ و خیامؔ کی طرح تھپک تھپک کر سلانے کے عوض انسان کو جگانے کی جانب مائل ہو جاؤں۔

لیکن اس وقت میری تخیل کا دھارا بڑے زور و شور سے تصوف کی پر اسرار وادیوں کی جانب دھڑا دھڑ بہہ رہا تھا۔ ان کی نصیحت پر عمل پیرا نہیں ہو سکا۔ لیکن "شنیدہ اثرے دارد" کے طور پر ان کی نصیحت غیر محسوس طریقے سے مجھ پر اثر کرتی رہی اور جب چند ماہ و سال کے بعد میری طبیعت "روح ادب" کے مزاج سے مختلف ہونے لگی تصوف سے روگردانی کر کے میں سیاسی شاعری کرنے لگا، اور سیاست سے مڑ کر جس وقت میری شاعری تجسس و تشکک کی جانب گامزن ہو گئی تو میرے ناصح حضرت اقبال کی شاعری اقوال روایات اور عقائد کی طرف چل پڑی اور یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جس تصوف اور مابعد الطبیعات سے انھوں نے مجھے روکا تھا۔ اس پر "حرکی" کا لیبل لگا کر وہ خود اسی طرف چلے گئے۔ اور عقل کو "بولہب" اور عشق کو "مصطفیٰ" کا خطاب دینے اور ع

السلام اے عشقِ خوش سودائے ما

کے نعرے لگانے لگے۔

چونکہ وہ اعلیٰ درجے کے پڑھے لکھے اور بلا کے ذہین انسان تھے اس لئے شروع شروع میں انھوں نے مغرب کے الحاد اور مشرق کے ایمان میں مصالحت کی بڑے خلوص کے ساتھ کوشش کی۔ لیکن جب ان کی سعی مشکور نہیں ہوئی تو انھوں نے، نیٹشے کے مافوق البشر (مشرف با سلام کر کے "شاہین بچہ") بنا دیا۔ قرآن کے مردود لفظ "عشق" کو آسمان پر چڑھا کر اسے تمام انسانی شرف و مجد کا مرکز تسلیم کیا اور قرآن کے محبوب لفظ "عقل" کو خاک میں ملا کر اس کو تمام مفاسد کا سرچشمہ ٹھہرا دیا اور میں چیخ اٹھا کہ

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما؟

میرے تقشف کا انجام:-

میں نے تقشف سے روگردانی کیوں کی؟ اگر آپ یہ ماجرا ایک کٹھ ملا کی طرح سنیں گے تو مجھ پر ہزاروں صلواتیں بھیجنے لگیں گے۔ اور اگر ایک انسان دوست آدمی کی طرح سنیں گے تو مجھے امید ہے کہ کم سے کم میرے دل کی گداختگی کی داد دینے پر ضرور مجبور ہو جائیں گے۔

وہ ماجرا سن کر آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ جذبات کی رو میں بہہ کر اور "مصلحت خداوندی" پر نگاہ نہ کر کے میں نے بہت بڑی ٹھوکر کھائی۔ پرائے شگون پر ناک کٹائی اور اپنی عاقبت خراب کرلی ہے لیکن اگر آپ کے سینے میں دل اور دل میں دردمند انسانوں کی محبت ہے تو آپ یہ فیصلہ ہرگز نہیں کر سکیں گے کہ ترکِ عبادت میں میری نیت کا فتور یا میرے عدوان کا مادہ کارفرما تھا اب وہ ماجرا سنیئے۔

میں ایک روز حسبِ معمول امانی گنج کے میدان میں ٹہل رہا تھا۔ دسمبر کی برفانی ہوائیں، ادنیٰ دا سکٹ کو توڑ کر سینے میں چبھ رہی تھیں۔ فضا اپنی کالی کملی کو اوڑھ لینے کے واسطے جھٹک رہی تھی۔ تھکی ماندی چڑیاں بسیرا لے رہی تھیں۔ دور دور تک اداسی چھائی ہوئی تھی اور آفتاب کے ڈوب جانے کی کراہ فضا پر نظر آ رہی تھی کہ میں نے دیکھا کہ ایک کوزہ پشت بڑھیا، لکڑی ٹیکتی اور ریلوے لائن کو عبور کرتی ہوئی انتہائی دردمندی کے ساتھ میری طرف رینگتی چلی آ رہی ہیں۔

ان کا یہ عالم دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سوچنے لگا کہ یہ چلے کے جاڑے، یہ برف میں جھلا جھٹیٹا، یہ ہڈیوں کو تراشنے والی ٹھنڈی ہوا، یہ اونگھتا چٹیل میدان اور یہ ضعیفہ؟ — آخر کیا بپتا پڑی ہے ان پر کہ یہ اس وقت گرم سفر ہیں۔ اس وقت تو کتے بھی گھر سے باہر نکلنے کی جرأت نہیں کرتے۔ تیز تیز قدم رکھتا ہوا قریب گیا تو یہ دیکھا کہ جس لکڑی کے سہارے وہ چل رہی ہیں اس پر ان کا ہاتھ کانپ رہا ہے اور ان کے ہاتھ کی لٹکتی ہوئی کھال چلنے میں ہچکولے کھا رہی ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا۔ "بڑی بی سلام۔" انھوں نے میرا سلام سن کر جھکے جھکے "جیتے رہو بیٹا" کہا اور بڑی دشواری کے ساتھ کمر سیدھی کر کے پوچھا۔ "بیٹا تم کون ہو؟" میں نے اپنا نام بتایا۔ انھوں نے میرے نام کو اپنے حافظے میں ٹٹول کر پھر پوچھا "بیٹا! اپنے باپ کا نام بتاؤ؟" اور جیسے ہی میں نے اپنے باپ کا نام بتایا۔ ان کی بے نور و خشک آنکھوں میں دفعتاً نمی آ گئی۔ انھوں نے اپنے دونوں کانپتے ہاتھوں کی انگلیاں اپنے ماتھے پر چٹخا کر دور سے میری بلائیں لیں اور

ہچکیاں لے کر رونے لگیں، میری آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ اور میں نے دردناک آواز میں پوچھا "آپ رونے کیوں لگیں؟" انھوں نے کہا "بیٹا کیسے نہ روؤں اللہ بخشے میرے خاوند بخاری ڈیوڑھی کے سپاہی تھے۔ اللہ کرے خان صاحب بہادر (میرے باپ) کی کروٹ کروٹ حوریں ہوں۔ ان کی سرکار سے عید بقرعید اور شبرات کے انعام و اکرام کے ساتھ ساتھ، جڑاول کے نام سے اتنا مل جاتا تھا کہ ہم سب چین سے رہتے تھے۔ ہائے خان صاحب بہادر کے چھ مہینے کے بعد میرے سرتاج بھی سدھار گئے اور لے دے کر ایک نوجوان جہان بیٹا تھا سو وہ بھی "خانی"[1] کے مہینے میں دغا دے گیا۔" بڑی بی سینے پر ہات رکھ کر رونے لگیں اور ان کے چہرے کی جھریوں میں آنسو دوڑنے لگے۔

میں نے کہا "بڑی بی! آپ میرے گھر چلیں مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا آپ کی خدمت کروں گا اور ہر مہینے خدمت کرتا رہوں گا۔ انھوں نے کہا "نہیں بیٹا بختیار نگر میں میری چھوٹی بہن رہتی ہے وہ ہر مہینے مجھے سات روپے دیتی ہے۔ ان روپوں میں میرا خرچ پانی چل جاتا ہے۔ ایک بوڑھی جان کا پالنا ہی کیا۔" وہ غیور بڑھیا، جب کانپتے ہاتھوں سے دعائیں دے کر دور چلی گئیں تو میرے ایمان کی پنڈلیاں کانپنے لگیں اور یہ سوچ کر کہ یہ ہڈیوں کی مالا بڑھیا فقط سات روپیوں کی خاطر ہر مہینے ڈگ ڈگ کرتی بختیار نگر جاتی ہے۔ میری سانس گلے میں الجھنے لگی۔ اور اسی درد انگیز لمحے میں میری نظر دوڑ گئی اس طرف کہ اللہ کے کروڑوں بندے در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے، بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے، یتیم بچے ایک ایک کا منھ دیکھتے رہتے، بوڑھے باپ جوان بیٹوں کے جنازے اٹھاتے۔ کم سن بیواؤں کو رنڈسالے پہنائے جاتے، بوڑھی اور بے آسرا بیواؤں کے جوان بیٹوں کے جنازے اٹھانے کے سامنے دم توڑتے، سانپ انسانوں کو ڈستے، درندے ان کی ہڈیاں بھنبھوڑتے، سیلابوں میں شہر کے شہر بہہ جاتے، قحط کی شدت سے مائیں اپنے بچوں کو بھون بھون کر کھا جاتیں۔ وبائیں سیکڑوں گھروں کو بے چراغ کر دیتیں، زلزلوں کی کروٹوں میں ہزاروں شہر دب دبا کر رہ جاتے اور آتش فشاں پہاڑ بے شمار آبادیوں کو راکھ میں تبدیل کر کے رکھ دیا کرتے ہیں اور پھر یہ خیال آکر میرا سر چکرانے لگا کہ اللہ کی بنائی ہوئی اس دنیا کا عالم ہے کہ یہاں قدرت نے طاقت کو یہ لائسنس دے رکھا ہے کہ وہ ناطاقتی کو کچل ڈالے۔ میری چشم تصور نے یکایک پھر یہ تماشہ دیکھنا شروع کر دیا کہ یزید، شمر، نادر، نیرو، چنگیز، ہلاکو

---

[1] بیچ آباد کے ایک محلے کا نام

مسولینی اور ہٹلر خون انسانی کے دریاؤں میں اپنی رنگینیوں کے جہاز چلا رہے ہیں۔ فاتح اپنے مفتوحوں کی لاشوں پر قالین بچھا بچھا کر فتح کے جشن منا رہے ہیں۔ جوان مرد احتیاط سے تنگ آکر بزدلوں کے روبرو جھک رہے ہیں۔ اور بڑے بڑے اکابر ان سلاطین کے درباروں میں پیٹیاں باندھے کھڑے ہوئے ہیں۔ اور جاہلوں کے دروازے پر بڑے بڑے علماء کھڑے بھیک مانگ رہے ہیں۔ سقراط کو زہر کا پیالہ پلایا جا رہا ہے۔ مسیح کو صلیب پر لٹکا دیا گیا ہے۔ محمدؐ کے دانت شہید ہو جانے کے بعد خون بہہ رہا ہے۔ اور محمدؐ کے نواسے حسینؓ کو اس کے بچوں اور ساتھیوں کو زمین پر لٹا لٹا کر پیاسا ذبح کیا جا رہا ہے اور یہ سارے تماشے خدائے بزرگ و برتر کی آنکھوں کے سامنے۔ جو عادل ہے۔ حکیم ہے، رحیم ہے۔ رؤف ہے، رب ہے اور رزاق ہے اور جو اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرتا ہے۔ اور اس کے باوجود وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا اور ٹک ٹک دیدم، دم نکشیدم کے فتار میں گرفتار ہے۔ ان تمام باتوں پر ایک سانس میں غور کرنے کے بعد زندگی میں وہ پہلا دن تھا کہ خدا کے عادل و حکیم اور رب و رزاق ہونے سے میرے دل میں شدید بدگمانی پیدا ہو گئی۔ اور جھوٹ کیوں بولوں، مجھ کو خدا پر اس قدر غصہ بھی آ گیا کہ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی لائن کے شوالے پر نظر پڑ گئی۔ میں غصے میں بھرا ادھر گیا اور شوالے کے دروازے پر کھڑے ہو کر اول فول بکنے لگا۔

اسی عالم میں گھر آیا۔ نماز مغرب کا وقت قضا ہو چکا تھا۔ نماز کی عادت نے دل میں انگڑائی لی۔ میں نے ہمت ہار کر اس کی انگڑائی توڑ دی۔ اتنے میں باپ کا ایمان لاٹھی چارج کرنے لگا۔ بڑے جی سے وضو کیا۔ مصلے پر نظر ڈالی، دل نے کہا، اٹھا کر پھینک دے اس کو۔ اب باپ اور دادا دونوں مل کر مجھ پر لاٹھی چارج کرنے لگے۔ میں نے بادل ناخواستہ نماز شروع کر دی۔ رکوع میں خم ہوا تو وہ کوزہ پشت بڑھیا سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اب خوف خدا نے ڈانٹ پلائی کہ جھک جا مردود۔ میں جھک گیا اور جوں توں کر کے ایک بوجھل دل کے ساتھ آسمان کو دیکھنے لگا۔

کیا میرا دماغ کفر کی جانب پرواز کر رہا ہے؟ یہ سوچ کر میں لرز گیا۔ پھر میں نے اپنے دل سے پوچھا کیا میں نعوذ باللہ، خدا کے وجود سے انکار کر سکتا ہوں؟ دل نے کہا۔ "نہیں ہرگز نہیں"۔

اسی کشمکش کے عالم میں کئی مہینے تک اپنے دل و دماغ کو ایک اڑیل ٹٹو کی طرح نماز پڑھتا، لیکن ع "حالتے رفت کہ محراب بفریاد آمد" کی سی کیفیت مفقود ہو گئی۔

بندوں کی درمندی اور اللہ کی بے مہری کا تصور قوی سے قوی تر ہوتا چلا گیا۔ اور اسی تناسب سے میری نمازیں بے لطف، بے خضوع اور کھوکھلی ہوتی چلی گئیں۔ اور میرے ایمان میں اسی طرح تنزل ہونے لگا جس طرح رات کی تیرگی منہ اندھیرے کی روشنی میں آہستہ آہستہ کم ہوتی چلی جاتی ہے۔

اس عالم میں جب نماز پڑھتا تھا تو بے شمار انسانوں کی آہیں میرے کانوں میں گونجنے لگتی تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ آوازیں آنے لگتی تھیں۔

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

یا خداوندا، کارے انتہا داشت
کہ سر بندہ پروریدن نیست

زندگی اپنی جو اس طور سے گزرے غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

دیں میرسد کہ بہ غالب ناکام چہ رفت؟
می تو آں گفت کہ ایں بندہ خداوند نہ داشت

کفن بیاور و تابوت جامہ نیلی کن
کہ روزگار طبیب است و عافیت بیمار

مرا زمانہ طناز دست بستہ و تیغ
زند بفرقم و گوید کہ "ہاں سرے می خوار"

رونا تو اپنی آنکھوں کا دستور ہو گیا
حق نے تو دی تھی آنکھ یہ ناسور ہو گیا

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

چنداں کہ خدا غنیست، ما محتاجیم

اور ہر بار میرا جی چاہتا تھا، احتجاج کے طور پر نماز توڑ دوں۔ مگر ہمت نہیں پڑتی تھی۔ آخر کار کہاں تک اپنے سے لڑتا۔ ایک روز نماز پڑھ رہا تھا کہ خیال آیا ایسی نمازیں جن میں لب پر آیتیں ہوں اور دل میں ٹکا بیتی، کس مرض کی دوا ہو سکتی ہیں۔ یہ خیال آتے ہی ایک توپ سی چلی میرے دل میں دھائیں سے میری کھوپڑی میں ایک چھناکا پیدا ہوا۔ میری عقل میرے سر سے نکل پڑی اور میرے سامنے کھڑے ہو کر مجھ کو چیخ دکھانے لگی۔ اور میں نے جھٹ سے نماز توڑ ڈالی۔ حجرۂ نماز سے دیوانہ وار باہر آیا۔ حجام کو فوراً بلایا، داڑھی منڈوا دی۔ موٹے جھوٹے کپڑے اتار کر پھینک دیئے۔ اچھا لباس پہن لیا، ٹمٹم منگائی۔ آدھ گھنٹے میں لکھنؤ پہنچ گیا۔ لکھنؤ پہنچتے ہی دن دہاڑے۔ ایک نازنین کے کمرے پر چڑھ گیا اور گانا سننے لگا گانا سن کر کھانا کھایا۔ ٹنڈے کبابی کے کباب نوش فرمائے، وہیں پڑ کر سو گیا۔ شام کے قریب حمام کیا، گویا عقل کا غسلِ صحت ہو گیا۔ اور آسمان کی طرف آنکھیں اٹھا کر کہا۔

لو بندگی، کہ بندگی سے چھوٹ گئے، ہم

اور رات کے گیارہ بجے جب اس نازنین کی گدگدی مسہری پر لیٹا تو وہ کچھوے داڑھی کا لعین ترشا ملّا جو میرے حجلۂ دل میں آ کر بس گیا تھا، اپنا مصلّے اور اپنے وضو کا بدھنا بغل میں داب کر کھڑا ہو گیا۔ اور مجھ سے "تجھ پر خدا کی مار۔ اے مردود" کہتا ہوا چلا گیا اور اس ملّا کے جاتے ہی میری خواب گاہ میں میرا گم کردہ شاعر ؎

پس از مدت اگر را افتاد، بر ما کاروانے را

کے مانند ہنستا ہوا در آیا۔ آتے ہی اس نے دوڑ کر میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور گانے لگا ؎

مژدہ اے دل کہ مسیحا نفسے می آید | کہ ز انفاس خوشش، بوئے کسے می آید

آغازِ بادہ خواری :

دنیا کی تمام باتوں میں سے دو باتیں خصوصیت کے ساتھ ایسی تھیں کہ لڑکپن ہی سے مجھ کو ان سے شدید نفرت تھی۔ ایک تو، ان میں سے تھی بادہ خواری اور دوسری تھی دروغ گفتاری۔ دروغ گفتاری سے اب تک نفرت ہے لیکن بادہ خواری اختیار کر چکا ہوں۔

اس سے پیشتر کہ میں اپنے آغازِ بادہ خواری کا ماجرا بیان کروں، مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادہ خواری و دروغ گفتاری کے باب میں چند نکات پیش کر دوں تاکہ آپ کو میرے نظریات کا علم ہو جائے۔

جہاں تک کہ بادہ خواری کا تعلق ہے، میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ہر چند بادہ خواری اب میری زندگی کا جزو لاینفک بن چکی ہے۔ لیکن اگر بدقسمتی سے میں کبھی

ریاست کا آمر ہو جاؤں تو اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر شراب کا سا جوہر ناب عوام کے لئے
زہر اور خواص' اور وہ بھی دونوں قسم کے خواص کے واسطے آبِ حیات ہے، میں اس پر اسلحہ کے
لائسنس کے مانند یہ کڑی شرط عائد کر دوں کہ جب تک درخواست گزار (۱) اس نوعیت کا میڈیکل
سرٹیفکیٹ پیش نہ کر دے کہ اس کی صحت میں اس قدر دم خم ہے کہ وہ شراب کی ایک مقدار معین کے
بار کا متحمل ہو سکتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ کسی ماہر نفسیات کا۔ اس مضمون کا صداقت
نامہ بھی حاصل نہ کر لے کہ درخواست گزار کے مزاج میں تموّج اور حد سے متجاوز ہونے کا میلان
نہیں ہے اور وہ اس قدر دانا، پاکیزہ نفس اور شریف انسان ہے کہ پینے کے بعد وہ صحت کی پائیداری
اپنی اخلاقی و معاشی حالت کی استواری، اپنی خانگی زندگی کی خوش گواری، اپنے ذہن کی سالمیت
کی بیداری، اپنے حقوقِ نفس (مع حقوقِ عباد) کی آبیاری اور اپنے معاشرے کی پُرسکون
ہمواری کو، بأحسن الوجوہ، قائم رکھنے کی بدرجۂ اتم صلاحیت رکھتا ہے اس وقت تک اس کے نام
بادہ خواری کا لائسنس منظور نہ کیا جائے۔

اب رہی دروغ گوئی سو اس کے باب میں بڑی جسارت سے کام لے کر یہ عرض کرتا ہوں کہ جو
لوگ حقیقتِ کذب سے واقف نہیں وہ ہر "خلاف واقعہ بیان" پر کذب کا لیبل لگا دیا کرتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہر دانا انسان کو میرے اس خیال سے اتفاق ہوگا کہ ہر "خلاف واقعہ بیان کو
جھوٹ کے زمرے میں شمار نہیں کیا جا سکتا اور کلمات حکمت آمیز کو 'حرفِ دروغ' کا خطاب دینا انسانیت
پر بڑا ظلم ڈھانا ہے۔ میرے نزدیک جھوٹ فقط اسے کہا جائے گا جو سامعین کو دھوکا دے کر کسی شخصیت
یا جماعت کو بیجا نقصان یا اپنے ناروا فائدہ پہونچانے یا زیٹ کا مزا اڑانے کے واسطے بولا جاتا ہے۔

لیکن اگر ایسے خلاف واقعہ بیانات پر ہم دروغ گفتاری کا لیبل چسپاں کر دیں گے، جو بڑی
احتیاط آمیز نیک نیتی اور انتہائی جذبۂ حب انسانی کے ساتھ اس غرض سے زبان پر لائے جاتے ہیں کہ
(۱) نادان اور ضدی بیماروں کو موت کے جنگل سے بچا لیں (۲) فتنوں کا سدّباب کر دیں۔ (۳) گم راہ فرد یا
معاشرے کو صراطِ مستقیم پر لے آئیں اور (۴) کسی معصوم کے دل کو ٹوٹنے سے بچا لیں تو اس کے یہ معنی ہوں
گے کہ ہم تمام محسنانِ انسانیت اور تمام مصلحین عالم کے تمام عظیم کارناموں پر پانی پھیر دیں گے۔ اور یہ ایک
ایسی خطا ہوگی جس کو خیر کی تاریخ اور معلمین و مبلغین کی روح کبھی معاف نہیں کر سکے گی۔

سو، اگر میری جھوٹ کی یہ تعریف تسلیم کر لی جائے تو میں دعوے کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں
نے زندگی بھر میں کبھی ایک بار بھی دروغ بافی کا ارتکاب نہیں کیا ہے۔

اور غیر متفکر عوام میں جس کو جھوٹ کہا جاتا ہے اس کو مان لیا جائے تو مجھے اعتراف ہے کہ
اپنے اٹھارہ معاشقوں کے دورِ متلاطم میں اپنی بیوی کے دل کو ٹوٹ جانے سے بچا لینے کی خاطر میں نے

اپنے سر پر قرآن رکھ کر ایک بار نہیں اٹھارہ ہزار مرتبہ "جھوٹ" بولا اور بڑے دھڑلے کے ساتھ بولا ہے اور لوگوں کے معمولی اشعار پر "سبحان اللہ"، "ماشاء اللہ" "کیا خوب فرمایا ہے آپ نے" کے نعرے لگا لگا کر اور احباب کی مروت کے دباؤ میں ان کے کلام پر مبالغہ آمیز تبصرے لکھ لکھ کر بڑے زنانٹے کے ساتھ آج بھی "جھوٹ" بولتا رہتا ہوں۔

ہاں تو اس توضیحی عبارت یا اس جملۂ معترضہ کے بعد اب سنئے کہ میری بادہ خواری کا آغاز کیوں کر ہوا؟ یہ واقعہ غالباً ۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء کا ہے کہ میں اپنی نانہال دھول پور گیا ہوا تھا۔ وہاں میرے ایک دوست سردار مہابیر سنگھ نے میری دعوت کی تھی اور کہا تھا کہ میں چراغ میں بتی پڑتے ہی ان کے وہاں پہونچ جاؤں۔

وقت مقررہ پر میں وہاں پہونچ گیا۔ اپنے دوست سردار روپ سنگھ اور سردار تارا چرن کو وہاں موجود پایا۔ میرے آتے ہی بوتل کھول دی گئی اور پیمانے بھر بھر کے سب کے سامنے رکھ دیئے گئے۔

چوں کہ مجھ نافہم کو شراب سے سخت نفرت تھی، میں پیمانے کی میز سے اٹھ کر صوفے پر جا بیٹھا۔ سب نے میری طرف نگاہ اٹھائی اور صوفے پر جا کر بیٹھ جانے کی علت دریافت کی۔ میں نے کہا۔ "میں شراب نہیں پیتا۔" تینوں دوستوں کے منھ سے بیک ساعت ایک طویل "ارے" کی آواز نکل گئی۔ رن بیر نے کہا: "ارے شاعر ہو کر تم شراب نہیں پیتے۔" میں نے کہا۔ "شاعر کے واسطے شراب پینا کوئی لازمی امر نہیں۔" میرے اس جواب سے سب کے منھ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

روپ سنگھ نے اپنی ناک پر انگلی رکھ کر کہا۔ "میری جان تم کو یہ بھی آج تک خبر نہیں کہ دیوتاؤں نے سمندروں کو متھ کر یہ سوم رس نکالا تھا۔ فقط کویوں (شاعروں) کے لئے۔ ارے کوی ہو کر شراب نہ پینا پاپ، بلکہ مہاپاپ ہے۔ تم کو پینا پڑے گی۔" میں انکار اور وہ تینوں اصرار کرنے لگے، بڑی دیر تک جھک جھک رہی، شور رہا۔ منتیں رہیں، ہاتھ جوڑے گئے، لیکن جب میں پینے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوا تو میرے میزبان مہابیر سنگھ نے جلدی جلدی بڑے بڑے چار پانچ گھونٹ پی کر سردار روپ سنگھ اور سردار تارا چرن سے کہا تم لوگ بتیجر کی چوتیا پنتی میں وقت برباد نہ کرو۔ اٹھاؤ اپنا اپنا جام میں ابھی ان کوی مہاراج کا تیا پانچا کئے دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر انھوں نے اپنا گلاس خالی کر دیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی دھمکی سے پوچھا۔ "کیوں جھوٹے کوی صاحب نہیں پیو گے؟" میں نے کہا۔ "مہابیر تیرے سر کی قسم مر جاؤں گا پیوں گا نہیں۔" انھوں نے بڑے زعم کے ساتھ اپنے سر کو جھٹکا دے کر کہا۔ "اچھا بچا جی ابھی مزہ چکھائے دیتا ہوں تم کو۔" یہ کہا اور کسی بڑے اور مضبوط ارادے کے ساتھ وہ اٹھ کھڑے

کرتے ہوئے سامنے کے کمرے میں داخل ہوگئے۔ ان کے جانے کے بعد روپ سنگھ نے میری طرف اشارہ کرکے تاراچرن سے کہا۔ "پارٹنر[1] دیکھ لو گا ڈوڈی ایسے ہی ہوتے ہیں"۔ میں نے ان کو گالی دی، وہ ہنسنے لگے۔

کوئی دس پندرہ منٹ کے بعد مہابیر کمرے سے نکلے انھوں نے لپک کر دو جام بنائے۔ ایک جام آدھا ختم کرکے وہ اپنے کمرے کی طرف دیکھنے لگے اور جب چھم کی آواز سنی تو انھوں نے پردہ اٹھایا۔ اور سیکنڈ کے اندر پردے کے تانے بانے سے ایک روشنی سی پھوٹنے لگی اور دوسرے سیکنڈ میں کیا دیکھتا ہوں کہ پیکر انسانی میں ڈھلی ہوئی ایک کڑکتی بجلی، ہزاروں الوتوں کے ساتھ چھم چھم کرتی اور پتلی کمر بل کھاتی چلی آرہی ہے۔۔ اور میرے دل میں یسبح الرعد بحمدہ کی صدا گونج رہی ہے۔

اُف۔ وہ سولہ سترہ برس کا سن۔ وہ مرادوں کی راتیں مرادوں کے دن۔ وہ چھلا سی کمر، وہ صراحی دار گردن۔ وہ کسمساتا بدن، وہ گدرایا ہوا جوبن۔۔ وہ سینے کا بالی ابھار، وہ ریشمی بلوری سطح ناہموار۔ گالوں کی وہ کنول کی کاغذی جلد، جلد کے نیچے سے چھنتا اور چھلکتا ہوا گلابی رنگ۔ وہ ستواں ناک۔ سجل نقشہ۔ دمکتی پیشانی، دمکتی پیشانی پر وہ بوٹا قشقہ۔ ڈکلتا قد۔ چھتا پنڈا۔ سرخ انکھڑیوں سے وہ اٹھتی رنگین گھٹائیں۔ لانبی نکیلی پلکوں کی جھپک میں وہ بجلیوں کے کوندے بکھری زلفوں سر کے دنبالے وہ کھلائی ہوئی دھنک۔ سانسوں کی موجوں میں وہ کوکتی جوانی۔ بکھری زلفوں میں وہ جھولتی ہوئی، بندرابن کی برکھا راتیں۔ ہیرے کے باریک قلم سے ترشے ہوئے لب، لبوں میں وہ چوم لیے جانے کی تمنا کا ابھار۔ اور چھل چھل کرتی چست انگیا کی کٹوریوں میں وہ زیر تعمیر تاج محل کی جھنکار۔ ارے دہائی گنبد۔ گردوں کے پروردگار۔ اس کو دیکھ کر زلزلہ آگیا۔ میرے دیار وجود میں۔ خون کی گردش میں ایسا جوار بھاٹا آیا کہ کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آنے لگیں۔ حباب سی اٹھنے لگی۔ میرے مسامات سے، اور سر پر آواز منڈلانے لگی۔ "اڑ جھینگر، ساون آیا۔" "اڑ   ساون آیا۔"

اتنے میں وہ بھرے ہوئے ساغر کی طرف گئی، پتلی پتلی اور لانبی لانبی سرخ انگلیوں سے اس نے ساغر اٹھایا، ایسا معلوم ہوا۔ گویا بلوریں حجاب کے قلموں کے حلقے میں ممتعہ روشن ہوگیا۔ ساغر کے خطوں کی نبض چلنے لگی اور صہبا کی موجوں میں بھنور پڑنے لگے۔

---

[1] تاش کے رفیق

پیمانے سے منھ لگا کر اس نے دو چار گھونٹ پئے اور اس کے بعد اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اسکی لمبی لمبی انگھڑیاں میرے سینے کو توڑ کر میرے دل میں اتر گئیں اور ایسا لگا جیسے کوئی چیز میرے گلے سے اتر رہی ہے۔ پھر اس نے آنکھیں جھکا لیں میرے دل میں دونوں وقت گلے ملنے لگے اس نے اپنا ساغر خالی کر کے دوسرا ساغر لب ریز کر لیا۔ اس لب ریز ساغر سے چند قطرے پئے۔ کن آنکھوں سے مجھ کو آنکا، آنک کر شکاری کی نظر سے دیکھا اور پیمانہ ہاتھ میں اٹھا کر بڑھنے لگی میری طرف، اور بجنے لگے اسکے قدم میرے سینے میں ـــــ میرے دل میں "ٹن ٹن" خطرے کی گھنٹی بجی اور آواز آئی "ارے بڑا زبردست طوفان آ رہا ہے۔ خاں صاحب ہوشیار" سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ میری طرف بڑھتے ہوئے اس نے گانا بھی شروع کر دیا ؂

"ارے میں تو لٹ گئی، بیچ بجارے ترکوا نے لوٹ لیا" اسکے گاتے ہی تارا چرن نے ستار چھیڑ دیا۔ "جھنن جھنن جھنن جھان" عود کی لپٹوں ستار کے جھالوں اور اس فتنۂ دوراں کی تانوں سے در و دیوار جھومنے لگے اور وہ ظالم مجھ سے قریب سے قریب ہونے لگی، یہاں تک کہ جھالوں اور تانوں میں پیرتی ہوئی وہ بالکل میرے سر پر آ کر کھڑی ہو گئی اور پھر اس قدر قریب آ گئی کہ اس کی ابلتی جوانی کی آنچ مجھ کو چھونے لگی اور اسکی کچی عمر کی مہکتی سانس میرے سینے میں پھنسنے لگی۔ میرے دل سے پھر آواز آئی "خاں صاحب! ہوشیار، ہوشیار دشمن سر پر آ پہنچا" بغلی ڈوب جاؤ، میرے ہاتھ پیر سنسنانے لگے، چاہا کہ اٹھ کر بھاگ جاؤں کہ یکایک وہ ظالم جھم سے میرے زانو پر آ کر بیٹھ گئی، ستار پر اور بھی تیزی کے ساتھ جھالا بجنے لگا، اور اس نے اپنی جھوٹی شراب کے ساغر کو میرے لبوں سے پیوست کر کے پھر گانا شروع کر دیا۔ "ارے پی لو، ترکوا شراب، میری جھوٹی شراب، میری جھوٹی شراب" اور میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ الا اللہ کا نعرہ لگا کر پورا گلاس ایک سانس میں خالی کر دیا۔ میرے ہاتھ سے گلاس لیکر چوما اور پھر اس نے میرے گلے میں باہیں ڈال دیں اور اپنے لب میرے لب سے چسپاں کر کے اس طرح الٹی سانسیں لینے لگی گویا وہ میرے تمام وجود کو پی جائے گی۔

جھر، جھر، جھر، جھر، تالیاں بجانے لگے تارا چرن، روپ سنگھ اور جہانگیر سنگھ ہپ ہپ ہرا کرتے سب میری طرف دوڑ پڑے۔ رن بیر نے سر جھکا کر کہا: "خاں صاحب بہادر آداب، بولو گئی ساری شیخی" اور پھر دور شروع ہو گیا، ستار کے جھالوں میں۔

بالا بلند، عشوہ قدے، سرو ناز من　　کوتاہ کرد قصۂ زہد دراز من

۱؎ ارے میں تو بازار کے بیچوں بیچ گئی۔ ترک نے لوٹ لیا (مسلمان کو ترک کہا جاتا، پھر یہ لفظ معشوق کے معنی ..

میرے عنفوان شباب تک کا ہندوستان

میرے حالات کے ساتھ ساتھ میرے اس ہندوستان کے تہذیبی و معاشرتی حالات بھی سن لیجئے، جس نے مجھ کو متاثر کیا اور سانچے میں ڈھالا تھا۔

تہذیبی اعتبار سے اس وقت ہندوستان دو راہے پر کھڑا ہوا سوچ رہا تھا، کہ مشرقیت پر قائم رہے یا مغربیت کی طرف مڑ جائے؟ ملک اس وقت "خالص مشرقی"، "نیم مشرقی" اور "مغربی" ان تین گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔

خالص مشرقی گروہ کی اکثریت تھی۔ نیم مشرقی گروہ کی تعداد کم تھی اور مغربی گروہ اقلیت میں تھا۔

خالص مشرقی گروہ کے چہروں پر لانبی یا خشخشی داڑھیاں تھیں اور سروں پر پٹے پٹوں پر عمامے، دستاریں، شملے یا دو پلی اور چوگوشیا ٹوپیاں۔ پاؤں میں گھیتلے یا سلیم شاہی جوتے۔ بڑے پائنچوں کے پائے جامے یا دو ریی گھٹنے، عبائیں قبائیں۔ انگرکھے، دگلے شالوں اور کمروں پر بڑے بڑے رومال، چکن کے کرتے، روئی کی صدریاں اور ہاتوں میں خاک شفا کی تسبیحیں، انگلیوں میں فیروزے کی انگوٹھیاں۔ ہولا اور شام لگی جریبیں۔

نیم مشرقی گروہ داڑھی منڈاتا، شیروانیاں، چست پائجامے پمپ جوتے استعمال کرتا اور جیبوں میں گھڑیاں رکھتا تھا۔ جن کی زنجیریں دونوں جیبوں کے درمیان لٹکتی رہتی تھیں۔

اور مغربی گروہ سوٹ بوٹ اور ہیٹ میں غرق رہتا تھا۔ لیکن داڑھی کے ساتھ مونچھیں نہیں منڈاتا تھا۔

فرنگیوں کے نقیب پنڈت مدن موہن مالویہ اور سر سید احمد خاں اپنے چیلے چاپڑوں کے ساتھ مغربیت کے فروغ کی سعی کر رہے تھے لیکن اس وقت تک مشرقیت اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ مغربیت ہر چند ابھرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی، مگر قومی مشرقیت اس کا گلا دبائے ہوئے تھی۔ اور سوٹ پہننے والوں کو "بلبلی صاحب" کہا جاتا تھا۔

کھیلوں میں بھی ہندوستانی کھیل، یعنی گلی ڈنڈا، پتنگ، آتی پاتی، چھلچھلی، کبڈی، آنکھ مچولی ست گھڑا گیپل، گولیاں، اندھا مرغا، تلی گھوڑی، شطرنج اور چوسر۔ بتراکی، بانک، بنوٹ

پٹا، کشتی، ڈنڑ، اور مگدر۔ مرغ بازی اور بٹیر بازی اور تیتر بازی کا عام رواج تھا۔ اور فٹ بال، ہاکی، ٹینس، پنگ پانگ، بیڈمنٹن، تاش اور کرکٹ کو کوئی منہ نہیں لگاتا تھا۔

اسی طرح ڈولیوں، پالکیوں، فنسوں، میانوں، ہوادار دل، گھوڑوں بند گھوڑا گاڑیوں اور ہاتھیوں کی سواریوں کے آگے لینڈ ڈیں، ٹمٹمیں، فٹنیں، موٹریں اور سائیکلیں سواریاں بھی بھاتی تھیں۔ مشرقی و مغربی لوگوں کی راتیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی تھیں۔ ادھر شام ہوتے ہی نوابوں اور رئیسوں کے محلوں میں جھاڑ فانوس، شمعیں اور ر اکّے روشن کر دیئے جاتے عود سلگتا، عطر دان کھلتے، خاص دانوں میں گلوریاں آتیں، چاندی سونے کی چمیٹوں سے اٹھا اٹھا کر پان کھائے جاتے، معطر حقے اور سٹکیں گڑ گڑاتیں۔ علمی مباحث، مشاعرے اور مجرے ہوا کرتے تھے۔

ادھر کلبوں میں تاش کھیلے جاتے، بیڈمنٹن کی اچھل کود ہوتی۔ پیانو بجتا، گراموفون کھڑکھڑاتا سگرٹوں کی بو اڑتی۔ کانی بیلی شمس "بکورا" یا "مسز پیچر" مغربی دھنوں میں شور و غوغا کرتیں اور جب بیرہ دے بیرہ دہ گڑواتا ڈانس شروع ہوتا تو بینڈ بجنے لگتا تھا اور عمدہ بجانے والوں کو زور زور سے تالیاں بجا کر داد دی جاتی تھی اور ہماری زبان میں وہ سب تالی پٹے ہوئے لونڈے گھیرے بن جایا کرتے تھے۔ ادھر فرش یا چوکیوں پر دستر خوان بچھا کر ہاتھوں سے اور اُدھر میزوں پر کانٹے چھری رکھ کر، چھری کانٹے سے کھانا کھایا جاتا۔ چونکہ فرنگی تہذیب اس وقت تک مغرب پرستوں تک کو بھی ہضم نہیں ہو سکی تھی اس لئے چھری کانٹوں سے برابر کھٹ کھٹ کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ گاہ گاہ وہ آلات خوراک تڑ سے فرش پر گر بھی جایا کرتے تھے یا بے گلی مرغ کی ٹانگ اڑ کر کسی کی ناک سے ٹکرا جایا کرتی تھی۔ دونوں کے کھانوں میں بھی زمین آسمان کا فرق تھا۔ ادھر کے کھانے تھے (۱) قورمہ، قلیا، کوفتے، شامی کباب، بوٹی کباب لگن کباب، آنت کباب، مچھلی کباب، ذم پخت کباب، نرگسی کباب، ران کباب، مرغ کباب، تیتر، کبوتر، بٹیر، شب دیگ، کلّے پائے، کھچری، سری، بھیجا، کلیجی، گردے، دم پخت بکرے، قیمہ، قیمہ بھرے کریلے، دھوئی ماش کی دال، کھڑے مسور کی دال، خاگینہ، چلے، ستارے، بگھی رائتیں، بریانی، پلاؤ، مرغ پلاؤ، تیتر پلاؤ، بٹیر پلاؤ، بوٹ پلاؤ اور چکنی پلاؤ وغیرہ۔

مٹھائیوں میں، حبشی حلوا سوہن، پپڑی حلوہ سوہن، زردہ، انار کا زردہ، پستے یا دام کا زردہ، مزعفر، کھیر، شیر خرما، پچھے، بالائی، میٹھے سموسے، قلفیاں، بالائی کے آب خورے، نکش پیڑیاں،

لہ انگریز ہندوستانیوں کے کلبوں میں آنا توہین سمجھتے اور اپنے کلبوں میں ہندوستانیوں کے داخلے کو خلاف شان خیال کرتے تھے۔ اسی لئے دیسی انگریزوں کے کلبوں میں اینگلو انڈین لڑکیاں اور عورتیں ہی شریک ہوتی تھیں۔

رساول، گڑمبا، پیوسی، برنی، جلیبیاں، امرتیاں، لڈو، باجرے کا ملیدہ، قلاقند، گلاب جامن، پیڑے پیٹھا، اندر سے، دندان مصری، شکر پارے، لوز، چٹنیاں اور مربے۔ دہی رایتا، پھلکیاں، دہی بڑے، تلی دالیں۔ چاٹ، تکونے، سموسے، شہال، پاپڑ، نمک پارے، کھچڑیاں، دال موٹھ، سیو، تلی اردی، بھرتے، ساگ، تہری قبولی، خشکہ گوجھے، منگیچیاں اور رکھوٹے۔ (چپاتی، ورقی چپاتی، دہری چپاتی، پھلکے، گردے، خمیری، شیرمال ڈوسے یکر اٹھارہ برتنوں کے پراٹھے روغنی روٹی بیسنی روٹی، باقر خوانی۔

اور اُدھر کا کھانا تھا، سوپ، چاپ کٹلٹ، ابلی مچھلی، ابلا مرغ، ابلے آلو، ابلا مٹر، ابلی ترکاریاں، ڈبل روٹی، مکھن، پڈنگ، پیسٹری، آئس کریم، جیلی، ساس اور کیک۔ بس اللہ اللہ خیر سلا۔

ہر چند سرسید گزیدہ انگریزی خوانوں میں فرنگی کے نقالی اور پرستاری کا ذوق روبترقی تھا مگران کی عورتیں ٹھیٹ ہندوستانی تھیں اور "موئے کالا پانی پینے والوں"[1] سے ان کو شدید نفرت تھی۔

گھروں میں مغربی فرنیچر کا کہیں نام بھی نہیں تھا، وہی پرانے زمانے کی مسہریاں وہی چھپر کھٹ وہی نیچے پایوں کے تختوں کے چوکے، چوکوں پر مسندیں، قالین، چاندنیاں، گاؤ تکیے، میر فرش، اُگالدان، الائچی دان، پاندان اور خاص دان، لباس میں بھی وہی قدیم تراش خراش قائم رہی، وہی پائچوں کے کلی دار پاجامے جن کے گوشے چلتے وقت خادمائیں اٹھا لیتی تھیں، وہی انگیا، وہی کُرتی، وہی انگیاؤں کی چڑیاں، وہی شلوکے، وہی دوپٹے، وہی دلائیاں اور وہی رضائیاں، وہی پرانا تیل پھلیل تھا، وہی کاجل، وہی مسّی، وہی سرمہ، وہی مہندی اور وہی افشاں چلی آرہی تھی۔ صابون کا رواج بہت کم تھا، کھلی بیسن اور اُبٹن سے کام لیا جاتا تھا۔

کنواریوں کو بے کلیوں کے سیدھے پاجامے پہنائے جاتے تھے۔ ان کی ناک میں ایک موتی کی چھوٹی سی نتھنی ہوتی، یا نیم کا تنکا، اور ان کو پان کھانے، مسّی لگانے اور افشاں چھڑکنے کی اجازت نہیں تھی اور مانگ نکالنے کے بدلے ان کے سروں پر مینڈھیاں گوندھی جاتی تھیں (جس سے چوخانہ سا بن جاتا تھا۔

اس دَور کے زیوروں کے نام سُن لیجئے۔

(۱) سر پر چھپکا (۲) ماتھے پر سراسری ٹیکا سیمت۔ (۳) کانوں میں پتّے، بالیاں، جھمکے، بلے

---

[1] شراب کو عورتیں کالا پانی کہتی تھیں۔

بجلی، نگر، بنارے، جھالے، انتیاں اور کرن پھول۔ (۴) ناک میں نتھنی، بلاق اور کیل (۵) گلے میں طوق، گلوبند، بدھی، زنجیر، چنن ہار، ڈھکر کی، چمپا کلی اور ہیکل (۶) بانہوں میں جوشن، نونگے، بازوبند، اکّا اور چھوٹا سا عطر دان (۷) کلائیوں میں کڑے، پہنچے، دتّیاں، بانکیں، چوڑیاں کریلیاں، پہنچیاں، شمر بیں، کنگن، اور جہانگیر یاں (۸) انگلیوں میں چھلّے، انگوٹھیاں، آرسی اور علی بند (جن میں سونے چاندی کی زنجیریں ہوتی تھیں) (۹) پاؤں میں سا نچھا گل، جھانجیں، رام جھول، بچھوے، کڑے، جھڑے، لچھے اور پازیب (۱۰) پاؤں کی انگلیوں میں چھلے (جن میں انگوٹھے سے لے کر چھنگلیا تک سونے یا چاندی کی زنجیر ہوتی تھی)

نواب صاحب کی بیگم ہوں یا بیرسٹر صاحب کی بیٹر ہاف (BATTER HALF) دونوں بڑی سختی کے ساتھ پردے کی پابند تھیں۔ ڈولی اور پالکی کے سوا کوئی بی بی گھر سے باہر قدم نہیں رکھتی تھی اور تو اور عورتوں کی آوازیں اور ان کا وزن بھی پردہ نشیں تھا یعنی کوئی بی بی اسقدر زور سے نہیں بولتی تھی کہ مردانے تک اس کی آواز جا سکے اور جب کوئی خاتون پالکی میں سوار ہوتی تھیں تو پتھر کا ٹکڑا یا سل پالکی میں رکھ دی جاتی تھی کہ کہاروں کو اس کے جسم کا صحیح اندازہ نہ ہو سکے اور بیبیاں تو بیبیاں، مامائیں اصیلیں اور لونڈیاں تک پردے کی پابند تھیں۔

زنانے میں آنے جانے والے بیرونی بچوں سے بھی جب کہ وہ دس گیارہ سال کے ہو جاتے تھے، پردہ شروع کر دیا جاتا تھا۔ اور مشکوک چال چلن کی عورتیں سے بھی پردہ کیا جاتا تھا۔ اور تو اور باپ دادا نانا چچا اور بھیا کے سامنے بھی عورتیں سروں پر پلو ڈال کر جایا کرتی تھیں اور کسی عورت کی یہ مجال نہیں تھی کہ وہ اپنے بزرگوں کی موجودگی میں اپنے بچے کو گود میں لے لے۔

زنانے مکان کی فضا کو مقدس رکھنے کا یہاں تک اہتمام کیا جاتا تھا کہ کسی ترکاری والی کو یہ اجازت نہیں تھی کہ وہ لانبی لانبی ترکاریوں مثلاً لوکی، ترئی، کریلے، چچینڈے وغیرہ کو ٹکڑے ٹکڑے کئے بغیر سالم حالت میں اندر لے جائے اس لئے کہ صورت کے لحاظ سے ان ترکاریوں کو "فحش ترکاری" خیال کیا جاتا تھا۔

اپنے لڑکپن کا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ بلیح آباد کے ایک صاحب کے لڑکے کی شادی میں ناچ ہو رہا تھا کہ بالا خانے سے ایک عورت جھانک کر ادھر دیکھنے لگی۔ اور صاحبان محفل میں سے ایک صاحب نے اس کو بندوق مار دی۔ صاحب خانہ دیگوں کے حلقے میں کھڑے تھے کہ انھوں نے گولی چلنے کی آواز سنی اور دوڑتے ہوئے محفل میں آئے۔ گولی مارنے والے خانصاحب نے ان سے کہا "بھائی آپ کی بیوی اوپر سے جھانک رہی تھی مجھ سے بے حیائی برداشت نہیں ہوئی میں نے گولی ماردی۔"

صاحب خانہ نے ان کی پیٹھ ٹھونک کر کہا "بہت اچھا کیا آپ نے" اور فوراً اندر چلے گئے اور تھوڑی دیر میں ایک لاش گھسیٹتے ہوئے آئے اور کہا "بھائی دیکھ لیجئے میری بیوی نہیں لونڈی جھانک رہی تھی۔ اللہ نے میری آبرو اور میری جان دونوں چیزیں بچا لیں۔

۲۔ سیاسی اعتبار سے اس وقت سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پو پھٹنے میں بہت دیر تھی۔ رات کے دو یا تین بجے کا وقت تھا لوگوں کی اکثریت خراٹے لے رہی تھی کچھ لیٹے دل بیمار پڑے کروٹیں لے اور کنمنا رہے تھے اور بہت تھوڑے لوگ ننگ اور گو کھلے کے گھر شکن کمر بیدار ہو گئے اور دبے سروں میں آزادی کے چرچے کر رہے تھے اور بھارت ماتا چونکتا ہوکر ادھر ادھر دیکھ کر دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ ؎

از کجا می آید این آواز دوست

فرنگی کے کان تک بھی وہ آوازیں پہنچ رہی تھیں لیکن اس کا غرور کہہ رہا تھا کہ ؎

یہ ہوا میرے چراغوں کو بجھا سکتی نہیں

لیکن مہاتما گاندھی جس وقت لنگوٹا باندھ کر میدان میں کود پڑے تو پھٹ گئی اور ہر طرف سے یہ آوازیں لگیں کہ تحت یا تختہ ـــ آزادی یا موت یا ایوانِ فرنگی مسمار یا تختۂ دار۔

گاندھی کی آندھی نے حکومت کے اوسان اڑا دیئے۔ حکومت یہ سوچ کر ہاتھ ملنے لگی کہ ہم نے مسلمانوں کے ایک فرقے کو دوسرے فرقے اور ہندوؤں کے ایک فرقے کو دوسرے فرقے اور پھر بحیثیت مجموعی ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا دینے کے سلسلے میں جو لاکھوں روپیہ پانی کی طرح بہا دیا، وہ بیکار گیا اور سارے مسلمان اور ہندو مل کر آج ہمارے مقابلے کے واسطے آ گئے۔ یہ علامت نہایت خطرناک ہے۔ کیا تدارک کیا جائے اس فتنۂ عظیم کا ؟

آخر کار حکومت نے ایک منصوبہ تیار کر لیا۔ پولیس اور فوج کے حلقے میں بگل بجا دیا گیا۔ ایک طرف تو جیلوں کے دروازے کھول دیئے گئے۔ لاٹھیاں برسنے اور گولیاں چلنے لگیں اور دوسری طرف پکڑ بلوایا گیا ہندوؤں اور مسلمانوں کے دینی رہنماؤں، یعنی مہاپرشوں، بدھیاؤں اور شمس العلماؤں کو، جن کو ہندو مسلم فسادات برپا کرانے کے لئے برسوں سے گھر بیٹھے وظیفے مل رہے تھے اور بری طرح پھٹکارا گیا ان کو کہ انھوں نے ایسی غفلت کیوں برتی کہ ہندو مسلم اتحاد کا فتنہ برپا ہو گیا۔

اور اسکے ساتھ ساتھ پکارا گیا ان تمام نوابوں، برائٹ آنریبلوں، خان بہادروں، رائے بہادروں، رئیسوں، تاجروں، سیٹھوں، سود خواروں، زمین داروں، جاگیرداروں، تعلقہ داروں اور دیسی ریاستوں کے شہریاروں کو جن کو حکومت سانڈوں کی طرح پالے تھی۔ کہا کہ دیکھو

کانگریس کی طرف اپنی توپوں کے منھ موڑ دو اور آزادی کے دیوانوں پر اپنے کتے چھوڑ دو۔

اب کیا تھا ہر طرف پکڑ دھکڑ کا ایک طوفان برپا ہو گیا جیلیں بھری جانے لگیں سولیاں کھڑی کردی گئیں اور ہر جانب سے غلغلے بلند ہونے لگے کہ خاک میں ملا کر رکھ دو۔ انگریز بہادر کے غداروں کو۔ یہاں تک کہ آگے چل کر جلیانوالہ باغ کی زمین خون میں ڈوب گئی اور تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہونے لگیں لاشیں محبان وطن کی ـــــــ اور آسمان سے آنے لگیں صدائیں ؎

کسے نہ ماند کہ اور ابہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

قومی تحریک سے وابستگی

یہ واقعہ، غالباً ۱۹۱۸ء کا ہے کہ سب سے پہلے محمد مستقیم[1] نے مجھ کو گاندھی جی کی شخصیت اور تحریک آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر کے کانگریس کے سالانہ اجلاس میں شریک ہونے کے واسطے احمد آباد بھیجا تھا۔ شام کے وقت احمد آباد پہنچا۔ ایک خیمہ میں جا کر ٹھہر گیا۔ تھکا ماندہ تھا کھانا کھا کر سو گیا۔ پچھلے پہر یہ خواب دیکھ رہا تھا کہ میں تخت سلیمان پر بیٹھا اڑ رہا ہوں کہ میرا خیمہ تالیوں سے گونجنے لگا آنکھ کھل گئی، گھڑی دیکھی، سوا چار کا وقت تھا۔ خیمے کا پردہ الٹ کر باہر آ گیا۔

باہر آتے ہی دیکھا کہ میرے خیموں کے شہر پر، شگونی کی گلابی روشنی برس رہی ہے اور سینکڑوں زہرہ جمال گجراتی لڑکیاں، پتلی پتلی کمروں میں سرخ سرخ پیٹیاں باندھے اور ہاتھوں میں شمعیں اٹھائے قومی ترانے گا رہی ہیں اور پوری دنیا چھما چھم ناچ رہی ہے ؎

چہ مبارک سحرے بود و چہ فرخندہ شبے

میں صبح ہوتے مولانا ابوالکلام آزاد کے پاس پہنچا، ان کے ساتھ چائے پی۔ انھوں نے ہنس کر کہا، ملیح آباد میں آپ نے جو لطیفہ[2] سنایا تھا آج تک اس کا مزا لے رہا ہوں۔

مہاتما گاندھی سے پہلی ملاقات:

مولانا آزاد کے ساتھ، گاندھی جی سے ملا۔ ان کی صورت نے میرے ذوق جمالیات کے منھ پر تڑاق سے تھپڑ مار دیا۔ اور میرے دل میں اس وقت یہ بات آئی کہ اس قدر ٹوٹے ہوئے جسم اور اس قدر بگڑے ہوئے چہرے کا آدمی دنیا میں کر ہی کیا سکتا ہے۔ ہندوستان کی آزادی، اور گاندھی؟ یہ منھ اور مسور کی دال؟؟ مایوسی نے مجھ کو ڈھانک لیا

---

[1] وہ نسلی اعتبار سے انگریز، دینی اعتبار سے مسلمان۔ آگرے میں میرے سوتیلے ماموں کے ٹیوٹر اور بعد کو میرے بھائی محمد یوسف خاں کے سکریٹری کی حیثیت سے ملیح آباد آ گئے تھے [2] اس سفر میں مبشر احمد خاں رامپوری، چھوٹے دادا، اور جگنو خدمتگار میرے ساتھ تھا [3] وہ لطیفہ یہ ہے کہ ایک ایرانی ہندوستان کے آم کھا کر جب شیراز پہنچا اور اس نے وہاں جا کر جب آموں کی تعریف کے پل باندھ دیئے۔ تو اہل شیراز نے پوچھا۔ کیا وہ پھل انگور و سیب سے بھی اچھا ہے؟ اور اس ایرانی نے کہا، امر احلیٰ بہتر تو لوگ اسکے پیچھے پڑ گئے کہ اس کا مزا بتاؤ۔ مزا بتانے کی چیز ہی کب ہے کہ وہ بتاتا تقاضوں سے تنگ آ کر اس نے کہا آم اس قدر لذیذ تھے کہ کھاتے وقت یہ محسوس ہوتا تھا گویا علی مرتضیٰ ہیں کہ زبان سے گلے میں اترتے چلے جا رہے ہیں۔ نعرہ صلوٰۃ بر محمد و آل محمد۔

لیکن جب مختلف مسائل پر انھوں نے زبان کھولی تو اُن کی رائے کی صحت واصابت اور انکے لہجے کی پختگی وصلاحیت نے یقین دلا دیا کہ ہندوستان کو جس مرد میدان کا انتظار تھا وہ آگیا ہے۔ اب ہمارے دن پھر جائیں گے۔ گاندھی جی کے پاس پنڈت موتی لال کی صاحبزادی وجے لکشمی سر جھکائے ہوئے بیٹھی تھیں۔ اس وقت تک میں نے حسن معصوم دیکھا نہیں تھا میرا دل کانپ اٹھا۔ اور اس سوچ میں پڑ گیا کہ اگر سید حسین سے ان کی شادی ہو جاتی تو کون سی قیامت آجاتی ہم سب چھٹ بھیئے ہیں۔ آزادی کے بعد بھی ہم کتوں کی طرح آپس میں لڑتے اور ایک دوسرے کو بھنبوڑتے رہیں گے۔

اتنے میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا آزاد سبحانی اور پنڈت نہرو آگئے۔ نہرو نے مجھ کو گلے لگا لیا اور مجھ کو وہ زمانہ یاد آگیا جب میں بچپن میں اپنے باپ کے ساتھ ان کے باپ کے مکان ٹھہرا اور وہاں سب سے پہلے ان کو دیکھا تھا۔ اس وقت وہ بھولا قیامت تھے اور ہیں بھی :

اس کے بعد ہم سب پنڈال جانے کے لئے باہر آئے۔ اللہ اللہ وہ ہندو مسلم اتحاد کا جوش خروش، وہ کوثر وگنگا کی موجیں دوش بدوش۔ آنکھوں میں عزائم کے وہ ہو نکتے گرداب، وہ سورماؤں کے گرجتے شباب۔ وہ گجراتی والنیٹر لڑکیوں کے جوشیلے گیت، گیتوں میں وہ پیت کی ریت۔ وہ امنگوں کا زور وہ ترنگوں کا شور۔ وہ جیالوں کی سج دھج وہ نعروں کی گونج گرج۔ وہ تمناؤں کے طوفان وہ لو دیتے ارمان۔ وہ گونجتے یمین ویسار، وہ ٹوٹتی زنجیروں کی جھنکار۔ ایسا محسوس ہورہا تھا کہ ہندوستان کی زمین آسمانوں کی طرف ہمک رہی ہے۔ ہر طرف ایک بجلی ہے کہ لپک رہی ہے۔ فرنگی کھڑے سینے کوٹ رہے ہیں غرور حکومت کے شیشے چھنا چھن ٹوٹ رہے ہیں۔ طوفان بن کر آرہا ہے۔ سوراج اور ہندوستان کے سر برہنہ جاں بازوں کے قدموں کی طرف بہتا چلا آرہا ہے، برطانیہ کا تاج ؎

بکوئے مے کدہ یا رب سحر چہ مشغلہ بود
کہ شور شاہد و ساقی و شمع مشعلہ بود
حدیث عشق کہ از حرف و صوت مستغنیست
بنالہ دف و نے در خروش و ولولہ بود
مباحثے کہ در آں حلقۂ جنوں می رفت
ورائے مدرسہ و قال و قیل مسئلہ بود

کانگریس پنڈال میں قدم رکھا حاضرین کے جوش و خروش کو دیکھا اور خون میرے بدن میں تین کروڑ میل فی لمحہ کی رفتار سے گردش کرنے لگا۔

اور تھوڑی دیر میں، ہندو مسلم فساد کے سرکاری ایجنٹ مدن موہن مالویہ جب تقریر کرنے کھڑے

ہوئے تو تمام پنڈال بپھر گیا اور ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں، نہیں سنیں گے، نہیں سنیں گے، بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ۔

آل انڈیا خلافت کمیٹی کا اجلاس:

رات کے وقت جب خلافت کمیٹی کے اجلاس میں شریک ہونیکے لئے روانہ ہو کر پنڈال کی پشت سے گزرنے لگا، (جہاں روشنی اور آمدورفت بہت کم تھی) تو میں نے ایک والینٹر لڑکی کا دیوانہ وار بوسہ لے لیا اور میرے بوسہ لیتے ہی پنڈال سے آواز بلند ہوئی" نصرمن اللہ و فتح قریب۔"

میں نے اس نعرے کو بہت اچھا شگون سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد خلافت کے پنڈال میں گیا، دیکھا کہ مولانا حسرت موہانی اور مہاتما گاندھی کے درمیان بڑی رسہ کشی ہو رہی ہے ایک طرف گاندھی جی اور ان کے دیگر رفقاء اس بات پر مصر ہیں کہ سردست برٹش تاج کے زیر سایہ آزادی طلب کی جائے اور دوسری طرف فقط حسرت موہانی ہیں۔ جو آزادی کامل کا ریزولیشن پاس کرانا چاہ رہے ہیں۔

حضرت حسرت موہانی کو سب نے لاکھ لاکھ سمجھایا لیکن وہ نہیں مانے اور سیدھے اسٹیج کی طرف روانہ ہو گئے اپنا آزادی کامل کا ریزولیشن لیکر۔ اسٹیج اونچا تھا اور حضرت پستہ قد آدمی تھے، میں نے سہارا دے کر ان کو اسٹیج پر چڑھا دیا اور جب انھوں نے آزادی کامل کا ریزولیشن پیش کیا تو پنڈال میں ہنگامہ بپا ہو گیا اور میں اس ہنگامے سے اکتا کر اس والینٹر لڑکی کے پاس پہنچ گیا جو پنڈال کی پشت پر کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔

جب میں احمد آباد سے روانہ ہونے لگا تو چھوٹے دادا نے (جن کا ذکر آگے آئے گا) کہا بھائی شبیر حسن خاں مجھ کو اجمیر شریف کی زیارت کرادو ایسے موقع روز روز نہیں آتے۔ میں نے انکی بات منظور کرلی۔ اجمیر سے دو چار اسٹیشن پہلے ہی، دسٹنٹ سگنل ڈاؤن نہ ہونے کی وجہ سے گاڑی ایک جگہ رک گئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک بلا کی حسین لڑکی سامنے کھڑی ہوئی ہے۔ اس کے حسن نے مجبور کر دیا کہ اسکو پاس سے جاکر دیکھو۔ میں گاڑی سے اتر کر اس کے نزدیک پہنچ گیا اور اس قدر بیہوش و مسحور ہو گیا کہ گاڑی رینگنے لگی، چھوٹے دادا نے گلا پھاڑ پھاڑ کر آواز دی۔

میں نے پکار کر: "آپ جائیں اجمیر کے ویٹنگ روم میں ٹھہر جائیں۔ میں دوسری[1] گاڑی سے جاؤں گا۔" دوسری گاڑی سے شام کے وقت اجمیر پہنچ گیا اور جب کھانا کھا کر لیٹنے لگا تو چھوٹے دادا نے کہا، بھائی شبیر حسن خاں آؤ زیارت کر آئیں۔ میں نے کہا، آپ جائیں، میں خواجہ صاحب کا مہمان ہو لے

---

[1] میری نظم جنگل کی شاہزادی اسی رومانی سفر کی یادگار ہے (وہ بھی اب بوڑھی ہو چکی ہے اُف رے تقاضائے وقت۔

اور جب تک خود میزبان بلانے نہیں آئیں گے میں نہیں جاؤں گا۔" چھوٹے دادا نے مجھ کو اسطرح گھور کر دیکھا جیسے میں کفر بک رہا ہوں اور منہ بنا کر درگاہ چلے گئے۔

حسب دستور کوئی چار بجے میری آنکھ کھلی۔ نہا دھو کر میں نے شیروانی پہنی اور چاہا کہ جگنو کو جگا کر ٹہلنے کے لئے نکل جاؤں۔۔۔ لیکن خلاف دستور نیند کا ایک ایسا گہرا جھونکا آیا کہ جوتہ اور شیروانی اتارے بغیر میں چارپائی پر دراز ہو کر سو گیا، اور اسی عالم میں یہ خواب دیکھا کہ ایک مرد بزرگ میرے سرہانے کھڑے بڑی دلداری کے ساتھ مسکرا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا "آپ کا اسم گرامی۔" انھوں نے عجیب مشفقانہ انداز سے کہا "میرا نام ہے معین الدین اور میزبان کی حیثیت سے آپ کو بلانے آیا ہوں۔ شرط آپ کی پوری ہوگئی۔ اب تو آئیے گا، نا؟"

میری آنکھ کھل گئی۔ چھوٹے دادا کو جگا کر خواب سنایا۔ ان کو حیرت ہو گئی۔ کہنے لگے بھائی شبیر حسن خاں آپ تو چھپے رستم نکلے۔۔۔ اس کے بعد ہم دونوں درگاہ چلے گئے۔

اجمیر سے پلٹ کر جب لکھنؤ پہنچا، معلوم ہوا کہ ٹیگور آئے ہوئے ہیں۔ ان سے ملنے گیا۔ انھوں نے مجھ کو سر سے پیر تک دیکھنے کے بعد انگریزی میں پوچھا "کیا یہ بات سچ ہے کہ میں ایک نوجوان شاعر کے چہرے کو دیکھ رہا ہوں؟" میں نے سر جھکا کر انگریزی میں جواب دیا "شاید۔" انھوں نے میرا نام پوچھا جب میں نے اپنا تخلص بتایا انھوں نے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا اور کہا یہ عجیب اتفاق ہے کہ کل ہی سروجنی نائیڈو نے آپ کی ایک نظم "طلوع سحر" کا ترجمہ سنایا تھا۔ اور آج آپ سے ملاقات ہو گئی۔ آپ کی نظم لاجواب ہے اور اسکے سننے کے بعد میں آپکو فرزند سحر گاہ کہہ سکتا ہوں۔"

اسکے بعد انھوں نے بتایا کہ میرے باپ فارسی کے بڑے اسکالر تھے اور دیوان حافظ ان کے سرہانے رکھا رہتا تھا۔

جب میں رخصت ہونے لگا تو انھوں نے کہا کیا یہ ممکن ہے کہ شانتی نکیتن اگر کچھ روز کیلئے میرے ساتھ رہیں اور حافظ کی اسپرٹ سے مجھ کو بخوبی آگاہ کر دیں؟ میں نے بڑی خوشی کے ساتھ ان کی دعوت قبول کر لی اور جگنو خدمت گار کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔ اور مطالعے کے لئے بہت کتابیں بھی ساتھ لے لیں۔

ٹیگور نے میری بڑی آؤ بھگت کی اور اپنے ایک طالب علم برنی صاحب کے کمرے میں مجھ کو ٹھہرا دیا۔

وہاں کی زندگی بے حد سادہ تھی لیکن گوشت وہاں نہیں کھایا جا سکتا تھا۔ اس کی تکلیف ضرور تھی پھر بھی جگنو چوری چھپے گوشت کا انتظام کر دیا کرتا تھا۔

صبح کی مستی، دونوں وقت کا غسل، صبح و شام کی موسیقی اور گھنے درختوں کے سائے میں تدریس

وہاں کی زندگی کے اجزائے لانیفک تھے۔

لڑکیوں اور لڑکوں کے میل جول کے معاملے میں ٹیگور کس قدر وسیع القلب تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک روز کسی بوڑھے پروفیسر نے آکر ایک لڑکی اور ایک لڑکے کے مابین حادود سے متجاوز تعلقات کی جب شکایت کی تو انھوں نے اس سے پوچھا "یہ صورت جبریا تراضیٔ طرفین سے پیدا ہوئی تھی؟" اور جب اس پروفیسر نے یہ بتایا کہ اس صورت حال میں جبر کا کوئی دخل نہیں تھا تو ٹیگور نے قہقہہ مار کر کہا "تو پھر اس میں اعتراض کی بات ہی کیا ہے۔ قدرتی تقاضوں کے دھاروں پر بند باندھنا فطرت انسانی کے خلاف ناانصافی ہی نہیں بغاوت بھی ہے۔ آپ شاید بھول گئے لیکن مجھ کو اب تک یاد ہے کہ میں بھی ایک زمانے میں نوجوان تھا" یہ بات سن کر میں بھی لڑکیوں سے کھل کر ملنے جلنے لگا۔

ہر چند میں تصوّف کے دائرے سے نکل کر فکر کی جانب آہستگی کے ساتھ مڑ رہا تھا مگر ٹیگور کی شاعری اس کے باوجود مجھ کو بیحد متاثر کیا کرتی تھی اور میں ان کے ترجمے پڑھ پڑھ کر سر دھنا کرتا تھا۔ اور اب بھی میرے دل میں یہ چور ہے کہ گاہ گاہ صوفیانہ شاعری میں وجد کرنے لگتا ہوں اور اس کی شاید یہ علّت ہو کہ شاعر کسی منزل میں بھی خشک اور کھرا فلسفی نہیں بن سکتا۔ اگر میں بنگالی زبان سے واقف ہوتا تو ٹیگور کی شاعری کو سمجھنے کی طرح سمجھ سکتا۔ لیکن مجھے اس کا بیحد افسوس ہے کہ میں نے ان کی شاعری کو انگریزی ترجموں وساطت سے پڑھا اور بنگالیوں کی طرح سمجھ نہیں سکا۔

میرا یہ دعویٰ ہے کہ شاعری ایک ایسا جادو ہے جس کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ شاعری آبگینہ ہے اور ترجمہ گھن۔ شاعری شیشہ ہے اور ترجمہ پتھر۔ شاعری حباب ہے اور ترجمہ ہوائے تند کا تھپیڑا۔

جب شاعری کا ترجمہ کیا جاتا ہے تو اس کا کندن مٹی کا ایک ڈھیر بن جاتا ہے۔ اس کے لالہ و گل پلاسٹک کے پھولوں کا لباس پہن لیتے ہیں اور اس کا شعلۂ جوالہ راکھ میں تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے میں بہت کچھ مان لینے پر تو اپنے کو آمادہ کر سکتا ہوں کہ فکری اور آفاقی مسائل کی شاعری کا تو کسی حد تک ترجمہ ہو سکتا ہے لیکن شاعری کے اس کھنکتے طلسمی دائرے میں ترجمہ باریاب نہیں ہو سکتا جہاں الفاظ کو ان کے لغوی معانی سے جدا کر کے استعمال کیا جاتا ہے اور ان کے سروں پر بالکل معنی کے تاج رکھے جاتے ہیں۔ جہاں لہجوں کی ایک ایک کروٹ اور الفاظ کی ایک ایک بہت کے نیچے سے نئے نئے مطالب کے صدہا چشمے پھوٹا کرتے ہیں، جہاں مختلف النسل لفظوں کے نقطہ ہائے انصال سے خیالات کی ایک نئی نسل پیدا کی جاتی ہے جہاں طواف حرم کو رقص

اور رقص کو طواف حرم کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے، جہاں اکائی کے میدان میں اعداد کے میلے ہوا کرتے ہیں جہاں دو دو مل کر چار نہیں ایک ہو جاتے ہیں۔ جہاں دوش نفی پر علمِ اثبات لہرایا جاتا ہے جہاں تلوار کی دھار سے مرہم ٹپکتا ہے۔ جہاں نشتروں کی نوک سے زخموں میں ٹانکے لگائے جاتے ہیں۔ جہاں سبُو کے دسنے سے کپے کا در کھٹکھٹایا جاتا ہے۔ جہاں کانٹے گنگناتے اور پھول کراہتے ہیں۔ جہاں موتیوں سے آنسو۔ اور آنسوؤں سے موتی برسائے جاتے ہیں جہاں نازک جالوں کے گھن سے چٹانیں توڑی جاتی ہیں۔ جہاں بولوں کے کٹاؤ میں کٹاریاں مچلتی ہیں۔ جہاں اولوں کے مسامات سے چنگاریاں برستی ہیں۔ جہاں ڈوب جانے کے بعد بیڑے ابھرتے ہیں۔ جہاں نالوں کے تیشوں سے مجسمے تراشے جاتے ہیں۔ جہاں نوحوں کی گود میں راگنیاں پروان چڑھتی ہیں جہاں پلکوں کی نوک پر آسمان تولے جاتے ہیں جہاں ٹھوکروں سے فولاد برمایا جاتا ہے۔ جہاں فن کے سوپ میں اجرام پھٹکے جاتے ہیں۔ جہاں شعور کی چھلنی میں کائنات چھانی جاتی ہے جہاں فکر کے پروں پر ذات و صفات کو اُسایا جاتا ہے۔ جہاں اوس کی بوندوں میں الاؤ روشن کیے جاتے ہیں۔ جہاں آنچ کی لہروں میں زُہرا کی کمر بچکتی ہے۔ جہاں بوئے گل گیت بن جاتی ہے اور گیت زُہرا جبینوں کے مکھڑے بن جاتے ہیں۔ جہاں ہواؤں کو دیکھا اور صداؤں کو چکھا جاتا ہے۔ جہاں تتلیوں کی دھاریوں پر کرۂ ارض کو نچایا جاتا ہے۔ جہاں ایک ایک آن کی ہتھیلی پر، کروڑوں صدیاں تھرکتی نظر آتی ہیں اور جہاں جزو بت اپنے ماتھے پر کلیت کا تاج سج کر کے آفاق کو اپنے جوڑے میں لپیٹ لیتی ہے۔

مترجم جب اس دائرہ رقصاں کی جانب نگاہ اُٹھاتا ہے تو اس کے الفاظ کی ہڈیاں بولنے لگتی ہیں۔ اس کی تخیل کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں اور اس کے وجود کا ڈورا جڑ سے ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔

کاش نوبل پرائز کے ارباب حل و عقد سے کوئی یہ جا کر کہہ دے کہ اے سخن ناشناسو اور قدر ناشناس پرست اندھو، اگر تم ادب کے قدرداں ہو تو شاعر کے کلام کو اسکی زبان میں پڑھو خود نہیں پڑھ سکتے تو تم اس کے ہم زبان اکابر کی ایک کمیٹی بنا کر اس کے سپرد کردو کہ وہ اپنی رائے سے تم کو مطلع کرے۔

تمھیں آخر یہ کون سا دماغی مرض لاحق ہو گیا ہے کہ تم شاعری کے جیتے جاگتے جسم کی جانب تو کوئی اعتنا نہیں کرتے اور جب ترجمہ اس گرم جسم کو ٹھنڈی لاش میں تبدیل کر دیتا ہے تو اس لاش کو تم کلیجے سے لگا لیتے ہو۔۔۔ اے جسم بیزار و لاش نواز لوگو، ادب کی دیوی تمھاری بے سوادی پر ماتم کر رہی ہے۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، خیالات کے دھارے کبھی یوں بھی بہنے لگتے ہیں۔ اب پھر آجائیے ٹیگور کی طرف اور چند کلمات ان کی شخصیت کے بارے میں سماعت فرمائیے۔

جسطرح بنگالی سے ناآشنا ہونے کی بنا پر میں ان کی شاعری کے باب میں ایک مستند نقاد کے مانند کوئی جامع تبصرہ نہیں کرسکتا اسی طرح میں ان کی شخصیت کے بارے میں بھی کوئی قطعی رائے قائم نہیں کرسکتا۔ شخصیت شناسی بڑی جان لیوا چیز ہوتی ہے اور سالہا سال کی بے تکلف ہم نشینی کے بعد بھی اس کا ستر میلا پن کم نہیں ہوتا۔ جناب والا، ٹیگور یا کسی اور کا تو ذکر ہی کیا مجھ سے اگر آپ یہ پوچھیں کہ تو اپنے کو بھی جاننے کی طرح جانتا ہے؟ تو میں یہ جواب دونگا کہ ہر چند بچپن سے لیکر اس پیرانہ سالی تک میں علی الاتصال و بہر دقیقہ اپنے ساتھ رہا ہوں، لیکن قطعیت کے ساتھ یہ کہہ نہیں سکتا کہ در حقیقت میں ہوں کیا۔ سہ

ہمارے حال کو دنیا بھلا کیا جان سکتی ہے

بسا اوقات جب ہم خود غلط اندازہ کرتے ہیں

اور پھر میں ٹیگور کے ساتھ رہا بھی کتنا۔ صرف چھ مہینے اس لئے عرض ہی کیا کرسکتا ہوں البتہ اس قدر ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ بڑے ہی وسیع المشرب، نہایت زندہ دل، بے حد شریف، حد سے زیادہ بے تکلف، حساس اور جمال پرست انسان تھے۔

لیکن ایک چیز ان میں ایسی تھی جو میرے دل میں کھٹکا کرتی تھی اور وہ تھی ان کی نمود و نمائش کی عادت۔ میں نے ہمیشہ اس بات کو بُری نظر سے دیکھا کہ جب کوئی غیر ملکی انٹرویو کے واسطے ان سے ملنے آتا تھا تو اس کے آنے سے پیشتر وہ بن سنور کر ایک نمایاں مقام پر بیٹھ جاتے تھے۔ عود اُن کی پشت پر سلگا دیا جاتا تھا۔ اور وہ حسین لڑکیوں کو اپنے گرد و پیش کھڑا کر کے یوں انٹرویو دیا کرتے تھے کہ آنے والے کو یہ گمان ہونے لگے کہ میں کسی پُر اسرار دیوتا کو دیکھ رہا ہوں۔

بیوی میری مفارقت برداشت نہیں کرسکیں۔ شانتی نکیتن ایک تار بھیجا کہ میں ایک ہفتے کے واسطے بلیح آباد چلا آؤں اس لئے میں وہاں اپنا سارا سامان اور ساری کتابیں چھوڑ کر بلیح آباد آگیا۔ اور بیوی نے پھر ایسی بُری طرح گھیرا کہ میں دوبارہ شانتی نکیتن جا ہی نہ سکا۔ اور میرا وہ تمام سامان پھر مجھے کبھی نہیں ملا۔

ایک خواب!

یہ ۱۹۲۲ء کا ذکر ہے کہ ایک روز شام کے وقت، جب میں "قصرِ سحر" میں بیٹھا ہوا سامنے کی پھولی ہوئی شفق کی رنگینی کی طرف اشارہ کر رہا تھا تو میری بیوی نے مجھ سے کہا: "دن رات تمھیں انھیں باتوں کی دھن لگی رہتی ہے۔ بھولے سے بھی اپنے گاؤں گراؤں کی خبر نہیں لیتے۔ خواجہ حسن کو تم نے ضلع دار بنا دیا ہے وہ البادند مچائے ہوئے ہیں کہ اللہ دے اور بندہ لے، دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں، تمہاری رعایا کو ہر طرف بادھو لوٹ مچی ہوئی ہے، گاؤں گراؤں کا نہ حساب ہے نہ کتاب اور جب تم حساب مانگتے ہو وہ باتوں کے طوطے اڑانے لگتے ہیں، اور زبانی حساب بنا کر الٹے کچھ روپے تمہارے ہی ذمے نکال دیتے ہیں۔ تم کو دس ہزار دے کر بیس ہزار اپنے ڈب میں رکھ لیتے ہیں۔ یہ کاغذ کی ناؤ آخر چلے گی کب تک؟" میں نے کہا: "اچھا اشرف جہاں، اب میں خود ہی کام کروں گا۔" انھوں نے تنک کر کہا: "ارے تم اس قابل ہوتے تو پھر یہ رونا کیوں ہوتا، تم تو اپنی جائداد کا ایک بڑا حصہ اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ نقد آنکھیں بند کر کے اپنے بڑے بھیا کی نذر کر چکے ہو اور جو کچھ بچا کھچا رہ گیا ہے اس کو بھی کسی کی بھینٹ چڑھا دو گے۔ ڈھاک کے تین پات رہ جائیں گے۔ نہ لڑکی کا بیاہ ہو سکے گا نہ لڑکے کی پڑھائی۔

میں نے کہا: "اشرف جہاں اتنا دل چھوٹا نہ کرو میرے پاس جو کچھ بچ رہا ہے وہ بھی خدا کے فضل سے اس قدر ہے کہ ہم تم بڑے آرام کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے ہیں۔" انھوں نے بگڑ کر کہا: "سدا اپنے ہی بارے میں سوچتے ہو، ارے یہ بھی تو سوچو کہ ہمارے بچوں کا کیا حشر ہو گا؟ میں پوچھتی ہوں کیا ہمارے بچے اپنے باپ دادا کا بھرم قائم رکھ سکیں گے؟" بیوی کی یہ باتیں سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔ دل نے کہا کہتی تو ٹھیک ہیں اور وہ پہلا دن تھا کہ عقلِ معاش میرے سینے میں کنمنائی اور سوچنے لگا، اپنی آمدنی اور اپنی جائداد، کیوں کر بڑھاؤں اور جب خاک کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو دل اداس ہو گیا اور چہرے پر بڑی بیکسی برسنے لگی۔ بیوی نے مجھے اداس دیکھا ان کے دل پر چھری چل گئی۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگیں، "تم گھبراؤ نہیں۔ تم جانتے ہو کہ بادا کو اپنے ہاتھ سے کھانا پکانے کا کس قدر شوق ہے اللہ کا دیا سب کچھ ہے، مامائیں ہیں، اصیلیں ہیں، باورچنیں ہیں مگر جب تک وہ اپنے ہاتھ سے کوئی نہ کوئی چیز خود نہیں پکا لیتے انھیں چین نہیں پڑتا۔ انھیں دیکھ دیکھ کر مجھے اس قدر اچھا پکانا

آگیا ہے کہ میں لکھنؤ میں کھانے کا ایک ہوٹل کھول دونگی اور اس سے اتنا پیدا کر کے دکھادوں گی کہ پشتوں تک کاٹے نہیں کٹے گا۔ ہمارے تمہارے بزرگ خالی ایک تلوار لے کر یہاں آئے تھے اور اس تلوار کے زور سے اتنے بڑے بڑے محل کھڑے کر کے اپنی بہادری کا لوہا منوادیا اور میں۔ اللہ نے چاہا تو کفگیر سے سونا اگلوا دوں گی۔

بیوی نے ڈھارس بندھائی۔ میرا دل اور بھی مغموم ہو گیا اور دوسرے کمرے میں آ کر اپنے بچوں کے مستقبل پر غور کرنے لگا۔ اتنے میں خدا جانے یکایک کیسے لہر آئی کہ میں نعت کہنے لگا۔

اے کہ ترے جلال سے ہل گئی بزم کافری
رعشۂ خوف بن گیا، رقص بتان آذری

نعت کہہ کر کھانا کھایا اور بستر پر دراز ہو کر لحاف اوڑھ لیا۔ نعت سر میں گونجنے لگی بیوی کے خراٹوں نے میرے بیوٹے بوجھل کر دیئے فاران کی ہواؤں نے لوری دی اور دو چار کروٹیں بدل کر سو گیا۔

سو گیا، تو پچھلے پہر ایک انوکھا خواب دیکھا۔ سچا خواب یا میرے تصورات کا گرداب؛ میں کیا فیصلہ کروں۔ یہ دنیا بڑی حیرت ناک و پراسرار ہے۔

ہاں تو، یہ خواب دیکھا کہ ایک تابناک چہرے کے مرد بزرگ میرے سامنے کھڑے ہوئے ہیں، اور چاند ان کا طواف کر رہا ہے۔ میں نے ان کی طرف نگاہ اٹھائی آنکھوں میں خیرگی آ گئی بار بار میں نے آنکھیں ملیں غور سے ان کو دیکھا پل بھر میں حافظہ جگمگا اٹھا، میں پہچان کر ان کے قدموں پر گر گیا اور منھ ملنے لگا ان کے نعلین پر۔ انھوں نے ہاتوں کا سہارا دے کر مجھے اٹھا لیا میں نے روتے ہوئے پوچھا کیا آپ وہی میرے رسول ہیں جنھوں نے اپنا دیدار لڑکپن[1] میں مجھے دکھایا تھا" یہ سنکر وہ مسکرائے اور ارشاد فرمایا، ہاں میں وہی تمہارے پہلے خواب کا محمدؐ ہوں۔ یہ سنتے ہی میں ان کے قدموں پر گر کر اور ان کے نعلین سے منھ رگڑ رگڑ کر رونے لگا۔

پھر محمدؐ نے فرمایا "اٹھ کھڑے ہو"۔ میں ہات باندھ کر انکے روبرو کھڑا ہو گیا۔ انھوں نے کہا، "تم ہنسنے کیلئے بنے ہو روتے کیوں ہو؟" اور یہ کہتے ہی میری بائیں جانب اشارہ کر کے حکم دیا کہ تم اس شخص کے پاس چلے جاؤ" میں نے ادھر نگاہ اٹھائی تو یہ دیکھا کہ ایک بادشاہ سر جھکائے اور ہاتھ باندھے کھڑا ہوا ہے۔ میں نے کہا "اے میرے رسول! یہ کون ہے" انھوں نے ارشاد فرمایا "یہ نظام دکن ہے، تم کو دس برس تک اس کے زیر سایہ رہنا ہے۔

---

[1] ایک اسی قبیلے کا خواب پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔

یہ سُن کر میرا دل یکایک اس طرح دھڑکنے لگا کہ اس کے ضربات پیہم سے میری آنکھ کھل گئی اور روتے روتے میری ہچکیاں بندھ گئیں۔

جی بھر کے رو چکا تو بستر سے اٹھا۔ منھ ہاتھ دھونے لگا منھ پر دو چار چھینٹے زور زور سے مارے تو حواس بجا ہوگئے اور حواس بجا ہوتے ہی ایک بے پایاں حیرت نے میرے تمام وجود کا احاطہ کر لیا۔ اور سر پکڑ کر میں یہ سوچنے لگا کہ میں نے ایسی اوسر زمین پر مکان بنایا ہے جہاں دور تک کوئی باغ نہیں ہے اور ابھی تک میں نے اپنے مکان کے گرد چمن بندی بھی نہیں کی ہے نہ گھاس ہی لگائی ہے نہ خوشبودار پودے ہی نصب کئے ہیں ۔۔۔ اور تو اور ابھی تک اس مکان کو پھولوں کے گملوں سے بھی نہیں سجایا ہے اور اس کے باوجود ایک نرالی خوشبو میرا احاطہ کئے ہوئے ہے اور خوشبو ایسی کہ عطر اور پھول بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے آخر یہ طلسم ہے کیا؟ کیا یہ خواب کے اثر کا جادو ہے یا سچ مچ کی خوشبو ہے یہ خیال کر کے میں نے بیوی کو جگایا کہ دیکھوں وہ بھی خوشبو محسوس کرتی ہیں کہ نہیں۔

بیوی آنکھیں ملتی اٹھیں۔ پوچھا "ٹہلنے جا رہے ہو؟" میں نے کہا "اور کیا، نوکر ہی اس بات کے ہیں۔ جلدی سے گلوریاں بنا دو۔" بیوی نے اٹھ کر کلیاں کیں، پاندان کھولا اور جیسے ہی انہوں نے چونے کی چمچی اٹھائی بگڑ کر مجھے دیکھا اور پوچھا "سچ سچ بتاؤ یہ رات کو مجھے سوتا چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے کہ ایسے مہکے مہکائے اور پھولوں میں بسے چلے آ رہے ہو۔" میں نے کہا "اللہ اللہ کرو اشرف جہاں! اس چٹیل میدان میں کہاں جاؤں گا، لکھنؤ ہوتا تو بات بھی تھی اور میں لکھنؤ میں بھی کبھی ایسا نہیں کرتا۔" کہنے لگیں "اللہ ری ڈھٹائی، جوتیوں سمیت آنکھوں میں گھسے جا رہے ہو تمہارے پاس سے خوشبو کی لپٹیں چلی آ رہی ہیں۔ میں نے تو تمہارے کپڑوں میں عطر نہیں لگایا تھا پھر یہ نگوڑی خوشبو کیوں آ رہی ہے؟ یہ کس غیبانی کی خاک میں ملی سیج کی خوشبو ہے؟"

میں نے کہا "تمہیں جگا کر تو میں گناہ گار بن گیا۔ اور اور سونگھ کر دیکھو میرے کپڑوں کو اگر میرے کپڑوں میں خوشبو ہو تو میں گناہ گار ٹھہر جاؤں گا۔"

وہ میرے کپڑے سونگھنے کو اٹھیں اور سونگھ کر کہا "تمہارے کپڑوں سے برابر خوشبو آ رہی ہے اب بھی انکار کرو گے؟" میں نے کہا "دوسرے کمرے میں چل کر میرے کپڑے سونگھو تب ٹھیک ٹھیک پتہ چل جائے گا تم کو۔" انہوں نے کہا "یہ کیا کہہ رہے ہو!" میں نے کہا "چلی تو چلو دوسرے کمرے میں۔ پھر سارا ماجرا بیان کر دوں گا۔" دوسرے کمرے میں جا کر انہوں نے خوب زور زور میرے کپڑے سونگھے، بار بار سونگھے اور کہنے لگیں "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا طلسم ہے وہاں تمہارے کپڑوں میں خوشبو تھی یہاں بالکل نہیں ہے کیا تم نے کوئی جنتر منتر سیکھ لیا ہے؟" اس کے بعد میں نے

۱؎ ظہور علی خاں کی کہانی کا ایک بار بار دہرایا ہوا فقرہ، جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

ان سے اپنا سارا خواب بیان کر کے کہا کہ یہ اس خواب کا کرشمہ ہے۔ انہوں نے پہلے تو اپنے منہ پر تھپڑ مار مار کر اور کان پکڑ پکڑ کر توبہ کی۔ اللہ مجھے معاف کرے کہ میں نے اس خوشبو کو نگوڑی کہا تھا اور پھر مجھ سے کہا تم کو بڑی بشارت ہوئی ہے تم کو مبارک باد دیتی ہوں۔ میں نے ان سے کہا۔ تم کچھ نہ بولنا میں گلابو کو اوپر بلاتا ہوں دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا محسوس کرتی ہے۔ میں نے گلابو کو آواز دی وہ اوپر آئی، میں نے کہا حقہ بھر لاؤ۔ وہ تمبا کو نکالنے کے لئے الماری کی طرف بڑھی اور دو قدم چل کر اس نے ایک لانبی سانس لے کر پوچھا، بی بی یہ "کیسی بو" خوش بو کیسی آرہی ہے؟ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اس کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا وہ بھونچکا ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ اتنے میں نیچے سے چھوٹے دادا کی آواز آئی: "بھائی بشیر حسن خاں آج ٹہلنے کے لئے نہیں چلئے گا۔ میں نے کہا اوپر آجائیے حقے کے دو ایک کش لے کر چلیں گے۔ چھوٹے دادا حسب عادت قہقہے مارتے اوپر آئے اپنی ٹوپی تڑ سے تخت پر پھینک دی اور کان کھڑے کر کے گہری گہری سانسیں لینے لگے۔ اور پوچھا۔ بھائی بشیر حسن خاں کی بیوی آج تم نے یہ کیسا عطر لگایا ہے کہ سارا کمرہ مہک رہا ہے ایک پھریری ہمیں بھی دے دو، الغرض، کوئی آدھ گھنٹے تک وہ خوشبو میرے کمرے کے اندر مچلتی رہی۔

وہ خواب و خوشبو کا امتزاج آج تک ایسا معمہ بنا ہوا ہے جس کو میں قطعیت کیساتھ نہیں سمجھ سکا ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ خواب اور اس کے بعد کی وہ خوشبو میرے آبائی عقائد کی ایک محسوس کیفیت یا میرے شاعرانہ تصورات کی ایک حیرت ناک خلاقی ہو ایسی خلاقی جو حواس کو فریب دے سکتی ہے یا جناب والا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ انسان کے اس ابتدائی دور کے تمام قیاسات اور اب تک کے تمام سائنسی انکشافات سے قطعاً مختلف کوئی اور ہی چیز ہو۔ بابا اس عالم "امکان" میں وہ کیا ہے جو ہو نہیں سکتا۔ ہماری اس دنیا کا یہ ہو سکتا پن اور اس کی یہ امکانیت ایک ایسا بے کراں میدان ہے جس کی حد بندی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے

ہر کس نہ شناسندۂ راز است دگرنہ
ایں ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

سریرِ امارت سے حصیرِ ملازمت کی جانب

اس خواب کے بعد میری ضعیف الاعتقاد بیوی میرے پیچھے پڑ گئیں کہ تم کو رسول اللہؐ نے حکم دیا ہے دکھن جانے کا جاؤ اور جلدی جاؤ۔

بیوی بے چاری کو تو میں نے کھٹ سے "ضعیف الاعتقاد" کر کہہ دیا۔ لیکن اپنے گریبان میں منھ ڈال کر یہ بات نہیں سوچی کہ اس وقت میں بھی کون سا بقراطِ اعظم تھا۔ یہ سچ ہے کہ میں تقشف کو ترک کر چکا اور انسان کی دردمندی کو دیکھ کر خدا کی شفقت درافت سے بھی بدگمان ہو چکا تھا لیکن ان دو برجوں کے گر جانے سے ہوتا کیا ہے، دین کی پوری عمارت تو مسمار ہو کر نہیں رہ گئی تھی۔ اس لئے میں بھی اس بشارت کے امتحان کی خاطر حیدرآباد جانا چاہتا تھا، یعنی بیوی ہی کے دل میں نہیں میرے دل میں بھی چور تھا۔ جو رنگ لائے بغیر نہیں رہا۔

یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ سفرِ دکن خالی ایک معاشی مسئلہ ہی نہیں تھا بلکہ میری ایک رومانی[1] گھتی بھی ایسی تھی جو حیدرآباد جائے بغیر کھل ہی نہیں سکتی تھی۔

ہر چند حیدرآباد جانے کی بات میرے دل میں ٹھن چکی تھی مگر سوچتا تھا کہ وہاں مجھے پوچھے گا کون۔ نہ ایم۔ اے ہوں نہ صدرالافاضل۔ لے دے کر میری صرف ایک کتاب "روحِ ادب" چھپ کر مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ مگر ایک ٹٹروں لٹوں سے کتاب سے ہوتا ہی کیا ہے ــــ ایک کتاب۔ ایک کتاب کی اشاعت و مقبولیت سے کہیں شخصیت بنا کرتی ہے۔ شخصیت تو بنتی ہے ایک جگ بیت جانے سے اور سالہا سال خونِ جگر کھو کنے کے بعد اور پھر یہ خیال بھی آتا تھا کہ میرا مزاج بہت ہی نازک۔ نوکری کا ننگ برداشت ہوگا کیونکر۔ اور اقربا، احباب بھی یہی مشورہ دیتے تھے کہ اس خبط سے دست بردار ہو جاؤ اور اگر ایک مہینے کے اندر اندر نظام دکن کو گالیاں دے کر واپس نہ آجاؤ تو جو چور کی سزا ہے وہ ہماری۔ یہ باتیں سچائی کے عنصر سے خالی نہیں تھیں ــــ لیکن میری بیوی اور خود میرا دل حکم دے رہا تھا کہ حیدرآباد جائے بغیر دم بہ نے

---

[1] حیدرآباد پہنچ کر میں نے "تیرے لئے" کی سرخی سے ایک نظم بھی کہی تھی جس کے یہ دو تین شعر پڑھ کر آپکو میرے اس رومان کا پتہ چل جائے گا۔

دیکھو کیونکر جی رہا ہوں دلربا تیرے لئے ‫ ہر نفس ہے اک حدیث کربلا تیرے لئے
پھیر لیں آنکھیں مناظر سے ملیح آباد کے ‫ لکھنؤ کی چھوڑ دی آب ہوا تیرے لئے
مانگتا ہوں بھیک درویشوں سے تیرے واسطے ‫ شام کے کوچے میں دیتا ہوں صدا تیرے لئے

(مطبوعہ "نقش و نگار" ۱۹۳۶ء)

الغرض، عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر وحید الدین صاحب سے خط و کتابت کر کے اور مہاراجہ کشن پرشاد کے نام، حضرت اقبال، مولانا عبدالماجد دریابادی، حضرت اکبر الہ آبادی، اور مولانا سلیمان ندوی سے سفارشی خط حاصل کر کے میں ۱۹۲۴ء کے اوائل میں حیدرآباد پہنچ گیا۔[سلہ]

حیدرآباد[سلہ] میں سب سے پہلے، مہاراجہ کشن پرشاد سے ملا۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے کہا "

جوش صاحب آپ کا مجموعہ کلام "روح ادب" دیکھ کر میں نے تمنا کی تھی کہ اللہ اس درویش صفت رئیس زادے سے ملا دے، سو میری وہ تمنا آج پوری ہو گئی — میں نے وہ سفارشی خط پیش کیے انھیں پڑھ کر وہ کچھ سوچنے لگے۔ اور تخلئے میں لے جا کر مجھ سے کہا: "جوش صاحب یہ بات اپنے تک رکھئے گا کہ میں آج کل سرکار کا 'معتوب' ہو چکا ہوں۔ اگر آپ میرے زمانے میں تشریف لاتے تو میں اسی دن اپکا انتظام کر دیتا

میرا رخت سفر جب گھر سے باہر جانے لگا۔۔۔۔ تو ایسا معلوم ہوا کہ عزت آباد کا جنازہ اٹھ رہا ہے اور میری ماں نے جب یہ بین کیا کہ اے میرے قبر میں سونے والے سرتاج آؤ اور دیکھو کہ تمھارا نازوں کا پلا بچہ نوکری کرنے باہر جا رہا ہے تو گھر میں چیخ پڑ گئی اور جب آہ و فغاں کے شور میں سب سے گلے مل مل کر میں رخصت ہونے لگا اور آداب خاندان کے جبر سے بیوی کو گلے نہ لگا سکا تو ماں کی ڈبڈبائی آنکھوں نے مجھ سے کہا، ہم سے گلے نہیں ملے۔ میں نے اداسی کے ساتھ آنکھیں جھکا لیں اور جب اپنے دھڑکتے دل پر قدم رکھتا باہر آیا تو تمام نوکر چاکر بھی رونے لگے اور جب ملیح آباد سے ریل چلی۔ باپ کی رندھی ہوئی آواز آئی۔ اے میرے لاڈلے بیٹے اللہ تیرا نگہبان۔ ہائے کیا کروں موت نے بیکس کر دیا ہے تجھکو روک نہیں سکتا اور اسی کے ساتھ ساتھ میرے دادا کے باغوں نے جھک جھک کر مجھے سلام کیا۔ اور سرزمین وطن نے گریبان پھاڑ کر خدا حافظ و ناصر کا نعرہ لگایا اور میں کلیجہ مسوس کر رہ گیا اور حزیں کا شعر زبان پر جاری ہو گیا۔

بہ نومیدی حزیں از کوئے او بار سفر بستم خدا، صبرے کند روزی دل امید دارم را

میں نے ایک نظم اسی زمانے میں "الوداع" کے نام سے کہی تھی جو "نقش و نگار" میں موجود ہے اسے پڑھ کر میری اس وقت کی حالت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سلہ حسن اتفاق سے اس وقت مہاراجہ کے دربار میں سید محمد حسین صاحب صدر المہام، نواب بہادر جنگ، نواب اکبر یار جنگ، نواب قادر نواز جنگ، نواب مہدی یار جنگ، اور سرامین جنگ موجود تھے جو آگے چل کر میرے بہت گہرے دوست بن گئے تھے، اور میرے بہت کام آئے۔

بہر حال میں فنانس منسٹر اکبر حیدری کے نام ابھی خط لکھے دیتا ہوں وہ مجھے بہت مانتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کی خدمت میں کوتاہی نہیں کریں گے۔ یہ کہتے ہی کوئی تین صفحوں کا لمبا چوڑا خط لکھ کر میرے حوالے کر دیا اور فون کر کے اسی وقت انہوں نے حیدری سے میری زبردست سفارش بھی کر دی اور اسی کے ساتھ ساتھ سر راس مسعود کو بھی فون پر ہدایت کر دی کہ وہ مجھ کو اپنے ساتھ لے جا کر حیدری سے ملا دیں۔ راس مسعود مجھے حیدری کے پاس لے گئے اور کہا یہ ہماری قوم کے ایک ابھرتے ہوئے شاعر ہیں ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی حوصلہ افزائی کریں۔ آپ کے دوست حضرت اقبال نے بھی ان کی بڑی زبردست سفارش کی ہے اور مہاراجہ نے بھی یہ خط آپ کو بھیجا ہے۔ حیدری صاحب نے خط پڑھ کر کہا ان کے متعلق مہاراجہ مجھ کو فون بھی کر چکے ہیں۔ اور پھر میری طرف منھ کر کے حیدری صاحب نے کہا۔ آپ آئندہ جمعرات کے دن صبح دس بجے میرے پاس آ جائیے گا میں آپ کو سرکار سے ملا دوں گا۔[له]

ابھی جمعرات میں دو دن باقی تھے کہ حیدری صاحب نے مجھے بلا بھیجا۔ راس مسعود بھی وہاں موجود تھے نہایت نفیس چائے پلائی اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے انہوں نے مجھ کو ان قطعات کا ایک بنڈل دیا۔ جو شاعروں نے ان کے خطاب "سر" کی مبارکباد کے طور پر کہہ کر ان کی خدمت میں پیش کئے تھے۔ میں۔ وہ قطعات پڑھ چکا تو حیدری نے کہا، جوش صاحب آپ بھی ایک "کوتا" (قطعہ) کہہ دیں۔

ایک طرف تو لفظ قطعہ "کو دو گنتا" سن کر میں بھنا گیا۔ اور دوسری طرف چونکہ میں فرنگی حکومت سے بیزار تھا، میرے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔

له ہر چند حیدری صاحب کے اس وعدہ سے مجھ کو بڑی خوشی ہوئی تھی مگر وہ جو کہاوت ہے کہ بکری نے دودھ دیا سو وہ بھی مینگنی بھرا، مجھے ان کے لہجے سے بڑی تکلیف ہوئی تھی کہ وہ "میں" کے لفظ کو بکسرہ میم "ادا کر کے بکریوں کی طرح "میں" "میں" کر رہے تھے اور میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ اللہ نے میری کشود کار کی صورت نکالی تو مگر ایک بکری کی معرفت خوب جانتا ہوں کہ درحقیقت لہجے اچھے ہوتے ہیں نہ بُرے اُن کا اچھا یا بُرا لگنا مبنی ہوتا ہے کانوں کی موروثی عادت پر، اور ہم جس لفظ کا تلفظ بچپن سے جس طور پر سنتے آتے ہیں جب وہی لفظ بدلے لہجے میں سنتے ہیں تو ہم کو تکلیف ہوتی ہے لیکن یہ سب کچھ سمجھنے کے باوجود آج بھی جب کوئی شخص لفظ "ادب" کی دال کو ساکن کر کے "آدب" یا گاڑی "کو" گڈی" کہتا ہے تو بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ اس کو اٹھا کر دے ماروں۔ یہ بات فقط لہجوں تک محدود نہیں، عقائد کے میدان میں بھی ہمارا یہی عالم ہے کہ جب ہم اپنے موروثی عقائد کے خلاف کوئی بات سنتے ہیں

حیدری صاحب نے مجھ سے پوچھا آپ یکایک اس قدر سیریس (SERIOUS) سنجیدہ کیوں ہو گئے میں نے کہا۔ آپ بُرا نہ مانیں تو کہوں کہ فرنگی جس شخص کو خطاب دیتا ہے اس پر ماں کی گالی پڑ جاتی ہے یہ سُن کر راس مسعود اور حیدری چراغ پا ہو کر کھڑے ہو گئے۔ مجھ کو تنہا چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے اور میں اپنی قیام گاہ کی جانب روانہ ہو گیا[1]۔

جب یہ بات سنی تو نواب مہدی یار جنگ میرے پاس آئے اور کہا کہ میں آپ کو اپنے والد نواب عماد الملک کے پاس لے جانا چاہتا ہوں۔ میرے والد سفارش کے معاملے میں اس قدر سخت ہیں کہ جب میں کیمبرج سے امتحان پاس کر کے آیا تھا تو انہوں نے میری سفارش تک سے انکار فرما دیا تھا۔ بہرحال میں آپ کو ان کے پاس لئے چلتا ہوں، ہر چند مشکل سے دو فی صد امید ہے لیکن اگر انہوں نے سفارش کر دی تو حیدری صاحب کی لاکھ سفارش پر بھاری ہو گی۔

اُن کے ساتھ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک اسّی، پچاسی برس کے مرد بزرگ برآمدے کی بڑی سی آرام کرسی پر دراز ہیں اور ان کے چہرے پر علم و فضل اور مضبوط کردار کا جلال برس رہا ہے۔ مہدی صاحب نے میرا تعارف کیا۔ اعتناء کی ایک دھاری بھی ان کے چہرے پر نہیں دوڑی میرے دل پر زبردست چوٹ لگی، لیکن پی گیا۔ میری اہمیت ظاہر کرنے کے لئے مہدی صاحب نے کہا، آپ یہ جوش صاحب حسام الدولہ تہور جنگ نواب فقیر محمد خاں، گویا کے پوتے ہیں یہ سن کر وہ چونک پڑے اور کہنے لگے شمالی ہندوستان کا وہ ایسا کون باشندہ ہے جو ان کے دادا کے نام سے واقف نہ ہو۔ لیکن ان کی ذات میں بھی کوئی جوہر ہے؟ مہدی صاحب نے کہا۔ یہ بہت اچھے شاعر ہیں۔ آپ اجازت دیں تو جوش صاحب کچھ سنائیں۔ انہوں نے کہا اچھا۔ مہدی صاحب نے مجھ سے کہا۔ جوش صاحب ارشاد۔ اور جب میں نے اپنے ایک مسدس کے تین چار بند سنائے۔ تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ اور کہنے لگے اس نوجوان میں تو انیس کی روح بول رہی ہے یہ عمر اور اس قدر پختگی۔ میں تو سمجھتا تھا کہ آج کل کے نوجوانوں کی طرح یہ بھی آئیں بائیں شائیں کہتے ہوں گے مگر ان کے کلام میں تو روانی بھی ہے اور معانی بھی۔ مہدی خط لکھنے کا کاغذ لاؤ، مہدی صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔ جلدی سے اندر جا کر کاغذ قلم لے آئے آرام کرسی کے دونوں ہتھوں پر ایک تختہ

تو بگڑ جاتے ہیں حالانکہ عقائد ذہن انسانی کے موروثی عادات کے سوا اور کچھ ہوتے ہی نہیں۔
یہ دنیا ذہن کی بازی گری معلوم ہو جاتی ہے۔ یہاں جس شے کو جو سمجھو وہی معلوم ہوتی ہے۔

[1] ذرا دیکھئے تو میری دانائی اور ملازمت کی خواستگاری اور اس پر برہنہ گفتاری۔ سچ کہا تھا۔ خدا بخشے، محمد غنی خاں نے کہ بھائی بشیر حسن خاں۔ شعر میں تو خیر باقی اور تمام باتوں میں تم نہایت قسم کے چوتیے ہو۔

رکھ دیا۔ نواب عماد الملک نے پورے ایک صفحے کا سفارشی خط لکھا اور کہا کہ فہدی تم یہ خط، سر
امین جنگ کے حوالے کر کے میری طرف سے کہہ دینا کہ سرکار کے روبرو پیش کر دیں۔

نواب عماد الملک کے مکان سے گیسٹ ہاؤس آیا "چھوٹے دادا" نے تار دیا تار کھول کر پڑھا۔
تو معلوم ہوا کہ میری بیوی پرسوں شام کی گاڑی سے حیدر آباد آرہی ہے، میں حیران ہو گیا کہ آخر یہ ماجرا
کیا ہے۔ ملازمت تو در کنار، میں نے ابھی تک تو نظام کو دیکھا بھی نہیں ہے اور بیوی ہیں کہ
چلی آرہی ہیں۔

لیکن میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ تیسرے دن میری بیوی دونوں بچوں اور اپنے ماموں کو
ساتھ لیے حیدر آباد آگئیں اور گیسٹ ہاؤس پہنچتے ہی آب دیدہ ہو کر کہنے لگیں کہ میں یہاں
اس لئے آئی ہوں کہ تمھارے دونوں بچے تمھارے حوالے کر دوں اور خود اپنے ہیرے کی انگوٹھی کچل
کر کھا لوں۔ اور اس دنیا سے سدھار جاؤں۔ یہ سنتے ہی میرے ہوش اڑ گئے اور گھبرا کر پوچھا، اشرف جہاں
خدا کے واسطے جلدی بتاؤ آخر بات کیا ہے۔ انھوں نے روتے ہوئے کہا، ماموں کو بلا کر پوچھ لو۔

ماموں نے آکر جیب سے ایک تار نکالا۔ میں نے تار پڑھا تو معلوم ہوا کہ کسی اللہ کے بندے
نے ان کے پاس یہ بھیجا تھا کہ آپ کے شوہر عقد ثانی کر رہے ہیں۔ فوراً حیدر آباد پہونچ جائیے میں نے
کہا اشرف جہاں یہ تار بالکل جھوٹا ہے۔ بیوی نے کہا اگر یہ تار جھوٹا ہے اور تم سچے ہو تو بچوں کی بازو
پکڑ کر قسم کھا لو کہ تم دوسرا نکاح نہیں کر رہے تھے۔ اور جب میں نے اپنے بچوں کے دونوں بازو
پکڑ کر بڑے ولولے کے ساتھ قسم کھائی تو ان کا چہرہ بحال ہو گیا۔

اتنے میں چھوٹے دادا ہنستے ہوئے آگئے اور میری بیوی کے دل پر اپنی خیر خواہی کا سکہ بٹھانے کی
خاطر انھوں نے کہا بھائی شبیر حسن خاں کی بیوی یہ تار میں نے دیا تھا۔ میں نے برا مان کر کہا "چھوٹے
دادا آپ کو ہرگز ایسا نہ کرنا چاہئے تھا۔ انھوں نے کہا۔ میرے بھائی برا نہ مانو، مجھ سے یہ
کب ہو سکتا تھا۔ کہ تمھارا گھر بگڑے اور میں بیٹھا تماشہ دیکھتا رہوں۔ میں نے کہا آپ کیسی
باتیں کر رہے ہیں۔ میرا گھر بگڑ کب رہا تھا۔ انھوں نے کہا۔ وہ شوق والی بات یاد کرو۔
جو ایک لڑکی کا پیام لے کر تمھارے پاس آئے تھے۔ بیوی نے بگڑ کر مجھے دیکھا اور کہا تو
اب تو بات کھل گئی، ہائے تم کیسے باپ ہو تم نے اپنے دونوں بچوں کی باہیں پکڑ کر جھوٹی قسم کھائی۔
میں نے جھلا کر کہا، اپنے بچوں کی جھوٹی قسم کھانے والے قصائی پر میں ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں۔
اب پوری بات مجھ سے سن لو۔ یہاں[1] ایک بہت بڑے جاگیردار ہیں انکی صاحبزادی نے خدا جانے مجھے کیوں

---

[1] میں انھیں اور رمضانی باورچی کو ملیح آباد سے اپنے ساتھ لایا تھا۔

گر دیکھ لیا کہ مجھ پر عاشق ہو گئیں۔ اپنی خادمہ کے ہاتھ ایک خط بھیجا اور لکھا کہ میری ماں نے میرے باپ کو اس
بات پر تیار کر لیا ہے کہ وہ آپ سے میری شادی کر دیں، کل آپ کے مصاحب شوق صاحب آئیں گے آپ کے
پاس۔ چنانچہ اسکے دوسرے روز ہی شوق صاحب نے ان جاگیردار صاحب کا نام لے کر مجھ سے
آکر یہ کہا کہ اگر آپ انکی صاحبزادی سے نکاح کرنے پر آمادہ ہوں تو میں ان کے والدین ماجد کو اس
بات پر راضی کر سکتا ہوں کہ وہ اپنی صاحبزادی کا آپ سے نکاح کر دیں، اور اسی کے ساتھ ساتھ انھوں
نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ آپکے رہنے کے لیے ایک کوٹھی اور ایک کار کا انتظام کر دیا جائے گا۔ آپ کے
تمام خانگی مصارف جاگیر سے ادا کیے جائیں گے اور پندرہ سو روپیہ ماہانہ جیب خرچ بھی آپکو دیا
جائے گا۔ بیوی نے بڑی گھبراہٹ کے ساتھ بات کاٹ کر پوچھا اور پھر تم نے کیا جواب دیا۔ میں نے
کہا کہ میں نے یہ جواب دیا کہ شوق صاحب میری شادی ہو چکی ہے، میں دو بچوں کا باپ ہوں۔ "ہم میاں
بیوی کو ایک دوسرے سے بیحد محبت ہے اور میں یہ گوارہ نہیں کر سکتا کہ ان پر سوت لاؤں یہ کہہ کر
میں نے چھوٹے دادا سے کہا۔ "کیوں صاحب میں نے آپ سے یہی بات کہی تھی نا یا کچھ اور چھوٹے دادا
نے کہا۔ نہیں یہی بات کہی تھی۔ میں نے کہا جب آپکو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ میں صاف صاف انکار کر
چکا ہوں تو پھر آپ نے میری بیوی کو تار کیوں دے دیا۔ چھوٹے دادا نے کہا۔ "میرے بھائی آدمی کو
بدلتے دیر نہیں لگتی میں نے سوچا کہ تمھاری بیوی کو بلا کر تم پر مسلط کر دوں۔

یہ بات سن کر میری بیوی کے دل کا کانٹا نکل گیا کہنے لگیں اس بھڑوے شوق کو اب کبھی اپنے
گھر نہ آنے دینا۔ علی کی تیغ ٹوٹے اس نگوڑے پر میرا لاکھ کا گھر خاک کرنے آیا تھا موا۔ دوسرے
ہی دن مٹھائی منگوا کر مولا مشکل کشا کی نیاز دلائی اور گھر کا مطلع صاف ہو گیا۔

ایک روز میں اس بات پر غور کر رہا تھا کہ نواب عماد الملک کے خط کو بھی تقریباً ایک
ماہ گزر چکا ہے۔ لیکن نظام نے اب تک مجھے طلب نہیں کیا ہے۔ شاید وہ تیر بھی خطا کر گیا
کہ پل بھر میں غمگین ہونے کے عوض میرے دماغ میں ایک مسخرگی کی لہر دوڑ گئی اور اس نے کھٹ سے
ایک بازاری سا مطلع کہہ کر پیش کر دیا اس مطلع پر مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی میں ہنستا ہوا بیوی
کے پاس آیا۔ لو اشرف جہاں لو ایک مطلع سنانے اور یہ بھی بتانے آیا ہوں کہ اس مطلع کے بعد میرے
دل سے برابر یہ آواز آرہی ہے کہ یا تو نظام آج ہی مجھ کو حیدرآباد سے نکال دیں گے یا آج
ہی اپنے پاس بلا لیں گے ان دو باتوں کے سوا کوئی تیسری بات ہو ہی نہیں سکتی بیوی نے مسکرا کر کہا پھر تمھاری زبان
کا سکہ نہیں بیٹھ سکتا۔ تم آئے دن تو "زلف پیچاں" اور "روئے خوباں" بکتے رہتے ہو۔ اور میرے سامنے
آئے ہو ولی اللہ بن کر۔ میں نے کہا۔ تم میرے مرتبے سے واقف نہیں۔ حشر کے میدان میں جب تم پوچھو

گی کہ ارے یہ کون ہے کہ اللہ میاں کے قدموں کے پاس بیٹھا ہوا گڑگڑا رہا ہے تو فرشتہ جواب دیں
گے کہ یہ اعلیٰ حضرت جوش صاحب قبلہ ہیں۔ اور تم بھڑ بھڑا کر میرے قدموں پر گر پڑو گی۔
وہ سنتے ہنستے لوٹ گئیں اور خوب ہنس چکیں تو کہا، اچھا وہ شعر تو سناؤ میں نے کہا مطلع کو شعر کہہ
رہی ہو، ماشاء اللہ، انھوں نے کہا۔ زیادہ لیاقت نہ بگھارو اور مطلع سناؤ میں نے کہا تو سنو"

دشمن ہوں اس زمین پہ شاہ و وزیر کا
لونڈا ہوں آسمان پہ جناب امیرؑ کا

مطلع سنتے ہی توبہ توبہ کر کے انھوں نے اپنا منھ پیٹ لیا کہنے لگیں تم کھڑے دوزخ میں جاؤ
گے۔ توبہ توبہ ارے کہاں جناب امیر اور کہاں یہ باتیں۔ اور پٹھان ہو کر اپنے کو لونڈا کہتے ہوئے
تمھیں شرم بھی نہ آئی۔ میں نے کہا ارے خاک سمجھتی ہو تم شاعروں کی زبان کو۔ اس شعر میں "لونڈے"
کے معنی ہیں روحانی چیلا" اور جھنڈیا" تمھیں کیا خبر کہ ہم شعرائے کرام الفاظ کے معنی یوں بدل دیتے
ہیں کہ لغات کا منھ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے۔

بیوی نے کہا بھاڑ میں جائے ایسا سخن پن، کہ اسی آن دروازے پر معاً اگئی زن زن ___
اور برآمدے میں تالی بجنے لگی، ٹھن ٹھن۔

باہر آیا تو دیکھا نواب قادر نواز جنگ کھڑے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے کہا مبارک
ہو جوش صاحب سرکار نے آپکو یاد فرمایا ہے ابھی تیار ہو جائیے۔

میں اندر گیا اور بیوی کے سامنے جھک کر کہا" آداب بجا لاتا ہوں بیگم صاحبہ کیا میں نے
ابھی یہ نہیں کہا تھا کہ دیا تو نظام مجھے آج ہی نکال دیں گے یا آج ہی بلائیں گے" دیکھا جو اس
درویش نے کہا تھا وہی ہوا نا" نظام نے مجھے بلا بھیجا ہے۔ بیوی نے چھپنی ہوئی مسکراہٹ
کے ساتھ کہا بہت شیخی نہ بگھارو، جلدی کپڑے پہنو اور جاؤ۔

کنگ[۲] کوٹھی کی کالی ننگی کالی کالی دیواروں اور اسکی شاہانہ بھاٹک کے بوسیدہ پردے

---

[۱] اے اہل حیدر آباد تالی بجا کر اپنے آنے کی اطلاع دیتے ہیں۔
[۲] نظام کے محل کا نام۔ اصل میں کوٹھی تھی کسی نواب کمال خاں کی جس نے چھورے پن سے کام لے
کر اس ___ کوٹھی کے تمام دروازوں وغیرہ پر "K.K" یعنی کمال خاں" کھدوا دیا تھا۔ جب نظام نے
قبضہ کر لیا تو اس نے کے" حروف کو کنگ کوٹھی میں تبدیل کر دیا کیا وہ کمال خاں دروازہ پر "ک خ"
نہیں کھدوا سکتا تھا۔؟ لیکن اس نے اپنے حروف بجا ___ سے گریز نہ کر کے انگریزی کے حروف کو
اس لئے اختیار کیا تھا کہ اس کو "صاحب بہادر سمجھا جائے۔ ڈوب مرا ہے چڑیا کے غلام۔

پر عبرت کے ساتھ نگاہ ڈالتا اور بے پایاں دولت کے پیدا کردہ، بے کراں افلاس پر غور کرتا جب محل سرا کے اندر پہنچا تو یہ حسرت ناک تماشا دیکھا کہ وہاں سبزے کا فرش ہے۔ نہ کیاریاں، پھولوں کے پودے ہیں نہ سرو و چنار۔ سوکھا۔ روڑھا صحن ہے۔ اور اس بجھے بجھے صحن میں ہزاروں چیزیں نہایت بے قاعدگی کے ساتھ ادھر ادھر بکھری پڑی ہیں۔ سامنے ایک نہایت چھوٹا سا تین سیڑھیوں کا برآمدہ ہے۔ برآمدے میں ایک بے پالش چھوٹی سی کرسی پر ایک ادھیڑ اور خشک چہرے کا دبلا پتلا آدمی، میلے اور پیوند لگے کپڑے پہنے اکڑا ہوا بیٹھا ہے اور اس کے بے پھندنے کی بوسیدہ ترکی ٹوپی کے کنارے پر میل کی ایک چوڑی سی تہ جمی ہوئی ہے۔ اور اس کے سامنے تیس چالیس عمائد شہر اور عیان ریاست، دستار و بکلوس لگائے اونگھی مرغابیاں کی مانند دست بستہ و سرنگوں کھڑے ہوئے ہیں اور انکے پیچھے بہت سے جیر کے ناکارہ بکس پڑے ہوئے ہیں۔

میری نذر قبول کر کے انہوں نے اپنے دست بستہ حاضرین سے کہا: "انھیں پہچانتے (پہچاتے) ہو؟ عماد الملک نے لکھا ہے کہ فقیر محمد خاں گویا کے پوتے ہیں۔ اگر اودھ کی سلطنت برباد نہ ہو جاتی تو یہ دکن کیوں آتے۔ آدھے مسلمانوں کو اودھ سنبھال لیتا آدھے مسلمانوں کو دکن۔

اسکے بعد نظام نے اپنے استاد حضرت جلیل مانک پوری کو مخاطب کر کے کہا۔ استاد ان کے خاندان سے تم تو خوب واقف ہو گے۔ استاد نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ خداوند ان کے والد نواب بشیر احمد خاں نے اس وقت میری امداد کی تھی۔ جب کہ میرے استاد حضرت امیر مینائی کے انتقال کے بعد کوئی میرا سرپرست نہیں باقی رہا تھا۔ جلیل صاحب کی اس شرافت پر میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ نظام نے حضرت جلیل کا یہ اعتراف احسان سن کر میری آنکھوں کی نم ناکی کو دیکھ کر کہا۔ استاد آپ اور جوش دونوں بڑے شریف آدمی ہیں آپنے سب کے سامنے یہ بات بے جھجک کہہ دی کہ ان کے والد نے تمہاری مدد کی تھی اور تمہارا یہ اعتراف سن کر جوش کی آنکھوں میں آنسو آگئے مجھ کو تم دونوں کی بات بہت پسند آئی۔ اور مجھ سے مخاطب ہو کر نظام نے کہا۔ عماد الملک نے یہ بھی لکھا ہے کہ نوجوان ہونے کے باوجود تمہاری شاعری میں اساتذہ کی سی پختگی پائی جاتی ہے۔

میں نے مطلع سنایا

تاجو رتیغ تو روک دوں گا جلال روز حساب تیرا   پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑیگا عتاب تیرا

۱؎ استاد تک کو "آپ" نہیں "تم" سے مخاطب کیا جاتا تھا، دولت جو چاہے کرے، کون بول سکتا ہے۔

۲؎ ہائے، استاد اور شاگرد سے ہاتھ جوڑ کر بات کرلے۔ اے حکومت کی ربیت کیا کہنا تیری شرافت کا۔

نظام کے چہرے پر پسندیدگی کا رنگ دوڑ گیا، زیرِ لب "واہ" کہا اور جب میں نے یہ شعر پڑھا

جڑیں پہاڑوں کی ٹوٹ جاتیں فلک تو کیا عرش کانپ اٹھتا

اگر میں دل پر نہ روک لیتا تمام زورِ شباب تیرا

تو نظام نے جھوم کر کہا "بہت اچھا بہت اچھا بہت اچھا" اور تمام حاضرین زور زور سے داد دینے لگے اور میری غزل کے اختتام پر نظام نے کہا "استاد جلیل ان کے یتو دبتادیے میں کہ بوڑھے ہو کر یہ تمہاری ہمسری کے ہو جائیں گے۔

اس کے بعد انہوں نے پوچھا۔ جوش تمہاری شادی ہو چکی ہے؟ میں نے کہا۔ میری شادی ہو چکی ہے اور میری بیوی یہاں آ بھی چکی ہیں۔ "یہاں آ چکی ہیں" انہوں نے حیرت سے کہا اور پھر فرمایا کہ ملازمت سے پیشتر وہ یہاں کیوں چلی آئیں انہوں نے یہ خیال کیوں نہ کیا کہ اگر یہاں تم کو ملازمت نہ مل سکی تو ان کا یہاں چلا آنا بیکار ہو جائے گا۔

میں نے کہا سرکار میری بیوی کو اس بات کا یقین ہے کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ مجھ کو یہاں ملازمت نہ ملے۔

نظام نے پوچھا۔ تمہاری بیوی کو اس بات کا یقین کیوں تھا کہ تم کو یہاں ملازمت ضرور ہی مل جائے گی۔ یہ سوال سن کر میں چپ ہو گیا سوچنے لگا کہ اس خواب کا ماجرا کہوں یا نہ کہوں۔

میری اس سُنش و پنج کو دیکھ کر نظام نے کہا بولو جی بولتے کیوں نہیں؟

اس موقع پر نواب مہدی یار جنگ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور چونکہ میں ان سے اپنا خواب بیان کر چکا تھا۔ انہوں نے کہا، خداوند کی اجازت ہو تو میں اس کی علت بیان کر دے۔ نظام نے کہا بولو، بولو اور جب مہدی صاحب نے میرا تمام خواب بیان کر دیا تو نظام کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور کہا تو یہ بولو کہ سرکار دو عالم نے جوش کو میرے سپرد فرمایا ہے، یہ کہا اور وہ اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر جھک گئے اور تمام دربار پر ایک گہرا سکوت چھا گیا۔

اس باریابی کے ایک ہفتے کے بعد، عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ دارالترجمہ کے ناظم عنایت اللہ صاحب نے، جو مولوی ذکاء اللہ صاحب دہلوی کے فرزند اور اکبر حیدری وزیر اس مسود کے برسالہ ہونے کی بنا پر میرے بدخواہ بن چکے تھے، مجھے بلا کر کہا جوش صاحب مبارک ہو یہ لیجئے شاہی فرمان سرکار نے پولیٹیکل اکاڈمی کے مترجم کی حیثیت سے آپ کا تقرر فرما

لہ دربجے کے ہم پایہ، ہم سر

دیا ہے۔

میں نے اُن سے کہا۔ پولیٹیکل اکانومی سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ انہوں نے خوش ہو کر کہا تو پھر آپ انکار لکھ دیں۔ میں نے فرمان کے حاشیے پر یہ لکھ دیا کہ سرکار والا تبار کا بے حد شکریہ لیکن چوں کہ پولیٹیکل اکانومی میرا سبجکٹ نہیں رہی ہے اس لیے مجھے افسوس ہے کہ میں اس کام کو باحسن الوجوہ نہیں کر سکوں گا۔ البتہ اگر انگریزی ادب کے ترجمے کا کام میرے سپرد کیا جائے گا تو اسے بڑی خوبی کے ساتھ انجام دے سکوں گا۔

عنایت اللہ نے کہا، انگریزی ادب تو انگریزی ہی میں پڑھایا جاتا ہے اس لئے اس کے ترجمے کا کوئی جواز ہی نہیں ہے آپ یہ عبارت قلم زد کر دیں میں نے کہا۔ کیا مضائقہ ہے رہنے دیجئے کالوں گا تو بدنمائی پیدا ہو جائے گی۔

عنایت اللہ نے کہا، ناظم شعبہ ہونے کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ میں آپ کی عبارت کے نیچے یہ نوٹ لکھ دوں کہ انگریزی ادب براہ راست پڑھایا جاتا ہے اس کا ترجمہ ایک فعل عبث ہو گا آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا۔ میں نے کہا بڑے شوق سے لکھ دیں آپ۔

اس کے جو تھے پانچویں دن، عنایت اللہ خود میرے پاس آئے اور کہنے لگے جوش صاحب مبارک ہو، سرکار نے انگریزی ادب کے مترجم کی حیثیت سے آپ کا تقرر فرما دیا ہے۔ یہ لیجئے فرمان اور لکھ دیجئے اس پر اپنی منظوری۔

میں نے دیکھا کہ فرمان میں یہ لکھا ہوا تھا کہ ہر چند اس ونیئے عہدے کے قیام کا کوئی جواز نہیں ہے لیکن سردست جوش ملیح آبادی کا مترجم انگریزی ادب کے عہدے پر فوراً تقرر کیا جائے اور جب ان کو ترقی مل جائے تو اس عہدے کو توڑ دیا جائے۔ میں نے شکریے کے ساتھ اس فرمان پر دستخط کر دیئے۔ اور عنایت اللہ صاحب کے چلے جانے کے بعد میں نے بیوی کو یہ خوش خبری سنائی، انہوں نے اپنے دونوں ہاتوں کی انگلیاں اپنے ملتھے پر چٹکا کے کہا، قربان جاؤں اپنے رسول اللہ کے دیکھی تم نے اس خواب کی تعبیر تم نے تو حیدری سے بگاڑ کر اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی، لیکن اللہ نے تمہاری مدد کی عماد الملک تمہاری پشت پناہی کو کھڑے ہو گئے۔ میں تو کہتی ہوں پتھر سے پانی نکل آیا۔ اور دوسرے ہی دن بیوی نے بڑی دھوم سے میلاد کیا اور محلے بھر میں مٹھائی بٹوائی۔

تقرر کے بعد شکریئے کی نذر لے کر پہونچا۔ ایک نذر اپنی طرف سے اور دو نذریں بیوی بچوں کی طرف سے پیش کیں۔ نظام نے کہا اچھی کیا ہے، میں تمہیں اس قدر دوں گا، کہ گھر میں رکھنے کی جگہ

باقی نہیں رہے گی۔ کئی بیویاں ہیں تمہاری؟ میں نے کہا، میری تو صرف ایک ہی بیوی ہے
انھوں نے کہا میں نے سنا ہے اودھ کے تعلقداران کے بہت سی بیویاں ہوتی ہیں۔ میں نے کہا
سرکار والا پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم میاں بیوی ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے ہیں۔
اور دوسری بات یہ ہے کہ میری بیوی بھی میری ہی طرح پٹھان نسل کی ہیں۔ اور اس پر طرّہ
کہ کئی برس سے وہ بے چاری شدید اختلاج میں مبتلا ہیں اگر میں دوسری شادی کرلوں گا تو ان
کی پٹھولی اور ان کا اختلاج یہ دونوں مل کر انھیں ہلاک کر ڈالیں گے۔

نظام نے اختلاج کا حال سنا تو پوچھا کب سے ہے۔ میں نے کہا چار پانچ برس سے ہے
پوچھا کس کس کا علاج کرا چکے ہو۔ میں نے ان کے معالجوں کے نام بتا دیئے۔ پھر سوال کیا اتنے
علاج پر کسقدر روپیہ برباد کر چکے ہو۔ میں نے کہا کم سے کم پندرہ بیس ہزار تک برباد کر چکا ہوں
لیکن مرض ہے کہ جانے کا نام نہیں لیتا۔ یہ سن کر نظام نے سیدھے ہو کر بڑے فخریہ انداز میں
کہا۔ میں ڈاکٹری اور طب میں اس قدر دستگاہ رکھتا ہوں کہ ہر چند میں باقاعدہ مطب نہیں
کرتا لیکن بڑے بڑے ڈاکٹروں اور طبیبان کے لبان نہیں کھلتے ہیں میرے سامنے یہ کہکر
اندر گئے۔ اور دو چار منٹ کے بعد آکر چوب دار کو آواز دی کہ یہ پانچ زبان، عیسیٰ میاں
کے بازار کسے دواخانے سے گاؤزباں اور خمیرہ مروارید لے آ۔ جب دونوں دوائیں آ
گئیں۔ تو ان کو میرے حوالے کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ یہ دوائیں صبح و شام اپنی بیوی
کو کھلاؤں۔ کسی دن ناغہ نہ ہونے دوں اور علین مرگ[۱] کے دن آکر بتاؤں کہ
اب میری بیوی کیسی ہیں۔

اس واقعہ کے پندرہ بیس دن کے بعد علین مرگ کے دن کنگ کوٹھی گیا۔ دو
نذریں پیش کیں اشرفیوں کو دیکھ کر ان کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ پوچھا یہ دوسری نذر
کس کی طرف سے ہے۔ میں نے کہا یہ میری بیوی کی طرف سے ہے۔ انھوں نے پوچھا بتاؤ میری
دواؤں کا اثر میں نے سفید جھوٹ سے کام لے کر کہا، سرکار کی دواؤں نے تو جادو کا اثر کیا
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کبھی اختلاج تھا ہی نہیں یہ سنتے ہی ان کے چہرے اور ان کے تمام
بدن میں خوشی اور مفاخرت کی ہر دوڑ گئی اور چوب دار کو حکم دیا کہ فلاں فلاں ''طبیباں اور
ڈاکٹران'' کو فوراً حاضر کر دے۔

جب تمام نامی ''طبیباں'' اور ڈاکٹران حاضر ہو کر نذریں پیش کر چکے تو انہوں نے حکم

---

[۱] دکن میں برشگالی کے یوم اولیں کو مرگ اور آغاز موسم باراں کو مرگ لگنا کہا جاتا ہے۔ اس واقعہ کا بقیہ صفحے پر

دیا کہ تمام "طبیباں" میرے داہنے طرف اور تمام ڈاکٹران میرے بائیں جانب صفیں باندھ کر کھڑے ہو جائیں اور جب حکم کی تعمیل ہو گئی تو کوتوال شہر دنکٹا مادا ریڈی کو ان صفوں کے درمیان "مرجع الجرین" کے طور پر کھڑا کر دیا۔

اور عین اس وقت جب کہ حکیم ڈاکٹران کی طرف اس امید کے ساتھ دیکھ رہے تھے کہ آج ہم سب پر کوئی نہ کوئی نوازش ضرور کی جائے گی۔ نظام نے کڑک کر ان سے کہا دیکھو یہ جوش ملیح آبادی تمہارے سامنے کھڑے ہوئے ہیں یہ بے چارے اپنی بیوی کے علاج میں پندرہ بیس ہزار روپیہ تم بے ایمان مسخراں کو چٹا چکے ہیں لیکن تم انھیں تن درست نہیں کر سکے میں نے دو دوائیں دیں اور بیس دن کے اندر ان کی بیوی کا مرض غائب ہو گیا۔ اب اے سالو اگر تم میرے سامنے حذاقت کا دعویٰ کروگے تو میں تمہاری . . . . . گا اور فقط یہی نہیں میں تم سب کی . . . میں ریل چلا دوں گا اور اس ریل میں بیٹھ کر دھکا دھک کرتا ممناڈ تک چلا جاؤں گا۔

اپنے آقا کی زبان سے یہ فحش الفاظ سن کر ان سب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ان کے گلا پھلے لانبی داڑھیاں ہوا میں پھڑپھڑانے لگیں۔ ڈاکٹروں کی مونچھوں کی کھڑی جو بچوں پر بھیر دں ناچنے لگا ذلت کے کوے ان کے سروں پر قاؤں قاؤں کرنے لگے اور ان کی جھکی پلکوں کے نیچے لال لال منھ کے بندر جست دخیز کرتے نظر آنے لگے۔

ان کی یہ حالت دیکھ کر ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی بہت بھاری پتھر، کسی پہاڑی سے ٹوٹ کر، دریا میں آگرا ہے اور ساکن موجوں میں یکایک بھونچال آ گیا ہے۔

میں نے بڑی عبرت کے ساتھ دیکھا کہ ان معززاہ باب فن کی پنڈلیاں کانپ رہی ہیں ان کی گردنیں پتلی پتلی ہو کر ہو کر ان کے سرونکا وزن اٹھانے سے انکار کر رہی ہیں۔ ان کی آنکھیں بجھ گئی ہیں انکا جذبۂ غیرت منھ پیٹ رہا ہے، ان کی ناکیں سرخ ہو ہو کر لانبی ہو چکی ہیں اور ان کی خود داری ان کے رخساروں کی دونوں ابھری ہوئی ہڈیوں پر اکڑوں بیٹھی ہوئی لید کر رہی ہیں، ہائے انسان تیری

بقیہ صدے۱۷۳ عجیب کی شہر بھر میں ڈگی پٹ گئی کہ جوش صاحب اس قدر بلند اقبال ہیں کہ سرکار نے انکی بیوی کے علاج کی خاطر اپنی جیب سے ایک نہیں پورے پانچ روپے صرف کر ڈالے اور مہاراج کشن پرشاد نے تو اس خوشی میں میری دعوت بھی کر ڈالی اور کہا، حالانکہ ہم روسٹر سرکار دعائیں میں آپ وہ پہلے آدمی ہیں جن پر نظام نے پانچ روپے اپنی جیب سے خرچ کر ڈالے ہیں۔

دارالترجمہ یہ مقام دفتر کم اور دار التفریح زیادہ تھا۔ ہم تمام لوگ[2] (سید ابوالخیر مودودی کے علاوہ) روز ہاشمی صاحب فریدآبادی کے کمرے میں جمع ہو کر گپیں اڑاتے اور شاعری کیا کرتے تھے میں نے وہاں مترجمِ ادبِ انگریزی[3] کی حیثیت سے تقریباً ڈیڑھ برس کام کیا اور جب علامہ علی حیدر صاحب طباطبائی کو پنشن مل گئی تو اکبر حیدری اور راس مسعود کے علی الرغم نواب اکبر یار جنگ کے مخلصانہ مساعی کی بنا پر مجھے ترقی مل گئی میرا عہدہ توڑ دیا گیا اور میں علامہ طباطبائی کی جگہ "مشیرِ ادب" کے عہدے پر کام کرنے لگا میری یہ بڑی نمک حرامی ہو گی۔ کہ اگر میں اس امر کا اعتراف نہ کروں کہ شعبۂ دار الترجمہ کی وابستگی نے مجھکو بے علمی فائدہ پہنچایا۔ اور خصوصیت کے ساتھ علامہ عمادی، علامہ طباطبائی اور میرزا محمد ہادی رسوا کے فیضانِ صحبت نے مجھ بے سواد آدمی کو میرے جہل پر مطلع کر کے مجھ کو ذوقِ مطالعہ پر مامور کر دیا۔ اور صحتِ الفاظ و نجابتِ لہجہ کا جو پودا میرے باپ اور میری دادی نے میرے وجود کی

۱؎ اس وقت تو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ جب ان میں سے کسی نے میری بیوی کا علاج نہیں کیا ہے تو پھر انھیں کیوں ذلیل کیا جا رہا ہے۔ لیکن اب اس کی علت سمجھ میں آ رہی ہے کہ چونکہ نظام اپنے کو تمام طبیبوں اور ڈاکٹروں سے بہتر سمجھتے تھے اور ان کا دل اس بات پر کڑھا کرتا تھا کہ اگر میں مطب کرتا تو جو دولت یہ لوگ کما رہے ہیں میری جیب میں آتی اور منصبِ شاہانہ کی مجبوری سے چونکہ میں ایسا نہیں کر سکتا تو میری مجبوری سے فائدہ اٹھا کر یہ نااہل مزے اڑا رہے ہیں کیا ہوا اگر ان میں کوئی جوش کی بیوی کا معالج نہیں رہا مگر انکی بیوی کے معالجوں کے یہ لوگ ہم پیشہ اور ایک تھیلی کے چٹے بٹے تو ہیں وہ معالج میرے ساتھ نہیں آ سکتے تو پھر انکو ذلیل کر کے اپنا جی کیوں نہ ٹھنڈا کر لوں؟ ممکن ہے میری یہ رائے غلط اور اس کی علت کچھ اور رہی ہو اس لئے کہ دولت کی ضروریات سے زیادہ فراوانی اور مسخرے مصاحبوں سے حد سے بڑھی قصیدہ خوانی کے بگاڑے ہوئے دماغوں کی اچھل کود اس نوعیت کی ہوتی ہے کہ، کوئی ذی عقل اسے گرفت میں نہیں لا سکتا، اے اللہ مجھکو دولت کی فراوانی اور افلاس کی طغیانی سے محفوظ رکھنا اس لئے کہ ان دونوں طاقتوں میں انسانیت کا دم نکل جایا کرتا ہے۔

۲؎ یعنی احسان احمد علامہ عمادی، مولوی فدا علی، محمد ابراہیم، رشید احمد، میرزا البیب، سخا جے پوری اور گاہ گاہ قاضی تلمذ حسین، محمد علی محوی، علامہ طباطبائی اور میرزا محمد ہادی رسوا صاحب امراؤ جان ادا) بھی شریکِ بزم ہو جاتے تھے

۳؎ میرے ذمے "حیاتِ بیکن" کا ترجمہ تھا۔

سرزمین پر لگایا تھا اگر طباطبائی میرزا محمد ہادی اور عمادی کی مسلسل دس برس کی ہم نشینی کا مجھ کو موقع نہ ملتا تو وہ پودا کبھی شاداب اور بار آور نہ ہوتا۔

میرزا محمد ہادی صاحب میرے پڑوسی تھے میں دکھن آ کر پھر ان سے پڑھنے لگا اور اس بار فارسی کے ساتھ ان سے انگریزی ادب اور فلسفہ کا بھی باقاعدہ درس لینا شروع کر دیا۔ ہر چند ۱۹۱۶ء میں شراب کے لطف سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اس لئے کبھی کبھی بار بار دعوت میں تو پی لیتا تھا۔ لیکن اپنی تنخواہ سے خرید کر کبھی نہیں پیتا تھا اور اسی وجہ سے مجھے یہ فرصت حاصل تھی کہ روز رات کے گیارہ بجے تک اردو فارسی ۔۔۔ انگریزی ادب اور فلسفے کا بلا ناغہ مطالعہ کیا کرتا۔

ہائے کیوں کر بیان کروں کہ اس وقت مجھے حیدر آباد کیا چیز تھا ارزانی اور اس پر دولت کی فراوانی ہر طرف ایک چہل پہل تھی۔ امراء کے دروازوں پر صبح و شام نوبت بجا کرتی تھی، آئے دن جلسے، مجرے، داوتیں اور مشاعرے ہوتے۔ سو متوسطین تک غرق نشاط رہا کرتے تھے۔ اور اسکاچ وسکی صرف آٹھ روپے میں ملتی، اور پانی کی طرح بہائی جاتی تھی۔

وہاں کا علمی و ادبی ماحول، موسمی اعتدال، مجلسی اُبھار اور تہذیبی نکھار۔ وہاں کی رامش و رنگ میں ڈوبی شامیں بہاڑوں پر تھرکتی صبحیں شبستانوں میں ناچتی گاتی راتیں، بانہوں اور بوسوں کی سوغاتیں، یارانِ دلنشیں کی ترنگیں، اٹھتی جوانیوں کی امنگیں، باغ عامہ کی لچکتی ڈالیاں، عثمان ساگر کی گنگناتی متوالیاں، اونچی اونچی گاتیاں، بہکی بہکی مدہ ماتیں وہاں کے میلے ٹھیلے، ابریوں کے ریلے، ہر حجرے پر رونق، سرگوشے ہو حق، بجتی گلیاں، تھرکتی رنگ رلیاں، ساحلوں پر سرائیں اور وہ خیمہ ہائے جشن کی سنہری قناتیں۔ وہ شاہزادۂ معظم جاہ کا دربار گویا مہر کا بازار وہ پریاں قطار اندر قطار وہ گردنوں کو پیچھے ریلتے ہوئے سینوں کے ابھار وہ جھمکے وہ چمپئی ہار وہ چٹانوں کے بیوپار وہ طوفانِ گیسو و رخسار، وہ پازیبوں کی جھنکار وہ تبلے وہ ستار وہ گیتوں کی ہلکی ہلکی پھوار وہ غزلوں کے گونجتے اشعار وہ ابلتے انوار وہ کھنکتے در و دیوار اور وہ چھلکتے ہوئے شیشہ ہائے سرشار۔! ہائے کن کن باتوں کا ذکر کروں حافظے کا سر سفید ہو چکا ہے اور پرانی صحبتیں گلا چکی ہیں۔ اب شام کے وقت کراچی میں جب اپنے مکان کے کھلے ہوئے مغربی چھجے میں شمالی ناظم آباد کی دور کی روشنیوں کے سامنے تنہا بیٹھتا ہوں تو ان کی رنگ رلیوں کو دیکھ کر انگاروں پر لوٹنے والی اشتیت میری زمانۂ ماضی کی سرخوشیوں کی سزا دینے پر کمر بستہ ہو کر میرے بیتے دنوں کو حکم دیتی ہے کہ وہ میرا تعاقب کرنے لگیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حیدر آباد کی راتوں کی براتوں کے جلوس۔ گم کردہ لمحوں اور گہنائے مکھڑوں کے درد انگیز جلوس۔ دامن شفق کو پھاڑ کر باہر نکل آتے ہیں اور غلغلے مچانے والے یاروں کے چہرے اور آغوش میں مچلنے والے دلداروں کے مکھڑے فضا پر

تیرتے نظر آنے لگتے ہیں اور میری پیاسی نظریں جب انھیں پکڑ لینے کے واسطے دوڑتی ہیں تو وہ دریائے شفق میں غوطہ لگا کر میری آنکھوں سے پل بھر میں اوجھل ہو جاتے ہیں اور ایک سوگوار دھواں میرے سر پر منڈلانے لگتا ہے۔

اگر میں کل جی بھر کے ہنسا نہ ہوتا تو آج دل تھام کر یوں نہ روتا۔ سچ کہا ہے انیس نے ؎

روئے خزاں میں وہ جو ہنسا ہو بہار میں

وہ جو کہتے ہیں کہ ہر شر میں خیر اور خیر میں شر کا ایک عنصر ہوتا ہے وہاں کا دوسرا بھیانک رُخ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

حیدر آباد سے اخراج

حیدر آباد کے سر پر جاگیرداری اور شہر یاری کا گرہ ٹھونگیں مار رہا تھا۔ ہر طرف درباری سازشوں کے جال بچھے ہوئے تھے۔ نظام کے مصاحب ہر چند لکھے پڑھے نہیں تھے لیکن اس قدر کڑھے ہوئے درباری مسخرے موروثی مراثی، خاندانی خوش آمدخورے، مشاق بھانجی مار، جھوٹے قصیدہ خواں، نکتہ دروغ اچھوتے تہمت کار، بولی ٹھولی میں اس قدر طاق و مشاق، اور نظام کے اس درجہ مزاج شناس تھے کہ ان کو انگلیوں پر نچاتے، چاپلوسی کے توؤں پر روٹیاں پکاتے اپنے کو اچھالتے حریفوں کو گراتے روز ماں بہن کی گالیاں کھاتے اور شربت کی طرح پی جاتے باتوں کے طوطے اڑاتے اور ان طوطوں کو اپنے آقا کی بھوؤں پر بٹھاتے اور ان سے "بنی جی بھیجو" کے نعرے لگواتے تھے۔

جس طرح سانپ والے بانسریوں پر ناگوں کو نچاتے ہیں اسطرح یہ مسخرے بھی اپنے ملائم لہجوں کی گاڑیوں میں اپنی آنکھوں کے گھومتے ہوئے عیار ڈھیلوں کے پہیے لگاتے اور اپنی غلط بات کو سچ ثابت کر دینے کی خاطر اپنے سدھے ہوئے جھروں کے منہ میں لگام لگا کر اپنی منزل مقصود کی جانب ہنکاتے اور نظام کو اپنے راستوں پر چلاتے تھے اور بڑے بڑے حاکموں اور جاگیرداروں سے بگڑ جاتے تو سر دربار ان کو پٹوا کر نکلوا دیتے اور ان کے گھروں میں جھاڑو پھروا دیا کرتے تھے۔ ان کی زبانیں ایسی رنگین ہوئی ناگنیں تھیں جن سے اور تو اور شاہزادے تک محفوظ نہیں تھے۔[1]

---

[1] یہ بات فقط حیدر آباد ہی سے مختص نہیں تمام دیسی ریاستوں کا یہی عالم تھا ہر جگہ مسخرے مصاحبوں کی ریشہ دوانی اور پاگل مہربانیوں کی حکم رانی تھی۔ مصاحبوں کی زبانیں ان کی کھیتیاں تھیں اور والیان ریاست کے کان ان کے کھیتوں پر برسنے والے ابر تھے اور چونکہ انھیں کبھی اُن کی غلطیوں پر مطلع نہیں کیا گیا تھا اس لئے وہ اپنے ہر برے سے برے فعل کو روا سمجھتے تھے اور چونکہ وہ مسلسل و مکمل فراغت کے آغوش میں رہتے تھے اس لئے ان کے قوائے فکر کو زنگ چاٹ چکا تھا اور ان کی عقلوں پر چربی چھا گئی تھی اس لئے وہ خطرناک قسم کے پاگل ہو چکے تھے اور اسی وجہ سے ذرا ذرا سی بات پر آبرو داروں کو ذلیل کر دینا، ارباب علم کے سروں پر ٹھوکریں مارنا، بھانڈوں بھگیتوں کو سر چڑھانا اور شریف خاندانوں کی بہو بیٹیوں پر سانڈوں کی طرح چڑھ جانا ان کا آئے دن کا مشغلہ اور آبائی کھیل تھا۔ اور ان سانڈوں، اُن دیوانوں اور ان کالے ناگوں کو فرنگی حکومت نے اس لئے قائم رکھا تھا کہ جب کبھی

(بقیہ اگلے صفحے پر)

بہر حال حیدر آباد میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے مجھ کو دس برس تک اپنے سائے میں پروان چڑھایا تو نے مجھ کو کبھی غیر ملکی نہیں سمجھا، تو نے مجھ کو کتب بینی کی دعوت دی، تو نے میری شاعری کو آب و رنگ بخشا، تو نے مجھے علم و فکر کا راستہ دکھایا تو نے مجھے کتاب کا کل اور کائنات کے مطالعے پر مامور فرمایا، کتاب نے میری آگاہی میں اضافہ کیا، کا کلِ زلفی چھاؤں نے مجھ کو جمالیاتی شاعری کا خزانہ بخشا کائنات کے مسائل نے مجھ میں تفکر کا مادہ پیدا کیا، تفکر نے میرے علم میں اضافہ کیا، علم کے اضافے نے مجھ پر یہ تلخ حقیقت عیاں کردی کہ میں سراسر جاہل ہوں اور اس عرفان جہل نے مجھ کو وادی حیرت کی جانب موڑ دیا۔

میں نے "غلط بخشی" کے نام سے نظام کے خلاف ایک نظم کہی تھی (جس کا ذکر آگے آئے گا) وہی نظم بظاہر میرے اخراج کا سبب بنگئی لیکن اس نظم کی پشت پر جو اور بھی اسباب کام کر رہے تھے اُن کا ابتک کسی کو علم نہیں ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان اسباب کو بھی بیان کر دوں۔

مجھ کم بخت "گھر پھونک، تماشہ دیکھنے والے" کی یہ اُفتادِ مزاج ہے خواہ اسے ہنر سمجھا جائے یا عیب۔ کہ میں عامۃ الناس کے قدموں پر سر جھکا دینے کو انتہائی شرافت۔ اور خداوندِ اقتدار کے روبرو، گردن میں خم پیدا کرنے کو انتہائی کمینگی سمجھتا ہوں۔ اور میر تقی میر کے مانند:—

سر کسو سے، فرد نہیں آتا
حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

کا نعرہ لگاتا رہتا ہوں۔

اور اس افتادِ مزاج کے ساتھ میں جس وقت نظام کے روبرو سراپا انکسار بن کر جاتا۔ ان کو "سرکار" کہتا اور ان کی زبان سے اپنے متعلق "تم" سنتا تھا تو میرے دل پر ایسی کاری ضرب لگتی تھی کہ بلبلا اٹھتا تھا۔ زبان سے تو کچھ نہیں کہتا تھا لیکن میرے چہرے کا تغیر اور میرے چوٹ کھائے دماغ کی برقی لہریں نظام کے دل پر اسطرح اثر کیا کرتی ہیں۔ جیسے میدان میں سونے والے پر شبنم گرتی ہے اور اسے کچھ بھی خبر نہیں ہوتی کہ میرے سر میں یہ دھمک کیوں ہو رہی ہے۔

اپنے پاش پاش غرور کے ساتھ دربار سے جب گھر آتا تھا تو بیوی کے سامنے اپنی اس بے عزتی کا رونا رویا کرتا تھا۔ اور وہ بھی اس بے احتیاطی کے ساتھ کہ نوکر چاکر سب سن لیا کرتے تھے۔

ہندوستان میں آزادی کا طوفان آئے گا یہ لوگ اسے رد کرنے کے واسطے، فلک پیما بند تعمیر کریں گے اور راجہ پورس کے ہاتھیوں کے مانند خود اپنی ہی قوم کو روند کر مار ڈالیں گے،

مجھ کو مطلق یہ معلوم نہیں تھا کہ نظام کی خفیہ پولیس کا گھر گھر میں اس طرح جال پھیلا ہوا ہے کہ کوئی اس کی زد سے بچ کر نکل ہی نہیں سکتا۔ صرف گھر کے نوکر چاکر یا مامائیں ہی نہیں سودا بیچنے والیاں تک خفیہ پولیس میں بھرتی ہیں۔

مجھ کو اس بات کا پتہ کیوں کر چلا وہ بھی سن لیجئے۔ ایک روز نواب قادر نواز جنگ بڑا خوفناک چہرہ بنائے، میرے پاس آئے اور کہا جوش صاحب آپ اپنے محل میں جن بات کا رونا رویا کرتے ہیں، سرکار والا تک وہ بات پہنچ گئی ہے۔ اور مجھ کو اس بات کی بڑی خوشی اور انتہائی حیرت ہے کہ یہ بات سن کر سرکار نے مسکرا کر ارشاد فرمایا کہ جوش بڑا مغرور آدمی ہے۔ ملازمت کر رہا ہے مگر اس کے سر سے بوئے امارت ابھی تک نہیں نکلی، سنتا ہوں وہ خدا سے بھی گستاخیاں کیا کرتا ہے لیکن کیا کروں، سرورِ کائنات نے اس شخص کو میرے سپرد فرمایا ہے۔

نظام کی سالگرہ وغیرہ پر تمام شعراء قصائد پیش کیا کرتے تھے لیکن میں نے کبھی قصیدہ نہیں کہا۔ ایک سالگرہ کے موقع پر ایک رسالے کے مدیر نے میری ایک بہاریہ نظم "قصیدہ" بنا کر شائع کر دی، جس کا یہ مطلع تھا ؎

اٹھی وہ گھٹا رنگ سامانیاں کر

گہر باریاں کر، گل افشانیاں کر

اس نظم میں سالگرہ کی جانب، کوئی ادنیٰ سا بھی اشارہ یا نظام کی مدح میں کوئی ایک شعر بھی نہیں تھا لیکن میرے اس مقطع پر شاہی عتاب نازل ہو گیا ؎

کبھی جوش کے جوش کی مدح فرما

کبھی گل رخوں کی ثنا خوانیاں کر

نظام اس دھوکے میں پڑ گئے کہ اس قطعے کا روئے سخن ان کی طرف ہے اور دوسرے ہی دن فرمان شائع کیا گیا کہ معلوم ہوتا ہے یہ قصیدہ جوش نے کسی خاص وقت (ہنگام بادہ نوشی) میں کہا ہے ان کو چاہیئے کہ وہ ایسے اوقات میں سرکار کو یاد نہ کیا کریں۔" اگر آئندہ وہ ایسا کریں گے تو اچھا نہیں ہو گا۔

اس واقعے کے کوئی دو برس کے بعد ایک روز نواب مہدی یار جنگ بہت گھبرائے ہوئے میرے پاس آئے اور کہا بڑا غضب ہو گیا۔ ہوش بلگرامی نے سرکار عالی تک یہ خبر پہنچا دی ہے کہ آپ کے...... شاہ زادی سے بڑے گہرے مراسم ہیں اور یہ بھی انھوں نے کہا ہے کہ.....

محل میں، جس وقت....... شاہ زادی جوش کو روک رہی تھیں اور جوش معذرت کر رہے تھے اس وقت میں نے پردے کے پیچھے سے یہ خود سنا تھا کہ شاہ زادی نے بڑے پیار کے لہجے میں اُن سے فرمایا تھا کہ "اگر تم اس وقت نہیں رُکو گے تو میں تمھیں مار ڈالوں گی۔"

نظام کے دل میں، یہ متذکرہ بالا چاروں خبریں، معلوم و نامعلوم طریقے سے ابھی اُٹھ ہی رہی تھیں کہ میں نے وہ اشتعال انگیز نظم جس کا ذکر کر چکا ہوں، جاگیرداروں اور وزراء کی بھری محفل میں سُنا دی۔ اور تمام محفل میں ایک دہشت ناک سناٹا چھا گیا۔ نواب نظامت جنگ وزیر سیاست نے میرے کان میں کہا "کُلھاڑی ماری آپ نے اپنے پاؤں میں اوّلا تو آپ کو۔ ایک ملازم سرکار عالی کی حیثیت سے ایسی نظم کہنا ہی نہیں چاہیئے تھی اور کہہ بھی دی تھی تو پھر یہ چاہیئے تھا کہ اس کو سات پردوں میں چھپا کر رکھتے حد کر دی آپ نے ناعاقبت اندیشی کی، بخدا میں تو اس پر کوئی کارروائی نہیں کروں گا، خفیہ پولیس والوں نے یہ نظم لکھ لی ہے، یقین رکھئے کل تک یہ کنگ کوٹھی پہنچ جائے گی۔ اس نظم کے چند اشعار یاد ہیں، آپ بھی سماعت فرمالیں، یہ نظم میرے کسی مجموعے میں طبع ہو چکی ہے)

الٰہی اگر ہے، یہی روزگار	کہ سینے رہیں، اہل دل کے فگار
دنائت کو حاصل ہوں سرداریاں	شرافت کرے، کفش برداریاں
سَرِ بزم جہل آئیں، اہل نظر	بشکل غلامان، زرّیں کمر
لئیموں کی ہر شب ہو غرقِ شباب	بنازِ نگاراں، بصوتِ رباب
رہیں فضل بار ان میں بھی تشنہ کام	خرابات کے اولیائے کرام
ہر محفلِ ممسک بد خصال	کریم آکے پھیلائیں دست سوال
ہُنر ہو اور اس درجہ بے آبرو	تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

دوسرے ہی دن وہ نظم، نظام تک پہنچ گئی۔ کوئی دوسرا ایسی زبردست گستاخانہ نظم کہتا تو جن، بچوں سمیت، کولھو میں پیل دیا جاتا۔ لیکن ان کی شرافت دیکھئے کہ انھوں نے بڑے خفیہ طور پر میرے ہم نوالہ و ہم پیالہ دوست آغا جانی، نائب کوتوال کو میرے پاس بھیجا کہ وہ مجھے اپنے ہمراہ کنگ کوٹھی لے آئیں؛ آغا نے مجھ سے کہا، مجھ کو اس بات پر بڑی حیرت ہے کہ ہر چند آپ نے اس قدر سخت نظم کہی ہے، پھر بھی سرکار آپ کے خلاف کسی قسم کا اقدام پسند نہیں فرماتے ہیں اور انھوں نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اگر جوش مجھ سے معافی طلب کر کے اس بات کا عہد کر لیں کہ وہ آئندہ میرے خلاف کچھ نہیں کہیں گے تو میں انھیں دل سے معاف کر دوں گا۔ اس لئے ابھی ابھی میرے ساتھ چلئے اور اس

معاملے کو زیرہ بود بلائے بنا دیجئے۔ میں نے اُن کی بات سُن کر سر جھکا لیا۔ آغا نے کہا، ارے دیر نہ کیجئے، کپڑے پہنئے اور میرے ساتھ ہو لیجئے۔ میں نے کہا، آغا معافی مانگنے پر میں تیار نہیں ہوں۔ وہ یہ کر دنگ ہو گئے، مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ زنانے دروازے پر جا کر آواز دی۔ بھابی ذرا ایک بات سُن جائیے اور جب میری بیوی بیٹ کی آڑ میں آ کر کھڑی ہو گئیں تو انھوں نے کہا بھابھی آپ کے شوہر نام دار سرکار سے معافی مانگنے پر تیار نہیں ہیں۔ بیوی نے آغا سے کہا۔ ذرا انھیں بلا لیجئے آغا نے مجھے پکارا میں پہنچ گیا، اور بیوی نے بڑے تیہے کے ساتھ ڈانٹ کر مجھ سے کہا۔ ارے کیا تمھارا دماغ پھر گیا ہے، آدھی سے زیادہ جائداد تباہ کر کے یہاں آئے ہو اور ابھی چھ مہینے بھی نہیں ہوئے ہیں۔ اس آدھی جائداد کو بھی ملیح آباد جا کر تین برس کے لئے خواجہ حسن کو ٹھیکے پر دے آئے ہو اور وہ سارا روپیہ بھی بالا بالا بمبئی جا کر برباد کر آئے ہو۔ معافی نہیں مانگو گے تو کیا جھنجھنے جھاڑتے پھرو گے؟ اور پھر یہ بھی تو سوچو کہ لڑکی لڑکے کو لکھانا پڑھانا اور ان کی شادیاں کرنا ہے۔ جاؤ اسی گھڑی جاؤ اور سرکار سے جا کر معافی مانگ لو نہیں تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔ سُن رہے ہو تم۔؟

میں نے کہا۔ اشرف جہاں یہ بات سچ ہے کہ تم سے ڈرتے ہیں مگر یہ بھی سُن لو کہ اس قدر نہیں ڈرتے ہیں کہ بھیگی بلّی بنے جائیں اور معافی مانگ آئیں۔ یہ سُن کر بیوی ہکا بکا ہو کر رہ گئیں، دیر تک مجھے گھورا اور پھر آنکھیں جھکا لیں اور آغا جانی یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ جو شخص خودکشی پر تُل جائے اسے کوئی روک نہیں سکتا۔

آغا کے چلے جانے کے بعد، میں نے ڈر کے مارے گھر میں قدم نہیں رکھا اور دوسرے دن جلدی جلدی استعفیٰ لکھ کر اپنے محکمے کے سکریٹری نواب ذوالقدر جنگ کے پاس چلا گیا۔

ذوالقدر نے کہا جوش صاحب آپ یہ کیا کر رہے ہیں، جذبات میں نہ بہئیے، عقل سے کام لیجئے۔ جائیے اور سرکار سے معافی مانگ لیجئے۔ آپ کو معلوم نہیں۔ ملازم کی کھال کو موٹا ہونا چاہیئے، سرکار مجھے گالیاں تک دے چکے ہیں۔ یہ آپ سے کہہ رہا ہوں، لیکن میں پی گیا۔ استعفیٰ نہیں دیا۔ اور آپ کی بات تو قطعی اس کے برعکس ہے۔ آپ نے خود سرکار پر لعن طعن کی ہے اور اس کے باوجود اُلٹے استعفیٰ دے رہے ہیں۔

دیر تک وہ مجھے سمجھاتے رہے، دیر تک بڑی ردو قدح رہی اور جب میں نہیں مانا تو انھوں نے غصے میں آ کر، میرا استعفیٰ کنگ کوٹھی روانہ کر دیا۔

میرا استعفیٰ، جنگل کی آگ کے مانند نظام تک پہونچ گیا۔ اور نظام، چیخ چیخ کر کہنے لگے،

بڑا غضب ہوا، جوش مجھ سے جیتے جارہے ہیں، جوش مجھ سے جیتے جارہے ہیں۔" نواب سر امین جنگ نے کہا، خداوند سے کون جیت سکتا ہے' کہاں جوش اور کہاں شاہ دکن، جوش کی سُرکا (مرتبے) کے تو بیکڑوں شاعر لکھنؤ کی گلیوں میں جوتے چٹخارتے ہیں۔ نظام نے کہا، امین' تم بات کی نزاکت نہیں سمجھ رہے ہو۔ مزا تو جب تھا کہ ان کے استعفے سے پیش تر ہی میں ان کو برطرف کردیتا لیکن اس عالم میں جبکہ وہ خود مستعفی ہورہے ہیں، بات اُلٹ گئی ہے اور میں ہارا جارہا ہوں۔

نواب امین نے دست بستہ عرض کیا۔ خداوند اس استعفا کو خانہ زاد کے حوالے فرمادیں، فدوی ابھی معاملے کو پلٹ دے گا۔ نظام نے میرا استعفیٰ ان کی طرف پھینک دیا۔ امین جنگ نے اسے اٹھاکر فوراً اچاک کردیا اور ہوا میں اس کے پرزے اڑا کر کہا، سرکار والا اس استعفا کا اب وجود ہی باقی نہیں رہا ہے اب سرکار فرمان جاری کردیں۔ میرے استعفے کے چاک ہوجانے ہی نظام کا چہرہ دمک اُٹھا اور کہنے لگے، امین تم نے مجھ کو جتادیا، ہمارے سکریٹری کو ایسا ہی قابل (قابل) ہونا چاہیئے۔ لکھو فرمان کہ جوش بلیح آبادی کو ممالک محروسہ سرکار سے خارج کیا جاتا ہے پندرہ دن کے اندر اندر وہ روانہ ہوجائیں اور تاحکم ثانی یہاں قدم نہ رکھیں۔

فرمان لے کر آغا جانی میرے پاس آئے اور کہنے لگے اس فرمان کو سمجھے بھی؟ میں نے کہا اس میں سمجھنے کی کیا بات ہے؟ انھوں نے کہا میں سرکار والا کا مزاج شناس ہوں اس لئے فرمان کے دو نکتے بتلانے آیا ہوں۔ پہلا نکتہ تو یہ ہے کہ سرکار جب کسی پر عتاب فرماتے ہیں تو اسے چوبیس گھنٹے کے اندر نکال دیتے ہیں آپ کو چوبیس گھنٹے کے عوض پورے پندرہ دن کی مہلت دی گئی ہے اور وہ اس مقصد سے کہ آپ صورت حال کو ٹھنڈے دل سے سمجھ کر معافی مانگ لیں اور یہ فرمان واپس لے لیا جائے۔ اور دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ہے کہ اس میں "تاحکم ثانی" لکھ کر آپ کی واپسی کو ناممکن نہیں بنایا گیا ہے۔ دیکھئے اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔ ابھی میرے ساتھ سرکار کی خدمت میں حاضر ہوکر معافی مانگ لیجئے، اگر اس وقت یہ فرمان منسوخ نہ کردیا جائے تو میری ناک کاٹ لیجئے گا۔

میں نے آغا جانی کو گلے لگا کر ان کی پیشانی چوم لی اور کہا آپ واقعی میرے پکّے دوست ہیں۔ لیکن میں کسی طرح معافی طلب نہیں کروں گا۔

آغا نے سر پکڑ کر کہا بھائی راج ہٹ، بالک ہٹ، تریا ہٹ تو سنی تھی آج معلوم ہوا کہ چوتھی ہٹ بھی ہوتی ہے، جس کو "شاعر ہٹ" کہنا چاہیئے۔

اندر جاکر میں نے بیوی سے کہا اب رخت سفر باندھو ہم یہاں پندرہ دن کیوں پڑے رہیں۔ تین چار

دن ہی میں کیوں نہ چلے جائیں۔ بیوی نے کہا۔ یہ تو سوچو جاؤ گے کیسے؟ جانے کا دم درود بھی ہے؟ — تمہاری بہن بہنوئی، ان کے بچے اور پھر ہم لوگ اور چھوٹے دادا اور دو نوکر اتنے آدمیوں کا کرایہ بھاڑا کہاں سے آئے گا؟ اور پھر تمہاری یہ ضد بھی ہے کہ ہم اپنی موٹر اور اپنے دونوں کتے بھی ساتھ لے جائیں گے اور ان کو یہاں کی گلیوں میں مارا مارا انہیں پھرنے دیں گے، ان سب کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا، اسی دن کے لئے میں تم سے کہا کرتی تھی کہ روز دعوتیں نہ کرو، غول کے غول آدمیوں کو روز شرابیں نہ پلاؤ، اتنے اللے تللے نہ کرو۔ اب بتاؤ کیا کرو گے، اور کیسے جاؤ گے۔ نہ نو من تیل ہو گا نہ رادھا جی ناچیں گی۔

بیوی کی باتیں سن کر میں چکرا گیا اور یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ ان حالات میں سفر ناممکن ہے میں نے کہا پھر اشرف جہاں کیا کیا جائے؟ انھوں نے کہا جاؤ اور شاہزادے اور مہاراجہ (کشن پرشاد) سے جا کر قرض مانگو۔ میں نے کہا میں قرض مانگنے نہیں جاؤں گا یہ تو ان دونوں کا فرض تھا کہ وہ کسی کو میرے پاس بھیج کر خود پچھواتے کہ ہم اس موقع پر کیا امداد کر سکتے ہیں۔ جب انھوں نے اپنا فرض ادا نہیں کیا تو میں بے غیرتی لاد کر ان کے پاس کیوں جاؤں۔ بیوی نے کہا ہاں سچ کہتے ہو لیکن میں پوچھتی ہوں کہ اب کیا کیا جائے۔ میں نے کہا کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے الغرض ایک ایک کر کے دن گزرنے لگے اور اخراج کی تاریخ قریب سے قریب تر آنے لگی اور کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آئی۔ اور میرا عالم اس مسافر کا سا ہو گیا جو راستہ بھول کر جنگل میں سر ٹکراتا اور چیختا پھرتا ہے:۔

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل
کجا دانند، حال ما سبکساران ساحل ہا

ایک روز اسی ربودگی و بے چارگی کے عالم میں سر جھکائے بیٹھا تھا کہ حکیم آزاد انصاری نے آ کر کہا کچھ خیال بھی ہے کہ یہاں سے جانے میں اب فقط چار دن باقی رہ گئے ہیں؟ میں نے کہا، آزاد صاحب اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ اخراج کے دن میں بڑے اطمینان سے اپنے پھاٹک کے سامنے آرام کرسی پر بیٹھ جاؤں اور نظام کی نافرمانی کے جرم میں اپنے کو گرفتار کرا کے جیل چلا جاؤں۔ لیکن میرے بال بچے کیا کریں گے؟

آزاد نے کہا گرفتار ہوں آپ کے دشمن، میں ایک ایسی تدبیر نکال کر آیا ہوں جو پٹ پڑ ہی نہیں سکتی۔ آپ کو اس بات کا علم نہیں کہ خاندانِ آصفیہ کی یہ ایک قدیم روایت چلی آ رہی ہے کہ شاہی معتوبوں کو تاحیات وظیفہ دیا جاتا ہے۔ آپ بھی معتوب ہیں اس لئے آپ کو بھی وظیفہ دیا جائے گا۔ اس لئے آپ، اللہ کا نام لے کر اس مضمون کی درخواست کے ساتھ اکبر حیدری کے

پاس جائیں کہ آپ کو، خزانۂ عامرۂ سرکار عالی سے پانچ ہزار کی رقم بطور قرض دیدی جائے اور اس رقم کو وظیفۂ عتاب میں سے بالاقساط وضع کر لیا جائے۔

میں نے کہا تدبیر تو آپ نے ایسی نکالی ہے جو تیر بہدف ہے لیکن کیا منھ لیکر حیدری کے پاس جاؤں انھیں تو ان کے خطاب کے معاملے میں ذلیل کر چکا ہوں۔ آزاد نے کہا اس سے کیا ہوتا ہے آپ حیدری سے تو قرض نہیں مانگ رہے ہیں۔ آپ تو خزانۂ عامرہ سے قرض لے گا۔ میں نے کہا بہت اچھا میں طیار ہوں، لیکن درخواست لکھنا تو مجھے آتا نہیں۔ آزاد نے اپنی جیب سے ٹائپ شدہ درخواست نکال کر میرے حوالے کر دی اور کہا اسی خیال سے میں آپ کے پاس مسلح ہو کر آیا تھا کہ درخواست لکھنا آپ کے بس کا روگ نہیں۔

اپنے مزاج کو لاکھوں کوڑے مار مار کر میں حیدری کے پاس گیا انھوں نے بڑی نرمی کے ساتھ پوچھا جوش صاحب میں آپ کی کھدمت (خدمت) کر سکتا ہوں۔ لفظ "کھدمت" کے زہر کو پی کر میں نے کہا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میرے اخراج میں اب صرف چار روز باقی رہ گئے ہیں اور خدا کے فضل و کرم سے میرے پاس اس قدر روپیہ نہیں کہ میں سفر کر سکوں۔ اس صورت میں آپ مجھ پر دو عنایتیں کریں۔ پہلی عنایت تو یہ ہوگی کہ آپ میری اس قرض کی درخواست کو منظور فرمالیں اور یہ ممکن نہ ہو تو پھر یہ دوسری عنایت کریں کہ مجھ کو بجرم سرتابی گرفتار کرا کے جیل بھجوا دیں۔

انھوں نے میری درخواست اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا، آپ گرفتاری کی بات نہ کہیں اگر آپ کو گرفتار کر لیا تو لٹریچر کی ہسٹری حیدرآباد کو کبھی "ماف" (معاف) نہیں کر سکے گی۔

میری درخواست پڑھ کر وہ داڑھی کھجانے لگے۔ میں نے کہا حیدری صاحب آپ اپنے دماغ پر بار نہ ڈالیں میں ہر مصیبت کے لئے بخوشی تیار ہوں۔ انھوں نے کہا جوش صاحب یہ فنانس کا "مالا" (معاملہ) ہے اس میں پانچ چھ مہینے لگیں گے۔ میں نے کہا مجھے تو صرف چار دن کی فرصت ہے۔ یہ سن کر انھوں نے سر جھکا لیا۔ سوچنے لگے پھر اپنی خشخشی داڑھی کھجائی، عینک صاف کر کے دوبارہ لگائی اور آخر کار گردن کے ایک فیصلہ کن جھٹکے کے ساتھ میری درخواست منظور کر کے اس پر دستخط کر دیئے اور دوسرے ہی دن مجھ کو پانچ ہزار مل گئے۔

جاتا ہے آسمان لئے کوچے سے یار کے

آتا ہے جی بھرا، در و دیوار دیکھ کر

ہائے کیسے بتاؤں کہ حیدرآباد سے روانگی کے وقت میرے دل کا کیا عالم تھا ایک طرف غم دورانی

تھا، اور ایک طرف غم جاناں، میری معاش کی شمع بجھ کر دھواں دے رہی تھی اور میرے عشق کا چاند گہنا کر اداسی برسا رہا تھا۔ بیوی ریل کے ڈبے میں اداس بیٹھی تھیں اور محبوبہ اسٹیشن کے ڈیننگ روم میں پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ اور میرا یہ عالم تھا کہ بیوی کی نظر بچا بچا کر بار بار ڈیننگ روم جاتا، محبوبہ کو گلے لگا کر روتا اور آنسو پونچھ پونچھ کر باہر آتا اور سید علی اختر مرحوم، سید ابوالخیر مودودی۔ اور سید ابوالاعلیٰ مودودی سے (جو مجھے رخصت کرنے اسٹیشن آئے تھے) باتیں کرنے لگتا تھا۔

میں اسی عالم میں تھا کہ نواب ذوالقدر جنگ آگئے اور ایک کاغذ میری طرف بڑھا کر کہا یہ میرے نام کا شاہی فرمان ہے اسے پڑھ لیجئے۔ فرمان حرف بحرف یاد نہیں لیکن اس کا مفہوم یہ تھا کہ جوش ملیح آبادی آج ہندوستان جا رہے ہیں ان سے کہہ دو کہ ہندوستان جا کر وہ اپنے قلم کو ہمارے خلاف نہ استعمال کریں اور اگر معافی پر تیار ہوں تو ہنوز گنجائش باقی ہے۔ میں نے کہا نواب صاحب اعلیٰ حضرت کی خدمت میں میرا شکریہ عرض کر کے یہ کہہ دیجئے کہ میں ان کی ہدایت پر عمل کروں گا لیکن معافی طلب کرنے پر آمادہ نہ ہوں۔ نواب ذوالقدر جنگ نے کہا کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ سرکار والا کو برا کہیں اور سرکار والا الٹے آپ سے معافی طلب کریں اتنے میں ریل رینگنے لگی میں دوڑ کر سوار ہو گیا۔ سب کو سلام کیا۔ میری محبوبہ ڈیننگ روم سے نکل آئی۔ اس نے آنسوؤں سے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ مجھے رخصتی سلام کیا، سلام کر کے لڑکھڑا گئی میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے گلے لگا لیا، اور گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی۔

ہر چند اس عالم پر اب ایک جگ بیت چکا ہے لیکن آج بھی جب کبھی اس کی یاد آجاتی ہے کلیجہ تھام کر رہ جاتا ہوں۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں قیامت کے دن متنفس بھی زندہ نہیں رہے گا وہ مجھے دیکھیں کہ قیامت گزر چکی ہے اور آج تک زندہ ہوں۔ (لیکن ایسی زندگی بھی کس کام کی کہ جیتا جاگتا آدمی اپنے کو "مرحوم" لکھنے لگے۔ ہائے وہاں سے کوچ کے وقت زلفوں سے مہکتی اور طبلوں سے گمکتی سرشار راتیں، عثمان ساگر کی سہانی صبحیں، پہاڑوں کی رنگین بدلیاں، سکندر آباد کی البیلی شامیں اور یاران دکن کی چہکتی صحبتیں میرے سامنے کھڑی ماتم کر رہی تھیں۔ معظم جاہ کا دربار آنکھوں میں آنسو بھرے مجھے دیکھ رہا تھا اور کسی کی حریم ناز سے ہائے ہائے کی آوازیں آرہی تھیں۔

اور اس پر طرہ یہ کہ میں خود اپنے ارادے سے فردوس دکن کو تج دینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

تجھ سے رخصت کی وہ شام اشک افشاں ہائے ہائے
وہ اداسی وہ فضائے گریہ ساماں۔ ہائے ہائے

یاں لبوں پر جنبش آہ تنک جاں وانصیب
واں مژہ میں لرزش اشک گریزاں ہائے ہائے
یاں کف پا چوم لینے کی. بھنچی سی آرزو!
واں بغل گیری کا، فرمایا سا ارماں۔ ہائے ہائے
میں سراپا سازِ عشرت اور وقفِ دردِ غم
تو مجسّم ناز کی اور بارِ حرماں۔ ہائے ہائے
وہ مرے ہونٹوں میں کچھ کہنے کی حسرت وائے شوق
وہ تری آنکھوں میں کچھ سننے کا ارماں۔ ہائے ہائے

میں اپنے ڈبے میں سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ غم دوراں اور غم جاناں کی پرشور موجوں نے میرے تمام وجود کو ڈھانک لیا اور میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے آبائی جائداد نے پکار پکار کر مجھ سے کہا جب تک تین برس کا ٹھیکہ موجود ہے مجھ سے کسی فائدے کی امید نہ رکھنا۔ پھر اُن احباب کے چہروں پر تصوّر کی نگاہ ڈالی جن کی بارہا عقدہ کشائی کر چکا تھا، وہ ہچکچاتے نظر آئے۔ اقرباء کا خیال آیا تو دیکھا کہ وہ میری بربادی پر مسکرا رہے ہیں اور آخر کار جھانسی تک آتے آتے میں نے یہ بات طے کر لی کہ اپنے قدر شناس قاضی سر عزیز الدین کے پاس چلا جاؤں جو دیتا کے وزیر اعظم ہیں۔

دربدری

جھانسی پہنچ کر میں نے بیوی کو جب اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو انھوں نے کہا اچھا یہ بھی کر کے دیکھ لو۔ وہ بڑی اداسی کے ساتھ ملیح آباد کی طرف روانہ ہو گئیں۔ اور میں ریاست دیتا جانے کے لئے جھانسی اسٹیشن پر اتر گیا۔

دیتا پہنچ کر قاضی صاحب کو میں نے اپنی ساری داستان سنادی، انھوں نے کہا جوش صاحب آپ شخصی حکومت کا بار اٹھانے کے واسطے بنے ہی نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت بڑا جوہر عطا فرمایا ہے، میری رائے ہے کہ آپ آگرے کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنا کر وہاں سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالنا شروع کر دیں، پرچے کا نام رکھئے "سلطنت" آگرے میں آپ کو رہنے کی دشواری اس لئے نہ ہوگی وہاں آپ کے نانا کا عالیشان محل موجود ہے۔

میں نے کہا۔ قاضی صاحب رائے تو بہت اچھی ہے مگر کس برتے پر اخبار نکالوں۔

انھوں نے جواب دیا کہ آپ ریاست دیتا کے برتے پر اخبار نکالیں۔ سردست، ریاست آپ کو ساڑھے چار سو فی ہفتہ کے حساب سے سولہ سو روپیہ ماہانہ دے گی اور سال آئندہ کے بجٹ سے یہ رقم دگنی کر دی جائے گی منظور ہے آپ کو؟ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں میں نے ان کی اس پیشکش کو فوراً منظور کر لیا۔ اس کے بعد انھوں نے کہا۔ آپ اللہ کا نام لے کر یہ کام شروع کر دیں۔ میں دوسری ریاستوں سے بھی آپ کو امداد دلا دوں گا۔

قاضی صاحب کی اس تجویز سے میرا دل باغ باغ ہوگیا۔ اور رات کو مشاغل سے فرصت پا کر سو گیا۔ صبح جب اُن کے ساتھ ناشتہ کرنے بیٹھا تو انھوں نے کہا، جوش صاحب آپ کے اخبار کی پالیسی کیا ہوگی۔ میں نے کہا آپ فرمائیں۔ انھوں نے کہا پرو برٹش (فرنگی حکومت کی حمایت) یہ سنتے ہی میرا چہرہ ملگجا سا ہو کر رہ گیا۔ قاضی بھانپ گئے۔ انھوں نے بڑے دبدبے کے ساتھ میز پر گھونسا مار کر کہا، جوش صاحب۔ برٹش ایمپائر (سلطنت برطانیہ) ایک نعمت ہے اور بہت بڑی نعمت۔ اگر یہ حکومت خوانخواستہ باقی نہ رہی تو میری یہ بات کان کھول کر سن لیجئے کہ ہندو ہم کو کچا چبا ڈالے گا سرکاری نوکری تو بڑی بڑی چیز ہے وہ ہم پر عرصۂ حیات تنگ کر دے گا۔ گائیں آپ کی کھیتیاں چریں گی، اور آپ گائے پر ہاتھ اٹھائیں گے تو کم سے کم آپ کا ہاتھ توڑ ڈالا جائے گا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ قتل کر ڈالے جائیں۔ ہندو آپ کے خون سے ہولی کھیلے گا، آپ کے ایم اے لڑکوں پر ہندو میٹرک کو ترجیح دی جائے گی۔

اور آپ کے خاندانوں کو تہ تیغ کر دیا جائے گا۔ فرمایئے کیا آپ اس پر تیار ہیں؟ میں نے کہا، قاضی صاحب آپ میرے بزرگ ہیں اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ آپ مجھ کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کا اس ہمدردی کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا لیکن اس کو کیا کروں کہ مجھ کو انگریزی حکومت سے نفرت ہے میری بات کاٹ کر انھوں نے کہا آپ اپنے دوست جواہر لال کے بہکانے میں آ گئے ہیں، دیکھئے یہ آپ کی روزی اور تمام مسلمانوں کی فلاح کا سوال ہے۔ آپ فیصلے میں جلدی نہ کیجئے۔

لیکن جب ان کے بار بار سمجھانے کے بعد بھی میں نے فرنگی کی حمایت پر آمادگی ظاہر نہیں کی تو انھوں نے مایوس ہو کر کہا۔ اگر آپ برٹش حکومت کی مخالفت کریں گے تو مجھے افسوس ہے کہ ریاست آپ کا ہاتھ نہیں بٹا سکے گی اور اگر میں ریاست سے آپ کی امداد کروں گا تو میری پرائم منسٹری ہی ختم ہو جائے گی۔ میں نے کہا، قاضی صاحب، میں آپ کو آپ کے وعدے سے سبک دوش کرتا ہوں۔

اور رخصت ہوتے ہوئے میں نے کہا قاضی صاحب میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں آپ نے تو دل سے یہ چاہا تھا کہ میری زندگی سدھر جائے لیکن میرے مزاج کی افتاد نے سارا کھیل بگاڑ کر رکھ دیا۔ آپ نے مجھ پر کرم کرنا چاہا لیکن میں اس کرم کا بار اٹھا نہیں سکا۔ خطا آپ کی نہیں میری ہے ؎

ہر چہ ہست از قامت کوتاہ بے ہنگام ماست
ورنہ تشریف تو، بر بالائے کس کوتاہ نیست

دھول پور آیا، تو دھول پور کے سب سے بڑے جاگیر دار اور اپنے حقیقی ماموں کی حویلی کے عوض، اپنے پرانے دوست سردار روپ سنگھ کے وہاں ٹھہرا۔

میں نے اپنی رُوداد سنائی اور کہا کہ مہاراجہ کے پاس آیا ہوں شاید وہ کوئی ملازمت دے دیں۔ روپ سنگھ نے کہا، مہاراجہ بڑا پاپی ہے مجھے اس سے کوئی امید نہیں، جب تک تمہاری کوئی صورت نہ نکلے تم میرے ہی ساتھ رہو۔ بلیح آیا دجا کر بھابھی کو بلا لاؤ۔ نواب صاحب (میرے ماموں) کے باڑے کی حویلی میں ان کو ٹھہراؤ جب تک کوئی بندوبست نہ ہو جائے میں پان سو روپے ماہانہ تم کو دیتا رہوں گا۔ جب کبھی دن آئیں تو ادا کر دینا۔

میں نے کہا میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں کہ میرے بے کہے تم میری امداد پر آمادہ ہو گئے روپ سنگھ نے میری بات کاٹ کر کہا، یہ کون سی انوکھی بات ہے کیا ہم دونوں بہت پرانے دوست نہیں ہیں؟ کیا تم نے اپنے ماموں پر ترجیح دے کر میرے یہاں قیام نہیں کیا ہے؟ کیا ہم میں کوئی

خیریت ہے؟ میں راج پوت ہوں تم پٹھان، تم مسلمان راج پوت ہو میں ہندو پٹھان۔

میں نے کہا، بھائی روپ سنگھ میں سوچ کر جواب دوں گا۔ روپ سنگھ نے کہا سوچ کر جواب دینے والے کی ایسی تیسی۔ ابھی ابھی جواب دو ورنہ چھاتی پر چڑھ کر گلا دبا دوں گا۔ میں نے ہنس کر کہا، ایسی ہول جول کا ہے کی ذرا سوچ تو لینے دو۔ یہ سنتے ہی روپ سنگھ نے جست لگائی مجھ کو فرش پر گرا دیا میرے سینے پر چڑھ بیٹھے اور زور زور سے میرا گلا دبا دیا کر کہنے لگے، منظور ہے کہ نہیں یا مار ڈالوں؟ میں نے کہا منظور، منظور۔ اے ظالم منظور۔ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ کے آنسو بہنے لگے کانوں سے سنتے تھے۔ ورنہ سنائی، لیکن ہمی رسد، آنکھوں سے دکھا دیا۔

روپ سنگھ نے۔ دوست ہو تو ایسا۔ میں نے تار دے کے بیوی کو دھول پور بلا لیا۔ وہ چھوٹے دادا اور سخاوت و ظفر[1] کو ساتھ لے کر آ گئیں، میں بھی روپ سنگھ کے باڑے سے اٹھ کر مامُوں کے باڑے آ گیا اور ان کی خالی حویلی میں رہنے لگا۔ کئی بار مہاراجہ دھول پور سے ملا، ہر بار انھوں نے ملازمت کا وعدہ کیا، لیکن ایفاد کی نوبت نہیں آئی۔ جب اس گو مگو میں دو تین مہینے گزر گئے تو مجھے تشویش ہونے لگی کہ آخر ماجرا کیا ہے۔

اسی اثناء میں خواب دیکھا کہ مولوی احمد حسین[2] فرما رہے ہیں کہ مہاراجہ سے کوئی امید نہ رکھیے۔ "آپ ایک رندِ پاک باطن ہیں وہ بگلا بھگت۔" صبح ایک تار آئے گا اس پر عمل کیجیے گا۔ میں نے بیدار ہوتے ہی روپ سنگھ کو یہ خواب سُنا دیا، انھوں نے کہا یہ خواب تو ایسا ہے کہ اس کے سچے جھوٹے ہونے کا تو آج ہی پتہ چل جائے گا۔

اس کے کوئی دو گھنٹے کے بعد جب ہم لوگ ناشتے سے فارغ ہو کر گپ شپ کر رہے تھے کہ مہاراجہ کے پرائیویٹ سکریٹری آ گئے اور مجھ سے کہا میں آپ سے تخلیے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں اور جب میں ان کو دوسرے کمرے میں لے گیا تو انھوں نے کہا سرکار فرماتے ہیں کہ میرا اور جوش صاحب کا معاملہ تو ایسا ہے جیسا درخت اور بکّل (چھال) کا ہوتا ہے، اگر وہ یہاں سے چلے گئے تو میں بے بکّل کا درخت ہو جاؤں گا۔ میں جوش صاحب کو ایک اچھا سا عہدہ[3] دینا چاہتا ہوں مگر دو شرطیں ہیں ایک تو یہ کہ وہ شراب ترک کر دیں اور دوسری یہ ہے کہ روپ[4] سنگھ سے ملنا چھوڑ

---

[1] ایک پروردہ، دوسرا ملازم [2] آگے ان کا تفصیلی حال آئے گا [3] روپ سنگھ مہاراجہ کے ساتھ کھیلے ہوئے دوستوں میں تھے جو اب معتوب ہو چکے تھے۔

دیں میں نے کہا مہاراجہ سے جاکر کہہ دیجئے کہ انھوں نے میری ذات کے ساتھ جس یگانگی کا اظہار کیا ہے میں اس کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں لیکن اس کے باوجود نہ تو میں شراب ہی ترک کروں گا نہ روپ سنگھ ہی کی محبت سے دست بردار ہوں گا۔

روپ سنگھ پردے کی آڑ سے یہ باتیں سن رہے تھے میرا یہ آخری فقرہ سُن کر وہ یہ کہتے کمرے میں در آئے کہ سکریٹری صاحب ٹھہریئے، سرکار سے جاکر کہہ دیجئے کہ جوش شراب بھی چھوڑ دیں گے اور روپ سنگھ سے بھی منہ پھیر لیں گے۔ سکریٹری نے پوچھا۔ جوش صاحب آپ کیا کہتے ہیں؟ میں نے کہا میں شراب اور روپ سنگھ دونوں کو نہیں چھوڑوں گا مجھے سرکار کی یہ دونوں شرطیں منظور نہیں ہیں۔" روپ سنگھ نے ڈپٹ کر کہا تم کو چھوڑنا پڑیں گی یہ دونوں چیزیں۔ میں نے کہا، نہیں چھوڑوں گا، نہیں چھوڑوں گا، نہیں چھوڑوں گا۔ اور اسی شور و غل میں سکریٹری صاحب" ارے رام ایسی پکّی دھن؟ ایسی پکّی دوستی کہتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

سکریٹری کے چلے جانے کے بعد روپ سنگھ نے انگلی اٹھا کر کہا، تم ڈیم فول ہو، سارا اپنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ میں نے کہا تم ڈیم فول ہو، میں نے سارے بگڑے ہوئے کھیل کو سنوار دیا۔ انھوں نے کہا، تم اپنی غلطی تسلیم نہیں کروگے؟ میں نے کہا تم اپنی غلطی تسلیم نہیں کروگے؟ انھوں نے کہا، میں ہرگز ہرگز اپنی غلطی تسلیم نہیں کروں گا، اب میں نے جست کر کے ان کو گرادیا سینے پر چڑھ بیٹھا اور ان کا گلا دبا کر کہا تسلیم کرو اپنی غلطی۔ انھوں نے کہا، اچھا یادا جان تو چھوڑ دو میں ہی غلطی پر ہوں۔ میں اُن کے سینے سے اتر آیا اور وہ مجھے گلے لگا کر رونے لگے کہ میری خاطر تم نے بہت بڑا ایثار کیا۔

اب ہم پھر برآمدے میں آکر بیٹھ گئے۔ روپ سنگھ نے کہا، تمہارے خواب کا پہلا حصہ تو سچّا نکلا کہ مہاراجہ سے قطع تعلق ہوگیا۔ اب اگر تارہ بھی آگیا تو پورا خواب سچّا ثابت ہوجائے گا۔

رسالہ "کلیم" کا دہلی سے اجراء

دہلی پہنچا تو مسز نائیڈو برس پڑیں، کہنے لگیں، ذرا اس کا نام تو بتایئے جس نے آپکو یہ خبر دی تھی کہ سروجنی مر چکی ہے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا، یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ انھوں نے کہا یہ میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ اگر آپ مجھ کو زندہ سمجھتے تو یہ سیدھے میرے پاس آ کر اپنی بپتا کہتے۔ اور میرا جواب سنے بغیر انھوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اگر گھوش مجھ کو نہ لکھتے تو مجھے یہ پتہ بھی نہ چلتا کہ آپ دھول پور میں اپنے کسی دوست روپ سنگھ کے وہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

میں نے معذرت کے واسطے لب کھولے ہی تھے کہ انھوں نے کہا۔ میں آپ کے ٹمپرامنٹ سے واقف ہوں، کچھ نہ کہئے، میری خواب گاہ میں جایئے۔ میرے تکیہ کے نیچے ایک بڑا سا لفافہ رکھا ہوا ہے اسے کھولے بغیر اپنی جیب میں رکھ لیجئے، ذرا سنبھال کر رکھئے گا تا کہ گم نہ جائے۔ اب آپ کا یہ کام ہوگا کہ دہلی سے ایک نیم ادبی و نیم سرکاری ماہ نامہ نکالیں گے اور کسی ریاست کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھیں گے۔ میں اشتہار بھی دلا دوں گی۔

میں رسالے کا نام "کاخ بلند" رکھنا چاہتا تھا۔ میرے دوست ذوالفقار علی صاحب بخاری نے رائے دی کہ میں رسالے کا نام "کلیم" رکھوں، "کاخ بلند" نام مشکل ہے۔ میں نے یہ رائے مان لی اور رسالے کے اجراء کے ابتدائی مراحل میں سرگرم ہو گیا۔

رسالہ نکالنا ایک تجارتی امر ہے۔ میری سات پشتیں بھی تجارت سے واقف نہ تھیں اس لئے ابتدائی مراحل ہی میں بہت سارا روپیہ برباد ہو گیا اور اسکے ساتھ ساتھ میرے دہلی کے احباب نے مجھے گھیر لیا، روز بوتلیں کھلنے اور دعوتیں ہونے لگیں اور کاتبوں، کاغذ والوں، بلاک سازوں اور چھاپہ خانے والوں نے بھی یہ سمجھ کر کہ میں سراسر لٹر آدمی ہوں، مجھے دونوں ہاتھوں سے لوٹنا شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابھی دوسرا پرچہ شائع نہیں ہوا تھا کہ تمام روپیہ ترپھر ہو گیا۔ شرم آئی کہ مسز نائیڈو سے یہ داستاں کہوں اور سوچنے لگا کہ اب کیا کیا جائے۔ ابھی کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ بیمار پڑ گیا۔ بخار اس قدر تیز آیا کہ حواس گم ہو گئے اور نزلہ اس قدر شدید ہوا کہ تمام سینہ زندہ ہو گیا اور سانس بھی رک رک کر آنے لگی اور میں سمجھا کہ اب جانبر نہیں ہو سکوں گا۔
میں اس زمانے میں فتح پوری کے کراؤن ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک پرچہ پر

میں نے مسز نائیڈو اور جواہرلال کا نام لکھا اور پرچہ لے کر کراہتا نیچے آیا، منیجر کو وہ پرچہ دے کر کہا۔ اگر میں مر جاؤں تو فوراً ان دونوں کو خبر کر دیجئے گا۔ منیجر نے بجید بدحواس ہو کر مجھ سے کہا۔ جوش صاحب خدا کے واسطے خودکشی نہ کیجئے گا مجھ کو منیجر کی بوکھلاہٹ پر ہنسی آ گئی اور کہا منیجر صاحب میں بزدل نہیں کہ خودکشی کروں، میری حالت خراب ہے اس لیے سوچا کہ مسز نائیڈو اور جواہر کو خبر ہو جائے، منیجر دوڑا ہوا گیا اور ڈاکٹر سید ناصر عباس کو جن کا مطب وہاں سے دس قدم پر تھا اپنے ساتھ لے آیا۔ ڈاکٹر صاحب مجھے پہلے سے جانتے تھے میرے سینے کا معائنہ کیا اور مطب جا کر اپنے آدمی کے ہاتھ دوائیں بھیج دیں۔

دوائیں پی کر ابھی لیٹا ہوا اپنی بے کسی پر غور اور اپنی موت کی آمد کا انتظار کر ہی رہا تھا کہ آہٹ محسوس ہوئی اور پنڈت شیو نرائن صاحب (جن کا مطبع ہوٹل سے ملا ہوا تھا اور جن کو مطلبی فریدآبادی مجھ سے ملا چکے تھے) میرے کمرے میں داخل ہو گئے، میں نے کہا، آئیے شیو نرائن صاحب، افسوس کہ میں اُٹھ نہیں سکتا۔ آپ میرے سرہانے بیٹھ جائیں۔ مزاج پرسی کے بعد انھوں نے کہا، جوش صاحب مجھ کو اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ رسالہ نہیں نکال سکتے۔ میں کاروباری آدمی ہوں۔ میرے پاس اپنا ذاتی چھاپہ خانہ بھی ہے اس لئے آپ پسند کریں تو میں آپ کا پچاس فیصد شریک ہو جاؤں۔ قلم آپ کا چلے گا روپیہ میں لگاؤں گا اور جب تک رسالہ چلنے نہ لگے پانچ سو روپیہ ماہانہ آپ کو بطور پیشگی دیتا رہوں گا۔ میں نے اس تجویز کو لطیفۂ غیبی سمجھا اور فوراً قبول کر لیا۔

دو چار دن کے اندر پنڈت شیو نرائن نے ہوٹل کے سامنے ہی دو کمروں اور کشادہ صحن کا فلیٹ دفتر اور میری سکونت کے واسطے کرایہ پر لے لیا اور میں ہوٹل سے وہاں اُٹھ آیا۔

اس کے کچھ روز بعد جب میں نے ان سے کہا کہ میں اپنی بیوی کو بھی یہاں لے آنا چاہتا ہوں تو انھوں نے قرول باغ میں ایک کوٹھی کرایہ پر لے کر اس کو فرنیچر سے آراستہ کر دیا اور میں بیوی کو لے آنے کے لئے دھول پور چلا گیا۔ وہاں پہونچ کر یہ معلوم ہوا کہ میری بیٹی بیمار ہے۔ بیوی اس کو لے کر آگرے چلی گئیں۔ اور کسی ہسپتال میں وارڈ لے کر مقیم ہیں۔ اور میرا بیٹا میرے دوست لطیف الدین کے مکان میں رہتا ہے۔ سخاوت اور ظفر بھاگ چکے ہیں۔ دوسری گاڑی سے گھبرایا آگرے لطیف کے گھر گیا دیکھا کہ میرا بیٹا اور اس کا چچازاد بھائی دونوں ایک نہایت بوسیدہ اور میلی دری پر اُداس بیٹھے ہیں میرے بیٹے نے مجھے دیکھا دوڑ کر سینے سے لگ گیا اور روہانسی آوازیں کہنے لگا۔ ابا ہم یہاں اس دری پر سوتے ہیں ہم کو چارپائیاں بھی نہیں دی گئی ہیں اور ہم روز دس روپے دیتے ہیں تو ہمیں کھانا ملتا ہے اور وہ بھی الا سلا۔ جی چاہا چیخیں مار مار کر رونے لگوں لیکن اس خیال سے ضبط کیا کہ میرے پرانے دوست لطیف،

بُرا مانیں گے۔ (غالباً لطیف کی معاشی حالت اس وقت بگڑ چکی تھی)

لڑکے کولے کر ہسپتال پہنچا۔ دیکھا بیوی کا منھ اترا ہوا ہے، اور بیٹی نڈھال پڑی ہے۔ اسکی بیمار پائی پر بیٹھ کر میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اور آنسو جاری ہو گئے، بیٹی بھی رونے لگی۔ بیوی نے آنسو پونچھ کر کہا، اللہ کے واسطے اس طرح نہ روؤ، میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، ارے ہم کیا ہیں، بڑی بڑی شاہزادیاں پر اس سے بھی بُرے وقت پڑ چکے تھے، اللہ کا شکر کرو، لڑکی کو پلوریسی ہو گئی تھی، اب اچھی ہو چکی ہے، بس طاقت آنے کی دیر ہے۔

میں نے بیوی سے کل حالات بیان کر دیئے، انھوں نے کہا، بس آٹھ دن کی دیر ہے یہاں ٹھہر جاؤ، پھر ہم سب ساتھ دہلی چلیں گے۔

آٹھویں دن دہلی آ گیا، قرول باغ کی کوٹھی آباد ہو گئی ــــ "کلیم" اچھا خاصہ چلنے لگا معقول آمدنی ہونے لگی، میری نظموں کے دو مجموعے بھی چھپ گئے۔ حیدر آباد سے عتابی وظیفہ بھی جاری ہو گیا۔ لہٰذا زندگی چین سے گذرنے لگی۔ سال دو سال آرام سے گزرنے لگی۔ میری زندگی پھر ایک بحران کی جانب مڑ گئی ایک روز شام کے وقت شیو نرائن خشک چہرے کے ساتھ آئے اور کلیم سے اپنی دست برداری کا اعلان کر کے، کہہ دیا کہ کل سے آپ اپنا پرچہ خود سنبھالیں۔

یہ سچ ہے کہ شیو نرائن صاحب نے اپنے بھائیوں کے دباؤ میں آ کر اگر یہ بات کی تھی مگر ان کا یہ اخلاقی فریضہ تھا کہ وہ مجھے کم سے کم تین مہینے کا نوٹس دیتے، مگر انھوں نے صرف بارہ گھنٹے کا نوٹس دے کر علٰحدگی اختیار کر لی ـــ میں سیدھا اپنے پڑوسی محمود علی خاں جامعی کے پاس پہونچا، اور کلیم کا کاروبار ان کے سپرد کر دیا، لیکن جب ایک مہینہ کے بعد انھوں نے کلیم کی آمدنی کے نو ۹ روپے میرے حوالے کئے تو میں دنگ ہو کر رہ گیا مگر فرط مروت سے کچھ کہہ نہ سکا۔ (خدا غارت کرے اس مروت کو۔ ارے خدا مروت کو کیا غارت کرے گا، خود مروت نے مجھ کو غارت کر کے رکھ دیا، آج بھی غارت کئے ہوئے ہے اور انشاء اللہ مرتے دم تک غارت کرتی رہے گی۔

جب اور کوئی صورت سمجھ میں نہیں آئی تو میں نے مسٹر پانی کار کو لکھا اور پانی کار نے تار بھیج کر مجھے پٹیالہ بلا لیا۔ پٹیالے پہونچتے ہی انھوں نے مجھے مہاراجہ پٹیالہ بھوپندر سنگھ سے ملوا کر میرا وظیفہ مقرر کرا دیا۔ اب دہلی آ کر میں نے محمود علی خاں سے رسالہ نکال لیا۔ قرول باغ سے دریا گنج اُٹھ آیا، ایک کوٹھی "اڈیتہ بھون" کرائے پر لے لی ایک لکھے پڑھے ذہین پنجابی نوجوان اور دہلی کے دو تجربہ کار

ؔ وہ مدراسی زبان کے شاعر و ادیب اور مہاراجہ پٹیالہ کے وزرا، میں سے تھے جن سے سروجنی نائیڈو ملا چکی تھی۔

بوڑھوں کو ملازم رکھ کر میں خود رسالہ نکالنے لگا، اور حکیم حضرت انصاری بھی میرا ہاتھ بٹانے لگے اور حیرت ہے کہ خود میری بیوی بھی "کلیم" کے کاروبار میں میری دست گیری کرنے لگیں اور "کلیم" صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔

میں نے اسی زمانے میں اپنی چچازاد بہن کے بیٹے التفات احمد خاں سے اپنی بیٹی سعیدہ کی بڑی دھوم دھام سے شادی بھی کر دی، میری بیٹی کی شادی کا کھانا پکوایا تھا قرول باغ کے عبداللہ صاحب نے، اور ایسا کھانا پکوایا تھا کہ باید و شاید۔ خدا جانے عبداللہ صاحب اب کہاں ہیں۔ جہاں کہیں بھی ہوں، میری یہ آواز سن لیں کہ میں آج تک ان کو یاد کرتا ہوں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ، اس موقع پر میرے جگری دوست سردار دیوان سنگھ مفتون نے جس خلوص کے ساتھ میرا ہاتھ بٹایا تھا، میں اسے بھی فراموش نہیں کر سکتا اور دہلی کلاتھ مل کے لالہ شنکر لال اور سروجنی نے جو تحائف دیئیے تھے، میرے دل میں ان کی یاد اور ان کا تشکر بھی آج تک شاداب ہے۔

کلیم کی روز افزوں ترقی نے میرے بہت سے دشمن بھی پیدا کر دئیے تھے اور ایسا کیوں نہ ہوتا اس لئے کہ فرنگی حکومت کی تہدیم، سرمایہ داری کی تدفین، سوشلزم کی تبلیغ اقوال و اوہام کی تضحیک فکر و تامل کی ترغیب، کانگریس کی تحکیم، اور مسلم لیگ کی تنقیص، اس کی پالیسی میں داخل تھی اور اسی بنا پر شاہ (فرنگی) اور شاہ صاحب دونوں مجھ سے بگڑ گئے تھے، جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا تھا کہ کانگریس کے غلامی پرست مخالفین، مسلم لیگ کے خطاب یافتہ "مجاہدین" حکومت کے کفش بردار حکام اور منبر و محراب پر بلبلا نے والے سرکاری وظیفہ خوار، علمائے کرام لنگر لنگوٹ باندھ باندھ کر اکھاڑے میں اتر آئے تھے۔

ادھر پلٹنیں تھیں اور ادھر میں ایک فرد واحد تھا کہ آواز دے رہا تھا ؏

من و گرز و میدان و افراسیاب

آئے دن میرے خلاف کفر کے فتوے نکلا کرتے اور قتل کی دھمکیوں کے گم نام خط آیا کرتے تھے خفیہ پولیس سائے کی مانند میرا تعاقب کرتی تھی، اور بیوی چلاتی رہتی تھیں کہ ارے منھ اندھیرے ٹہلنا چھوڑ دو، نہ جانے اندھیرے میں کون پیچھے سے آکر چھری مار دے لیکن میں ہر روز تاروں کی چھاؤں میں ایک زبردست "تنبیہ الغافلین" قسم کا لٹھ اٹھائے کر جمنا کے کنارے بڑے اطمینان کے ساتھ ٹہلا کرتا تھا

[1] میں کلیم کے دور آخر میں تحریک پاکستان کا حامی بن گیا تھا اور پاکستان کی حمایت میں ایک بڑے مجمع کے سامنے گنگا پرشاد میموریل ہال کی چھت کے نیچے ایک ایسی گھن گرج نظم پڑھی تھی کہ ہال گونجنے لگا تھا۔ اور میرے سینکڑوں کانگریسی دوستوں کو مجھ سے بے حد شکایت پیدا ہو گئی تھی (وہ نظم میرے کسی مجموعے میں شائع ہو چکی ہے۔

کہ آخر میں بھی آفریدی پٹھان ہوں، دو چار کو مار کر مروں گا۔

آں نہ من باشم کہ روزِ جنگ بینی پشت من
آں منم کاندر میانِ خاک و خوں بینی سرم

اس کلیمی دور میں ایک بار سر تیج بہادر سپرو صاحب نے مجھ سے کہا۔ جوش صاحب، اگر ایمپائر کی موافقت میں اور سوشلزم کے خلاف نظمیں کہنا اور مضامین لکھنا شروع کر دیں تو تھوڑی ہی دیر میں لکھ پتی بن سکتے اور حکومت سے خطاب حاصل کر سکتے ہیں۔ بڑے بڑے والیانِ ریاست آپکی شاعری کے رومانٹک اور نیچرل سینریز کے حصوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اگر آپ اپنی یہ روش بدل دیں تو ریاستوں سے بھی آپکی لٹریری پنشنیں مقرر ہو سکتی ہیں۔

میں نے کہا، سپرو صاحب۔ آپ میرے باپ کے احباب میں سے ہیں۔ میں آپ کو اپنا بزرگ سمجھتا ہوں لیکن آپ بُرا نہ مانیں تو اتنا عرض کروں کہ شاعری ایک خالص وجدانی معاملہ ہے جس کو جلبِ منفعت کا ذریعہ بنانا گناہ ہے اس لئے مجھ کو یہ امر اپیل نہیں کرتا کہ اگر میں حکومت یا امراء کی تعریف کروں گا تو دولت مند ہو جاؤں گا۔ شاعری کو جانچنا چاہیئے اس کے مفید یا مضر اثرات کی روشنی میں —— اور اگر محکم دلائل کے ساتھ آپ اس امر کو ثابت فرما دیں کہ ہندوستان کے واسطے انگریز کی حکومت اور والیان ریاست کی ہستی مفید اور بابرکت ہے تو میں اپنی روش ترک کر دوں گا۔

یہ دن کو سپرو کے چہرے پر ندامت کے ساتھ ساتھ غیظ کے ہلکے ہلکے آثار پیدا ہو گئے۔ اور انھوں نے اپنے تلخ لہجے میں ملائم تبسم کی پھیکی سی شیرینی پیدا کر کے مجھ سے فرمایا کہ اگر یہ بات ہے تو کیا میں آپ سے دریافت کر سکتا ہوں کہ پھر آپ حیدرآباد اور پٹیالے سے وظائف کیوں لیتے ہیں؟۔ میں نے کہا۔ سپرو صاحب غالباً آپ کا یہ خیال ہے کہ میں "منکرِ مے بودن و ہم رنگِ مستاں زیستن" پر عمل پیرا ہوں۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ نے یہ سوال کر کے مجھے اس کا موقع دیا کہ میں اپنی پوزیشن صاف کر دوں۔ پہلی بات یہ عرض کرتا ہوں کہ والیانِ ریاست کے پاس جو دولت ہے وہ ان کی نہیں، بلکہ عوام کی ہے اس لئے کہ وہ ہماری محنت کی پیدا کردہ اور انسان کے ضائع شدہ حقوق کا نتیجہ ہے اس لئے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم قوت استعمال کر کے ان کی دولت چھین لیں اور اس کو طاقت الناس میں تقسیم کر دیں اور جب تک وہ قوت حاصل نہ ہو ہم کو چاہیئے کہ ان کی دولت سے تمتع کی سعی کرتے رہیں۔

اگر ہم اپنے اصول قربان کیئے بغیر اُن سے ایک روپیہ بھی وصول کر لیں تو اس کے یہ معنی

ہوں گے کہ ہم نے اُن کو بقدر ایک روپیہ کمزور کر دیا اور اپنے کو بقدر ایک روپیہ قوی بنا لیا۔ اور وہ ایک روپیہ جو مسخروں اور بھانڈوں پر ضائع ہو جاتا، اپنے مصرف میں لا کر ہم نے اس سے بہتر کام لیا۔

یہ تو مختصر سا اصولی جواب ہے۔ اب میری دونوں پنشنوں کی روداد سُن لیجئے۔ جہاں تک کہ میری حیدرآباد کی پنشن کا تعلق ہے وہ پنشن اعتابی پنشن ہے۔ میں نے نظام کے خلاف نظم کہی سے معتوب ہوا اور حسبِ روایتِ خاندانِ آصفیہ، پنشن کا مستحق ٹھہرا دیا گیا اور اب تک سرتابی کی داد حاصل کر رہا ہوں۔ اب رہا پٹیالے کی پنشن کا معاملہ تو میری وہ پنشن سیاسی نہیں خالص ادبی ہے آج تک مہاراجہ نے مجھ سے یہ نہیں کہا کہ میں فرنگی کے خلاف شعر کہنا یا کھدّر پہننا ترک کر دوں۔ اگر مہاراجہ کی پنشن مجھے میرے اصول سے منحرف کر دیتی تو مجھ سے زیادہ ذلیل اور کون ہو سکتا تھا۔ لیکن اس عالم میں کہ وہ پنشن قطعی طور پر غیر مشروط ہے میں اس سے کیوں نہ فائدہ اٹھاؤں۔

میری یہ باتیں سن کر سپرو صاحب خاموش ہو گئے لیکن چہرے پر تکدّر کی شکنیں اُبھر آئیں اور اُن کے چشم و ابرو سے یہ بات ٹپکنے لگی گویا میں نے براہِ راست ان کی اہانت کر دی ہے۔

وہ تا حیات مجھ سے روٹھے رہے۔ سچ کہا ہے صائبؔ نے ؎

گفتارِ صدق مایۂ آزار می شود
چوں حرفِ حق بلند شود دار می شود

سیاستِ افرنگ کے دُو رُخ

ساڑھے تین یا چار برس تک اپنے ماہنامہ "کلیم" کو کامیابی سے چلاکر اور ایک ایسے رومانی عذاب میں گرفتار ہو کر، جس نے میرے حواس چھین لیئے تھے، میں دہلی کی زندگی تج کر ملیح آباد[1] چلا گیا اور چونکہ میں رسالے کے کام کا نہیں رہا تھا، میں نے اپنے داماد التفات احمد کو منیجر بنا دیا۔ لیکن جب یہ دیکھا کہ وہ نام خدا بالکل نکھٹو ہیں، میں نے "کلیم" بند کر کے مجاز علی سردار اور سبط حسن کی درخواست پر اس کو ان لوگوں کے رسالہ "نیا ادب" میں ضم کر دیا جو "کلیم و نیا ادب" کے از روئے قواعد غلط نام کے ساتھ لکھنؤ سے جاری ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ وقت سب سے بڑا مرہم ہے، ملیح آباد آکر چھ سات مہینے کے بعد میرے دل کا زخم بڑی حد تک مندمل ہو گیا۔ اور میں "قصرِ سحر" کی چمن بندی اور توسیع میں لگ گیا۔

ادے میں ادب نقیب، کشتۂ التفات حبیب اور باغوں کی تنصیب —— لیکن مرتا کیا نہ کرتا —— بیوی تل گئیں آموں کے باغ لگوانے پر اور ایسی تل گئیں کہ کھانا پینا دوبھر کر دیا۔ ہر آن یہ رٹ لگ گئی کہ باغ لگاؤ، اور جب تک باغوں میں قلم نہ لگ جائیں قلم نہ اٹھاؤ میں نے اسی زمانے میں ایک طویل ڈرامائی نظم "حرف آخر" شروع کی تھی انھوں نے وہ نظم بھی نہیں کہنے دی[2]۔

تنگ آکر میں نے ماتا دین پٹواری کو بلایا۔ پٹواری نے کہا منجھلے بھیا اب قانون بدل گیا ہے آپ کسی کاشتکار کو بے دخل کر کے اس سے زمین نہیں نکال سکتے۔ اور جب زمین ہی نہیں نکل سکے گی تو باغ کیسے لگے گا۔

ماتا دین کی یہ بات سن کر میں باغ باغ ہو گیا کہ چلو ایک بڑی مصیبت کٹ گئی میں خوشی خوشی بیوی کے پاس گیا، اور جھوٹ موٹ کا غمگین چہرہ بنا کر پٹواری کی بات دہرا دی۔ لیکن بیوی مایوس نہیں ہوئیں مجھے اور پٹواری کو ساتھ لیکر گاؤں گئیں تھانے کے سامنے کاشتکاروں کو جمع کر کے پٹواری سے کہا پوچھو کاشتکاروں سے منجھلے بھیا نے کیا تم پر کوئی ظلم ڈھایا ہے؟ تم پر لگان وصول کرنے میں کبھی سختی

---

[1] غالباً سنہ ۱۹۴۲ء میں [2] اور آج تک وہ نظم ناتمام پڑی ہوئی ہے نہ جانے اسکو تمام بھی کر سکوں گا یا ناتمام ہی چھوڑ کر سدھار جاؤں گا [3] پہلے بھیا تھا اب بوڑھا کھوسٹ ہوں۔

کی ہے۔ تم سے کبھی بیگار لیا ہے۔ اور جب ماتا دین نے یہ تمام سوالات کیئے تو ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں "ناہیں۔ ناہیں۔ کبھو ناہیں۔ (نہیں نہیں۔ کبھی نہیں) منجھلے بھیا کی جے۔ منجھلے بھیا کا راج بنا رہے گنگا دھار تک (جب تک گنگا میں پانی ہے) پھر بیوی نے کہا ماتا دین پوچھو۔ اگر بھیا، باغ لگانے کے لیئے تم لوگوں سے تھوڑی تھوڑی زمین مانگیں تو کیا تم نہیں دوگے؟ ساری رعایا نے یک زبان ہوکر کہا: "دیبا، دیبا، ابھیوں ابھیوں دیبا۔ گلے گلے دیبا (دیں گے، دیں گے۔ ابھی ابھی دیں گے اگلے گلے دیں گے۔

اس کے بعد ماتا دین نے استعفے نکالے اور کاشتکاروں نے دھڑا دھڑ انگوٹھے لگانا شروع کر دیئے۔ اور جب تمام استعفے مکمل ہوگئے، بیوی نے مجھ سے کہا، اب تم ان کا شکریہ ادا کر دو۔ اور جب میں شکریہ ادا کرنے کھڑا ہوا تو تمام کاشتکار رونے لگے "بھیا ہم تو تھری پنہئی ہیں اس نہ کرو۔
(بھیا ہم تو تمھاری جوتی ہیں ایسا نہ کرو)

بیوی نے مٹھائی تقسیم کی، رعایا نے منجھلے بھیا کی جے کے نعرے لگائے اور دو تین مہینے کے اندر آم کے باغ نصب ہوگئے، اور بیوی نہال ہوگئیں۔

میں غالباً ۱۹۴۲ء میں پھر لکھنؤ آکر رہنے لگا یہ سچ ہے کہ ملیح آباد میں بیحد سکون تھا، امانی گنج کے میدان کی خالص ہوائیں تھیں، طلوع و غروب کے مناظر تھے بور کی خوشبو، کوئل کی کو کو اور پپیہے کی پی ہو تھیں۔ اور لکھنے پڑھنے کی فرصت۔

لیکن آدمی، مدنی حیوان ہے۔ شام کو جب لکھنے پڑھنے کے جھاکیہ سے فارغ ہوکر بادہ خواری کی عبادت شروع کرتا تھا، تو شدید تنہائی کے سوا کسی کو شریک نہیں پاتا تھا اور دوستوں کو آنکھیں ڈھونڈنے لگتی تھیں اور چونکہ ؎

زاہد کی نماز ہو کہ مے کش کی شراب
دونوں کا مزا ہے باجماعت ساقی

اپنی تنہائی پر دل اداس ہو جاتا ہے۔

ایک روز اس گھٹن میں پی رہا تھا کہ دل ڈوبنے لگا، یاروں کے چہرے، اور دلداروں کے مکھڑے آنکھوں کے نیچے پھرنے لگے، رباعی کا ایک مصرع زبان پر جاری ہوگیا۔ ع

افسوس شراب پی رہا ہوں تنہا

جی میں آیا کہ قافیے کو "ن" کی شرط لگا کر کہوں، "ن" شرط لگا کر "تنہا" کا "نباہ" بڑا ہی مشکل نظر آیا۔ بہرحال طبیعت پر زور ڈال کر، رباعی کہہ ڈالی۔ آپ بھی سن لیں اور میری جگر کاوی کی داد دیں ؎

افسوس شراب پی رہا ہوں تنہا
غلطاں بسبو، تمام خون فن رہا
ٹھٹھری ہوئی ساغر میں نظر آتی ہے
صہبا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ملیح آباد کی بے احباب شاموں سے تنگ آکر، میں لکھنؤ چلا گیا تھا۔ اور اگلے ہاتھوں اگر یہ بھی بتا دوں کہ آپ کو میری گھٹن کا پورا اندازہ ہو جائے گا کہ اکثر ایسی بھیانک شامیں بھی گزرتی تھیں کہ میرے اقربا، مجھے گھیر لیا کرتے، اپنے دیوانی فوجداری مقدمات کے روح فرسا تذکرے چھیڑ دیتے۔ فوجداری کے وقت دشمن کے حملے کو خالی دے جانے اور اس پر کاری ضرب لگانے کے گُر۔ اور کالے سانپوں سے بچنے کے پینترے بتایا کرتے تھے۔

ایک روز جب میں اپنی بنارسی باغ کے پھاٹک کے سامنے والی کوٹھی میں بیٹھا لکھنؤ کے گورنر کی تقریر ریڈیو پر سُن رہا تھا۔ جس میں اہلِ ہند سے یہ اپیل کی گئی تھی کہ وہ انسانیت کے مستقبل بچانے کی خاطر، جنگِ عظیم میں برطانیہ کی مدد پر کمربستہ ہو جائیں اس وقت میں نے یہ مندرجہ ذیل نظم[1] "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب" کے نام سے پندرہ منٹ کے اندر کہہ ڈالی تھی۔

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج اے سوداگرو — دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو
جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر، بھیڑیا ہے بھیڑیا — بھیڑیئے کو مار دو گولی، پئے امن و بقا
باغِ انسانی میں چلنے ہی پہ ہے بادِ خزاں — آدمیت لے رہی ہے، ہچکیوں پہ ہچکیاں
ہات ہے ہٹلر کا رخشِ خود سری کی باگ پر — تیغ کا پانی چھڑک دو، جرمنی کی آگ پر

۲

سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمھاری اور یہ ذکر — نوعِ انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر
جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے — نوعِ انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے
ہندیوں کے جسم میں کیا روح آزادی نہ تھی؟ — سچ بتاؤ کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی؟

۳

اپنے ظلمِ بے نہایت کا فسانہ یاد ہے؟ — کمپنی کا بھی وہ دورِ مجرمانہ یاد ہے؟
لوٹتے پھرتے تھے تم جب کارواں در کارواں — سر برہنہ پھر رہی تھی، دولتِ ہندوستاں
دستِ کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم! — سرد لاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم!
صنعتِ ہندوستاں پر موت تھی چھائی ہوئی — موت بھی کیسی تمھارے ہات کی لائی ہوئی

---

[1] یہ نظم چونکہ انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں کہی گئی تھی اس لئے اس میں شاعرانہ محاسن کی تلاش نہ کیجئے اور چونکہ یہ نظم ضبط ہو جانے کی بنا پر میرے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہو سکی ہے۔ اس لئے اس کو یہاں درج کر رہا ہوں تاکہ محفوظ ہو جائے۔

اللہ اللہ، کس قدر انصاف کے طالب ہو آج ۔ میر[۱] جعفر کی قسم کیا دشمنِ حق تھا سراج[۲]
وہ اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے؟ یاد ہے جھانسی کی رانی کا زمانا یاد ہے؟
ہجرتِ سلطانِ دہلی کا سماں بھی یاد ہے؟ شیر دل ٹیپو کی خونیں داستاں بھی یاد ہے؟
تیسرے فاقے میں اک گرتے ہوئے کو تھامنے کن کے سر لائے تھے تم شاہ ظفر کے سامنے[۳]
یاد تو ہوگی، وہ مٹیا برج کی بھی داستاں؟ اب بھی، جس کی خاک سے رہ رہ کے اٹھتا ہے دھواں
تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہوگا بارہا؟ آج بھی آتی ہے جس سے ہائے اختر[۵] کی صدا
سچ کہو، کیا حافظے میں ہے وہ ظلمِ بے پناہ آج تک رنگون میں، اک قبر ہے جس کی گواہ[۶]
ذہن میں ہوگا یہ تازہ ہندیوں کا داغ بھی یاد تو ہوگا تمہیں جلیان والا باغ بھی؟
پوچھ لو، اس سے تمہارا نام کیوں تابندہ ہے ڈائر[۷] "گرگ دہن آلود"، اب بھی زندہ ہے
وہ بھگت سنگھ اب بھی جس کے غم میں دل ناشاد ہے اس کی گردن میں جو ڈالا تھا، وہ پھندا یاد ہے
ہند کے رہبر رہا کرتے تھے کس ہنجار سے پوچھ لو یہ قید خانوں کے در و دیوار سے
اب بھی ہے محفوظ جس میں طنطنہ سرکار کا آج بھی گونجی ہوئی ہے جن میں کوڑوں کی صدا
آج کشتی فلک کے اوج پہ کیوں ہوں کیوں؟ سخت حیراں ہوں کہ اب تم درسِ حق دیتے ہو کیوں
اہلِ قوت دامِ حق میں تو کبھی آتے نہیں آدمیت کو، کبھی خاطر ہی میں لاتے نہیں

(۶)

لیکن آج اخلاق کی تلقین فرماتے ہو تم! ہو نہ ہو۔ اپنے میں اب قوت نہیں پاتے ہو تم!
اہلِ حق روشن نظر ہیں۔ اہلِ باطل کور ہیں یہ تو ہیں اقوال ان قوموں کے جو کمزور ہیں
آج، شاید، منزلِ قوت میں تم رہتے نہیں جس کی لاٹھی اس کی بھینس اب کس لئے کہتے نہیں
کیا کہا؟ انصاف ہے انساں کا فرضِ اولیں کیا فتالِ ظلم کا اب تم میں کس باقی نہیں

(۷)

دیر سے بیٹھے ہو نخلِ راستی کی چھاؤں میں کیا، خدانا کردہ، کچھ موچ آ گئی ہے پاؤں میں
گونج ٹاپوں کی نہ آبادی، نہ ویرانے میں ہے خیر تو ہے۔ اسپ تازی، کیا شفاخانے میں ہے

---

[۱] ہندوستان کا رہ سیاہ غدار جیسے غداروں کی ہندوستان میں کبھی کمی نہیں رہی [۲] نواب سراج الدولہ بہادر جو ہندوستان کا سپوت تھا۔ [۳] خونی دروازے میں شاہزادوں کے سر کاٹ کر ان کے باپ حضرت ظفر کے سامنے خوان میں رکھ کر لائے گئے تھے [۴] کلکتے کی وہ عمارت جس میں حضرت واجد علی شاہ کو قید کیا گیا تھا [۵] حضرت واجد علی شاہ کا تخلص [۶] حضرت ظفر کو رنگون میں قید اور دفن کیا گیا تھا [۷] پنجاب کا ایک باغ جہاں شرخوار جنرل ڈائر نے صدہا محبانِ وطن کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

آج کل تو ہر نظر میں رحم کا انداز ہے — پھر طبیعت کیا نصیب دشمناں ناساز ہے
بس کیا اکڑی کہ حق کے نام پر مرنے لگے — نوعِ انساں کی ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے
ظلم بھولے، راگنی انصاف کی گانے لگے — لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلانے لگے
مجرموں کے واسطے زیبا نہیں یہ شور و شین — کل یزید و شمر تھے اور آج بنتے ہو حسین ؑ
خیر اے سوداگرو اب ہے تو بس اس بات میں — وقت کے فرمان کے آگے جھکا دو گردنیں
اک کہانی۔ وقت لکھے گا نئے مضمون کی — جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی
وقت کا فرمان اپنا رخ بدل سکتا نہیں — موت ٹل سکتی ہے یہ فرمان ٹل سکتا نہیں

اس نظم کا چھپنا تھا کہ آگ لگ گئی طلاب اور عامۃ الناس جلوس بنا بنا کر نکلنے اور گلی گلی اسے گاتے پھرنے لگے، آگے آگے وہ لوگ ہوتے تھے اور پیچھے پولیس[1]۔

میری یہ نظم جب برلن ریڈیو سے براڈ کاسٹ ہوئی تو میری شدید نگرانی ہونے لگی اور میری کوٹھی سے ملی ہوئی دوسری کوٹھی میں ایک سی آئی ڈی انسپکٹر صاحب میری شبانہ روز نگرانی کے واسطے

---

[1] جن لوگوں نے یہ نظم پڑھی وہ گرفتار کر لیے گئے لیکن مجھ پر ہاتھ نہیں ڈالا گیا۔ انگریز زمانے میں پھونسا تھا کہ ہیج بہادر پیر دفعہ یہ میری گرفتاری رکوا دی تھی کہ اگر میری پکڑ دھکڑ ہو گئی تو میں سیاست کے میدان کا عملی آدمی بن کر بہت خطرناک ہو جاؤں گا۔ معلوم نہیں یہ خبر جھوٹی تھی یا سچ مگر یہ واقعہ ہے کہ میری گرفتاری عمل میں نہیں آئی یہ بھی ممکن ہے کی انگریزی قوم کی شرافت نے میری گرفتاری کی اجازت نہ دی ہو۔ انگریز محبانِ وطن کی دل سے قدر کرتا تھا یہ اور بات ہے کہ بحکم سیاست اس کو سختی اختیار کرنا پڑی تھی، حکمران کی حیثیت سے انگریز کمینہ لیکن من حیث القوم شریف تھا اور اس کے سینہ میں اس قدر چوڑائی تھی کہ اپنے خلاف بات سن کر مشتعل نہیں ہو جاتا تھا لیکن میری قوم چوں کہ ذہنی اعتبار سے ایک چھوٹی قوم ہے یہ اپنے خلاف آواز سن کر تلا میں مارنے لگتی اور کف در دہاں ہو جاتی ہے۔

کسی انگریز فلسفی نے لکھا تھا کہ دو ڈھائی سو سال کی ذہنی ورزش کے بعد ہم نے اس اعلیٰ شرف کو پا لیا ہے کہ جب کوئی ہم کو برا کہتا ہے تو ہم برا نہیں مانتے ٹھنڈے دل سے غور کرتے ہیں کہ وہ برائی ہم میں ہے کہ نہیں ہوتی ہے تو ہم اس کو دور کرنے کی سعی کرتے ہیں نہیں ہوتی تو ہم اپنے برا کہنے والے کو سمجھانے کی حد کوشش کرتے ہیں لیکن اس کی عداوت کو دل میں جگہ نہیں دیتے۔ [2] میں ان ہیڈ کانسٹبل صاحب سے بخوبی واقف تھا ہزاروں بار میں

بقیہ اگلے صفحہ پر

اُگر رہنے لگے۔ ایک دن سہ پہر کے وقت پولیس نے میری کوٹھی پر دھاوا بول دیا اور ایک ہندو انسپکٹر کی سرکردگی میں دس پندرہ کانسٹبل آدھمکے میری خانہ تلاشی کے لیے اور کھڑے ہو گئے برآمدے میں اور انسپکٹر صاحب کمرے تک آ گئے۔ انسپکٹر سے میں نے کہا جناب میرا گھر کھلا ہوا ہے آپ شوق سے ایک ایک گوشہ چھان ڈالیں اس پر انسپکٹر نے سرگوشی کے انداز میں کہا میں آپ کو ایسی عمدہ نظم کی مبارکباد دیتا ہوں میں آپ کے گھر کی تلاشی نہیں لوں گا صرف ضابطہ کی خانہ پُری کر کے چلا جاؤں گا۔ میں نے کہا پولیس میں رہ کر آپ اس قدر شریف ہیں۔ بڑے تعجب کی بات ہے۔ اس نے کہا: میں اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے مجبوراً نوکری کرتا ہوں مگر میں نے ضمیر نہیں بیچا ہے میرا دل آپ لوگوں کے ساتھ ہے۔ یہ کہہ کر وہ ایک میز پر سر جھکا کر ضابطے کی خانہ پُری کے واسطے کچھ لکھنے لگا انسپکٹر کی مشغولیت سے فائدہ اٹھا کر ایک مسلمان ہیڈ کانسٹبل صاحب نے میری ماتمی زنجیر[1] اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لی۔ چوری انہوں نے کی میں نے شرما کر سر جھکا لیا۔

اور جب ضابطہ کی کارروائی مکمل کر کے وہ انسپکٹر صاحب رخصت ہونے لگے تو میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ہندو کی شرافت اور مسلمان کی کمینگی دیکھ کر مجھ کو دانتوں پسینہ آ گیا۔

کوئی حد ہی نہیں اس احترامِ آدمیت کی
بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں

اس کے بعد میں نے اس واقعے پر ایک نظم کہہ کر چھپوا دی۔ جو چھپتے ہی ضبط کر لی گئی چونکہ وہ نظم بھی میرے کسی مجموعے میں طبع نہیں ہوئی ہے اس لئے اُسے بھی نقل کئے دیتا ہوں کہ محفوظ ہو رہے۔

جس سے امیدیں ہیں بجلی آگ ارمانوں میں ہے
اے حکومت کیا وہ شے اس میز کے خانوں میں ہے
بند پانی میں سفینہ کھے رہی ہے کس لئے
تو مرے گھر کی تلاشی لے رہی ہے کس لئے؟
گھر میں درویشوں کے کیا رکھا ہوا ہے اے بدنہاد
آ مرے دل کی تلاشی لے کہ بر آئے مراد!

---

[1] مجالس عزا میں انہیں تجبیں بار بار کر روتے اور ماتم کرتے دیکھا تھا وہ حسین کے محب یعنی حق کے پرستار تھے اور اس کے باوجود ان کو میری گھڑی چراتے وقت شرم نہیں آئی۔ حکومت فرنگی کے دور میں اس کی حکومت کے خلاف نظمیں اور مضامین چھپ سکتے تھے اور اخباروں کی ضمانتیں بالعموم ضبط نہیں ہوا کرتی تھیں۔

جس کے اندر وحشتیں پرہول طوفانوں کی ہیں — جس میں غلطاں آندھیاں اندھے بیابانوں کی ہیں
جس کے اندر ناگ ہیں اے دشمنِ ہندوستاں — شیر، جس میں ہونکتے ہیں کوندتی ہیں بجلیاں
پھوٹتی ہیں جس سے نبضیں افرادِ رنگ کی — جس میں ہے گونجی ہوئی آوازِ طبلِ جنگ کی
جس کے اندر آگ ہے دنیا پہ چھا جائے وہ آگ — نارِ دوزخ کو پسینہ جس سے آ جائے وہ آگ
موت جس میں دیکھتی ہے منھ اس آئینے کو دیکھو — میرے گھر کو دیکھتی کیا ہے مرے سینے کو دیکھ

اس واقعہ کے بعد میں نے آغائی صاحب کے امام باڑے میں ایک مسدس پڑھا حسین اور انقلاب کے نام سے۔

"حسین اور انقلاب" سننے کے لئے پورا ادبی لکھنؤ ٹوٹ پڑا تھا، امام باڑے میں تل دھرنے کی بھی جگہ باقی نہ تھی لکھنؤ کے تمام شعراء تمام اساتذہ، یہاں تک کہ مولانا صفی بھی تشریف لائے اور اس مجلس میں فقط شیعہ ہی نہیں اہل سنت اور ہندو بھی شریک ہوئے تھے۔

چونکہ اس مسدس میں آہ و فغاں پر زور دینے کے بدلے، ایثار اور کردار حسین پر عمل کرنے کی بالکل پہلی بار ترغیب دی گئی تھی، اس لئے ارباب مجلس نے بالعموم، اور اعیان سیاست نے بالخصوص بار بار کھڑے ہو کر، اس جوش و خروش سے داد دی تھی کہ ان کی آوازوں کے تھپیڑوں سے منبر میں جنبش پیدا ہو گئی ــــــ اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سامعین اپنے اپنے تہ بند پھاڑ کر میدان جنگ میں کود پڑیں گے

لہ یوں تو میرے دل میں یہ بات مدتوں سے کھٹکتی رہتی تھی کہ حسینیت کی سی دولت کے علمبردار شہادت حسین پر تو آنسو بہاتے، لیکن عزیمت حسین سے جی چراتے ہیں اور یہ انوکھی بات بھی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ کربلا کا داور عشر یعنی اعظم کا سا غیور سورما جس قوم کا ہیرو ہو وہ قوم باطل پرستی و بزدلی کا صید زبوں کیونکر بن گئی اور اس نے اس ننگ کے برداشت کر لینے پر اپنے کو، کس طرح آمادہ کر لیا کہ وہ باطل بنیاد فرنگی کے آگے سربسجود ہو جائے۔

لیکن مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانے میں میرے اس شعلے کو، ایک آئی سی ایس مستشرق انگریز نے جو بورڈ آف ریونیو کا صدر تھا، شعلہ جوالہ میں تبدیل کر کے "حسین و انقلاب" کہنے پر مجھ کو آمادہ کر دیا تھا اور آپ بھی سن لیں کہ محرم کی پہلی تاریخ کو جب میں اس سے ملنے گیا تھا اس نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ تاریخ اسلام میں حسین ایک ایسا منارہ حق ہے کہ اگر ہندوستان کے صرف مٹھی بھر شیعہ اپنے ہیرو کی اسپرٹ کو جذب کر کے اس کے راستے پر گامزن ہو جائیں

حکومت کے کان تک یہ غلغلہ پہنچا تو اس نے شیعہ خاں صاحبوں خاں بہادروں اور سروں، کو طلب کر کے یہ ہدایت کی کہ وہ کوئی ایسی تدبیر نکالیں کہ اس مسدس کا اثر زائل ہو جائے۔ اپنے آقا کا حکم سن کر انہوں نے مشورہ کیا، اور مشورے کے بعد وہ تمام حسین کے پرستار، یزید کی حمایت پر تیار ہو کر لکھنؤ کے سب سے بڑے مجتہد سید ناصر حسین صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ان سے یہ کہا کہ ارباب مجلس نے بالعموم اور بانی مجلس، حکیم صاحب عالم صاحب نے بالخصوص، ہمارے دین کی زبردست توہین کی ہے اور منبر حسین پر جوش صاحب کے سے علانیہ بادہ خوار کو بٹھا کر تذلیل کا بھی ارتکاب کیا ہے اس لئے آپ اس مجلس کے باطل ہونے کا فتویٰ صادر فرمادیں۔

قبلہ و کعبہ نے مجھے بلا بھیجا، مجھے دیکھتے ہی ان تمام سرکار پرستوں کے چہروں پر حیرانی کی ایک لہر دوڑ گئی ——— اور چائے نوشی کے بعد قبلہ و کعبہ نے اپنے بائیں طرف مصلے بچھوا کر جب مجھ سے یہ ارشاد فرمایا کہ جوش صاحب زحمت نہ ہو تو آپ میرے مصلے پر بیٹھ کر اپنا وہ مسدس سنا دیں جو آپ نے آغائی صاحب کے امام باڑے میں پڑھا تھا تو حکومت کے ایجنٹوں کی صفوں میں ایک کھلبلی اور بوکھلاہٹ پیدا ہو گئی، اور جب میں قبلہ و کعبہ کے نعرہ ہائے تحسین کی گونج میں وہ مسدس پڑھ کر، اپنی جگہ واپس آگیا تو انہوں نے سرکار پرستوں کی ٹولی کی طرف دیکھ کر یہ ارشاد فرمایا کہ آپ حضرات نے یہ حدیث مبارک کہ لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ، تو ضرور سنی ہو گی جس کے یہ معنی ہیں کہ جب تم سکر میں ہو تو نماز کے قریب نہ پھٹکو، اور اس سے یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ پینے والوں کو ہوش کے عالم میں، نماز پڑھنے سے روکا نہیں گیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر کوئی شخص نشے کے عالم میں نہیں ہے تو وہ منبر حسین پر بھی بیٹھ سکتا اور مسجد میں داخل ہو کر نماز بھی پڑھ سکتا ہے۔

یہ سنتے ہی سرکار پرستوں کا رنگ فق ہو گیا، اور میں سمجھ گیا کہ دراصل معاملہ کیا تھا میرے اس مسدس کا انگریزی میں ترجمہ ہو کر، جب مسٹر مارشؔ[1] میٹر گورنر کے ملاحظہ سے گزرا تو انہوں نے مجھے بلا بھیجا بڑی شفقت سے پیش آئے، اور کہا اس سے پیشتر، جب میں نے آپ کی نظم، "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندان سے خطاب" کا ترجمہ پڑھا تھا، میری آنکھیں شرم سے جھک گئی تھیں،

---

[1] مسٹر مارش، میرے باپ کے دوست، مجرموں کے دشمن، بے آسرا لوگوں کے مددگار اور اپنی آدھی تنخواہ محتاجوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے اگر حکومت مسٹر مارش کے سے شریف حکام سے کام لیتی تو ابھی برسوں اور حکومت کر سکتی تھی۔

اور اب جب میں نے آپ کی نظم "حسین اور انقلاب" کا ترجمہ بڑھا تو میں نے آپ کے بارے میں یہ رائے قائم کی کہ آپ حق کے پرستار، اور باطل کے دشمن ہیں ـــ اور اب میں آپ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا مسولینی اور ہٹلر دونوں اس وقت یزید کا پارٹ کر رہے ہیں کہ نہیں اور جب میں نے کہا، بے شک آپ سچ کہہ رہے ہیں تو انہوں نے مجھ سے دوسرا سوال کیا کہ اگر میں آپ سے یہ درخواست کروں کہ آپ عصر نو کے ان زندہ یزیدوں کے خلاف آل انڈیا ریڈیو سے ہر ہفتے ایک نظم براڈکاسٹ کرتے رہیں جس کے معاوضے میں برٹش حکومت آپ کو آٹھ سو ماہانہ آنریریم دیا کرے گی تو کیا آپ اس "آفر" دپیش کش کو قبول نہیں کریں گے؟

یہ سن کر میں نے سر جھکا لیا۔ انہوں نے پوچھا کیا بات ہے یہ "تو آپ کی نفاد مزاج سے ہم آہنگ ہے" میں نے کہا۔ مسٹر مارش میں دو وجوہ کی بنا پر آپ کی بڑی عزت کرتا ہوں ایک تو آپ میرے مرحوم باپ کے دوست اور دوسرے آپ غریبوں کے بہت بڑے سرپرست ہیں۔ میں کسی آنریریم کے بغیر آپ کے ارشاد کو مان لیتا مگر کیا کروں اپنے اصول سے مجبور ہوں کانگریس نے اس جنگ میں آپ کا ہاتھ بٹانے کی جو شرطیں پیش کی تھیں آپ کی حکومت نے انھیں نہیں مانا۔ مارش نے میری بات کاٹ کر کہا میں آپ سے حکومت کے تعاون کی درخواست نہیں کر رہا ہوں تو صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ آپ فقط مسولینی اور ہٹلر کو بے نقاب کرتے رہیں۔ میں نے کہا۔ اگر میں ایسا کروں گا تو اس کا جو گرانڈ ٹوٹل نکلے گا وہ بالواسطہ آپ کی حکومت کی موافقت پر منتج ہو گا۔

مارش یہ سن کر تھوڑی دیر کے لئے تو خاموش ہو گئے، پھر اپنی عینک کی تال صاف کرتے وہ بڑے ولولے کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ میں سمجھا وہ مجھ پر حملہ کریں گے میں بھی جوابی حملے کے واسطے کھڑا ہو گیا۔

لیکن وہ میرے قریب آئے اور میری پیٹھ ٹھونک کر کہنے لگے "وانڈرفل ینگ مین" (حیرت ناک جوان آدمی) آپ کے انکار نے میرے دل میں آپ کی عزت قائم کر دی آپ اپنے باپ کی مانند بڑے آدمی ہیں۔ آپ کو دیکھ کر میں نے اپنی اس رائے میں تبدیلی کر لی ہے کہ ہندوستان کی زمین کیریکٹر پیدا نہیں کرتی اگر آپ کو کبھی میری ضرورت پڑے یاد کر لیجئے گا، یہ کہہ کر وہ مجھے رخصت کرنے برآمدے تک آئے اور برابر مسکراتے رہے۔

کچھ دن فلمی دُنیا میں

اُمید صاحب آمیٹھوی اور ساغر نظامی کو ساتھ لئے کہ جب میں ایک مشاعرے کی شرکت کے واسطے بمبئی گیا تو اس کے دوسرے ہی دن شام کے وقت شالیمار پکچرز پونا کے مالک احمد صاحب بنے (سید سجاد ظہیر) کے گھر آئے (ہم وہیں ٹھہرے ہوئے تھے) اور ہم دوگوں کا کلام سننے کے بعد وہ بنے میاں کو دوسرے کمرے میں اٹھا کر لے گئے اور دیر تک باتیں کرنے کے بعد جب رخصت ہوگئے تو بنے میاں نے مجھ سے کہا احمد صاحب آپ کو ساغر صاحب کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں آپ دونوں پر کوئی پابندی نہیں ہوگی صرف گانے لکھ دیا کیجئے گا آپ کا معاوضہ گیارہ سو تنگ اور ساغر صاحب کا معاوضہ ساڑھے پانسو تنگ حاضر کیا جائیگا۔ میں نے کہا یہ سرخوشی کا وقت ہے اس وقت ان باتوں کا موقع نہیں کل جواب دوں گا صبح کو ساغر نے مجھ سے کہا اگر آپ یہ شرط لگا دیں گے میرا اور ساغر کا معاوضہ بالکل مساوی ہوگا تو احمد صاحب کی چونکہ یہ تمنا ہے کہ آپ اُن کے وہاں کام کریں اس لئے وہ اس یہ شرط کو قبول کرلیں گے اور میری زندگی بن جائے گی۔ میں نے ساغر کی بات مان لی۔

میں نے بنے سے کہا کہ میری یہ شرط ہے کہ ساغر کو میرے برابر معاوضہ دیا جائے اگر احمد صاحب اُسے قبول نہیں کریں گے تو میں اُن کی یہ پیش کش نامنظور کر دوں گا۔

احمد صاحب نے بادلِ ناخواستہ یہ شرط قبول کرلی اور تھوڑے دن کے بعد ہم لوگ پونے آگئے اور شنکر سیٹھ روڈ کے "دو طاہر بیلیں" میں رہنے لگے۔

پونے کے موسم کا اعتدال وہاں کے مناظر وہاں کی دلفریب صبحیں اور شامیں وہاں کی پابند اوقات برسات اور وہاں کی پہاڑیاں ایسی چیزیں تھیں جن کو آج تک بھلا نہیں سکا ہوں۔

میں نے اپنے دہلی کے رہنے والے پنجابی دوست ملک حبیب احمد اور اپنے دکنی دوست حبیب اللہ رشدی کو بھی شالیمار میں ملازم رکھا دیا تھا، کرشن چندر کو بھی احمد صاحب پونے کھینچ لائے تھے بےچارہ جوانا مرگ شام بیتواری، حمید بٹ مرحوم برج بھوشن اور بھارت بھوشن (ہندی کے شاعر) بھی شالیمار سے وابستہ تھے۔ میرے پرانے فوجی دوست مناں خاں رام پوری

له معاوضہ اچھی طرح یاد نہیں مگر اتنا ضرور ہے کہ ساغر صاحب کا معاوضہ مجھ سے نصف تھا۔

بھی بسلسلہ تبادلہ پونے آچکے تھے اور پونے کے نئے دوست قدوس گھڑی والے اور محمد نصیح بھی ایسے دلچسپ نکلے کہ رات کی اکثر نشستیں اُن کے گھر پر ہوا کرتی تھیں اور ایک اچھی خاصی چنڈال چوکڑی کی صورت نکل آئی تھی۔

اُسی اثناء میں قمر علی[1] صاحب اور سید آفتاب[2] حسین صاحب سے بھی بڑے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ نصیح[3] صاحب کی گردن میں ایک ذرا سا خم تھا اس لئے میں ان کو "مرد کج گردن" کہا کرتا تھا اسی کے ساتھ ساتھ چونکہ وہ تاویلات دقوانی پر بڑی دسترس رکھتے تھے۔ میں نے اُن کو "امیر تاویلات دقوانی" کا خطاب بھی دیدیا تھا۔

وہاں میرے ایک لکھ پتی دوست اور بھی تھے "مولا ڈینا" جو ہمہ وقت شراب پیتے اور لوگوں کی بڑی کشادہ پیشانی کے ساتھ امداد کیا کرتے تھے اور ایک سلسلۂ خاص میں انہوں نے میری اعانت بھی کی تھی۔ جس کو میں فراموش نہیں کر سکوں گا۔

وہیں ساغر صاحب کا مراد آباد کی ایک صاحب زادی سے قلمی معاشقہ بھی چل رہا تھا اور کچھ روز کے بعد وہ صاحب زادی طاہر پیلس میں دلھن بن کر آ گئی تھیں۔

پونے کا ہر دن عید تھا، ہر رات شب برات تھی اور ہر آٹھویں دسویں دن میں بمبئی جا کر کسی کے آستان جمال پر سجدہ ریزی بھی کر آتا تھا لیکن احمد صاحب کی غلط عملی نے دو ڈھائی سال کے اندر وہ سارا طلسم توڑ دیا۔ وہ چپ چپاتے پاکستان کی طرف پرواز کر گئے اور ہم سب لوگوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور وہ سارا کھیل خوش ور خشید، دے دولت مستعجل بود ہو کر رہ گیا۔

پونے کو خیر باد کہہ کر میں بمبئی آ گیا اور نیپنے کے خالی گھر میں رہنے لگا۔ اس گھر کے ایک گوشے میں ممتاز حسین (جو آج کل کراچی کے کسی کالج میں اردو کے استاد ہیں) بھی رہتے تھے جہاں سعیدہ کے بچوں اور ان کے مابین روز کوئی نہ کوئی جھگڑا ہوا کرتا تھا۔ اس لئے کچھ روز کے بعد میں اپنے ایک بے تکلف ملنے والے ماسٹر عبدالعزیز صاحب رام پوری کے دجیکب سرکل والے خالی فلیٹ میں اٹھ آیا تھا۔ اس زمانے میں فلمی بازار ٹھنڈا پڑا ہوا تھا۔ ساغر ہر دوسرے تیسرے دن میرے پاس آتے

---

[1] قمر علی ٹیلرنگ فرم کے مالک اور لکھ پتی انسان تھے [2] آفتاب صاحب ایک لانڈری کے مالک، اور آسودہ حال آدمی تھے کراچی آکر دونوں تباہ ہو چکے ہیں۔ کراچی نے چھوٹوں کو ابھارا اور بڑوں کو دفنا دیا ہے۔ [3] آگے چل کر یہ بات کھل گئی کہ وہ دلچسپ زیادہ اور مخلص بہت کم تھے [4] وہ کہیں بہت دور گئے ہوئے تھے۔

اور ہم ایک دوسرے سے پوچھا کرتے تھے کہ خاں صاحب اب ہوگا کیا۔

پروڈیوسر اس بات پر مُصر تھے کہ جوش صاحب ہمارے اسٹوڈیو میں آئیں گے تو ہم اُن سے گیت لکھائیں گے اور جوش صاحب اس بات پر اڑ گئے تھے کہ وہ ہمارے گھر آنے کا دکھ سہیں گے تو ہم گیت کہیں گے۔

میرے دوست آغا جانی کاشمیری اور خواجہ احمد عباس نے بہت کوشش کی کہ معاملات رہ براہ ہوجائیں مگر کچھ نہ ہو سکا۔ اس کش مکش میں میرا حال بد سے بدتر ہوتا چلا گیا آمدنی کچھ تھی ہی نہیں اور بیوی کے پاس جو کچھ اودھی پونجی تھی وہ بھی دم توڑ رہی تھی۔

میں اُسی عالم میں ایک روز شام کے وقت شغل کر رہا تھا کہ بازار میں یکایک ایک قیامت کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ اور ہر طرف سے "مارو، مارو، مارو" کی آوازیں آنے لگیں۔ میں برآمدے میں جا کر جھانکنے لگا کہ دیکھوں معاملہ کیا ہے کہ اتنے میں کسی نے زور زور سے میرے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ میں نے بھری سوڈے کی بوتل ہاتھ میں لے کر دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھلتے ہی ایک صورت آشنا سندر پڑوسی نے بڑی گھبراہٹ کے ساتھ کہا، مسٹر جوش آپ فوراً یہاں سے کسی مسلم محلے میں چلے جائیں کسی نے مہاتما گاندھی کو گولی مار دی ہے۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ یہ کام کسی مسلمان کا ہے اس لئے فوراً سے چلے جائیے۔ تم بال بچوں اور بوتل جوتل لے کر اپنی بیٹی کی سہیلی رفعت کے مکان میں جو بھنڈی بازار میں تھا چلا گیا۔ اور وہاں پہونچا تو ریڈیو پر جواہر لال کا یہ اعلان سنا کہ مہاتما جی کو ایک ہندو مرہٹے گوڈسے نے گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے۔ اس اعلان نے مسلمانوں کو قتلِ عام سے بچا لیا اگر جواہر اس اعلان میں پانچ منٹ کی بھی تاخیر کر دیتے تو لاکھوں مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا جاتا۔ دوسرے دن میں اپنے فلیٹ میں آگیا اور زندگی فاقہ کو نفر کے سائے میں گذرنے لگی ایک دن میں نے دیکھا میری بیوی اداس بیٹھی ہیں، پوچھا کیا بات ہے کہنے لگیں میرے پاس جو دیا تھا اب وہ سسکیاں بھر رہا ہے جلدی ہی کوئی بسیتا کرو نہیں تو خدانہ کرے دھڑا دھڑ فاقے ہونے لگیں گے، یہ سن کر یہ بات میرے دل میں آئی کہ اب میں اپنی آن توڑ دوں۔ اور قلم کان میں لگا کر "وہ کام گیت لکھنے کا" کے نعرے لگاتا اسٹوڈیوں کی گلیوں میں پھرنا شروع کر دوں۔

کہ جاہا، سپر باید انداختن!

میرے خون میں جب اس ارادے کی دھمک پیدا ہوئی تو میرے سینے کا خوابیدہ شاعر جوش یکایک بیدار ہو گیا اور جامے سے باہر ہو کر کہنے لگا کہ تو اس دنیا دار شیر حن فا کے بہکانے میں آکر، اگر پروڈیوسروں کی طرف جائے گا تو تیری ٹانگیں توڑ کر رکھ دوں گا۔

اپنے غیور شاعر کی یہ گھن گرج سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور بجلی کی لپک کے مانند فوراً ایک تدبیر میری سمجھ میں آ گئی، میں سیدھا بیوی کے پاس گیا اور کہا، اشرف جہاں پانچ دن اور راستہ دیکھو، اگر اس مدت میں کوئی سبیل نہ ہوا تو مجھے تیس چالیس روپے اور یہ کالا کمبل دے دینا بیوی نے کہا اس روپے سے کیا کرو گے اور روپے کے ساتھ یہ کمبل کیوں مانگ رہے ہو۔ میں نے کہا میرے ایک کاروباری ملنے والے ہیں ان کو ساتھ لے جا کر مارکٹ سے ترکاریاں لاؤں گا اور عین اپنے فلیٹ کی دیوار کے نیچے کمبل بچھا کر آلو، گوبھی اور بنڈے بیچنا شروع کر دوں گا۔ میرے باپ کو بنڈے بہت پسند تھے۔ اور ان کے خدام بازار سے بنڈے خرید کر لاتے تھے۔ اب ان کا بیٹا سڑک پر بیٹھ کر بنڈے بیچے گا، اور اول و آخر میں ایک نسبت پیدا ہو جائے گی۔ یہ سنتے ہی بیوی اچھل پڑیں گویا خدا نہ کردہ بجلی کا جھٹکا لگ گیا۔ اُن کی آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو بھر آئے کہنے لگیں ایسا کرو گے تو ناک کٹ جائے گی، میں نے کہا، اشرف جہاں تعلقہ داری کی بو دماغ سے نکال ڈالو، حلال کی روزی کمانے میں کہیں ناک کہیں کٹا کرتی ہیں، ناک تو کٹتی ہے چوری چکاری کرنے، اپنی آن توڑنے اور اسٹوڈیوں کے چکر لگانے سے ___ اور "بفرض محال" اگر اس بات کو بے عزتی مان بھی لیا جائے تو میرے اس طرح سڑک پر بیٹھ کر ترکاری بیچنے سے میری نہیں ہندوستان کی ناک کٹ جائے گی۔

بیوی نے سر سے لے کر پاؤں تک مجھے دیکھا، "اے اللہ تو کہاں جا کر سو گیا ہے" وہ کہا۔ تکیے پر سر رکھ دیا اور بڑی بیکسی کے ساتھ آنکھیں موند لیں۔

بیوی کی اس اُداسی پر میرا دل بھر آیا دوسرے کمرے میں لیٹ کر سو گیا اور خواب دیکھنے لگا کہ میں اپنے فلیٹ کی دیوار کے نیچے سڑک پر کمبل بچھائے ترکاریاں بیچ رہا ہوں اور سامنے سے جنازے گذر رہے ہیں میں پوچھ رہا ہوں کہ یہ جنازے کس کے ہیں لوگ کہہ رہے ہیں تمہارے آباد و اجداد کے۔ جب بیدار ہوا تو دیکھا میرا داماد التفات ایک اخبار لئے آ رہا ہے اس نے اخبار دے کر کہا ۔ ماموں سرکار ہند کو اپنے رسالے "آج کل" کے لئے ایک اڈیٹر کی ضرورت ہے جس کی درخواستیں مانگی گئی ہیں آپ کے واسطے یہ بہترین موقع ہے آپ فوراً درخواست روانہ کر دیں اور پنڈت جواہر لال نہرو کے پاس اُسی درخواست کی نقل بھیج دیں۔ میں نے کہا بیٹا درخواست تم لکھ لاؤ میں دستخط کر دوں ۔ داماد تھوڑی دیر میں درخواست لکھ کر آ گیا اور درخواست دہلی بھیج دی گئی۔

اس واقعے کے دوسرے تیسرے دن حسن اتفاق سے پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام دونوں بمبئی آ گئے۔ میں نے ان کی اس آمد کو وہ سمجھا جس کو عرف عام میں "تائید غیبی" کہتے ہیں اور سیدھا

گورنمنٹ ہاؤس پہونچ گیا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ پنڈت جی اور مولانا کہیں باہر گئے ہوئے ہیں اور وہ ایک گھنٹے میں پلٹ آئیں گے۔

جی میں آیا کنور[1] مہاراج سنگھ سے کیوں نہ مل لوں اور خالی بیٹھ کر انتظار کیوں کروں۔ پرچے پر اپنا نام لکھ کر بھیجا۔ انہوں نے فوراً بلا لیا اور بڑے تپاک سے پیش آئے۔ اور پوچھا خاں صاحب آپ یہاں کہاں۔ میں نے کہا میں تو آج کل دہلی ہی میں رہتا ہوں۔ انہوں نے کہا اور پھر بھی مجھ سے کبھی نہیں ملے۔ میں نے کہا، میں اس وقت پنڈت جی سے ملنے آیا تھا وہ موجود نہیں ہیں اس لئے آپ سے ملنے آ گیا ہوں۔ میں بے سوچے سمجھے یہ کہہ تو گیا مگر فوراً خیال آیا میں نے بڑی بے تکی بات کہی ہے اس کے تو یہ صاف معنی ہیں کہ میں کنور صاحب سے یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر پنڈت جی اس وقت غیر حاضر نہ ہوتے تو میں آپ سے ملنے نہ آتا یہ سوچ کر میرے چہرے پر خجالت کے آثار پیدا ہو گئے مہاراج سنگھ بڑے ذہین آدمی تھے بھانپ گئے اور مسکرا کر کہنے لگے آپ پٹھانوں کی یہی بات تو مجھے بہت اچھی لگتی ہے کہ جو بات آپ کے دل میں ہوتی ہے وہ بے جھٹ سے زبان پر آ جاتی ہے۔ میں نے کہا میں اپنی بد حواسی کی معافی چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا میں جس بات کی، دل سے، قدر کرتا ہوں آپ اسی کی معافی چاہ رہے ہیں ان کے یہ کہتے ہی مولانا آگے آگے اور پنڈت جی پیچھے پیچھے ان کے کمرے میں داخل ہو گئے مولانا نے فقط ہاتھ ملایا اور پنڈت جی لپک کر، میرے گلے لگ گئے اور چھوٹتے ہی پوچھا جوش صاحب آج کل آپ کیا کر رہے ہیں، میں نے کہا پنڈت جی "آج کل" کے واسطے درخواست دے کر اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ پنڈت جی نے مسکرا کر کہا یہ "آج کل" کی الٹ پھیر میری سمجھ میں نہیں آئی۔ مولانا آزاد نے لالی بکھر کر بن کر کہا، معلوم تا ہے کہ جوش صاحب نے ہمارے سرکاری رسالے "آج کل" کا جو اشتہار نکلا ہے اس کی ادارت کے واسطے درخواست دی ہوگی۔ پنڈت جی نے کہا تو پھر سیدھے روز آپ دہلی آ جائیے۔ میں بندوبست کر دوں گا۔

مولانا آزاد نے کہا، پنڈت جی، آپ کو معلوم نہیں، یہ محکمہ سردار پٹیل کا ہے۔ آپ سوچ سمجھ کر جوش صاحب کو دہلی بلائیں۔ پنڈت جی نے کہا، جوش صاحب ہمارے شانے سے شانہ ملا کر رنجش اٹھا چکے ہیں ــــ پٹیل کو بھی یہ بات معلوم ہوگی۔ اور نہیں معلوم ہوگی تو میں ان کو بتا دوں گا، آپ بڑے اطمینان کے ساتھ دہلی آ جائیے۔

---

[1] کنور مہاراج سنگھ اس وقت بمبئی کے گورنر تھے اور میرے پورے خاندان سے ان کو واقفیت تھی

[2] مولانا نے چاند سے پر تعلقات کی وزارت کا نشہ چڑھ چکا تھا اور نہرو وزارت عظمیٰ کا پورا میخانہ خالی کر دینے کے باوجود ہوش میں تھے۔ یہ فرق دیکھ کر مجھے بہت صدمہ ہوا کہ مولانا مجذوب بن چکے ہیں اور پنڈت سالک کے درجہ پر فائز ہیں۔ افسوس کہ مسلمان پر حکومت کا نشہ بہت چڑھ جاتا ہے۔

مژدہ! خار دشت پھر

وہ غالباً ۱۹۳۸ء کا دور تھا کہ میں تہ کاری فروخت کرنے کے ارادے کو فسخ کر کے دہلی پہنچا۔ اسٹیشن سے سیدھا پنڈت جی کے پاس گیا اور انہوں نے سردار پٹیل سے ٹیلی فون پر بات کر کے میری ملازمت کی بات پکی کرلی اور یہ وعدہ بھی کرلیا کہ وہ ریاستوں سے میری پنشنیں بھی مقرر کرادیں گے اور مجھ کو میاں عظیم حسین صاحب کے پاس بھیج دیا جو اُس وقت اطلاعات عامہ کے سکریٹری تھے۔

میاں عظیم حسین واقعی میاں آدمی نکلے ہیں ان کی شرافت سے بے حد متاثر ہوا۔ اثنائے گفتگو میں انہوں نے مجھ سے کہا، تنخواہ آپ کو صرف گیارہ سو ماہانہ ملے گی آپ اس قلیل تنخواہ میں کیوں کر زندگی بسر کر سکیں گے، میں نے کہا، میاں صاحب، پنڈت جی نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ کئی ریاستوں سے میری ادبی پنشن مقرر کرا کے اس قلیل تنخواہ کی خانہ پُری کر دیں گے۔

جب انٹرویو سے پہلے میں نے اس کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں قدم رکھا جہاں، ''آج کل'' کی ادارت کے امیدواروں کا ایک لشکر بیٹھا ہوا تھا تو میری صورت دیکھتے ہی تمام امیدواروں کے چہرے فق ہوگئے اور میرے مقابلے میں اپنی ناکامی کا یقین ان کی آنکھوں میں تیرنے لگا۔ اس بات سے میرے دل کو بہت سخت دھکا پہنچا اور میں سوچنے لگا کاش میں یہاں آکر اتنے بڑے لشکر کی مایوسی کا سبب نہ بنتا اور عرفی کا یہ شعر سر میں گونجنے لگا۔

اے متاعِ درد، در بازارِ جاں، انداختہ
گوہرِ ہر سود، در جیبِ زیاں، انداختہ

اور جب انٹرویو کے کمرے میں داخل ہوا تو یہ دیکھا کہ میاں عظیم حسین اور اجمل خاں کے علاوہ چار پانچ آدمی ایسے بھی وہاں موجود ہیں جن کو میں نہیں جانتا۔ اس کمرے میں بیٹھ کر جب میں نے اپنے پان کی ڈبیا کھولی تو ایک صاحب نے جو صورت کے اعتبار سے مدراسی معلوم ہو رہے تھے مجھ سے انگریزی میں کہا، یہاں پان کھانا آداب کے خلاف ہے میں نے جھلا کر جواب دیا آزاد ہو جانے کے بعد بھی آپ اپنے پرانے آقا کے آداب کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں میں پان کھانے سے باز نہیں آسکتا، پان میرے واسطے ایسا ہی ہے جس طرح سانس لینا آپ اسے پسند نہیں کرتے تو میں انٹرویو سے دست بردار ہو کر باہر چلے جانے پر آمادہ ہوں میں ڈبیا بٹوا اٹھا کر جب اٹھ کھڑا ہوا، تو میاں عظیم حسین اور اجمل خاں نے یہ کہہ کر مجھ کو روک لیا کہ آپ شوق سے پان کھائیں۔

اس کے بعد غالباً اجمل خاں نے کہا جوش صاحب ہم آپ کا انٹرویو کیا ہیں، بس وہ نظم

سنا دیجیئے جو آپ نے نظام کے خلاف کہی تھی۔ میں نے کہا، اجمل خاں جن لوگوں کے دماغوں پر اب تک فرنگی آداب کی مہر لگی ہوئی ہے وہ میری نظم کیا خاک سمجھ سکیں گے۔

اس پر میاں عظیم حسین، اجمل خاں اور ان کے ساتھ کئی اصحاب نے ہم زبان ہو کر کہا جوش صاحب، آپ ہماری طرف دیکھیں اور ہم کو نظم سنائیں۔ ہم سب آپ کے قدر دان ہیں۔ میں نے اس نظم کے چند شعر سنا دیئے اور انٹرویو ختم ہو گیا۔

"آج کل" کی ادارت سنبھالنے کے بعد جب ایک روز پنڈت جی سے ملنے گیا تو انہوں نے پوچھا کہ آپ اپنے محکمے کے وزیر سردار پٹیل سے اب تک ملے کہ نہیں۔ میں نے کہا نہیں اور نہ ملنے کا ارادہ ہی ہے، پنڈت نے پوچھا کیوں۔ میں نے انگریزی میں جواب دیا کہ: "اسلئے کی انکا چہرہ BECAUSE HE HAS GOT A CRIMINAL FACE" (مجرموں کا سا ہے)

یہ سن کر پنڈت جی نے بڑا زبردست قہقہہ لگایا اور پھر مجھ سے کہا۔ نہیں نہیں۔ آپ کو ان سے ضرور مل لینا چاہیئے۔ میں ابھی فون پر آپ کی ملاقات طے کئے لیتا ہوں۔ انہوں نے فون کیا جواب آیا ابھی روانہ کر دیجئے۔ میں ان کی کوٹھی پر پہنچا وہ دھوتی باندھے برآمدے میں کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے بات ملاتے ہی ان سے کہا سردار صاحب مجھے آپ سے ملنے کا ایک خاص وجہ سے بڑا اشتیاق تھا۔ وہ بڑے گھاگ آدمی تھے "خاص وجہ" سن کر بھانپ گئے اور پوچھا آپ کو مجھ سے ملنے کا کیوں اشتیاق تھا۔ میں نے کہا اس لئے کہ میں آپ کی بہت سی برائیاں سن چکا ہوں۔

یہ سن کر وہ مجھے کمرے میں لے گئے، بیٹھتے ہی انہوں نے انگریزی میں کہا، آپ نے یہ سنا ہو گا کہ میں مسلمانوں کا دشمن ہوں۔ آپ جس قدر خوفناک برہنہ گفتار آدمی ہیں اسی قدر میں بھی ہوں، اس لئے آپ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ میں آپ کے سئے اُن تمام مسلمانوں کی بڑی عزت کرتا ہوں جن کے خاندان باہر آکر یہاں آباد ہوگئے ہیں لیکن میں ان مسلمانوں کو پسند نہیں کرتا جن کا تعلق ہندو قوم کے شودروں اور نیچی ذاتوں سے تھا اور مسلمانوں کی حکومت کے اثر میں آکر انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا یہ لوگ دراصل نہایت متعصب، شریر اور فسادی ہیں، اور اقلیت میں ہونے کے باوجود ہندو اکثریت کو دبا کر رکھنا چاہتے ہیں

میں نے کہا، سردار صاحب پہلی بات تو یہ ہے کہ دنیا کے تمام انسان ایک نسل سے ہیں میں ذات پات کا بالکل قائل نہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر آج سے دو تین سو برس کسی کے پردادا کا پردادا چمار تھا تو کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ اس کے چمار پن میں آج تک کوئی تبدیلی نہیں ہو سکی ہے؟ اور وہ آج تک چمار ہی چلا آرہا ہے۔ اس بات کا وہ جواب دینے والے ہی

بیٹھے کہ ان کے سکریٹری نے آکر کہا آپ نے مہاراجہ پٹیالہ کو یہ ٹائم دیا تھا وہ آگئے ہیں۔

سردار کی کوٹھی سے ابھی نکلا تھا کہ مولانا آزاد سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ انہوں نے اپنی موٹر روک کر مجھے آواز دی اور جب میں اپنی موٹر سے اتر کر اُن کی موٹر میں بیٹھ گیا، انہوں نے مجھے بڑے درد انگیز، تیوروں سے دیکھ کر کہا، جوش صاحب آپ اور سردار پٹیل، میں نے سر جھکا لیا اور انھوں نے یہ شعر پڑھا۔

عنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

مولانا آزاد تو یہ شعر پڑھ کر چلے گئے، لیکن میرے دل کا عجیب عالم ہوگیا۔ میں سوچنے لگا کہ ہم نے اپنے ملک کو اتنی قربانیاں دے کر کیا یہ دن دیکھنے کے لئے آزاد کرایا تھا کہ انگریز کے جاتے ہی اردو کا بیڑا غرق ہو جائے اور مسلمانوں کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ کان میں ریاست دیتا کے وزیر اعظم قاضی عزیز الدین کی آواز آئی کہ جوش صاحب ہم نہ کہتے تھے کہ ہندوستان آزاد ہوگیا تو ہندو مسلمانوں کو تہ تیغ کر ڈالیں گے؟ اسی کے ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ پاکستان بنانے والے نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ جو مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں گے ان کا حشر کیا ہوگا وہ ایک ایک مسلمان کو پاکستان کیوں نہیں لے گئے پھر میں نے اپنے کو اس امید سے تسلی دی کہ نفرت کی عمر زیادہ نہیں ہوتی، چار دن میں یہ تعصبات ختم ہو جائیں گے اور سوشلسٹ حکومت آجائے گی اور پھر یہ ساری تفریقیں فنا ہو کر رہ جائیں گی۔ (دینی) برادری ختم ہو کر، انسانی برادری کے دور کا آغاز ہو جائے گا۔

یہ ایک شب کی تڑپ ہے، سحر تو ہونے دو
بہشت سر پہ لئے، روزگار گزرے گا
فضا کے دل میں پر افشاں ہے آرزوئے غبار
ضرور ادھر سے کوئی شہ سوار گزرے گا

۱۹۵۵ء میں جب بسلسلۂ شرکت مشاعرہ، تیسری بار میں پاکستان آیا تو ہرچند اس سے پیشتر بھی میرے دیرینہ دوست سید ابو طالب صاحب نقوی (چیف کمشنر کراچی) مجھ کو پاکستان آجانے کی دعوت دے چکے تھے۔ لیکن اس مرتبہ تو وہ پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئے کہ میں پاکستان چلا آؤں۔

میں پاکستان آنے پر بالکل تیار نہیں تھا لیکن صاف انکار نہیں کیا کہ نقوی کا دل نہ ٹوٹ جائے اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میں اس مسئلے پر غور کروں گا۔

اسی اثناء میں انہوں نے اپنے گھر پر مجلس کی تمام اکابر شہر کے ساتھ اسکندر مرزا صاحب کو بھی بلایا اور سب کو میرا مسدس "حسین و انقلاب" سنوایا، اور ان تمام اکابر نے جن میں اسکندر مرزا بھی شامل تھے مجھ سے اصرار کیا کہ میں پاکستان کا باشندہ بن جاؤں ان کی دعوت پر ہر چند میں نے اپنے دل میں تو یہ کہا کہ خدا کی قسم، میں ایسا ہرگز نہیں[1] کروں گا، لیکن زبان سے یہ کہا میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ اب نقوی کا یہ تکیہ کلام ہو گیا کہ جوش صاحب آخر آپ کب تک سوچیں گے۔ تو میں پریشان ہو گیا آخر میں کب تک ٹالتا اور بے دودھ کا بچہ بالتا رہوں گا۔

اسی دوران میں ایک روز وہ میٹرو پول آ گئے اور مجھ سے کہا سارے کام چھوڑ کر آج آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ آپ سے پاکستان آجانے کا اقرار لے کر دم لوں۔

میں نے کہا، نقوی صاحب آپ جانتے ہیں کہ مجھ کو آپ سے کس قدر محبت ہے اگر آپ میری جان تک مانگیں تو حاضر کر دوں۔ لیکن نقوی صاحب نے کہا دیکھئے، "لیکن" کے بعد انکار نہ کر دیجئے گا۔ میں چپ ہو گیا۔ وہ اپنا صوفہ چھوڑ کر میرے صوفے پر آ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے فرمایئے آپ پاکستان کب آ رہے ہیں؟ اب جی اکڑا (اور آنکھیں نیچی کر کے) میں نے کہا نقوی صاحب، جب تک کہ پنڈت جواہر لال نہرو زندہ ہیں، میں پاکستان کیوں کر آ سکتا ہوں۔

انہوں نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا، اور نہرو کے بعد کیا ہو گا یہ بھی کبھی سوچا ہے؟ میں نے کہا خدا نہ کرے کہ میں اُن کے بعد زندہ رہوں۔ انہوں نے کہا شاعر کی یہ بڑی بدبختی ہے کہ وہ زندگی کے سنجیدہ مسائل کو بھی جذبات کی ترازو میں تولا کرتا ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر نہرو صاحب آپ کی زندگی ہی میں سدھار گئے، تو پھر ہندوستان میں آپ کا چاہنے والا کون رہ جائے گا۔ آپ کی یہ نوکری آپ کی یہ فراغت و عزت کیا اُن کے بعد ختم نہیں ہو جائے گی؟ اور تھوڑی دیر کے واسطے یہ بھی فرض کر لیجئے کہ پنڈت نہرو کے بعد بھی ہندوستان آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائے رہے گا لیکن یہ بھی تو سوچئے کہ خدا نخواستہ آپ کے بعد وہاں آپ کے بچوں کا کیا حشر ہو گا؟ دیکھئے جوش صاحب، آپ کے بعد ہندوستان میں آپ کے بچے دربدر مارے پھریں گے اور ایک متنفس بھی ان کے سر پر ہاتھ نہیں رکھے گا۔۔۔ یہاں تک تو معاشی پہلو پر میں بات کر رہا تھا۔ اب ذرا تہذیبی پہلو پر بھی نگاہ ڈالئے یہ اس سے بھی زیادہ جان لیوا ثابت ہو گا۔ جوش صاحب آپ کے بچے اردو بھول جائیں گے، ہندی ان کا اوڑھنا بچھونا ہو گی۔ وہ آپ کے کلام کا ترجمہ ہندی میں پڑھیں گے اور تہذیبی روایتی اور

---

[1] میں جس وقت دل ہی دل میں پاکستان نہ آنے کی قسم کھا رہا تھا اس وقت فرمان روزگار مجھ پر مسکرا رہا تھا۔

ثقافتی اعتبار سے آپ کی پوری نسل میں اس قدر زبردست و عبرتناک تبدیلی پیدا ہو جائے گی کہ آپ سے اس کا کسی نوعیت کا بھی تعلق باقی نہیں رہ جائے گا، کیا یہ عظیم لسانی، مزاجی اور روایتی بربادی آپ کو منظور ہے؟ اور اگر آپ یہاں نہ آگئے تو کیا اس کے یہ معنی نہیں ہونگے کہ آپ اپنی وقتی فراغت و عزت کی قربان گاہ پر اپنے پورے خاندان کو بھینٹ چڑھا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

ان کی اس طویل، جذباتی و منطقی تقریر نے میرا دل ہلا دیا اور میری آنکھیں کھول دیں اور میں سوچنے لگا کہ میرے بعد، یہ میرے نازوں کے پلے بچے اور میری یہ شاہانہ مزاج رکھنے والی بیوی کیا کرے گی۔ نقوی صاحب سے میں نے کہا آپ نے مجھ کو جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ بے شک میری آل اولاد ہندوستان میں پنپ نہیں سکے گی۔ نقوی صاحب، مجھ کو بیس گھنٹے اور دے دیجئے کہ میں اس مسئلہ پر ایک بار اور غور کر لوں، کل اسی وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا آخری فیصلہ سنا دوں گا۔

نقوی صاحب کے چلے جانے کے بعد میں نے ناصر احمد خاں سے کہا تم نے سن لی نقوی صاحب کی ساری تقریر، اب کیا کہتے ہو، ناصر نے کہا۔ مجھ کو ان کے ایک ایک حرف سے اتفاق ہے۔ اگر آپ یہاں منتقل نہ ہوئے تو زندگی بھر پچھتائیں گے۔ یہ کہتے ہی ناصر میرے قریب آکر بیٹھ گئے اور بڑے درد کے ساتھ انگشت شہادت بلند کر کے کہنے لگے خاں صاحب آپ کئی پشتوں سے ملیح آباد پر حکومت کرتے چلے آرہے ہیں، آپ کی رعایا آپ کے سامنے تھراتی اور جھک جھک کر سلام کرتی ہے کل اسی دو کوڑی رعایا کے بچے، آپ کے بچوں پر حکومت کریں گے، ان کو دھوتیاں بندھوائیں گے اور ان کے سروں پر جوتیاں رکھوائیں گے۔ اللہ کرے یہ دن دیکھنے سے پیشتر ہم مرجائیں

صبح اٹھ کر میں نے اس مسئلے پر دوبارہ غور کیا تھا دھو کر نقوی صاحب کے پاس گیا، اور ان سے کہہ دیا کہ اب میں ہجرت پر تیار ہو گیا ہوں، یہ سنتے ہی نقوی کی باچھیں کھل گئیں، دوڑ کر مجھے گلے لگایا اور اسوقت ڈپٹی کمشنر کو طلب کر کے حکم دیا کہ جہانگیر روڈ پر جو ایک بہت بڑا پلاٹ خالی پڑا ہی اسکو جوش صاحب کے نام الاٹ کر دیجئے اس پر ان کا سینما ہال اور مکان تعمیر کیا جائیگا۔ اور فلاں مقام پر پچاس ایکڑ زمین بھی جوش صاحب کو الاٹ کر دیجئے وہاں انکا باغ نصب کیا جائے گا۔

لہ ناصر احمد ملیح آبادی، میرے قرابت داروں میں سے ہیں، وہ مجھ سے پہلے ہی پاکستان چلے آئے تھے اور جب سے میں آیا تھا، وہ ہر وقت میرے ہی ساتھ رہتے تھے لیکن اب اس خطا پر کہ ان کی ایک مصیبت کے وقت میں نے ان کا ہاتھ بٹایا تھا، انہوں نے مجھ سے ملنا جلنا ترک فرما دیا ہے اور ایک اور کار آمد کام نکلا ہم سے ایک اور ہوا دشمن جانی پیدا۔

جب اُن کے حکم کی تعمیل ہوگئی تو دونوں زمینوں پر مجھ کو قبضہ دے دیا گیا اور میرے چوکیدار جھونپڑیاں ڈال کر وہاں رہنے لگے۔

اور جب تمام لکھا پڑھی مکمل ہو گئی۔ نقوی صاحب نے کہا آپ دہلی جا کر ایمرجنسی سرٹیفکیٹ پر اپنے بال بچوں کو یہاں لے آئیں۔ آپ کے آتے ہی سینما کی تعمیر کا کام شروع کرادوں گا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے سکریٹری ربانی صاحب کو بلا کر میرے مکان کی تلاش کے لئے کہا۔ ربانی صاحب نے سندھ مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی میں ایک اچھی سی کوٹھی میرے حوالے کردی اور میں دہلی پر واز کر گیا۔

دہلی پہنچا۔ معلوم ہوا پنڈت جی باہر گئے ہوئے ہیں دو تین دن میں آئیں گے۔ سیدھا مولانا کے پاس گیا۔ مولانا کسی اخبار میں یہ پڑھ چکے تھے کہ ہندوستان کے ایک شاعر پر پاکستان ڈورے ڈال رہا ہے۔ میں نے کہا جی ہاں مولانا میں وہی شاعر ہوں اس کے بعد میں نے اپنی ساری روداد بیان کردی، نقوی صاحب کی تقریر کے ایک ایک لفظ کو دہرا دیا اور پھران سے پوچھا اب آپ کی کیا رائے ہے مولانا؟

انہوں نے چند سوال کر کے جب معاملے کے ہر پہلو کو سمجھ لیا تو کہا آپ کا ہجرت کر جانا ہر چند ہمارے واسطے پشیمانی و سرگردانی کا باعث ہوگا و سرگردانی کا باعث ہوگا لیکن جہاں تک کہ آپ کے خانوادے کے مستقبل کا سوال ہے، میری رائے ہے کہ آپ ہجرت کر جائیں۔ نقوی نے یہ سچ کہا ہے کہ ہجرت کے بعد آپ کا یہاں کوئی پوچھنے والا نہیں رہے گا، آپ تو آپ خود مجھے کوئی نہیں پوچھے گا۔

میں ہر معاملے کو منطقی طور پر دیکھنے کا خوگر ہوں، لیکن جواہر لال شدید جذباتی آدمی ہیں۔ وہ آپ کی ہجرت پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوں گے۔

تیسرے دن یہ سن کر کہ پنڈت جی آج آ رہے ہیں، میں پالم کے ہوائی اڈے پر پہنچ گیا وہ اُترے انہوں نے چھوٹتے ہی مجھ سے کہا غالباً آپ ہی وہ شاعر ہیں جس پر پاکستان ڈورے ڈال رہا ہے۔

تو میں نے اُن سے کہا مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کہنا ہے اور آج ہی۔ انہوں نے کہا تو پھر ابھی میرے ساتھ چلیئے اور جب ان کے گھر آکر میں نے اپنا کل ماجرا بیان کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ مولانا آزاد کی اس باب میں کیا رائے ہے تو ان کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نمایاں ہوگئے۔ اور کہا جوش صاحب آپ نے مجھ کو بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے اور میرا یہ خیال ہے کہ اگر ہندو کی تنگ

لہ نام یاد نہیں رہا اُس مقام کا۔

دلانہ حب الوطنی، یہ صورت حال نہ پیدا کر دیتی تو آپ کے دل میں ترک وطن کا کبھی خیال پیدا ہی نہ ہوتا لیکن یہ معاملہ بہت نازک ہے، مجھے سوچنے کے لئے دو دن کا وقت دیجئے میں خود بھی غور کروں گا اور مولانا سے بھی رائے لوں گا۔

دو دن کے بعد جب پہنچا تو نظر اٹھاتے ہی میں نے اُن کے دل موہ لینے والے چہرے پر اُس قسم کی شگفتگی دیکھی جو کسی ذہنی گرہ کے سلجھا لینے کے بعد پیدا ہوا کرتی ہے۔ انہوں نے بڑی بشاشت کے ساتھ نگاہ اٹھائی شیریں تبسم لبوں پر مچلنے لگا اور انہوں نے کہا جوش صاحب میں نے آپ کے معاملے کا ایک ایسا اچھا حل نکال لیا ہے جسے آپ بھی پسند کریں گے، کیوں صاحب یہی بات ہے نا کہ آپ اپنے بچوں کے معاشی و تہذیبی مستقبل کو سنوارنے اور اردو زبان کی خدمت کرنے کے واسطے پاکستان جانا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا جی ہاں اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہے انہوں نے کہا تو پھر آپ ایسا کریں کہ اپنے بچوں کو پاکستانی بنا دیں۔ لیکن آپ یہیں رہیں اور ہر سال پورے چار مہینے آپ پاکستان میں قیام کر کے اردو کی خدمت کر آیا کریں۔ سرکار ہند آپ کو پوری تنخواہ پر ہر سال چار مہینے کی رخصت دے دیا کرے گی۔

پنڈت جی کی اس تجویز پر میں اچھل پڑا۔ میں نے کہا، یہ تجویز مجھے دل سے منظور ہے اس طرح سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔ پنڈت جی میری منظوری سے بے حد بشاش ہو کر میرے گلے لگ گئے۔ حوریاں رقص کناں، ساغر و پیمانہ زدند!

دوسرے ہی دن اخبار والوں نے مجھ کو گھیر لیا میں نے وہ تمام معاملہ جو میرے اور پنڈت جی کے مابین ہوا تھا بیان کر دیا، اور تیسرے روز ہی میرا انٹرویو ہندوستان کے تمام انگریزی وار دو اخباروں میں شائع ہو گیا۔

ل انہوں نے انگریزی میں Narrow minded Patriotism کہا تھا۔

پاکستانی شہریت

جانا، شاہ گل فام کا، چوتھی طرف، اور گھر جانا، اس کا آسیبوں کے نرغے میں۔
آسیبوں کے ذکر سے پیشتر یہ سن لیجئے کہ جب پنڈت جی سے یہ معاملہ طے کر کے پاکستان آیا تو نقوی صاحب نے میری خوشیوں پر پانی پھیر دیا۔ انہوں نے کہا یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ آپ پاکستانی باشندے نہ بنیں اور یہاں زمین کا الاٹمنٹ آپ کے نام ہو جائے ہم کو آپ کے بچے آپ کی نسبت سے پیارے ہیں۔ جب آپ ہی ہمارے نہ بن سکیں گے تو ہمارے واسطے ناممکن ہو جائے گا کہ ہم آپ کے واسطے سینما بنوائیں یا باغ لگوا دیں اس کے علاوہ یہ صورت حال آپ کو کہیں کا بھی نہ رہنے دے گی پاکستانی آپ کو ہندوستانی سمجھیں گے اور ہندوستانی آپ سے اس لئے بدگمان ہو جائے گا کہ آپ کا پورا خاندان پاکستانی بن چکا ہے۔ اور خود آپ بھی ہر سال چار ماہ پاکستان میں رہیں گے۔ خوش صاحب دو کشتیوں میں پاؤں رکھ کر دریا کو عبور نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کا بھرم دونوں ملکوں سے اٹھ جائے گا۔ میرے دل کو نقوی صاحب کی اس بات سے بڑا دھکا لگا۔ لیکن چونکہ بات تھی، باؤن تولے پاؤ رتی کی اس لئے ان کی منطق کے سامنے سپر ڈال دی اور پاکستانی بن گیا اب سنیئے آسیبوں کا ذکر۔
میرے پاکستانی بنتے ہی یعنی جنگل کی چوتھی طرف جاتے ہی ایک قیامت کا غلغلہ برپا ہو گیا پورے پاکستان میں، اور شہر کراچی میں تو اس قدر بلبلا اٹھا گو یا صور قیامت پھونک دیا گیا ہے۔۔۔ تمام چھوٹے بڑے اردو انگریزی اخباروں کے لشکر، خم ٹھونک ٹھونک کر میدان جنگ میں آ گئے۔ تمام ادباء و شعراء اور کارٹون سازوں نے اپنے اپنے قلموں کی تلواریں نیام سے نکال کر میرے خلاف مضامین، قطعات اور کارٹونوں کی بھرمار کر دی۔

---

(۱) ہماری کہانیوں کے تمام شاہزادے "گل فام" ہوا کرتے تھے اور جب وہ شکار کے واسطے جانے لگتے تھے تو ان کی مائیں ہمیشہ ان کو یہ تاکید کیا کرتی تھیں کہ جنگل میں صرف تین طرف شکار کھیلنا چوتھی طرف جانے سے وہ اس بناء پر منع کیا کرتی تھیں کہ چوتھی طرف بھوتوں اور آسیبوں کا رہنا ہے لیکن چوں کہ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ جس شے سے منع کیا جاتا ہے اد بدا کر اس شے کی طرف دوڑتا ہے اس لئے تمام "گل فام" شادی شکار کھیلتے کھیلتے چوتھی طرف ضرور جاتے اور اپنے کو بھوتوں کے نرغے میں گھر لیا کرتے تھے۔

ہر طرف منڈیوں کا سا ایک غلغلہ بلند ہوگیا کہ دہائی سرکار کی، مغل اعظم یعنی ابوطالب نقوی نے جوش کو آدھا پاکستان کاٹ کر دے دیا۔ مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے لوگ میرے خلاف متحد ہو کر شیر و شکر ہوگئے۔ وہابیوں، بریلیوں، دیو بندیوں، قادیانیوں، سنیوں اور شیعوں نے اپنی چودہ سو برس کی نفرتوں کو یکسر بھلا دیا، تبرا اور مدح صحابہ کے مابین طرح مصالحت پڑ گئی اور میرے خلاف متحدہ طور پر اعلان جنگ فرما دیا گیا۔

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا۔

میرا پاکستان آنا ایسا معلوم ہوا گویا کوئی زبردست ڈاکو قارون کے خزانے پر ٹوٹ پڑا ہے یا ابرہہ نے کعبے کا محاصرہ کر لیا ہے۔ یا کام دیو، اچھوتوں کے محل میں کود پڑا ہے، اور تمام کنواری کنیاں، ہائے اللہ، ہائے اللہ کے نعرے لگا لگا کر بھاگ رہی ہیں۔ یہ تمام شور، یہ تمام غلغلے، یہ تمام دھماکے اور یہ ساری دہائیاں جب حکومت کے کان تک پہنچیں تو وزارت داخلہ نے نقوی صاحب سے جواب طلب کر لیا اور جس وقت میں نے یہ بات دیکھی کہ مجھے باغ اور سینما کی زمین دے کر نقوی صاحب ایک بڑی مصیبت میں گھر گئے ہیں، تو میں نے چپکے سے باغ اور سینما کے پلاٹ واپس کر دیئے۔

اس زمانے میں چودھری محمد علی صاحب وزیر اعظم تھے۔ نقوی صاحب کی ان سے کھٹ پٹ ہوگئی، نقوی صاحب اسکندر مرزا کے بل بوتے پر وزیر اعظم سے ٹکر لی تھی۔ اسکندر مرزا نے ان کی پشت پناہی سے روگردانی کی اور ان کی کمشنری ختم کر دی گئی۔ نقوی صاحب کے زوال نے میری کمر توڑ دی۔ میں ادھر کا رہا نہ اُدھر کا۔

میں نے سوچا ہندوستان پلٹ جاؤں، غیرت نے اجازت نہیں دی۔ میں نے دل سے پوچھا، خاں صاحب اب کیا ہوگا، دل نے کہا ہمت نہ ہار، اگر خار ہے، بو د گل دستہ گر دد۔

لوگوں نے رائے دی کہ میں حکومت سے درآمد برآمد کا لائسنس لے کر، کاروبار شروع کر دوں تجو گاؤدی کی۔ مجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ میں تجارت کا اہل نہیں، میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ اس دوڑ دھوپ میں زندگی اجیرن ہوگئی۔ روز صبح کو گھر سے نکلتا دوپہر کو پلٹتا، تھوڑی دیر آرام کر کے پھر باہر نکل جاتا اور شام کو واپس آتا تھا۔

میرا عالم اس گاؤں والوں کے علم کا سا ہوگیا تھا جو محرم کے زمانے میں اٹھایا جاتا ڈھول تاشوں کی تڑ تڑ جھیم جھیم کی گونج میں ہر مکان کے چبوترے پر رکھا جاتا اور اسی طرح دن بھر چکر کاٹ کاٹ کر پھر اسی تڑ تڑ، تڑ تڑ، جھیم جھیم کے ساتھ مکان میں لا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ اس دوڑ دھوپ میں خدا کے فضل و کرم سے کچھ ہاتھ تو آیا نہیں البتہ ڈاکٹروں

سکریٹریوں اور وزیروں کے ایسے دودو کوڑی کے نخرے ایسے اوچھے ٹھٹھے اور اس قدر غیر شریفانہ گنڈا میر بن دیکھے کہ آدمی کا وقار نظروں سے گر گیا اور یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اس قوم میں کسی صاحب قلم کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اور ہر ادیب و شاعر کو چاہیئے کہ وہ خودکشی فرمائے۔ یہ سچ ہے کہ ہندو حکام بھی بعض اوقات نخرے دکھاتے ہیں، لیکن اللہ اکبر! یہ مسلمان جب ہیڈ کانسٹبل ہو جاتا ہے تو ہامان و فرعون بن جایا کرتا ہے اور حکومت کی گدی پر بیٹھ کر خدمت گاروں اور ٹھیری والوں کے لڑکے بھی اپنے کو قیصر و دارا سمجھنے لگتے ہیں۔ اللہ بونوں کے ذریعہ لنکا والوں کو نہ تے جائے۔ اب میری مسلسل ناکامیوں کی فہرست ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ جہانگیر روڈ کا سینما پلاٹ اور باغ لگانے کی زمین۔ خود میں نے واپس کر دی۔

۲۔ ایک سوسائٹی کا سینما پلاٹ، نیلام میں، میرے نام چھوٹا ـــــ قیمت ادا نہ کر سکا اس لئے نکل گیا۔

۳۔ کاشتکاری کے لئے، ہاشمی صاحب، ڈپٹی کمشنر کراچی نے پچاس ایکڑ زمین دی۔ الطاف گوہر صاحب نے اسے ضبط فرمایا۔

۴۔ سائیکل رکشاؤں کے پرمٹ ملے۔ نرخ گر گیا، پرمٹ ہوا میں اڑ گئے۔

۵۔ کولڈ اسٹوریج کی اجازت مل گئی۔ روپیہ لگانے والوں کو ورغلا دیا گیا۔

۶۔ واجد علی شاہ کنٹرول ریٹ پر بیس دینے پر آمادہ ہو گئے۔ روپیہ لگانے والے کو روک دیا گیا۔

۷۔ بیڑی کے پتوں کا لائسنس مل رہا تھا۔ لائسنس دینے والے کے نخرے برداشت نہ کر سکا۔ اسے برا بھلا کہہ کر گھر آ گیا۔

۸۔ سینما کے ساز و سامان کا دوسرے دن پرمٹ مل رہا تھا۔ وزیر معطل کر دیا گیا

۹۔ ٹیلس ٹائل کا اجازت نامہ ملنے والا تھا۔ وزیر بدل گیا۔

۱۰۔ پریس قائم کرنے کا اجازت نامہ لکھ کر تیار ہو گیا۔ دستخط کرنے سے پیشتر وزیر کو نکال دیا گیا۔

۱۱۔ مچھلی کی تجارت کا پرمٹ لکھ دیا گیا تھا۔ سکریٹری کو برطرف کر دیا گیا۔

۱۲۔ پیٹرول پمپ کی سعی کی۔ ناکام ہو گئی۔

۱۳۔ ایک مکان الاٹ ہوا تھا۔ آج تک قبضہ نہ مل سکا۔

۱۴۔ دیہی ترقی کے محکمہ میں درخواست دی بیتطور نہیں ہوئی۔

۱۵۔ اپنی کتابوں کی طباعت و اشاعت چاہی۔ کوئی ناشر تیار نہیں ہوا۔

۱۶۔ فریئر ہال کے ایک گوشے میں ریسٹوران کھلوا دینے کا وعدہ حکم کیا گیا۔ افسر صاحب کا تبادلہ ہو گیا۔

۱۷۔ سندھی ادبی بورڈ میں ایک علمی کام کیا۔ اجرت نہیں ملی

۱۸۔ محکمہ آبادکاری کے ایک افسر صاحب نے مکان کی زمین الاٹ کر دی۔ چلتے وقت وہ کھڑے نہیں ہوئے۔ الاٹمنٹ کا پرزہ پھاڑ کر ان کے سامنے پھینک دیا۔

۱۹۔ پنجاب کے چیف منسٹر قزلباش صاحب ایک کارخانے کا پرمٹ دے رہے تھے کہ اسی دن فوجی انقلاب آ گیا اور ان کی وزارت نے دم توڑ دیا۔ الغرض ؎

جب جگہ ہم نے بنا یا گھر سڑک میں آ گیا

ان مسلسل ناکامیوں نے مجھ کو جھکا دیا۔ شدت یاس اور ہجوم افلاس نے میرا احاطہ کر لیا۔ نقوی صاحب جو اکہتر روپیہ بطور قرض دیتے تھے وہ اسقدر کم تھا کہ میرا گھر چلا نہیں سکتا تھا اس لئے اپنے ایک دوست کے ذریعہ سے زیور بیچ بیچ کر کام چلانے لگا۔

میں نے سوچا کہ یہ کاغذ کی ناؤ کب تک چلے گی۔ بیوی نے کہا ساری مدیں آدھی کر دو۔ اس کی لپیٹ میں آ کر شراب ترک کر دی۔ ترک شراب کے بعد میرا اس بچے کا سا عالم ہو گیا جس کا دودھ چھڑا دیا جاتا ہے۔ شراب کی بھڑکن سے نجات پانے کے واسطے شام ہی سے کھانا[1] کھا لیا کرتا تھا۔ لیکن بے چینی میں کمی نہیں آتی تھی۔ جی بہلانے کو کتاب اٹھا لیتا تھا کہ شراب کی للک بہل جائے۔ کتاب کی سطریں ناگنوں کے مانند رینگنے لگتی تھیں اور حروف کے دائروں میں بچھو ڈنک اٹھائے نظر آتے تھے۔

گرم گرم بستر پر لیٹ جاتا اور کروٹوں پر کروٹیں بدلتا تھا۔ لیکن نیند کسی طرح بھی نہیں آتی تھی اور تمام بدن میں کھجلی ہونے لگتی تھی۔ گھنٹوں کھر کھر کھجایا کرتا اور چھپکلی کی کٹی ہوئی دم کی مانند رات رات بھر تڑپتا رہتا تھا اور صبح کو جب خط بنانے کے واسطے آئینے کے سامنے بیٹھتا تھا تو اپنا بے خوابی کا رونداہوا انتہائی کا سا منہ دیکھتا

---

[1] کھانے کے بعد شراب کی خواہش باقی نہیں رہتی۔

نہیں جاتا تھا اور اپنی شکل دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی تھوبڑ قسم کے مسکین شاہ دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے دانت نکال نکال کر بھیک مانگ رہے ہیں!

اگر کسی دن کتے کی سی جھپکی آ بھی جاتی تھی تو اتنے برے برے اور ٹوٹے ٹوٹے خواب دیکھتا تھا کہ بار بار [illegible] سے آنکھ کھل جایا کرتی اور گھڑی کی ٹک ٹک دل پر گھن چلانے لگتی تھی۔

نہ جانے کتنے سنسناتے، سیلے سپاٹ، روکھے، پھیکے، ڈکارتے، ڈستے، پھنکارتے، بھیانک اور بھنبھوڑتے خواب دیکھ ڈالے اس زمانے میں۔ ان خوابوں میں سے ایک خواب[1] درج کر رہا ہوں:-

تکئے پر سر رکھا۔ اندازہ ہو گیا کہ آج بھی پایاب اور ادھوری نیند آئے گی۔ تھوڑی دیر چت پڑا رہا۔ بدن سنسنانے لگا، آہستگی سے داہنی طرف کروٹ لی۔ داہنی کروٹ کو پھر بائیں کروٹ میں تبدیل کیا۔ دماغ کو خالی کر کے چاہا کہ اس میں نیند کو آباد کر دوں۔ رفتہ رفتہ سانس میں ہمواری پیدا ہونے لگی اور سر پر ایسے آہنگ کے ساتھ نیند منڈلانے لگی جیسے اترتے وقت جہاز کی آواز۔ شاید میں پچیس منٹ میں سو گیا۔ اتنے میں کسی احمق نے فریج میں کوئی چیز رکھ کر دھڑام سے اس کا دروازہ بند کر دیا۔ اوچھے کا پیار۔ بالو کی دیوار۔ اس دھڑاکے سے نیند اچٹ گئی اور اکف ہو کر سنہنانے لگی اور دماغ تپ تپ ہونے لگا۔ دل نے کہا ارے غضب ہو گیا۔ اب نیند نہیں آئے گی۔ گھبرا کر سیدھے ہاتھ کی طرف کروٹ بدلی۔ کمبل کو سینے تک کھینچ لیا۔ چادر کے گوشے کو گل تکیہ بنا لیا اور دماغ کو اس تصور کی موجوں میں ترانے لگا کہ میں اپنے ریزرو کیا کمپارٹمنٹ میں سفر کر رہا ہوں۔ گھنے اور اندھیرے جنگل سے ریل ستار جاتی گزر رہی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں دوبارہ ہلکی سی جابی نیند آنے لگی۔ ایسا لگا کہ دماغ پر اوس گر رہی ہے۔ پھر ہلکے سے کہرے نے میرے وجود کو ڈھانک لیا۔ ریل چھکا چھک چلی جا رہی ہے اور میں سو رہا ہوں۔ خدا خدا کر کے نیند آ گئی تو خواب دیکھا کہ سامنے ایک بڑا سا میدان ہے جہاں خیمہ نصب کرنے کے لئے میخیں ٹھونکی جا رہی ہیں، کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ۔ اس کے بعد ایک دل بادل خیمہ نصب کر دیا گیا ہے۔ خیمے کے اندر باہر بڑے بڑے گیس کے ہنڈے روشن کئے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد دس بارہ فراش آ گئے اور

---

[1] اس خواب کو صبح ہوتے ہی لکھ لیا تھا اس لئے محفوظ رہا۔

بڑی بڑی دریوں کو زور زور سے جھٹک کر بچھا رہے ہیں۔ دریوں کے جھٹکے جانے سے گرد اڑ رہی ہے۔ گرد سے مرچوں کی دھانس آ رہی ہے ـــ اور کچھ ڈاڑھی کا فراش چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے۔ ابے رمضنیا سالے زندہ ہے کہ مر گیا۔ ارے اگالدان لا اگالدان۔

اب کچھ لوگ خیمے میں داخل ہو رہے ہیں۔ ان کی ٹوپیاں دو دو گز لانبی ہیں۔ ٹوپیوں پر مرغ کڑھے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگوں کے سروں پر بڑے بڑے کالے بگلے ہیں۔ بگلوں کے اوپر اگیا بیتال بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں۔ ان کے جسموں پر چیتے کی کھال منڈھی ہوئی ہے۔ جوتوں کی ڈوریوں میں مگرمچھ بندھے ہوئے ہیں۔ ان کی جیبوں سے بار بار بندر جھانک رہے ہیں۔ بندروں کی گردنوں میں ناگوں کے مفلر پڑے ہوئے ہیں اور جب وہ لوگ بیٹھ گئے قالینوں پر، تو بیٹھتے ہی ان کی ٹانگیں چھ چھ فیٹ لانبی ہو گئیں اور ناگوں کی چوکڑی لگا کر ناچنے لگے۔ ادھر ایک مشعلچی بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ اس کی ٹھوڑی پر لنگور کی دم سی پتلی داڑھی ہے اور اس کے پیچھے پیچھے ایک پورا طائفہ چلا آ رہا ہے بڑے زبردست ہنگامے کے ساتھ۔ طائفہ خیموں کے بیچوں بیچ آ کر بیٹھ گیا۔ حاضرین حقے پینے اور سازندے ساز ملانے لگے۔ سازوں کے ملنے سے دو خونخوار بلیوں کے لڑنے کی آوازیں آنے لگیں اور حقوں کے کڑکڑ کے ایک دوسرے کو فحش گالیاں دینے میں سرگرم ہو گئے۔ گانے والی سامنے آئی، اس کا منہ گھونس کا سا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں کھڑاویں بندھی ہوئی ہیں۔ سارنگیا تانت کی طرح پتلا اور تاڑ کی طرح لانبا ہے۔ طبلچی اس قدر موٹا ہے کہ پندرہ گز زمین گھیرے بیٹھا ہوا ہے اور وہ اپنے سونڈوں کے سے ہاتھوں سے دھا دھم طبلہ بجا رہا ہے۔ اس کے طبلے کی تھاپ سے گیس کے ہنڈے چٹخ چٹخ کر چلے جا رہے ہیں۔ گھونس کی سی شکل والی مغنیہ گا نہیں چیخ رہی ہے۔ اور اس کے منہ سے موٹے موٹے کوے نکل نکل کر قاؤں قاؤں کر رہے ہیں۔

اتنے میں یہ دیکھا کہ شکل سے دو بالشت کا ایک بونا گل مچھے رکھے مٹکتا چلا آ رہا ہے۔ اس کے گلے میں ایک بڑی سی دیگ لٹکی ہوئی ہے اور وہ لوہے کے ایک ٹکڑے سے اس دیگ کو ٹن ٹن بجا کر تال دے رہا ہے۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ اس کی دیگ سے ایک مرہٹہ کود پڑا اور جھانجھیں بجانے لگا۔ اور جھانجھیں اس زور سے بجنے لگیں کہ مجھ بدبخت کی آنکھ کھل گئی اور دیکھا کہ گھڑی تین بجا رہی ہے اور سکینہ شاہجہاں پوری کا یہ شعر دماغ میں گونج رہا ہے۔

دل کی لگی تیرے فراق اپنا اثر دکھائے گی
لیٹو گے لاکھ بن کے تم نیند کبھی نہ آئے گی

سہروردی صاحب۔ اسی اثنا میں سہروردی صاحب کو وزیر اعظم بنا دیا گیا اور میں اس فکر میں پڑ گیا کہ ان منصوبوں کے چکر سے نکل کر میں نے "ارباب قرطاس و قلم" (اکاڈمی آف لیٹرز) کے نام جو منصوبہ تیار کیا ہے اس کو سہروردی صاحب کی بارگاہ میں کیونکر پیش کروں اور جب میں نے اپنے ایک مخلص دوست منا خاں ایڈوکیٹ سے اس کے متعلق مشورہ کیا تو انھوں نے کہا کہ میرے ایک بہت اچھے دوست ہیں محمود الحق صاحب عثمانی جو سہروردی صاحب کے مقرب خاص ہیں ان سے کہونگا کہ وہ آپ کو سہروردی صاحب سے ملا دیں۔ چنانچہ ایک روز منا خاں عثمانی صاحب کو لے کر خود میرے گھر آ گئے۔ اور معاملہ طے ہو گیا۔ اس کے دوسرے ہی دن عثمانی صاحب نے مجھے سہروردی صاحب سے ملا دیا سہروردی صاحب نے میری تجویز کو بہت پسند کیا اور وعدہ فرمایا کہ میں اکیڈمی قائم کرا دونگا۔

لیکن میری بدبختی دیکھئے کہ دوسرے ہی دن عثمانی اور سہروردی کے مابین ایسا بگاڑ پیدا ہو گیا کہ ان کی آمد و رفت ہی بند ہو گئی اور میں بے آسرا ہو کر رہ گیا

اس کے بعد خدا کا کرنا یہ ہوا کہ بیگم شائستہ اکرام کراچی آ گئیں اور آفتاب احمد خاں وزیر اعظم کے سکریٹری بلکہ دست راست بن گئے اور چونکہ یہ دونوں مجھ کو بہت پہلے سے جانتے تھے، انھوں نے میری بڑی دستگیری کی۔

بیگم صاحب، سہروردی صاحب کی رشتے کی بہن تھیں۔ انھوں نے میرے مبالغہ آمیز محامد و محاسن کچھ اس طرح ذہنشین کر دیئے کہ سہروردی صاحب جو خود بھی ایک ادبی اور صاحب ہنر آدمی تھے مجھ پر بے حد مہربان ہو گئے اور مجھ کو اجازت دیدی کہ میں جب جی چاہے بلا روک ٹوک ان کے پاس آ جایا کروں۔[1]

اس طرح آفتاب احمد خاں نے بھی سہروردی پر میرا سکہ جمانا اور میرا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا اور میری تجویز حرکت میں آ گئی[2]

حسن اتفاق یا میری خوش قسمتی کہئے کہ اس اثنا میں زبیری صاحب مرحوم تعلیمات کے سکریٹری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ وہ نہایت ذی علم و ادب نواز انسان تھے۔ میری امداد پر تل گئے۔ اپنی زبردست سفارش کے ساتھ انھوں نے میری کارروائی فنانس بھیج دی اور مجھے مشورہ دیا

---

[1] میں اپنے ان دونوں محسنوں کو تا مرگ فراموش نہیں کر سکونگا۔

[2] آفتاب احمد صاحب کے توجہ دلانے پر سہروردی صاحب نے لٹریری فنڈ سے مجھے پانچ ہزار روپیے بھیجے تھے۔ پانچ ہزار روپیے اس وقت پانچ لاکھ معلوم ہوئے تھے۔

کہ میں فنانس سکریٹری ممتاز حسن صاحب سے مل لوں۔

ممتاز حسن کا نام سن کر میں چکرا گیا۔

اور اس چکرانے کے دو اسباب تھے۔ پہلا سبب تو یہ تھا کہ جون ۱۹۴۲ء میں دہلی کے ایک مشاعرے کی شرکت کے سلسلے میں ہمارے مابین ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آ چکا تھا اور اس لئے میں سمجھتا تھا کہ وہ کسی مفید ملکی کام میں بھی میرا ساتھ نہیں دیں گے۔

اور دوسرا سبب یہ تھا کہ حدیث متواتر کے طور پر میں یہ سن چکا تھا کہ ممتاز حسن صاحب اس بدنصیب صوبے کے دشمن جانی ہیں جس کو "یو پی" کہتے ہیں۔ لیکن میں ان سے کیونکر نہ ملتا۔ ارتکاب ازدواج کے بعد باپ اور نانا بن چکا تھا ان سب کو پالتا کیونکر!۔ اس لئے اپنی اوقات پر لعنت بھیجتا ہوا دفتر مال پہنچا۔ پہنچتے ہی قدم دو دو من کے ہو گئے۔ ٹھنڈی انگلیوں سے اپنا نام لکھ کر پرچہ اندر بھیج دیا۔

چپراسی نے آکر کہا اس وقت ایک صاحب وہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ پی، اے کے کمرے میں انتظار کریں۔ دل نے کہا اور آؤ پاکستان۔ خون کے گھونٹ پئے اور پی، اے کے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ پی، اے صاحب نہ تو کھڑے ہوئے نہ ہاتھ ملایا۔ مجھ کو فرعون کی طرح دیکھا اور کام کرنے لگے۔ دل نے کہا۔ مبارک ہو خانصاحب پاکستان کی طرف سے یہ عزت افزائی ——— جی چاہا کمرے سے نکل جاؤں پھر سوچا ہم تو طارق کی طرح کشتی جلا کر آئے ہیں، اب کہاں جا سکتے ہیں۔

ابھی مشکل سے چھ سات منٹ اس عذاب میں گزرے تھے کہ کیا دیکھتا ہوں کہ خود ممتاز حسن صاحب میرے سامنے کھڑے ہوئے معذرت خواہی کر رہے ہیں۔ ممتاز حسن کی اس غیر متوقع اور غیر معمولی شرافت نے مجھ کو حیرت میں ڈال دیا اور میرے دل کو ان کی جانب جھکا دیا اور میں اپنے سوء ظن پر دل ہی دل میں ملامت کرنے لگا۔

اپنے کمرے میں لے جا کر انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ آپ کی اکاڈمی کی تجویز بہت لمبی چوڑی ہے اگر آپ اس کو تدوین لغت تک محدود کر دیں تو فنانس اس کی منظوری دیدیگا۔

مجھے اپنی اس تجویز کے بگاڑ پر افسوس ہوا۔ لیکن میں بے چارہ کر ہی کیا سکتا تھا ناچار اسی شکل کو غنیمت سمجھا۔ میں نے ان کی بات مان لی۔ "ترقی اردو بورڈ" وجود میں آگیا اور میری کئی سال کی عرق ریزی اور سعی مسلسل مشکور ہو گئی۔

بورڈ بن گیا تو انجمن ترقی اردو کے صدر مولوی عبدالحق صاحب کو رکنیت کی دعوت دی گئی۔ مولوی صاحب مجھ کو ناپسند کرتے تھے۔ اسلئے انھوں نے یہ جواب دیا کہ اگر مجھ کو لغت

کا چیف ایڈیٹر نہیں بنایا گیا تو میں رکنیت کی دعوت کو ٹھکرا دوں گا۔

ممتاز حسن صاحب نے عبدالحق صاحب کی اس ضد پر منہ بنایا لیکن کچھ سوچ کر منظور کر لیا اب کیا تھا۔ عبدالحق صاحب چیف ایڈیٹر ہو گئے۔ انجمن ترقی اردو کے دفتر میں لغت کا کام ہونے لگا میں نے بورڈ کے لئے دوڑ دھوپ کر کے جو عمارت کرائے پر لی تھی وہاں چند کلرک رہ گئے اور میں ممتاز حسن صاحب نے مجھ کو "مشیر ادب" کا عہدہ دیدیا۔ سب سے زیادہ میری تنخواہ مقرر کر دی لیکن عبدالحق صاحب نے کوئی سوا ڈیڑھ برس تک کوئی کام ہی مجھ سے نہیں لیا۔ اور دفتر میں بیٹھا تنخواہ لیتا۔ مکھیاں مارتا اور یہ سوچا کرتا کہ میں نے جس دفتر کو کئی سال خون پانی ایک کرنے کے بعد قائم کرایا تھا مجھ کو اسی دفتر میں "چوں مہ بہ سحاب اندر" بنا کر رکھ دیا گیا ہے ــ بے کاری اور مفت کی تنخواہ داری سے تنگ آ کر میں نے آخر ممتاز صاحب کو لکھا کہ مجھ سے لغت نویسی کا کام لیا جائے۔ اور جب انھوں نے مجھ کو لغت نویسی پر مقرر کر دیا تو مولوی عبدالحق صاحب کو اس قدر تاؤ آ گیا کہ وہ ادارت و رکنیت دونوں سے دست برداری پر آمادہ ہو گئے۔

اس کے بعد بورڈ کے سکریٹری شان الحق صاحب حقی کا مولوی عبدالحق صاحب اور شوکت صاحب سبزواری سے سخت بگاڑ پیدا ہو گیا اور گرما گرم مراسلت کا سلسلہ چھڑ گیا۔ مولوی صاحب کے انتقال کے بعد لغت کا کام بورڈ کے دفتر میں ہونے لگا اور حقی صاحب اور سبزواری صاحب کے مابین ظاہری مصالحت تو ضرور ہو گئی لیکن دلوں میں کدورت باقی رہی اور انشاءاللہ باقی رہے گی ـــــ (اس لئے کہ ارباب یوپی اور اہل دہلی کی فطرت ہی یہی ہے)

اس کے بعد حقی صاحب کے دل میں مجھ سے بھی گرہ پڑنا شروع ہو گئی۔ برتاؤ تو ہمارے درمیان خوردانہ اور بزرگانہ بحال رہا لیکن چونکہ حقی صاحب کا در پردہ یہ مطالبہ رہتا ہے کہ لوگ ان کے روبرو جھکتے رہیں اور میں نے ان کے اس مطالبے کو خوراک نہیں پہنچائی اور جب وہ مطالبہ مسلسل بھوکا رہنے لگا تو وہ سوچنے لگے کہ مجھ کو کس طرح زک پہنچا سکتے ہیں اور آخر کار اللہ نے ان کو وہ موقع دے ہی دیا۔

غالباً اگست ۱۹۶۷ء میں رخصت لے کر میں اپنے ملیح آباد کے باغوں کے تصفیے کی خاطر ہندوستان گیا اور باغوں کے معاملے نے اس قدر طول کھینچا کہ مجھے چار مہینے رہنا پڑا باغوں اور مشاعرے کے سلسلے میں بمبئی پہنچا۔ ظ انصاری صاحب کسی اخباری نمائندے کو لے کر انٹرویو کے لئے آئے اور میرا انٹرویو کسی انگریزی اخبار میں شائع

ہو گیا۔

رخصت کے اختتام پر جب لاہور پہنچا تو مجھ سے کہا گیا کہ میرے بمبئی کے معصومانہ انٹرویو کو نئے نئے معانی پہنا کر یہاں کے اخباروں نے خوب اچھالا اور مجھ کو پاکستان کا دشمن ٹھہرا دیا ہے۔

مجھ کو یہ سن کر افسوس تو ضرور ہوا لیکن تعجب بالکل نہیں ہوا۔ میں نے خیال کیا کہ جب حدیث اور قرآن کو اپنے سانچے میں ڈالنے کے لئے تاویلات کے ذریعہ سے بدل دیا جاتا ہے تو میرا انٹرویو کیا چیز ہے۔ لاہور میں ان اخباروں کا اعلان شائع کرا کے جب کراچی آیا اور دفتر پہنچا تو حقی صاحب نے بڑے گستاخانہ انداز میں مجھ سے مراسلت شروع فرما دی۔

اور آخر کار اس غیر شریفانہ سلسلہ کو بند کر دینے کے واسطے میں نے حقی کو لکھ بھیجا کہ میں جس خاندان کا رکن اور جس مزاج کا آدمی ہوں اس مزاج کا آدمی ٹوٹ تو سکتا ہے لیکن لچک نہیں سکتا۔ اگر آپ میری معاش پر ضرب لگانے کی ٹھان چکے ہیں تو:۔

نگاہِ گرم سے حالت ہو دل کی اور تباہ
اگر یہی ہے ارادہ ترا تو بسم اللہ

میری اس آخری تحریر کے بعد حقی صاحب کا مراسلہ آیا کہ اب مجھے توسیع نہیں دی جائیگی میں دفتر سے قطع تعلق کر کے گھر آگیا اور حقی کے گھر میں گھی کے چراغ جلنے لگے۔

لیکن اس خبر کو حقی صاحب نے کسی اخبار میں شائع ہونے نہیں دیا تاکہ ان کا پول نہ کھلنے پائے اور جب ہندوستان کے ریڈیو نے میری برطرفی کا اعلان کیا تو یہاں کے اخبار نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اس کی تردید کرتے ہوئے الٹا اس کو جھوٹا قرار دیا۔ جے دلاورا ست دزدے ...."

میری زندگی کا بحمداللہ یہ پانچواں معاشی بحران ہے جس سے کہ اس وقت گزر رہا ہوں۔ ہر چند میری ملازمت کو ختم کر دیا گیا ہے۔ میرا پاسپورٹ بھی ضبط کر لیا گیا ہے، میری سیمنٹ کی ایجنسی بھی مجھ سے چھین لی گئی ہے اور میرے باغوں کا جو روپیہ ہندوستان کے ریزرو بنک میں جمع ہے وہ بھی مجھے یہاں نہیں مل سکتا اور اس کے ساتھ ساتھ ہر چند خدا کے فضل و کرم سے میرا کوئی بنک بیلنس بھی نہیں ہے لیکن میں بدحواس نہیں ہوں۔ بدحواسی تو در کنار میں پہلے ہی کی طرح ہشاش بشاش ہوں۔ اور مجھ کو یقین کامل ہے کہ میرا یہ بحران بھی میرے چار عدد سابق بحرانوں کے مانند کسی خیر جدید کا سرچشمہ بن جائیگا۔

مجھ کو اس امر کا یقین کس بنا پر ہے؟ یہ بھی سن لیجئے:۔

میں جب حیدرآباد گیا تھا اور سر اکبر حیدری کی سی طاقتور شخصیت سے بگاڑ پیدا ہونے کے بعد جب میرے پنپنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی، اس وقت نظام نے میری خاطر ایک جدید و غیر ضروری عہدہ خلق کر کے مجھے برسر روزگار بنا دیا تھا۔

جب دکن سے میرا اخراج ہوا تھا اس وقت روپ سنگھ اور سروجنی نائیڈو نے میری مدد کی۔ اس کے بعد شیو نرائن نے ہاتھ بٹایا اور جب شیو نرائن نے ساتھ چھوڑ دیا اس وقت مہاراجہ پٹیالہ میری پشت پر آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

جب بمبئی میں نان شبینہ تک سے محروم ہونے کا وقت سر پر آ پہونچا تھا اس وقت پنڈت نہرو نے میری دستگیری کی تھی۔

جب نقوی صاحب کی دعوت اور بھروسے پر یہاں آیا تھا اور نقوی صاحب کی کشتی ڈگمگا رہی تھی۔ اس وقت سہروردی صاحب، شائستہ اکرام، آفتاب احمد خاں، زبیری صاحب اور ممتاز حسن صاحب نے میری تجویز کو منظور کر کے ترقی اردو بورڈ بنایا اور میری معاش کا بندوبست کر دیا تھا۔

سوچتا ہوں کہ جب کوئی نامعلوم توانائی یا حسن اتفاق کی تکرار ہر برے وقت پر میرا ساتھ دیتی رہی ہے اور ہر موقع پر کوئی اللہ کا بندہ "مردے از غیب" کی طرح جھپکے سے آ کر اور میری مصیبت کے پہاڑ کاٹ کر غائب ہو جاتا ہے تو مجھ کو اس بحران کی بھی کوئی پروا نہیں کرنا چاہئے اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اس بحران کا سر بھی میرے قدموں پر جھک کر رہے گا۔

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

اور اسی بنا پر جس دن میری نوکری چھوٹی تھی تو نوحے یا مرثیے کے بدلے میں نے اسی روز ایک نظم "ترانۂ بہار" کے نام سے کہی تھی۔ آپ بھی اس سن لیں اور داد دیں۔

لو اٹھا جھوم کر وہ ابر بہار
وا شربوا، وا شربوا ادی الاصبار

آ کہ "یا ہو" کی گونج میں وہ الاپ	کہ دو عالم ہوں رقص پر تیار
کہ دوہ دھن کنشت میں چھیڑیں	جھوم جائیں بہشت کے اشجار
خطۂ برف سے اگا ئیں آگ	آگ میں لہلہائیں پھر گلزار
سنگ و آہن کو بخش دیں آہنگ	خار و خس کو عطا کریں جھنکار

کھنکھٹائیں سبو کے دستے سے — بابِ آگاہی و درِ اسرار
آج یہ راز فاش کر دیں آؤ — کہ رئیسانِ شہر ہیں نادار
آؤ دربارِ کج کلاہاں میں — عاجزی کو سکھائیں استکبار
بخش دیں مرہ نشیں گداؤں کو — حکمِ سلطاں سے جرأتِ انکار
کنجِ باطل کو چھوڑ دیں شاخیں، — دستِ قاتل کی توڑ دیں تلوار
آندھیوں کو سنائیں سوزِ نسیم — زلزلوں کو سکھائیں وضعِ قرار!
نارِ گیتی سے بن لیں شعلے — مار کر دل سے چھین لیں جھنکار
آؤ عرفاں کے یوں سبو چھلکائیں — کہ الٹ جائیں اولیائے کبار
یوں کریں شرحِ وحدتِ آفاق — ایک ہو جائیں کافر و دیندار
ذرہ و آفتاب کے مابین! — ڈال دیں آؤ طرحِ بوس و کنار
آؤ یوں دھوم سے گلال اڑائیں — کہ گلابی ہو کہکشاں پہ سوار
آؤ پیدا کریں بگردشِ جام — وقتِ اندک میں فرصتِ بسیار
آؤ عمرِ خضر کو چکرا دیں — تب و تابِ لمحۂ سرشار
آؤ ذرات کو عطا کر دیں — تتلیوں کے پروں کے نقش و نگار
لائی پھر بوئے زلفِ لا محدود — مرحبا مرحبا اے نسیمِ بہار
ہاں اب اے دل نواز سازندے — اور کچھ اور نقاب کی گلکار
اور بکھر جائے اپنی ڈال سے نگاہ — اور گھر جائے ابرِ زمزمہ بار
اور بڑھ جائے صحتِ مستی — اور چڑھ جائے نرگسِ بیمار
اور ہو تیز اے نسیمِ شمال — اور ہو تند اے ہوائے چنار
اور اے ابرِ سرمگیں، دھمال — اور اے ابرِ آتشیں دہکار
اور چھکو ہزارہ دستوں سن — اور بھکو ثوابت و سیار
اور بوجھل ہو میکدے پہ گھٹا — اور گھُل کر ہو احتیاط کی دھار
اور سازِ الست کا آہنگ — اور رندانِ مست کی للکار
اور شیشوں کی انجمن میں کھنک — اور بوندوں کی شاخ سے ٹپکار
ہاں ابل اے شرابِ گل در رخ — ہاں بدل اے مزاجِ لیل و نہار
ہاں لہر دے ہیں گھوم جائے گھٹا — ہاں نکھر دے میں جھوم جائے نکھار
بدلیو، ہاں ابھی گرج ہر آن، — بجلیو! ہاں ابھی کڑک ہر بار

خوفِ شب خوں پہ ہاں یہی ہتھیار دو
جورِ گردوں سے ہاں یہی پیکار

ہاں یہی بھیڑ بھاڑ اے رندو
ہاں یہی چھیڑ چھاڑ اے بوچھار
ہاں یہی نعرۂ "ھوالموجود"
ہاں یہی نعرۂ "ھوالغفار"

ہاں گدایانِ کوئے پیرِ مغاں
یوں جگا دو لبوں پہ صوتِ ہزار
کہ سلاطینِ آسماں اورنگ
مانگنے آئیں رقص و رنگ ادھار
یوں الجھنے لگے گھٹا سے ہوا!
کہ سلجھنے لگیں لٹ ھا کے تار
کھول دو ہاں زمیں کے غنچے
بول دو آسماں پہ یلغار
یوں بکھرنے لگے رگوں میں سرور
کہ تھرکنے لگے چمن کا نکھار
مست رامش گرو، دھنوں میں گھماؤ
نغمۂ بحر و موجۂ انہار
یوں ستاروں پہ متصل چھائے
کہ پڑے دور تک مہین پھوار
یوں ان آڑے سروں کو قوس بناؤ
کہ چھلک جائے مصر کا بازار
مغنیو جھوم کر کمر لچکاؤ
مطربو! جھوم کر اٹھاؤ ستار

گرہِ زلفِ ناز و بندِ قبا
کھول دو دخترانِ قاف و شمال

یوں نقابیں اٹھاؤ مکھڑوں سے
کہ گلابی کو توڑ دیں رخسار
اس ٹھکانے کی بتیاں کھاؤ بتاؤ
کہ بدل جائے وقت کی رفتار
بوئے گل کو بناؤ خمیرۂ زر
رنگِ گل کو سجاؤ سلسلہ دار
اس انوکھی لٹک سے توڑا لو
کہ دھڑکنے لگے دلِ کہسار
لے کو بہاؤ اور کھلی چھب لی
سر پہ جھمکاؤ لٹ پٹی دستار
اس جوبنی دھمک سے رقص کرو
کہ کھنکنے لگیں در و دیوار
یوں ہو چھم چھم کہ فرش بن جائے
تندِ قلزم کی سطحِ ناہموار
توڑ دو جال اے زمین و مکاں
تال دو تال اے یمین و یسار
ہاں گلوں کی خمیدہ لیکھوں پر
کم سنو! یہ نہیں پتنگوں کی قطار
اے بتوں کی جھبر یہی جھا دو
اے گلابی لبو یہی جھنکار!

مدھ بھری پائلو، یہی چھل بل
گھومتی چھاگلو، یہی جھنکار

نذر کرتا ہیں جوش کے نغمات
ہاں اٹھا لو اسے پیمبرانِ بہار

دیکھئے آپ نے میرے تیور؟ ابھی تھی اس بحران کی برپا دوش قلندرانہ!

بحمد اللہ کہ میری نوکری چھوٹے ہوئے اب ایک مدت گزر چکی ہے جس روز میں حضرت حق کے فضل و کرم اور حفیظ صاحب کے قلم جنبش رقم سے برطرف کر دیا گیا تھا۔ اس روز بعد دو دن تک چند گھنٹے تو ضرور پریشانی رہی تھی لیکن میری بیوی کی ہمت اور میری عزیمت نے اس وقتی پریشانی کو تمام ہوتے ہوتے، بھاگتے چور کے مانند فراموش کر دیا۔

اور اب چونکہ وہ سارا معاملہ :۔ رونے والے رو چکے، اور ہنسنے والے ہنس چکے

اک پرانا واقعہ ہے خانہ ویرانی مری

کے حدود میں داخل ہو کر گلدستۂ طاق نسیاں بن چکا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ چونکہ میں اپنے بزرگوں کے ناموس اور اپنی عزت نفس کو شاہد بنا کر یہ قسم کھا چکا ہوں کہ مر جاؤں گا لیکن اب سرکاری ملازمت کا ارتکاب نہیں کروں گا یعنی اب کھائی تو کھائی اب کھاؤں تو رام دہائی" تو اس منزل میں آ گیا ہوں اب اپنی پوزیشن صاف کرنے کا ارادہ کروں گا تو مجھے یقین ہے کہ میرے اس عمل کو حکومت کی خوشامد یا ملازمت کی آرزو نہیں سمجھا جائے گا اور اسی بنا پر میں، ببانگ دہل اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ، ۱۹۶۷ء کے اواخر میں میرے خلاف اداری غلط گوئی یا شدید غلط فہمی کی

لہ نوکری چھوٹ جانے کے بعد میں نے محمد موسیٰ خاں، فدا حسین صاحب اور خود صدر پاکستان کو اسی مضمون کے خط لکھے تھے کہ اب میں نے یہ بات طے کر لی ہے کہ کبھی سرکاری نوکری نہیں کروں گا البتہ یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تمام حجت کے طور پر اس غلط فہمی کو دور کر دوں جو حکومت کے دل میں میری طرف سے پیدا ہو گئی ہے جس کے یہ معنی ہیں میں حکومت سے کسی چیز کا طالب نہیں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ معاملے کی صفائی ہو جائے ورنہ بہانے سے کام نہیں لوں گا اور جو کچھ میں نے کہا ہے اس کو سچائی کے ساتھ بیان کر دوں گا۔ ان خطوں کا حشر یہ ہوا کہ فدا حسین صاحب اور صدر پاکستان نے تو مجھے جواب دینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی، البتہ موسیٰ خاں نے جواباً لکھا کہ میں اپنی شکایات لکھ بھیجوں۔ لیکن میں نے اس ننگ کو گوارا نہیں کیا اور ان کو لکھ بھیجا کہ میں ان کو کبھی خط نہیں لکھوں گا۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی تحریر کر دیا کہ روح کربلا گواہ رہے کہ میں نے اتمام حجت اپنی کوتاہی سے کام نہیں لیا ہے

بنا پر جو یہ پروپیگنڈا فرمایا گیا تھا کہ میں پاکستان کا دشمن یا صرف پاکستان کا مخالف ہوں قطعی طور پر غلط اور بے بنیاد تھا۔ حیرت ہے کہ اس موٹی سی بات کو کوئی کیوں نہ سمجھ سکتا کہ میں پاکستان کا دشمن ہوتا تو اپنی دولت اپنی عزت، اپنی فراغت، اپنے احباب، اپنے بزرگوں کی ہڈیوں سے منھ موڑ کر اور اپنے ناز بردار جواہر لال نہرو کا دل توڑ کر یہاں آتا کیوں ؟۔

اگر اس موقع پر کوئی نزیوں حال صاحب یہ فرمائیں کہ مجھے دولت کی طمع یہاں کھینچ کر لے آئی تھی تو میں اُن سے یہ کہوں گا کہ ہندوستان میں میرے واسطے کس چیز کی کمی تھی کہ میں اس کمی کو پورا کرنے یہاں آتا ـــــ اور اس کے ساتھ میں اُن بزرگ وار سے یہ بھی عرض کروں گا کہ وہ میرے مزاج اور میری زندگی کے حالات سے اگر واقف ہوتے اور ان کو یہ معلوم ہوتا کہ میں ایک لُٹا لُٹا انسان رہا ہوں اور لُٹا لُٹا انسان کبھی لالچی ہو نہیں سکتا تو وہ میرے باب میں اس قدر اوچھی بات کہنے کی کبھی جرأت نہ فرماتے۔

اور بالفرض محال تھوڑی دیر کے واسطے یہ مان بھی لیا جائے کہ مجھ کو طمع کھینچ کر یہاں لائی تھی لیکن جب نقوی صاحب اور اسکندر مرزا کے زوال کے بعد مجھ پر عرصۂ حیات تنگ ہو چکا تھا اور میری پریشانیوں کا حال سن کر جب پنڈت جی نے مجھ سے کہلا بھیجا تھا کہ میں پاکستان کو ترک کر کے ہندوستان آجاؤں اس وقت میں نے ہندوستان جانے سے انکار کر دیا تھا۔

اور اب جب کہ میں پاکستان میں اپنا مکان بھی بنوا چکا ہوں اور یہیں کی خاک میں دفن ہو جانے پر بھی آمادہ ہوں تو کس کے منھ میں اتنے دانت ہیں کہ مجھ کو پاکستان کا دشمن کہہ کر اپنے خبث نفس یا اپنی حماقت کا اعلان فرما دے۔

پھر کان کھول کر سن لیجئے کہ میں ان خیالات کا اظہار اس لئے نہیں کر رہا ہوں کہ خدا نخواستہ حکومت مجھ پر مہربان ہو جائے، میں جانتا ہوں کہ ایک میرے سے مزاج اور ایک میرے سے برہنہ گفتار آدمی پر دنیا کی کوئی حکومت کبھی مہربان ہو ہی نہیں سکتی۔ حکومتیں مہربان ہوتی ہیں بے ضمیروں پر اور میرے پاس ضمیر جیسی خطرناک چیز موجود ہے۔ اور جب کہ خدا کے فضل و کرم سے میرے جلّ جلالہٗ کا زمانہ سر پر آ چکا ہے سوچتا ہوں اب کوئی مہربان ہوا بھی تو کیا اور نامہربان رہا بھی تو کیا۔

راس آئے گی تو کیا آئے گی زمانے کی ہوا اب راس، بھی دو دن زمانے کی ہوا آئی تو کیا

میں اس نفرت پرور دہ سیاست گزیدہ زمانے میں جب کہ ایک ملک دوسرے ملک کو اپنے پیٹ میں رکھ لینے پر تلا بیٹھا ہے اور ملک تو پھر بھی ایک وسیع تصور ہے جب کہ ایک صوبہ دوسرے

صوفیے بدبخری تانے کھڑا ہے۔ یہ بات کس سے کہوں کہ میں تمام نوع انسانی کا دوست ہوں اور یہ کہوں بھی تو یقین کون کرے گا، ہر سننے والا میرے اس دعوے کو اپنے خبث نفس کی ترازو میں تول کر مجھ کو جھوٹا سمجھے گا، لیکن میں اپنے سچ کو اس خوف سے دبا نہیں سکتا کہ اس کو جھوٹ خیال کیا جائے گا اس لئے میں کہہ دینا چاہتا ہوں، جوتی کی نوک سے کوئی مانے یا نہ مانے کہ اب ایک مدت دراز سے میرے سینے میں ابو الانسان حضرت آدم کا دل دھڑک رہا ہے۔ میں اس دنیا کے ہر قریب و دور ملک کو بلا استثنا اپنا وطن اور اس کرۂ ارض کے ہر نیک و بد انسان کو بلا استثنا اپنا بچہ سمجھتا ہوں۔

جب کسی کے گھر میں جشن ہوتا ہے، میں سمجھتا ہوں وہ جشن میرے ہی گھر میں ہو رہا ہے۔ اور جب کسی گھر سے کوئی جنازہ نکلتا ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ جنازہ میرے ہی گھر سے نکل رہا ہے۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ انفس و آفاق، وحدت کی زنجیریں جکڑے ہوئے اور ایک ہی قسم کے عناصر ترکیبی کے مختلف مظاہر ہیں جن میں صرف اسم و جسم کا فرق ہے، اصلیت اور حقیقت سب کی ایک ہے اس کائنات میں غیریت کا کہیں کوئی نام ہی نہیں ہے اور عینیت کامل سب کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس عالم وحدت و عینیت میں اگر کسی سے نفرت یا دشمنی کروں گا تو اس کے سوا، اور کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے کہ میں خود اپنی ذات سے نفرت یا دشمنی کر رہا ہوں۔

اے دوست دل میں گرد کدورت نہ چاہیئے
اچھے تو کیا بُرے سے بھی وحشت نہ چاہیئے

کہتا ہے کون پھول سے رغبت نہ چاہیئے۔ کانٹے سے بھی مگر تجھے نفرت نہ چاہیئے

کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو سبزہ زار کا
پالا ہوا ہے وہ بھی نسیم بہار کا!!

میری موجودہ زندگی

اپنی اس آخری زندگی کا حال کیا بتاؤں ۔ جان کی اماں پاؤں تو زبان ہلاؤں ۔
اللہ اللہ یہ آب و ہوا کی ناسازگاری یہ کراچی کی علم بیزاری ۔ یہ پرانی یادوں کی کٹاریاں یہ نئے ماحول کی آریاں، یہ مولد و منشا سے دوری ، یہ غربت کی مجبوری ۔ سینے میں یہ چھلکتی لمبی سانسیں یہ حالات کی اکھڑی سانسیں ، یہ دل پہ چلتے بان، یہ سر پر کڑکتی کمان ۔ یہ اخباروں کی ریشہ دوانیاں یہ حکومت کی سرگرانیاں یہ دوستوں کا فقدان یہ معاشی بحران ۔ اور یہ چہرہ زندگی پہ گرد و غبار کا غازہ اور یہ دوش پہ عزت نفس کا جنازہ ۔

میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو خوت ٹھوک کر مر چکا ہوتا ۔ لیکن مجھے دیکھو کہ میں اب بھی جی رہا ہوں اور فقط جی ہی نہیں رہا ہوں آلام حیات پر مسکرا بھی رہا ہوں ۔ ان درد مندیوں کے ہوتے ہوئے اب بھی وہ ہے کا جگر دار کا ہے، بحمداللہ کہ میرا جگر لوہے کا ہے میں ایک دقیقے کے واسطے بھی اپنے کو اداس نہیں ہونے دیتا ، غم کو ہمیشہ ٹھکراتا رہا اور ۔

چوں غم تو نہ تواں یافت مگر در دل شاد
ما بہ امید غمت خاطر شاد ے طلبیم

کے مصداق میں اپنی زندگی کو ڈھالے رہتا ہوں ، میں خارج سے خوشی کی طلب گاری نہیں کرتا ، خارج میں رکھا ہی کیا ہے میں اپنے باطن میں خوش ہوتا خوشی کی آب یاری کرتا خوشی اگاتا اور خوشی کی بالیاں کاٹتا رہتا ہوں اور ہستی کے عالم میں دنیا کے تمام بے دردوں کو مخاطب کر کے گنگناتا رہتا ہوں کہ :۔

تھوڑی سی زندگی تھی بہر حال کٹ گئی
تم کو جو ہم پہ رحم نہ آیا تو کیا ہوا

حسب معمول قدیم نادروں کی چھاؤں میں بلا ناغہ ہر روز دو یا تین بجے صبح کو بیدار ہو کر خوب اچھی کلیاں اور غرارے کرتا غٹ غٹا کر کٹورا بھر پانی پیتا تھوڑا دو جلو چھینٹے مار کر تولیا سے منہ پونچھتا ۔ اور لکھنے پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں ۔ میز پر اگر بتی جلتی رہتی ہے اور وہاں پہنچ جاتا ہوں جس عالم کا کوئی نام اب تک رکھا ہی نہیں گیا ہے ۔

اس وقت کبھی کبھی میرے گرد و پیش ہلکی ہلکی گھنٹیاں بجنے لگتیں اور دماغ کے ایوان میں وہ راگنیاں بھر جاتی ہیں کہ بقول حضرت اقبال : من از ان نغمہ تپیدم کہ سرودن نہ تواں ۔ بعض اوقات طبع میں ایسی قید

ناز کی ہوتی ہے کہ موذن کی آواز گراں گزرتی ہے۔ اور بعض اوقات جب اذان کی آواز سنتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام کرۂ ارض عرش کی جانب پرواز کرتا چلا جا رہا ہے اور تمام ثوابت و سیارے زمین کی جانب جھکتے چلے آ رہے ہیں۔

اور جب رات کی گہری سیاہی سانولے پن میں تبدیل ہونے لگتی ہے تو کتاب و قلم سے دست بردار ہو کر کبھی کبھی انگنائی میں آ جاتا اور آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر یہ سوچنے لگتا ہوں کہ آخر یہ سب کچھ ہے کیا، اور جب کچھ جواب نہیں ملتا تو بلبلا بلبلا کر پوچھتا ہوں۔

اے پچھلے پہر کے غم گسارو، بولو
اے نجم گردوں کے شرارو، بولو
اس پردۂ رنگ و بو میں پوشیدہ ہے کون
بولو اے ڈوبتے ستارو بولو!

اس کے بعد اگر ہمت ہوتی ہے تو ٹہلنے کے واسطے نکل جاتا ہوں۔ یا پھر مکان ہی میں ورزش کر کے خط بناتا، نہاتا، ناشتہ کرتا اور پھر لکھنے پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ اور یہ سلسلہ سہ پہر کو دو یا تین بجے تک بڑے تسلسل کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ پھر نیند آئے یا نہ آئے، ایک گھنٹے کے واسطے لیٹ جاتا ہوں اور اس کے بعد دوبارہ حمام کر کے نوشت[1] و خواند کا سلسلہ دوبارہ آغاز کر دیتا ہوں اور شام ہوتے ہی مخوبات ڈھو کر مغرب کی طرف نگاہ اٹھا کر سوال کرتا ہوں۔

اے دشمن بے پناہ کب ہو گا غروب؟ اے سنگ رہ گناہ کب ہو گا غروب؟
پیاسے بیٹھے ہیں کب سے رندان کرم اے شعلۂ رو سیاہ کب ہو گا غروب

اور آفتاب غروب ہو جاتا ہے تب:-
دل کی جانب رجوع ہوتا ہوں میں سر تا بقدم، خضوع ہوتا ہوں میں

---

[1] وہ ایک بار یہ بھی ہو چکا ہے کہ تاروں کو دیکھ کر گریبان کے ٹکڑے کر دیئے اور ہچکیاں لے لے کر پایا ہے، جھنجھلا کر دیا... ہوں... اور تینوں برس سے دوپہر کا کھانا ترک کر چکا ہوں کہ کھلے اقتدار کی بھوری آنکھ کے ... دیوانے میاں رست داؤں کو جو گنگی دولتوں کی بھیک مانگنے اور دولت کی تابرگ سے بچ سکنے والی ... گا

جب مہر بیگ غروب ہو جاتا ہے

پیمانہ بکف طلوع ہوتا ہوں میں

اس دشمن بے پناہ کی تجہیز و تکفین کی خوشی میں بڑے چاؤ اور انوکھے رچاؤ کے ساتھ پیمانہ بھرتا ہوں اور یہ سوچ کر کہ اُس کرۂ آفات میں آج کا دن بھی محض حسنِ اتفاق سے بخیریت ٹوٹ گیا یہ پی جاتا ہوں پڑھ کر ۔

جو سامنے آیا تھا وہ عفریت گیا

میں ہارنے والا تھا مگر جیت گیا

اس مرد فگن ، صبر شکن دنیا میں

صد شکر کہ دن آج کا بھی بیت گیا

بھرے پیمانے کو نعرۂ "بسم اللہ" اور "بیادِ فلاں بنتِ فلاں" کے ساتھ لبوں سے لگا لیتا اور الحمد اللہ کہہ کر پیمانے کو سامنے کی کھڑکی کے قریب رکھ کر شفق رنگ میں جماتا۔ حال سے منقطع اور مستقبل سے بے پروا ہو کر ماضی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب جاتا ہوں۔

ماضی کے سوا میرے پاس اب باقی ہی کیا رہ گیا ہے۔ پہلے یادش بخیر ، بوتل کھلتے ہی طبلے پر تھاپ پڑتی تھی ، نازنینوں کی پائلیں جھنک اٹھتی تھیں ، اور یاروں سرمست کے لطیفوں سے محفل گونجنے لگتی تھی اب طبلے کی تھاپ کی جگہ سماعات سے اٹھتی تھاپ ہے پائلوں کی جھنک کے عوض سینے میں بربادی کی کھٹک ہے اور یاروں کے لطیفوں کے بدلے حالات کے کثیفے ہیں۔

ہوئے ان جاہل اور بورانے صنعت کاروں یعنی دولت مند نا داروں کو جو کروڑوں نوٹوں کے پیچھے دوڑتے پھرتے ہیں ، اس بات کا مطلق علم نہیں ہے کہ اس دنیا میں دولت کی نہیں دماغ کی فرماں روائی ہے اور سرکارِ قلم کے دربار میں سکندرِ اعظم اور قارون پر قسم کی بس اس قدر آبرو ہے کہ اسے غلام اور اسے دریوزہ گر کے سوا اور کوئی نام دیا ہی نہیں جا سکتا۔ اور خیرہ دامنی دو رنگ کے متوالوں کو اس بات کا پتہ نہیں ہے کہ نوشت و فواند ایک ایسی برنظر عیاشی بھی ہے کہ راجہ اندر کا اکھاڑا اس کے روبرو گورِ غریباں سے زیادہ سنسان نظر آتا ہے اور فاتحین عالم کو یہ معلوم نہیں کہ جب ایک نیا لفظ یا نیا خیال بات آ جاتا ہے تو ان کے جشن ہائے فتح مندی کے زمزمے بازاری شور بن کر رہ جاتے ہیں۔ اور بے دیا اربابِ تقشف و تصوف کے علم میں یہ بات اب تک نہیں آئی ہے کہ ادب کی تخلیق ، ہنر کی پیداوار اور اسرارِ حیات و کائنات کی تحقیق ایک ایسی بے لوث دلگداز قدرِ عبادت ہے کہ کروڑوں حج اکبر اس کا طواف کرتے رہتے ہیں اور جس وقت کہ اس کے نیم دقیقے کو ہزار سالہ زہد پر لادا جاتا ہے۔ تو اس کی ہڈیاں بولنے لگتی ہیں اور پل بھر وہ اس اونٹ کے مانند زمین پر اپنا سینہ رکھ دیتا ہے جس کی کمر ناقابلِ برداشت وزن سے دب کر چٹ سے ٹوٹ کر رہ جاتی ہے۔

نہ محرمے نہ شفیقے نہ ہمدمے دارم
حدیثِ دل بکہ گویم عجب غمے دارم

میں زیادہ سے زیادہ بیس پچیس اور کم سے کم پندرہ منٹ کے وقفے سے صرف چار پیگ پیتا ہوں اور جب تین پیگ ختم کرکے چوتھا پیگ بنانے لگتا ہوں تو ام آرا پوچھتی ہیں "کونسا" تو میں چوتھا کہہ کر ہنسنے لگتا ہوں اور جب چوتھا پیگ آدھا ختم ہو جاتا ہے تو کھانا طلب کر لیتا ہوں اور کھانا کھا کر کلیوں اور غراروں سے فارغ ہو کر تکئے پر سر رکھ دیتا ہوں اور پھر جیسا کہ اوپر کہہ چکا ہوں حسب معمول راتوں کی چھاؤں میں بیدار ہو کر لکھنے پڑھنے لگتا ہوں۔ پہلے شراب تھی مایۂ نشاط و آب حیات اور آج ہے خواب نوشی کی دوا اور وقتی بے ہوشی۔ ہائے کہاں سے کہاں آ گیا میرا کاروانِ حیات!!

مجھ کو آخر یہ ہلا با کیوں جا رہا ہے۔ کیا میں ہی ایک رہ گیا ہوں مشقِ ستم کے واسطے؟۔ ہاں تو جب "چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیرا پاکھ" والی کی سسکیاں پیتے سمندر میں ڈوب کرنے کشتی کا تختہ کشتی کا آغاز کرتا ہوں تو۔ سلوٹی فضا سینما کے پردوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ پردے اٹھنے اور گرنے لگتے ہیں اور ہر پردے کے اٹھتے وقت گھنٹیاں سی بجتیں اور منادی کی آواز گونجنے لگتی ہے کہ اے جوش دیکھ یہ تیرا ملیح آباد ہے جہاں تو شہزادوں کی طرح رہتا تھا۔ یہ تیرے محل کے سقف و بام ہیں۔ یہ وہ انگنائی ہے جہاں تو کھیلا کرتا تھا۔ یہ تیری وہ کھلائی ہے جس نے برکھا رت میں کلکتے والا ان ڈلی گایا اور پھر گھر پھر کو رلایا تھا اور یہ تیرے ماں باپ ہیں۔ میری ماں، میری طرف ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھ کر دور سے میری بلائیں لیتیں اور سر پیٹنے لگتی ہیں اور میرے باپ بڑی حسرت کے ساتھ میری طرف آنکھیں اٹھاتے اور "ہائے میرا بیٹا" کہہ کر بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ اور پردہ گر جاتا ہے۔

اب دوسرا پردہ اٹھتا اور منادی کہتا ہے۔ اے جوش دیکھ، یہ تیرا سب سے پہلا شہر درسگاہ سیتا پور ہے، یہ تیرا گنبد غنا اور کعبۂ تہذیب لکھنؤ ہے۔ یہ تیرا آگرہ ہے، یہ تیرا حیدر آباد دکن ہے۔ یہ تیری بمبئی ہے اور یہ تیری دہلی ہے۔ میں ان کی گلیوں میں گھومنے لگتا ہوں، بہت سے جانے پہچانے لوگ مجھے سلام کرتے ہیں اور جب میں ان سے اللہ کے نام پوچھتا ہوں تو پردہ گر جاتا ہے۔

اب تیسرا پردہ اٹھتا ہے اور منادی کہتا ہے اے جوش دیکھ، یہ تیرے بچھڑے ہوئے اور زیر خاک سوئے ہوئے احباب یعنی تیرے مورخانِ شباب ہیں" تو انھیں پہچانتا ہے!! ہاں پہچانتا ہوں۔ ان کو نہیں تو اور کسے پہچانوں گا۔

یہ صف اولیں میں کھڑے ہوئے ہیں، ابرار مختار، مانی، صاحب عالم، مجاز اور مخمور، تم سب تو ہمیشہ چہچہاتے رہتے تھے۔ ارے اب بولتے کیوں نہیں؟۔ تم مجھ کو دیکھ کر مسکرا رہے ہو۔ ہائے

تمہارا تبسم تو آنسوؤں میں ڈوبا ہوا ہے۔ ارے کچھ تو بولو سب رو رہے ہیں۔ اور مجاز اپنا وہی پرانا گیت "بریلی کے بجاریں جھمکا گرا ری" سنا رہا ہے۔ میری ہچکیاں بندھ گئیں اور پردہ گر گیا۔

اب جو تھا پردہ جو چھم چھم کی آوازوں میں اٹھ رہا ہے اور منادی آواز دے رہا ہے۔ دیکھ لے جوش! یہ تیری جوانی کے خیمۂ رقص و رنگ کی گانے اور ناچنے والیاں ہیں اور ایک فتنۂ روزگار بڑی نغمگیں آواز میں گا رہی ہے:

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا دینا!
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا
اے فتنۂ محشر ہم! سوتے ہی نہ رہ جائیں
اس راہ سے گزرے تو ہم کو بھی جگا جانا

سارنگی سے نوحوں کی آواز نکل رہی ہے اور پردہ گر جاتا ہے۔

اب پانچواں پردہ اٹھا ہے اور کہنے والا کہہ رہا ہے دل تھام کر دیکھ لے جوش:۔ یہ تیرے محبوب ہیں جن کے مکھڑوں کی جوت سے تیری بضیں چلا کرتی تھیں، جن کی پل بھر کی جدائی بھی تجھ سے برداشت نہیں ہوتی تھی اور جب روزگار تیرے اور ان کے مابین فصل پیدا کر دیتا تھا تو نیند تیرے پپوٹوں پر صبح تک کبھی نہیں مارتی تھی اور تیرے تکیے روتے روتے بھیگ جاتے۔

اللہ اللہ جگر جگر مکھڑے فضا پر دمک رہے ہیں۔ سب کی انکھڑیوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں کسی کسی نے اپنی زلفیں سوگوارانہ انداز سے بکھرا دی ہیں اور کسی کسی نے اپنا گریبان چاک کر ڈالا ہے اور فضا پر "ہائے اللہ ہائے اللہ" کی آوازیں تیرنے لگتی ہیں کہ عین اس وقت یکایک پشت کی جانب سے ایک آواز آتی ہے "سنو"۔ میں سمجھ جاتا ہوں کہ یہ آواز ہے میری دن بھر کی اکتائی ہوئی بیوی کی۔ اور سنو کے بعد وہ کہنے لگتی ہیں کہ آج نوکر نے حساب میں اتنے پیسے مار لئے، فریج میں پانچ

لہ بات یہ ہے کہ میری بیوی میرے پڑھنے لکھنے کا بہت احترام کرتی ہیں اور ہرگز نہیں چاہتیں کہ وہ میری مشغولیت میں خلل انداز ہوں۔ اسی لئے وہ صبح سے گھر کے دھندوں میں لگ جاتی ہیں لیکن جب بارہ بجے وہ تخت پر بیٹھتیں اور مجھ کو دین و دنیا سے بے پروا پاتی ہیں تو اکتا کر نیچے اتر جاتی ہیں اور سعیدہ سے کہتی ہیں کہ بیٹی میں کس سے بات کروں وہ تو پچھلے پہر سے لے کر شام تک سر جھکائے لکھتے رہتے ہیں اور میں سارا سارا دن خفقانی بنی بیٹھی رہتی ہوں۔ گھنٹے دو گھنٹے کے بعد جب وہ آتی ہیں مجھ کو اسی عالم میں پاتی ہیں اور کبھی کبھی مجھ پر ترس کھا کر کہتی ہیں۔ ارے اتنی محنت نہ کرو۔ خدا نہ کرے بیمار پڑ جاؤ گے اور میں ان سے مسکرا کر کہتا ہوں کہ بیوی تم کو معلوم نہیں ایک بالشت بھر کا فرشتہ، چھوٹا سا

انڈے بچے اب صرف تین باقی ہیں۔ سعیدہ کے منجھلے بیٹے نے آج بڑی بدتمیزی کی۔ میں نے اسے تھپڑ مار دیا، اور ہاں میں نے غزالہ سے کہا تھا اوپر آ کر حساب لکھ دینا وہ ابھی تک نہیں آئی۔ تم اسے بلا کر ڈانٹ دو۔ بیوی کی یہ باتیں سن کر میری جان نکل جاتی ہے۔ میرے سینما ہال سے دھواں اٹھنے لگتا ہے اور میرے سارے پنچھی گھبرا کر اڑ جاتے ہیں۔

لیکن میں نہیں چاہتا کہ میری بیوی اس بھید کو پا جائیں کہ میں ان کی باتوں سے گھبرا رہا ہوں اس لئے ان کی باتوں سے میرے چہرے کا رنگ جب اڑنے پر تل جاتا ہے تو میں جھپٹا مار کر اسے اپنے چہرے پر پھر جما لیتا اور مصنوعی طور پر مسکرانے لگتا ہوں۔ لیکن بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کے آتے ہی جب میں ایڑ لگا کر اپنے چہرے کو شگفتگی کی جانب موڑنا چاہتا ہوں تو میرا چہرہ شریر گھوڑے کی طرح دونوں پاؤں پر کھڑا ہو کر ہنہنانے لگتا ہے۔ میرے دونوں گالوں کی ہڈیاں ابھر آتی ہیں۔ منہ چوڑا ہو کر تو بڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور میری ناک میرے قابو سے نکل کر ڈیڑھ بالشت لانبی ہو جاتی ہے اور ایسا لگنے لگتا ہے کہ یہ میں نہیں ہوں کوئی کالا توا بیٹھا ہوا ہے۔

پستول ہاتھ میں لئے میری میز کے اوپر کھڑا یہ کہہ رہا ہے کہ اگر قلم ہاتھ سے رکھ دیا تو گولی مار دوں گا اور وہ تخت پر گر مرا کر لیٹ جاتی ہیں۔ کبھی کبھی تو ان کی اس تنہائی پر ترس کھا کر میں ان کے پاس جا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ لیکن زیادہ سے زیادہ دس پانچ منٹ کے بعد پھر لکھنے لگتا ہوں اور جب غروب کے بعد میں شغل کرتا ہوں تو وہ یہ سمجھ کر کہ اس وقت میں خالی بیٹھا ہوں میرے پاس آ کر بیٹھ جاتی ہیں اور گھر کی باتیں کرنے لگتی ہیں۔ بیوی بے چاری کو کیا معلوم کہ جس وقت وہ یہ سمجھتی ہیں کہ میں خالی ہوں اس وقت تو میں پرانی یادوں سے لبالب بھرا ہوا بیٹھا ہوتا ہوں اور ایسا بھرا ہوا کہ سانس لینے تک کی گنجائش نہیں پاتا۔ ہائے میری بیوی کہ سہاگن ہونے کے باوجود ان پر بیواؤں کی سی تنہائی چھائی رہتی ہے۔ میرا دل کڑھتا رہتا ہے مگر کیا کروں، کام بہت ہے اور عمر کم رہ گئی ہے۔ چاہتا ہوں کہ میرے سینے میں جو کچھ ہے اسے گھبرا گھبرا کر کاغذ کے سپرد کر دوں۔

میرا دین

میرؔ کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو تم، ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

ایک ہجری انسان کی مانند میں بآواز بلند یہ اعلان کرتا ہوں جو ادھر دیکھ رہا ہے وہ ادھر مڑ جائے جو دور ہے وہ قریب آجائے جس نے اب تک نہ سنا ہو وہ کان کھول کر سن لے جو اب تک مجھ کو مومن سمجھ رہا ہے وہ اپنے حسن ظن سے دست بردار ہو جائے اور جس کے نزدیک میں خدا کا منکر یعنی لفظ خدا کے لامحدود معنی میں منکر ہوں وہ بھی اپنے سوء ظن سے توبہ کر لے کہ میرا دین خیابانِ ذہن انسانی کی تمنائے رنگ و بو، حصول علم و فقدانِ جہل کی آرزو، اور محرک اولین کی مسلسل جستجو کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے اور ہر طرف سے منہ موڑ کر میں کافر باللہ و مومن بالانسان نوائے کائنات سے گرم پیکار جنس آگاہی کے خریدار اور ذرات صید انجم شکار نوع بشر کی طرف نگاہ اٹھا کر یہ کہہ رہا ہوں کہ :- من قبلہ راست کردم، بر طرف کج کلاہے۔

میں بھی ایک زمانہ میں عقل بیزار و عقاید پرست رہ چکا ہوں میری دنیا میں بھی روایت کو درایت پر ترجیح حاصل تھی۔ تیغ روزگار کے رد و بدل میرے ہاتھ میں بھی "مصلحت الٰہی" اور "ہر چہ از دوست میرسد نیکو ست" کی مضبوط سپر تھی۔ میرے گرد و پیش بھی بہت سی مناجاتیں بہت سی ڈھارسیں بہت سی تشفیاں بہت سی تسلیاں، بہت سی امیدیں، بہت سی دعائیں، بہت سی فردا کی گلکاریاں اور بہت سی نجات کی امیدواریاں تھیں اور میرے مشام تک بھی حوران مقصورات کے لبہائے رنگیں کی مہکیں آیا کرتی تھیں۔

لیکن اب میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا ہے۔ میرے دماغ نے مجھ کو لوٹ لیا ہے اور میں اب ٹکسی ہیں تو ادھر ہوں کہ جدھر کچھ بھی نہیں کا مصداق بن کر رہ گیا ہوں اور بے مروت عقل میرے آذر کدۂ تصورات کے تمام خوبصورت مجسموں کو پاش پاش کر کے میرے سامنے کھڑی ہنس رہی ہے۔

ایک زمانہ دراز تک عقل کو آلۂ ابلیس خیال کر کے میں اس سے لڑتا اور اس کا رستہ روکتا رہا لیکن وہ میرے عقائد پر سے یوں گزر گئی جس طرح ڈاک گاڑی ان پتھروں کو پیستی گزر جاتی ہے جن کو بچے پٹری پر رکھ دیتے ہیں۔

اے ایمان والو تمہارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے اور میرا گھر بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ مجھ کو نفرت کی نگاہ سے نہ دیکھو یہ موقع ہے ترس کھانے کا۔

اور اے میرے متفکر احباب تم بھی مجھ پر طنز نہ کرو اور مجھ سے یہ نہ کہو کہ اے نافہم جوشی تو کیسا عجیب آدمی ہے کہ منقولات سے نجات پانے اور معقولات سے قریب جانے پر افسوس کر رہا ہے۔ میں تمہارے طنز کی معقولیت کو تسلیم کرتا ہوں۔ بیشک میں عجیب الخلقت ہوں لیکن اس بات کو نہ بھولو کہ میں ایشیا کا باشندہ ہوں۔ وہ ایشیا جو روایات، اقوال اور اوہام کا پایہ تخت ہے۔ وہ ایشیا جہاں لاکھوں سال سے بھوتوں، چڑیلوں، شہید مردوں، جنوں اور فرشتوں کی کہانیوں کی چھاؤں میں بچوں کو سلایا جا رہا ہے، جہاں بڑے بڑے صوفی اور شاعر حکمت پر جنوں اور عقل پر عشق کو ترجیح دیتے چلے آ رہے ہیں، جہاں روایت کی قربانگاہ پر درایت کو چڑھایا جا رہا ہے۔ جہاں دعائے نیم شب و آہ سحر کو "کلید گنج مقصود" ٹھہرا دیا گیا ہے۔ جہاں "دو دو چار" کے سر کو دو دو پانچ کے آستانہ پر جھکا دیا گیا ہے۔ جہاں "الف لیلہ" "اندر سبھا" "چہار درویش" "اور طلسم ہوشربا" کے تھلیل جگ والے سائے میں ذہنوں کو پالا پوسا جا رہا ہے اور جہاں براہین قاطعہ کی گردنیں پر صدیوں سے کشف و کرامات کی چھریاں چلائی جا رہی ہیں۔ اس ایشیا میں کسی خاص متفکر کا پیدا ہو جانا تقریباً ایک محال امر ہے اس لئے اگر تم یہ دیکھو کہ میں اپنے دماغ کی آبادی اور دل کی بربادی پر کبھی کبھی آزردہ سا نظر آتا ہوں تو مجھے قابل معافی سمجھو اس لئے کہ :۔ "زمین شور سنبل برنہ آرد۔"

اور اے متفکر دوستو! اظہار حقیقت سے شرمانا کیسا۔ میں تم سے اپنے دل کا یہ چور بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ جب کبھی آبار و اجداد مجھ کو پکڑ لیتے ہیں تو میرا جی یہ چاہنے لگتا ہے کہ انھوں نے جو مافوق الفطرت باتیں مجھ سے کہی تھیں، اللہ کرے وہ ساری کی ساری سچ نکلیں مرنے کے بعد میں دوبارہ زندہ ہو جاؤں۔ اپنے بزرگوں اور دوستوں سے ملوں شافع محشر سے اپنے گناہ معاف کرا کے جنت میں جاؤں۔ حوض کوثر کے کنارے جام پر جام لنڈھاؤں اور حور و غلمان کو بھینچ بھینچ کر گلے لگاؤں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سن لیجئے کہ ان کمزور لمحوں کے روزن سے جب میری عقل جھانک کر مجھ کو دیکھ لیتی ہے تو میرے مرجھائے گالوں سے تراق سے تھپڑ مار کر مجھ سے کہتی ہے کہ اے سر بہتر کے بڈھے بول! تو نابالغ کب تک رہے گا۔ تیرے دودھ کے دانت کب ٹوٹیں گے؟ اور اے کھوسٹ تیرے دل میں جو بچہ بیٹھا نیل کر رہا ہے اس کی مسیں کب تک نہیں بھیگیں گی۔

اس جملہ معترضہ کے بعد اپنے موضوع کی جانب مڑ کر یہ عرض کر دینا بھی چاہتا ہوں کہ آج بھی میرے دل میں تمام بانیان مذاہب کا بے حد احترام ہے اور خصوصیت کے ساتھ

قوت دینیات کے شاہکار حضرت محمد عربیؐ، حضرت علیؑ اور حضرت امام حسینؑ کا شیدائی اور آبائی عقاید سے آزاد ہو جانے کے باوجود میں ان مذکرہ بالا تینوں مقتدر ہستیوں کا دل سے پرستار ہوں۔

آنحضرتؐ کے بارے میں اکثر یہ سوچتا رہتا ہوں کہ عرب کی سی جہالت کی راجدھانی میں اور وہ بھی آج سے کچھ اوپر، چودہ سو برس پیشتر ان کا پیدا ہو جانا اور کسی ایک متنفس کی شاگردی کیے بغیر جہان استاد کا مرتبہ حاصل کر لینا روزگار کا ایک ایسا معجزہ عظیم ہے کہ انسانی تاریخ انگشت حیرت کو اپنے دانتوں کے نیچے سے آج کے دن تک نکال نہیں سکی ہے، وہ پیدائشی عالم اور پیدائشی مفکر اور نظری نہیں عملی مفکر تھے۔

انھوں نے جاہلوں کے درمیان حقائق کو آشکار کر کے سقراط کے مانند زہر کا پیالا نہیں پیا، اور حقائق کو دلنشین لباس پہنا کر حشیمۂ حیوان پر قبضہ کر لیا۔

سقراط نے اپنی قوم کی ذہنی سطح سے بلند ہو کر زبان کھولی اس کو ہمیشہ کے واسطے خاموش کر دیا گیا، محمدؐ نے اپنی قوم کی ذہنی سطح پر قدم رکھ کر بات کی اور وہ بات اذان بن کر اس دنیا میں اب تک گونج رہی ہے۔ محمدؐ کو ایسی حیرتناک بصیرت حاصل تھی کہ وہ اپنے گرد بیٹھنے کے لوگوں کی لرزش مژگاں سے ان کے دلوں کی دھڑکنیں شمار کر لیتے اور ان کے انفاس کی درازی و کوتاہی پر نظر جما کر ان کے جذبات و خیالات کا طول و ناپ لیا کرتے تھے۔

وہ ایک طرف تو اپنی قوم کے تمام مکروہات و مرغوبات کے زبردست نباض تھے اور دوسری طرف وہ نوع انسانی کی اس کمزوری کو بھی پا گئے تھے کہ یہ سود و زیاں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا خود پرست حیوان صرف تخویف و تحریص کی وساطت سے راہ راست پر لایا جا سکتا ہے۔

اور اسی لیے وہ دوزخ کے انگاروں اور حوروں کے رخساروں کو دکھا کر اپنی قوم کو راہ راست پر لے آئے۔ انھوں نے ایک مصلح اعظم حکیم کے مانند فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی تقریروں میں ایسی فلسفیانہ موشگافی نہیں برتیں گے جو بے سمجھی پر دہ داری ہو اور ایسی حقائق کشا برہنہ گفتاری سے کام نہیں لیں گے جس سے ایک صحرانشین قوم کی فعالیت میں فرق پڑ سکتا ہے۔

اور اسی دانشمندانہ فیصلے کی بنا پر انھوں نے کاروانِ خیال کی نقل و حرکت کے واسطے

لے اس دھرتی ، تا پر کون ایسا ماں کا لال اور کون ایسا سورما ہے اور کس کے منہ میں اتنے دانت ہیں کہ وہ سینہ ٹھونک کر یہ دعویٰ کر سکے کہ میں آبائی عقاید اور ان عقاید کے پیدا کردہ مزاجی قوم سے کلیتہً آزاد ہو چکا ہوں یہ اور بات ہے کہ مجھ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں آزاد ہو چکا ہوں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ میرا یہ احساس خود ستائی ہے یا خود فریبی، دانشمندی ہے یا حماقت

ایک وجدانی شاہراہ تراش لی اور اس کے دونوں طرف روایات، کنایات، اشارات، تمثیلات اور تشبیہات کے درخت اس قدر پیوستگی کے ساتھ نصب فرما دیئے کہ منطق کی شعلہ بار دھوپ اس شاہراہ کے مسافروں کو جھلسا نہ سکے اور تمام قافلے بے روک ٹوک چلتے رہیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے کلمات کی کھنک، ان کے لہجے کی لچک اور ان کے پراسرار الفاظ کی دھنک کے نیچے اس شاہراہ سے لاکھوں قافلے اب تک گزرتے نظر آ رہے ہیں اور محمدؐ کا دل کروڑوں انسانوں کے سینوں میں آج بھی دھڑک رہا ہے۔

اور پھر دنیا کی سب سے زیادہ انوکھی بات یہ ہے کہ موت کے بھیانک میدان میں حور دوں کے خیمے نصب کر کے انھوں نے عربوں کے خون میں وہ حرارت پیدا کر دی کہ مٹھی بھر آدمیوں نے دیکھتے ہی دیکھتے آدھی دنیا کو مسخر کر کے اپنے خاک نشین کملی والے تاجدار کے قدموں پر ڈال دیا۔

اے غلاموں کو مقام فرزندی تک لانے والے، اے قاتلوں کو مسیحائی کے گر سکھانے والے اے انگاروں میں پھول کھلانے والے، اے خوف و حزن کو علامت کفر بتانے والے اور اے رگ ہائے ذرات میں نظام شمسی کا لہو دوڑانے والے۔

اے وحشیوں کو بردباری، اے زلزلوں کو تمکین شعاری اور اے عزائم انسانی کو آفاقی شکاری عطا فرمانے والے، اے لاوارثوں کے وارث، اے بے آسراؤں کے سہارے، اے یتیموں کے باپ اور اے بیواؤں کے سہاگ، اے حرف ناشناس معلم، اے سفرنہ کردہ سیاح اے فاقہ کش رزاق، اے تخلق کی برہان عظیم، اے امی حکیم، اے خدیو اقلیم حبل المتین، اے اولاد آدم کی فتح مبین، اے ناموسِ مار وطین اور رحمۃ للعالمین روحِ کائنات کا سجدۂ تعظیمی قبول فرما۔

محمدؐ کے بعد ان کے نازش روزگار بھائی علیؑ کی طرف اپنی ٹوپی سنبھال کر نگاہ اٹھایئے۔

ہزاروں ماہ و سال کے تجربوں کے بعد یہ کلیۂ قائم کیا گیا ہے کہ علم اور شجاعت یہ دو ایسے اضداد ہیں جو کبھی ایک ذات میں، جمع نہیں ہو سکتے۔ جس ہاتھ میں تلوار ہوتی ہے وہ قلم کو اپنی انگلیوں کی گرفت میں نہیں لا سکتا اور جس ہاتھ میں قلم ہوتا ہے وہ تلوار نہیں اٹھا سکتا لیکن انسانی تاریخ میں علیؑ کا ہاتھ وہ تنہا جامع اضداد ہاتھ تھا جو تلوار اور قلم دونوں کو مساوی روانی کے ساتھ چلا سکتا تھا۔

وہ ادیب، شاعر اور مفکر تھے اور ایسی کے دوش بدوش عدیم النظیر سپاہی بھی۔ وہ صفحۂ قرطاس پر مجسم فلکِ گہربار اور میدان کارزار میں سراپا شمشیر آبدار تھے۔

وہ اس کی پروا نہیں کرتے تھے کہ موت ان پر گرے یا وہ موت پر ان دونوں کو وہ مساوی طور پر محبوب سمجھتے تھے اس لئے کہ ان کی نگاہوں نے موت کی پیشانی پر حیات ابدی کا جھومر دیکھ لیا تھا۔

اس کے علاوہ ان کو ایک ایسی جوان بختی و برکت بھی حاصل تھی جس سے اس دور کا کوئی انسان بہرہ ور نہیں ہوا تھا اور جس نے ان کو اپنے تمام معاصرین پر وہ فوقیت بخش دی تھی جو آفتاب کو ذرات پر حاصل ہے اور وہ فوقیت یہ تھی کہ انھوں نے جو چہرہ سب سے پہلے دیکھنے کی طرح دیکھا وہ محمدؐ کا چہرہ تھا اور انھوں نے جو آواز سب سے پہلے سننے کی طرح سنی وہ محمدؐ ہی کی آواز تھی۔

محمدؐ نے ان کو گود میں پالا۔ اپنی شخصیت کے سانچے میں ڈھالا، اپنے ساتھ میں پروان چڑھایا اور وہ ان کے وجود میں اس طرح جذب ہو گئے کہ علیؑ کے اپنے انفاس سے بوئے محمدؐ آنے لگی جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ علیؑ حق پر اس مضبوطی سے قائم ہو گئے کہ وہ حق کا جسم، حق کی جان، حق کا اعلان اور حق کی آواز بن گئے اور یہاں تک کہ حق کو علیؑ سے اور علیؑ کو حق سے پہچانا جاتا تھا اور چونکہ ہر آن و ہر نفس حق پر قائم رہنا ایک بہت بڑا خطرناک مرحلہ ہے اس لئے ان کی زندگی کبھی پنپ نہیں سکی۔ دنیا والے ان کی حق پرستی کو برداشت نہیں کر سکے اور تو اور خود ان کے حقیقی بھائی ان کا ساتھ چھوڑ کر اس ایوان میں چلے گئے جہاں اسلام کے سر پر شاہی تاج رکھ دینے کے منصوبے تیار کئے جا رہے تھے اور جہاں شہد میں اس نیت سے زہر ملایا جا رہا تھا کہ اربابِ حق کو موت کے گھاٹ اتار کر باطل کو تخت شاہی پر بٹھا دیا جائے۔ علیؑ کی حق پرستی کی تاب نہ لا کر مسلمانوں کی ایک جماعت کثیر نے ان سے منہ پھیر لیا تھا اور یہاں تک کہ انھیں آخر کار یہ کہنا پڑتا تھا کہ دنیا نے مجھے ذلیل و خوار کر دیا، ذلیل کر دیا، ذلیل کر دیا۔ اور اس قدر کہ میرا اور معاویہ کا تقابل کیا جانے لگا۔

علیؑ کی زندگی اس کرۂ ارض کے تمام انسانوں کے مانند محرومی و ناکامی کے سوا انھیں کوئی اور چیز نہیں دے سکی لیکن جب انھیں قتل کر دیا گیا تو ان کی موت نے ان کی قبر پر وہ چراغ عظمت جلا دیا جس سے ان کی زندگی کو محروم کر دیا گیا تھا۔

ان کے کامگار حریف اپنے تمام کر و فر کے ساتھ وقت کے سمندر میں ڈوب چکے ہیں، لیکن ان کی زندگی کی تمام ناکامیوں کے باوجود ان کا نام تاریخ انسانیت کی پیشانی پر آج تک دمک رہا ہے، اور وہی لوگ جنھوں نے ان کی طرف سے منہ موڑ لئے تھے ان کی موت کے بعد جب کسی بلا میں گرفتار ہوتے تو "یا علیؑ" کے نعرے لگانے لگتے ہیں۔

اے علیؑ، شرافت انسانی، تیرے ان دو اخلاقی معجزوں کو قیامت تک فراموش نہیں کر سکے گی کہ جب تیرے حریف نے تیرے منہ پر تھوک دیا تھا تو نے اس کی جان بخشی فرما دی تھی اور موت کے وقت جب تیرے سامنے شربت کا پیالہ پیش کیا گیا تھا تو نے یہ کہا تھا کہ جب تک میرے قاتل کو شربت

نہیں ہلایا جائے گا میں نہیں ہوں گا۔

اے علیؑ، اے میدان جنگ کے سورما رجز خواں، اے منبر امن کے شیریں سخن خطیب، اے ایوان عدل کے دیدہ ور قاضی، اے کشور سیف و قلم کے خدیو کج کلاہ، اے نان جویں کی بے پناہ طاقت کے مظہر، اے زندگی کے معتوب، اے موت کے محبوب، اے علت العلل کے باب میں لا اغفور لا ایچمن اور لا قصر اور لا اھو کی سی معنی خیز خیال انگیز بات کہہ کر خاموش ہو جانے والے مفکر، سیف و قلم کا نجرا قبول کر۔!

اب دل مقام کو نگاہ اٹھایئے علیؑ کے سورما بیٹے اور محمدؐ کے لہولہان نواسے حسینؑ کی جانب جو تاریخ کے سینے کا ناسور اور گزراں وقت کی پیشانی کا نور ہے۔

وہ حسینؑ جس کے لبوں کی خشکی دیکھ کر فرات کی موجیں آب آب ہو کر رہ گئی تھیں اور جس کے چہرے کی شادابی دیکھ کر کربلا کے تپتے سورج کے ماتھے سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگی تھیں۔

وہ حسینؑ جس نے اس ارادے سے کہ ایوان حق کے چراغوں پر کوئی آنچ نہ آسکے اپنے گھر کے تمام چراغوں کو بجھا دیا تھا۔ اور ناموس انسانی کو بچانے کی خاطر جس نے فولاد کو پگھلا دینے والے عزم اور زلزلوں کی سانس اکھاڑ دینے والے ثبات کے ساتھ موت سے ٹکر لی تھی اور ایسی ٹکر کہ موت کی پیشانی سے لہو کا فوارہ جاری ہو گیا تھا۔ حسینؑ ناتواں تھے، یزید توانا تھا۔ قانون قدرت کے مطابق ہونا یہ چاہیے تھا کہ یزید حسینؑ کو شکست دے کر حسینیت کا چراغ گل کر دیتا۔

لیکن ہوا یہ کہ قانون قدرت کے علی الرغم حسینؑ کی ناتوانی نے یزید کی توانائی کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا اور اپنی مقبولیت کی ایک ضرب سے قاتل کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ وہ موت جس کے تصور سے بڑے بڑے ساونتوں کی پنڈلیاں کانپنے لگتی ہیں وہ موت منہ کھولے جب حسینؑ کے سامنے آئی تو حسینؑ اس کو دیکھ کر ایسی حقارت سے مسکرائے کہ خود موت کی نبضیں ساقط ہو کر رہ گئیں۔

سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ اس وقت بھی جبکہ تیروں کا موسلادھار مینہ برس رہا تھا اور حسینؑ اپنے رفیقوں اور جگر گوشوں کی لاشیں میدان سے اٹھا اٹھا کر بار بار خیمے کی طرف جا رہے تھے اور اس سے زیادہ حیرت یہ ہے کہ جبکہ ان کے تمام انصار و اقربا موت کی نیند سو چکے تھے اور ان کا قتل ایک یقینی امر بن چکا تھا اس نازک ترین اور مہلک لمحہ میں بھی ان کے حواس بجا تھے اور ایک بہادر سپاہی کا حوصلہ مندانہ تبسم ان کے لبوں پر کھیل رہا تھا۔ اور یہ دیکھ کر ہیبت باطل سے حق کا چہرہ زرد ہو چلا ہے وہ اس پر سرخی دوڑانے کیلئے بڑے اطمینان کے ساتھ اپنا خون روانہ کر رہے تھے۔ صرف یہی نہیں کہ اس یقینی ہلاکت کے موقع پر ان کے حواس بجا تھے بلکہ تاریخ انسانی کی سب سے بڑی قربانی دے چکنے کے بعد بھی ان کے چہرے پر اس فرد ماتم کی ایک معمولی سی دھاری بھی رونما نہیں ہوئی تھی اور ان کی زبان سے ایک ایسا آدھا لفظ بھی ادا نہیں ہوا تھا جس سے پتہ چلتا کہ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اے اہل اسلام! میں

نے عترتِ اسلام کے آفتاب کو ڈوبنے سے بچا کر تم پر احسان کیا ہے اور میں نے اپنے واسطے یہ حق خرید لیا ہے کہ تم مجھ کو ایثار کا دیوتا سمجھ کر میرے سامنے اپنی گردنیں جھکا لو۔

اے حسینؑ! اے دریائے زہر سے آبِ حیات پینے والے، اے بپھرے طوفان کو اپنے سفینے میں ڈبو دینے والے، اے حریمِ شہادت کے سب سے اونچے منارے، اے ہمتِ مردانہ کے اوتار، اور ثبات و عزم کے پروردگار! ازل سے لیکر ابد تک کے انسانیت کے غلامانہ سلام قبول کر۔

لیکن میری زبان سے ان متذکرہ بالا اعیانِ ممکنات کی تعریف سن کر اس مغالطے میں نہ پڑ جائیے گا کہ میں کسی دینی یا اعتقادی بنیاد پر ان کا مداح سرا ہوں۔ میرے ان کے مابین جو رابطہ ہے وہ صرف انسانی صفات کی بنیاد پر قائم ہے اور اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ میں سقراط، مزدک، زرتشت، گوتم بدھ، مہاویر، تلسی داس، کنفیوشس، مسیح، کبیر داس، گرو نانک، مارکس، لینن، نطشے اور برٹرنڈ رسل کا بھی جان و دل سے شیدائی ہوں اور جب تک کہ رام چندر اور کرشن کے متعلق مجھ کو یہ علم نہیں ہوا تھا کہ وہ دونوں تاریخی انسان نہیں صرف اساطیری کردار ہیں اسوقت تک میں ان کا بھی بہت احترام کرتا تھا لیکن ان متذکرہ بالا شخصیتوں کی شیفتگی کے یہ معنی نہیں کہ میں ان کا ہم خیال اور پیرو بھی ہوں۔

بات یہ ہے کہ مبلغانِ ادیان و مصلحانِ اذہان نے جس "خشتِ اول" پر اپنے نظام کے قصور تعمیر فرمائے ہیں وہ "خشتِ اول" سائنسدانوں کی سی کرید اور کھرے سونے کی سی تحقیقی نیت کے باوجود آج تک میرے ذہن کی گرفت میں نہیں آسکی ہے۔

اور یہی میرا دیانتدارانہ اعترافِ جہل ہے جس کو یاروں نے الحاد، عدم ایمان اور ارتداد کا نام دیکر میرے خلاف ایک غوغا بلند کر رکھا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ میری عقل کا قصور ہو، لیکن یار لوگ اس کو میری نیت کا فتور سمجھ بیٹھے ہیں اور لطف یہ کہ جو لوگ مجھ سے برافروختہ ہیں وہ علت العلل یا محرکِ اولیٰ کے باب میں مجھ سے بھی زیادہ جاہل ہیں۔ ان کو اپنے جہل کا علم نہیں اور اسی بنیاد پر وہ دیندار ہونے کے مدعی ہیں۔

کاش ان کو اس بات کا پتہ ہوتا کہ ہمارا ایمان اس پیڑھی در پیڑھی کے خلہ ہے جس کو ہم نے والد مرحوم کے ترکے میں پایا ہے۔ ہمارا ایمان تحقیقی نہیں تقلیدی ہے۔ ہم حادثۂ اتفاقی کے طور پر مسلمان کے گھر میں پیدا ہو گئے ہیں۔ اسلئے مسلمان ہیں۔ اگر یہودی کے گھر میں پیدا ہو جاتے تو ہم سے بڑا یہودی کوئی نہ ہوتا اور معتقدات کا یہ فرسودہ محل ٹھوس کھوپڑی پر نہیں کھوکھلے کانوں پر تعمیر فرمایا گیا ہے۔ اب رہا علت العلل اور محرکِ اولیں کا مسئلہ جس کو "خدا" "بھگوان" "اللہ" "یہوا" "مزدا" یا "گاڈ" کے نام دئے گئے ہیں جو تنزیہ کے دائرے میں "نور" یا "ہو" ہے لیکن تشبیہ کے میدان میں ایک مطلق العنان

بادشاہ — اور ان نول کا سا مزاج رکھنے والا انتہائی طاقتور شخص ہے۔ سو یہ بحث تقریباً الجھی ہوئی ہے کہ اس کے واسطے اس کتاب میں گنجائش نکالی نہیں جا سکتی۔

بہرحال میں اقرار و انکار کے دو کے بیچوں بیچ بیٹھا ہوا ہوں۔ نظام شمسی کو دیکھتا ہوں تو کہیں کوئی خلا نظر نہیں آتا۔ دل کو قرار آنے لگتا ہے اور نظام ارضی کو دیکھتا ہوں تو اس میں کروڑوں خلا نظر آتے ہیں اور حیات انسانی کی عبرتناک بے ثباتی اور اس کے بے کراں دردمندیوں پر نگاہ کرتا ہوں تو دل انکار پر مصر ہو جاتا ہے۔

نوع انسانی ابھی تک اس قدر جہل میں گرفتار ہے کہ ہم اپنی موجودہ ذہنی سطح پر بیٹھ کر نہ اقرار کر سکتے ہیں نہ انکار۔

اقرار یا انکار کا موقع اس وقت آئے گا جب ہم ذرے سے لے کر آفتاب تک کے علم پر حاوی ہو جانے کے بعد علت العلل کے ہر پہلو کو خوب ٹھونک بجا کر دیکھنے کے قابل ہو جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ اس آخری منزل تک پہنچنے میں ابھی لاکھوں سال بیت جائیں گے اور میں اسی تذبذب کے عالم میں خالی ہاتھ دنیا سے اٹھ جاؤں گا۔

لیکن مجھ کو یقین کامل ہے کہ لاکھوں یا کروڑوں برس کے بعد ہی سہی مگر ایک دن ایسا ضرور آئے گا کہ نوع انسانی آخر کار روح کائنات کو اپنی مٹھی میں لے لے گی اور پوری کائنات پر فرمانروائی کرنے لگے گی۔

جس وقت بفیض مشق فکر جولاں
انسان بنے گا تاجدار دوراں
مجھ کو نہ ملا تو لے نگار آفاق
بچ کر مری اولاد سے جائے گا کہاں

میرا خاندان

میرے پردادا

تہور جنگ حسام الدولہ نواب فقیر محمد خاں بہادر گویاؔ ان کے دادا یار بیگ خاں درۂ خیبر کے سرداروں میں سے تھے۔

یار بیگ خاں کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام محمد نامدار خاں اور چھوٹے کا محمد بلند خاں

ٰ کتاب کی طباعت سر پر آ گئی ہے۔ وقت نہیں کہ تاریخوں سے حضرت گویاؔ کے تمام حالات جمع کرکے قلمبند کردوں اسلئے اختصار سے کام لونگا۔ ان کے تفصیلی حالات مندرجہ ذیل تاریخوں اور تذکروں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

سراپا بخت جلد ۵ مختصر تاریخ محتشم خاں مسیر نواب محبت خاں۔ تاریخ وقائع تاریخ امیر نگر نامہ مظفری تذکرہ شعراء از ابن امین اللہ خاں طوفان، بوستان اودھ از راجہ درگا پرشاد سندیلہ، تاریخ آفتاب اودھ سیرت سید احمد بریلوی، از ابوالحسن علی، تاریخ امیر خانی، قیصر التواریخ از کمال الدین حیدر زار لکھنوی، لکھنؤ گزیٹیر از مسٹر نیل آئی سی ایس، تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ۔ تاریخ نظم اردو از محمد باقر ایم اے دہلی، داستان اردو از حامد حسن قادری۔ تاریخ اودھ، الیسٹ انڈیا کمپنی از ڈاکٹر باسو۔ تاریخ غازی الدین حیدر از محمد تقی ایم اے پی ایچ ڈی لکھنؤ۔ تاریخ واجد علیشاہ از ڈاکٹر بھٹناگر۔ خطوط گویا کتب خانہ ٹونک و دارالانشاء (رامپور) تذکرہ خوش معرکہ زیبا از سعادت علیخاں ناصر لکھنوی، تذکرہ گلشن بے خزاں از نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ۔ تذکرہ شعرائے اردو از عبدالغفور نساخ کلکتہ۔ تذکرہ شعرائے اردو از صغیر بلگرامی تاریخ عمادۃ السعادت از غلام علی آزاد۔ تذکرہ ریاض الفصحاء از مصحفیؔ۔ روزنامچہ قاضی کا کوروی تہنیت فقیر محمد بہادر گویا۔ (قاضی غظیم ملیح آبادی) تاریخ فرخ آباد شیو پرشاد۔ قدیم نسخہ قلمی تاریخ (کتب خانہ سید مسعود حسن رضوی لکھنؤ) تذکرہ آب حیات از آزاد۔ شعرالہند از عبدالسلام ندوی۔ لمعات القلندریہ (تکیہ شریف کاکوروی) شباب لکھنؤ از احمد علی لکھنوی تاریخ داستان اودھ از ڈاکٹر اگیان چند جین ایم اے اور اودھ کے پہلے دو نواب "TWO PAST TWO NAWABS OF OVADH" از اشر باری لال سریواستو

(دستخط)

نامدار خاں درۂ خیبر ہی میں رہے اور محمد بلند خاں آفریدیوں کے ایک قبیلہ اور اپنے دونوں بیٹوں محمد عوض خاں اور فقیر محمد خاں کو ساتھ لیکر ۱۲۴۳ھ میں ہندوستان چلے آئے۔ اور قائم گنج ضلع فرخ آباد میں سکونت اختیار کرلی۔

اس کے بعد کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ انھوں نے اودھ کا رخ کیا اور لکھنؤ آکر مقیم ہوگئے اور جب نواب غازی الدین حیدر کے دربار تک رسائی کا موقع مل گیا تو نواب نے ان کو تین سو روپے ماہانہ پر فوج میں کوئی عہدہ دے دیا۔

ایک روز موقع پاکر محمد بلند خاں نے نواب سے کہا میں آزاد قبائل کا فرد ہوں۔ کھلی ہوا میں رہنے کی عادت ہے شہر میں میرا دم گھٹتا ہے مجھ کو اطراف لکھنؤ کے کسی ایسے قصبے میں زمین دیدی جائے کہ میں وہاں سے روز لکھنؤ آؤں اور فرائض منصبی انجام دیکر شام کو وہاں چلا جاؤں۔

نواب نے کہا آپ اطراف لکھنؤ میں کوئی قصبہ منتخب کریں زمین آپ کو دیدی جائے گی۔

محمد بلند خاں نے تمام قریہ دیہات اور قصبات کا دورہ کرکے کنول ہار کو پسند کیا جو آفریدیوں کا گڑھ اور ملیح آباد کا ایک محلہ ہے۔ زمین ان کو دیدی گئی اور انھوں نے وہاں ایک کچا مکان بنا کر بودوباش اختیار کرلی۔ اور اب ان کا یہ معمول ہوگیا کہ صبح گھوڑے پر لکھنؤ جاتے اور شام کنول ہار پلٹ آتے تھے۔

کنول ہار میں انھوں نے اپنے دونوں بیٹوں محمد عوض خاں اور فقیر محمد خاں کی تعلیم کا سلسلہ شروع کردیا۔

کچھ روز کے بعد ان کے بڑے بیٹے محمد عوض خاں تعلیم سے بددل ہوکر ریاست اندور چلے گئے اور مہاراجہ ہلکر کی فوج میں رسالداری کے عہدے پر فائز ہوگئے۔

کنول ہار سے چلتے وقت انھوں نے یہ چاہا کہ اپنے چھوٹے بھائی فقیر محمد خاں کو بھی جن کی عمر اس وقت تیرہ چودہ سال کی تھی اپنے ساتھ اندور لے جائیں۔ لیکن فقیر محمد خاں نے کہا میری تعلیم ادھوری رہ جائیگی آپ جائیں میں تعلیم سے فراغت پاکر آپ کے پاس چلا آؤنگا۔

اس کے پانچ چھ سال کے بعد جب فقیر محمد خاں فارغ التحصیل ہوگئے تو بڑے بھائی کے پاس اندور چلے گئے اور بھائی نے ان کو بھی رسالداری کا منصب دلایا۔

اس کے کچھ روز بعد مہاراجہ ہلکر کو یہ خبر ملی کہ پڑوس کا ایک راجہ اندور پر چڑھائی کی نیت سے آیا ہے۔ اندور کے قریب اس کی فوج کا پڑاؤ ہے اور صبح ہوتے ہی حملہ ہونے والا ہے۔ یہ سنتے ہی مہاراجہ ہلکر نے بگل بجوایا اور اپنی فوج کو حکم دیا کہ صبح دشمن پر حملہ کردیا جائے۔ اسی رات کو فقیر محمد خاں نے کہا بھائی اب صبح ہوتے ہی میدان جنگ میں اترنا ہے۔ دیکھئے کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ انکی یہ بات سن کر

بڑے بھائی کے دل میں یہ بدگمانی پیدا ہو گئی کہ چھوٹا بھائی علم حاصل کر کے بزدل ہو گیا ہے۔ اسے راتوں رات ہی قتل کیوں نہ کر دوں تاکہ خاندان کی عزت پر حرف نہ آنے پائے لیکن برادرانہ محبت جوش میں آ گئی۔ انھوں نے سوچا کہ جب میدان جنگ میں یہ دیکھوں گا کہ یہ لڑنے سے جی چرا رہا ہے اس وقت اس کا کام تمام کر دوں گا ابھی جلدی نہ کرنا چاہئے۔

لیکن صبح ہوتے ہی جب میدان کارزار گرم ہوا تو ان کو دیکھ کر حیرت ہو گئی کہ ان کا اٹھارہ سال کا چھوٹا بھائی صفوں سے آگے بڑھ بڑھ کر دشمن پر نیزہ بازی کر رہا ہے۔ یہ جوانمردی دیکھ کر ان کا دل باغ باغ ہو گیا۔

معرکہ بے حد سخت تھا لیکن یہ دونوں بھائی اس جوانمردی کے ساتھ لڑے کہ راجہ ہلکر کی فوج کا حوصلہ بلند ہو گیا اور دن ڈھلتے ڈھلتے دشمن کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور حملہ آور راجہ بھاگ کھڑا ہوا۔

فقیر محمد خاں نے اس راجہ کا تعاقب کیا۔ بیس بیل کا حملہ طے کر کے اسے گرفتار کر لیا اور مہاراجہ ہلکر کے قدموں میں لا کر ڈال دیا۔ اس واقعہ کے بعد ڈنکے پٹ گئے۔ دونوں بھائیوں کی بہادری کے چرچے ان کی شجاعت اور کارناموں کا غلغلہ راجپوتانہ سے سفر کر کے ٹونک پہنچا تو نواب میر خاں والی ٹونک نے مہاراجہ ہلکر کے پاس برادرانہ خط بھیجا کہ ان دونوں بھائیوں کو مجھے دیدیجئے۔

مہاراجہ ہلکر بڑے شش و پنج میں پڑ گیا۔ سوچا کہ اگر ان دونوں کو بھیج دوں گا تو میری فوج میں پھوٹ پڑ جائے گی اور اگر نہیں بھیجوں گا تو نواب میر خاں سے بگاڑ پیدا ہو جائیگا اور ان کے سے زبر دست آدمی سے بگاڑ پیدا کر لینا خطرے سے خالی نہیں۔ ان تمام باتوں پر غور کر کے اس نے والئ ٹونک کو لکھا کہ میرے آپ کے برادرانہ تعلقات ہیں۔ آپ اگر میری اس تجویز کو مان لیں تو میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں گا کہ ان دونوں میں سے ایک بھائی محمد عوض خاں میری فوج میں رہیں اور دوسرے بھائی فقیر محمد خاں آپ کے پاس چلے جائیں۔ نواب میر خاں نے یہ بات مان لی اور فقیر محمد خاں ٹونک چلے گئے۔ نواب میر خاں نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور رسالدار بنا دیا۔

ٹونک میں اس وقت فارسی و عربی کے علوم کا ہجوم تھا۔ فقیر محمد خاں وقت نکال کر ان بزرگوں سے اکتساب علوم کرنے لگے۔

اس کے بعد نواب میر خاں اور انگریزوں کے مابین جنگ چھڑ گئی اور چونکہ نواب میر خاں کے مانند، فقیر محمد خاں بھی انگریزوں کے جانی دشمن تھے۔ انھوں نے بڑے ولولے کے ساتھ لڑنا شروع کر دیا۔ پنڈارے انگریزوں کے مددگار اور گورروں کے دوش بدوش نواب میر خاں کی فوج سے برسر پیکار تھے۔

ﻪ یہ سارا ماجرا دادی جان نے مجھ سے کہا تھا۔

پنڈاروں نے فقیر محمد خاں کے تیور دیکھ کر یہ سوچا کہ اگر ان کو ہلاک کر دیا جائے تو نواب میر خاں کی فوج بھاگ کھڑی ہو گی۔ اس لئے ایک پنڈارے نے ان پر توپ چلا دی۔ گولا ان کی ران میں آ کر لگا۔ وہ گھوڑے سے گر پڑے۔ ایک پنڈارا تلوار سونت کر ان کی طرف جھپٹا۔ انھوں نے بیٹھے بیٹھے اس کے اس طرح نیزہ مارا کہ وہ گر پڑا۔ نواب میر خاں کی نظر پڑی۔ گھوڑا دوڑاتے ہوئے آئے اور پنڈارے کا ایک ہاتھ میں کام تمام کر دیا اور چاہا کہ انھیں اٹھا کر گھر پہنچا دیں تاکہ فوراً مرہم پٹی ہو جائے۔ فقیر محمد خاں نے کہا میں نے زخم کو خوب کس کر باندھ لیا ہے سپاہی جیتے جی میدان چھوڑ کر نہیں بھاگتا۔ آپ یہ توپ میرے قریب کرا دیں میں بیٹھے بیٹھے دشمن پر گولہ باری کروں گا اور انھوں نے اس قدر کثرت کے ساتھ دشمن پر گولے برسائے کہ انگریزی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔

جنگ فتح ہوتے ہی ان کی مرہم پٹی کی گئی اور دو تین مہینے کے اندر وہ زخم بھر گیا۔ نواب میر خاں نے خوش ہو کر ان کا عہدہ بڑھا دیا اور بھائیوں کی طرح سلوک کرنے لگے۔

اس کے کچھ روز کے بعد نواب میر خاں نے فقیر محمد خاں کو حکم دیا کہ وہ جے پور اور اس کے بعد بھوپال پر حملہ کریں۔

جب انھوں نے جے پور اور اس کے بعد بھوپال پر حملہ کیا تو دونوں جگہ ایک ہی معاملہ پیش آ گیا رانی جے پور اور بیگم بھوپال نے جب یہ دیکھا کہ فقیر محمد خاں کا مقابلہ آسان نہیں ہے تو بالکل پہلے اپنے دو بچے بندھوا کر سرا میں اڑانا شروع کر دیئے کہ ہم صلح پر آمادہ ہیں۔

فقیر محمد خاں کا جب سامنا ہوا تو رانی جے پور اور بیگم بھوپال دونوں نے یہ استدعا کی کہ ہم کو اپنی بہن بنا لیجئے اور انھوں نے ان کی درخواست قبول کر لی اور اس رشتے کو یہاں تک نباہا کہ جب کبھی کسی نے جے پور یا گوالیار پر حملہ کیا انھوں نے فوراً موقع پر جا کر ان کو بھگا دیا۔

اسی دوران میں نواب میر خاں نے فقیر محمد خاں کو بعض مسائل طے کرنے کی غرض سے اپنا سفیر بنا کر اودھ روانہ کر دیا۔

ان کی شجاعت اور فن جنگ کا غلغلہ اودھ اور نواب تک بھی پہنچ چکا تھا جب وہ سفیر کی حیثیت سے نواب غازی الدین حیدر والئی اودھ سے ملے نواب نے ان کو بڑی حیرت سے کہا۔ خاں صاحب! آپ خالی بہادر ہی نہیں ایک بڑے دانشمند اور ذی علم انسان بھی ہیں۔ آپ کو جانے نہیں دوں گا۔

انھوں نے عرض کیا کہ خداوند نعمت میں تو ایک مدت سے اودھ کا باشندہ ہوں میرے باپ محمد طیب خاں آپ کی سرکار میں ملازم تھے۔ وہ ملیح آباد میں موجود ہیں۔ غازی الدین حیدر نے کہا پھر تو آپ حق بحق دار رسید کی طرح اپنے وطن ہی میں آ جائیں گے۔

اس پر انھوں نے کہا لیکن یہ بات آئین وفاداری اور اصول شرافت کے منافی ہے کہ میں والیٔ ٹونک کی رفاقت کو ترک کر دوں۔

نواب نے کہا، خانصاحب! میں ابھی اس مسئلہ کو حل کئے دیتا ہوں اور ہرکارے کو حکم دیا کہ نواب معتمد الدولہ آغا میر وزیر اودھ کو حاضر کرے۔

آغا میر کے آتے ہی انھوں نے حکم دیا کہ اپنا جانب کی طرف سے نواب میر خاں کو خط لکھ کر فقیر محمد خاں کو مانگ لو۔

خط روانہ کر دیا گیا اور چند روز کے بعد آغا میر نے ان کو مطلع کر دیا کہ والیٔ ٹونک نے ہماری بات منظور کر کے آپ کو اودھ میں رہ جانے کی اجازت دیدی ہے۔

انھوں نے کہا جب تک نواب میر خاں مجھ کو براہ راست خط لکھ کر اجازت نہیں دیں گے میں اودھ کی ملازمت قبول نہیں کرونگا

اور جب تھوڑے دن میں ان کے پاس نواب میر خاں کا براہ راست خط آ گیا تو انھوں نے سرکار اودھ کی پیشکش قبول کر لی اور یہ عرض کیا کہ خداوند نعمت کی ملازمت قبول کرنے سے پیشتر میری دلی تمنا یہ ہے کہ ملیح آباد جا کر اپنے باپ کی قدمبوسی کر آؤں۔

غازی الدین حیدر نے آغا میر کو حکم دیا کہ فقیر محمد خاں کو ہاتھی پر ملیح آباد روانہ کر دیا جائے۔ تین سو سوار اور نقیبوں کا ایک ٹولی بھی ان کے ساتھ کر دی جائے اور جب اس تزک و احتشام کے ساتھ وہ ملیح آباد پہنچے کر ان کے ہاتھی کے پیچھے تین سو سوار ہیں اور ان کی ہاتھی کے آگے آگے نقیبوں کی ایک ٹولی فقیر محمد خاں بہادر کی سواری آرہی ہے کے نعرے لگا رہی ہے تو وہاں کے پٹھان یہ سمجھے کر کوئی بادشاہ ادھر سے گزرتا ہوا سندیلے جا رہا ہے۔

اور ان کے باپ نے جب یہ سنا کہ نقیب فقیر محمد خاں کا نام لے رہے ہیں تو انھوں نے لوگوں سے کہا ارے یہ تو میرے بیٹے کا نام ہے۔ یہ سن کر پٹھانوں نے قہقہہ مارا اور ایک صاحب نے بطور طنز یہ کہا کہ جی ہاں آپ کا بیٹا بادشاہ بن کر آرہا ہے اور آپ کے اس کچے مکان میں دربار کرے گا۔

اس پر محمد بلند خاں نے کہا مسخرو ہنستے کیا ہو، اللہ کو فضل کرتے دیر نہیں لگتی۔

اس کے بعد جب وہ "شاہی سواری" سندیلے کا راستہ چھوڑ کر کنول ہار کی طرف مڑنے لگی تو تمام پٹھانوں کے منھ کھلے کے کھلے رہ گئے اور پوری آبادی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر دیکھنے لگی اور جب وہ جلوس محمد بلند کے مکان کے سامنے آ کر ٹھہر گیا۔ تمام لوگ ادھر دوڑ پڑے اور حلقہ باندھ

کو کھڑے ہو گئے۔

فقیر محمد خاں کی نظر جب اپنے باپ پر پڑی، انہوں نے ہاتھی کے بیٹھنے کا بھی انتظار نہیں کیا دھم سے اس کی پیٹھ پر سے "باوا باوا" کہتے کود پڑے، اور جا کر باپ کے قدموں پر سر رکھ دیا باپ نے "ارے میرا فقیرا" کا نعرہ لگا کر بیٹے کو قدموں سے اٹھا کر کلیجے سے لگا لیا اور بوڑھے باپ کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے۔

باپ کی قدم بوسی کا شرف حاصل کر کے، جب وہ لکھنؤ واپس آئے، غازی الدین حیدر نے ان کو پچیس ہزار سواروں کا رسالہ دار بنا دیا۔ اس کے کچھ دن بعد وزارت مال بھی ان کے سپرد کر دی اور اسی کے ساتھ انہیں "سرکار خیر آباد" کا گورنر بنا دیا۔ اس کے دوش بدوش غازی الدین حیدر نے گولا گنج میں زمین کا ایک بہت بڑا قطعہ بھی ان کے حوالے کر دیا اس قطعے کے انہوں نے دو ٹکڑے کر دیئے، ایک ٹکڑے کا نام "احاطہ پختہ فقیر محمد خاں" اور دوسرے احاطہ کا نام احاطہ خام فقیر محمد خاں رکھ دیا۔

احاطہ پختہ فقیر محمد خاں میں متعدد محلات تعمیر کرا کے خود رہنے لگے اور احاطہ خام میں اپنے ذاتی سپاہیوں اور کارندوں کو آباد کر دیا[1] ملیح آباد سے ایک میل کے فاصلے پر انہوں نے میرزا گنج میں سینکڑوں ایکڑ زمین خرید کر، وہاں اپنے محل بنائے۔ بارہ دری کی آم کے باغ نصب کرائے اور گرمیوں کے واسطے ایک پختہ برف خانہ بنوا دیا۔

اسی اثنا میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس سے ان کے اخلاص اور ان کی شجاعت کے ٹھکوے کیا، پورے اودھ میں ڈنکے بج گئے اور وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک روز ان کے ایک مخبر خاص نے ان تک ایک زبردست سازش کی خبر پہنچا دی۔ جو ان کے رفیق نواب معتمد الدولہ بہادر آغا میر وزیر اودھ کے خلاف تھی اس سازش کے بانی تھے غازی الدین حیدر کے مقربین میں سے ایک مرزا حاجی۔

میرزا حاجی نے دو راجپوتوں کو دس دس ہزار روپے رشوت دے کر اس امر پر آمادہ کر لیا تھا کہ جب آغا میر شاہی طبیب حکیم واجد علی خاں کے بیٹے کی شادی میں شریک ہونے کے واسطے پرسوں ان کے وہاں جائیں تو تم پہلے ہی سے وہاں پہنچ کر دروازوں کے پٹوں کے پیچھے کھڑے ہو جانا اور جیسے ہی آغا میر دروازے میں قدم رکھیں۔ تم دونوں بیک وقت حملہ کر کے ان قتل کر ڈالنا یہ خبر پاتے ہی فقیر محمد خاں، آغا میر کے محل گئے، ان سے اس سازش کا مطلق

---

[1] راجہ صاحب محمود آباد کے دیوان میں جس کا نام "سحر" ہے ایک قطعہ موجود ہے جو انہوں نے ان کے گورنر بنائے جانے کی خوشی میں بطور مبارکباد کہا تھا[2] وہ دونوں احاطے اپنے چند محلوں کے ساتھ آج بھی موجود ہیں۔

کوئی ذکر نہیں کیا۔ اور جب آغا میر حکیم صاحب کے لڑکے کی شادی میں شریک ہونے کی نیت سے روانہ ہوئے تو فقیر محمد خاں بھی ان کے ہمراہ ہو گئے۔
حکیم صاحب کے مکان کے سامنے پہنچتے ہی انہوں نے آغا میر سے کہا آج میں آگے آگے چلوں گا، اور آپ میرے پیچھے پیچھے آئیں گے۔
ان کی اس انوکھی درخواست سے آغا میر کے تمام رفقاء دنگ ہو کر رہ گئے اور ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے۔ آغا میر نے آنکھیں جھکا لیں اور تھوڑے سے توقف کے بعد کہا، خاں صاحب آپ کی تجویز منظور۔ بسم اللہ آپ آگے آگے چلیں۔ فقیر محمد خاں نے جیسے ہی دروازہ کے اندر قدم رکھا راجپوت نے تلوار چلا دی، جس سے ان کا داہنا ہاتھ بری طرح زخمی ہو گیا اور جب فوراً تلوار تلوار سونت کر انہوں نے راجپوتوں کو ڈانٹا تو ان کی آواز سنتے ہی ان کے ہاتھوں سے گر پڑیں انہوں نے بھاگنا چاہا لیکن انہوں نے جھپٹ کر دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور جب ان کی لاشوں کا معائنہ کیا گیا کہ ان راجپوت کے بازوؤں پر دس دس ہزار کے نوٹ تعویذوں کی طرح بندھے ہوئے ہیں۔
آغا میر نے فقیر محمد خاں کو دوڑ کر کلیجے سے لگا لیا، ان کے زخمی ہاتھ کو بوسہ دے دے کر بار بار آنکھوں سے لگایا اور کہا خاں خاں صاحب جب آپ نے میرے آگے آگے چلنے کی فرمائش کی تھی اسی وقت میں بھانپ گیا تھا کہ اس کے پیچھے کوئی بات ضرور ہوگی۔
اس کے بعد انہوں پوری سازش کا حال بتا دیا۔ میرزا جی کو کھرے کھرے جس دوام کی سزا دی گئی۔ اور آغا میر نے ان کو دوبارہ گلے لگا کر کہا خاں صاحب! آپ نے اپنی جان پر کھیل کر میری جان بچالی، یہ مجھ پر آپ کا وہ احسان ہے جس کو میں زندگی بھر یاد رکھوں گا۔
شاہ اودھ نے جب ان کا یہ کارنامہ ارشاد سنا، ان کی بے حد تعریف کی سات پارچے کے خلعت سے نوازا، اور نواب حسام الدولہ اہور جنگ کا خطاب بھی عطا فرمادیا۔
حضرت ناسخ نے اس واقعہ پر ایک تاریخی قطعہ کہا تھا۔ جو ان کے دیوان میں تاریخ مجروح شدن فقیر محمد خاں بہادر کے عنوان سے موجود ہے۔
لگے ہاتھوں میرے پر دادا کا ایک دوسرا واقعہ بھی سن لیجئے۔
آغا میر پر جب زوال آیا۔ اور ان کے حریف میر مہدی کو قلمدان وزارت ملا تو چونکہ فقیر محمد خاں آغا میر کے طرف داروں میں سے تھے اور میر مہدی کے دل میں یہ خوف بیٹھا ہوا تھا کہ فقیر محمد خاں ایک نہ ایک دن اپنے اثرات سے کام لے کر آغا میر کو پھر بر سر حکومت لے آئیں گے، اس لئے اس نے ان کی ہلاکت کا منصوبہ بنا کر، ایک روز انہیں دوپہر کے کھانے پر اپنے وہاں مدعو کیا۔
اور اس منصوبے کی تکمیل کے واسطے اس نے یہ صورت نکالی کہ خود تو بالائی کمرے پر بیٹھا اور اونچی اور سنگین دیواروں سے گھرے تنگ انگنائی میں ایک بھینسے کو، خوب شراب پلا کر آزاد

چھوڑ دیا کہ جیسے ہی وہ انگنائی میں قدم رکھیں وہ تھینسا ان پر حملہ کر کے ان کا کام تمام کر دے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ جب فقیر محمد خاں نے انگنائی میں قدم رکھا، بھینسے نے، شیر ببر کے مانند جھپٹ کر ان پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے بھینسے کا وار خالی دے کر پینترا بدلا اور دوسرے گوشے میں تلوار تول کر کھڑے ہوگئے وہ ادھر بھی تیر کی طرح آیا، انہوں نے اس پر تلوار چلا دی جس سے اس کی ناک زخمی ہوگئی۔ زخمی ہو کر وہ اور بھی خوفناک ہوگیا اور اپنے دونوں سینگ جھکا کر دوڑا کہ ان کا پیٹ پھاڑ ڈالے لیکن جیسے ہی اس نے سر جھکایا انہوں نے تلوار کا ایک ایسا دو ٹوک وار کیا اس کی پہاڑ سی گردن کٹ گئی اور خون کا ایک فوارہ آسمان کی طرف جست کرنے لگا۔

وہ اپنی خون آلود تلوار لئے اوپر چڑھ گئے، میر مہدی اور ان کے مصاحب دوسرے کمرے کی طرف بھاگے۔ انہوں نے جھپٹ کر میر مہدی کا گریبان پکڑ لیا، اور اس کی گھگھی بندھ گئی اور پھر انہوں نے اس کے منہ پر اس قدر زور سے تھپڑ مارا کہ وہ اوندھے منہ گر گیا اور دستار وزارت ڈھلکتی ہوئی سامنے کی دیوار سے جا ٹکرائی۔ اور فقیر محمد خاں یہ کہتے ہوئے اتر گئے کہ او گدھی کے بچے تو پٹھانوں کی شجاعت کا امتحان لیتا ہے۔

یہاں تک تو سرسری طور پر ذکر تھا ان کی عالی مرتبگی اور دلیری کا۔ اب ان کی تہذیبی زندگی کے بھی چند واقعات سماعت فرمائیے۔

سب سے پہلی اور سب سے زیادہ حیرتناک بات تو یہ ہے کہ اگرچہ پشتو ان کی مادری زبان تھی، پھر بھی انہوں نے اردو شاعری اور اردو زبان پر اس بلا کی قدرت حاصل کر لی کہ ناسخ سے کڑے آدمی نے ان کو اپنے حلقہ تلامذہ میں لے لیا۔ اور ان کو اس قدر شہرت حاصل ہوئی کہ میرے زمانہ تعلیم تک ان کا کلام نصاب میں داخل تھا۔

اور ہر چند وہ آزاد قبائل کے ایک اکھڑ پٹھان تھے۔ انہوں لکھنؤ کی تہذیب کو اس قدر جذب کر لیا کہ لکھنؤ کے قدیم نوابوں اور ان کے مابین کوئی فرق ہی باقی نہیں رہا تھا۔

ان کے محلوں کی سجاوٹ، ان کے ماکولات و ملبوسات کی نفاست ان کی بٹیروں اور مرغوں کی پالیاں، ان کے مشاعرے، ان کے شبستان میں راتوں کے مجرے، ان کی ادب نوازیاں اور اہل علم پر ان کی ندبا شیاں ان میں سے کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں تھی جس سے یہ گمان ہوتا کہ وہ دیت تہذیب میں ایک نومسلم کی طرح داخل ہوئے ہیں۔ اور در اصل ایک بالکل اجنبی زبان اور ایک قطعی نامانوس تہذیب کے سانچے میں ڈھل جانے کی یہ حیرتناک اصلاحیت و ذہانت ایک ایسی نادر صفت ہے جو لاکھوں ہی نہیں کروڑوں انسانوں میں سے کسی ایک غیر معمولی شخصیت ہی کو نصیب ہوتی ہے۔

ہر چند وہ بہت دولت مند انسان تھے، اور میری دادی جان نے مجھ سے کہا تھا کہ بیٹا تمہارے دادا جان کے یہاں اس قدر روپیہ آتا تھا کہ اسے گننا ممکن ہی نہ تھا اس لئے تراندوں میں تول تول روپیہ تھیلیوں میں بھرا اور تہ خانوں میں رکھا جاتا تھا لیکن تمول کے باوجود، وہ کثرت زر کی نحوست سے بخوبی واقف تھے اور یہ بات ان کو پسند نہیں تھی کہ اپنے اخلاف کے واسطے گاؤں گراؤں یا کسی قسم کی کوئی جائے داد غیر منقولہ ایسی چھوڑ جائیں کہ ان کے اخلاف، دولت و ثروت کی فراوانی کے چیدہ نبوں بن کر اوصاف انسانی سے محروم ہو کر رہ جائیں۔

ان کی یہ تمنا تھی کہ جس طرح تلوار کے زور سے میں نے بڑے بڑے محل تعمیر کر لئے ہیں اسی طرح میری اولاد بھی تلوار کی وساطت سے کمائے اور میری ہی طرح جی کھول کر مستحقین پر روپیہ برسائے۔

اور اسی خیال کے تحت انہوں نے اپنے نائب میرزا حسن علی بیگ عرف مرزا حسو کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ وہ ان کے واسطے گاؤں گراؤں ہرگز نہ خریدیں۔

ایک روز جب یہ بات ان کے علم میں لائی گئی کہ میرزا حسو بیگ ان کے نام پر سینکڑوں زمین سینکڑوں باغ اور سیکڑوں گاؤں آئے دن دھڑا دھڑ خریدتے چلے جا رہے ہیں تو ان کو یہ بات بے حد ناگوار گزری انہوں نے حسو بیگ کو طلب کر کے ان سے کہا۔ میرزا میری سمجھ میں یہ بات مطلق نہیں آتی کہ میں نے تم سے وہ کون سی ایسی برائی کی ہے کہ تم میرے واسطے جائیدادوں کی خریداری پر اتر آئے ہو اور میری اولاد کے حق میں کانٹے بو رہے ہو۔ میرزا حسو بیگ نہایت دور اندیش آدمی تھے انہوں نے دست بستہ عرض کیا کہ خاں صاحب بہادر، آپ کی سرکار میں تعمیرات کا سلسلہ برابر جاری ہے، اور میں دوسرے زمینداروں پر جا بجا ڈال ڈال کر ان کے وہاں سے مزدور بلاتا رہتا ہوں، اس لئے آئے دن کی مصیبت سے نجات پانے کے واسطے میں نے جائیداد اس لئے خرید لی ہے کہ آسانی کے ساتھ مزدور مہیا ہوتے رہیں یہ سنا تو فقیر محمد خاں کا غصہ فرو ہو گیا اور ارشاد فرمایا کہ جائے داد کی یہ خریداری صرف مزدوروں کی فراہمی کے حدود میں رہے اور ریاست نہ بننے پائے۔ میرزا صاحب نے تعمیل ارشاد کا وعدہ تو کر لیا، مگر در پردہ، جائے داد کی خریداری کا سلسلہ بڑی سرگرمی سے جاری رکھا۔

ایک روز فقیر محمد خاں سے چوبدار نے آ کر عرض کیا کا ہنور کی ایک بیگم صاحب سلام کرنے کے لئے حاضر ہوئی ہیں انہوں نے فرمایا بلا لاؤ۔

وہ بیگم صاحب آتے ہی رونے لگیں، اور کہا میرا بیٹا بدراہ ہو گیا ہے باپ کا سارا اندوختہ پھونک میں اڑا چکا ہے اور برسوں اس نے بہت بڑی جائے داد صرف ڈیڑھ لاکھ میں آپ کے نائب کے ہاتھ بیچ ڈالی ہے آپ کی دریا دلی اور سخاوت کے اودھ میں ڈنکے بجے ہوئے ہیں، اس لئے میں یہ درخواست کرنے حاضر ہوئی ہوں کہ

مجھ سے ڈیڑھ لاکھ نقد لے کر میری جائداد واپس فرما دیجئے۔

انہوں نے حسو بیگ کو بلایا، انہوں نے آتے ہی جھک کر سلام کیا۔ فقیر محمد خاں نے سلام کا جواب نہیں دیا۔ مرزا صاحب نے ہاتھ جوڑ کر کہا کیا حضور سے کوئی قصور ہو گیا ہے فقیر محمد خاں نے بگڑ کر ارشاد فرمایا۔ میرزا جائے داد پیدا کرنے کا چسکا تم سے جائے گا نہیں، یہ دیکھو کابلنور کی بیگم صاحبہ بیٹھی ہوئی ہیں، جن کو تم شکار کر چکے ہو۔

میرزا صاحب نے کہا خدا گواہ کہ میں ان بیگم صاحبہ سے بالکل واقف ہی نہیں۔ اس پر بیگم صاحبہ نے جلدی سے بات کاٹ کر اپنے بیٹے کا نام لیا اور پوچھا کیا آج سے ایک مہینہ پیشتر آپ نے اس کی جائیداد نہیں خریدی ہے اور جب مرزا صاحب گھبرا کر سر کھجانے اور کوئی عذر ڈھونڈنے لگے تو فقیر محمد خاں نے کہا۔ ان بیگم صاحبہ کے لڑکے کی جائیداد اسی وقت واپس کر دو۔ میرزا صاحب نے کہا میں نے وہ جائیداد تین لاکھ میں خریدی ہے، اور بیگم صاحبہ ڈیڑھ لاکھ کہہ رہی ہیں۔ انہوں نے حکم دیا کاغذات لاؤ۔ اور جب کاغذات آ گئے تو معلوم ہوا کہ میرزا صاحب سچ کہہ رہے تھے۔ اس پر ان بیگم صاحبہ نے کہا اب پتا چلا کہ وہ جائے داد ڈیڑھ میں نہیں، تین لاکھ میں خریدی گئی ہے آپ یہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ جو میں اپنے ساتھ لائی ہوں اپنے خزانے میں جمع کرا دیں، اور مجھ کو دو مہینے کی مہلت عطا فرما دی جائے اس مدت کے بعد جب باقی ڈیڑھ لاکھ روپیہ حاضر خدمت کر دوں تو میری جائے داد میرے بیٹے کے نام کر دی جائے۔

فقیر محمد خاں نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد ارشاد فرمایا کہ بیگم صاحبہ آپکا فرزند اس جائیداد کو پھر کبھی کے ہاتھ فروخت کر ڈالے گا۔ بیگم نے یہ بات سنی تو یہ سمجھ کر رونے لگیں کہ فقیر محمد خاں ان کی جائے داد واپس کرنے پر تیار نہیں ہیں۔

ان کی یہ کیفیت دیکھ کر انہوں نے فرمایا بیگم صاحبہ آپ میری بات نہیں سمجھیں میں چاہتا ہوں کہ آپ کے فرزند کے عوض، وہ جائے داد آپ کے نام منتقل کرا دوں تاکہ آپ کا لڑکا دوبارہ فروخت نہ کر سکے۔

بیگم کا چہرہ یہ سن کھل گیا اور کہاں خاں صاحب، جیسا کہ ابھی کہہ چکی ہوں یہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ آپ اسی وقت لے لیں، باقی روپیہ جب دو مہینے کے بعد لے کر آؤں تو ـــ ان کی بات ابھی پوری بھی نہیں ہو پائی تھی کہ انہوں نے ارشاد فرمایا، میرزا ہم بیگم صاحبہ سے مطلق روپیہ نہیں لیں گے تم ان کے فرزند کی جائے داد، میری طرف سے بیگم صاحبہ کے نام اسی وقت ہبہ نامہ کر کے ان کے سپرد کر دو۔ یہ سنتے ہی مرزا صاحب کا رنگ اڑ گیا۔ بیگم کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو ٹپکنے لگے اور

ان کی جائیداد واپس کر دی۔

ایک بار ان کے ایک دوست نے جن کا نام غالباً محمد علی خاں تھا، ان سے کہا کہ ریاست رامپور پر میرے ایک قرابت دار ناجائز طور پر قابض ہو چکے ہیں، حالانکہ از روئے شریعت و قانون یہ ریاست مجھے ملنی چاہیئے کہ میں ہی اس کا صحیح وارث ہوں۔ میں نے عاصب پر مقدمہ دائر کیا تھا لیکن رشوت کے بل بوتے پر وہ جیت گیا ہے اب میں اس مقدمے کو ولایت کی پریوی کونسل تک لے جانا چاہتا ہوں، جس کے واسطے اسی ہزار کی شدید ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پریوی کونسل میں رشوت نہیں چل سکے گی اور میں یقیناً مقدمہ جیت جاؤں گا۔ ان کی استدعا پر فقیر محمد خاں نے ان کو اسی ہزار روپئے دے دیئے اور جب مقدمہ جیتنے کے بعد، ان کو رام پور کا نواب بنا دیا گیا تو انہوں نے فقیر محمد خاں کو خط پر خط لکھے کہ رام پور تشریف لایئے، کچھ روز میرے مہمان رہیئے بس اس اثنا میں تمام اعیان ریاست کو جمع کر کے، آپ کے احسان کا اعلان کروں گا، جو آپ مجھ پر کر چکے ہیں اور اسی دربار میں آپ کے اسی ہزار بڑی نیازمندی کے ساتھ واپس کر کے آپ کی خدمت میں ایک بڑی جاگیر بھی پیش کروں گا۔ فقیر محمد خاں نے اس روپئے کے واپس لینے انکار کرتے ہوئے لکھا کہ وہ حساب دوستاں در دل کے طور پر دی گئی تھی، میں کوئی بنیا نہیں کہ اسے واپس لے لوں[1]

اب چند تذکرہ نویسوں اور مورخوں سے بھی ان کے حالات ملاحظہ فرمایئے۔

صاحب الیاقوت والمرجان فی ذکر علمائے سہوان،، لکھتے ہیں کہ حکیم بدرالدین فاروقی، ابن شیخ محمد صدرالدین تھا تیری دشاگرد شاہ رفیع الدین محدث دہلوی، نواب فقیر محمد خاں بہادر کے ندیم اور ان کے محلات کے معالج رہے۔

صاحب ،، تاریخ اودھ،، کا بیان ہے کہ نواب فقیر محمد خاں ایک اولوالعزم سپاہ سالار ہی نہیں

---

[1] میں نے جب کہ میں ۱۹۲۷ء میں والی رامپور، نواب حامد علی خاں کے زمانے میں بطور مہمان رامپور میں ٹھہرا ہوا تھا ان تمام خطوط کو ریاست کے دارالانشاء سے منگا کر خود پڑھا تھا لیکن جوانی کے لاابالی پن میں ان کی نقلیں نہیں کرائی تھیں اور اب جبکہ مجھے ان نقلوں کا خیال آیا میں نے کتب خانہ رامپور کے لائق مہتمم عرشی صاحب کو خط لکھا کہ وہ نقلیں مجھے بھیج دیں کہ اس کتاب میں درج کر دوں تو انہوں نے مجھے اطلاع دی کہ دارالانشاء کے تمام کاغذات کو حکومت نے الہ آباد بھیج دیا ہے اب اتنا وقت کہاں کہ الہ آباد جاؤں اور نقلیں حاصل کروں۔

مزاج بھی شاہی پایا تھا۔ ایک بار نواب آغا میر نے ان سے کہا کہ اسی فصل میں ہم آم کھانے ملیح آباد آئیں گے اور بادشاہ سلامت کو بھی ساتھ لائیں گے۔

نواب فقیر محمد خاں نے ان شاہی مہمانوں کے لئے ایک بارہ دری تین لاکھ روپے میں تعمیر کرائی اور تین لاکھ کے فرنیچر سے اس کو آراستہ کیا۔

صاحب "صبح و گلشن" نے لکھا ہے کہ اس قصبے (ملیح آباد) میں عمارت رفیع و بنا متین دارند رواں ان کی عظمت و ثروت کے آثار ہیں۔

صفیر بلگرامی کہتے ہیں کہ انہیں آموں کا بہت شوق تھا اور آم بڑے اہتمام سے لگائے تھے اور سنا ہے کہ وہ دودھ اور شربت سے سینچے جاتے تھے۔

نواب مصطفٰی خاں شیفتہ نے تحریر کیا ہے کہ باوجود ہجوم دنیا، قدر دان اہل ہر فن است تذکرہ "خوش معرکہ زیبا" میں درج ہے اتمام اس (فقیر محمد خاں) کا آغاز سے خوش تر جبکہ دولتمند تھا اب شیعہ امیر المومنین حیدر ہے[1]

کریم الدین خاں ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ہمیشہ سے ہنگامہ رہتا ہے سننے میں آتا ہے بہت متعصب سنی ہے[2] تاریخ "مختصر" میں لکھا ہے کہ نصیر الدین حیدر کے وزیر منتظم الدولہ فقیر محمد خاں سے نا خوش ہو گئے تھے۔ ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ انہوں نے وزیر کے روبرو، تاج الدین حسین خاں کے حق میں کلمات درشت کہے تھے۔ اور دوسری وجہ . . . . . یہ تھی کہ فقیر محمد خاں جری آدمی تھے، اور ان کے سامنے ظلم ہوتا تو مظلوم کی پاسداری کرتے تھے۔ اس لئے ان کے خلاف یہ حکم جاری کر دیا گیا کہ وہ دربار میں ہتھیار باندھ کر نہ آئیں گویا نے کہا میں اس پر خانہ نشینی کو ترجیح دیتا ہوں اس پر انہیں ہتھیار لگانے کی اجازت دے دی گئی۔

الہ آباد کے رسالہ "ہندوستانی" میں ایک مقالہ "مخزن آلام" اور "احمد کی شاعری" کے عنوان چھپا تھا جس میں صاحب مقالہ نے لکھا ہے کہ گویا کا عروج نصیر الدین حیدر تک رہا، وہ اودھ کے ساڑھے تین لاکھ سپاہیوں کے سالار تھے اور خود چودہ سو پیادے اپنی ذاتی خاص میں رکھتے تھے۔

---

[1] ان کے شیعہ ہو جانے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

[2] انہوں نے حضرت علی کی شان میں جو قصیدے اور امام حسین کی جانب میں جو سلام کہے ہیں ان سے اس قول کی تکذیب ہوتی ہے۔

صاحب" نامہ مظفری نے لکھا ہے کہ گویا عربی بھی ایسی صاف بولتے تھے کہ گویا مادری زبان ہی اور ان کی ترکی بولنے پر بھی لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ چودہ سو سپاہی ان کے ذاتی ملازم تھے فقیر محمد خاں کے باپ بھی بڑی آن بان کے آدمی تھے، تمام عمر وہ اپنے کچے مکان ہی میں رہے، بیٹے نے لاکھوں لاکھ جتن کئے کہ باپ محلوں میں اٹھ آئیں لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا، اور کہا میں زنخا بننا پسند نہیں کرتا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فقیر محمد خاں کے باپ اپنے گھوڑے کو لنگوری چال سے دوڑاتے ہوئے چوک سے گزر رہے تھے اور جب ان کا گھوڑا[1] ایک طوائف کے چھجے کی طرف بلند ہوا تو نوچی نے نائکہ سے پوچھا یہ سوار کون ہے نائکہ نے کہا، چپ رہ، یہ نواب فقیر محمد خاں بہادر کے باپ ہیں۔

یہ سن کر، وہ غصے میں بھرے ہوئے گھر آئے اور بیٹے سے کہا فقیرے جا میں زندگی بھر چوک سے نہیں گزروں گا، بیٹے نے سبب پوچھا تو انہوں نے سارا ماجرا بیان کرنے کے بعد کہا دنیا کا قاعدہ ہے کہ بیٹا باپ کے نام سے پہنچانا جاتا ہے اور آج یہ الٹی گنگا بھی کہ باپ کو بیٹے کے نام سے پہنچانا گیا ہے۔ لعنت ہزار لعنت، چوک سے گزرنے والے پر۔

ایک بار فقیر محمد خاں کے مہتمم "باغات" نے ان کی خدمت میں لکھا کہ حضور کے والد ماجد جب باغات تشریف لاتے ہیں تو پٹھانوں کے غول کے غول، ان کے پیچھے آتے اور ہزار ہا کچے پکے آم توڑ کر لے جاتے اور پودوں کی شاخیں بھی توڑ ڈالتے۔

یہ خبر سن کر فقیر محمد خاں نے اپنے باپ کے نام لکھنؤ سے ملیح آباد یہ خط بھیجا کہ باد امام باغ آپ کے ہیں آپ کو ان پر کامل تصرف حاصل ہے، آپ باغوں میں جتنے آدمی چاہیں اپنے ساتھ لے کر جائیں لیکن آپ کے علم کے بغیر جو لوگ آپ کی آڑ لے کر، باغوں میں گھس جاتے اور نقصان پہنچاتے ہیں، ان کے متعلق میں نے مہتمم باغات کو لکھ دیا ہے کہ انہیں باغوں میں نہ جانے دیا جائے۔

بیٹے کا یہ خط پڑھ کر وہ جامے سے باہر ہوگئے، اپنے بھانجے سے کہا فقیرا امیر ہو کر دیوانہ ہوگیا ہے میں اسے برداشت نہیں کرسکتا کہ جو لوگ میرے پیچھے پیچھے باغوں میں آنا چاہیں انکو روک دیا جائے چلو میرے ساتھ لکھنؤ میں آج فقیرے کو مزا چکھا دوں گا۔

فقیر محمد خاں اپنے محل میں شاہزادوں اور عمائد لکھنؤ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ چوبدار نے آکر عرض کیا کہ سرکار کے والد محترم غصے میں بھرے ہوئے اپنے بھانجے سے یہ کہتے تشریف لا رہے ہیں

---

[1] گھوڑے کی وہ چال کہ وہ زمین سے بلند ہو کر اچھلتا، اور قوس سی بناتا، زمین پر قدم رکھتا ہے

کہ میں آج اسے مزا چکھا دوں گا۔

فقیر محمد خاں نے یہ سنا تو گھبرا گئے اور حاضرین سے کہا۔ میں اس بڑی الماری کے پیچھے جا کر چھپ جاؤں گا۔ بادا تشریف لائیں تو کہہ دیجئے گا کہ میں اس وقت کہیں باہر گیا ہوا ہوں۔

اتنے میں بپھرے ہوئے محمد بلند خاں آ گئے، تمام محفل کھڑی ہو گئی، انہوں نے پوچھا فقیرے کہاں ہے۔ حاضرین نے جواب دیا کہ کہیں باہر تشریف لے گئے ہیں محمد بلند خاں نے کہا خوشامد خورد جھوٹ نہ بولو اور صاف صاف بتاؤ کہ وہ کہاں ہے۔

"خوشامد خوردو" کا لفظ سن کر تمام ارباب محفل دنگ ہو کر رہ گئے۔ لیکن حضرت گویا کے پاس خاطر سے، کسی نے کوئی ناشائستہ جواب نہیں دیا۔

اتنے میں ہوا کا ایک تند جھونکا آیا اور فقیر محمد خاں کا اڑتا دامن دیکھ کر، محمد بلند خاں کے بھانجے نے الماری کی طرف اشارہ کر دیا۔ محمد بلند خاں الماری کی طرف جھپٹے۔ بڑے، بیٹے کو کھڑا کر الماری کے پیچھے سے نکالا اور ان کا گریبان پکڑ کر کہا تیری یہ مجال ہے کہ میرے ساتھ باغوں میں نہ جانے والے کو روک دے، یہ کہتے ہوئے ان کے منہ پر تڑاق سے طمانچہ مار دیا۔ اور جب طمانچہ کھا کر انہوں نے سر جھکا لیا تو محمد بلند خاں کے بھانجے نے کہا ماموں بس، اب اس سے زیادہ ذلیل نہ کیجئے۔

اور جب محمد بلند خاں بیٹے کو بھری محفل میں ذلیل کرنے کے بعد باہر جانے لگے تو بیٹے نے باپ کے قدم پکڑ لئے اور کہا بادا معاف کر دیجئے اور پھر باپ نے بیٹے کو گلے لگا لیا اور پورے اودھ میں غلغلہ بلند ہو گیا فقیر محمد خاں کی بے نظیر شرافت و سعادت مندی کا۔ اور شعراء نے ان کی سعادت مندی کی تعریف میں قصیدے کہے اور انہوں نے ان کی جھولیاں بھر دیں۔

میرے دادا

نواب محمد احمد خاں بہادر، احمد صاحب[1] مخزن الآلام اور تعلقہ دار کسمنڈی، جسمانی و جنسی طاقت کے اعتبار سے ایک ایسے غیر معمولی انسان تھے جو صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔
میں نے ان کو اپنے جاتے بچپن اور آتے لڑکپن میں دیکھا تھا ان کا جسم بیحد گٹھا ہوا تھا کلائیاں دو دو آدمیوں کی کلائیوں سے بھی زیادہ چوڑی تھیں، اور آواز اس قدر بھاری تھی کہ سننے والے کے زخموں کے ٹانکے ٹوٹ جائیں۔
ان کی آنکھیں بہت بڑی تھیں، منحوبر داڑھی تھی، سر پر پگڑی باندھتے تھے اور جب داڑھی اور پگڑی کے مابین ان کی آنکھیں چمکتی نظر آتی تھیں تو ڈر کے مارے میرا پیشاب خطا ہونے لگتا تھا، وہ انگرکھا پہنتے اور انگرکھے کے اوپر ایک مخملی رومال لپیٹ لیا کرتے تھے۔
ان کی چال اس قدر بنی تلی تھی کہ اس میں تیز رفتاری کا عنصر پیدا ہو ہی نہیں سکتا تھا، اس لئے کہ تیز تیز چلنے کو وہ آداب شرفا کے خلاف سمجھتے تھے۔
وہ صرف ایک وقت، یعنی دوپہر کو کھانا کھاتے، اور صبح، روزے کرکے ناشتہ کیا کرتے تھے۔
ان کی پچیس تیس بیویاں، چار نکاحی، اور باقی سب لونڈیاں باندیاں تھیں۔ وہ ایک سو بارہ بچوں کے باپ تھے ان کے بچوں کے غالباً پچاسی نام میرے پاس لکھے ہوئے ہیں باقیوں کے نام اب کس سے پوچھوں۔
ان کا انتقال اٹھاسی برس کی عمر میں ہوا۔ انھوں نے بلوغ کے بعد سے انتقال تک کبھی ایک رات عورت کے بغیر نہیں گزاری ۔۔۔ البتہ جب لکھنؤ جاتے تو پردے کی شدت کی بنا پر، چونکہ بیویاں کیسی لونڈیاں باندیاں بھی ان کے ساتھ نہیں جا سکتی تھیں اور چونکہ طوائفوں

---

[1] ان کے دیوان کا نام

سے وہ سخت نفرت کرتے تھے، اس لئے دو ایک راتیں ناغہ ہو جاتی تھیں، اور صبح ہوتے ہی ان کے سر میں شدید درد ہونے لگتا تھا۔ اس عالم میں یہ ایک بندھا ٹکا معمول تھا کہ دو مضبوط قسم کے خدمتگار، ان کی کنپٹیوں پر روئی کے گالے چپکا کر، ایک گھنٹے تک سنی سے ان کا سر دبایا کرتے تھے۔

ان کی اس غیر معمولی جنسی طاقت کا غلغلہ سن کر لکھنؤ کے بڑے بڑے سول سرجن اور ڈاکٹر ان کے پاس آتے۔ ان کی غذا، ان کے معمولات، مرغوبات و مکروہات کے بارے میں دیر تک سوال کرتے اور ان کا فون جانچتے تھے مگر کسی کو ان کی بے مثال جنسی طاقت کی وجہ نہیں معلوم ہو سکی۔

میں نے کمسنی میں ان کی اس بے کراں طاقت کے متعلق بعض لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ چونکہ وہ کاکوری کے تکیہ شریف کے شاہ صاحب کی دعا سے پیدا ہوئے تھے اور انہوں نے دادا میاں کو ان کے لڑکپن میں اپنا پائجامہ پہنا کر کچھ زیر لب دعا کی تھی، اس لئے ان میں یہ غیر معمولی طاقت آگئی تھی (اس بات کو میں ایک افسانے سے زیادہ کوئی وقعت نہیں دیتا)

ہمارے خاندان کا یہ اصول تھا کہ خلف اکبر کو باپ کا جانشین اور تعلقدار بنایا جاتا تھا اور باقی بچوں سے بے حد محبت تھی، انہوں نے اس اصول کو دوسری شکل دے دی، یعنی میرے حقیقی چچا اور میرے باپ کو ہر چند سب سے بڑی جائیداد عطا فرمائی۔ اور تعلقداری بچا کو بخش دی لیکن اپنے کسی فرزند کو میرے چچا یا باپ کا دست نگر نہیں رکھا اور گزارے کے بدلے سب کو دل کھول کر گاؤں اور باغ مرحمت فرمائے، بعض کو مرتبے کے لحاظ سے زیادہ جائیداد دی اور بعض کو کم لیکن کسی ایک فرزند کو بھی محروم نہیں رکھا، اور ان بیٹوں کو بھی جو باندیوں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے کم سے کم دو دو گاؤں اور دو دو باغوں کا مالک بنا دیا۔

جس طرح ململ کی چادر کو پھول کے اوپر ڈال کر اور پھر زور سے کھینچ کر تار تار کر دیا جائے اسی طرح انہوں نے اپنی جائیداد کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

اودھ کے تمام تعلقہ داروں کی طرح دادا میاں نے بھی اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف کوئی توجہ مبذول نہیں فرمائی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے باپ کے علاوہ ان کے تمام فرزند جاہل رہ گئے اور حرف شناسی سے آگے نہیں بڑھ سکے۔

دادا میاں کو عورتوں سے فرصت ہی کب ملتی تھی کہ وہ اپنے علاقے کی نگرانی اور ضلع داروں سے حساب بھی کرتے اس لئے تمام کارندوں نے خوب جی بھر کر لوٹا اور ایک کارندے صاحب نے جن کی تنخواہ فقط بیس روپیہ ماہوار تھی ساڑھے تین لاکھ روپے جمع کر لئے، جو ان کے انتقال کے بعد ان کی اکلوتی بیٹی کو مل گئے۔

مہینے دو مہینے کے بعد، جب وہ محل سے برآمد ہوتے تھے، تو لوگوں میں یہ غلغلہ بلند ہو جاتا تھا کہ آج بڑے خاں صاحب برآمد ہوئے ہیں اور احاطے میں اہل ملیح آباد اور رعایا کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے تھے، سلام کرنے کی غرض سے شرفا کیواسطے کرسیاں اور رعایا کے کیواسطے دور دور تک بنچیں رکھ دی جاتی تھیں اور ان کی یہ سب سے بڑی خصوصیت تھی کہ وہ اس سرے سے لے کر اُس سرے تک ہر شخص سے فرداً فرداً باتیں کرتے، اور کسی ایک فرد کو بھی مکالمت سے محروم نہیں رہنے دیتے تھے۔

وہ انگریزوں کو ناپاک سمجھتے تھے اور دوسرے کے سلسلے میں، جب ملیح آباد میں کلکٹر کا پڑاؤ ہوتا، تو حسب دستور وہ سب سے پہلے دادا میاں سے آکر ملتا تھا اور بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ جب وہ اس فرنگی سے ہاتھ ملاتے تو اسی وقت تسلہ آجاتا اور وہ اس کے سامنے بیسن مل کر ہاتھ دھو لیا کرتے تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد (جس کو فرنگی "غدر" سے منسوب کرتے تھے) جب تعلقہ داری کے اسناد تقسیم ہو رہے تھے، تو تمام تعلقہ داروں کے ساتھ دادا میاں بھی تجدید سند کے واسطے گورنمنٹ ہاؤس تشریف لے گئے تھے اور جیسے ہی لیفٹنٹ گورنر کی نظر دادا میاں پر پڑی اس نے چیخ مار کر کہا، ول ہم نے آپ کو پہچان لیا آپ وہی ہے جو بنت نصف گنج کی لڑائی میں برٹش کے خلاف لڑا تھا، آپ نے ہمارا بہت سا آدمی مارا تھا ہم فوج کا کرنل تھا ہم نے آپ کو دوربین سے دیکھا تھا نائیں ناہوں، ہم آپ کو سند نہیں دے سکتا۔

جب یہ سنا تو دادا میاں نے گرج کر کہا، بے شک میں آپ کے خلاف لڑا تھا اور مجھے لڑنا ہی چاہئے تھا میں نمک حرام نہیں ہوں کہ نواب اودھ اور اپنے ملک سے غداری کرتا ہم پٹھانوں کے خون میں غداری نہیں ہے۔ ہم لوگ تو آن پر جان دے دیا کرتے ہیں، آپ سند نہیں دیتے شوق سے نہ دیں

دادا میاں کی اس گرج سے دربار پر خاموشی چھا گئی، بہت سے تعلقہ دار ڈر گئے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے لیکن لیفٹننٹ گورنر کے معقول اور شریف آدمی تھا، وہ مسکرا دیا، اور کہا بہت اچھا بہت اچھا بولا۔ ہم آپ کو تعلقہ داری کی سند دے گا۔ بہت اچھا بولا پٹھان کیریکٹر کے مطابق (موافق) بولا۔

لیفٹننٹ گورنر نے ان کو تعلقہ داری کی سند کے ساتھ ساتھ درجہ اول کا آنریری مجسٹریٹ بھی بنا دیا۔ اور وہ مہینے میں ایک بار مجسٹریٹی کے فرائض انجام دینے لگے۔ ملیح آباد چونکہ پٹھانوں کی بستی ہے اس لئے آئے دن وہاں لٹھ پونگا ہوا کرتا تھا اور برابر فوجداری کے مقدمے پیش ہوا کرتے تھے لیکن ان کی مجسٹریٹی کی یہ خصوصیت تھی

کہ جب وہ کسی پر جرمانہ کرتے تھے تو جرمانے کی رقم خود ان کے خزانے سے ادا کی جاتی تھی۔

ایک بار ان کے اجلاس پر ایک پٹھان مقدمہ پیش ہوا، جس نے فرخ آباد اسٹیشن پر ایک بدکلام انسپکٹر پولیس پر لٹھ سے حملہ کر کے اس کا سر پھاڑ دیا تھا۔

انہوں نے اسی پٹھان پر جرمانہ کر کے جرمانہ کی رقم حسب دستور اپنی سرکار سے ادا کر دی اور شام کے وقت اسے بلا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، اور فرمایا کہ میں تم سے بہت خوش ہوں کہ تم نے اس بدتمیز انسپکٹر کا دماغ ٹھیک کر دیا۔ میں اس صلے میں بتیس روپے ماہانہ تمہارا وظیفہ مقرر کر رہا ہوں، جو تمام عمر تم کو ملتا رہے گا۔ دادا میاں کے بعد بھی اس کو وہ وظیفہ تاحیات ملتا رہا۔

ایک دن علاقے کے چند کاشتکار خاں صاحب بہادر کی دہائی، خاں صاحب بہادر کی دہائی کے نعرے مارتے آئے اور کہا حضور ہمارے گاؤں میدا پور سے داروغہ جی گزر رہے تھے انہوں نے ہمارے ٹھوکریں ماریں اور کہا سالو سلام کرنے کے لئے کیوں نہیں کھڑے ہوئے۔

دادا میاں نے کسی سپاہی کو حکم دیا کہ ان کے سر پر کس کس کر جوتیاں مارو کاشتکار چلائے کہ ہم تو آپ کے پاس فریاد لے کر آئے تھے، آپ الٹے ہمیں کو پٹوا رہے ہیں اس پر انہوں نے کہا تمہارے سروں پر جوتیاں اس لئے لگوا رہا ہوں کہ تم ہماری رعایا ہو، اور پھر بھی ٹھوکریں کھا کر آئے ہو، جاؤ ابھی جاؤ اور تھانے میں گھس کر داروغہ کے سر پر جوتے مارو، اور جب جوتے مار کر آؤ گے میں تمہارا ساتھ دوں گا۔

اور جب وہ لوگ داروغہ کو پیٹ کر آئے تو ان کی پوریوں، کچوریوں اور مٹھائیوں سے تواضع کی گئی اور ان کا آدھا لگان معاف کر دیا گیا۔

انہیں بٹیریں لڑانے، بٹیریں پالنے اور بٹیریں کھانے کا بہت شوق تھا سپاہی راتوں کو کھیتوں میں جال لگاتے پھندیوں کے پنجرے چاروں طرف لٹکاتے، ان کی بولیوں پر بٹیروں کو کھیتوں میں گراتے، اور صبح کو سیکڑوں بٹیریں جالوں میں پھنسا کر لے آتے تھے ان میں سے کچھ لڑانے کے لئے پال لی جاتیں۔ کچھ بچوں میں تقسیم کر دی جاتیں اور کچھ دسترخوان کے لئے پکائی جاتی تھیں۔

جب وہ دوپہر کے وقت دسترخوان پر بیٹھتے تھے، تو محل کا پورا لمبا چوڑا دالان و برآمدہ ان کے ساتھ کھانے والے بچوں سے بھر جاتا۔ اور ایسا معلوم ہوتا کہ سکندر اعظم کی فوج ٹوٹ پڑی ہے۔

ایک دن میں اپنے باپ کے پاس بیٹھا برفی کھا رہا تھا کہ دادا میاں کا خاص خدمتگار

رحم علی آیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا بڑے خاں صاحب بہادر نے یاد فرمایا ہے۔

جب میں اپنے باپ کے ساتھ محل میں داخل ہوا دیکھا کہ وہ ایک مخمل سے ڈھکے ہوئے مونڈھے پر تشریف فرما ہیں اور فرط غضب سے ان کا سر ہل رہا ہے۔ اور جب میرے باپ نے جھک کر سلام کیا، اور پوچھا بادا کیا بات ہے تو انہوں نے سر کو جھٹکا دے کر فرمایا، بشیر، مجھے آج محمد اسحٰق کی صورت سے نفرت ہو گئی، میرے باپ نے بڑے ادب سے پوچھا بادا کس بات پر دادا میاں نے فرمایا کہ ابھی اسحٰق تیز تیز قدم رکھتا میرے پاس آیا تھا میں نے کہا کہ اسحٰق اس طرح چھچھورے پن سے تیز تیز چلنا آداب شرفا کے منافی ہے، تم جانتے ہو اس نے میری یہ ڈانٹ سن کر کیا جواب دیا میں نے کہا بادا معاف فرمائیے خوشی کے مارے میری چال بدل گئی ہمارے علاقے کے گاؤں کھڑی میں ایک بہت بڑا خزانہ نکل آیا ہے اس کی خوشخبری دینے آیا ہوں بشیر، اس کا یہ جواب سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی، میں نے کہا دور ہو جا میری نظروں سے بھلا خزانہ بھی کوئی ایسی چیز ہے کہ اس سے شریفوں کی چال میں فرق آ جائے ۱۵؍ برس کی عمر میں بھی دادا میاں کی صحت اس قدر اچھی اور ان کے قویٰ اس قدر مضبوط تھے کہ وہ ابھی دس بیس[2] برس تک اور جی سکتے تھے مگر ایک حسین عورت ان کی موت کا باعث بن گئی۔

واقعہ یہ ہے کہ ان کو خوش کرنے کے لئے میرزا امداد بیگ نے لکھنؤ سے ایک نہایت خوبرو اور دراز قامت مغلانی کو بطور تحفہ ان کی سرکار میں پیش کیا تھا، اس عورت کو آتشک کا مرض تھا جو ان کو لگ گیا، انہوں نے، شرم کے مارے، کسی سے نہیں کہا، اور کچھ روز بیمار رہ کر اسی مرض میں ان کا انتقال ہو گیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں ایک روز رات کے وقت، جب دادا میاں کے پاس گیا تھا ان کی داہنی میز پر ایک بڑا سا حقہ جل رہا تھا، اور بائیں جانب وہ صبیح دراز قامت مغلانی، کولھے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی، میں اس کو دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا اور اس کی جانب ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا تھا، اور انہوں نے میری یہ حالت دیکھ کر یہ ارشاد فرمایا تھا، ڈیوٹ[1] الوٹ کیا دیکھ رہا ہے بدتمیز کہیں کا جھکا لے آنکھیں،

یہ بات کہیں اوپر کہہ چکا ہوں کہ میرے دادا، اپنے مختلف البطن چھوٹے بھائی نواب محمد نسیم خاں سے خوش نہیں تھے، اور نسیم خاں کے انتقال کے بعد ان کے فرزند نواب محمد علی کو

---

[1] ایک بار سوٹ پہنے دیکھ کر انہوں نے مجھ کو، ڈیوٹ الوٹ صاحب بہادر کا خطاب دیا تھا، اور اکثر اسی نام سے مجھے پکارا کرتے تھے۔ [2] فرزند اکبر۔

بھی پسند نہیں فرماتے تھے۔

دادا جان صاحب مرض الموت میں گرفتار ہو گئے تو عین ان کے انتقال کے دن ان کو خبر دی گئی کہ محمد علی خاں عیادت کے واسطے حاضر ہوئے ہیں۔

یہ سنتے ہی انہوں نے لونڈیوں سے کہا مجھے اٹھا کر بٹھا دو گاؤ تکیہ پیچھے رکھو کر، حقہ سامنے لگا دو، میری دادی جان نے کہا اٹھ کر نہ بیٹھو، ایسا نہ ہو دشمنوں کی طبیعت اور خراب ہو جائے، انہوں نے جواب دیا کہ محمد علی مجھ کو دیکھنے آیا ہے۔ میں اس کو یہ دیکھ کر خوش نہیں ہونے دوں گا کہ چچا اب انتقال کے قریب آگئے ہیں۔

اور جب وہ اٹھا کر بٹھا دیئے گئے انہوں نے حکم دیا بلاؤ محمد علی کو، محمد علی خاں نے پوچھا چچا مزاج کیسا ہے، دادا میاں نے بلند آواز سے ارشاد فرمایا۔ محمد علی اب افاقہ ہو رہا ہے۔ یہ کہہ کر وہ بڑے کر و فر سے حقہ پینے اور پان کھانے لگے، اور تھوڑی دیر بیٹھ کر جب بھتیجا چلا گیا تو گاؤ تکیہ ہٹوا کر میری دادی سے ارشاد فرمایا، میرے بدن میں جس قدر بھی طاقت باقی تھی وہ میں نے محمد علی پر صرف کر دی، اس کے بعد کلمہ پڑھا، اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

ان کے مجموعہ کلام کا نام "دیوان احمد سو سوم بہ مخزن الالام ہے، ٹائٹل پیج پر مندرجہ ذیل عبارت ایک حلقے میں درج ہے:۔ من نتائج افکار سخن سنج بیان، عالی خاندان، الا دو دمان جناب محمد احمد خاں صاحب بہادر، تعلقہ دار و آنریری مجسٹریٹ خلف الرشید، دست گیر افتادگاں، جنت مکاں حضرت فقیر محمد خاں صاحب بہادر گویا مرحوم و مغفور۔

دادا میاں نے ایک مطبع قائم کر کے ملیح آباد میرزا گنج ہی میں یہ دیوان چھپوایا اور خاندان میں تقسیم کر دیا تھا۔

اس دیوان کی ضخامت پانچ چھ سو صفحے سے کم نہیں تھی میرے پاس ان کے بیاس دیوان تھے گھر میں چوری ہوئی تو چور کتابیں بھی لے گیا۔ اب چند اوراق میرے پاس رہ گئے ہیں۔

وہ ٹھیٹ قدیم رنگ میں شعر کہتے تھے۔ چند اشعار آپ بھی سن لیں۔

کبھی گر سامنا ہو گیا رخ گل گوں جاناں کا ٭ تو فق ہو جائے گا منھ دیکھنا صبح بدعنداں کا

علی مرتضیٰ شیر خدا کی مدح لکھتا ہوں ٭ نیستاں نام رکھا جائے گا میرے قلمدان کا

وہ ہوں میں رندا ے واعظ نہیں کچھ مذہب و ملت ٭ نہ قائل کفر کا ہوں، نہ تابع ہوں ایماں کا

قتل کرنے کو مرا بانی بیداد آیا — آرزو تھی مجھے جس کی وہی جلاد آیا
نہ ہوا تو مری خاطر سے فراموش کبھی — میں تو بھولے سے بھی تجھ کو نہ کبھی یاد آیا

شہر میں آئے تو جنگل کی ہوا سر میں بھری — لائی صحرا میں جو وحشت تو وطن یاد آیا

ثمر باغ جہاں میں یہ ملا نخل جوانی کا — کہ وصل یار حاصل ہے مزا ہے زندگانی کا
حسینوں میں تمہارا نام ہوتا بوتے پر میرے — صنم تم ڈال دو اپنا دوپٹہ کامدانی کا

جیتے جی فرقت دلدار نے سونے نہ دیا — قبر میں حسرت دیدار نے سونے نہ دیا
رات بھر گنتے رہے تارے شب تاریں ہم — یاد افشان رخ یار نے سونے نہ دیا
خواب میں دیکھ لیا رقص جو کرتے انکو — گھنگروؤں کی اسی جھنکار نے سونے نہ دیا

عدم سے جانب ہستی جو بوتراب آیا — ہوا یہ شور جہاں میں کہ آفتاب آیا

جو یاد ہجر میں ان کی کوئی ادا آئی — پری کا بھیس بدل کر مری قضا آئی
صبا تو آتی ہے کیا ہو کے اسکے کوچے سے — کہ تجھ سے آج مجھے بوئے آشنا... آئی
بہایا آنکھوں سے دریا لہو کا اندر نے — تمہاری یاد جو اے شاہ کربلا.. آئی

پژمردہ ہو کے بے رخی باغباں سے ہم — برگ خزاں کی طرح چلے بوستاں سے ہم
تلقین کی احتیاج نہیں ہم کو زاہدا، — ہیں فیضیاب صحبت پیر مغاں سے ہم

جب سے عاشق ہوئے تمہارے ہم — لگ گئے گور کے کنارے... ہم
وصل کی شب وہ مجھ سے کہتے ہیں — آج تم جیتے اور ہارے... ہم

میرے باپ

نام تھا نواب بشیر احمد خاں۔ اور تخلص تھا بشیر مردانہ حسن میں ان کا جواب نہیں تھا یہ منسلکہ تصویر اس وقت کے ایک اناڑی کے ہاتھ کی کھینچی ہوئی ہے، جس سے انکی صورت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

ان میں جمال و جلال کا ایسا امتزاج تھا کہ جس جگہ بیٹھ جاتے تھے، ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے والوں کے ہجوم سے گلیاں بند ہو جاتی تھیں، اور جب ریل میں سفر کرتے تو فرنگی بھی، جنکی تہذیب میں تعارف کے بغیر، بات کرنا بد تہذیبی ہے، اس قدر متاثر ہو جاتے تھے کہ ان سے یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتے تھے کہ آپ کا نام کیا ہے، اور آپ کس خاندان کے فرد ہیں ان کو اپنی اولاد سے اسقدر محبت تھی کہ ستر ماؤں کی محبت کو ان کی ایک محبت پر قربان کر دیا جا سکتا تھا، وہ رات کے ایک یا دو بجے مردانے سے اٹھ کر جب زنانے میں تشریف لاتے تھے، تو ایک خادمہ، لالٹین ہاتھ میں لئے آگے آگے چلتی تھی، اور وہ ہم تو بھائیوں بہنوں کی نبضیں دیکھے بغیر نہیں سوتے تھے، اور جب ہم میں سے کسی کا ناخن بھی دکھتا تو ڈاکٹروں سے ہمارا گھر بھر جایا کرتا تھا۔ اور جب ہم میں سے کسی کے منھ سے کوئی بدشگونی کی بات نکل جاتی تھی، تو ہم پر سے صدقے اتارے جاتے تھے اور چونکہ ہمارے تمام محلوں کو بھوتوں اور چڑیلوں کا رمنا خیال کیا جاتا تھا، اسلئے ہم سب بچوں کی خوابگاہ کے گرد رو زرات کو حصار کھینچا جاتا، اور ہماری پائینتی ایک ایک آدھ دو اسلائی جاتی تھی، جب ہم زنانے سے مردانے میں جاتے تو بھی، ڈیوڑھی میں سے گزارنے کیلئے کوئی نہ کوئی خادمہ ہمارے ساتھ کر دی جاتی تھی، جب ہم غسل خانے جاتے اس وقت بھی دروازے پر ایک ماما کھڑی رہتی، اور بار بار پکار پکار کر کہا کرتی تھی بھیا، یا بیٹیا ڈرنا نہیں، ہم دروازے پر کھڑے ہوئے

سلہ میں اپنے باپ کے بہت سے واقعات اوپر درج کر چکا ہوں اسلئے اس موقع پر اختصار سے کام لینا پڑا ہے۔

ہیں، اور جب سوتے وقت دادی جان حصار کھینچ کر، تین تار بالیاں بجاتی تھیں تو ڈر کے مارے میرے تمام رونگٹے جھن سے کھڑے ہو جاتے تھے۔

لیکن انتہائی شفقت کے باوجود وہ تربیت کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ سخت گیر، اور دادی جان کی اس نصیحت پر کہ "بیٹا" بچوں کو کھلاؤ سونے کا نوالہ، اور دیکھو شیر کی نگاہ سے۔ بڑی شدت کے ساتھ عامل تھے۔

انھوں نے خصوصیت کے ساتھ ہم تینوں بیٹوں کو بڑی سختی کے ساتھ اس بات کی ممانعت کردی تھی کہ آپس میں یا دوسرے ساتھ کھیلنے والے بچوں سے کشتم کشتانہ کرو، شور نہ مچاؤ کونوں کھتروں میں نہ کھیلو، خدمت گاروں کارندوں اور سپاہیوں کی چار پائیوں پر نہ بیٹھو، خواہ وہ موجود ہوں یا نہ ہوں، لکھنے پڑھنے کے وقت کھیل کود کے قریب بھی نہ پھٹکو، کمرے کے دروازے بند کر کے نہ بیٹھو، اگر کوئی مذاق دل لگی کی بات کرے اسے مارو اور ہمارے پاس لے آؤ، لونڈیوں باندیوں سے ہنس کر بات نہ کرو۔

ایک روز کسی مخبر نے آدھی رات کو، ان تک یہ بات پہنچا دی کہ میرے بڑے بھائی اور میں، دونوں حضرت احسن مارہروی[1] کے صاحبزادے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، باغ میں ٹہل رہے تھے، یہ خبر سن کر وہ آگ بگولا ہو گئے۔ لحاظن ماما کی معرفت ہم دونوں بھائیوں کو اسی وقت جگوا کر بلوایا، ہم پہنچے تو انھوں نے فرمایا سنا ہے آج آپ دونوں احسن صاحب کے لڑکے کے ہاتھ میں ہاتھ والے باغ میں گل گشت فرما رہے تھے۔

ہمیں کیا معلوم تھا کہ کسی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ٹہلنا کوئی بری بات ہے ہم نے اقرار کر لیا، ہمارے اقرار کے بعد انھوں نے بھاری آواز میں فرمایا۔ آپ دونوں ادھر آئیں، جب ہم ان کے قریب پہنچ گئے۔ انھوں نے کہا آپ دونوں اپنے اپنے ہاتھ کھول کر جھکا دیں، اور جب ہم نے ہاتھ کھول کر جھکا دیئے تو انھوں نے اپنے بھرے ہوئے حقّہ کی دہکتی ہوئی چلم کے انگارے ہمارے ہاتھوں پر گرا دیئے ہمارے ہاتھ بری طرح جل گئے اور صبح تک بڑے بڑے آبلے پڑ گئے۔

جہاں تک کہ علم و فضل کا تعلق ہے وہ عام رؤسا سے بالکل مختلف، اور رات کے دو بجے تک کتب بینی کیا کرتے تھے۔ فارسی زبان اور تاریخ اسلام پر ان کو کسقدر عبور حاصل

---

[1] وہ ہمارے یہاں اکثر آتے اور ہفتوں ٹھہرا کرتے تھے۔

تھا کہ سعدی، حافظ، نظیری قاآنی اور فردوسی کا پورا کلام از بر تھا۔ اردو میں وہ میر تقی میر اور میر انیس کے شیدائی تھے۔ اور جب انیس کے مرثیے اور فردوسی کا شاہنامہ سناتے تھے تو سماں بندھ جاتا تھا۔

شاعری میں سب سے پہلے مرزا داغ سے اصلاح لی، اس کے بعد امیر مینائی اور جلال لکھنوی سے استفادہ کیا، ہرچند وہ لکھنؤ کی غالب پرست "معیار پارٹی" کے رکن تھے مگر غالب پر میر کو ترجیح دیتے تھے۔

اور تاریخ اسلام جب بیان فرماتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود اس دور میں موجود تھے، مجھ سے ایک بار، سید ناصر حسین صاحب قبلہ نے فرمایا تھا کہ آپ کے والد گرامی کو تاریخ اسلام پر اس قدر عبور حاصل تھا کہ خود مجھے اس پر غبطہ پیدا ہوا کرتا تھا۔

دینی اعتبار سے وہ سنی تھے، لیکن اہل بیت کی محبت کو جزو ایمان ہی نہیں عین ایمان سمجھتے اور حضرت علیؑ کو تینوں خلفاء پر بمراحل ترجیح دیتے تھے۔

قلب کی گداختگی، شاعری سے شیفتگی اور علم وفضل سے وابستگی، اور لکھنؤ کی تہذیب سے دل دادگی کے باوصف ان کے مزاج میں اس قدر غصہ تھا کہ غضب کے ہنگام وہ ایک خوفناک پٹھان کے علاوہ اور کچھ بھی نظر نہیں آتے تھے۔ اور "قبضے پر ہاتھ رکھتے ہی کچھ اور ہو گئے" کا عالم ان پر طاری ہو جایا کرتا تھا۔

ان کی سرکار سے سیکڑوں بیواؤں، یتیموں اور بوڑھوں کو ماہانہ وظائف ملا کرتے تھے اور اس کے اخفاء میں ان کو اس قدر غلو تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر ہی نہیں ہونے پاتی تھی۔

ان کے انتقال کے بعد، میں نے وظائف کا رجسٹر دیکھا تو یہ دیکھ کر حیرت ہوگئی کہ اس رجسٹر میں ان لوگوں کے نام بھی درج ہیں جو ہمارے خلاف عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دے چکے تھے۔ اور اس کے باوجود ان کا وظیفہ بند نہیں کیا گیا تھا۔

ہم آفریدیوں اور قندھاریوں کے مابین شاہی دور میں ہمیشہ تلوار چلتی رہی تھی۔ قندھاریوں میں ایک صاحب عبدالرحمٰن خاں تھے جو میرے باپ کے پاس آیا کرتے تھے۔ انھیں آتے جاتے دیکھ کر مجھ کو اس بات پر تعجب ہوا کرتا تھا کہ قندھاریوں اور آفریدیوں کے درمیان تو ایک مدت سے عداوت چلی آرہی ہے۔

بلکہ وہ میرے باپ سے کیوں ملنے آتے ہیں، اور اس سے بھی زیادہ تعجب اور پشیمانی آمیز افسوس اس بات پر ہوتا تھا کہ عبدالرحمن خاں کے آتے ہی میرے باپ میرے باپ کی آنکھیں کیوں جھک جاتی ہیں یہ سوچ سوچ کر دن بھی دل میں کڑھا کرتا تھا کہ میرے باپ شاید عبدالرحمن خاں سے ڈرتے ہیں، جبھی تو ان کو دیکھتے ہی آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں، لیکن ڈر کے مارے زبان سے کچھ کہتا نہ تھا، جب بہت دن تک یہ تماشہ دیکھتا رہا تو مجھ سے ضبط نہیں ہوا اور ایک روز ڈرتے ڈرتے میں نے پوچھا میاں آپ عبدالرحمان خاں سے آنکھیں کیوں نہیں ملاتے، انھوں نے میرا یہ سوال سنکر پہلے تو ادھر اُدھر دیکھا اور مجھ کو اپنے قریب بٹھا کر فرمایا بیٹا، عبدالرحمن خاں ایک زمانے میں رئیس تھے اب ان کے پاس کچھ بھی نہیں رہا ہے اس لئے میں ان کو ایک وظیفہ دیتا ہوں، اور بیٹا شریفوں کی یہ آن ہے کہ جسکو وظیفہ دیتے ہیں، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھتے کہ وہ کہیں شرمندہ نہ ہو جائے۔ اور جب میں آنکھوں میں آنسو بھرے جانے لگا تو انھوں نے فرمایا، دیکھ بیٹا میرے سر کی قسم، یہ بات کبھی زبان پر نہ لانا۔

جہاں تک ان کی ادبی زندگی کا تعلق ہے، وہ گاہ گاہ غزلیں کہا کرتے تھے، ان کے پاس کوئی بیاض نہیں تھی، غزلیں پرچوں پر لکھ کر، ادھر ادھر ڈال دیتے یا کبھی صندوقچے میں رکھ لیا کرتے تھے، اس لئے ان کے کلام کا بہت بڑا حصہ تلف ہو گیا، جو چند غزلیں مل سکیں وہ بھائی صاحب نے "کلام بشیر" کی صورت میں چھاپ دیں، جس کا ایک حصہ ترقی اردو بورڈ میں موجود ہے۔

ان کو زبان کی صحت، اور لہجے کی نجابت کا بے حد خیال رہتا تھا، اور جب ہم میں سے کوئی غلط بولتا تھا، وہ تڑاق سے تھپڑ مار دیا کرتے تھے۔

افسوس کہ "کلام بشیر" اس وقت میرے سامنے نہیں ہے حافظے میں جو شعر موجود ہیں وہ سن لیجئے:۔

آمادہ ہو جو سوز نہاں کے بیان پر — انگارہ خود اٹھا کے میں رکھ لوں زبان پر

چھوڑو خدا ہی پر کہ وہاں ہوگا فیصلہ — میرے بیان پر نہ، تمہارے بیان پر

اب تم بھی مہرباں ہو تو جی خوش نہ ہو سکے — دل مر گیا، کچھ ایسی آئی جان پر

یہ رشک کے صدمے کبھی دل سہ نہیں سکتا — جنت بھی ترا گھر ہو تو میں رہ نہیں سکتا

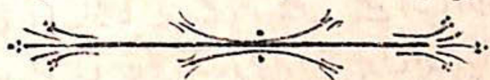
سمجھو تو اسی پردے میں کہہ جاتا ہے سب کچھ — جو تم سے یہ کہتا ہے، میں کچھ کہہ نہیں سکتا

جگنوؤں کا وہ چمکنا کبھی ویرانوں میں　　　وہ غریبوں کے مزاروں پہ چراغاں ہونا
دل ہی دل میں مرے رونے پہ وہ ہنسنا انکا　　　اثرِ ضبط وہ چہرے سے نمایاں ہونا

راہ پر، ان کو لے ہی آیا دل　　　اُف رے چلتے ہوئے زمانے کے

دم ان کے سامنے نکلے دُعا یہ مانگوں گا　　　ذرا مجھے مرے احباب قبلہ رو کرتے
برا ہو دل کا یہ کم بخت آہ کر بیٹھا　　　قریب تھا کہ وہ کچھ مجھ سے گفتگو کرتے

کوئی گریاں قریب تُربت ہے　　　زندگی، پھر تری ضرورت ہے



میری ماں

نواب خواجہ محمد خاں، جاگیر دار دھول پور (راجپوتانہ) کی بیٹی تھیں.
میرے نانا ہر چند بہت معمولی سے پڑھے لکھے آدمی تھے، لیکن، یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ انہیں اپنی بیٹی اور بیٹے کی تعلیم و تربیت میں بے حد غلو تھا. انہوں نے لکھنؤ سے ایک قابل استانی اور لائق استاد کو بلا کر اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا تھا، اور اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے لکھنؤ کی مغلانیوں کو بھی ملازم رکھا تھا کہ وہ انہیں آداب سکھائیں.

اس لکھنوی اثر کا یہ نتیجہ نکلا کہ میرے ماموں تو بالکل شیعہ ہو گئے اور میری ماں ہر چند اصحاب ثلاثہ کو مانتی رہیں لیکن حضرت علیؓ کو سب پر برابر ترجیح دینے اور محرم میں عزاداری کرنے لگیں.

میری نانی کا سایہ میری ماں کے سر سے لڑکپن ہی میں اُٹھ چکا تھا، لیکن انکی سوتیلی ماں حاتم زمانی بیگم نے انہیں سگی ماں کی طرح اس لاڈ سے پالا کہ میری ماں کو یہ محسوس نہیں ہو سکا کہ انکی ماں کا انتقال ہو چکا ہے، جب میری ماں کی شادی کا وقت آیا تو چونکہ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ میرے دادا براتیوں کا ایک لشکر ساتھ لیکر آ رہے ہیں، اس لئے وہ دھولپور سے آگرہ چلی آئیں کہ نانا کے آگرے والے محل میں بیک وقت پانچ سو مہمان ٹھہرائے جا سکتے ہیں.

میرے نانا کے تعلقات راجپوتانہ کے تمام والیان ریاست سے برادرانہ تھے اسی

لے میری ماں کی شادی میں چھ سات والیان ریاست نے شرکت کی تھی۔
اور چونکہ میری سوتیلی نانی حاتم زمانی بیگم واقعی حاتم ثانی تھیں، اس لئے انھوں نے اس قدر جہیز دیا تھا، کہ وہ مال گاڑی کی آٹھ بڑی کراچیوں میں بھر کر ملیح آباد لایا گیا تھا اور آگرے میں اس شادی کے ڈنکے بج گئے تھے۔
حاتم زمانی بیگم نے دو مغلانیاں، دو غلام اور ایک ہاتھی بھی، اس کے چاندی سونے کے زیوروں کے ساتھ جہیز میں شامل کر دیا تھا۔
آگرے سے کامل دو مہینے کی مہمان داری کے بعد، جب برات ملیح آباد آئی، تو میری دادی فرماتی تھیں کہ تمام محل میں چراغاں کیا گیا، اور ایک عشرے تک دعوتوں اور مجروں کا سلسلہ جاری رہا۔
دادا میاں چونکہ غیر معمولی طور پر بیحد کثیر العیال تھے اور چونکہ انکے بہت سے بیٹے فوت ہو چکے تھے، اس لئے ان کا یہ معمول تھا کہ وہ ہر ہفتے، شام کے وقت اپنے مرے بیٹوں کو نام لے لیکر پکارتے کہ اے امیر احمد، اور اے رشید احمد واپس آجا، واپس آجا، اور اس قدر زور سے روتے تھے کہ محل کے تمام سقف و بام ہلنے لگتے تھے۔
دادا میاں کی آواز جب چراغ جلے محل میں گونجنے لگتی تھی ڈر کے مارے میری ماں کا برا حال ہو جاتا تھا۔ وہ کانپنے لگتی تھیں اور میکے سے آئی ہوئی مغلانیاں ان سے کہتی تھیں صاحبزادی یہ نواب صاحب کو کیا ہو گیا تھا کہ انھوں نے آپ کو شیروں کے کٹہرے میں بند کر دیا ہے۔
میرے باپ کو میری ماں کی اس دہشت زدگی کا علم ہوا تو وہ اپنے بڑے بھائی محمد اسحق خاں کے محل میں اُٹھ گئے۔ لیکن وہاں پہنچ کر بھی میری ماں کو سکون حاصل نہ ہو سکا۔ میرے چچا اس قدر مغلوب الغضب تھے کہ ذرا ذرا سی بات پر ماماؤں اصیلوں کو اسقدر زور سے ڈانٹتے ڈپٹتے تھے کہ ان کی آواز کی دھمک سے زمین کانپنے لگتی اور نم خوردہ چھجے کے پلاسٹر کے ٹکڑے ٹوٹ ٹوٹ کر چبوترے پر بکھر جاتے تھے خسر کے محل میں ہائے ہائے کی پکار اور دیور کے محل میں شیر کی ڈہکار ــــ میری ماں بڑے شش و پنج میں مبتلا ہو گئیں۔
اس کے بعد میرے باپ کا محل کیسے بنا، اس کی روداد خود میری ماں کی زبان سے سن لیجئے۔
انھوں نے ایک روز مجھ سے کہا، بیٹا جب میں تمہارے چچا کے گھر میں رہتی تھی ایک دن ایک ایسی ہلچل برپا ہو گئی میں سمجھی آج میرا دم نکل جائے گا۔ اور وہ ہلچل،

لہ یہ ماجرا میری ماں نے مجھ سے بیان فرمایا تھا۔

کیسے ہوئی یہ بھی سن لے۔

ایک دن تمہاری چچی، ساٹن کا بے حد چست گھٹنا پہنے چبوترے کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگیں تو اس قدر گھٹنے پر زور پڑا کہ وہ ان کے گھٹنے کے نیچے کوئی ایک بالشت بھر ادھڑ گیا۔ اتنے میں بدقسمتی سے تمہارے چچا نادقت زنانے میں آنکلے، انھوں نے اپنی بیوی کا ادھڑا گھٹنا دیکھا تو بڑی تیزی کے ساتھ کمرے میں جاکر، ایک بڑی لانبی سی چھری لیکر آگئے، تمہاری چچی کو چبوترے پر گرادیا، ان بیچاری کے سینے پر چڑھ بیٹھے، اور کہا، بے غیرت بھرے گھر میں ننگی پھر رہی ہے، یہ کہتے ہی انھوں نے چھری اٹھائی کہ ان کا گلا کاٹ ڈالیں۔ وہ تو اللہ نے یہ بڑی خیر کی کہ یہ ماجرا تمہاری دادی نے دیکھ لیا، انھوں نے آکر تمہارے چچا کی پیٹھ پر زور سے چھڑی مار کر کہا اسحٰق میرے سر کی قسم میری بہو کے سینے سے اتر آ، بڑا غیرت دار بنا ہے۔

جب ماں نے قسم دی تو تمہارے چچا تمہاری چچی کے سینے سے اتر آئے، اور چھری پھینک کر بڑبڑاتے ہوئے باہر چلے گئے۔

بیٹا یہ تماشہ دیکھ کر میں ادھ موئی ہو کر رہ گئی، اور جب تمہارے باپ گھر میں آئے میں نے سارا ماجرا بیان کر کے ان سے کہا، اگر آپ میری زندگی چاہتے ہیں تو خود اپنا مکان بنوا لیجئے، نہیں تو میں ہول کھا کھا کے ایک دن مر جاؤں گی۔

اس کے بعد میرے باپ کا مکان تعمیر ہو گیا، اور میری ماں نے اپنے مکان میں آکر اطمینان کی سانس لی۔

میری ماں کو اس نازو نعم سے پالا گیا تھا کہ وہ کھانا پکانا، سینا پرونا بالکل نہیں جانتی تھیں پکانا ریندھنا، یا سینا پرونا تو بڑی بات ہے ان کو پوری سو تک گنتی بھی نہیں آتی تھی، اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ روپے میں کتنے پیسے اور آنے ہوتے ہیں۔ ان کی خاص مغلانیاں ممو بیگم اور عباسی خانم ان سے مہینے میں دو دو، اور کبھی تین تین بار تنخواہیں وصول کر لیتی تھیں اور ان کو پتہ نہیں چلتا تھا، اور جب کبھی وہ کہتی تھیں کہ مجھے تو یاد پڑتا ہے کہ میں پہلی کو تمہاری تنخواہ دے چکی ہوں تو وہ کہتی تھیں ہے ہے بیگم صاحب بھلا ایسا اندھیر ہو سکتا ہے کہ ہم تنخواہ پا چکنے کے بعد بھی پھر آپ سے تنخواہ مانگیں حضرت عباس کی قسم آپ کو دھوکا ہو رہا ہے، تو میری ماں الٹی شرمندہ ہو کر رہ جایا کرتی تھیں۔ ان امور پر نگاہ کر کے میرے باپ نے گھر کا انتظام کبھی ان کے سپرد نہیں کیا، اور میری دادی جان گھر چلاتی رہیں۔

سلہ میری دادی آگرے کے اس ممتاز اور متمول گھرانے میں پیدا ہوئی تھیں جس کے محل کے چاروں طرف ایک بہت بڑا پائیں باغ تھا اور اسی بنا پر اہل آگرہ اس باغ کو باغ والے کہا کرتے تھے دادی جان کے باپ

میری ماں کو شاعری سے بڑی دلچسپی اور میر انیس سے بڑی محبت تھی، اور ان کے مرثیے پڑھ پڑھ کر اور سن سن کر رو دیا کرتی تھیں۔

ہم سات بھائی بہن تھے، یعنی اختر جہاں بیگم[1]، شفیع احمد خاں، بشیر احمد خاں (بعد کو شبیر حسن خاں جوش)، انیس جہاں بیگم، رئیس احمد خاں، حشمت جہاں اور شوکت جہاں۔ لیکن ہم سات بھائی بہنوں میں میری ماں مجھے سب سے زیادہ چاہتی تھیں، اور دنوں کی خدمت گزاری بوا گلزار کے سپرد تھی، لیکن میرے ناشتے کا دودھ شہد اور جلیبیاں لا کر وہ اپنے ہاتھ سے تیار کر کے مجھ کو آواز دیا کرتی تھیں، ننھے آ تیرا دودھ تیار ہے۔

ابھی کوئی ایک ہفتہ کی بات ہے کہ صبح کو میری بیوی نے مجھ سے پکار کر کہا ارے ہے کب تک اچھل کود (ورزش) کرتے رہو گے، تمہارا دودھ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ بیوی کی یہ آواز سن کر مجھے اپنی ماں یاد آگئیں، دل پر بجلی گر پڑی اور آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ جاری ہو گیا۔

میری پیاری ماں، آپ سو چکی ہیں، اور میں ابھی تک جاگ رہا ہوں۔ زندگی کی

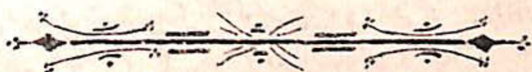
نام غالباً میرزا انشاء حسین بیگ تھا، جن کے دادا ترکستان سے آ کر آگرے میں آباد ہو گئے تھے۔ میرزا انشاء حسین بیگ صاحب آگرے کے کوتوال تھے، اور آگرے کی مشہور کوتوالی گلی آج تک ان کے نام سے مشہور ہے۔ میں نے دادی جان کے حقیقی خالہ زاد بھائی میرزا خادم حسین مختار رئیس اکبرآبادی کو لڑکپن میں دیکھا تھا، وہ گرم ڈھاکہ انگرکھا پہنتے تھے، اور شانوں پر شالی رومال پڑا رہتا تھا۔ حضرت رئیس بڑے وضعدار، بڑی آن بان کے بزرگ اور آدھے شہر آگرہ کے مانے ہوئے استاد تھے، آخر عمر میں ان کی جاگیرداری پر زوال آگیا تھا مگر رکھ رکھاؤ میں ذرہ بھر کمی نہیں آئی تھی، ایک بار کسی نے ان کے سامنے میرزا غالب کا ذکر کیا تھا تو انہوں نے کہا تھا کہ غالب کو مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے، اس لیے کہ وہ میرے قرابت داروں میں سے تھے۔ دادی جان کو ہزاروں کہاوتیں اور فارسی و اردو کے ہزاروں اشعار یاد تھے جنھیں وہ برمحل صرف کیا کرتی تھیں، اور جب ہم سب بھائی بہن دسترخوان پر بیٹھتے تھے وہ ہمارے ساتھ آ کر بیٹھ جاتیں اور کھانے کے آداب بتایا کرتی تھیں۔ اور جب ہم میں سے کوئی غلط لفظ بول اٹھتا تو وہ منہ پر تھپڑ مار دیا کرتی تھیں۔ وہ بے حد راسخ العقیدہ شیعہ تھیں اور جب وہ چپکے چپکے مجھ کو شیعیت کا درس دیا کرتی تھیں تو میری پھوپی جو میرے چچا کی طرح کٹر سنی تھیں، ان سے ہنس کر کہا کرتی تھیں اماں پوتے کو شیعہ نہ بنائیے تو وہ بگڑ کر کہتی تھیں چل پرے مردار خارجن، آخر گھر میں کوئی تو ایسا ہو جس کا فاتحہ درود مرنے کے بعد مجھ تک پہنچ سکے۔ ان میں اس قدر زبردست انتظامی قوت تھی کہ وہ ایک سلطنت کا کام چلا سکتی تھیں۔

[1] صد حیف! اختر جہاں بیگم، شفیع احمد خاں اور حشمت جہاں کا انتقال ہو چکا ہے،

رات کس قدر بھیانک ہے، یہ آپ سے کیونکر بتاؤں ۔۔۔ اماں، آپ کا ننھا، اب بوڑھا ہو چکا ہے اور اب اسکو "ابا" اور "نانا" کے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ کاش! میں آپ کے سامنے مر جاتا، اور یہ دن نہ دیکھتا۔

میری اچھی ماں اب مجھے اپنے پاس بلا لیجئے، اور اے اللہ اب مجھ کو اس دنیا سے اٹھا لے

سر گھوم رہا ہے ناؤ کھیتے کھیتے — اپنے کو، فریب عیش دیتے دیتے
اُف کار حیات، تھک گیا ہوں معبود — دم ٹوٹ چکا ہے سانس لیتے لیتے



میرے چچا

نام تھا نواب محمد اسحٰق خاں "کسمنڈی" کے تعلقہ دار اور بڑے رعب دواب کے بیحد اکھڑ پٹھان تھے۔ آواز اس قدر بھاری تھی کہ سننے والوں کے کلیجے شق ہو جائیں، مزاج میں اسقدر زبردست غصہ تھا کہ جب بگڑ جاتے تو بے تحاشا گالیاں دینے اور بکنے لگتے تھے اور یہ بھی خیال نہیں رہتا تھا کہ بھائی بھتیجے بھانجے، بیٹے بیٹھے ہوئے ہیں۔

وہ میرے باپ کے حقیقی بڑے بھائی اور ان سے عمر میں اتنے بڑے تھے کہ میرے باپ نے ان کی بیوی کا دودھ پیا تھا، مزاج میں وہ میرے باپ کے بالکل برعکس تھے۔ علم و ادب اور تہذیب سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ میرے باپ تفضیلی اور وہ بیحد کٹر سنی خلیفہ اول کو تمام اصحاب پر ترجیح دیتے تھے۔

جب ان کے علم میں یہ بات آئی کہ میں شیعہ ہو گیا ہوں، تو انہوں نے مجھے اس نیت سے اپنے گھر بلایا کہ میری مرمت کر دیں، مجھے دیکھتے ہی انھوں نے گرج کر کہا۔

سب کے سرتاج بعد پیغمبر
یعنی بو بکر، افضل و برتر

پوچھا کیسا شعر ہے میں نے کہا، بڑے بادا بہت اچھا، میرا جواب سن کر وہ بھنچے ہوئے غصے کے ساتھ، منھ سے آوازیں نکالنے لگے۔ ہوں، ہوں وہ معمولی آواز کی "ہوں" نہیں بڑی گھڑگھڑاتی، اور طویل الصوت ہوتیں تھیں، جن کے یہ معنی تھے کہ اگر اس شعر کے

خلاف کچھ کہو گے تو مزا چکھا دوں گا۔ لیکن میں بے وقعت نہیں تھا کہ ان کو موقع دے دیتا اس لئے ٹال کر چلا آیا۔

میری دادی جان میرے باپ کے ساتھ رہتی تھیں، اور وہ ہر جمعرات کو ان سے ملنے آیا کرتے تھے۔ ایک روز رئیس احمد انگنائی میں کھیل رہا تھا۔ کہ وہ دادی کے سلام کی خاطر آ گئے

رئیس احمد سے انھوں نے کہا آؤ میرے ساتھ، ماں کو سلام کرنے کے بعد تم کو گھر لے جا کر خوب برفی کھلاؤں گا۔ وہ دادی کو سلام کر کے بیٹھ گئے، اور رئیس کو گھٹنے پر بٹھا لیا۔

دادی جان نے باتوں میں کہا۔ بیٹا اسحٰق یہ بو کیسی آ رہی ہے، انھوں نے کہا اماں یہاں تو کسی قسم کی بو نہیں ہے، دادی نے اپنی لونڈی سے کہا سکونت کیا تجھے بھی بو محسوس نہیں ہو رہی ہے اور جب سکونت نے بھی یہی کہا کہ بی بی مجھ کو تو بو نہیں آ رہی ہے، تو دادی نے ناک پر آنچل کا سرا رکھ کر کہا اف وہ ابو بکر۔

یہ سنتے ہی چچا جامے سے باہر ہو گئے۔ رئیس کو گھٹنے سے نیچے گرا دیا، اور کہا اماں آپ تبرا بازی کر رہی ہیں۔ یہ کہہ کر انھوں نے فرش پر دھم سے ڈنڈا مار کر کہا "اماں دم چار یار دم چار یار"[1] یہ سنتے ہی دادی نے کڑک کر کہا "بیٹا دم پنجتن"، اور یہ دم چار یار دم پنجتن کے نعرے اس قدر بلند ہو گئے کہ مردانے تک آواز پہنچی، میرے باپ گھبرائے اندر آئے کہ دم چار یار اور دم پنجتن کیا ہو رہا ہے

میرے باپ کے آتے ہی بڑے بادا غصے میں کانپتے کھڑے ہو گئے اور کہا بشیر تم دیکھ رہے ہو کہ اماں تبرے بازی کر رہی ہیں۔ کیا کروں ماں ہو گئیں، کوئی اور کہتا تو خون چوس لیتا۔ ابھی وہ کہہ ہی رہے تھے کہ سامنے سے مرغی گزرنے لگی انھوں نے مرغی کی ٹانگیں چیر کر پھینک دیں۔ اور فوراً میرے گھر سے کانپتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد فرنگی حکومت نے ایک سخت مزاج کمشنر کو جس کا نام شاید ہیولاک تھا، اس امر پر مامور کیا تھا کہ وہ روہیلکھنڈ اور ملیح آباد کے پٹھانوں کو ڈرائے اور ان کے دلوں پر انگریزی حکومت کے رعب کا سکہ بٹھائے ـــ دورہ کرتا جب وہ ملیح آباد آیا تو میرے دادا کی مخالف پارٹی نے اس سے کہا کہ نواب محمد اسحٰق خاں کے سپاہیوں میں بہت سے بدمعاش اور ڈاکو شامل ہیں اور جب چچا اس سے اپنے سپاہیوں کے لشکر کے ساتھ ملنے گئے تو کمشنر نے ان سے کہا "دل کھان صاحب آپ کا سپاہی لوگ بدماس (بدمعاش) اور ڈاکو ہے یہ سنتے ہی انھوں نے بڑے زور سے ڈپٹ کر کہا ابے تو بدمعاش ہے میں ابھی تری کیمپین (ٹیم) کی... پھاڑ کر رکھ دوں گا یہ کہہ کر وہ

---

[1] یعنی میں چار یار کا دم بھرتا اور ان کی برتری کا نعرہ لگاتا ہوں۔

انکی طرف جھپٹے وہ گھبرا کر خیمے سے نکل گیا، اور گھوڑی پر بیٹھ کر لکھنؤ بھاگ گیا ——— اور لکھنؤ جاتے ہی اس نے ملیح آباد کے تھانیکے انچارج کو تار دیا کہ چچا کے تمام اسلحہ ضبط کرلئے جائیں ——— تھانے دار کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ سیدھا دادا میاں کی ڈیوڑھی پر گیا۔ دادا میاں محل کے اندر جا چکے تھے۔ اس نے ان کے منہ چڑھے خدمتگار رحم علی کی ٹھاڑی میں ہاتھ ڈال کر کہا مجھ پر ایک بہت بڑی مصیبت آ گئی ہے، میں اس وقت بڑے خاں صاحب سے ملنا چاہتا ہوں، خدا کے واسطے میری خبر کر دو ——— رحم علی کو ترس آگیا! اس نے فوراً ماما کے ذریعہ سے خبر کر دی۔ . . . . دادا میاں نے پردہ کرا کے اس کو اندر بلا لیا۔

تھانے داران کے قدموں پر گر پڑا، اور کہا خاں صاحب بہادر میری جان بچا لیجئے۔ چھوٹے خاں صاحب (میرے چچا) کے اسلحہ ضبط کر لینے کا مجھے کمشنر نے تار دیا ہے حضور مدد کر دیں گے تو میری جان اور نوکری بچ جائے گی۔

دادا میاں نے چچا کو بلا کر کہا اسخت میرے سر پر ہاتھ رکھو، چچا نے ان کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تو انھوں نے کہا ان تھانیدار کو کمشنر نے تار دیا ہے کہ تمہارے اسلحہ ضبط کر لئے جائیں اس میں ان کی کوئی خطا نہیں، میرے سر کی قسم انہیں کوئی گزند نہ پہنچانا۔

انھوں نے تھانیدار سے کہا آئیے میری طرف اور لے جائیے ہتھیار ——— اسکے بعد باہر بیٹھکے میں ایک بڑی سی میز پر تمام اسلحہ چن دیئے گئے۔

سب سے پہلے انہوں نے بندوق اٹھائی، اس کو فرش پر رکھا، اور اس پر پانچ جوتے مارے، اور تھانیدار کی طرف یہ کہہ کر بندوق پھینک دی کہ لیجئے اس کو اپنی ماں کی .... میں رکھ لیجئے۔ اور اسی طرح ایک ایک کر کے، تمام اسلحہ پر پانچ پانچ جوتے مار کر اور اسے بھی اپنی ماں کی...... میں رکھ لیجئے کہہ کر انھوں نے تمام ہتھیار واپس کر دیئے اور گالیاں کھایا ہوا تھانیدار سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

ان کو جب غصہ آتا تھا تو بقدر شدت غضب، وہ دیر تک اس قابل نہیں رہتے تھے کہ بات کر سکیں، اس عالم میں وہ اپنے دونوں ہاتھ کی انگلیوں کو باہم پیوست کر کے اپنے دونوں انگوٹھوں کو اٹھا کر اور ایک دائرے کی صورت میں ایک دوسرے کے گرد گردش دینے لگتے تھے۔ اور جب تک ان پر یہ کیفیت طاری رہتی تھی، کوئی ان کے پاس آنے یا ان سے بات کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

ایک روز وہ کسی کو گالیاں دینے کے بعد اپنے انگوٹھوں کو گھما رہے اور تمام حاضرین انکے

کمرے سے نکل کر برآمدے میں لرزاں و ترساں کھڑے ہوئے تھے کہ ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب ان سے ملنے کے واسطے آ گئے۔ ڈپٹی کلکٹر صاحب سے کوئی یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکا کہ فرطِ غضب کی بنا پر خاں صاحب کے انگوٹھے گھوم رہے ہیں۔ اسوقت ان کے پاس نہ جائیے۔

چنانچہ ڈپٹی صاحب ان کے کمرے میں داخل ہو گئے، داخل ہوتے ہی انھوں نے کہا، "آداب عرض خاں صاحب" چچا جان نے ان کی طرف گھور کر دیکھا بول سکنے کی طاقت نہیں تھی سلام کا جواب نہیں دیا، اور "ہوں" کر کے اور تیزی سے انگوٹھے گھمانے لگے۔ ڈپٹی نے بڑے غور سے ان کو دیکھا، اور سوچنے لگا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے کہ انھوں نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا۔ اور یہ کیا تماشہ ہے کہ ان کے انگوٹھے برابر گھوم رہے ہیں۔ اور دو ایک منٹ کی حیرانی کے بعد جب اس نے پھر کہا "خاں صاحب مزاج کیسا ہے؟ ــــــــ" تو انھوں نے اپنی رانوں کی طرف اشارہ کر کے کہا، "یہ......." مزاج پرسی کا یہ انوکھا جواب سن کر وہ دفعتاً اٹھ کھڑا ہوا، اور سنسناتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

ایک بار ہمارے گھر میں مشاعرہ ہونے والا تھا، لکھنؤ کے مشاہیر میرے باپ کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ماں کو سلام کرنے کے لئے، چچا جان، گھر کا سے نکل کر ہمارے صحن میں آ گئے، اور میرے باپ کے گرد لوگوں کا ہجوم دیکھ کر ان کے کمرے میں چلے آئے، میرے باپ کھڑے ہو گئے، ٹوپی پہن لی، حقہ سامنے سے ہٹا دیا گیا انھوں نے پوچھا بشیر، یہ کون لوگ ہیں بتاؤ، میرے باپ نے کہا میاں بھائی یہ لکھنؤ کے شعراء ہیں آپ ہیں مولانا صفی، آپ ہیں حضرت عزیز، آپ ہیں حضرت محشر، آپ ہیں حضرت آرزو، آپ ہیں حضرت ابر آپ ہیں محمد صاحب بہادر اور آپ ہیں حکیم ننھے آغا صاحب فاضل۔

چچا جان نے کہا مولانا صفی سنتا ہوں آپ شاعر لوگ یہ باندھتے ہیں کہ معشوق کے کمر ہی نہیں ہوتی، کیا یہ سچ ہے، مولانا صفی نے کہا جی ہاں خاں صاحب شاعری میں معشوقوں کی کمر کو معدوم و موہوم کہا جاتا ہے، اس پر چچا نے کہا اب ہم آپ سے یہ پوچھتے ہیں کہ اگر معشوقوں کے کمر ہوتی ہی نہیں تو پھر شب وصل میں وہ کیا چیز ہوتی ہے جس کو، دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر آپ لوگ چچ چچ چچ کرتے رہتے ہیں۔" ان کے اس سوال سے تمام شعراء دنگ ہو کر رہ گئے، اور میرے باپ کی پیشانی سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔

ایک بار ان کے خلف اکبر وصی احمد خاں، ایک ابتدائی قسم کا گراموفون لیکر آئے اور کہا

باوا اس باجے سے آدمیوں کی آوازیں آتیں اور گانا سنائی دیتا ہے آپ کو سنانے آیا ہوں، انھوں نے کہا یہ عجیب چیز لائے ہو، سناؤ۔

انھوں نے باجا بجایا تو اس سے بڑی مدھم گانے کی آوازیں آنے لگیں اور جب وہ تیسری چوڑی چڑھانے لگے تو بڑے باوا نے فرمایا ہٹاؤ اس سالے باجے کو اس سے تو چری پھٹی "چری پھٹی" کی آوازیں آرہی ہیں۔ آئندہ مجھ کو یہ فحش باجا نہ سنانا، ورنہ ڈنڈا...... گھسیڑ دوں گا۔

اور جب وصی احمد بھائی، کھسیانے ہو کر، باجہ اٹھانے لگے، تو بڑے باوا نے ڈنڈا مار کر اس کو توڑ ڈالا۔

ایک مرتبہ وصی احمد بھائی سوٹ پہن کر اپنی فرنگی معشوقہ سے ملنے کے لئے لکھنؤ جا رہے تھے، ابھی وہ احاطہ کو طے ہی کر رہے تھے کہ معلوم نہیں کیا بات ہوئی کہ بڑے باوا خلاف، وقت معمول مردانے میں نکل آئے، اور ان کی پشت دیکھ کر سپاہیوں سے پوچھا یہ کون فرنگی جا رہا ہے، سپاہیوں کو یہ بتانے کی جرأت نہیں ہوئی کہ آپ کے فرزند اکبر وصی احمد خاں ہیں، لیکن بڑے باوا نے جب ڈانٹ کر پوچھا تو انھوں نے ڈرتے ڈرتے بتا دیا کہ حضور یہ وصی احمد خاں ہیں۔ بڑے باوا نے ڈانٹ کر آواز دی پلپلی صاحب ادھر آئیے وصی احمد بھائی اُچھل پڑے رنگ زرد ہو گیا، سر جھکائے ہوئے آئے، بڑے باوا نے فرمایا کہ آپ پٹھان ہو کر ایسے بے غیرتی کے ننگے کپڑے پہنتے ہیں، جب آپ پھاٹک کی طرف منھ کئے جا رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ آپ کے سرین ٹا، ٹا، ٹا، ٹا کرتے اوپر نیچے آجا رہے ہیں، تھوک ہے آپ کی پھٹولی پر جائیے ... میں آپ کو عاق کرتا ہوں، ہر چند آپ فرزند اکبر ہیں، مگر میں آپ کو نہیں آپکے چھوٹے بھائی کو اپنا جانشین بناؤں گا۔ جائیے، اور اب بڑے مزے سے اپنے سرینوں کو طوئے طوئے طوئے طوئے، طوئے طوئے کرتے پھریئے۔

میری بیوی

اشرف جہاں بیگم، میرے دادا کے مختلف البطن، چھوٹے بھائی نواب محمد نسیم خاں بہادر تعلقہ دار سہلامو کے فرزند محمد مقیم خاں کی بیٹی اور سائمہ بیگم کی نواسی ہیں سائمہ بیگم کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ میری بیوی کا مزاج سمجھنے میں اس سے بڑی مدد ملے گی۔

سائمہ بیگم، میرے اور میری بیوی کے پردادا نواب فقیر محمد خاں بہادر کی نہایت شعلہ مزاج اور چہیتی بیٹی تھی، اور باپ نے، اس خیال سے کہ بڑے محل میں ان کی شعلہ مزاجی کی بنا پر کوئی ہنگامہ نہ ہو، انہیں "منجھلا محل" دے دیا تھا کہ وہاں وہ بلا شرکت غیرے آرام سے رہیں۔

سائمہ بیگم کی نفیرت کا یہ عالم تھا کہ ان کے کپڑے دھوبی کے وہاں نہیں جاتے تھے، دھوبن ان کو گھر ہی میں دھوتی اور استری کر دیا کرتی تھی۔

ان کا کھانا تو منجھلے محل ہی میں پکتا، لیکن ان کا ناشتہ ایک روپیوں اور اشرفیوں سے بھرے ہوئے تھال کے ساتھ، بطور جیب خرچ، باپ کے گھر سے آیا کرتا تھا، جن کو وہ چاندی اور سونے کی آمیزش کی بنا پر "کھچڑی" کہا کرتی تھیں۔

چونکہ ان کے دو تین بچے سنوراہی میں جا چکے تھے، اس لئے اپنی مغلانیوں ماماؤں اصیلوں اور لونڈیوں باندیوں کے متعلق انہیں یہ بدگمانی پیدا ہو گئی تھی کہ ہو نہ ہو ان میں کوئی "ٹھنیا" ضرور ہے۔

اور جب تیسرے یا چوتھے بچے کی ولادت ہوئی تو انھوں نے محل کے تمام دروں میں پردے چھڑوا دیئے اور زچہ خانے کے دروازے پر عورتوں کا پردہ بٹھا دیا کہ مخصوص ماماؤں کے سوا

لہ وہ عورت جو ٹونے ٹوٹکے سے بچوں کو ہلاک کر کے ان کا کلیجہ نظر دں ہی نظر دں میں چبا ڈالتی ہے۔

اور کوئی اندر نہ آسکے۔

اسی اثناء میں ایک متجسس مزاج کمسن لونڈی نے اندر کے بچے کو ایک نظر دیکھنے کی خاطر کوٹھے پر دبے پاؤں چڑھ کر جیسے ہی کھڑکی کا پٹ کھول کر جھانکا، سالمہ بیگم کی نگاہ اس پر پڑ گئی، انہوں نے جھٹ سے بچے کے منہ پر پلو ڈال کر فوراً یہ حکم دیا کہ اس کلموئی ٹھینیا کو زندہ دفن کر دیا جائے۔ اور اس بے چاری لونڈی کو محل کے ایک گوشے میں قدآدم گڑھا کھود کر دفن کر دیا گیا۔

اس انتہائی ظالمانہ حادثہ کے بعد۔۔ ایک روز ان کے شوہر نے جو اودھ کی فوج کے عہدہ دار تھے، جب لکھنؤ جانے کی اجازت طلب کی تو انہوں نے کہا آج نہیں، پرسوں جانا۔ شوہر نے کہا ایک ایسا ضروری کام ہے کہ مجھے آج ہی جانا ہے۔ انہوں نے کہا، میں آج تو ہرگز جانے نہیں دوں گی۔ شوہر نے کہا بیگم مجھے تو آج ہی جانا ہے، اتنا کہہ کر وہ محل سے نکل گئے۔ سالمہ بیگم نے کسی لونڈی کو حکم دیا کہ سل اٹھا لائے، وہ سل اٹھا لائی اور سل انہوں نے اپنے سینے پر اس قدر زور سے ماری کہ پل بھر میں روح پرواز کر گئی۔

دیدی کہ خونِ ناحق پروانہ شمع را ۔ چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

محل میں رونا پیٹنا ہونے لگا، ان کے شوہر نے جو آہ و بکا کی آواز سنی، گھوڑے سے کود پڑے اور جب محل میں قدم رکھتے ہی انہیں بیوی کی خودکشی کا حال معلوم ہوا تو پستول نکال کر سینے پر مار دیا۔ اور بیوی کی چارپائی کے پاس ہی گر کر دم توڑ دیا۔

یہ ہے میری بیوی کے مزاج کا پس منظر۔۔۔ وہ بہرحال سالمہ بیگم ہیں اس لئے جب ان کو غصہ آجاتا ہے تو جان لینے اور جان دینے پر اتر آتی ہیں۔

میں اب تک زندہ ہوں، میری سخت جانی کا یہ معجزہ ہے۔۔۔ وہ کبھی سیدھے منہ بات نہیں کرتیں، میری بیٹی سعیدہ، میرا بیٹا سجاد، اور ان دونوں کے بچے ان سے ڈرتے ہیں اور چونکہ وہ بچوں کو ہر آن ڈانٹتی، ڈپٹتی، جھڑکتی اور بات بات پر بدتمیز کہتی رہتی ہیں، اس لئے وہ ان کے پاس آنے جانے سے گریز کرتے ہیں۔

جب مکانوں کے سقف و بام سے آوازیں اگلوا لینے والا کوئی آلہ ایجاد ہو جائے گا تو میرا سارا مکان "بدتمیز" کی آوازوں سے گونجنے اور کانپنے لگے گا۔

یہ میرا دعویٰ ہے کہ اس پورے کرۂ ارض کا کوئی شخص، خواہ وہ کتنا ہی ماہر نفسیات یا ماہر نفسیات کا باوا ہی کیوں نہ ہو، اس امر کا کبھی اندازہ لگا ہی نہیں سکتا کہ وہ کب اور کس بات پر ہنس دیں گی اور کس بات پر جامے سے باہر ہو جائیں گی۔

کون ان کے مزاج کو برگو یا سمجھ سکتا ہے۔ میں ہزار بار تجربہ کر چکا ہوں کہ ایک روز میرے جس لطیفے پر وہ خوب جی بھر کے ہنسی تھیں، جب میں نے ان کو وہی لطیفہ دوبارہ سنایا تو انکی آنکھوں میں خون اتر آیا، اور کہنے لگیں بھاڑ میں جائے یہ بھی کوئی لطیفہ ہے ۔ میرے سامنے ایسی باتیں نہ کہا کرو۔

ہر چند میں نے اپنے معاملات عشق امکانی حد تک ان سے مخفی رکھے تھے لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپ نہیں سکتے، میرے دو ایک اور خصوصیت کے ساتھ میرے آخری عشق کے معاملات اڑتے اڑتے ان تک پہنچ گئے تھے، اور انہوں نے مجھے ایک کمرے میں قید کر کے جو جو ستم مجھ پر ڈھائے تھے ان کی شرح اب بیکار ہے کہ:

سفینہ اپنا، کنارے جب آلگا غالب ۔ خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہیے

لیکن اب بھی جب کہ میں کمبخت بوڑھا ہو چکا ہوں، وہ کم سے کم مہینے میں چار یا پانچ بار عین اس وقت جب کہ آفتاب غروب ہونے کے بعد، میں طلوع ہونا شروع کرتا ہوں اور مجھے بڑی شدت کے ساتھ میری عاشقی پر، طعن و تشنیع کا ہدف بنایا کرتی ہے۔

میں دانت نکال نکال کر کہتا ہوں، ارے اشرف جہاں میں دن بھر کا تھکا ماندہ اس وقت پینے اور جینے بیٹھا ہوں، اس وقت تو گڑے مردے نہ اکھیڑو، اس وقت، میری غلطی سے ہو گیا سو ہو گیا اب اب تو اس پر خاک ڈالو، بھول جاؤ، معاف کر دو لیکن میری گڑگڑاہٹوں کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور مجھے لگاتار بُرا بھلا کہتی رہتی ہیں وہ سلسلہ اس قدر طویل اور روح فرسا ہوتا ہے کہ میں تلملا اٹھتا ہوں، کبھی کبھی جلدی جلدی چار پیگ زہر مار کر کے، اور اوندھے سیدھے دو چار لقمے کھا کر، اور کبھی کھانا کھائے بغیر ہی خوابگاہ کی طرف بھاگتا، اور بستر پر جا کر لیٹ جاتا ہوں مگر وہاں بھی وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتی ہیں اور خوابگاہ میں داخل ہو کر وہی سلسلہ شروع کر دیتی ہیں

اثنائے ملامت میں، جب وہ پاندان کھول کر پان بنانے لگتی ہیں۔ تو میں یہ سوچ کر خوش ہو جاتا ہوں کہ اب تبرے بازی ختم ہو جائے گی، اور میں کمبخت سو سکوں گا۔ لیکن وہ وقفہ، خاموشی قبل از طوفان بن جاتا ہے اور گلوری منہ میں رکھ کر وہ اپنی ملامت کی بندوق میں نئے کارتوس بھر کر، مجھ پر دوبارہ گولیاں برسانے لگتی ہیں۔

اس طرح وہ بار بار پان بناتیں، اور دو ایک منٹ خاموش رہ کر پھر تبرا شروع کر دیتی ہیں۔ بار بار کروٹیں بدلتا ہوں، اور وہ ہر بار ٹھہر ٹھہر کر، طعن و تشنیع کے بالکل نئے نئے گوشے نکال کر، آمد ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں، کا ثبوت دیتی رہتی ہیں۔

شاید کسی نے یہ شعر میرے ہی واسطے کہا تھا۔

اگر سمر مزاج وہ کیا کیا نہ کہہ گئے ؛ ہم نے نہ پھر جواب دیا چپ پڑے رہے

اور بالآخر مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں کے زیر اثر میں تڑپ تڑپ کر سو جاتا نہایت بھیانک خواب دیکھنے لگتا اور صبح کو اس زخمی چوہے کی طرح بیدار ہوتا جس سے جی بھر کر بلی کھیل چکی ہو۔

اب ان کے مزاج کی چند خصوصیات اور بھی سن لیجئے۔

پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ وہ اپنی ہر بدگمانی، ہر وسوسے، ہر قیاس، ہر ظن اور ہر واہمے کو ایک حقیقت کبریٰ اور وحی والہام کا مرتبہ دے دیتی ہیں۔

مثلاً جب کسی نواسے یا پوتے کو وہ کوٹھے سے پکارتی ہیں، اور وہ بچہ آواز پہ آواز نہیں دیتا تو یہ جانچے بغیر کہ وہ اس وقت مکان میں ہے کہ نہیں، یا کسی ایسے دور کے گوشے میں ہے جہاں تک آواز نہیں پہنچ سکتی ان کو اس بات کا یقین، اور یقین کامل ہو جاتا ہے کہ بیٹی یا بیٹے نے اپنے بچوں کو ہدایت کر دی ہوگی کہ وہ میری [illegible] آواز پہ آواز نہ دیں، اور یہ سوچ کر وہ بیٹی یا بیٹے پر برس پڑتی ہیں، اور وہ سلسلہ دیر تک قائم رہتا ہے۔

یعنی ان کے دل میں جب کسی امر کے متعلق "ایسا ہوا ہوگا" کا خیال پیدا ہو جاتا ہے تو اس کے ہمیشہ یہ معنی ہوتے ہیں کہ یقیناً ایسا ہو چکا ہے اور اس کے سوائے کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔

یوں تو میں بالعموم پچھلے پہر بیدار ہوتا ہوں، لیکن مہینے میں کبھی ایک آدھ بار کسی نامعلوم سبب کے باعث جب میں دیر سے جاگتا ہوں تو اس غم میں سر پکڑ کر بستر پہ بیٹھ جاتا ہوں کہ آج میں جلوہ ہائے طلوع صبح سے محروم ہو کر رہ گیا۔ اور وہ جب مجھے اس عالم میں دیکھتی ہیں تو ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ میں نے اپنی معشوقہ کو خواب میں دیکھا ہوگا، ہرچند کہ دیکھا ہوگا کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ میں "دیکھ چکا ہوں"، وہ مجھ سے بگڑ کر کہتی ہیں، اب بھی تم خوابوں میں اس کلموہی کو دیکھا کرتے ہو، اللہ تم ا[illegible] کو غارت کرے کیا اب بھی مجھے چین سے رہنے نہیں دو گے۔؟

ان کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جب وہ صبح کو بیدار ہوں، اس وقت کوئی شخص بلند آواز سے نہ بولے اگر اس وقت کوئی بلند آواز سے بول دیتا ہے تو اس کی شامت آجاتی ہے۔ چھوٹے دادا کو بلند آواز سے بولنے کا مرض تھا، اور میری بیوی سب سے زیادہ ان کو جھڑکیاں دیا کرتی تھیں اور وہ میرے پاس منہ لٹکائے آتے اور کہا کرتے تھے بھائی ببر حسن خاں تمہاری بیوی نے تو ناطقہ بند کر رکھا ہے۔

ان کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ایک بار انہوں نے جو چیز کسی جگہ رکھ دی ہے، اب وہ چیز قیامت تک اسی جگہ رکھی جائے گی اور اگر کوئی اس چیز کو کسی دوسری جگہ رکھ دے گا تو قیامت آجائے گی وہ صبح کو خوابگاہ سے نکل کر برآمدے کے تخت کے جس گوشے پر، سب سے پہلی مرتبہ آکر بیٹھی تھیں، روز اس گوشے پر آکر بیٹھتی ہیں، ہر چند گرمیوں کے موسم میں ادھر دھوپ آجاتی ہے، مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹتیں اور جب میں کہتا ہوں دھوپ سے ہٹ کر سائے میں بیٹھ جاؤ تو وہ بگڑ کر کہتی ہیں، یہ میری وضع کے خلاف ہے، میں تمہاری طرح تھوڑی ہوں ہیں کہ روز ٹھور ٹھکانے بدلتی رہوں۔ اگر میں اسقدر مستقل مزاج نہ ہوتی تو تمہارے سے ہرجائی کو آج تک نباہ ہی نہ سکتی تھی۔

ان کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ دبیلا کے کسی آدمی کو شریف نہیں سمجھتی کسی پر بھروسہ نہیں کرتیں اور یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی عورت سے ان کا ملا نہیں بڑھ سکا، وہ کہیں نہیں جاتیں اور کسی عورت کا اپنے وہاں آنا جانا پسند نہیں کرتیں۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بے ترتیبی کو برداشت نہیں کر سکتیں چادروں کی شکنوں اور کرسیوں وغیرہ کے زاویے درست کرتی رہتی ہیں۔

پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ وہ ناشتہ کے بعد کم سے کم آدھ گھنٹے کے واسطے ہمیشہ لیٹ جاتیں اور منہ سے نہیں بولتی ہیں۔

چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بیدار ہوتے ہی کراہتیں اور کہتی ہیں کہ آج طبیعت بہت خراب ہے، ہڈی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لڑکپن ہی سے اختلاج قلب میں بری طرح مبتلا ہیں میں نے لاکھوں علاج کر دیکھے مگر وہ بیچاری تندرستی سے آج تک محروم ہیں۔

اور ان کی چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر روز ایک ایک پائی کا حساب لکھائیں اور جبتک حساب نہ لکھ جائے ماہی بے آب کی طرح تڑپتی رہتی ہیں۔

جہاں تک کہ تدبیر منزل کا تعلق ہے، ان کی سی منتظم اور سلیقہ مند عورت میری نظر سے آج تک نہیں گزری ہے۔

میں ایک لکھ لٹ انسان ہوں، اگر میری شادی ان سے نہ ہوئی تو میں فاقے کر کے مر جاتا۔ میں دس کروڑ گھوڑوں کی طاقت کا انجن ہوں، وہ اس سے جوگنی طاقت کا بریک ہیں گر اس قدر قوی بریک نہ ہوتا تو میں اپنا انجن، ہمالیہ سے ٹکرا کر اب تک کب کا پاش پاش کر چکا ہوتا۔

میں جب حیدرآباد دکن میں تھا، وہ اپنے ماں باپ سے ملنے کے لئے تین مہینے کے لئے ملیح آباد

چلی گئی تھیں، ان تین مہینوں کا حال سن لیجئے۔
جب پہلی تاریخ کو تنخواہ ملتی تھی تو ساری تنخواہ مہمان نوازیاں اور اللوں تللوں کی وجہ سے دسویں پندرھویں دن ہی ختم ہو جاتی تھی، اور ہر پندرھویں کو رام لال بقال سے قرض لے کر گھر کا کام چلایا کرتا تھا۔ اور جب دوسرے مہینے کی پہلی تاریخ کو، تنخواہ لے کر گھر آتا، رام لال کو اپنے برآمدے کی کرسی پر بیٹھا یا سوتا پاتا اور رام لال اپنا روپیہ مع سود کاٹ کر باقی رقم میرے حوالے کر دیا کرتا تھا۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ میں نے بہت سی دکانوں میں کھاتے بھی کھول لئے تھے۔ اور اس طرح چیزیں گھر لایا کرتا تھا گویا وہ سب آندھی کے آموں کی طرح مفت مل رہی ہیں، اور مہینے کی پہلی یا دوسری کو جب ان دکانوں کے بل آتے تھے تو سر پکڑ کر رہ جاتا رام لال سے دوبارہ قرض لے کر بل ادا کیا کرتا تھا۔

بیوی جب ملیح آباد سے آئیں، تو گھر کا یہ رنگ دیکھ کر انہوں نے منہ پیٹ لیا اور تھوڑے ہی دن کے اندر، انہوں نے پھر گھر کو درست کر کے رام لال بقال سے نجات دلا دی، اور میرے سارے کھاتے بند کرا دیئے۔

ان کی سختی کا یہ عالم ہے کہ جب گھر سے جاتے وقت ان سے دس پانچ روپے مانگتا ہوں تو تین چار پیشیوں کے بعد دس مانگتا ہوں تو صرف پانچ دیتی ہیں، اور جب گھر پلٹتا ہوں تو پائی پائی کا حساب لکھا لیتی ہیں۔

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب ! خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

مجھ کو مشاعروں سے نفرت ہے، اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ مجھے خلافِ معمول دیر تک جاگنا پڑتا ہے، اور میرے دماغ پر اس کا کم از کم، دو تین دن تک بار رہتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ مشاعروں میں زاغ و زغن کو اس یقین کے ساتھ کلام سنانا پڑتا ہے کہ مفہومِ شعر تو الگ رہا سامعین الفاظ کا تک نہ سمجھ نہیں سکیں گے، اور اسی کے ساتھ ساتھ زاغ و زغن کا کلام سننا بھی پڑتا ہے۔

لیکن چونکہ میں اس قربانی کے بعد مشاعرے سے ایک ہزار روپیہ گھر لاتا ہوں، وہ مجھے مشاعروں کی قربان گاہ پر چڑھا دیا کرتی ہیں، اور مجھے قربان گاہ پر نہ چڑھائیں تو کیا کریں انہوں نے کر میری معاش بحد محدود ہے لگے ہاتھوں مشاعروں کے متعلق میری دو رباعیاں بھی سن لیجئے۔

ہوتی ہے مشاعروں میں جو گھوڑے کی ٭ حاجی بخش اللہ کی میاں نورے کی
افسوس کہ اس عطرِ سخن کو اپنے ٭ بکھرتا ہوں میں شیشیوں میں قاروڑے کی

یہ چندہ سرحشر، بجسم تشنگیک — دوزخ کا سزاوار ہے، تیرے نزدیک
معبود، خطا ایک، سزا ہو سو بار — فدوی تو مشاعروں میں ہوتا تھا شریک

ابھی پانچ چھ برس کی بات ہے جب میں عامل کالونی میں رہتا تھا، اسی وقت انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہارا مزاج ایسا ہے کہ تم کو کبھی زیادہ روپیہ جمع نہیں ہو سکے گا اور تم جو کبھی گئے تو جب بچوں سے علیحدہ ہو جاؤ گے تو یہ مکان چھن جائے گا اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ اپنا ایک ذاتی مکان بنوا لوں، یہ سن کر میں نے کہا تھا کہ اب تو میرا مقبرہ بننے کا زمانہ ہے، تم مکان کی فکر کر رہی ہو۔

لیکن صاحب، میری بیوی کی ہمت پر صد آفریں کہ انہوں نے لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا دو منزلہ مکان بنوا کر دم لیا، ورنہ ایوب خاں سابق صدر پاکستان اور ان کے نفس تو امرا لطاف گوہر صاحب کے عتاب کے بعد میں اپنے پورے قبیلے کے ساتھ، آج کسی جھونپڑی میں پڑا ہوتا۔ سچ ہے سگھڑ بیوی بڑی دولت ہوتی ہے۔ ان کا ایک کارنامہ اور بھی سن لیجئے۔

ایک روز انہوں نے مجھے کمرے میں بلا کر ایک بکس دکھایا اور کہا بتاؤ، اس میں کیا ہے؟ میں نے کہا مجھے کیا معلوم، انہوں نے پوچھا۔ تم کب سے شعر کہہ رہے ہو، میں نے کہا بچپن سے، انہوں نے کہا وہ برسوں اور کا بیاں کیا کیں، جن پر تم نے شعر کہے تھے، میں نے کہا سب کی سب تلف ہو گئیں، میری یہ بات سن کر انہوں نے وہ بکس کھول کر کہا دیکھو میں نے تمہاری ایک ایک کاپی اور پرچہ ایک ایک پرزہ اس بکس میں محفوظ کر لیا ہے، اب تم یہ کاپیاں ممتاز حسن صاحب کے قومی عجائب گھر کے ہاتھ فروخت کر دو اور میں نے وہ کاپیاں پندرہ ہزار روپے میں فروخت کر دیں، اس باب میں مختار حسن صاحب اور پیر حسام الدین صاحب راشدی کا شکر گزار ہوں کہ اگر وہ توجہ نہ کرتے تو یہ سودا بھی نہ ہو سکتا۔

کہاں تک اپنی بیوی کی خوش انتظامی بیان کروں۔ آموں کے چار باغ انہوں نے نصب کرائے اور ١٩٢١ء میں انہوں نے ٹھیل ٹھیل کر مجھے مجبور کر دیا، میری سب سے پہلی تصنیف "روح ادب" کو مرتب اور شائع کراؤں اس کے بعد اطمینان نے میرے سر مسلط ہو ہو کر میری مندرجہ ذیل کتابیں مجھ سے مرتب کرائیں اور چھپوائیں۔ اگر وہ زبردستی نہ کرتیں تو یہ کتابیں کبھی معرض وجود میں آ ہی نہیں سکتی تھیں۔

روح ادب۔ جذبات فطرت۔ خیالات ذریں۔ اوراق سحر۔ آواز حق۔ شاعر کی راتیں۔ شعلہ و شبنم۔ حرف و حکایت۔ جنون و حکمت۔ آیات و نغمات۔ سیف و سبو۔ فکر و نشاط۔ سرود و خروش۔ ...

سلہ میری مندرجہ ذیل کتابیں ابھی شائع نہیں ہوئی ہیں، "مدوجزر"۔ "آئینہ"۔ "وحدت انسانی موت جو آل محمد کی نگاہ میں ہے" "مفکر"۔ "عظمت انسانی"۔ اور "حرف آخر" اس طویل دراماتی نظم کا آغاز ١٩٥٩ء میں ہوا تھا، اس کے بعد مجھ کو زندگی کے مکروہات سے نجات نہیں ملی، اس لیے ابھی تک نامکمل ہے۔ اگر فرصت

اور انقلاب۔ اشارات سنبل و سلاسل۔ رات و رنگ۔ عرش و فرش۔ نجوم و صبا۔ قطرہ و قلزم۔ طلوع و فکر
نجوم و جواہر اور الہام و افکار اور میری یہ زیر نظر کتاب "دیادوں کی برات" بھی انہیں کی مرہون منت
ہے اگر وہ میرے سر پر سوار نہ ہو جاتیں تو میں اسے بھی مرتب نہ کر سکتا۔

اپنے ان متذکرہ بالا کارناموں کی بنا پر جب وہ حسب سنت جاریہ مجھ سے کسی بات پر بگڑ جاتی ہیں، تو کہتی ہیں کہ یہ میری جوتیوں ہی کا طفیل ہے کہ تم اس وقت جوش صاحب بنے بیٹھے ہو۔ اگر میں تم پر زور نہ ڈالتی تو تمہاری کوئی ایک کتاب بھی نہ چھپتی، اور دنیا کو یہ معلوم بھی نہ ہوتا کہ تم کس کھیت کی مولی ہو۔

اور کبھی یہ بھی کہتی ہیں کہ جب مجھ سے تمہاری شادی ہوئی تھی، اس وقت تک تم چھوٹے دادا کی زبان میں لقا بھنا تھے، اگر میں جی لگا کر، تمہاری تاک نہ کرتی تو تم کو یہ ڈیل ڈول کبھی حاصل ہی نہ ہوتا، اور ہمیشہ دبلے پتلے لفافت سی بنے رہتے۔

ہر چند جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں وہ نہایت مغلوب الغضب اور تنک مزاج ہیں لیکن میری ذات کے ساتھ اب بھی ان کی محبت کا یہ عالم ہے کہ اگر میں اسے لفظ عشق سے منسوب کروں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ میں ان کی محبت کی تخفیف و توہین کر رہا ہوں

جوانی میں جب میں باہر سے رات کے وقت گھر آتا تھا، تو اس امر کا پتہ چلانے کی نیت سے کہ میں کسی عورت سے ہم آغوش ہو کر تو نہیں آ رہا ہوں وہ مجھے روشنی میں لے جا کر غور سے میرا چہرہ دیکھتیں، لالٹین اوپر اٹھا کر میری شیروانی پر نگاہ کرتیں کہ کہیں کسی زلف کا بال تو اسمیں چپکا ہوا نہیں ہے، اسی کے ساتھ ساتھ وہ میرے کپڑے، لانبی لانبی سانسیں لے کر سونگھا کرتی تھیں کہ میرے جسم سے کسی عورت کے بدن یا بالوں کی خوشبو تو نہیں آ رہی ہے۔

اور "عشق است و ہزار بدگمانی" کے تحت یہاں تک ہوتا تھا کہ وہ جاڑوں میں پچھلے پہر میرے لحاف میں ہاتھ ڈال کر، یہ پتہ چلانے کے لئے کہ میں ان کے سوجانے کے بعد کسی عورت پاس چلا تو نہیں گیا تھا، وہ میرے تلوے ٹٹول کر یہ دیکھا کرتی تھیں کہ وہ ٹھنڈے ہیں یا گرم۔

ہاتھ آئی تو اس نظم کو مکمل کر کے کسی بینک میں یا بیوی کے پاس رکھوا دوں گا کہ اسے میرے مرجانے کے بعد شائع کیا جائے۔ اور یہ اس لئے کروں گا کہ اگر یہ اوہام سکن و روایات فگن نظم میری زندگی میں شائع ہو گئی تو مجھ پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جائے گا۔

بیوی سے چھپا کر میں نے اس کتاب میں اپنے معاشقوں کا حال قلمبند کیا ہے۔ اب دیکھئے اس کی عاقبت کے بعد کیا ہوتا ہے۔

اور آج بھی جب کہ میں ایک خبیث بوڑھے کی صورت اختیار کر چکا ہوں، جب کبھی کوئی اخباری جوان عورت میرا انٹرویو لینے، یا کوئی نوعمر شاعرہ مجھ سے ملنے آتی ہے، وہ میرے چہرے کے نشیب و فراز اور میری آنکھوں کے رنگ پر اپنی متجسس نظروں کے آلات لگا کر یہ جانچتی رہتی ہیں کہ میں اس کو محبت کی نظر سے تو نہیں دیکھ رہا ہوں ـــــ اور جب تک وہ عورت بیٹھی رہتی ہے، ان کے چہرے پر بدگمانی کا بیدا کردہ کرب جھلکتا رہتا ہے۔

مری خاک بھی لحد میں، نہ رہی امیر باقی ✣ انہیں مرنے کا ہی اب تک نہیں اعتبار ہوتا

وہ مجھ کو آج تک بوڑھی کا دولہا سمجھتی۔ اور پہلے کی طرح اب بھی مجھ سے محبت کرتی ہیں۔

ہر چند میری پاگل اور باندھی جوانی کے مسلسل معاشقوں نے میری اخلاق کی ماری دہان پان بیوی کے دل پر ایسے ایسے کٹھن چلائے تھے کہ اگر وہ پہاڑوں پر چلائے جاتے تو ان کے پرخچے اڑ جاتے لیکن اللہ رے میری بیوی کی استقامت محبت کہ انہوں نے ان روح فرسا حوادث کا ڈٹ کر مقابلہ کیا

جھانسی کی رانی نے ڈٹ کر انگریزوں کا مقابلہ کیا، میدان جنگ میں شہید ہو گئی مگر دشمن کے سامنے سپر نہیں ڈالی، میری بیوی نے ڈٹ کر میرے جنونوں کا مقابلہ کیا، نہ سپر ڈالی نہ شہید ہی ہوئیں، اور آخر کار مجھ کو سب سے چھین کر میدان جیت لیا۔

.ہر کارے کہ ہمت بستہ گردد . . . . . اگر خارے بود گل دستہ گردد

میں نے ۱۹۵۰ء میں، ام الشعراء یعنی اپنی بیوی پر ایک نظم کہی تھی، جو ہنوز نا تمام ہے، آپ بھی سن لیں

دیکھ کر تجھ کو میرے دل سے ٹپکتا ہے لہو
تیرا، ہر لمحہ، بجز حسرت دو سوا ہی نہ تھا
مجھ کو، ہر رات، وہ آوارہ لیے پھرتی تھی
جب بھی چھاؤں میں زلفوں کی وہ سلوائی تھی
آگ تھی جس میں، بر بھشانہ وہ پانی مجھ پر
ہاتے اک شب بھی نہ ہوتی تھی سہانی تیری
جب بھی اٹھتی تھیں، مری سمت نگاہیں تیری
تیری عصمت کے شبستاں میں ہے اک حشر بپا
تجھ پہ بالقصد نہیں تھیں وہ جفائیں میری

اے مرے باپ کی، غم دیدہ و ناشاد بہو
میری قصاب جوانی کو یہ احساس نہ تھا
ایک بجلی تھی کہ خرمن پہ ترے گرتی تھی
چاندنی، دھوپ ترے واسطے بن جاتی تھی
کاش بھولے سے بھی آتی نہ جوانی مجھ پر
کروٹیں آنچ پہ لیتی تھی، جوانی تیری
ان نگاہوں سے برستی تھیں کراہیں تیری
میرے معصوم گناہوں کو یہ معلوم نہ تھا
جبر سرکار مشیت تھیں، خطائیں میری

اس قدر قریب پہ بھی ، تجھ سے بہت دور رہا ہیں ۔ الاماں ! صبح کی افتاد سے ، جو رہتا ہیں
اب کہ اداؤں کی سفیدی نے جتایا ہے مجھے : جذبۂ کرب بتر سے ، سامنے لایا ہے مجھے
شرم ہے جو نہیں اٹھتی وہ نظر لایا ہوں : اپنی بھیگی ہوئی شاموں کی سحر لایا ہوں
اپنی آنکھوں کے ، ترے در پہ گہر رکھتا ہوں : بخش دے مجھ کو ، ترے پاؤں پہ سر رکھتا ہوں



میری بیٹی

نام ہے سعیدہ خاتون ۔ میں پیار سے مردانہ نام بنا کر کلو کہتا ہوں ۔
غالباً ۱۹۱۷ء یا ۱۹۱۸ء کے لگ بھگ دہرہ دون ، اپنی نانی کے گھر پیدا ہوئی تھی حیدر آباد دکن میں تعلیم پائی ، تعلیم جاری تھی کہ مجھے نظام نے خارج البلد کر دیا ، اور اس کے بعد برابر ایسے موانع پیدا ہوتے رہے کہ اس کی تعلیم کی تکمیل نہیں ہو سکی ۔
وہ غالباً ۱۹۳۶ء کا زمانہ تھا کہ میں نے دہلی میں اس کی شادی کر دی تھی اپنی چچا زاد بہن کے بیٹے التفات احمد شہاب سے ۔ التفات احمد علی گڑھ کا گریجویٹ ، خوش فکر شاعر اور صاحب فکر انسان تھا لیکن اس میں جینے اور ابھرنے کا حوصلہ نہیں تھا ۔ کثرت آلام سے بیمار ہو کر وہ بیچارہ بہت قبل از وقت (۳۰) دنیا سے سدھار گیا ۔
سعیدہ بے حد ذہین اور نکتہ سنج ہے ، اور سخن فہم بھی ، طبیعت موزوں ہے مگر شعر نہیں کہتی ۔ وہ ماشاء اللہ نو بچوں کی ماں ہے ۔ نانی بھی بن چکی لیکن مجھ کو اب تک گڑیاں کھیلتی بچی نظر آتی ہے جی چاہتا ہے کہ اس کے بچوں کے نام بھی لکھ دوں ۔ ان خطابات کے ساتھ جو ان کو میری سرکار کی جانب سے عطا ہوئے ہیں ۔
انور سعید خاں ، عرف "میاں" "مویاں" اور مسٹر بلقاقا ۔۔۔ حیدر مسعود خاں عرف "بغا" ۔۔۔ پرویز شہاب خاں عرف "پری" "مسٹر پدپد" "مسٹر باٹا" اور "وحشت کا جھونگا" ، صبوحی خاتون عرف "بوٹی چوٹی" ۔۔۔ غزالہ خاتون عرف "غزلیا" ۔۔۔ خسرو شہاب خاں ، عرف بلو ، مسٹر لالہ رخ اور جاسوس اشرف جہاں ۔ علی معظم خاں عرف "مسٹر منیڈک" اور تسلیم شاہ ۔۔۔ فرخ جمالی عرف بدمعاش قلن قلندر" اور "قلنوا" ۔۔۔ سراج انور خاں عرف مسٹر کسی اور کالا گڈون ماشاء اللہ اتنے بہت سے بچوں کا پالنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ، اس نے اپنے خون جگر سے ان پودوں کو سینچا اور پروان چڑھایا ہے ۔ میری بیوی

شکایت کرتی ہیں کہ سعیدہ کو ہمارا خیال نہیں رہا میں کہتا ہوں اس بیچاری کو فرصت ہی کب ملتی ہے۔
اپنے بچوں اور اپنی نواسیوں نواسوں کی خدمت سے کہ وہ کسی اور طرف توجہ کر سکے۔
اس دولت کی مسلسل کاوشوں نے اس کی صحت بگاڑ کر رکھ دی ہے اور جب میں اپنی بیٹی
کا چہرہ اترا ہوا دیکھتا ہوں تو میرے دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں۔

میرا بیٹا

نام ہے سجاد حیدر خاں میں اسکو پیار سے چھجوا کہتا ہوں۔ سعیدہ کی ولادت کے غالباً
دو سال کے بعد وہ لکھنؤ میں پیدا ہوا تھا۔

وہ بیمار پیدا ہوا، اور آج تک تندرست نہیں ہے وہ اپنڈکس سے لیکر ٹائیفائڈ ڈبل
نمونیا اور خناق کے جیسے مہلک مرضوں تک گرفتار رہ چکا ہے۔

اس نے سات آٹھ برس کی عمر ہی سے موٹر چلانا سیکھ لیا تھا۔ اور جب کسی قدر سیانا ہوا تو
خود فکر کی مدد سے اس نے تھوڑا بہت موٹر کی مرمت کا علم بھی حاصل کر لیا جو آج آڑے وقت
اس کے کام آ رہا ہے (جس کی تفصیل آگے آئیگی)

میرے پڑھنے لکھنے کے اختتام قیام میں اس نے محمد فقیہہ صاحب بیرسٹر اور نائب وزیر جونا گڑھ کی بیٹی
انور خانم سے اپنی ماں کی علی الرغم شادی کرلی تھی جس پر بیوی اب تک ناخوش ہیں۔

وہ ماشاءاللہ پانچ بچوں کا باپ ہے ان کے نام بھی خوبصورت سن لیجئے —— ساجد حیدر خاں
عرف مسٹر ٹائیگر —— ناز خاتون عرف امی —— ترنم خاتون عرف چھنی —— تاجدار بیگم تبسم خاتون
عرف چھنی —— اور فواد حیدر عرف مسٹر ببر

سجاد بھی اپنی بہن کی طرح بلا کا ذہین ہے۔ شعر بھی کہتا ہے۔ بعض اشعار آبدار بھی ہوتے ہیں اور
وہ دعویٰ کر سکتا ہے ع

پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

— افسوس کہ بیماریوں کی وجہ سے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکا۔

وہ آج سے کچھ اوپر دو برس پہلے موٹر سیمنٹ ایجنسی چلاتا خود اپنے خرچ کرتا اور جیسے کا کر
دیا کرتا تھا لیکن ۱۹۶۳ء میں جبکہ میں ہندوستان گیا۔ اور وہاں کسی انگریزی اخبار میں میرا ایک انٹرویو
شائع ہوا تھا۔ اسوقت ترقی اردو بورڈ کے سکریٹری شان الحق حقی وزارت اطلاعات کے سکریٹری

الطاف گوہر، اور میرے نئے حواری عیش ٹونکی نے اس انٹرویو کے معنی مجھ اس قدر مسخ کر کے پیش کئے کہ اس وقت کے مطلق العنان صدر فیلڈ مارشل صاحب، یعنی ایوب خاں نے برہم ہو کر میری نوکری بھی ختم کر دی، میرا پاسپورٹ بھی چھین لیا اور قومی عجائب گھر کو بھی میرے مسودات کی خریداری سے روک دیا میری بیوہ لڑکی کے آئیل ٹینکر کے بارے میں بھی اشارہ فرما دیا کہ اس میں مال نہ بھرا جائے اور میری ایجنسی بھی بند کر دی۔

میری اس بے سروسامانی سے متاثر ہو کر سجاد نے ایک چھوٹی موٹی ورک شاپ کھولی جس سے وہ لشتم پشتم زندگی بسر کر رہا ہے۔ یا یوں کہئے کہ زندگی کو ٹھوک رہا ہے ہائے میرے بچے۔

سجاد نے لکھنؤ کی بھارت کھنڈے یونیورسٹی سے سند حاصل کی تھی، وہ پاکستان ریڈیو پر ستار بجانے کے واسطے بلایا جاتا تھا ایوب خاں صاحب بہادر نے اس کا وہ دروازہ بھی بند کروا دیا میں نے اجداد کی تلوار کو پگھلا کر قلم بنا لیا تھا، میرے بیٹے نے میرے قلم کو ہتھوڑے میں ڈھال لیا ہے ہائے میرے خاندان کا وہ عروج اور داغ ہے یہ زوال۔

میرے
چند قابلِ ذکر احباب

افسوس، دلا ــ کہ غم گساراں رفتند
شیریں بدناں و گل عذاراں رفتند
چوں بوئے ــ گل ــ آمدند ــ بہ باد سوار
در خاک ــ چو قطرہائے باراں رفتند

یاں چھپی دھوپ ہے، گلابی سایا
دیتا ہے، سحابِ ابدیت چھایا
جوشؔ آؤ، کہ منتظر ہے بزمِ ارواح
در آیا ــ یارانِ رفتہ ــ آیا، آیا

(ابرار حسن خاں اثرؔ ملیح آبادی)

خوبصورت، خوش دماغ، حاضر جواب، جادو بیان، داستان سرا، عاشق مزاج، لطیفہ گو، شوخ و طرار، ملیح آبادی، نثار دو نویس، سب سے زیادہ ذہین، مرغ و ماہی پکانے میں استاد، میرے لنگوٹیا یار، میرے بہنوئی، میری سراپا شفقت پھپھی زاد بہن کے، منجھلے بیٹے، (جو میری صحبت کی ناز بردار، اور میری بیاہی ماں میں منتقل بیٹھا کرتی تھیں) بڑھتی عمر تک سراپا نیاز، ڈھلتی زندگی میں خوفناک و دشنام طراز۔ اور میرے اس کوچے کے راہ برادر بن گئے جس کو بعد تو قیقوب کی اصلاح میں کوئے بد اعمالی، کہا جاتا ہے چوں کہ وہ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے۔

اس لئے میرے باپ نے ان کی پرورش و تعلیم کا بار اپنے ذمے لے لیا تھا۔ اُن کے اور میرے مکان کے مابین کھڑکی تھی۔ وہ سونے کے اوقات کے علاوہ ہمارے ہی مکان میں رہا کرتے ہمارے ہی ساتھ کھاتے پیتے، اور کھیلتے کودتے رہتے تھے۔ بڑا بچپن کا ذکر ہے، ایک روز ہم لوگ دوپہر کے وقت ڈیوڑھی میں بیٹھے غالباً تاش کھیل رہے تھے کہ ابرار آ گئے۔ اور اصرار کرنے لگے کہ ہم کو بھی کھیل میں شریک کر لو، میرے بڑے بھائی نے (جو سال دو سال مجھ سے بڑے تھے) ان سے کہا تم کھیل میں ہمیشہ بے ایمانی کرتے ہو اس لئے ہم تم کو نہیں کھلائیں گے۔ انہوں نے کہا اگر ہم کو نہیں کھلاؤ گے تو ہم "قرآن مجید"[1] کی قسم، تم کو بشیر ماموں[2] سے ابھی پٹوا دیں گے۔ میرے بڑے بھائی نے کہا جا پرے، کر دو۔ تو کیا پٹوا سکتا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ میرے باپ کے پاس گئے اور کہنے لگے بشیر ماموں، شفیع احمد خاں (میرے بڑے بھائی) کہہ رہے ہیں کہ ہم سے سمجھانی لڑاؤ گے۔ یہ سنتے ہی میرے باپ آگ بگولا ہو گئے، اور ڈیوڑھی میں آ کر میرے بڑے بھائی کو خوب مارا، وہ چیختے رہے کہ ابرار جھوٹا ہے، لیکن انھوں نے پروا نہیں کی۔ اور ابرار کا چہرہ گلنار ہو گیا[3]۔ وہ رئیس احمد[4] کی اکّا سے اس گمان پر جلتے تھے کہ وہ ان کو باسی کھانا دیتی ہیں اور اتنا ان سے

---

[1] نہ جانے انکی زبان میں کیا خرابی تھی کہ وہ قرآن مجید "کہا کرتے تھے۔ [2] چونکہ میرے باپ۔۔۔" کو ان کی ماں "بشیر ماموں" کہتی تھیں، اسی لئے انکی زبان پر بھی لفظ چڑھ گیا تھا۔ [3] یہ اور بات ہے کہ جب میرے باپ کو دوسرے دن یہ پتہ چل گیا کہ ابرار نے جھوٹا الزام لگایا تھا تو ان کی بھی پٹائی کر دی گئی تھی۔ [4] میرا چھوٹا بھائی۔

اس بنا پر کھنتی تھیں کہ وہ ان پر جھوٹا الزام لگاتے ہیں۔ ایک روز شام کے وقت مکان کی ڈیوڑھی میں اتفاقیہ طور پر بالا ارادہ، وہ انا سے ٹکرا گئے۔ اور، چھوٹتے ہی کہا "او اندھی ہو جاؤ"، یہ سنتے ہی انّا نے آسمان سر پر اٹھا لیا، اور ڈیوڑھی کے پھاٹک سے چیخ چیخ کر کہا "ہے ہے میاں آگ لگے اس چودھویں صدی کو، ارے، غضب خدا کا، یہ کل کا چھوکرا ابرار مجھ سے کہہ رہا ہے "او اندھی ہو جاؤ"، میرے باپ کو تاؤ آ گیا، سپاہی کو حکم دیا کہ اٹھو دس چھڑیاں نیم سے، کاٹ لاؤ، پھاٹک بند کر دو کہ ابرار بھاگ نہ پائے۔ اور جب چھڑیاں آ گئیں، ابرار کو پکڑ بلوایا اور میرے باپ نے چھڑی اٹھا کر کہا کیوں بے مردود، گھر کی بڑی بوڑھیوں سے بدتمیزی کرتا ہے۔ ادھر آ آج تیرے ٹکڑے اڑا کر رکھ دوں گا۔ انھوں نے، تھر تھر کانپتے ہوئے کہا، بشیر ماموں قرآن مجید کی قسم، قرآن مجید کی قسم، قرآن مجید کی قسم، میرے باپ نے کہا قسمیں ہی کھاتا رہے گا۔ یا کچھ کہے گا بھی۔ وہ دوڑ کر میرے باپ کے قدموں پر گر پڑے۔ اور ڈبڈبائی آنکھیں اٹھا کر، کہا بشیر ماموں قرآن مجید کی قسم، میں نے تو "اندھی ہو جاؤ" نہیں "اندھی ہو جائیے" کہا تھا۔ ابرار کی اس ذہانت پر میرے باپ کو ہنسی آ گئی، اور، چھڑی پھینک کر، فرمایا، گرو گھنٹال[1] آج تو چھوڑے دیتا ہوں، لیکن اب اگر اس قسم کی کوئی بات زبان پر لائے گا تو تیری ہڈیاں پسلیاں ایک کر دوں گا۔

ہماری ماماؤں میں سے تھیں، ایک کوزہ پشت محبوبن بوا، وہ بھی ان کی شرارتوں کے باعث، ان سے جلتی تھیں۔ ایک روز انھوں نے، امام باڑے سے ملے ہوئے کمرے میں ان کو سگریٹ پیتے دیکھ لیا اور میرے باپ سے جا کر کہا، میاں "ابریل" (ز ابرار) چُرٹ پی رہا ہے اور جب "ابریل" بلوائے گئے تو بوا محبوبن کے چہرے کی جھریوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اور ابرار نے، اسی رات کو، جب وہ سو رہی تھیں تو ان کی فاختہ اڑا دی، اور اس چالاکی سے کہ کسی کو پتا ہی نہیں چلا کہ وہ حرکت ان کی تھی۔ جس زمانے میں رئیس احمد، اور ابرار میرے ساتھ لکھنؤ کی لاٹوش روڈ کی گلی کے مکان میں، بسلسلۂ تعلیم رہتے تھے ابرار کا معمول تھا کہ روز منھ اندھیرے وہ سگریٹ پی کر، دو غزلیں، "کھلی چھت پہ کنج قفس میں امری زبان صیاد"، اور، "محبت میں تری ہم سے ہر آں اہل وطن چھوٹا"، بالالتزام گایا کرتے تھے اور سگریٹ کے واسطے جب حقہ سے دیا سلائی جلاتے تھے تو دھندلکے کا اندھیرا کانپ اٹھتا تھا، اور اس کا شعلہ میری آنکھوں میں اس طرح چبھ جاتا تھا کہ میں آنکھیں بند کر لیا کرتا تھا۔ اس مکان کا ذکر ہے، میرے باپ، ملیح آباد سے آ کر، اس مکان کی نچلی منزل میں اور میرے بڑے بھائی، ہمارے اوپر کے کمرے سے ملے ہوئے دوسرے کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

---

[1] چونکہ وہ ہم لوگوں کو نئی نئی شرارتیں سکھایا کرتے تھے۔ اس لیے میرے باپ نے ان کو گرو گھنٹال کا خطاب دے دیا تھا۔

ہفتے کی رات تھی، میں اور ابرار اپنے حجرہ میں طالب علم شریف[1] کے ساتھ باتیں کر کر کے، قہقہے مار رہے تھے۔ ابرار نے مجھ سے کہا ہم ہنس بول رہے ہیں، شفیع احمد خاں (میرے بڑے بھائی) پر یہ بات شاق گزر رہی ہوگی۔ وہ عجب نہیں کہ بشیر ماموں سے جاکر شکایت کر دیں۔ وہ تو ہمیشہ ہماری تاک میں رہا کرتے ہیں۔ ابرار کا یہ جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ بھائی صاحب، دروازہ کھول کر نیچے اترنے لگے، انھوں نے کہا دیکھئے میں نے بھی کہا تھا وہی ہوا۔ شفیع احمد خاں ہماری شکایت کرنے کے لئے نیچے جا رہے ہیں میں تو شریف کو لے کر اس چور دروازے سے اسی وقت بھاگا جا رہا ہوں اگر بشیر ماموں اوپر آکر آپ کو برا بھلا کہیں تو آپ بھی گھر چھوڑ کر شریف کے وہاں آجایئے گا، اور صبح کی گاڑی سے ہم لوگ نواب صاحب رام پور کے پاس چلے جائیں گے۔ ابرار یہ کہہ کر چلا تو گئے، میں تنہا رہ گیا، اتنے میں میرے باپ آئے، فرمانے لگے، "تم لوگوں نے شفیع احمد کی نیند حرام کر دی شہدے کہیں کے" اور وہ مردود گرد گھنٹال کہاں ہے۔ میں نے کہا وہ شریف کے گھر چلے گئے ہیں۔

باپ کی یہ بے جا ڈانٹ پھٹکار، مجھ کو زہر لگی، ان کے نیچے اتر جانے کے بعد میں ابرار کے پاس چلا گیا۔ ابرار نے کہا، اب یہ گھر رہنے کے قابل نہیں رہا ہے قرآن مجید کی قسم شفیع احمد خاں ایک روز ہم کو مروا ڈالیں گے، چلئے انیس خالہ (میری چھوٹی بہن) کے گھر میں رات گزار دیں اور پہلی ٹرین سے رام پور چلے جائیں۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں ہے ابھی ہم شریف کے دروازے سے نکلے ہی تھے کہ دیکھا ہمارے باپ کے سپاہی، ریاست علی خاں، لالٹین لئے چلے آ رہے ہیں، ابرار نے کہا کہ یہ مخبری بھی شفیع احمد خاں نے کر دی ہوگی کہ آپ بھی گھر چھوڑ کر شریف کے ہاں چلے آئے ہیں، دیکھئے ریاست علی خاں جب قریب آئیں تو قرآن مجید کی قسم اس ان کو ماں کی گالی دیجئے گا۔ میں نے کہا ابرار کیسی باتیں کرتے ہو، ریاست علی خاں کھرے پٹھان ہیں اور بوڑھے آدمی ہیں۔ میں ان کی سفید داڑھی کی حرمت کرتا ہوں ان کو ہرگز گالی نہیں دوں گا۔ اتنے میں ریاست علی خاں قریب آگئے اور کہا خان صاحب بہادر نے فرمایا ہے کہ آپ فوراً گھر آجائیں، نہیں تو مجھ سے برا اور کوئی نہیں ہو گا۔ ابرار نے دو قدم آگے بڑھ کر کہا۔ ریاست علی خاں سو بات کی بات یہ ہے کہ قرآن مجید کی قسم، تمہاری تو ماں . . . . . " بے چارے ریاست علی خاں، اس قدر فحش گالی سن کر اس طرح اچھل گئے گویا کسی نے ان کو گولی مار دی ہے۔ انھوں نے بڑی بے چارگی کے ساتھ نگاہیں جھکا لیں، اور ڈھل ڈھل آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ان کے بہتے آنسو آج تک میرا تعاقب کر رہے ہیں۔

انیس کے ہاں، ہم دونوں، بہت تڑکے، بیدار ہو کر، سفر کی تیاری کر رہی رہے تھے کہ مکان کے نیچے گاڑی ٹھہرنے کی آواز آئی، انھوں نے جھانک کر دیکھا تو ان کے منھ سے چیخ نکل گئی۔

---

[1] وہ بجنور کا رہنے والا اور میرا محبوب دوست تھا اب نہ جانے کہاں ہے۔

اندر سے بشیر ماموں آ گئے، انہیں خالہ نے ہماری مجرمی کی خبر کر دی۔ آپ کو ایسا چاہیے نہ تھا اور زینے پر جب قدموں کی آواز گونجنے لگی، تو انہوں نے، آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے چارپائی کے نیچے جا کر دبک گئے۔ میاں نے آ کر بڑی خشونت کے ساتھ، مجھ کو دیکھا، میں کانپنے لگا۔ فرمایا گرو گھنٹال کہاں ہے۔ میں نے چارپائی کی طرف اشارہ کر دیا۔ میاں نے گرج کر فرمایا نکل چارپائی کے نیچے سے مردود۔ ابا چارپائی کے نیچے سے یوں نکلے، جیسے آواز صور سن کر بے چارے مردے اپنی بے حساب درد مند زندگی کا حساب دینے کے واسطے اپنی اپنی قبروں سے نکلیں گے۔

میاں نے ایک حرف بھی نہیں کہا۔ ہم دونوں کو کوٹھے سے اترنے کا اشارہ فرمایا۔ آگے آگے میاں اور پیچھے پیچھے ہم مفرورین کوٹھے سے اترے تو میاں نے گاڑی میں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں ان کے ساتھ اس طرح گاڑی میں بیٹھ گئے، گویا پھانسی کے سامنے دو مجرم بندھے ہوئے ہیں۔ راستے بھر میاں نے کوئی بات نہیں کی گھر آتے ہی فرمایا۔ چلو اوپر۔ جب ہم اوپر آگئے تو میاں نے ابا ادر کے منہ پر ایک زناٹے کے ساتھ، تھپڑ مارا کر ابا۔ وہ ٹنڈ منڈ ہو گئے، لیکن چار پانچ سکنڈ کے اندر ہی اندر، بجائے کھڑے ہوتے، وہ ایک ایک جست میں تین تین چار چار سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے، مکان سے باہر نکل گئے۔

ان کے اس ڈرامائی فرار کے بعد، میاں نے مجھ سے کہا سنتا ہوں آپ کو بہادری کا بڑا دعویٰ ہے، امیدی[1] دو لاٹھیاں لے آؤ۔ ایک ان سور صاحب کے ہاتھ میں دو، اور ایک مجھے، آج میرے ان کے مابین دو دو ہاتھ ہو جائیں، اور پتہ چل جائے کہ بہادر کون ہے، امیدی نے ایک لاٹھی میاں کے ہاتھ میں دے دی، اور دوسری لاٹھی میری طرف بڑھائی میری کیا مجال تھی کہ باپ سے زور آزمائی کے واسطے، لاٹھی ہاتھ میں لیتا، میں نے ہاتھ نہیں بڑھایا اور امیدی نے میرے کاندھے سے لگا کر، لاٹھی کھڑی کر دی، میں پیچھے ہٹ گیا، لاٹھی گر گئی میاں نے ڈپٹ کر، فرمایا اے بزدل لاٹھی ہاتھ میں لے۔ اور میدان پکڑ۔ اور جب میں ٹس سے مس نہ ہوا تو میاں نے ارشاد فرمایا کہ تو سراسر زنخا ہے۔ علمائے اخلاق نے سچ کہا ہے کہ بزدلی اور بے حیائی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تو سمجھا میں تجھے بے حیا کیوں کہہ رہا ہوں؟ مجھ کو خوب معلوم ہے کہ آج کل تیرے نکاح کی تنسیخ کا مقدمہ چل رہا ہے، اگر تو غیرت مند ہوتا تو اس موقع پر گھر چھوڑ کر چلا جاتا کہ اگر میرے باپ مقدمے سے ہات اٹھا لیں گے، تو میری بیوی کسی اور کے پہلو میں چلی جائے گی۔ میں نے۔ آب دیدہ ہو کر کہا، میاں میں آپ کو اس قدر غیرت مند اور شریف انسان سمجھتا ہوں

---

[1] امیدی = امید علی خاں

کہ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ سے کتنے ہی ناخوش ہو جائیں، اگر مقدمے سے کبھی دستبردار ہو ہی نہیں سکتے۔ میری یہ بات سن کر امیاں کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

رئیس احمد کو ابتدا ہی سے شکار، ورزش، گھوڑے کی سواری اور اپنے جیب خرچ کو گنیوں میں تبدیل کر کے جمع کرنے کا شوق تھا۔ ابرار نے ان کے اس میلان صحت کو دیکھ کر ایک دن ان سے کہا "رئیس احمد! آپ کو قرآن مجید کی قسم، ایک ایسی نایاب دوا دے سکتا ہوں کہ آپ دو مہینے کے اندر اندر ایک دیو پیکر پہلوان بن جائیں"۔ رئیس کی باچھیں کھل گئیں، پوچھا، اس دوا کا نام کیا ہے۔ انہوں نے کہا "زبان پر لگانے کا طلا"۔ رئیس نے قیمت دریافت کی، ابرار نے کہا، ارے کچھ نہیں، فقط پانچ گنیاں۔ رئیس نے چپکے سے گنیاں دے دیں، ابرار ایک چھوٹی سی شیشی میں روغن بادام لے آئے، اور کہا دیکھئے، روز ایک کوری سینک اس میں ڈبو کر نہار منھ چاٹ لیا کیجئے گا، قرآن مجید کی قسم آپ ہو بہو ہو جائیں گے ہو بہو۔ ایک روز بڑے بھائی صاحب نے رئیس کو سینک چاٹتے دیکھ کر پوچھا یہ کیا دوا ہے، رئیس نے بڑی سادگی کے ساتھ کہا میاں بھائی یہ زبان کا طلا ہے" ابرار پانچ گنیوں میں لائے ہیں۔

بڑے بھائی صاحب کو لفظ طلا کے معنی تو معلوم نہیں تھے، لیکن یہ سمجھ کر کہ ابرار ڈاکٹر ہیں نہ حکیم، ہو نہ ہو انہوں نے پھل بڑا کر کے .... یہ تماشہ، میاں سے جا کر سارا واقعہ، بیان کر دیا۔ میاں نے رئیس کو بلا کر پوچھا، اسے کیا معلوم تھا کہ اس میں کوئی بری بات ہے، کل واقعہ بیان کر دیا، میاں نے شیشی دیکھی، اس میں روغن بادام پایا۔ اسی وقت ابرار کو بلایا، اور فرمایا کیوں مردود، تو نے ... دوا بنا کر ... سے گنیاں اینٹھ لیں، مجھ کو اس کی پروا نہیں، مگر اس دوا کا نام اس قدر فحش بتایا "زبان کا طلا"، آج تیرے ٹکڑے اڑا کر رکھ دوں گا۔ یہ کہہ کر میاں ابرار کی طرف جھپٹے، ابرار نے چیخ مار کر کہا قرآن مجید کی قسم میں نے "زبان کا طلا" نہیں "روزبان تیل" کہا تھا، رئیس احمد خاں نے میری بات سمجھی ہی نہیں، میں نے کہا تھا دو تیل، وہ سمجھے طلا۔ طلا کیا چیز ہوتا ہے، قرآن مجید کی قسم مجھ کو معلوم ہی نہیں۔ میاں سمجھ تو گئے کہ ابرار بات بنا رہا ہے، لیکن ان کی ذہانت و حاضر جوابی کی داد کے طور پر، انہیں معاف کر دیا۔

جس زمانے میں ہم آگرے کے سینٹ پیٹرز کالج میں زیر تعلیم تھے اور ملیح آباد سے، تعطیل کی مدت گزار، آگرے جا رہے تھے، میاں نے رئیس، ابرار اور مجھے پانچ پانچ سو روپے دے دیئے تھے کہ آگرے جا کر، جڑاول بنوا لینا۔ اسی وقت ابرار نے یہ لکھ کر میری جڑاول پانچ سو روپے میں نہیں بن سکے گی۔ مزید پانچ سو روپے کا مطالبہ کیا تھا۔

۱؎ رئیس کا پیار کا نام ۲؎ رئیس و ابرار۔

میاں نے ہم دونوں بھائیوں اور ابرار کو طلب کر کے، مجھ سے اور رئیس سے پوچھا
کہ تمہاری جڑاول پانچ پانچ سو روپے میں بن جائے گی کہ نہیں ہم نے جواباً عرض کیا کہ بن جائے گی
میاں نے ابرار سے کہا کہ ان دونوں کی جڑاول تو پانچ پانچ سو میں بن جائے گی، تمہاری جڑاول
میں کیا سرخاب کے پر لگے ہیں کہ وہ اس قدر رقم میں تیار نہیں ہو سکے گی؟ تو ابرار نے، آنکھوں میں
آنسو بھر کر، یہ جواب دیا تھا کہ بشیر ماموں آپ غصے نہ ہو جائیں تو یہ کہوں کہ ان دونوں کی
جڑاول بھی اس قدر کم روپے میں نہیں بن سکے گی، یہ آپ کے بیٹے ہیں، اور پیسہ کم پڑے گا تو آپ
سے دوبارہ منگالیں گے، میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں، مجھ یتیم کی ہمت نہیں پڑے گی یہ سن کر
میاں نے ابرار اور ان کے طفیل ہم دونوں بھائیوں کو بھی ایک ایک ہزار روپے مرحمت فرما دیئے تھے

ایک بار ان کے کشمیری محبوب نے ان سے چار سو روپے طلب کئے وہ اس سے وعدہ
کر کے تو چلے آئے لیکن بڑے کلفتنا رہیں۔ بڑ گئے کہ روپیہ دوں گا کہاں سے کئی روز تک پریشاں
رہنے کے بعد، انھوں نے مجھ سے کہا شبیر حسن خاں، قرآن مجید کی قسم ایک ایسی تدبیر سمجھ میں
آئی ہے کہ کبھی پٹ نہیں پڑ سکتی۔ آپ رئیس احمد خاں کو بلالیں۔ رئیس آگئے تو انھوں نے کہا
آپ جانتے ہیں کہ بشیر ماموں آپ سب کو کس قدر چاہتے ہیں وہ آپ کے ناخن کا دکھنا تک برداشت
نہیں کر سکتے ہیں۔

رئیس نے کہا آخر کہنا کیا چاہتے ہو؟ انھوں نے کہا بشیر ماموں کو جو محبت آپ سے ہے اس
سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا پہیلیاں سی کیوں بجھا رہے ہو، صاف صاف بات
کہو۔ انھوں نے کہا میں چاہتا ہوں کہ آپ جھوٹ موٹ بے ہوش ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ آپ
کی بیہوشی سے بشیر ماموں کا دل دہل کر رہ جائے گا اور تھوڑی دیر بے ہوش رہ کر ہوش میں
آجائیں، اور ان سے چار سو روپے کی فرمائش کر دیں اگر رئیس احمد خاں آپ یہ ڈراما کھیل کر
مجھے روپے دلا دیں گے، تو قرآن مجید کی قسم، میں زندگی بھر کے لئے آپ کا غلام بن جاؤں گا
رئیس نے ان سے امداد کا جب وعدہ کر لیا تو برابر تین دن تک ابرار نے ان سے ریہرسل کرایا،
جسمانی حرکات بتائے اور لہجے کے طول و عرض کو بار بار سکھایا، خود لیٹ لیٹ کر بتایا کہ کھانا
کھاتے ہوئے آپ یوں لیٹ جائیے گا یوں نوالہ توڑیئے اور پھر یوں، دھم سے گر پڑیئے گا، اور
ہوش میں آجانے کے بعد پھر یوں ٹھہر ٹھہر کر حرف مطلب زبان پر لائیے گا۔

جب تین دن تک کا مسلسل ریہرسل ختم ہو گیا تو ہمارا طائفہ ملیح آباد آیا۔ اور شام ہوتے
ہی رئیس احمد نے، حسب تعلیم ابرار، امی (انا) سے کہا۔ آج طبیعت کچھ خراب ہے، کھانا ابھی سے
کھلادو۔ کھانا امام باڑے کے برآمدے میں چن دیا گیا۔ ابرار اور میں دونوں صحن میں بیٹھ

گئے یہ دیکھنے کو کہ رئیس کیسی ایکٹنگ کرے گا۔

رئیس نے ابرار کے کہنے کے مطابق گن کر تین نوالے کھائے، چوتھا نوالہ اٹھا کر کراہنے لگا۔ ابرار نے مجھ سے، چپکے سے کہا، کتنی اچھی ایکٹنگ ہو رہی ہے۔ رئیس نے کراہ کر تین بار آہ آہ آہ کی آواز نکالی، نوالہ ہاتھ سے چھوٹ گیا اور دھم سے لیٹ کر بے ہوش ہو گیا۔

اس کے "بے ہوش" ہوتے ہی گھر بھر میں کہرام برپا ہو گیا، اناں دوڑی ہوئی باہر گئیں، اور دیوانہ وار پکار کر کہا "ہائے میاں رئیس بے ہوش ہو گیا" میاں کے حواس اڑ گئے، ننگے پاؤں دوڑتے آئے اور رئیس کے گرد گھوم گھوم کر دعا کرنے لگے کہ اے اللہ میری جان کی قربانی قبول کر، اور اسے اچھا کر دے! پانچ منٹ کے بعد ڈاکٹر عبدالکریم صاحب آ گئے، میاں نے کہا خدا کے واسطے میرے بچے کو بچا لیجئے۔ ڈاکٹر صاحب نے، آلہ لگا کر، اور انگلیوں سے ٹھونک ٹھونک کر اس کے سینے کا مطالعہ کیا۔ نبض دیکھی اور کہا خان صاحب کوئی گھبرانے کی بات نہیں، گرمی دماغ پر چڑھ گئی ہے میں ابھی دوا لے کر حاضر ہوتا ہوں۔ ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد میاں پھر رئیس کے گرد گھوم گھوم کر دعائیں مانگنے لگے، دادی جان نے، جیب قرآن کی ہوا دی۔ رئیس نے ابرار کی سکھائی ہوئی انتہائی نقاہت کے ساتھ ذرا سی آنکھیں کھول دیں۔ میری ماں نے کہا۔ مبارک ہو رئیس کو ہوش آ گیا۔

میاں نے، انتہائی بے تابی کے ساتھ جھک کر پوچھا بیٹا طبیعت کیسی ہے؟ رئیس نے سن کر، ایک بار پلکیں جھپکائیں، میاں کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ اس کے سرہانے بیٹھ گئے۔ رئیس نے دوبارہ آنکھیں کھول کر، نازک سی مہین آواز میں ٹھہر ٹھہر کر، کہا بابا۔ چار سو۔ روپے۔ میاں نے میری ماں سے کہا ارے جلدی سے پانچ سو کی تھیلی لے آؤ، اور جب تھیلی اس کے سامنے رکھ دی گئی اس نے بڑی کانپتی آواز میں پوچھا، میاں ہمارے سر کی قسم۔ یہ روپے۔ دے کر واپس۔ تو نہیں لیں گے؟ میاں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ جواب دیا۔ ارے تیرے سر کی قسم واپس نہیں لوں گا اس کے دوسرے ہی دن ہم لوگ لکھنؤ چلے گئے۔ اور شام ہوتے ہی ابرار اس کشمیری لڑکے کو چار سو دے آئے اور باقی سو روپوں سے خوب تفریح کی۔

انھیں کہانیاں کہنے کا بھی نہایت شوق تھا۔ سنی ہوئی کہانیوں ہی پر اکتفا نہیں کرتے ہزاروں من گھڑت کہانیاں، اور فرضی قصے بھی ایجاد کیا کرتے تھے اور اس حافظہ بیانی اور اس ڈرامائی انداز کے ساتھ کہ سننے والے پورے پورے سات سات گھنٹے تک مسلسل سنتے رہتے اور بھوک پیاس تک بھول جایا کرتے تھے۔

اور جب وہ مسائل پر زبان کھولتے، تو حاضرین پر سناٹا سا چھا جاتا، اور بڑے بڑے صاحبانِ علم وادب حضرات کا منھ کھلا کا کھلا رہ جاتا تھا۔

ابتداء میں، بادہ خواری کے وہ بلبل ہزار داستاں بن جاتے، ٹھمریاں اڑا دیے، اپنا اور دوسروں کا کلام، اور لطیفے سناتے، اور بسا اوقات انگریزی ناچ بھی دکھایا کرتے تھے لیکن زندگی کے آخری دور میں وہ اس قدر خوفناک ہوگئے تھے کہ شراب پینے کے وقت، جس کی طرف بھی ان کی نظر اٹھ جاتی تھی، وہ اس کو گالیاں دینے لگتے تھے (ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی کھوپڑی میں، ماں، بہن، اور بیٹی وغیرہ کی گالیوں کے کارتوس، مختلف خانوں میں لگے ہوئے، تھے اور شراب جس خانے میں پہنچ جاتی تھی، اس کا کارتوس دن سے چل جایا کرتا تھا) میں نے اور مجھ سے زیادہ بیگم نے بے حد کوشش کی اور بار بار سزائیں بھی دیں۔ کہ ان کی اصلاح ہو جائے، مگر عمر کے انحطاط اور شراب کی کثرت نے ان کے دماغ کو ماؤف کر دیا تھا کہ وہ راہ راست پر نہیں آئے۔ آخر کار، تنگ آکر، میں نے، اپنی رات کی محفلوں میں شریک ہونے سے ان کو روک دیا، اور پہرے بٹھا دیے کہ وہ باریاب نہ ہو سکیں۔

حقہ پانی بند ہو گیا تو وہ بڑے اداس ہو کر رہ گئے۔ اور اپنے گھر میں بیٹھ کر پینے لگے اور گھر والوں کو گالیاں دینے لگے۔ اور اس مقاطعے اور گھر والوں کے احتجاج مسلسل سے تنگ آکر وہ نان پارے چلے گئے اور راجہ صاحب نان پارہ کی نوکری کر لی۔

ایک روز میں اپنی لکھنؤ کی بنارسی باغ کے سامنے والی کوٹھی سے خواہ مخواہ سیر کرنے کے واسطے باہر نکلا ہی تھا کہ وہ تانگے پر اپنا سامان رکھے آگئے میرا ماتھا ٹھنک گیا کہ ہو نہ ہو وہ راجہ صاحب نان پارہ کو گالیاں دے کر آئے ہیں۔

اور جب تانگے سے اترتے ہی انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ شبیر حسن خاں یہ نان پارے کا راجہ نہایت کمینہ ہے، تو میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ اس لئے کہ ان کی یہ سنت جاریہ تھی کہ وہ رات کو جسے گالیاں دیتے تھے، اگر وہ صبح کو شکایت کرتا تھا تو وہ اسے کمینہ آدمی کہا کرتے تھے،

میں نے کہا تمہارا اس طرح لدا پھندا آنا اس امر کی غمازی کر رہا ہے کہ رات کے وقت تم نے راجہ کو ضرور گالیاں دی ہیں۔ انہوں نے کہا قرآن مجید کی قسم میں نے گالیاں نہیں دی ہیں۔ اسی دن سر شام میں انہیں ساتھ لے کر راجہ صاحب کے پاس گیا۔ ان سے کہا تم موٹر میں بیٹھے رہو، جب بلاؤں تو آنا۔ اندر جا کر راجہ صاحب سے پوچھا، انہوں نے کہا رات کو خاں صاحب نے میری تمام محفل درہم برہم کر دی، میرے ہاں ڈرنک اور ڈنر کی پارٹی تھی، جس میں انگریزوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا جب ہم سب کھانے میز پر آئے، خاں صاحب، چینی کی پلیٹ میں ہڈی توڑنے لگے کھٹا کھٹ، اور جب میرے سکریٹری نے انہیں روکنا چاہا تو خاں صاحب نے اس کو فحش گالیاں دینا شروع کر دیں۔

ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد، میں نے کہا راجہ صاحب، ابرار کو آپ سے بے حد محبت ہے وہ اپنی اس غلطی پر بے حد پشیمان ہیں، اب وہ ذکر ہی کرنا نہیں چاہتے لیکن چونکہ وہ آپ کو بہت چاہتے ہیں۔ اس لئے ان کی یہ تمنا ہے کہ آپ کے پاس آ کر معذرت کریں۔ راجہ صاحب نے کہا جوشؔ صاحب "میں نے خاں صاحب کو کبھی ملازم نہیں، ہمیشہ اپنا بزرگ سمجھا، آپ انھیں بلوا لیں۔ آدمی بھیج کر میں نے انھیں بلوا لیا، ابرار نے جھپٹ کر راجہ کو گلے سے لگا لیا اور رونے لگے۔ راجہ نے کہا خاں صاحب خدا کے واسطے نہ روئیے، میں آپ کا بڑا احترام کرتا ہوں، چھوڑیے اس ذکر کو پھر آجائیے میرے پاس اسی اثنا میں آفتاب غروب ہو گیا، میں اٹھنے لگا، راجہ نے کہا، ایسی بھی کیا بے مروتی، تھوڑی سی پی کر تو جائیے۔ میں نے کہا میں ابرار کی صحبت میں شراب نہیں پیوں گا۔ آپ کسی دوسرے کمرے میں ان کا انتظام کر دیں۔ ابرار نے مجھ کو بڑی شکایت آمیز نظروں سے دیکھا، اور راجہ صاحب نے کہا جوشؔ صاحب آپ اجازت دے دیں تو خاں صاحب ایک پیگ تو میرے ساتھ کر لیں، پھر دوسرے کمرے میں انھیں بھیج دوں گا، اس کے بعد بوتل کھلی، سب سے پہلے، حسب دستور مہتمم شراب کو ایک پیگ پلایا اور دس پندرہ منٹ کے بعد جب اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ شراب میں کسی دشمن نے زہر نہیں ملوا دیا ہے۔ ہم لوگوں کے جام بھر دیے گئے۔

آدھا جام خالی کر کے، ابرار نے سوفا چھوڑ دیا۔ راجہ کے سامنے فرش پر آ کر بیٹھ گئے۔ اور ان کے ہاتھ چوم چوم کر "دو میرا چینوا، میرا منوا" کہنے لگے۔ اس کے بعد جلدی سے اپنا گلاس ختم کر کے انھوں نے میرا جام غٹا غٹ کر پی لیا۔ اور اس کے بعد جلدی سے، راجہ سے، راجہ کا جام بھی ایک سانس میں خالی کر، وہ مسکرائے، اور اپنی ترکی ٹوپی کج کر لی۔

میں سمجھ گیا کہ اب وہ گالی دینے والے ہیں، اس لئے کہ بارہا دیکھ چکا تھا کہ گالیاں دینے سے پیشتر، وہ مہین مہین مسکراتے اور ٹوپی کج کر لیا کرتے تھے، میں نے چاہا کہ میں فوراً اٹھ جاؤں لیکن راجہ نے میرا دامن پکڑ کر، مجھے بٹھا لیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ ابرار نے راجہ صاحب کی جانب نظر اٹھائی، ان کا ہات چوما، اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

راجہ صاحب، قرآن مجید کی قسم آپ بھی بڑے حرام زادے ہیں۔ اور محفل برخاست ہو گئی

ایک روز سہ پہر کے وقت لکھنؤ کے، مقبرہ جناب عالیہ کے قریب کے مکان میں جہاں میں اپنی ساس کے علاج کی غرض سے ٹھہرا ہوا تھا، وہ میرے پاس اور اکبر آئے، اور کہنے لگے شبیر حسن خاں آپ جانتے ہیں کہ مجھے، لڑکپن ہی سے آپ سے کس قدر محبت ہے آپ نے جس دن سے میرا بائیکاٹ کر دیا ہے، میری زندگی ویران ہو کر رہ گئی ہے، یہ کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ میں نے انھیں گلے لگا لیا، اور کہا ابرار تم کو بھی معلوم ہے کہ میں تم کو کس قدر چاہتا ہوں، مگر، بابا تمہاری گالیاں

---

[1] جس دعوت میں اکبر نہ شریک ہوتے تھے، ہم گنگشیا لوگ اس دعوت کو پھیکا سمجھتے تھے۔

کون برداشت کر سکتا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ بات یہ ہے کہ لوگ مجھے "اِرّی ٹیٹ" (برافروختہ) کر دیتے ہیں، اس لیے، مشتعل ہو کر میرے منھ سے، آخر پٹھان ہوں، گالیاں نکل جاتی ہیں۔ اگر کوئی مجھے "اری ٹیٹ" نہ کرے تو قرآن مجید کی قسم میرے منھ سے گالی نکل ہی نہیں سکتی۔ میں نے کہا بھائی آج یہ کرو کہ میرے ساتھ پیو اور اس طرح کہ میرے تمھارے سوا اور کوئی تیسرا شخص موجود نہ ہو۔ میں تو "اری ٹیٹ" بھی کیا تو آپ کے قدموں پر سر رکھ دوں گا، اور اگر آپ مجھے جوتے بھی ماریں گے تو قرآن مجید کی قسم اُف تک نہیں کروں گا۔ میں نے کہا میرے گھر پر روزانہ پانچ دوست آجاتے ہیں، یہاں تخلیہ میسر نہیں ہو سکے گا۔ انھوں نے کہا چلیے شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلے کے نیچے گومتی کے کنارے بیٹھ کر پییں۔ گومتی کے کنارے، ایک پیگ کرنے کے بعد، انھوں نے کہا، یہاں اندھیرا ہو چکا ہے، چلیے چوک چلیں، اور نازنین[1] کے کمرے میں بیٹھ کر پییں، اور گانا بھی سنیں۔ میں نے کہا چلو اسی وقت چلو، بحمداللہ میں تمھیں "اری ٹیٹ" نہیں کر رہا ہوں۔

نازنین کے کمرے کے زینے پر پہنچ کر انھوں نے کہا، میری رائے یہ ہے کہ پہلے ٹُنڈے کبابی کے وہاں دو پیگ پی لیں۔ اور کباب کھا کر، گانا سنیں۔

میرے نزدیک کبابی کی دکان پر بیٹھ کر شراب پینا تو درکنار، کباب تک کھانا، آدابِ شرفا کے خلاف تھا، مگر ابرار کی خاطر میں نے یہ ننگ بھی گوارا کر لیا۔

ٹُنڈے کبابی سے میں نے کہا، اپنی دکان کے ایک گوشے میں اوٹ کھڑی کر دو، آج یہاں ہم شراب پییں گے۔ یہ سن کر کبابی گھبرا گیا، اور ہاتھ جوڑ کر اس نے کہا "خاں صاحب"۔ اس کی بات کاٹ کر میں نے کہا میں سب جانتا ہوں، لیکن اس وقت ایک ایسی بات آن پڑی ہے کہ تم کو یہ بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔ ٹنڈے نے انتظام کر دیا۔ بیٹھتے ہی میں نے ان سے کہا۔ ابرار حسن صاحب دیکھیے میں آپ کو مطلق "اری ٹیٹ" نہیں کر رہا، بلکہ آپ کے اشاروں پر چل رہا ہوں۔ ابرار نے اپنا سر میرے پاؤں کی طرف جھکا کر، کہا قرآن مجید کی قسم، آپ کا سا شریف آدمی کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

انھوں نے دکان پر دو پیگ پیے اور جیسے ہی تیسرا پیگ بنایا، میری جان نکل گئی اس لیے [illegible] مہین مہین مسکرائے، اپنی ٹوپی کو کج کرنے لگے۔ ہاتھ بلند کر رہے ہیں۔ یہ آثار دیکھ کر میں دکان سے فوراً باہر آ گیا۔ اور سامنے کی مسجد کے دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی مشکل سے ایک منٹ گزرا ہوگا کہ دکان کے اندر سے، ابرار کی آوازیں آنے لگیں "... مار دوں گا[2] ...... مار دوں گا" "... مار دوں ... دوں گا" اور ان کی اس عمومی دھمکی سے خوف زدہ ہو کر میں نے یہ دیکھا کہ لوگ ٹنڈے کی دکان سے، اس سراسیمگی کے ساتھ نکل نکل کر بھاگ رہے ہیں، گویا بہت بڑا زلزلہ آ گیا ہے۔ اور ابرار کی آواز شہر بھر گونج رہی ہے "مار دوں گا" "... مار دوں گا"

---

[1] ایک نہایت حسین طوائف۔ [2] "مار دوں گا" کے حرف گاف کو بالتشدید ادا کر رہے ہیں۔

اور کبابی کی دکان کے سامنے آنے جانے والوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے ہیں۔

اتنے میں یہ دیکھا کہ وہ قہقہے لگاتے باہر آ رہے ہیں۔ انھوں نے جب دکان سے باہر قدم رکھا تو پھر وہی نعرہ لگایا "۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ماردوں گا" اور تمام مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا۔

کسی نہ کسی طرح ان کو تانگے میں لاد کر وہاں سے چلا تو راستے بھر، جو سواری بھی تانگے سے مل کر گزری انھوں نے "۔ ۔ ۔ ماردوں گا" کے برابر نعرے لگائے اور گھر آ کر، جب تک سو نہیں گئے یہی نعرہ لگاتے رہے اور جب صبح کو میں نے کہا آداب[۱] بجا لاتا ہوں ابرار حسن صاحب اثر ملیح آبادی، تو وہ پانی پانی ہو کر رہ گئے۔

نورالحسن[۲] خاں، نام تھا۔ نورالحسن خاں دہائے ہر نام، آخر کار "نور" تھا۔ بن جاتا ہے) مجھ سے ۲۰ برس بڑے، میری پھپھی کے منجھلے بیٹے۔ نئے نئے الفاظ کے موجد، ہر شخص کی ہر افتاد پر یہ کہنے والے کہ "ہم تو پہلے ہی سے کہتے تھے" دنیا کی ہر چیز کو "ٹھکرائے" اڑا دینے کی "حد تک" برتنے والے، قہقہوں کے بادشاہ بخل میں قارون، بارگاہ بجاریوں کے قرب سے گریزاں، اپنی بیماری میں تیمارداری کے خواہاں مگر اپنے پیٹے پر جان دینے والے۔ دوسروں سے مذاق کرنے پر ہر وقت تیار، اور دوسرے ان سے مذاق کریں تو آمادۂ پیکار۔ شدید گرمی سردی کے وقت، اپنے مصاحبوں والوں سے بلا وجہ، بیزار، صحت کے پرستار، اور درازیِ عمر کے خواستگار، موت کے نام سے گرم فرزند۔ بڑے کھلے کھلے، موٹے تازے، دراز قامت، بلند آواز گچھے دار مونچھوں، اور، چوڑی ہڈیوں کے جرنیل نما انسان تھے۔ چھوٹے دادا کے جملہ خصوصیات کو میں نے ان چند سطروں میں بند کر دیا ہے، اب جو کچھ لکھوں گا، وہ اس اجمال کی تفصیل ہوگی۔

خدا جانے وہ کون ایسی قبول عام کی گھڑی تھی کہ میں نے ان کو "چھوٹے دادا" کے نام سے پکارنا شروع کیا تھا کہ تمام ملیح آباد اور تمام لکھنؤ [illegible] انھوں اسی طرح "چھوٹے دادا" کہنے لگا۔

---

[۱] صد حیف کہ ان کی بے پناہ ذہانت ان کو لے ڈوبی اور وقت سے پہلے ہی ان کی جان لے لی۔ بلا کی ذہانت ایک حد خطرناک چیز ہوتی ہے۔ ذہانت کے منھ میں اگر عقل سلیم کی خاردار لگام نہ لگائی جائے تو وہ اپنے سوار کو زمین پر گرا کر ٹاپوں سے کچل دیتی ہے۔ ابرار کے پاس ذہانت تو تھی لیکن عقل سلیم سے وہ محروم تھے، اسی لئے ان بیچارے کا یہ حشر ہوا۔

وہ اچھے شاعر بھی تھے، افسوس کہ ان کے بیٹے اظہار ملیح آبادی نے ان کا تمام کلام ضائع کر دیا ورنہ میں ان کے شعر سنا کر آپ کو یہ تسلیم کرا دیتا کہ وہ بڑے خوش گو تھے۔ انہوں نے حیدرآباد میں دو نظمیں کہی تھیں "لو آ ہی گئی لاڈلے بیٹے پہ جوانی اور پسند تھی تے توا نے بار نے" عجب دھوم مچا دی، جنہیں "نظیر اکبرآبادی کی سی روانی تھی ایک شعر یاد رہ گیا ہے انکا

زوال ہوش کے عالم میں بھی ہم نے یہ دیکھا ہے   خرد کے چند فتنے، ذہن میں بیدار رہتے ہیں

[۲] ان کی موت میرے دل کا زخم نہیں ناسور ہے اور ایسا کہ زندگی بھر رِستا رہے گا اور ان کا اس دنیا سے اٹھ جانا، میری زندگی کا ایک ایسا خلا ہے، جو مرتے دم تک، پر نہ ہو سکے گا۔ ہم پٹھانوں میں، بڑے بھائی کو "دادا" بھی کہا جاتا تھا۔

کہ وہ جگت گرو کے مانند جگت چھوٹے دادا بن گئے۔ اور ان سے بڑی عمر کے لوگ بھی ان کو چھوٹے دادا کہنے لگے۔

اب تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔ ان کا تن درست رہنے اور زیادہ سے زیادہ جینے کا شوق، جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ وہ امانی گنج کے میدان میں، ہر صبح و شام، میرے ساتھ ٹہلا کرتے اور ٹہلنے میں ایسے ایسے شندرے کرتے تھے بے ساختہ ہنسی آجاتی تھی۔

وہ اپنے دونوں ہات، بلند کرکے، چکر گھنی کی طرح گھماتے، پھر، بھالو کی طرح، کودتے، گردن کو دائیں بائیں گھما گھما کر، یا علی، کے نعرے لگاتے، درختوں کے نیچے جاکر، اس زور زور سے سانسیں لیتے تھے۔ گویا عالم نباتات کا تمام جوہر پی جائیں گے، اور پھر ہاہا ہاہا کی آوازوں کے ساتھ، اپنا منھ، طلسم ہوش ربا کے حملہ آور دیو کے مانند، اس طرح پورا کھول کر دوڑتے تھے کہ میدان کی ہوا کے تمام اجزائے صحت کو چبا کر رکھ دیں گے۔ اور جب ٹہل کر گھر آتے تھے تو چارپائی پر چت لیٹ کر، اپنی دونوں کلائیوں کو، بلا ناغہ، ناپا کرتے تھے کہ اب وہ کتنی اور موٹی ہو گئی ہیں۔

اسی ذوق میں صحت اور تمنائے درازی عمر نے ان میں کھانا کھانے کا ہوکا بھی پیدا کر دیا تھا۔ وہ کھانے کی میز یا دسترخوان پر اس طرح، خم ٹھونک کر بیٹھا کرتے تھے۔ گویا وہ میدان جنگ میں کود پڑے ہیں، اور اپنے شرکائے طعام کو بڑی ذلیل شکست دینے پر تل گئے ہیں۔

وہ اپنے سامنے کی پلیٹیں اور پیالے، جلد جلد صاف کرکے، انتہائی بے تکلفانہ بے دردی کیسا تھ ہاہاہا کرکے، دوسروں کی پلیٹوں پر ٹوٹ پڑا کرتے، اور اُن کے شرکائے طعام، خالی معدوں کے ساتھ، دسترخوان سے اٹھ جایا کرتے تھے۔

اور تو اور، وہ اس معاملہ میں بچوں پر بھی رحم نہیں کرتے، اور جب کوئی بچہ، ادھر اُدھر، کسی گوشے میں اُن کو مل جاتا تھا، تو وہ اس کو گود میں اٹھا کر، گھر سے باہر نکل جاتے اور، وہاں جاکر۔ اس کے ہاتھ کی چیز پھسلا کر اس سے لے لیتے اور، ہاہا کرکے کھا جایا کرتے تھے۔

وہ میرے لڑکپن میں میرے گنّے چھیلا کرتے، دو چار گنڈیریاں مجھے، دیتے اور یہ کہہ کر، پورا گنا خود کھا جاتے تھے کہ باقی سب گرہیں نکل گئیں۔ اور جب میرے واسطے برفی آتی تھی تو، دونا میرے ہات سے لے کر، کہتے تھے مولود شریف تو پڑھوا لو اور، دونے کو "مولود شریف، مولود شریف" کہہ کر بلند کرتے، اور دو دو ڈلیاں میرے حوالے کرکے، ساری مٹھائی ہاہا کرکے، خود کھا لیا کرتے تھے۔

ایک بار ابرار سیخ میں لگا ہوا تیتر بھون کر لائے، اور کہا رئیس احمد خاں آج ایسا تیتر بھون کر لایا ہوں کہ قرآن مجید کی قسم آپ کو مزہ آجائے گا، یہ کہتے ہی ان کے ہات کو یکایک ایک جھٹکا لگا اور مڑ کر یہ دیکھا کہ چھوٹے دادا، اس سیخ کو اپنے ہات میں لئے، ہاہا کرتے اپنے گھر دوڑے چلے جارہے ہیں۔

ایک روز میری کھانے کی میز پر کھانا چنا جا رہا تھا اور وہ آستین چڑھائے بیٹھے تھے کہ کسی نے آ کر ان کی والدہ کے انتقال کی خبر سنائی۔ میں اداس ہو کر، کھڑا ہو گیا اور آدمی سے کہا کھانا بڑھاؤ۔ انھوں نے، بے حد لغواں ہو کر، مجھے دیکھا، میں سمجھا ماں کی خبر مرگ نے ان کو غم گین بنا دیا ہے، میری آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ میں نے کہا چھوٹے دادا چلئے، آخری دیدار کر لیں۔ انھوں نے کہا، بھائی شبیر حسن خاں، زندگی و موت پر کس کا قابو چلتا ہے، آخری دیدار سے پہلے کھانا تو کھا لیں بھوکے پیٹ سے تو رویا بھی نہیں جائے گا۔ میں بڑی حیرت سے ان کو دیکھنے لگا۔ اور انھوں نے ایک بات مارے چھیلا، دو ٹوکے ہو جائیں، کہہ کر کھانا شروع کر دیا۔ دیکھا آپ نے ان کا ذوق طعام!!

اسی تمنائے صحت نے ان میں یہ بات بھی پیدا کر دی تھی کہ جب میں، یا میرے گھر کا کوئی فرد بیمار پڑ جاتا تھا، تو چھوت چھات کے ڈر سے، وہ مریض کے کمرے میں قدم نہیں رکھتے تھے اور دروازے کی دہلیز سے ناک پر رومال رکھ کر دور ہی سے مزاج پرسی کر کے فوراً چلے جاتے تھے۔ ان کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ بے حد بخیل بھی تھے اور حیرت تو یہ ہے کہ ان کے کھانے پینے کے ذوق پر بھی وہ بخل حاوی رہتا تھا اور کبھی وہ اپنی جیب سے خرید کر دو پیسے کی چیز بھی نہیں کھاتے تھے۔

انھوں نے، زندگی بھر، کوئی محنت نہیں کی۔ ان کی آمدنی کا تمام انحصار میری ذات پر تھا میں جیب خرچ اور کپڑے دیتا، دونے ٹوپی وغیرہ کے واسطے۔ جو روپیہ ان کی خدمت میں حاضر کیا کرتا تھا وہ اس کو ایک پائی خرچ کئے بغیر، سیونگ بینک میں جمع کر دیا کرتے تھے۔

انتقال سے کوئی دو مہینے پیش تر وہ بھائی بہنوں سے ملنے کے لئے، مجھ سے رخصت لے کر پونے سے ملیح آباد چلے گئے تھے۔ وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔

جب ان کے پرسے کے لئے میں وطن گیا تو ان کے چھوٹے بھائی محمد علی خاں نے مجھ سے کہا کہ جب چھوٹے دادا بیمار پڑ گئے اور حالت غیر ہونے لگی تو میں نے ان سے کہا، چھوٹے دادا میں بڑی اوچھی پونجی کا آدمی ہوں، آپ سیونگ بینک سے دو چار سو روپئے نکال لیں، تاکہ آپ کا علاج ہو جائے، یہ سن کر وہ بگڑ گئے، کہنے لگے خاں صاحب آپ روپیہ نکالنے کا ہم کو مشورہ نہ دیں، ہمارا علاج دلاج کچھ نہ کریں، اور اگر ہمارے دشمن مر جائیں تو ہماری لاش کو سمرا تالاب میں پھنکوا دیں۔ اب ان کی خودداری کا حال سنیے۔ ایک بار کوئی ڈپٹی کلکٹر صاحب مجھ سے ملنے کو آئے، ان کے سامنے حقہ رکھ دیا گیا، حقے کا دس پانچ کش لگا کر انھوں نے

۱ے اے چھیلا د بانکے محبوب) ایک ایسا بات میرے مار کر ہیرے دو ٹکڑے ہو کر رہ جائیں۔

۲ے ملیح آباد کے ایک تالاب کا نام۔

وہ حقہ، اپنے ہاتھ سے اٹھا کر، چھوٹے دادا کے سامنے رکھ دیا۔ اور جب چھوٹے دادا حقہ پی چکے تو، جوتے کی نوک پر حقہ رکھ کر، اپنا پاؤں ڈپٹی کی طرف پھیلا دیا اور ڈپٹی بے چارہ منہ دیکھتا رہ گیا۔

ایک بار ایک سہ منزلہ مکان کے اوپر کی دیوار پھلانگ کر مجھے ایک فتنۂ روزگار سے مل کر یہ کہنا تھا کہ

کودنا، کوئی یوں گھر میں ترے، دھم سے نہ ہوگا وہ کام کیا ہم نے جو رستم سے نہ ہوگا

میں دیوار پر چڑھ گیا، اور منڈیر پر بیٹھ کر کہا۔ چھوٹے دادا آپ بھی آجائیں۔ انھوں نے کہا بھائی شبیر حسن خاں آپ دبلے پتلے آدمی ہیں۔ آپ آسانی کے ساتھ دیواریں پھلانگ سکتے ہیں۔ میں ماشاء اللہ موٹا آدمی ہوں مجھے ڈر ہے کہ دیوار پھاندنے میں کہیں، خدا نخواستہ ایسا نہ ہو جائے کہ میں سڑک کی طرف اتر جاؤں۔

دیکھی آپ نے چھوٹے دادا کی خودداری، اپنے باب میں یہ نہیں کہا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں سڑک پر گر پڑوں اس لئے کہ گر پڑنے کے لفظ کو اپنی طرف منسوب کرنا انھیں اپنی شان کے خلاف نظر آیا۔ میں نے کہا چھوٹے دادا، اس "اتر جاؤں" کی بلاغت کی داد نہیں دی جا سکتی، یہ کیوں نہ کہا کہ مجھے خوف ہے کہ کہیں میں گر نہ جاؤں، انھوں نے کہا کرتے ہیں دھینے چلا ہے ہم پٹھان گرتے نہیں فقط سڑک کی طرف اتر جاتے ہیں۔ ہائے ان کے علاوہ "سڑک کی طرف اتر جانا" اس دنیا میں اور کون کہہ سکتا تھا اور وہ بھی "فقط"، کیسا تھو۔

اور ان کی خودداری کا یہ پہلو بھی بڑا دلچسپ ہے کہ وہ اپنے کو تو، بڑی کشادہ دلی کے ساتھ، اس امر کا حق دیئے ہوئے تھے کہ وہ جس سے بھی چاہیں مذاق کر سکتے ہیں لیکن انھوں نے کسی کا اپنی ذات پر یہ حق تسلیم نہیں کیا تھا کہ کوئی ان سے مذاق کا تصور بھی کر سکے۔

اور اسی بنا پر جب کوئی ان سے مذاق کا ارتکاب کر بیٹھتا تھا تو وہ مارنے مرنے پر اتر آتے تھے اور زندگی بھر کے لئے اس سے تعلقات منقطع کر لیا کرتے تھے۔

ایک بار، کاکوری کے عرس میں شاہ جہاں پور کے کسی معزز ترین پٹھان سے، بہت گھل مل کر باتیں کر رہے تھے، ان معزز پٹھان نے ملیح آباد کے آموں کے تذکرے میں ان سے پوچھا خاں صاحب آپ کے بھی ہمارے شہر کا "بلا غنڈا" بھی کھایا ہے یہ سن کر ان کو خیال پیدا ہوا کہ "بلا غنڈا" کسی عضو محش کا نام ہے وہ جامے سے باہر ہو گئے، اور آستین چڑھا کر کہنے لگے "بلا غنڈا" آپ نے کھایا ہوگا، ہزار بار کھایا ہوگا اور آج بھی کھا رہے ہونگے۔ وہ تو کہئے کہ ایک صاحب، فوراً چھوٹے دادا اور شاہ جہاں پور کے آمادۂ نبرد پٹھان کے درمیان آکر کھڑے ہو گئے اور کہا چھوٹے دادا شاہ جہاں پور میں بیل کو "بلا غنڈا" کہتے ہیں۔ اگر وہ عین موقع پر آکر رفع شر نہ کر دیتے تو دونوں لڑ مرتے۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ چھوٹے دادا معافی کے خواستگار ہوتے، مگر ان کو "بلا غنڈا" سن کر اس قدر غصہ

آچکا تھا کہ معافی طلب نہیں کی اور تنبیہات :۔ باہر چلے گئے "اللہ ری مد بلا غنڈا" کی فحاشی آمیز صوتی دھمک!
ایک بار، میرے سکھانے پر ماں کا پانچ برس کا بھانجا دبے دن ہوئے گھر سے نکلا، اور دہلیز سے پکار کر اس
نے کہا۔ ماموں ماموں چھوٹے دادا نے کہا کیا ہے بیٹا، اس نے جو بے دالان کی طرف اشارہ کر کے کہا
ماموں آؤ اسکے اندر آکر بیٹھ جاؤ، یہ سنتے ہی وہ ابے مردود کہتے اس کے پیچھے دوڑے، وہ بھاگا۔
وہ مکان کے اندر گھس کر اپنی نانی یعنی ان کی ماں کی پشت پر جا کے کھڑا ہو گیا۔ وہ جھپٹے اسے مارنے
کو، بچے نے غل مچایا، ان کی ماں نے پوچھا نوزحسن کیا ہے، انھوں نے کہا اسکے ٹکڑے اڑا دوں گا!
یہ مردود مجھ سے کہتا ہے ماموں آؤ، جو بے دالان میں بیٹھ جاؤ، ان کی ماں ہنسنے لگیں، وہ ان کے ہنسنے
پر بگڑ گئے اور جیسے ہی انھوں نے چاہا کہ ماں کی پشت سے لپٹے ہوئے بچے کو کھینچ کر ماریں پیٹیں ان
کی ماں، جھلا کر کھڑی ہو گئیں اور کہنے لگیں، اگر بچے کو ہات لگایا تو تیرے ہات توڑ کر رکھ دوں گی۔
دیوانہ ہو گیا ہے، معصوم بچوں سے لڑتا ہے آج کی نئی نسل کا کوئی بیٹا ہوتا تو بھانجے ہی کو نہیں ماں کو
بھی دھنک کر رکھ دیتا، مگر وہ تھے پرانے دور کے شریف زادے، ماں کی ڈانٹ سن کر، باہر چلے گئے
لیکن بھانجے سے، اپنے نزدیک یہ انتقام لیا کہ اس کے دوسرے روز جب اس کا ختنہ ہوا تو وہ
شریک نہیں ہوئے اور لکھنؤ چلے گئے۔

حیدر آباد کا ذکر ہے ایک روز، رات کے بارہ بجے میں گھر آیا، ابرار میرے ساتھ تھے پھاٹک
پر آتے ہی موٹر رک گئی۔ میں نے ابرار سے کہا اب موٹر خانے تک کیسے پہنچاؤں، ابرار نے صحن میں لیٹے ہوئے
چھوٹے دادا کی جانب اشارہ کر کے، کہا یہ کیا قلی پڑا ہوا ہے، اس سے ڈھکلوا لیجئے۔ یہ سنتے ہی چھوٹے
دادا نے، شیر کے مانند بستر سے جست کی۔ ڈنڈا اٹھا کر، ابرار کی طرف، یہ کہتے جھپٹ پڑے کہ ابے
مردود، گھس کھدے، ہم کو قلی کہہ رہا ہے، ٹھہر جا، تیرے ٹکڑے اڑا کر رکھ دوں گا، ابرار بھاگے، وہ
ڈنڈا اٹھاتے پیچھے دوڑے، ابرار گلی کے نکڑ پر پہنچ گئے وہ راستے ہی میں کھڑے ہو کر، ہانپنے اور
غل مچانے لگے۔

لکھنؤ کا ذکر ہے، ایک دن رفیع احمد خاں کی انگنائی میں بیٹھے ہم لوگ ادھر ادھر کی باتیں
کر رہے تھے کہ رفیع نے میرے کان میں کہا، چھوٹے دادا سے مذاق کرنے کو بہت جی چاہ رہا ہے۔
میں نے کہا وہ عمر بھر کے لئے دشمن ہو جائیں گے۔ تمہارے۔ انھوں نے کہا ان کی دوستی ہی کیا۔
مجھے چھینٹ لگے دیے دے رہی ہے کہ ان کی دشمنی سے خوف کھاؤں۔ یہ کہہ کر وہ بالا خانے کے زینے
کو اندر سے بند کر کے، چڑھ گئے۔ ایک منٹ کے اندر اوپر کی کھڑکی کھول اور اس سے، منہ نکال کر
کہا، وہ ابے چھوٹے دودا،، اب کیا تھا، قیامت برپا ہو گئی۔ ڈنڈا گھما کر، لپکتا، اور کھڑے ہو کر کہا ابے
مردود اگر پٹھان کا نطفہ ہے تو نیچے اتر آ۔ ابھی ٹکڑے اڑا کر رکھ دوں گا۔ کھڑکی بند ہو گئی۔ وہ

ریٹ کے دروازے پہ زور آزمائی کرنے اول فول بکنے لگے۔ اتنے میں کھڑکی پھر کھلی، اور پھر آواز آئی ابے چھوٹے دادا اا۔ انھوں نے جوتا کھینچ کر مارا، جو نیچے گر گیا، انھوں نے گرج کر کہا ابے زنخے، تجھ پر لعنت، اگر مرد ہے تو آجا نیچے۔ حرام زادے کہیں کے۔ ابے ... نیچے اترے گا کہ نہیں؟ جب اوپر سے کوئی جواب نہیں آیا تو وہ، غصے میں بھرے وہاں سے چلے گئے اور اس کے بعد مرتے دم تک زنخے کا منھ نہیں دیکھا۔

اسی طرح، قہقہے لگانے میں بھی کوئی ان کا نظیر نہیں تھا۔ ان کے قہقہے پورے اٹھارہ کھٹکوں کے ہوا کرتے تھے۔ ان کا ہر قہقہہ، زمین پر میل، ڈیڑھ میل تک پھیل کر، آسمان سے باتیں کرنے لگتا تھا۔ انکے قہقہوں کی آوازیں تو سن لیجئے۔ قہ۔ قہ۔ قہ قہ قہ۔ قہ۔ قاہا، قاہا، قاہا، قاہا، قاہا۔ قاہا، ہاہا، ہاہا، ہاہا، ہاہا، ہاہا۔ ہا آہ۔

میری کوٹھی۔ آبادی سے، تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھی وہ راتوں کو جب قہقہوں پر اتر آتے تھے، تو اُن کے قہقہے دادا جان کی بارہ دری سے ٹکرا ٹکرا کر، آبادی کے گلی کوچوں میں گونجنے لگتے تھے۔ اور قہقہے مار کر جب وہ اخ تھو کرتے، اور ان کا تھوک، چار پانچ گز، آگے جا کر گرتا تھا تو وہ بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ بھائی شبیر حسن خاں، دیکھا میرے پھیپھڑوں کا زور؟

ان کے الفاظ کی تراش خراش بھی دنیا سے نرالی تھی ان کے سینکڑوں الفاظ میں چند یاد رہ گئے ہیں آپ بھی سن لیں۔ قرول باغ دہلی کا واقعہ ہے حضرت آزاد انصاری میرے ہی ساتھ رہتے تھے، وہ روز صبح ان کے کمرے میں جا کر، پوچھا کرتے تھے آزاد صاحب کیا لکھا جا رہا ہے، وہ کہتے تھے اپنے دیوان کا مقدمہ لکھ رہا ہوں، وہ ہاہا کرتے، ان کے کمرے سے نکل جاتے تھے۔ جب یہ سلسلہ آٹھ دس روز تک جاری رہا تو ایک دن، انہوں نے پھر پوچھا آزاد صاحب اب کیا لکھا جا رہا ہے، اور جب آزاد صاحب نے پھر یہی جواب دیا کہ چھوٹے دادا اپنے دیوان کا مقدمہ لکھ رہا ہوں تو انھوں نے ایسا خارا شگاف قہقہہ لگایا کہ آزاد اچھل پڑے، اور کہا آزاد صاحب، اللہ اللہ یہ مقدمہ ہے کہ میاں کی پھڑ۔ ہم تو سینکڑوں مقدمہ بازیاں دیکھ چکے ہیں، مگر آپ کی مقدمہ بازی اس قدر طویل القامت ہے کہ قطب مینار اس کے سامنے چرکٹے کا لونڈا معلوم ہو رہا ہے۔ ارے یہ باتا بہ سقر لاتی، اور قنتورہ زرلقی والا، لمبا چوڑا، جھبرا جھاڑ، جھاڑ جھنکاڑ شتر خوار مقدمہ۔ مقدمہ ہے صدپور کے بنی شیر خان کے تاڑوں کا شرور ڈرو شرد، رو، سرد رو، قاہ، قاہ قاہ، قاہ، تاہ، قاہ، آزاد کے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا اور لوٹنے لگے۔ ایک بار لکھنؤ کی ایک تنگ گلی سے ہم لوگ گزر رہے تھے دیکھا کہ ایک مست سانڈ رسیاں تڑا کر، ہماری طرف سرپٹ دوڑتا چلا آ رہا ہے۔ میں اور چھوٹے دادا، ایک چبوترے پر چڑھ گئے اور شمر صاحب جب گلی کے ایک کنارے سے مل کر چلتے رہے تو انھوں نے چیخ مار کہا اے شمر صاحب چبوترے پر

پڑھ آئیے، ورنہ یہ اُدھیایا ہوا، دد دیوانہ سانڈ اپنے سینگوں سے، آپ کے دونوں مغیانوں کو پھاڑتا، اور آپ کے سارے جھوٹ کو روندتا ہوا نکل جائے گا۔"

ایک روز میں نے پوچھا [illegible]پ کی بھوئیں کیوں ہلتی رہتی ہیں، انھوں نے، قہقہہ مار کر کہا۔ بھائی شبیر حسن خاں جب سے میں بوڑھا ہو گیا ہوں، یہ خصماں کھانی حرام زادیاں چھنال ہو گئی ہیں اور یاروں کو اشارے کیا کرتی ہیں۔

ایک روز کسی نے پوچھا چھوٹے دادا آپ نے شادی کیوں نہیں کی، انھوں نے، قہقہہ مار کر کہا۔ جناب یہ دم بھر کی پلپلاہٹ، اور جیتے جی کی بھلبھلاہٹ آپ ہی کو مبارک ہو، یار لوگ ایسی نچال نہیں پالتے، خاں صاحب ایک مادہ کا نر بن جانے کے بعد، دنیا بھر کے نروں کی مادہ بن جانا کون گوارا کر سکتا ہے۔

ایک پلّا اس کاندھے پر، ایک پلّا اس کاندھے پر، اور میانی کے گوپے تھر تھر، تھر تھر۔ ہاہاہاہا، بھبوتیا کون بنے۔ اگر "داشادی، اومانی"، کے نعروں میں نتھو کو گھر میں بیاہ کر لے آتا، تو اس سارے ہاٹ سے ہات دھو کر، خاں صاحب، میں بھی آپ ہی کی طرح، لقات اور لقّا بھنابنا، ڈگ، ڈگ، ڈگ، ڈگ، کرتا پھرتا ہوتا۔

ایک بار میں اپنے نانا جان کے ساتھ، ریاست رام پور کے سرکاری مہمان خانے میں ٹھہرا ہوا تھا کہ میرے ماموں کے ایک بوڑھے اتالیق نے، جن کو "شاہ صاحب" کہا جاتا تھا، برآمدے میں بیٹھ کر بری طرح کھانس رہے تھے ان کی کھانسی کی آوازوں کو سن کر، انھوں نے مجھ سے کہا بھائی شبیر حسن خاں، سن رہے ہیں آپ یہ آوازیں "بھوق والی دی، بھوق والی دی۔ ہاہا، ہاہا، ہاہا،"

ہائے اب بھی جب کوئی بری طرح کھانستا ہے تو، چھوٹے دادا، "بھوق والی دی" یاد آجاتی ہے

وہ عصر حاضر کی سپاٹ عمارتوں کو "حرام زادی کلین شیو" کہا کرتے تھے اور نئے فیشن کی لڑکیوں کو انھوں نے "لونڈا فیلیل" کا خطاب بخشا تھا۔ اور جب کسی موٹے نازے اُمرد کی پشت پر وہ نظر جماتے، تو قہقہہ مار کر، کہا کرتے تھے، بھائی شبیر حسن خاں "ٹھاپ[1] دی بال"۔

ان کے مزاج کی یہ بھی ایک ناقابل فہم خصوصیت تھی کہ جس وقت موسم، میں غیر معمولی شدت آجاتی تھی۔ مثلاً شدید گرمی، یا شدید سردی پڑنے لگتی تھی، تو وہ اپنے ہم نشینوں سے اس طرح بگڑ جاتے تھے، گویا موسم کے شدائد کو انھوں نے ہی پیدا کر دیا ہے۔

ایک بار جب میں نے ان سے پوچھا کہ چھوٹے دادا سختی تو موسم کرتا ہے اور بگڑ جاتے ہیں آپ ہم سب سے، آخر اس کی وجہ کیا ہے، تو ایک ردکھی "ہوں" کے سوا وہ کچھ بولے ہی نہیں۔ ہائے یہ بھی سن لیجئے کہ ان کا کوئی

---

(۱) یعنی جس طرح فٹ بال پر ٹھاپ سے ٹھوکر لگاتے ہیں، اسی طرح تم بھی ایک ٹھوکر لگا دو۔

فعل "ٹکڑے اڑا دینے" سے کم کا کبھی ہوتا ہی نہیں تھا۔
مثلاً جب وہ حمام سے نکلتے تو یہ کہتے نکلتے کہ بھائی شبیر حسن خاں آج تو نہاتے نہاتے ٹکڑے اڑا دیے ہیں نے، اسی طرح جب کھانے کی میز سے اٹھتے تو یہی کہتے کہ بھائی شبیر حسن خاں آج تو کھاتے کھاتے ٹکڑے اڑا دیے ہیں نے، اور جب ٹہل کر آتے تو یہی کہتے کہ بھائی شبیر حسن خاں آج تو ٹہلتے ٹہلتے ٹکڑے اڑا دیے ہیں نے، یعنی وہ دنیا میں جو بھی کام کرتے اسے "ٹکڑے اڑا دینے کی حد تک کیا کرتے تھے۔
ان کی یہ بھی ایک دنیا بھر سے نرالی خصوصیت تھی کہ جس وقت کسی اللہ کے بندے کو کوئی حادثہ پیش آجاتا تھا، تو وہ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ "ہم تو پہلے ہی کہتے تھے" حالانکہ وہ کبھی پہلے سے ایک حرف بھی نہیں کہا کرتے تھے۔ میں اکثر یہ تماشا دیکھا کرتا تھا کہ جب کوئی سائیکل سے گر جاتا، یا پھل تراشتے میں کسی کی انگلی کٹ جاتی، کسی شخص کی ریل چھوٹ جاتی تو ان تمام مواقع پر وہ بڑے بھیانہ انداز میں "ہم تو پہلے ہی کہتے تھے" کا اعلان کیا کرتے تھے۔
آخر میں ان کی ایک بات اور بھی سن لیجیے، جس سے پتہ چل جائے گا کہ ساٹھ برس کی عمر میں بھی عورت نادیدہ چھوٹے دادا کس قدر بے خبر انسان تھے۔
ایک روز وہ میرے پاس غصے میں بھرے ہوئے آئے اور کہنے لگے بھائی شبیر حسن خاں آپ نے اپنے دو کوڑی کے خدمت گار جگنو کو بے حد منھ چڑھا رکھا ہے، اگر آپ کا منھ نہ ہوتا تو آج مار مار کے سالے کے ٹکڑے اڑا دیتا۔ میں نے پوچھا بات کیا ہے۔ انھوں نے کہا وہ مجھ سے بحث کر رہا تھا کہ بچہ مادہ کے آگے کے رخ سے پیدا ہوتا ہے، اور جب میں نے اس گاؤدی سے کہا کہ تیرا خیال سراسر غلط ہے، بچہ مادہ کے پیچھے کے رخ سے پیدا ہوتا ہے تو وہ سالا مجھ پر ہنسنے لگا۔ مجھے ان کے اس بھولے پن پر ہنسی آگئی، میں نے کہا چھوٹے دادا جگنو سچ کہتا ہے کہ بچہ مادہ کے اگلے حصے سے پیدا ہوتا ہے تو انھوں نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا بھائی شبیر حسن خاں میں اپنی ان دونوں آنکھوں سے دن دہاڑے بھینسیا کی بھینس کو خود جنتے دیکھ چکا ہوں کہ اس کا بچہ پیچھے کی طرف سے پیدا ہوا تھا، اور جب میرا قہقہہ نکل گیا تو وہ "وزیرے بھینس شہریارے چناں" کہتے ہوئے باہر چلے گئے۔

مختار احمد خاں

میرے ساتھ کھیلے ہوئے، پڑوسی، میرے باپ کے رفیق، میشر احمد خاں کے بیٹے، نسلی طور پر رام پوری وطنی اعتبار سے ملیح آبادی، عاشق مزاج وصوفی منش، دبلے پتلے دھان پان، اور بلا کے ذہین انسان تھے ابرار اور چھوٹے دادا وغیرہ کے مانند خصوصیات کثیرہ کے جامع تو نہیں تھے لیکن ان کی ایک خصوصیت ایسی

تھی، جو ہزاروں خصوصیات پر بھاری تھی۔ اور انسانی تاریخ آج تک اس کی کوئی نظیر پیش نہیں کر سکی ہے۔
اس سے پیشتر کہ میں اس خصوصیت پر روشنی ڈالوں، یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ وہ پڑھے کڑھے آداب مجلس سے واقف، لکھنؤ کی تہذیب سے متاثر تھے اور اس امر کو بھی بدرجہ اتم سمجھتے تھے کہ بے محل بات کرنا یا ہنسنا آدمی کو سبک بنا دیتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ جاننے کے باوجود، وہ جب کسی ایسی قابل تعظیم ہستی سے دوچار ہو جاتے تھے، جس کی ذات سے کسی دینی احترام کا تصور وابستہ ہوا کرتا تھا اس وقت ان کو بے اختیار ہنسی آنے لگتی تھی۔ ہر چند وہ صاحبان کشف و کرامات کے روبرو اس امر کی انتہائی کوشش کرتے تھے کہ باادب و سنجیدہ رہیں۔ اور بعض اوقات تو سنجیدہ رہنے کی کوشش میں ان کی جان تک پر بن جایا کرتی تھی۔ لیکن ان تمام مساعی کے باوجود ان بزرگوں کے سامنے ان کی چھاتی کو توڑ کر قہقہے بلند ہو جایا کرتے تھے۔

یہ بھی سن لیجیے کہ وہ ملحد نہیں، بلکہ دین دار آدمی تھے۔ اور تصوف کی چاشنی ان کو اپنے باپ سے وراثت میں ملی تھی۔ اس لئے ہونا یہ چاہئے تھا کہ وہ ان بزرگوں کا احترام کرتے اور بڑی عقیدت کے ساتھ ان کے روبرو جھکاتے اور ان کے ہات چومتے۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ رسم عالم اور اور خود اپنے عقائد کے خلاف وہ ہنسنے اور قہقہے لگانے پر مجبور ہو جایا کرتے تھے۔
نفس انسانی کا مسئلہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ اور بعض اوقات تو یہ مسئلہ ایسی بھول بھلیاں بن جاتا ہے کہ اس میں داخل ہو کر باہر نکلنا بے حد دشوار ہو جاتا ہے۔
اب ان کی زندگی کے چند واقعات سن لیجئے۔ اور زندگی بھر غور فرماتے رہئے کہ ان کی علت کیا تھی۔ پہلا واقعہ:۔ ایک روز میں اپنے نانا کے انتقال کے غم میں، چارپائی پر اداس لیٹا تھا اور وہ پائنتی کی طرف غمگین بیٹھے ہوئے مجھے تسلی دے رہے تھے کہ اتنے میں ایک مولانا صاحب تعزیت کے لئے آ گئے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور جب انھوں نے فاتحہ کو ہات بلند کئے تو نیچے سے میری چارپائی اچھلنے لگی۔ میں گھبرا گیا۔ اور تھوڑا سا جھک کر جب چارپائی کے نیچے نظر دوڑائی تو یہ دیکھا کہ وہ چارپائی کے نیچے پڑے ہنسی کے مارے لوٹ رہے ہیں۔ اور مولانا صاحب لاحول کہتے باہر تشریف لیے جا رہے ہیں
دوسرا واقعہ:۔ ایک بار امین آباد (لکھنؤ) کے چوراہے پر ہماری مڈبھیڑ ہو گئی۔ شمس العلماء مولانا عبد الحمید صاحب فرنگی محلی سے۔ ہم لوگ تانگے اور وہ گاڑی میں تھے مولانا کو دیکھ کر میں نے تانگہ ٹھہرایا اور مجھے دیکھ کر مولانا نے گاڑی روک لی۔ صاحب سلامت و مزاج پرسی کے بعد جب مولانا نے پوچھا خاں صاحب کہاں جا رہے ہیں؟ تو مختار نے قہقہہ مار کر جواب دیا حضور۔ چوک جا رہے ہیں۔ چوک۔ گانا سننے کے واسطے قاقا، قاقا، قاقا، ارے جوش، جلدی تانگہ بڑھاؤ۔ ہم مرے جا رہے ہیں، یہ خلاف توقع بات دیکھ کر، مولانا نے، کوچبان سے بلند آواز میں کہا۔ گاڑی بڑھاؤ۔ اور مختار نے

جھک کر کہا۔ حضور آداب۔ اور مولانا دور تک مُڑ مُڑ کر نہایت غصّے کے ساتھ دیکھتے چلے گئے۔

تیسرا واقعہ :۔ یہ واقعہ غالباً ۱۹۲۸ء کا ذکر ہے۔ جب کہ لکھنؤ میں ایک بزرگ وارث حسن شاہ صاحب کے کشف و کرامات کے ڈنکے پٹے ہوئے تھے، ان کے خاص مریدوں میں زیادہ تر دکلار، بیرسٹر اور ہائی کورٹ کے جج تھے۔ اور یہ مشہور تھا کہ وہ اُن سب کی شراب چھڑوا چکے ہیں۔ اس لئے کہ جب وہ پیگ بناتے تھے تو ان کو یہ نظر آتا تھا کہ جام کے اندر سینکڑوں سور کے بچے پیر رہے ہیں۔ ان کے عقیدت مندوں نے شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلے کی مسجد کے جوار میں اُن کے واسطے ایک کوٹھی بھی تعمیر کروادی تھی۔ اور وہ بڑی شان کے ساتھ وہاں رہتے تھے۔

اسی اثنا میں ایک روز صبح کو مختار سرے پاس آئے اور کہا کہ چلو حضرت وارث حسن کی زیارت کر آئیں ابھی ہم مسجد کی سیڑھیاں طے ہی کر رہے تھے میں نے کہا دیکھو مختار اُنکی ذات سے احترام کا تصور وابستہ ہے خدا کے واسطے ہنسنے نہ لگنا میری بات سن کر چوکنا سے ہو گئے۔ اور کہا خدا تمھارا بھلا کرے، بڑے موقع سے تم نے ہنسی کی بات یاد دلا دی۔ اب دانش مندی اسی میں ہے کہ شاہ صاحب کا تصور کر کے یہیں سیڑھیوں پر بیٹھ جاؤں"۔ وہ بیٹھ گئے اور اس زور زور سے ہنسنے لگے گویا ان کو ہنسی کا ہیضہ ہو گیا ہے۔

شاہ صاحب کے خادم ابو بکر نے اپنے کوارٹر سے جب ان کا یہ عالم دیکھا تو یہ سمجھ کر کہ ان پر جن آیا ہوا ہے وہ، پانی بھرا ہوا بدھنا لے کر ان کی طرف دوڑ پڑا۔ اور، کچھ پڑھ پڑھ کر ان کے منھ پر زور زور سے چھینٹے مارنے لگا۔ اس عمل نے ان کی ہنسی میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ اور وہ ہنسی کے مارے لوٹنے لگے۔ الغرض کوئی آدھ گھنٹے یا پون گھنٹے کے بعد یہ بادل چھٹا اور ہنسی کا ہیضہ تھم گیا۔ انھوں نے منھ دھو کر رومال سے پونچھا پانی پیا، گہری سانس لی، آسمان کو دیکھا، ٹوپی درست کی۔ پھریری لی۔ اور مجھ سے کہا اب چلو، بڑے اطمینان سے بیٹھیں گے۔ اس قدر ہنس چکا ہوں کہ اب سال بھر تک ہنسی نہیں آئیگی۔

اب ہم وارث حسن شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچ گئے۔ مختار ان کے داہنے ہاتھ پر اور میں اُلٹے ہاتھ پر بیٹھ گیا اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں اور وہ انتہائی عقیدت کے ساتھ مکالمت کرتے رہے، اور میں مطمئن ہو گیا کہ اب کوئی بات خلاف تہذیب نہیں ہو سکے گی۔

باتوں باتوں میں شاہ صاحب نے پوچھا۔ مختار، تمھارے والد کا مزاج کیسا ہے۔ اس سوال نے انکے صبر و تحمل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، وہ شاہ صاحب کے احترام کا بار پہلے ہی سے برداشت کئے بیٹھے تھے۔ اب شاہ صاحب کے سوال نے ان کے دوش پر اُن کے باپ کا احترام بھی لاد دیا۔ یہ دُہرا بوجھ ان سے اُٹھ نہیں سکا اور پہلو بدل کر انھوں نے کہا، "حضور" ۔۔۔ میں سمجھ گیا کہ اس حضور کے بعد اب کیا ہونے والا۔ اس لئے کہ میں بارہا تجربہ کر چکا تھا کہ جس طرح گالی دینے سے پیشتر، ابرار حسین مسکرا کر، اپنی ترکی ٹوپی کج کر لیتے ہیں۔ اسی طرح مختار قہقہوں سے پیشتر لابنی آواز میں "حضور" کہا کرتے ہیں۔

شاہ صاحب نے یہ دیکھ کر "وہ حضور" کہہ کر خاموش ہو گئے ہیں، پھر دریافت کیا کہ بتاؤ تمھارے والد کا مزاج کیسا ہے۔ انھوں نے بھنچی سی ہنسی کی تھرتھراتی آواز میں کہا "حضور خیریت سے ہیں۔ اور ان کے شانے ہلنے لگے اور شاہ صاحب کے تیور بدل گئے۔

مجھ کم بخت میں یہ بڑا عیب ہے کہ جب کوئی میرے سامنے ہنسنے لگتا ہے تو میں کسی طرح بھی ہنسی کو ضبط نہیں کرسکتا، میں نے فوراً کھنکھار کر اس طرح اٹھنا چاہا گویا باہر گلا صاف کرنا چاہتا ہوں شاہ صاحب نے کہا۔ میاں اگالدان آپ کے پیچھے رکھا ہوا ہے۔ میں نے، منھ موڑ کر، اس بڑے اگالدان میں، اپنی ہنسی خوب جی بھر کر تھوکی، اور اس قصد سے آنکھیں جھکا کر بیٹھ گیا کہ اب مردود مختار کی طرف دیکھوں گا ہی نہیں۔

اتنے میں شاہ صاحب نے بگڑ کر مختار سے کہا، اودھ کے شریف زادوں میں اب کیا یہ ناشائستگی پیدا ہوگئی ہے کہ جب ان سے ان کے والد گرامی کا مزاج پوچھا جاتا ہے تو وہ حضور کہہ کر ہنسنے لگتے ہیں۔ انھوں نے جھک کر شاہ صاحب کے قدم پکڑ لئے اور قہقہہ مار کر کہا۔ حضور میں بدتمیز نہیں ہوں۔ میرے پیر تھے دیوے شریف کے حاجی وارث علی شاہ، حضور پرسوں انھیں خواب میں دیکھا تھا جب سے بیکار بیکار برابر ہنسی آتی رہتی ہے، قاہ، قاہ، قاہ، ــــ اور میں اپنی پسلیاں پکڑ کر، اگالدان میں دوبارہ ہنسی تھوکنے لگا۔

شاہ صاحب نے غصّہ بھری آواز سے کہا، مختار یہ عذر گناہ بدتر از گناہ ہے کہ تم نے اپنے پیر کو خواب میں دیکھا، اور اس کا یہ اثر ہوا کہ تمھیں بیکار بیکار ہنسی آتی رہتی ہے۔ میں تمھیں بتاتا ہوں کہ تمھارا قلب سیاہ ہو چکا ہے۔ میں تمھیں چالیس تعویذ دوں گا۔ انھیں چالیس دن تک گھول گھول کر پینا اس سے جو شیطان تم پر مسلط ہو گیا ہے۔ وہ بھاگ کھڑا ہوگا۔ مختار کے حواس بجا نہیں رہے تھے، انھوں نے، پھر قہقہہ مار کر کہا، اے حضور ایک تعویذ کو پورے چالیس دن تک کیسے پیتا رہوں گا ــــ شاہ صاحب نے ڈانٹ کر کہا، میں تمھیں چالیس تعویذ دوں گا، تم اسے ایک سمجھ رہے ہو۔ یہ سنتے ہی مختار نے قہقہے میں ڈھلی چیخ مار کر مجھ سے کہا۔ ارے جوش اپنا قلم دیدے، ترکیب استعمال لکھ لوں، قاہ، قاہ، قاہ، قاہ، میں نے قلم نکالنے کے لئے جیب کی طرف ہاتھ اٹھایا۔ ہاتھ ایک من کا ہو کر اینٹھنے لگا، اور، ایک زبردست قہقہہ میرا سینہ توڑ کر، ہوا میں گونجنے لگا، اور میں یہ کہتا ہوا بھاگا کہ شاہ صاحب اب یہ خاکسار چلا۔ اور مختار میرے پیچھے یہ کہتے ہوئے دوڑے کہ ارے قلم تو دے دو۔ اور اسی عالم میں باہر آ کر، ہم دونوں۔ مسجد کے فرش پر گر کر ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔

چوتھا واقعہ:۔ وہ ایک زبردست عشق کے سلسلے میں بمبئی اور بمبئی سے کلکتہ چلے گئے اور وہیں پھر تجارت بھی کرنے لگے تھے، اور میں بھی اپنی زندگی کے سب سے زیادہ پیچیدہ عشق کو بہلانے اور بھلانیکی

خاطر غالبؔ سنہ ۱۹۲۲ء میں کلکتہ چلا گیا تھا اور غالبؔ ڈھائی تین مہینہ ان کے ساتھ رہا تھا۔
میں ان کی ناقابل شرح ہنسی کے تو بہت سے واقعات دیکھ چکا تھا، لیکن ان کے ناقابل فہم رونے سے وہاں جا کر دوچار ہوا تھا۔

کلکتہ میں ایک فرنگی لڑکی پر جس کا نام تھا "مس میبی"، وہ عاشق تھے اور وہ اس قدر وفادار تھی کہ روز وقت نکال کر چار بجے سہ پہر سے آٹھ بجے رات تک وہ ان کے پاس بلا ناغہ آیا کرتی تھی۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوتی تھی کہ روز اس کے آتے ہی وہ رونے لگتے تھے، معشوق کی بیوفائی پر تو سب روتے ہیں، وہ معشوق کی وفاداری پر رویا کرتے تھے۔ ان کی اس روش سے ان کی محبوبہ کو بھی تعجب ہوتا تھا، اور تاسف بھی۔ اس نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ میں مختار کو سمجھاؤں کہ وہ خوشی کے موقع پر رویا نہ کریں۔ میں نے انھیں سمجھایا بھی اور انھوں نے وعدہ بھی کر لیا کہ اب نہیں روئیں گے۔ لیکن جب وہ سامنے آئی، اس اللہ کے بندے نے پھر رونا شروع کر دیا۔ جب میں نے غور کیا تو یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ چوں کہ تصوف کا جذبہ ان کو اپنے باپ سے ملا ہے اور چونکہ صوفیاء کے متعلق یہ سنا گیا ہے کہ وہ لذات کی شیرینی میں غم کی چاشنی ملا دیا کرتے ہیں اور یہاں تک کہ لذیذ کھانوں میں بھی پانی کی آمیزش کر کے ان کو بدمزہ بنا دیتے تھے، اس لئے مختار اپنی معشوقہ کے شربت دیدار میں اپنے آنسو گھول دیتے ہیں کہ مسرت کی تیز دھار کند ہو جائے۔

وہ میرے ناقابل حل پیچیدہ عشق کو بھلانے کی خاطر، اکثر کلکتے کے حسینوں کے پاس مجھ کو لے جایا کرتے تھے۔ لیکن میرے دل میں کسی کی جگہ پیدا ہی نہیں ہوتی تھی۔۔۔۔ ایک روز وہ ایک نہایت حسین لڑکی کے کان میں کچھ کہہ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے تو وہ لڑکی میرے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی، میں مسکرا نہ سکا، پھر اس نے جھٹ سے میرا بوسہ لے کر میری گردن میں بانہیں ڈال دیں میں نے کہا۔ میں ان بانہوں کا بوجھ اٹھا نہیں سکتا۔ اس نے جھینپ کر کہا، اللہ ری لکھنؤ کی نزاکت۔ ارے میں تو مختار کا چوتھا واقعہ بیان کر رہا تھا، بیٹھا اپنا دکھڑا۔ ہاں، تو سنیے اسی زمانے میں ایک دن مختار نے مجھ سے کہا شبیر میں دنیا ترک کر کے اب اللہ اللہ کرنا چاہتا ہوں، یہ ساری دوکان فروخت کر کے اور "میبی" کو اس کا روپیہ دے کر ملیح آباد چلا جاؤں گا۔ اور رکاکوری شریف کے سجادہ نشین کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا۔ وہیں کوئی حجرہ مجھے دلا دینا۔ وہاں بیٹھ کر ساری زندگی یاد الٰہی میں گزار دوں گا۔ میں نے لاکھ لاکھ سمجھایا۔ ان کے سر پر ترک دنیا کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ وہ نہیں مانے دکان کو غالباً ستر ہزار میں فروخت کر کے انھوں نے اپنے پاس فقط دو تین سو روپے رکھ لئے اور باقی تمام روپیہ اپنی معشوقہ کے حوالے کر دیئے، ہرچند وہ روپیہ قبول نہ کرنے اور ان سے کلکتہ نہ چھوڑنے پر اصرار کرتی رہی، لیکن

انھوں نے اس کی بات نہیں مانی، مجھے ساتھ لے کر ملیح آباد اور ملیح آباد سے میرے ساتھ، ٹمٹم میں سوار ہو کر کاکوری پہونچ گئے۔ سلہ

خانقاہ کے گنبد پر نظر پڑتے ہی، میں نے کہا دیکھو مختار۔ جیب حیدر شاہ سے ہمارے تمھارے تین چار پشتوں کے تعلقات ہیں۔ اور پھر میں ان کا مرید بھی ہوں، اگر ان کے سامنے جا کر تم نے ہنسنا شروع کر دیا تو یاد رکھو ہماری ناک کٹ جائے گی۔ یہ سنتے ہی مجھ سے لپٹ کر وہ اس قدر روئے کہ ہچکیاں بندھ گئیں، اور جب ہچکیوں کا تار ٹوٹا تو، ڈبڈبائی آنکھیں اٹھا کر انھوں نے کہا، "شبیر، تمھارا ہنسوڑ مختار تو اب مر چکا ہے، وہ اب جب تک جیے گا لگاتار روتا ہی رہے گا۔ اگر مزا ہے تو پچھلے پہر کے رونے میں۔ اس کے بعد نہایت اطمینان کے ساتھ میں، ان کو جیب حیدر شاہ کے پاس لے گیا۔ ان کا اور ان کے باپ کا نام بتا کر درخواست کی کہ ان کو اپنے حلقۂ ارادت میں شامل فرما لیجیے۔

شاہ صاحب ہر شخص کو مرید نہیں بناتے تھے لیکن چونکہ میں نے درخواست کی تھی، اور وہ مختار کے بلدے خاندان سے بھی واقف تھے، انھوں نے میری درخواست منظور کر کے ان کو حکم دیا کہ پہلے دو رکعت نماز پڑھ لو۔ انھوں نے اس قدر طویل، رکوع و سجود، اور اس درجہ اخلاص مندی کے ساتھ نماز پڑھی کہ عہد رسالت کے مسلمان یاد آ گئے۔ نماز پڑھ کر انھوں نے پورے روپیوں کی مٹھائی منگائی جو کلکتہ کی دکان کے باقی نہ گئے تھے، اب مالِ دنیا میں ان کے پاس ایک، پائی بھی نہیں تھی۔

اب جیب حیدر شاہ ان کو اپنے روبرو بٹھا کر حسبِ دستور قدیم، ان کا ہاتھ، اپنے ہاتھ میں لے کر، اپنے سلسلے کے تمام بزرگوں کے نام لے لے کر ان سے یہ کہلانے لگے کہ میرا یہ ہاتھ فلاں فلاں بزرگوں کے ہاتھ پر ہے۔ سلہ

غالباً تراب علی شاہ قلندر کا نام لے کر، شاہ صاحب نے مختار سے کہا اب کہو کہ یہ میرا ہاتھ مجاشاہ قلندر کے ہاتھ پر ہے۔ مجاشاہ قلندر کا نام سنتے ہی، مختار پر دفعۃً خاموشی طاری ہو گئی۔ شاہ صاحب اس خیال سے کہ ان پر رقت طاری ہو گئی ہے دو منٹ کے واسطے، خاموش ہو گئے۔ اور جب ٹھہر کر شاہ صاحب نے پھر فرمایا، ہاں تو کہو میرا یہ ہاتھ مجاشاہ قلندر کے ہاتھ پر ہے۔ تو انھوں نے، پھریری سی لے کر کہا "حضور" ان کے اس طویل التصوف "حضور کو سن کر میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی، اور سمجھ گیا

سلہ وہ دور ایسا تھا کہ اپنے عشق کی بنا پر میرے دل میں تل بھر جگہ بھی خالی نہیں تھی اور نہ "بیبی" کے جمال کا وہ عالم تھا کہ اگر میرا دل برائے کرایہ خالی ہوتا تو میں اسے اپنے دل میں بسا لیتا، چلیے بہت اچھا ہوا ورنہ مختار کے سے جگری دوست سے تصادم ہو جاتا۔ اپنے اس عشق پر میں نے ایک نظم بھی کہی تھی جس کا ایک شعر یاد ہے ؎

تیرے پانے پہ بھی نہیں راضی ۔۔۔ تیرے کھونے پہ بھی نہیں طیار۔

سلہ تمام ناموں کے بعد حضرت علی کا نام لیا جاتا تھا۔ اور پھر بیعت مکمل ہو جاتی تھی۔

کہ اب پل بھر میں کیا ہونے والا ہے۔ اس لئے میں نے ٹھان لی کہ فوراً بھاگ کھڑا ہوں۔ لیکن یہ سوچا کہ اگر جوتے پہن کر جانے لگوں گا تو شاہ صاحب پوچھ بیٹھیں گے کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ اس لئے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔

اور ایک دقیقہ ضائع کئے بغیر میں جھٹ سے اٹھا، اور شاہ صاحب کی نظر بچا کر، ان کی بائیں ہاتھ کے برآمدے میں گیا اور پاکھے سے لگ کر، چوروں کی طرح کھڑا ہو گیا وہ برآمدہ آٹھ دس فٹ بلند تھا۔ اور جھانک کر میں نے دیکھ لیا تھا کہ بھاگ سکتا ہوں کہ نہیں۔

اب شاہ صاحب نے فرمایا کہ مختار میاں نماز میں تاخیر ہو جائے گی، جلد ان منازل سے گزر جاؤ اور کہو کہ میرا ہاتھ ممّا شاہ صاحب کے ہاتھ پر ہے۔

شاہ صاحب کے ہونٹوں کی جنبش ابھی ختم ہوئی تھی کہ ان کے خار اشگاف قہقہے سے خانقاہ کے تمام سقف و بام گونج اٹھے۔

شاہ صاحب نے گھبرا کر ان کا ہاتھ چھوڑ دیا، اور تیز تیز قدم رکھتے ہجرہ چلے گئے۔ میں ننگے پاؤں دھم سے کود پڑا، اور اپنی باہر کھڑی ہوئی ٹم ٹم کی طرف بھاگا۔ ان کے قہقہے اور ان کے یہ الفاظ میرا تعاقب کرنے لگے کہ حضور! ایسا نام تو کبھی سنا ہی نہیں تھا، اللہ اکبر، ممّا شاہ قلندر، ہاہا، ہاہا، ہاہا۔ ارے شبیر، کہاں غائب ہو گئے ہو ارے مجھے سنبھالو۔ دم نکلا جا رہا ہے میرا اُف۔ اُف ممّا شاہ۔ ارے توبہ قاہ، قاہ، قاہ، ہ ہ، قہا، ہا، ہا، ہا، ہا،

قاضی خورشید احمد

ریاضی استاد، شاعر و نقاد، فارسی و سنسکرت ماہر، مکذب بدیہیات، طفل حرکات، اخلاص شعار، دوست نواز، دشمن ناشناس، امرد پسند، آداب شکن، سریع الکلام، آشفتہ مزاج، غریب الخصائل، بظاہر بیگانہ، بباطن یگانہ اور!

گہے برطارم اعلیٰ نشینم
گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

قسم کے ایک ایسے سنکی انسان تھے جن کو نفسیات کے ماہر غور و فکر کا ایک اہم موضوع بنا سکتے تھے، ان کے سے کثیر الجہات آدمی کے تمام خصوصیات اور گفتنی حالات پر اگر تفصیل کے ساتھ قلم اٹھاؤں تو

ایک دفتر ہو جائے ــــــ لیکن چونکہ میں بڑی تیزی کے ساتھ غروب ہو رہا ہوں اور اس جھٹپٹے میں اتنا وقت نہیں نکال سکتا۔ اس لئے ان کی زندگی کے چند ہی پہلوؤں پر لکھ سکوں گا۔

وہ جھانسی، اٹاوہ اور الہ آباد کالج میں پرنسپل کے عہدے پر فائز رہے اور ڈاکٹر ضیاء الدین کے بعد مسلمانوں میں ریاضی کے سب سے بڑے ماہر تھے ــــــ ریاضی والوں کو بالعموم ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن وہ دریائے ادب کے بھی پیراک اور اس قدر زود گو شاعر تھے کہ جب کبھی انکے کالج میں کوئی مشاعرہ ہوتا تو وہ ایک نشست میں ہزار پندرہ سو شعر کہہ کر کالج کے لڑکوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔

[1] یہ ہے کہ (mass production) یعنی وافر پیدا واری، تکثر آفرینی یا انبار اندازی میں بڑھیا مال تو پیدا نہیں ہو سکتا پھر بھی ان کی غزلوں میں کبھی کبھی اچھے شعر بھی جھلک اٹھا کرتے تھے۔ شاعری کے سلسلے میں وہ دو بار مجھ سے بگڑ بھی گئے تھے۔ پہلی بار تو شفق پر میری نظم سن کر انھوں نے اپنے مخصوص لہجے میں جلدی جلدی کہا تھا۔ یہ مناظر کی شاعری انگریزوں کو مبارک ہو، مجھے تو یہ ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ انگریزی پڑھ کر آپ نے اپنی شاعری خراب کر ڈالی ہے۔ بالکل خراب۔ اور دوسری بار میری ایک فارسی آمیز غزل سلسل کو سنکر انھوں نے کہا تھا، آپ مہربانی فرما کر ایران تشریف لیجائیں، ایران۔ آپ کو مطلق اردو نہیں آتی، مطلق نہیں آتی۔ ہر چند میں نے اپنا کوئی تخلص تجویز نہیں کیا ہے، اس کے باوجود آپ سے بہتر کہیں بہتر شعر کہتا ہوں۔

اس پر میں نے ہات جوڑ کر کہا تھا۔ اے قاضی، خدا کے لئے تخلص نہ رکھ لینا ورنہ میں تو خاک میں مل کر رہ جاؤں گا۔

اب ان کے انتقاد کی شان بھی دیکھ لیجئے، ان کو جب یہ شعر سنایا گیا ؎

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

تو انھوں نے زور سے منھ جھٹک کر کہا لاحول، بھلا یہ بھی کوئی شعر ہے۔ شاعر صاحب اللہ تعالیٰ سے فرما رہے ہیں کہ ہر چند میرے ماتھے میں ہزاروں سجدے پھڑک رہے ہیں لیکن جب تک تو طلاق و تنزیہ کے دائرے سے نکل کر چھیل چھبیلی یعنی جانکی بائی آف الہ آباد کے لباس میں انگیا کرتی پہن کر نہیں آئے گا میں تیری بارگاہ میں ایک بھی سجدہ نہیں کروں گا اس سے زیادہ مادہ پرستی اور اہانت الٰہی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ــــــ اس کے بعد انھوں نے کہا، مجھے اس غزل کے دو شعر یاد آ گئے۔ ذرا ان کو

---

[1] قصبہ جھوسہ ضلع سیتاپور کے باشندے تھے۔

بھی پرکھ کر دیکھ لیجئے ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم ہائے سیاہ کو، ترے عفو بندہ نواز میں

اس کے یہ معنی ہیں کہ شاعر نے جس قدر بھی اودے، نیلے، پیلے، سفید اور دھانی گناہ کئے تھے وہ جب "عفوِ بندہ نواز" کے تنبوں کے دروازے پر پناہ مانگنے آئے تو انھیں بھگا دیا گیا، لیکن شاعر صاحب کے جب حبشیوں کی طرح کالے کلوٹے گناہوں نے درخواست کی تو انھیں فوراً پناہ دے دی گئی۔
کاش کوئی اللہ میاں سے جا کر پوچھے کہ آپ کو انسان کے جلسی گناہوں پر کیوں پیار آتا ہے۔ اسکے علاوہ اس شعر کے پہلے مصرعے میں "جہاں" کا لفظ انتہائی حشو ہے۔

اب دوسرا شعر دیکھئے ؎

کبھی قبلہ رُخ جو کھڑا ہوا تو حرم سے آنے لگی صدا — ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ عراقی کے شعر کا چربہ ہے ؎

بحرم چو سجدہ کردم ز حرم ندا بر آمد
کہ مرا خراب کردی تو بسجدۂ ریائی

اور دوسری بات یہ ہے کہ مصرعۂ اول کے جزوِ اول یعنی "کبھی قبلہ رخ جو کھڑا ہوا" میں ایک ایسی فحاشی اور بدتمیزی کی گئی ہے جس کو میں زبان پر نہیں لا سکتا۔ توبہ توبہ "کھڑا ہوا" ایسی فحاشی معاذ اللہ۔

ایک روز میں نے ان کو اپنا ایک مطلع سنایا ؎

حرم کو جانا ہے کچھ دل سے ساز کرتا جا
طواف کعبۂ حسن مجاز کرتا جا

انھوں نے منھ بنا کر کہا۔ میں پہلے بھی آپ سے کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہہ رہا ہوں کہ آپ مہربانی فرما کر ہندوستان کی سکونت ترک فرما کر ایران تشریف لے جائیں۔ جی ہاں، ایران، ایران، ایران تشریف لے جائیں۔ اور وہاں جا کر "طوافِ کعبۂ حسنِ مجاز" کی فارسی خوب بگھارتے پھریں۔ اس کے علاوہ پہلے مصرعے میں "جانا" کا الف گر رہا ہے۔ ہر چند قدما کے نزدیک حروفِ اصلی کے سوا اور تمام حروف گرائے جا سکتے ہیں، مگر میں کہتا ہوں کہ اس طرح اسقاطِ حروف سے شعر کی موسیقی خراب ہو جاتی ہے۔ اور ایک عیب اس شعر میں اور بھی ہے۔ طواف کرنا خلافِ زبان ہے۔ آپ نے پہلے "طواف" اور بعد کو "کرتا جا" کہہ کر اس قدر تعقید پیدا کر دی ہے کہ شعر کا سارا مزا کر کرا ہو گیا۔ اور ایک بڑی نازک بات اور کہتا ہوں کہ آپ نے "طواف" میں اضافت کا دم چھلا لگا کر "طواف کرتا جا" کو "طوافے کرتا جا" کی آواز میں مبدل کر دیا ہے۔ جو قبیح ہونے کے

بعد سراسر بکر دہ ہے۔

ان کی ہیئت کچھ ایسی عجیب تھی کہ جب کسی اجنبی کی نگاہ ان کی طرف اٹھ جاتی تھی تو وہ بھونچکا سا ہو کر رہ جاتا تھا۔ ان کا قد لانبا، بانس ایسا سانولا، منھ پر ایک عجیب سی فرنچ کٹ داڑھی تھی، آنکھوں پر بھیانک سی عینک، ان کی ترکی ٹوپی ان کے ماتھے پر اپنے پھندنے کی سونڈ ہلایا کرتی تھی، کسی سے گفتگو کرتے تھے تو ان کا لعاب دہن اڑ اڑ کر سامع کے منھ پر آیا کرتا تھا۔ اور آواز کے ایسے متصل جھٹکوں، اور الفاظ کی ایسی مسلسل تکرار و کے ساتھ گھبرا گھبرا کر جلدی جلدی باتیں کیا کرتے تھے، گویا گھانس کاٹنے کی مشین چل رہی ہے۔ یہ بھی ان کی ایک خاص ادا تھی کہ وہ اپنے دوستوں کی ہر بات کے ابطال پر ہر وقت تلے رہتے تھے۔

ہر چند وہ "آب حیات" کی زبان کے خود بڑے معترف تھے۔ لیکن ایک روز جب کہ میں اُن کے وہاں مہمان تھا، اور کسی صاحب نے ان کے رو برو "آب حیات" کی زبان کی تعریف کی تھی تو انھوں نے حسب عادت اُنکی اس رائے کا ابطال کرتے ہوئے کہا تھا کہ محمد حسین آزاد کو زبان کی ہوا تک نہیں لگی تھی، وہ تو بالکل ہونّق آدمی تھے۔ اور جب کسی نے ان کے رو برو میرزا غالب کے باب میں یہ کہا تھا کہ غالب ہماری زبان کا سب سے بڑا شاعر تھا تو انھوں نے بڑی برہمی سے کہا تھا کہ اجی غالب، وہ حضرت تو فارسی میں سوچتے اور اردو میں شعر فرماتے تھے۔ لاحول ولا قوت۔

ان کے ابطال کی یہ لے یہاں تک بڑھی ہوئی تھی کہ وہ بد بہات تک کی تکذیب پر اتر آتے تھے۔ مثلاً ایسے اگر کوئی شدت سرما کی شکایت کرتا تھا تو وہ کہا کرتے تھے اجی سردی وردی کیسی، شاید آپ نے کسی اخبار میں پڑھ لیا ہے کہ سردی پڑ رہی ہے سردی کا کہیں نام بھی نہیں ہے۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد اپنی بات بھول کر کہنے لگتے کہ یار آج تو ایسی سردی پڑ رہی ہے کہ دانت بج رہے ہیں۔

ان میں ساری دنیا سے جدا ایک بات ایسی بھی تھی جو ان کے سوا میں نے اس دنیا کے کسی آدمی میں آج تک نہیں پائی ہے۔ اور وہ بات یہ تھی کہ جب ان کا کوئی بچھڑا دوست برسوں کے بعد بھی ان سے ملنے آتا تھا تو وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے۔ دوڑ کر گلے لگانا، اخاہ کہہ کر خیر مقدم کرنا، مزاج پوچھنا، یہ ساری باتیں ان کے معمولات سے یکسر خارج تھیں، اور برسوں کا بچھڑا ابھیتا دوست بھی جب ان کے گھر جاتا تھا تو وہ اسکو اس طرح دیکھتے تھے گویا وہ ایک گھنٹہ پیشتر ان کے پاس بیٹھا تاش کھیل رہا تھا، اور اب دوبارہ آگیا ہے۔

لگے ہاتھوں ان کی سنک کے بھی چند واقعات سن لیجئے۔ ایک بار کوئی پانچ چھ برس کے بعد میں ان سے ملنے چلا گیا دیکھا کہ وہ کچھ لکھ رہے ہیں۔ میں نے کہا قاضی صاحب آداب، انھوں نے میری طرف آنکھیں اٹھائیں، اور بڑی سپاٹ سی آواز میں سلام کا جواب دے کر پھر لکھنے میں غرق ہو گئے۔ دوسرا ہوتا تو بگڑ جاتا کہ انھوں نے میری آمد ہی کو تسلیم نہیں کیا۔ میں ان کا مزاج شناس تھا، میں نے برا نہیں مانا، اور برابر لکھتے رہے۔

جب لکھ چکے تو میری طرف نگاہ اٹھا کے کہا۔ جوش میاں! ہم ایک معمہ حل کر رہے تھے۔ میں نے کہا چلو اچھا ہوا کہ معمہ حل کر لیا۔ اب یہ بتاؤ کہ مزاج کیسا ہے؟ میری مزاج پرسی ان پر بہت گراں گزری، انھوں نے اپنے ایک دوست سے جو میرے آنے سے پیشتر وہاں موجود تھے، میری جانب اشارہ کر کے کہا۔ آپ جانتے ہیں انکو؟ یہ ہیں حضرت جوش ملیح آبادی، ان کے دوست ہڑبڑا کر مصافحے کے لئے اٹھے۔ انھوں نے دونوں ہاتھ بلند کر کے کہا۔ نہیں، نہیں نہیں۔ ان سے ہرگز مصافحہ نہ کیجئے، ہر چند یہ میرے بہت ہی پرانے یار ہیں مگر آتے آتے انھوں نے مزاج پرسی کے ذریعہ سے مجھ پر وار کر دیا ہے۔ میں نے کہا ارے قاضی وار کیسا؟ یہ کیا بک رہا ہے انھوں نے کہا۔ کئی روز سے میری طبیعت خراب تھی، آج ارادہ کر چکا تھا کہ جلاب ضرور پیوں گا، لیکن معمہ حل کرنے میں جلاب پینا ہی نہیں یہ بات بھی بھول گیا تھا کہ میری طبیعت کئی روز سے خراب ہے۔ اور اس بھول کی بنا پر ناشتہ منگوانے ہی والا تھا کہ تم نے مزاج پرسی کر کے یہ بات یاد دلادی کہ میری طبیعت کئی روز سے خراب ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ تم نے آکر میرا ناشتہ روک کر مجھ کو جلاب پینے پر مجبور کر دیا، یہ ہے تمھاری دوستی، اب تم مزے سے ناشتہ کرو گے اور میں کم بخت رو رو کر جلاب پیوں گا۔

ابھی یہ سنک چل ہی رہی تھی کہ ایک نہایت خوش رو نوجوان اعلیٰ درجے کا سوٹ پہنے آیا اور انھیں سلام کر کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا، وہ اس خوبرو نوجوان کو اپنی داڑھی کھجا کھجا کر گھورنے لگے اور ایسا لگا جیسے وہ کوئی بات یاد کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ جب انھوں نے اس کو بار بار گھورا اور داڑھی کھجائی تو میں نے کہا۔ گھورتے ہی چلے جاؤ گے یا کوئی بات بھی کرو گے۔ انھوں نے کہا۔ جوش میاں! اس سے تمھیں کیا غرض، کیا غرض، کیا غرض، میں تو ان نوجوان سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا۔ پھر پوچھتے کیوں نہیں؟ انھوں نے سہ بارہ داڑھی کھجا کر اس نوجوان سے کہا۔ میاں صاحبزادے۔ ہمارا حافظہ بالکل بالکل بالکل خراب ہو چکا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ہم کبھو آپ کو استعمال میں لاچکے ہیں کہ نہیں لائے؟[1]

یہ سن کر وہ نوجوان نہایت غصہ میں بھر اٹھا، بڑے کھڑاکے سے کرسی پیچھے ڈھکیل دی اور بڑے زور سے کھٹ کھٹ کرتا زینے سے اتر گیا۔

اس کے جاتے ہی انھوں نے کہا۔ اگر یہ کسی شریف خاندان کا آدمی ہوتا تو اس سنجیدہ بات پر کبھی نہ بگڑتا ہو نہ ہو یہ بدقوا ہے، بدقوا ہے، بدقوا..... سالا بدقوا، کہیں کا، بدذہن۔

ایک روز ایک نومشق و نوجوان شاعر نے ان سے فرمائش کی کہ وہ انھیں ایک سہرا کہہ کر دے دیں، جس کو وہ کسی رئیس کے لڑکے کی شادی میں پڑھیں گے، اور ان غریب کو کچھ مل جائے گا، انھوں نے کہا۔ بہت اچھا۔ میں بہت تڑکے فکر سخن کرتا ہوں، آپ کل ٹھیک۔ آٹھ بجے صبح کو آجائیے گا۔ سہرا طیار ملے گا۔

---

[1] قاضی نے بڑے عریاں الفاظ میں پوچھا تھا۔ میں نے اسے کسی قدر شائستگی کے سانچے میں ڈھال کر بیان کیا ہے۔

طیار ملے گا۔ ان بیچارے شاعر کی شامت اعمال کہ وہ صبح کو چھ بجے ہی آ گئے۔ انھوں نے تیوری پر بل ڈال کر کہا، میں نے تو آپ کو آٹھ بجے بلایا تھا۔ شاعر بیچارے نے دانت نکال کر کہا، میرا جی چاہا کہ یاد دہانی کر دوں۔ انھوں نے بگڑ کر کہا۔ یاد دہانی۔ یاد دہانی یاد دہانی، تو جھوٹوں کو کی جاتی ہے۔۔۔ آپ نے مجھے جھوٹا سمجھا۔ جھوٹا۔ جھوٹا۔ جھوٹا! یہ کہتے ہی انھوں نے وہ پرچہ جس پر وہ سہرے کے چند اشعار لکھ چکے تھے چاک کر کے فرش پر پھینک دیا؛ اور شاعر ماتھا پیٹتا ہوا چلا گیا۔

ایک روز میں ان کو اپنے ساتھ موٹر میں لئے باغ عامہ جا رہا تھا کہ چوراہے پر میرے ایک مولانا قسم کے دوست نے موٹر ٹھہرانے کا اشارہ کیا۔ میں نے موٹر روک لی۔ انھوں نے گھبرا کر پوچھا۔ ایں موٹر کیوں روک لی۔ میں نے مولانا کی طرف اشارہ کر کے کہا آپ کے ایماء سے۔ قاضی صاحب نے مجھ سے ان کا نام پوچھا۔ میں نے کہا مولانا عبدالعزیز، انھوں نے کہا۔ مولانا عبدالعزیز۔ ہٹ جائیے۔ ہٹ جائیے۔ ہٹ جائیے۔ ہمارے پروگرام میں یہ بات داخل نہیں تھی کہ ہم اس چوراہے پر آپ کے لئے موٹر روک دیں گے؛ جائیے جائیے جائیے اور پھر مجھ سے کہا۔ فوراً موٹر اسٹارٹ کر دو۔ اسٹارٹ کر دو۔ ورنہ میں اتر جاؤں گا۔ میں نے موٹر اسٹارٹ کر دی اور مولانا بیچارے منھ دیکھتے رہ گئے۔

ایک بار میں ان کے وہاں جھانسی میں ٹھہرا ہوا تھا۔ صبح کو انھوں نے مجھ سے پوچھا، جوش میاں۔ میرے ساتھ کالج چلو گے۔ کالج۔ کالج۔ کالج۔؟ میں نے کہا۔ ضرور چلوں گا۔ انھوں نے ملازم سے پکار کر کہا۔ ناشتہ لاؤ ناشتہ۔ ناشتہ۔ ناشتہ؛

جب ناشتہ چن دیا گیا تو ان کے یہاں جو ایک دوسرے مہمان ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ بھی دستر خوان پر آ کر بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھتے ہی انھوں نے کہا، نہیں نہیں آپ کا ناشتہ بعد کو آئے گا، بعد کو، بعد کو، بعد کو یہ فقط کالج۔ کالج۔ کالج، جانے والوں کا ناشتہ ہے؛ اور وہ پانی پانی ہو کر دستر خوان سے اٹھ گئے۔

ایک روز میں ان کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔ اثنائے طعام میں، انھوں نے مجھ سے کہا جوش میاں تمھاری یہ برکت ہے کہ آج خالص گھی کا کھانا کھا رہا ہوں، ورنہ چھ مہینے سے شبیر[1] مجھ کو تیل کھلا کھلا کر مارے ڈال رہا تھا۔ اور جب کھانا ختم ہو گیا تو شبیر نے قہقہہ مار کر مجھ سے کہا، پورے چھ مہینے سے اعلیٰ سے اعلیٰ گھی لا لا کر کھانا پکوا رہا تھا اور ہر بار قاضی صاحب یہی شکایت کرتے تھے کہ میں ان کو تیل کھلا کھلا کر مارے ڈال رہا ہوں اور آج جب کہ میں نے تیل میں کھانا پکوایا ہے تو قاضی صاحب اس کو خالص گھی کہہ رہے ہیں۔

ایک بار کچھ ایرانی مذاق کے شکایات سے متاثر ہو کر محکمۂ تعلیمات نے ان کو پرنسپلی کے عہدے سے ہٹا کر وائس پرنسپل بنا دیا لیکن تنخواہ وہی پرنسپل والی رکھی۔ انھوں نے اس خوشی میں کہ وائس پرنسپل بنکر

---

[1] ان کے سالے کا نام

ان کی ذمہ داریاں تو بہت کم ہوگئیں، لیکن تنخواہ میں کمی نہیں ہوئی۔ بڑی دھوم سے ہلوگوں کی دعوت کی۔ کھانا زیادہ تھا اور برتن کم تھے۔ اور جب ان کے سالے نے کہا پلاؤ کاہے میں دیں۔ برتن تو باقی نہیں رہے تو انھوں نے کہا کوئی بات نہیں چار پانچ کموڈ راکھ سے دھلوا کر لے آؤ۔ میں نے کہا گھانس کھا گیا ہے قاضی، اب کموڈ میں پلاؤ کھلوائے گا۔ انھوں نے بگڑ کر کہا، بس پتا چل گیا کہ تم ہو گیا، بڑے کمیونسٹ بنے پھرتے ہو۔ تم سالے سوفی صدی بورژا ہو۔ بورژوا ہو۔ بورژوا ہو۔ بورژوا۔ اس بات پر تمام مہمانوں نے کہا قاضی صاحب۔ فقط جوش صاحب ہی نہیں ہم سب کے سب بورژوا ہیں۔ بورژوا۔ ہم میں سے کوئی بھی کموڈ میں نہیں کھانے کا۔ انھوں نے کہا۔ جہنم میں جاؤ تم سب بورژوا، اور وہ کموڈ میں پلاؤ کھانے لگے۔

لکھنؤ کا ذکر ہے، ایک بار حکیم آشفتہ مرحوم کی جو شامت آئی تو انھوں نے رفاہِ عام کے ایک بہت بڑے مشاعرے کا قاضی کو صدر بنا دیا۔ اور جب ہال کھچا کھچ بھر گیا تو وہ صدارتی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے۔ سب سے پہلے تو انھوں نے شاعری کی ماہیت بیان کی پھر فارسی، عربی، سنسکرت، اور انگریزی شعراء کے کلام پر سرسری سا تبصرہ کیا۔ اور بات جب اردو غزل تک آئی تو انھوں نے کہا کہ بچانوے فیصد غزل گو نہ کسی پر عاشق ہوتے ہیں نہ رنڈی کے طریقوں سے واقف ہوتے ہیں نہ شراب پیتے ہیں اور نہ بے دین ہی ہوتے ہیں مگر ان سب کی غزلوں کا مدار ہوتا ہے۔ عاشقی، رنڈی، شراب خوری اور کافری پر ان کی تمام شاعری فقط روایتی ہوتی ہے۔ جس کا حقیقت سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ اس لئے سارے غزل گو چوتیے ہوتے ہیں۔ چوتیے۔ چوتیے۔ چوتیے۔ اور دس منٹ کے اندر تمام بھرا ہوا ہال خالی ہو کر بھائیں بھائیں کرنے لگا۔

ان کی ایک انوکھی جنگ سننے سے پیشتر یہ بات ذہن نشین فرما لیجئے کہ وہ اپنے جنسی مشاغل کو ایک نہایت مقدس فریضۂ انسانی سمجھتے تھے۔ اگر ان کے اس ایرانی مذاق کے خلاف کوئی ایک کلمہ بھی زبان سے نکالتا یا اس میں استہزاء کا کوئی پہلو پیدا کرتا تھا تو وہ اس کو "مداخلت فی الدین" سمجھ کر جامے سے باہر ہو جاتے تھے۔ یہ سمجھ لینے کے بعد اب سنئے کہ شام کا وقت تھا، وہ اپنے لاٹوش روڈ والے مکان کی مہتابی پر میرے ساتھ بیٹھے بادہ خواری کا شغل کر رہے تھے کہ رفیع احمد خاں آ گئے۔ اور چھوٹتے ہی پوچھنے لگے کہ قاضی صاحب۔ اب کبھی "انفعالیت" کو بھی جی چاہتا ہے کہ نہیں۔ انھوں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ بے شک۔ کبھی کبھی ضرور جی چاہتا ہے کہ اس چیز کو بھی برت کر دیکھ لوں رفیع نے کہا تو پھر بسم اللہ۔ انھوں نے جواب دیا کہ فقط دو چیزیں مانع ہیں ایک تو تکلیف دوسرے اسکینڈل (رسوائی) اور جب رفیع نے ان دونوں کا حل پیش کر دیا تو انھوں نے کہا۔ اگر آپ اس کا ذمہ لیتے ہیں تو میں بڑی خوشی سے طیار ہوں۔ ان کی اس آمادگی پر رفیع کا قہقہہ نکل گیا۔ کہہ چکا ہوں کہ ان معاملات میں استہزاء کو، قطعی طور پر مداخلت فی الدین سمجھتے تھے۔ اس لئے رفیع کے قہقہے پر وہ جامے سے باہر ہو گئے، اور کہا۔ پہلے اپنی...

.... خانم کا چال چلن درست کر لیجئے پھر مجھ پر ہنسئے گا۔

رفیع پٹھان تھے۔ یہ سن کر آگ بگولا ہو گئے اور ترشے سے ان کو ماں کی گالی دے دی۔ قاضی نے گالی سنتے ہی اپنا سیدھا ہاتھ بلند کر کے کہا غلط در غلط جوش میاں غور کرو انھوں نے مجھ کو گالی دی مجھ کو مطلق غصہ نہیں آیا۔ اس لئے کہ گالی شدت غضب کی ایک مہمل سی آواز کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہوتی۔ اور ان کو میری بات پر غصہ آ گیا۔ اس لئے کہ وہ بات فیکٹ (حقیقت) ہے اور سچی بات پر لوگوں کو غصہ آ جاتا ہے۔

رفیع نے پھر آواز بلند ان کو ایک اور موٹی سی گالی دی۔ انھوں نے پھر اپنا سیدھا ہاتھ بلند کر کے کہا۔ غلط در غلط۔ جوش میاں۔ جہلیت ان کی طرف ہے اور واقعیت میری جانب۔ اس لئے میں ان کی بات کا برا نہیں مان رہا ہوں۔ اور یہ انگارے کی طرح دہکتے چلے جا رہے ہیں۔ رفیع ان کے اس طرز عمل سے سخت الجھن میں پڑ گئے کہ وہ مجھے حملہ کرنے کا موقع ہی نہیں دے رہے ہیں۔ ان کی ذہنی کوفت کو بھانپ کر میں ان کو وہاں سے اٹھا کر زبردستی نیچے لے آیا۔ اور جب ہم دونوں سڑک پر آ گئے تو دیکھا کہ قاضی صاحب اوپر سے جھانک رہے ہیں اور چاندنی رات میں ان کی فرینچ کٹ داڑھی کا عکس زمین پر پڑ رہا ہے۔ ابھی ہم دو قدم ہی چلے تھے کہ اوپر سے ان کی آواز آئی۔ خاں صاحب اپنی..... خانم کا چال چلن درست کر لیجئے۔ پھر مجھ پر ہنسئے گا۔ رفیع نے منہ اٹھا کر کہا اے تیری تو ماں کی........ اور انھوں نے کوٹھے سے کہا۔ غلط در غلط۔ اور میں غصے سے کانپتے رفیع کو گھر پہنچا کر پلٹا تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ وہ جنگ جس کے ایک سرے پر ماں کی گالی تھی) اور دوسرے سرے پر غلط در غلط کے نعرے تھے۔ خون خچر کے بغیر ہی ختم ہو گئی۔

قاضی صاحب میں سنجیدگی اور مجلسی تہذیب کی مطلق صلاحیت نہیں تھی اور اس کرۂ ارض پر انھوں نے اس طرح زندگی کاٹ دی جس طرح لڑکے بورڈنگ میں رہا کرتے ہیں میرے اس قول کی تصدیق مندرجۂ ذیل واقعے سے حرف بحرف ہو جائے گی۔

ایک بار انھوں نے جب کہ۔ حیدرآباد دکن میں وہ میرے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ مجھ سے فرمائش کی کہ میں ان کو مہاراجہ کشن پرشاد صاحب سے ملا دوں۔ میں نے کہا قاضی۔ تم دونوں میں بُعد مشرقین ہے۔ تم اول حلول مطلق العنان اور آزاد رو انسان ہو اور مہاراجہ کا ہر بن مو تہذیب کے آئین و آداب میں گندھا ہوا ہے۔ وہ مشرقی وضعداری کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ستر سے متجاوز ہے لیکن اس پیرانہ سالی کے باوجود کیا مجال کہ مجلس میں وہ صوفے سے بیٹھ لگا کر یا پاؤں پر پاؤں رکھ کر۔ یا ٹوپی اُتار کر بیٹھ جائیں۔ یہ سنا تو انھوں نے کہا۔ کیا میں کوئی کنجڑا۔ قصائی دھینا۔ جلا ہا ہوں کہ تم مجھے اُن سے ملنے کے قابل نہیں سمجھتے ہو میں ہندوستان جنت نشان کا باشندہ ہوں۔ افریقہ کا رہنے والا نہیں مشرقی تہذیب

تو پھر ے گھر کی لونڈی) ہے تم ھنجی ہنڈ تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔ میں نے کہا اچھا بھائی نہیں مانتے ہو تو کل ملا دوں گا دوسرے دن مہاراجہ کے دربار کے آداب سلام و اسالیب نشست و برخواست سے ان کو بخوبی آگاہ کر کے انھیں مہاراجہ کے پاس لے گیا۔

مہاراجہ کا سامنا ہوتے ہی انھوں نے السلام علیکم کا پتھر کھینچ مارا۔ تمام دربار میں حیرت کی لہر دوڑ گئی اور میں نے دل ہی دل میں کہا: "وہ مارا"

مہاراجہ نے پوچھا قاضی صاحب کیا آپ پہلی بار حیدر آباد تشریف لائیں ہیں؟ انھوں نے کہا جی ہاں پہلی، جی ہاں، بالکل پہلی بار۔ بالکل پہلی بار۔ مہاراجہ نے پوچھا دکن کو آپ نے کیسا پایا؟ قاضی نے کہا لاحول ولاقوۃ، یہاں کے لوگوں کو اردو نہیں آتی۔ بالکل اردو نہیں آتی ریل سے اترتے ہی تار گھر پر نظر پڑی دیکھا کہ اس کے بورڈ پر "تار پی" لکھا ہوا ہے ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ تار مذکر ہے ہئے مذکر کی جمع اس طور سے بن ہی نہیں سکتی اور پرسوں ایک صاحب جوش میاں سے خان ساماں کو ایک آنے کا دعدہ کر کے گئے تھے سو آج تک، وہ پلٹ کر نہیں آئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے آدمی پرلے درجے کے جھوٹے ہیں۔ جھوٹے۔ جھوٹے ہیں۔

اہل دربار میں یہ سن کر حیرت کی لہر دوڑ گئی اور مہاراجہ کے چہرے پر انفعال پھیلنے لگا لوگوں نے آنکھوں آنکھوں میں پوچھا کہ یہ کیسا جناور پکڑ لائے ہو۔ میں نے آنکھیں جھکا لیں۔

مہاراجہ کی تہذیب دیکھئے کہ ان کے منہ پر ان کے وطن کو اور وہ بھی برسر دربار دعلی الاعلان، اشتہار برا بھلا کہا گیا لیکن ہر چند ان کے چہرے پر پشیمانی کا رنگ دوڑا مگر زبان سے اُف تک نہیں کی۔

قاضی کی اس بران گفتاری کو ضبط کرنے میں دو تین منٹ لگ گئے مہاراجہ کو اور انھوں نے اپنی خوش خلقی کا سہارا لیکر مجھ سے کہا۔ جوش صاحب آپ کی زبانی یہ معلوم کر کے قاضی فقط ریاضی داں ہی نہیں شاعر بھی ہیں مجھے اشتیاق پیدا ہو گیا ہے کہ ان کے کلام سے بہرہ اندوز ہوں قاضی نے کہا۔ نیلی، نیلی، نیلی، مجھے اپنا کلام یاد نہیں، مطلق، مطلق یاد نہیں یہ کہہ کر قاضی نے اپنا سیدھا ہاتھ ان کی طرف پھیلا دیا اور بار بار انگلیاں اٹھا اٹھا اور جھکا جھکا کر کہنا شروع کر دیا۔ آپ کچھ سنائیں، سنائیں، سنائیں، آپ کچھ سنائیں۔ انگلی اس لونڈوں کی سی حرکت پر میں عرق عرق ہو کر رہ گیا۔ دل میں سوچا کہ دنیا میں کلام سنانے کی کہیں اس طرح بھی فرمائش کی جاتی ہے۔ مگر اللہ ری مہاراجہ کی خوش خلقی، اس ادائے فرمائش کو بھی پی گئے، اپنی بیاض منگائی کہا کہ میں کل سے بیحد گلو گرفتہ ہوں، جوش صاحب آپ کوئی غزل اس بیاض سے سنا دیں۔

ہر چند قاضی کی حرکتوں سے میں دریائے شرمندگی میں ڈوبا ہوا تھا پھر بھی موڈ پر قابو پا کر میں نے مہاراجہ کی دو غزلیں قاضی کو سنا دیں۔ انھوں نے میز پر اپنی ٹوپی ٹپک کر کہا، میاں جوش بہت غنیمت مہاراجہ نہ دہلوی ہیں نہ لکھنوی لیکن اچھے شعر کہتے ہیں، اور وہ بھی ہندو ہو کر ہندو ہو کر قاضی صاحب کے اس ریمارک

سے مجھ پر اور پورے دربار پر بجلی سی گر گئی ہر طرف سناٹا سا چھا گیا۔ اتنے میں سونے پر سہاگہ وہ ٹوپی تو اُتار کر پھینک ہی چکے تھے اب انھوں نے پاؤں پر پاؤں بھی رکھ لیا۔ اور جب میں نے آنکھ بچا کر ان کو ٹھوکا دیا تو وہ حسب عادت قدیم اوں اوں اوں کرنے لگے۔ اب وہاں بیٹھا رہنا میرے لئے ناممکن ہو چکا تھا۔ اس لئے میں نے مہاراجہ سے جھینپے ہوئے چہرے، جھکی ہوئی آنکھوں اور رندھی ہوئی آواز میں رخصت کی اجازت طلب کی اور رندھی ہوئی آواز میں ڈوبتے ہوئے دل اور لڑکھڑاتے ہوئے پاؤں کے ساتھ نیچے آگیا۔ اور آنکھوں کا یہ عالم تھا کہ جب میں نے اپنی موٹر کی طرف نگاہ اُٹھائی تو ایسا معلوم ہوا کہ اس پر دھواں سا چھایا ہوا ہے۔ میں بصد ہزار دشواری موٹر کا دروازہ کھول کر ایک کراہ کے ساتھ گدی پر گر گیا۔ اور سوچنے لگا کہ ابھی گاڑی نہ اسٹارٹ کردوں ورنہ کہیں ٹکرا دوں گا۔ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے میں چوب دار ہانپتا آیا اور کہا کہ سرکار یاد فرمارہے ہیں یہ سنتے ہی جی سن سے ہو کر رہ گیا۔ اور سوچنے لگا کہ اب مہاراجہ کو کس طرح منہ دکھاؤں گا۔ سیڑھیوں پر من من بھر کے قدموں سے چڑھا اور ایسا محسوس ہوا کہ یہ میں اپنے کو نہیں پانچ ہاتھیوں کو زینے پر چڑھا رہا ہوں۔

جھکے سر اور بوجھل پپوٹوں کے ساتھ جب مہاراجہ کے پاس گیا تو انھوں نے مسکرا کر کہا کل رات کو آپ اور قاضی صاحب یہیں ما حضر تناول فرمائیں گے۔

میں نے آنکھیں اٹھائے بغیر کہا۔ مہاراج مجھ کو آپ کی اس سنت حاتمیہ کا علم ہے کہ جب آپ کا کوئی نیازمند اپنے مہمان کو آپ کی خدمت میں لاتا ہے تو آپ اس کی میزبانی فرماتے ہیں...... لیکن میری یہ استدعا ہے کہ...... میں اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ مہاراجہ نے جلدی سے میری بات کر فرمایا۔ جوش صاحب آپ ہرگز شرمندہ نہ ہوں۔ میں قاضی صاحب سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں، اس لئے کہ اس قیامت کا بے لوث، نڈر، بے جھجک اور صاف گو انسان آج تک میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔ اور یہ وہ پہلے شخص ہیں جنکو تہذیب ریاکار بنانے میں ناکام ہو کر رہ گئی ہے مہاراجہ کی ان باتوں سے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا، اور ان کی دعوت منظور کر کے گھر آگیا۔

گھر آکر میں نے قاضی سے [illegible]یت کی وہ الٹے مجھ پر برس پڑے اور کہنے لگے اب تم نواب فقیر محمد خان بہادر کے پوتے نہیں جیلی بیادے بن کر رہ گئے ہو تمھاری رگ رگ میں غلامی سرایت کر گئی ہے۔ میں نے کہا قاضی اگر تہذیب کی نگہداری غلامی ہے تو میں غلام میری سات پشتیں غلام۔

انھوں نے کہا۔ اگر تم مناسب نہ سمجھو تو میں کل مہاراجہ کے پاس نہ جاؤں۔ میں نے کہا جانا تو پڑے گا لیکن یہ وعدہ کرو کہ کل شروع سے آخر تک خاموش رہو گے۔ انھوں نے کہا بہت اچھا آپ کی محبت میں ایسے بھی گوارا کر لیں گے اور حضرت جیب شاہ قلندرؒ بنے بیٹھے رہیں گے۔

دوسرے دن جب ہم مہاراجہ کا زینہ طے کر رہے تھے، انھوں نے کہا سنتا ہوں ارباب دکن

چپاتی نہیں کھاتے، نپا اول کھاتے ہیں۔ میں نے کہا بالعموم ایسا ہی ہوتا ہے لیکن شاندار دعوتوں میں چپاتیاں بھی ہوتی ہیں، اگر چپاتیاں، نہ ہوں تو بھیا اعتراض نہ کر بیٹھنا۔ انھوں نے کہا ہم تو چپ شاہ قلندر بنے رہنے کا وعدہ کر کے آئے ہیں۔

جب ہم کھانے کی میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے تو پلیٹیں گردش کرنے لگیں، اور چپاتیاں بھی قاب میں لاکر سامنے رکھ دی گئیں۔ چپاتیوں کو دیکھتے ہی انھوں نے مجھ سے کہا ارے چپاتیاں آگئیں میں نے انھوں آنکھوں میں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اور وہ چپ ہو گئے۔

اتنے میں کوفتوں کی ڈش آگئی۔ انھوں نے گن کر پانچ کوفتے اپنی پلیٹ میں رکھ لئے کوفتہ چکھ کر خوش ہو گئے اور یہ کہہ کر کہ جوش میاں، چکھ کر دیکھو کس مزے کا کوفتہ ہے کوفتہ میری جانب لڑھکا دیا۔ وہ سفید میز پوش پر ایک پیلی سی لکیر ڈالتا میرے ہاتھ سے آکر ٹکرا گیا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا گویا مجھ پر بم پھٹ پڑا ہے۔

جب کھانا ختم ہو گیا تو ایسا لگا کہ میں نے کھانا نہیں کھایا بلکہ کھانا مجھ کو کھا کر رخصت ہو گیا ہے۔

اب ہم سب رقص[1] و سرود کے جھلملاتے کمرے میں آگئے۔ تمام حاضرین مہاراجہ سمیت دوزانو بیٹھ گئے۔ میں نے کہا۔ قاضی، دوزانو بیٹھنا ہوگا۔ انھوں نے بڑے اکراہ کے ساتھ کہا۔ تمھاری محبت میں یہ بھی بھگت لیں گے۔ اب گانا شروع ہو گیا اور گانا ہی ہوا ہی تھا کہ وہ ہاں ہاں کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر میں قاضی نے میرے کان میں کہا دم نکلا جا رہا ہے دوزانو بیٹھنے سے۔ میں نے کہا برآمدے کے صوفے پر جا کر بیٹھ جاؤ۔ قاضی نے زور سے کہا وہاں سے رنڈی نظر نہیں آئے گی تمام محفل میں یہ فقرہ گونج اٹھا اور وہ بڑے اطمینان سے پلتھی مار کر بیٹھ گئے۔ ان کی اس حرکت پر لوگوں کی نظریں اٹھ گئیں میں نے آنکھیں جھکا لیں۔ انھیں ٹھوکا دیا کہ دوزانو بیٹھ جائیں مگر وہ حسب عادت پھر اوں، اوں، اوں، اوں کرنے لگے۔

اور خدا کا شکر ہے کہ سارنگی کی رُوں رُوں نے ان کی اُوں، اُوں، جذب کر لی۔

اب اسی برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن والی طوائف کا مجرا شروع ہوا اللہ نے اسکو حسن کے ساتھ گلا بھی بہت اچھا دیا تھا اس نے بحر طویل میں خود مہاراجہ کی ایک غزل چھیڑ دی۔ اس نازنین کے گلے کی چال پھرت بحر کے پیچ و خم اور سازوں کی ہم آہنگی نے وہ طلسمی عالم پیدا کر دیا کہ لوگ سرشار ہو گئے۔ اور مہاراجہ نے اپنی غزل کا پورا رس پینے کے واسطے آنکھیں بند کر لیں۔ اور جھومنے لگے۔

---

[1] گانے والیوں میں ایک برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن والی ایسی حسین لونڈیا تھی کہ میرا دل اس پر لوٹ ہو کر رہ گیا تھا اور آخر کار اس کے دل کو بھی کھینچ لیا تھا سہ کیوں وہ صیاد کسی صید پہ توسن ڈالے، صید جب خود ہی چلے آتے ہیں گردن ڈالے،

یہ جادو کا سماں چھایا ہوا تھا کہ قاضی نے اپنے گھٹنے پر تال دیتے ہوئے پوچھا کہ یہ کس کی غزل ہے؟ میں نے کہا مہاراجہ کی یہ سنتے ہی قاضی نے اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے سبحان اللہ کا ایسا نعرہ لگایا کہ مہاراجہ یہ سمجھ کر کہ یکایک نظام دکن تشریف لے آئے ہیں دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور جب قاضی نے دوبارہ سبحان اللہ کا نعرہ بلند کیا تو مہاراجہ یہ بات محسوس کر کے کہ وہ نظام کے بجائے قاضی کے روبرو ہاتھ جوڑے کھڑے ہیں۔ جھینپ کر بیٹھ گئے۔ اور پھر آنکھیں بند کر لیں لے

اور جب گھر آ کر میں نے کہا کیوں بے قاضی آخر کار مہاراجہ کو ہاتھ جڑوا کر تو نے دم لیا تو وہ داڑھی کھجانے لگے۔ اب ان سے میری آخری ملاقات کا حال بھی سن لیجئے ۔ ۱۹۵۵ء کے اواخر کی بات ہے کہ میں رئیس احمد اور اپنے چچا زاد بھائی مصطفےٰ علی خاں کے ساتھ لکھنؤ کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا اور کھا پی کر بستر پر دراز ہو چکا تھا کہ برآمدے سے ہوٹل کے بوائے کی آواز آئی۔ صاحب، وہ سو چکے ہیں دروازہ اب نہیں کھلے گا۔ اور اس کے بعد جب یہ آواز آئی کہ "نہیں نہیں نہیں ہم تو ابھی ابھی ملیں گے تو میں نے کہا۔ مصطفےٰ علی دروازہ کھولو قاضی آئے ہیں۔ انھوں نے دروازہ کھول دیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ چار گردے کی داڑھیوں والے دست بستہ اور سیاہی مائل احمقوں کے جلو میں کوئی سجادہ نشین صاحب میری چارپائی کی طرف بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ میں نے کہا رئیس احمد دوسری لائٹ بھی کھول دو، دوسری لائٹ کھل گئی تو یہ سماں دیکھ کر حیرت ہو گئی کہ قاضی صاحب جوگوشیا ٹوپی پہنے اور عمامہ باندھے میرے سامنے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ میں اپنے بستر پر اچھل کر بیٹھ گیا اور "ارے قاضی اور اس ہیئت میں" کہہ کر، میں نے مصطفےٰ علی کو آواز دی۔ قاضی درویش ہو گیا ہے اسے جوتی دکھاؤ اور جب انھوں نے کھڑے ہو کر قاضی کو جوتی دکھائی تو قاضی صاحب جلدی جلدی "ارے یہ کیا بیہودگی، یہ کیا، یہ کیا، یہ کیا بیہودگی" کہنے لگے: قاضی کی اگن بنتے دیکھی تو ان کے چاروں خفیف الحرکت معتقدین بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور اس قدر زور سے کہ لکڑی کا زینہ ان سراسیمہ و پشیمان مفرورین کے بھدے قدموں کی دھمک سے بجنے لگا۔

جب معتقدین بھاگ گئے تو میری چارپائی پر بیٹھ کر انھوں نے کہا۔ میں غلام علی میاں کا مرید ہو چکا ہوں میں نے کہا ارے دیوانے کیسی پیری اور کیسی مریدی، پڑھا لکھا آدمی ہو کر اس جوتیا چکر میں پڑ گیا۔ انھوں نے کہا تم کیا جانو ہمارے دل کی آنکھیں کھل چکی ہیں۔ بالکل بالکل بالکل کل رات کو ہمارے ساتھ کھانا کھانے آنا۔

دوسرے دن رئیس و مصطفےٰ کو لے کر ان کی جائے قیام پر پہنچا۔ دیکھا کہ جلاہوں کی سی شکل کے دس بارہ گھامڑ ان کے سامنے دو زانو بیٹھے ہوئے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی قاضی نے ان کو اٹھا دیا۔ ان کے قریب ہو گیا

لے مہاراجہ کو یہ دھوکہ اس لئے ہوا کہ نظام کے علاوہ ان کی محفل میں کوئی زور سے بولتا نہیں تھا اور نظام ہمیشہ بہت بلند آواز میں باتیں کیا کرتے تھے۔

تو یہ دیکھ کر حیرت ہوگئی کہ ان کے داہنے طرف شراب کی لانبی سی بوتل رکھی ہوئی ہے اور بائیں طرف ایک چھریرا سا لونڈا بیٹھا ہوا ہے میں نے کہا کیوں قاضی اس درویشی میں بھی..... انھوں نے کہا تم ارباب ظاہر ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے. ہم کو میاں (پیر) یہ نکتہ سمجھا چکے ہیں کہ بحر معرفت اس قدر ذخّار ہے کہ ایک بوتل اور ایک لونڈا اس کو ناپاک نہیں کر سکتا. نہیں کر سکتا. نہیں کر سکتا. ناپاک نہیں کر سکتا. یا حق، یا حق، یا حق،

حکیم صاحب عالم

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا ـــ لکھنؤ کے حاذق و ممتاز طبیب، عربی و فارسی کے منتہی، مذہبی قصائد کے عدیم النظیر شاعر، یتیموں اور بیواؤں کے سرپرست، مملکتِ شرافت کے تاجدار، اقلیمِ خلوص کے شہریار، اور کاروانِ زہد و اتقا کے سالار، صاحب عالم ـــ کیا بتاؤں کہ کس قدر خوش رو، خوش وضع، خوش طبع، خوش فکر، خوش اخلاق، خوش پوشاک، خوش گفتار، خوش تبسم، خوش اوقات، خوش ادارت، خوش میزبان، اور خوش مطبخ تھے۔

ان کا بوٹا سا قد تھا. چھوٹے چھوٹے ملائم ہاتھ تھے. گورا رنگ تھا اور چوڑی پیشانی تھی لکھنؤ میں ان کے تقوے کی اس قدر دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ بڑے سے بڑے رند کی یہ مجال نہیں تھی کہ ان کی محفل میں پی کر جائے. یا ان کے سامنے خلافِ شرع زبان ہلائے. لیکن اس قدر زبردست تقشّف کے باوجود وہ رندانِ نامہ سیاہ کے دوست، اور دوست. بھی کیسے میرے پسینے پر خون بہانے والے دوست تھے اور میرا اور ان کا یارانہ تقشّف اور تردامنی کا ایک ایسا عجیب سنگم تھا کہ جو دیکھتا تھا انگشت بدنداں ہو کر رہ جاتا تھا. اور جب کہ وہ میری صحبت ہائے شبانہ میں بھی شریک ہونے لگے. اور میری بے پایاں محبت کے طفیل انھوں نے میرے شرکائے بزم کو بھی اپنے سامنے پینے کی اجازت دے دی تو لکھنؤ بھر میں چرچے ہونے لگے کہ حکیم صاحب عالم کا سا متقی بھی مے خوار بن گیا اور جب اڑتے اڑتے یہ خبر لکھنؤ کے سب سے بڑے مجتہد سید ناصر حسین صاحب قبلہ تک پہنچی، تو انھوں نے صاحب عالم کو بلا کر یہ سمجھایا کہ وہ میری راتوں کی صحبت میں شریک ہونا ترک کر دیں لیکن انھوں نے قبلہ و کعبہ کی بات بھی نہیں مانی، اور برابر میری صحبتوں میں شریک ہوتے رہے. ان کو میری شاعری سے عشق تھا، اور کہا کرتے تھے کہ آپ کی صحبت میں بیٹھ کر بدنام ہو جانا اس امر سے بدرجہا بہتر ہے کہ لوگ مجھ کو خاصانِ خدا میں شمار کرنے لگیں ۔

خلق می گوید کہ خسرو بُت پرستی می کند
آرے آرے می کنم، با خلق و عالم کار نیست

وہ اس بلا کے نکتہ سنج تھے کہ اچھا شعر سن کر جھومتے اور سر دھننے لگتے تھے۔ اور ایک بار تو میری ایک نظم سنکر ان کا عالم ہو گیا تھا کہ انتہائی مہذب ہونے کے باوجود وہ جست کر کے میری چھاتی پر چڑھ بیٹھے اور میرا گلا[1] دبا کر چیخنے لگے کہ آج تجھ کو مار ڈالوں گا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ میری "ملحدانہ" نظموں کو سخت ناپسند کرتے اور ان کی پیروڈی کہہ کر خود مجھے سنایا کرتے تھے، اور میں ان کی داد دیا کرتا تھا۔

ایک روز میں نے ان سے کہا حکیم صاحب، پیروڈی کی جو نظمیں آپ مجھے سناتے ہیں ان میں بڑی جان ہوتی ہے۔ اگر آپ اسی کے ساتھ ساتھ سنجیدہ شاعری کی طرف بھی مائل ہو جائیں تو ڈنکے پٹ جائیں۔ انھوں نے مجھ سے کہا بھائی، میں غزل گوئی تو کر نہیں سکتا، اس لئے کہ میری زندگی اس قسم کی شاعری سے بالکل مختلف ہے البتہ ہو سکتا ہے کہ آئمہ طاہرین کی شان میں قصیدے کہنا شروع کر دوں ــــ چنانچہ انھوں نے قصیدے کہنا شروع کر دیئے اور ایسے ایسے بے مثال قصیدے[1] کہے کہ قاآنی سے ٹکر لینے لگے۔

وہ کھانا بھی بہت اچھا کھاتے اور کھلاتے تھے۔ نواب حامد علی خاں، والی رام پور کے کھانے کی یو پی بھر میں دھوم مچی ہوئی تھی، میں نواب صاحب کے وہاں بھی متعدد بار کھانا کھا چکا تھا، اس بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ حکیم صاحب کے مطبخ میں جو کھانا پکتا تھا اس کی لذت رام پور کے کھانوں سے کہیں زیادہ تھی۔

ان کا مطب نخاس میں، چڑیا بازار کے قریب جہاں، کسی زمانے میں ایک طالب علم کی حیثیت سے میں رہتا تھا۔ مطب کی چھت پر ایک چوکور بڑا سا ہال، ہال کے پہلو میں ایک کمرہ مع غسل خانہ اور چوڑا سا آنگن تھا۔ میں جب دہلی سے آتا تو کبھی کبھی ان کے اوپر کے کمرے میں ٹھہرا کرتا تھا۔ شام ہوتے ہی رات کی محفل جما کرتی تھی۔ جس میں میرزا جعفر حسین ایڈوکیٹ، مولانا ثاقب، سید غلام حسنین، علی عباس حسینی، مولانا اختر علی تلہری، سید اعظم حسین سابق مدیر "سرفراز" سید احتشام حسین، نواب جعفر علی خاں اثر، مجاز، مخمور، سراج، نذیر، احسن طباطبائی، میرزا یگانہ چنگیزی اور صدیق حسن خاں (آئی سی ایس) وغیرہ شریک ہوا کرتے تھے، اور آدھی رات تک شاعری ہوا کرتی تھی، ہائے وہ صحبتیں۔ جواب خواب و خیال ہو کر رہ گئیں، اب ان کی یاد آتی ہے تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔

ایک بار دہلی سے لکھنؤ آیا تو ان کے وہاں نہیں ٹھہرا، ایک ہوٹل میں قیام کیا، اور ارادتاً انھیں اپنے آنے کی خبر بھی نہیں کی، تاکہ ان کے وہاں اچانک پہنچ کر کھیل کھیلوں جس کو دہلی سے ٹھان کر آیا تھا۔

---

[1] رئیس کی معشوقہ، جو اب ملیح آباد میں انھیں کیساتھ رہتی ہے [2] انکے عزیز دنمیں ایک خوش گلو صاحبزادے انکا کلام سنایا کرتے تھے

شام ہوتے ہی رئیس احمد سے ملنے ہِن[1] کے وہاں پہنچا۔ اور حکیم صاحب سے جو کھیل کھیلنے والا تھا۔ اس کا طریقہ ان کو بتایا۔۔۔ رئیس نے تانگہ منگایا، اس پر چادر باندھی مجھے اندر بٹھایا، خود کوچ بان کے قریب بیٹھے، تانگہ حکیم صاحب کے مطب کے پھاٹک پر روکا، اتر گئے۔ حکیم صاحب سے کہا، ملیح آباد کی ایک خاتون کو کئی روز سے بخار آ رہا ہے، میں انھیں تانگے میں لایا ہوں، آپ کو تکلیف نہ ہو تو مہربانی فرما کر ان کی نبض دیکھ لیں، حکیم صاحب نے نبض دیکھنے کے لئے پردے میں ہاتھ ڈالا، اور میں نے ان کے ہاتھ میں۔۔۔۔ تھما دیا۔ وہ اچھل گئے اور "ارے" کہہ کر اس زور سے ہاتھ باہر کھینچا گویا ان کا ہاتھ بجلی کے برہنہ تار سے مس ہو گیا ہے۔ دو تین سکنڈ تک تو وہ دنگ ہو کر رئیس کا منھ تکتے رہے، اور پھر انھوں نے قہقہہ مار کر کہا "تانگے سے اتر آیئے جوش بیگم" میری جان میں تانگے سے ہنستا ہوا کود پڑا، انھوں نے بم مہاراج کہہ کر مجھے گلے لگا لیا اور اس قدر ہنسے کہ آنسو نکل آئے۔ لیکن اس تمام مسرت میں انھوں نے اپنا وہ ہاتھ، جس سے "نبض دیکھی تھی" اپنے جسم سے دور رکھا، اور مطب آ کر جب اس کو تین بار خوب اچھی طرح صابون سے دھو لیا تو اس گیلے ہاتھ سے میرا منھ چھو کر اسے چوم لیا۔

ہائے کل جس بات پر اس قدر ہنسے تھے آج اس پر دل تمام کر رو رہے ہیں۔۔۔ دنیا کی یہی ریت ہے۔ میری مہاجرت کے سال بھر بعد وہ بھی پاکستان آ گئے تھے۔ ان پر دل کا دورہ پڑ چکا تھا، اس لئے وہ میرے پاس آنے سے معذور تھے، میں متعدد احباب کے ساتھ ہر ہفتے ان کے پاس جایا کرتا تھا۔ اور چار پانچ گھنٹے کے لئے شاعری و لطیفہ گوئی کی محفل جم جاتی تھی اور لکھنؤ کا سماں بندھ جایا کرتا تھا۔

ایک روز حسب معمول، ہم سب لوگ یعنی منور عباس، علی جنین زیبا مرحوم۔۔۔ سالک لکھنوی، میرزا عالمگیر قدر، قیصر مرحوم، میرزا ابو جعفر، اور نواب ابوالحسن بلگرامی مرحوم ان کے وہاں پہنچے۔ وہ پھولوں کا سا شگفتہ چہرہ لئے باہر آئے، میں نے سینے سے لگا کر ان کا ہاتھ، اور انھوں نے میرا منھ چوم لیا، اور کہا کہ آج اپنے راثی سے ایسا قصیدہ سنواؤں گا کہ آپ کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل جائے گی۔ میں نے کہا میرے پاؤں زمین پر رہتے ہی کب ہیں، میں تو عرش بریں پر قدم جمائے رہتا ہوں، وہ ہنسنے لگے۔

اتنے میں ان کے دونوں چھوٹے بھائی محمد نواب اور للن صاحب بھی اپنی بیگموں سمیت آ گئے، یعنی پاکستان میں ان کے جس قدر بھی چہیتے اور قرابت دار تھے، وہ اتفاق سے سب کے سب یک جا ہو گئے اور انھوں نے سب کو جی بھر کے دیکھ لیا۔۔۔ ابھی چائے آ ہی رہی تھی کہ ان کو کھانسی آنے لگی۔ ان کے ڈاکٹر بیٹے نے کہا۔ "گولی حاضر کر دوں" انھوں نے کہا "شاعری کے بعد"۔۔۔ اور جب، تھوڑی دیر بعد کھانسی بڑھ کر

---

[1] افسوس کہ وہ نادر قصیدے ان کے بیٹوں کے پاس ہیں جن کو علم و ادب سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ بار بار کہہ چکا ہوں کہ انھیں چھپوا دو۔ وعدہ تو کر لیتے ہیں کہ چھپوا دیں گے، مگر مجھے ایفائے وعدہ کی کوئی امید نہیں، اور افسوس کہ وہ متاع بے بہا کیڑوں کی غذا بن جائے گا۔

اچھو کی شکل اختیار کر گئی تو ان کی سانس رکنے لگی ـــــ اور پل بھر میں روح پرواز کر گئی صاحب۔ عالم میں مر جاتا، تم نہ مرتے ـــــ تم نے مجھے زندہ درگور کر دیا۔ ارے حیرت ہے کہ تم مر گئے اور میں ابھی تک جی رہا ہوں ؎

پس از معشوق جینا، عشق کو بدنام کرنا ہے
خدا مجنوں کو بخشے مر گیا اور ہم کو مرنا ہے

رفیع احمد خاں

میرے آبائے اوّلین کے چند روزہ وطن فرخ آباد کے پٹھان، تمام دنیا کے فحش نگاروں کے سلطان علی گڑھ کے گولڈ میڈلسٹ ایم اے، متعدد کالجوں کے پروفیسر، آخری دور میں لکھنؤ کوآپریٹو سوسائٹی کے سکریٹری متوسط القامت، شگفتہ پیشانی، تاش استاد، سدا بشاش، چوک رسیا، یلدز معتوب، شہر محبوب، جوانی میں اھرمن پرستار، زوال جوانی میں طوالئف گرفتار، مرنجان مرنج قسم کے دل موہ لینے والے انسان تھے۔

ان کا مکان میرزا عالمگیر قدر کے مکان کے عین سامنے، امین آباد سے بہت قریب اس سڑک پر تھا جس کو اب "گوئن روڈ" کہا جاتا ہے۔ میں اپنے زمانۂ تعلیم میں ان کے مکان کے بالکل قریب راجا ابوجعفر صاحب کی کوٹھی "جعفر منزل" میں رہتا تھا، اس لئے میرزا عالمگیر قدر، وہ اور میں ایک ایسا تگڈم بن گئے تھے جس کو ہمیشہ یک جا پایا جاتا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہم لوگ یوسف مرزا، ابرار، اور شوکت تھانوی کو ہم راہ لیکر شام ہوتے ہی لکھنؤ کی خاص خاص جوانی مدائے پر اسرار دُھر دار گلیوں میں بسلسلۂ "تلاشِ معاش"[1] گھوما کرتے تھے۔ اور دیکھے وقت ہمارے جاں نثار کارندے اس بات کی ٹوہ لینے نکل جایا کرتے تھے کہ کن کن بوڑھوں نے دوسری یا تیسری رچائی ہے۔ ہم ان بوڑھوں کی فہرست طیار کر کے مختلف ذرائع اور مختلف و مشترک احباب کی وساطت سے ان بوڑھوں کے پاس جاتے، ان پر اپنی پارسائی و دین داری کے سکّے بٹھاتے تھے ان کی نظروں میں سماتے، ان سے پینگ بڑھاتے، اور اس طرح آخر کار ان کی بے آب و گیاہ دلھنوں تک آتے جاتے تھے۔

ان کے باپ کا نام تھا شفیع احمد خاں، ان کی عقل آواز اور گردن بہت موٹی تھی داڑھی بجد ڈراؤنی

---

[1] یہ ہماری چنڈال چوکڑی کی خاص اصطلاح تھی۔ جس کے معنی تھے، بہ جستجوئے لالہ رخاں۔

تھی۔ صبح جب وہ اپنی بھیانک آواز میں تلاوت کرتے تھے، تو میرے کمرے تک اس کی خوفناک گونج آیا کرتی تھی۔ اور میں یہ شعر پڑھا کرتا تھا[۱]

گر تو قرآن بدیں نمط خوانی
ببری رونقِ مسلمانی

خدا کی قسم ان کے گلے سے الفاظ اس طرح ٹھوکر مارتے نکلتے تھے، گویا وہ ڈوبتے ستاروں کو ماں بہن کی گالیاں دے رہے ہیں — ان کو رفیع سے بیحد نفرت تھی۔ میں نے آج تک دنیا کے کسی باپ کو اس قدر نامہربان نہیں دیکھا۔ رفیع نے ایک دن مجھ سے پوچھا تھا کہ بیٹا خراب نکل جاتا ہے تو اسکو "ناخلف" کہتے ہیں، شبیر یہ تو بتاؤ کہ باپ خراب نکل جائے تو اسے کیا کہیں گے، اور میں نے کہا تھا "ناسلف"۔ جب میری پہلی تصنیف "روحِ ادب" نکلی تھی، اس پر رفیع نے مقدمہ لکھا تھا، تو وہ "گلِ رعنا" کے مصنف حکیم عبدالحی صاحب کے پاس اسکو لیکر گئے تھے اور کہا تھا "یہ دیکھیے ایک بدمعاش کی کتاب پر دوسرے بدمعاش نے مقدمہ لکھا ہے۔ چور کا بھائی گرہ کٹ — اور سچی بات تو یہ ہے کہ انھیں ہم سے نفرت کرنا ہی چاہیے تھا۔ اس لیے کہ وہ بے حد کٹر تنگ ملّا تھے، اور ہم سب لوگ بے حد آزادہ رو اور ان کے نقطۂ نظر سے پرلے درجے کے اوباش تھے۔

ایک بار رفیع احمد خاں کے ایک رشتے کے چچا نے ان سے کہا، دس بارہ برس ہو چکے ہیں تمھاری شادی کو، اب تک کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا ہے، شاید تمھاری بیوی بانجھ ہے، تم دوسری شادی کر لو نہیں تو نسل منقطع ہو کر رہ جائے گی۔

اس کے جواب میں انھوں نے چچا سے کہا "اگر آپ اجازت دیں تو میں کوٹھے پر جا کر وہاں سے اس کا جواب دوں۔" چچا نے کہا کوٹھے سے جواب کا کیا تعلق ہے۔ انھوں نے کہا پٹنے سے بچ جاؤں گا، یہ کہہ کر وہ کوٹھے پر دوڑ کر چڑھ گئے، اور وہاں سے پکار کر کہا چچا جان، میں مر جاؤں گا، لیکن بچے کا باپ نہیں بنوں گا۔ چچا آپ کو معلوم ہماری نسل کس قدر شقی ہے، اور میں چاہتا ہوں کہ اشقیاء کی یہ نسل ہمیشہ کے واسطے منقطع ہو کر رہ جائے۔
چچا نے کہا تو بڑا امرد ہے، انھوں نے کہا تو کیا اپنے سے بھی بڑا امرد دو اور پیدا کر دوں؟

ایک بار خدا کے وجود کی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ رفیع احمد خاں بڑے سکون کے ساتھ سن رہے تھے لیکن وہ بحث جب اس جانب مڑی کہ خدا کے وجود کے ہزاروں مسکت دلائل تو ضرور موجود ہیں لیکن منطقی دلیل ایک بھی نہیں، تو انھوں نے میز پر گھونسا مار کر کہا — "شٹ اپ (خاموش)، میرے پاس وجود باری کی شافی و منطقی دلیل نہ سہی، لیکن ایک دلیل ایسی ہے جو منکرین و متشککین کی کھوپڑیاں توڑ کر رکھ دے سکتی ہے، اور اس دلیل کا نام ہے دلیل "ڈنڈاوی"۔ مجاز نے کہا تو کیا ہمارے سروں پر ڈنڈا مار

---

[۱] دیکھیے میری نظم: ۔ یہ داستان ہے جب کی: جس وقت ہم جوان تھے۔

آپ خدا کے وجود کو ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ — رفیع نے جواب دیا نہیں، ایسا نہیں کروں گا بلکہ آپ حضرات کی خدمت میں دست بستہ عرض کروں گا کہ آپ تمام حضرات اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ یہ خاکسار نہایت عمدہ سمجھ بوجھ کا آدمی ہے، صحت کے اعتبار سے بھی ہزاروں سے بہتر ہے، صورت بھی شریفوں کی سی ہے، مطالعہ بھی بہت اچھا ہے اور ان تمام اوصاف کے ساتھ ساتھ، یہ قادری ایم لے اور گولڈ میڈلسٹ بھی ہے، اور اسکے دوش بدوش، قادری کی لیاقت کو تسلیم کر کے اسے متعدد کالجوں میں پروفیسری کے عہدے بھی بارہا دیے جا چکے ہیں۔ لیکن تھوڑے ہی دن بعد اس ناچیز کو ہر کالج سے نکال دیا جاتا ہے، اور ان تمام حالات پر نگاہ کر کے میں آپ تمام حضرات سے یہ دریافت کرتا ہوں کہ اگر خدا موجود نہیں ہے، تو پھر یہ ڈنڈا کس کا ہے جو رفیع احمد خاں کی...... میں گھسا ہوا ہے؟ اور یہ ناچیز رفیع احمد خاں جس صوبے میں بھی جاتا ہے وہ غیبی ڈنڈا اس کے گھسا ہوا قطع منازل کرتا رہتا ہے جس سے یہ بات ماننا پڑتی ہے کہ وہ ہے اور ضرور ہے اور لگے ہاتھوں یہ بات بھی پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے کہ صرف موجود ہی نہیں، بلکہ حاضر و ناظر بھی ہے۔ اب بولو ملونو!!

وہ فحش نگاروں کے بادشاہ تھے، یاروں نے جسم انسانی کے اعضائے عورت کے نام لینے کو فحش نگاری سمجھ رکھا ہے، ان کو نہیں معلوم کہ صرف گالی بک دینے یا پوشیدہ اعضاء کے نام نظم کر دینے سے کام نہیں چلتا۔ فحش نگاری میں بھی سنجیدہ شاعری کی سی لیاقت و صلاحیت کا موجود ہونا اشد ضروری ہے۔ انھوں نے فحش نگاری کو جو ادب عالی کا جو مقام بخشا تھا، اور اس میں جو شریفیت پیدا کی تھی وہ شیخ سعدی اور ملا عبید زاکانی کے درجے کی چیز تھی، اور بعض اوقات تو وہ ان دونوں سے بھی آگے بڑھ جاتے تھے افسوس کہ میری قوم میں ابھی تک "مرد ابن" نہیں پیدا ہوا ہے، ورنہ میں ان کے فحش اشعار نقل کر کے اپنے دعوے کو مدلل کر دیتا۔ ان کی رگ رگ میں ایسی شوخی بھری ہوئی تھی کہ وہ ایک لمحے سنجیدگی کا بار بھی نہیں اٹھا سکتے تھے۔

ایک رات کو، لکھنؤ کی گلیوں میں انھوں نے، ایک "جلوس خرام و دشنام" نکالا تھا، اس کا ماجرا بھی سن لیجے۔ ایک دن رات کے دو بجے "گانا سن کر جب ہم سب چوک سے نکلے" انھوں نے کہا، میں نے یہ بات طے کی ہے کہ چوک سے امین آباد تک بلنے والوں کے جتنے بھی مکان پڑیں گے، تانگے روک روک کر اور آوازیں بدل بدل کر ان تمام مکان والوں سے مذاق کروں اور گالیاں دوں گا۔ میں نے کہا "رفیع، یہ بات آداب شرفاء کے خلاف ہے،" انھوں نے کہا "ایسی تیسی آداب شرفاء کی سب سے پہلے میرزا محمد ہادی رسوا صاحب[1] (امراؤ جان ادا) کا مکان پڑا۔ ان کے مکان کے نیچے تانگے روک دیے گئے۔ میں نے کہا دیکھو رفیع ان کو گالی نہ دینا یہ میرے استاد ہیں؛ انھوں نے کہا، اگر تم چپ نہیں رہو گے تو تمھارا نام لیکر انکو گالی دوں گا۔ میں خاموش ہو گیا۔

---

[1] میرزا صاحب بالاخانے پر رہتے تھے

انھوں نے تانگے سے اتر کر آوازیں لگانا شروع کر دیں: "میرزا صاحب، میرزا صاحب، جناب میرزا صاحب، جناب میرزا صاحب، جناب میرزا محمد ہادی صاحب قبلہ" دس پانچ ہانکوں کے بعد میرزا صاحب کی باریک سی آواز آئی۔ "کون صاحب ہیں؟" ان کی آواز سنتے ہی رفیع احمد نے کہا: "میں ہوں اُمراؤ جان ادا کا دھکڑ۔" میرزا صاحب کی آواز آئی: "کہیے، آئیں آئیں۔" انھوں نے کہا: "جناب میں نے سنا ہے کہ آپ نے اپنے کالج کے پرنسپل مسٹر میڈلی کا چھری سے کاٹ لیا ہے اور اسے گڑھے والی سرائے کے بینک میں فکس ڈپازٹ کے طور پر جمع فرما دیا ہے۔" یہ سنتے ہی میرزا صاحب نے اپنے ملازم سے پکار کر کہا: "رمضانی، ذرا چھجے سے جھانک کر دیکھ تو یہ کون بدمعاش بیہودگی کر رہا ہے۔" اتنے میں ہمارے تانگے حرکت میں آ گئے اور رمضانی کی آواز آئی: "حضور وہ تو تانگوں میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ پیر بخارا کے شہدے ہوں گے سرکار۔" اس کے بعد دو تین اور مقامات پر گالیاں دیتا اور مذاق کرتا، یہ فحاشی جلوس جب امین آباد پہنچا، تو پرنس ہوٹل کے نیچے کھڑے ہو کر انھوں نے ہانک لگائی: "جناب تصدق حسین صاحب، جناب قرار صاحب، جناب قرار صاحب، جناب تصدق حسین صاحب قرار۔" اوپر سے آواز آئی: "کون پکار رہا ہے؟" انھوں نے کہا: "میں نے سنا ہے کہ آپ کا لغت 'قرار اللغات' اپنے تمام الفاظ کی پلٹن لیکر آپ کی والدہ کی ...... میں داخل ہو گیا ہے۔" آواز آئی: "لاحول ولاقوۃ، یہ کون بیہودہ آدمی ہے، بدتمیز کہیں کا۔" اور ہم آگے بڑھ گئے۔ اب سید جالب صاحب دہلوی مدیر "ہمدم" کے مکان پر جا کر انھوں نے پکارا: "جناب سید جالب صاحب دہلوی ــــ جالب صاحب، جالب صاحب، اے جناب جالب۔" تھوڑی دیر میں ایک نہایت جلی ہوئی آواز آئی: "کون ہے؟ کون ہے؟" انھوں نے کہا: "جناب عالی، در دولت پر اس قدر عرض کرنے حاضر ہوا ہوں کہ اے حضرت جالب صاحب دہلوی مدظلہ، آپ کی نواں کا ...... " اندر سے آواز آئی: "اُوف، اُوف، اوف، اوف۔" اور ہم گھر جا کر سو رہے۔

صبح جب رفیع احمد خاں، ہم لوگوں کے ساتھ لیکر، ایک نہایت شریف و مہذب انسان کے مانند، اپنے دشنام دیدگان شبانہ کے پاس، ایک ایک کر کے پہنچے۔ کسی نے پچھلی رات کے واقعے کا ذکر نہیں کیا، البتہ جب ہم سید جالب کے پاس پہنچے تو انھوں نے اپنے مخصوص لہجے میں فرمایا: "جوش صاحب، جس لکھنؤ کی تہذیب کے ڈنکے بجتے ہوئے تھے اب اس کی یہ گت بن چکی ہے کہ کل رات کے تین چار بجے ایک شخص نے زور زور سے مجھے آواز دی اور جب میں نے ڈانٹ کر پوچھا: کون ہے؟ تو وہ گنڈا، میری والدہ معظمہ کی شان میں گستاخی کر کے بھاگ کھڑا ہوا۔" جالب صاحب کا یہ فقرہ سن کر، رفیع کو اس قدر ہنسی آئی کہ اس کے ضبط کرنے میں ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ آنکھیں ابل پڑیں، ان کی ٹھڈی کانپنے اور ان کے دونوں گال پر تولنے والی چڑیا کے مانند، پھڑ پھڑانے لگے۔

ص لکھنؤ کی ایک رنڈیوں کی سرائے۔

پرنس میرزا عالمگیر قدر

خاندان تیمور کی یادگار، لکھنؤ کے باشندہ، باوقار، کچھ اوپر چالیس برس سے ضیق النفس میں گرفتار، بھرکھی آواز بلا کی، پاٹ دار، زود اشتعال، دشرارہ باز، میرے لڑکپن کے یار، موسیقی دمزامیر کے ماہر، اسرار کھانا پکانے میں یکتائے روزگار، سخن سنجوں کے شہریار، اور معلوماتِ عامہ کے بردرگار، سانولے رنگ اور بڑی بڑی آنکھوں کے، پوست استخوان اور کاغذی بدن کے آدمی۔

ان کے دادا جان کو میں نے لڑکپن میں دیکھا تھا۔ اللہ اللہ ان کا جاہ وجلال۔ وہ صبح شام ایک وقت معین پر کوٹھے کی بالائی منزل سے اتر کر ایسے وقار کے ساتھ حویلی میں جاتے تھے کہ مجھے اپنے دادا کی سلطان خرامی یاد آجاتی تھی۔ اور ان کو اس قدر اعزاز حاصل تھا کہ گورنر جنرل تک ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔

گوئن روڈ پر، بیرسٹر رفیع احمد خاں کے مکان کے عین بالمقابل ان کی عالی شان حویلی[1] تھی۔ حویلی کے پہلو میں ایک دو منزلہ کوٹھی تھی۔ اور پشت پر بڑا سا پائیں باغ تھا۔ اور یہ جو امین الدولہ پارک کے آخری گوشے میں سنٹرل ہوٹل کی دو منزلہ عمارت کھڑی ہوئی ہے وہ انھیں کے پائیں باغ کو قطع کر کے تعمیر کی گئی ہے۔

وہ اسقدر سخن سنج ہیں کہ شعر سنتے ہی اس کے تمام محاسن و معائب کا احاطہ کر لیتے ہیں، اور بعض اوقات تو شعر میں ایسے معنی پیدا کر دیتے ہیں کہ شاعر دنگ ہو کر رہ جاتا ہے کہ ارے یہ معنی کہاں سے نکل آئے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کھانا پکانے میں بھی ایسی دست گاہ رکھتے ہیں کہ بڑے بڑے رکاب دار ان کے سامنے کان پکڑتے ہیں۔ کشمیری چائے ایسی بناتے ہیں کہ باشندگانِ کشمیر حیران ہو جاتے ہیں۔ اور طبلہ ایسا بجاتے ہیں کہ بڑے بڑے طبلچی ان کا منھ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ لیکن مغلوب الغضب اس قدر ہیں کہ ذرا سے مذاق پر جامے سے باہر ہو جاتے

---

[1] افسوس کہ ان کے بڑے بھائی میرزا جہانگیر قدر نے، وہ جائداد جس کی قیمت اس دورِ ارزانی میں پانچ چھ لاکھ سے کم نہیں تھی، اپنی ڈپٹی کلکٹری کے شہرہ آفاق دورِ عیاشی میں اونے پونے بیچ کر خاندانی امتیاز امارت کو برباد کر ڈالا تھا۔ اس حویلی میں رہنے والے میرزا عالمگیر قدر اب ڈرگ کالونی کے ایک چھوٹے سے بھنچے ہوئے مکان میں تنہا رہتے ہیں۔ ہائے کیا پلٹا کھایا ہے روزگار نے ——— ہائے کس قدر ہر آن بشاش رہنے والے چہرے اب مستقل طور پر اداس رہنے لگے ہیں۔

بنیاد اور بدگمانی کا یہ عالم ہے کہ ایک سیدھی سی بات کو پُرپیچ و خم سمجھ کر ترک تعلق کر لیتے ہیں۔ اور دل اتنا اچھا ہے کہ کچھ روز روٹھے رہنے کے بعد پھر خود بخود من جاتے ہیں۔

اب رہا ان کے معلومات عامہ کا مسئلہ۔ سو اس باب میں اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ میرزا صاحب کو کیا کیا آتا ہے، تو میں ان سے کہوں گا یہ پوچھ کہ اس عالم کون و فساد میں وہ کون ایک ایسی بات ہے جو انکو نہیں آتی ؎

ہر فن میں ہوں استاد مجھے کیا نہیں آتا

جناب والا تفسیر، حدیث، منطق، فلسفہ، ہیئت، ادب، موسیقی، نقاشی، ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، اور طب یونانی کے سے بے شمار گمبھیر علوم کے دروش بدوش ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ بٹیر کا شکار کیوں کر کھیلا جاتا ہے، کون کون سی پیٹنٹ دوائیں کن کن امراض کے واسطے مخصوص ہیں، موٹر کا کون پرزہ کہاں مل سکتا ہے اور ریلوں اور ہوائی جہازوں کے اوقات کیا ہیں ـــــ اجی آپ میرزا صاحب کو کیا سمجھتے ہیں، کان کھول کر سن لیجئے کہ اس کرۂ ارض پر معلومات عامہ کا اس قدر بڑا کباڑی اور کوئی موجود ہی نہیں ہے۔

بس یہ سمجھ لیجئے کہ جہاں تک کہ جہاں علم و آگاہی کا سوال ہے، آسمان پر خدائے قدیر ہے اور زمین پر میرزا عالمگیر ہاں وہ عرش پر علام الغیوب ہے۔ یہ فرش پر علام الشہود ہیں۔ یعنی ؎

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

میرے دورِ طفلی و شباب میں سے اب صرف میرزا ہی باقی رہ گئے ہیں، وہ مجھے یاد دلاتے ہیں کہ میں کس قدر نازک اندام و حسین تھا اور جب میں نے جرنیلی ٹوپی کج کر کے اور سیاہ شیروانی پہن کر دونین سپاہیوں کو جلو میں لے امین آباد پارک میں، اپنا سونے کا ڈنڈا ہلا ہلا کر ٹہلا کرتا تھا، تو میری سیاہ شیروانی پر میری گھڑی کی سنہری زنجیر ایسی لگتی تھی، جیسے کالے بادل میں بجلی چمک رہی ہے۔

میری محراب زندگی میں یہ میرزا ہی ایک دیا باقی رہ گیا، اگر یہ بھی بجھ گیا تو میں اندھیرے میں دفن ہو کر رہ جاؤں گا۔ میرزا مجھ کو مار کے مرنا!

مولانا صہبا بھوپالی

وہ اس قدر طفل قامت تھے کہ ان کے روبرو ٹھنگنے اور زیادہ دبتے ہوئے قد کے آدمی بھی بلغم باعور یا بالے میاں کی چھڑ نظر آتے تھے۔ جب ان کو "مولانا صہبا" کے نام سے پکارا جاتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی ننھے سے بچے کو "مولانا تاڑ" کہا جا رہا ہے۔

لیکن ان کی ذراسی جان میں قدرت نے علم وادب کی ایک کثیر مقدار کو اسطرح فشار دے کر بند کیا تھا۔ جسطرح ایک چھوٹے سے ٹین کے ڈبے میں تیس چالیس مچھلیاں منقبض کر کے تلے اوپر بند کردی جاتی ہیں۔ معلوم نہیں کس بنا پر ان کو "مجددی" کہا جاتا تھا۔ لیکن ان کی لیاقت کا میں دل سے قائل ہوں۔ جب وہ کسی علمی یا ادبی مسئلے پر باتیں کرتے تھے، تو پتا چلتا تھا کہ وہ کس قدر وسیع المطالعہ ہیں۔ وہ پرانے رنگ کے شاعر اور نئے مزاج کے نقاد بھی تھے۔ اور اس کوتاہ قامتی کے باوجود حسینوں پر بے ساختہ دست درازی کرنا انکا محبوب مشغلہ تھا۔

وہ عورت اور شراب کے اس قدر رسیا تھے کہ دونوں کی بو پا کر دوڑ پڑتے تھے۔ ان بیچارے کی عمر کا زیادہ حصہ افلاس میں گزرا لیکن امیروں کے آستانوں پر کبھی نہیں جھکے امیروں کے در پر جھکنا تو درکنار، وہ انھیں ان کے منہ پر بڑی روانی کے ساتھ گالیاں بھی دے بیٹھتے تھے۔ ایک روز ایک راجہ صاحب کے وہاں ڈرنک اور ڈنر کی دعوت تھی ــــ جب سہا صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو راجہ صاحب نے ایک دوسرے راجہ صاحب سے ان کا تعارف کرایا۔ ان راجہ صاحب نے بیٹھے بیٹھے مصافحے کے واسطے ہاتھ بڑھا دیا اور انھوں نے ان کو موٹی سی گالی دے کر کہا "ابے سالے بدتمیز شاعروں سے بیٹھے بیٹھے ہاتھ ملاتا ہے۔ ان راجہ صاحب کا رنگ ہلدی کا سا ہو گیا ــــ میزبان راجہ صاحب نے جھٹ سے ان کو گود میں اٹھا کر کہا "آپ نے میری ناک کاٹ ڈالی، کہیں، شرفا بھی گالیاں دیتے ہیں۔ سہا نے ان کی گود میں بیٹھے ہوئے کہا راجہ صاحب کیا آپ ناصح مشفق کا پارٹ ادا کر رہے ہیں، راجہ صاحب نے کہا یہی سمجھ لیجئے۔ سہا صاحب نے کہا ناصح مشفق کی بھی ماں کا...... راجہ نے گھبرا کر ان کو گود سے اتار دیا اور وہ بچوں کی طرح کھٹ کھٹ کرتے کمرے سے نکل گئے۔

وہ اختری فیض آبادی پر مرتے تھے، دونوں کا مکان لال باغ میں تھا، اور میں ان دونوں کے قریب بنارسی باغ کے سامنے رہتا تھا۔ وہ دوسرے تیسرے دن میرے پاس آتے مجھ کو اختری کے وہاں لے جاتے اور بچوں کی طرح اس کی گود میں بیٹھ کر "سرکار ــــ ایک پیار" کی درخواست کیا کرتے تھے۔

ایک شام کو وہ حسب معمول، اختری کی گود میں بیٹھے پیار مانگ اور شراب پی رہے تھے کہ اختری کی ماں نے کہا مولانا آپ جانتے ہیں، اختری نواب صاحب رام پور کی سرکار میں ملازم ہے اور ان کے سکریٹری صاحب یہیں ٹھیرے ہوئے ہیں، آپ اختری کی گود سے اتر آیئے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دیکھ لیں۔ یہ سنتے ہی انھوں نے بگڑ کر کہا، نواب رام پور کی تو ماں کا......" اختری کی ماں نے اپنا منہ پیٹ لیا ــ اور اختری نے ان سے کہا مولانا یہ بہت بری بات ہے۔ اس پر انھوں نے بے ساختہ کہا، اچھا تو، پھر تو سرکار کی بھی ماں کا۔

اور تو اور، وہ بیوی بیگم کو بھی گالیاں دے بیٹھتے تھے، اور ان کی بیگم ان کو ایک اونچے سے طاق یا مچان پر بٹھا کر گھر کے دھندوں میں لگ جاتی تھیں اور مولانا اوپر سے چیختے رہتے تھے کہ خدا کے لئے مجھے اتار دو اب گالی نہیں بکوں گا۔

ایک روز بنارسی باغ والے مکان میں وہ میرے پاس آئے۔ شام کا وقت تھا دور چلنے لگا۔ انھوں نے رباعیوں کی فرمائش کی' میں رباعیاں سنانے لگا۔ ان کو میری ناچیز رباعیاں اس قدر پسند آئیں کہ دس پانچ رباعیوں کے بعد انھوں نے کہا۔ جوش صاحب آپ کے سامنے تمام ہندوستان کی شاعروں کی تو ماں کا..... اور سناؤ۔ اتنے میں کسی نے' ایک نہایت نام ور شاعر کا نام لیکر پوچھا' کیا ان کی بھی ماں کا؟ انھوں نے ہاتھ بلند کرکے کہا' نہیں ان کو شامل نہیں کر رہا ہوں' جب دس بیس رباعیاں اور سن چکے تو اس مستثنیٰ شاعر کا نام لے کر کہا۔ ان کی بھی ماں کا......' اور جب چند رباعیاں میں نے اور پڑھیں تو بے قابو ہو کر انھوں نے بہت زور سے کہا' اب تو مولانا سہا مجددی کی بھی ماں کا......'

ایک رات کو ہم لوگ چوک گئے گانے سننے کے لئے مجاز' ایک دکان پر پان کھانے کے لئے ٹھہر گئے' سامنے ایک پٹاخا سی چھوکری چھجے پر کھڑی ہوئی تھی' انھوں نے کہا سب سے پہلے اسکی بانگی دیکھیں گے' کچھ تو پان بننے میں دیر ہوئی' اور ایک صاحب جو مجھے دیکھ کر رک گئے تھے' ان سے باتیں کرنے میں وقت صرف ہو گیا۔ اب ہم فارغ ہوئے تو دیکھا کہ سہا صاحب غائب ہو چکے ہیں اور بالاخانے سے آوازیں آرہی ہیں' اے امی جان دوڑیے کوئی بھوت آکر مجھ سے چمٹ گیا ہے' ہائے اللہ' ہائے اللہ' ہائے اللہ'۔ میں نے مجاز سے کہا ہو نہ ہو سہا صاحب اوپر چڑھ گئے ہیں' اور جب ہم اوپر پہنچے تو دیکھا کہ اس چھوکری کی کمر سے لپٹے ہوئے' ایک بوسہ' ایک بوسہ' ایک بوسہ' کی درخواست کر رہے ہیں' اور وہ چھوکری اور اس کی ماں دونوں تھر تھر کانپ رہے ہیں۔

غالباً یہ سنہ ۱۹۳۱ء کی بات ہے کہ ایک روز وہ مجھے بمبئی میں مل گئے اور دوڑ کر لپٹ گئے' میں نے پوچھا' یہاں کیسے آنا ہوا؟ انھوں نے کہا لوہے کے کاروبار کے سلسلے میں آیا ہوں۔ میں نے کہا اللہ اللہ یہ موم کا پتلا اور لوہے کا کاروبار۔ کہنے لگے' میں نہیں میرا ایک ساتھی کام کرے گا۔ میں ان کو گھر لے آیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد انھوں نے کہا۔۔ جوش اللہ نے مجھ پر بڑا فضل کیا ہے' ایک تو یہ دھندا ہاتھ آگیا ہے جس سے بھوجن چلے گا اور اسی بھوجن کے ساتھ رحمت الٰہی نے میرے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کا بھی معقول بندوبست کر دیا ہے اور ایک ایسی چاند سی بیوی دے دی ہے کہ چراغ گل ہو جانے کے بعد اس کا مکھڑا اور بھی دمک اٹھتا ہے اور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اللہ نے یہ فضل کیوں کیا ہے؟۔ میں نے کہا آپ بتائیں! انھوں نے کہا' وسکی اور برانڈی کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ البتہ وائین کی دو اور بیئر کی چار بوتلیں روز شام کو پی لیتا ہوں۔۔ میں نے کہا' واقعی اسے کہتے ہیں'۔ توبتہ النصوح۔

شام ہوتے ہی میں نے وائین اور بیئر کا بندوبست کر دیا۔ وہ پی کر غسل خانے چلے گئے۔ دس پانچ منٹ تک تو میں نے انتظار کیا اور جب وہ نہیں آئے تو غسل خانے کے دروازے پر دستک دی' دستک دیتے ہی دروازہ کھل گیا اور یہ سماں دیکھ کر حیران ہو گیا کہ وہ فلش کے چبوترے پر چاروں خانے چت پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔

ایک بار یہ سن کر کہ وہ بہت سخت بیمار ہیں، میں بھوپال گیا، ان کو خیراتی وارڈ میں دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے، سیدھا نواب صاحب بھوپال کے پاس پہنچا، ان کو غیرت دلائی کہ ان کے بھوپال کی اتنی بڑی شخصیت خیراتی وارڈ میں دم توڑ رہی ہے، انھوں نے فوراً کسی افسر کو بلا کر حکم دیا کہ سہا صاحب کو ایک پرائیویٹ وارڈ میں رکھ کر سرکار کی طرف سے ان کا علاج کیا جائے۔ مگر بعد کو معلوم ہوا کہ دفتری کارروائیوں کی بنا پر، اس قدر دیر میں حکم نامہ جاری ہوا کہ جب ایک دروازے سے ان کے علاج کا حکم نامہ آیا تو دوسرے دروازے سے ان کی لاش باہر جا رہی تھی۔۔۔ فردوسی کا سانحہ یاد آ گیا ؎

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا،

ڈاکٹر ایس، کے سکسینہ

نہ دبلے، نہ دھم دھو سنڈ، مزاج میں ذرا سی گڑبڑ، چہرے کا، ملگجا سا گونگا رنگ، لہجے میں بجتا چنگ۔ بد مزاج بیوی کے صید زبوں، وہ ظالم بیلی، یہ مظلوم مجنوں۔ آنکھیں، ذہانت سے ضیاء بار، معقولات کے علمبردار فلسفے کا افتخار، منطق کا ذخار، کاہلی کے پرستار، اور بزدلی کے مہا اوتار۔

۱۹۳۸ء میں جب میں، محکمۂ اطلاعات عامہ کے تین رسالوں "آج کل" "بساطِ عالم" اور "کشمیر" کا مدیر تھا، وہ ہندو کالج میں فلسفے کے صدرِ شعبہ تھے۔ اُس وقت کے چیف کمشنر شنکر پرشاد، آئی سی ایس ان کے بڑے پرانے دوست ہیں، اور انھوں ہی نے مجھ کو ان سے ملوایا تھا۔ اس کے بعد پھر وہ میرے دفتر میں ڈپٹی ڈائرکٹر ہو گئے تھے، اور ہر وقت میری ان کی ملاقات ہوا کرتی تھی۔ اب "جودھپور" "یونیورسٹی" میں فلسفے کے پروفیسر ہیں۔ کبھی کبھی دہلی آتے جاتے رہتے ہیں۔ اب کی ۱۹۶۷ء میں دہلی گیا تھا، اتفاق سے وہ آئے ہوئے تھے۔ بہت سی ملاقاتیں ہوئیں۔ میں نے کہا "ہلو لو، لو، لو، میں لو، لو ہو نے گئے ہو" وہ بہت ہنسے، بیوی آ گئیں، ہنسی نے دم توڑ دیا۔

کاہلی اور بزدلی کے علاوہ میرے ان کے مزاج میں، تقریباً سو فی صد اشتراک پایا جاتا ہے۔ مزاج کے ساتھ ساتھ، کائناتی مسائل میں بھی ہم دونوں کے جادۂ فکر میں، یک سرِ مو فرق نہیں ہے۔ اور، بفضلہٖ ہم دونوں وہ ہیں جن کو اوہام پرستوں اور عقل دشمنوں کے حلقے میں "کافر" کہا جاتا ہے۔

وہ ہندوؤں کی حماقت کا رونا روتے ہیں، میں مسلمانوں کی بے عقلی پر آنسو بہاتا ہوں، اور پھر ہم دونوں مل کر، ہندوؤں، مسلمانوں، یہودیوں، عیسائیوں، بودھیوں، سکھوں، اور جینیوں کی زبوں اندیشیوں پر ماتم کرتے ہیں۔ اب ان کی بالیں پرست کاہلی کا ایک واقعہ سن لیجیے۔ میرے صد ہا تقاضوں کے بعد، آخر

کاؤ وہ اس بات پر رضامند ہو گئے کہ کل سے وہ میرے ساتھ صبح کو ٹہلا کریں گے۔

چنانچہ دوسرے ہی دن، صبح کو، میں ان کے گھر پہنچا۔ ان کو جگایا۔ وہ بستر سے اٹھے۔ بڑی بے کسی کے ساتھ مجھے دیکھا، چارپائی سے اٹھ کر غسل خانے کی طرف چلے، قدم اس طرح رکھتے گویا وہ آندھی کے جھکڑ میں پہاڑ پر چڑھ رہے ہیں اور ٹانگیں دامنوں کے مانند ہواؤں میں اڑ رہی ہیں۔ غسل خانے سے نکلے تو چارپائی پر کراہ کر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا ان نخروں میں ذکر ان پھوٹ جائے گی اور دھندے کا سہاگ ہی الٹ جائے گا۔ انھوں نے بڑی بے چارگی سے تھکی آواز میں کہا، چلتے ہیں، یہ کہہ کر وہ منہ بناتے اٹھے، پھاٹک پر آئے اور سر کھجا کھجا کر باتیں کرنے لگے۔ میں نے کہا راستے میں باتیں کرتے چلیں گے۔ انھوں نے کہا پھر کیسے ممکن ہے، پاؤں کھلیں گے تو زبان بند ہو جائے گی۔ میں نے کہا اور جھلا کر کہا، ارے بھائی چلنا ہو تو چلیے، ورنہ سورج نکل آئے گا۔

انھوں نے کہا دراصل بات یہ ہے کہ پرماتما نے ٹانگیں فقط اس لیے دی ہیں کہ یہ ہم کو غسل خانے تک پہنچا دیں، اور دفتر جانا ہو تو پھاٹک تک لے جا کر سواری میں بٹھا دیں۔ یہ ٹانگیں ہم کو اس لیے نہیں دی گئی ہیں کہ ہم خاک چھانتے مارے مارے گھومتے پھریں۔ سنو، ہماری بہترین ٹہل یہ ہے کہ ہم دونوں پاؤں پھیلائے بستر پر چوبیس گھنٹے لیٹے رہیں۔ میں نے کہا مجھ سے ٹہلنے کا وعدہ کیوں کیا تھا، انھوں نے کہا اسے یار آپ کے آنے، اور اپنے وعدے کا یہاں تک تو احترام کر دیا کہ بستر سے اٹھ کر ان لوگوں سے قطعی مختلف ہو گیا جو بستروں پر پڑے رہتے ہیں۔ حالانکہ آپ کی خاطر میں نے اپنے کو جن لوگوں سے مختلف بنا لیا ہے، وہ ہم دونوں سے بہت اچھے ہیں اور میں وہاں سے اپنا سا منہ لے کر ٹہلنے چلا گیا، اور عہد کر لیا کہ اب سکسینہ کے پاس صبح کے وقت کبھی نہیں جاؤں گا۔

ایک روز میں ان کے گھر گیا، کہا آئیے قطب چلیں۔ انھوں نے کہا ٹھیک، جاؤں گا۔ میں نے کہا ارے موٹر سے جانا ہے، انھوں نے، بات کاٹ کر کہا، آپ بات سمجھتے نہیں، میل دو میل جانا ہو تو کوئی بات نہیں، سوا میل تو میل میں جو لیں ہل جائیں گی اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ "دل نہیں ہے آج تو مائل سفر"۔ میں نے کہا یہ "مائل سفر" کیا چیز ہوتی ہے، انھوں نے جواب دیا اضافت، بریکٹ میں رکھ دی ہے۔

(ب) ان کی بزدلی کے، بہت سے واقعات میں سے دو واقعے سماعت فرمائیے۔

پہلا واقعہ انھیں کی زبان سے سن لیجیے (ہر لفظ تو یاد نہیں، مگر واقعہ سامنے آ جائے گا)

"جوش صاحب، کل ہم ناشتہ کر کے، برآمدے میں، بڑے آرام سے اخبار پڑھ رہے تھے کہ اتنے میں بیوی نے تیز تیز آواز میں کہا ادھر آؤ، ادھر آؤ، آپ جانتے ہیں کہ ہم بے حد بزدل ہیں اور ہمارا قول یہ ہے کہ: ہر دل میں تھوڑا سا بزدل چاہیے۔ بیوی کے اس گرم اور گھبرائے لہجے سے ہم ڈر گئے، کانپنے لگے۔ انھوں نے کہا میں کہہ رہی ہوں ادھر آؤ، ادھر آؤ، ہم کانپتی پنڈلیوں کے ساتھ جوتے پہنے بغیر، بیوی کے پیچھے پیچھے ہو لیے، اور ہر قدم پر دل بلیوں اچھلتا رہا کہ دیکھیے کیا چیز پیش آتی ہے۔ بیوی نے باورچی خانے کے دروازے پر ہم کو لے جا کر کھڑا کر دیا اور، اشارہ کر کے کہنے لگیں، دیکھو یہ چار برتن ٹوٹے پڑے ہیں، اگر باورچی اسی طرح دھوتا رہا تو ایک

برتن بھی گھر میں باقی نہیں رہے گا۔

یہ سن کر ہمارے حواس بجا ہو گئے کہ گھر میں کوئی حادثہ نہیں ہوا ہے۔ ہم نے باورچی کو بلا کر کہا ارے بابا! کان کھول کر یہ بات سن لو کہ تانبے اور پیتل کے برتن، چینی کے برتنوں سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور یہ بھی سن لو کہ نیچر کا یہ اٹل قانون ہے کہ جب قوی اور کم زور میں ٹکر ہوتی ہے تو کمزور ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لئے کل سے ایسا کرو کہ قوی برتنوں کو کمزور برتنوں سے ملا کر دھونا چھوڑ دو۔ جب یہ سمجھا کر ہم پھر اخبار پڑھنے لگے تو بیوی نے پیچھے سے آ کر ہماری پیٹھ پر اس زور سے دوہتڑ مارا کہ ہمارے منھ سے چیخ نکل گئی، اور ہم ہائے رام، ہائے رام، کرنے لگے۔ انھوں نے ہماری چیخ کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا کیا میں نے تم کو اس لئے ٹوٹے برتن دکھائے تھے کہ تم باورچی کے سامنے فلسفے پر لکچر بگھار کر باہر چلے آؤ۔

ہم نے کہا ارے پھر تم ہمارا ہاتھی کیا کتنیاں کہنے لگیں۔ ہم چاہتے تھے کہ تم نوکر کو مارو ہم نے کہا رام رام کیسی باتیں کر رہی ہو، ہم مار کیسے سکتے تھے۔ انھوں نے کہا کیا تمھارے ہاتھ ٹوٹ چکے ہیں؟

ہم نے کہا ارے بات سمجھنے کی تو کوشش کرو، کہیں خالی ہاتھ بھی کسی کو مار سکتے ہیں؟ انھوں نے کہا یہ خالی ہاتھ کی کیا بات کر رہے ہو؟ ہم نے کہا ارے بی بی! جب کھوپڑی میں غصہ بھر جاتا ہے تو کھوپڑی ہاتھ کو مارنے کا حکم دیتی ہے، ہماری کھوپڑی میں غصہ تھا ہی نہیں مارتے کیسے؟ اب سمجھیں۔

میں نے گھر آ کر یہ سارا واقعہ بیوی سے بتا دیا۔ شام کو سکینہ آئی تو انھوں نے کہا سکینہ صاحب سنتی ہوں کہ آپ کی بیوی بڑی پاجی ہے (اور میں نے دل ہی دل میں کہا اور تم کیا کم ہو) سکینہ نے جواب دیا کہ اس پاجی پن میں میری بیوی کا رتی بھر قصور نہیں ہے۔ اس میں تمام قصور ہے شادی کے رواج کا، بھابی، دراصل یہ میاں بیوی کا رشتہ ہی کمینہ ہوتا ہے۔ اور یہ جو کچھ ہوا وہ اسی کم بخت رشتے کا پاجی پن تھا اور جو کچھ بھی نہیں اور میری بیوی منھ پھلا کر اندر چلی گئی۔ بیوی کے اندر جاتے ہی انھوں نے مجھ سے کہا۔ اب ہمیں جانے دو میں نے کہا ابھی تو ایک پیگ باقی ہے، اور پھر کھانا بھی کھانا ہے انھوں نے کہا اب نہیں ٹھہروں گا، آپ کی بیوی بگڑ گئی ہیں ایسا نہ ہو مجھے دپیٹنے سے آ کر مارنے لگیں، میں نے بہت سمجھایا، لیکن وہ نہیں مانے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔

اب ان کی بزدلی کا دوسرا واقعہ بھی سن لیجئے۔ دہلی کے قدسیہ باغ میں ایک روز شام کے وقت ہم لوگ موٹر میں بیٹھے پی رہے تھے کہ گشتی پولیس کے دو آدمی ادھر آ نکلے اور ہم سے کہا آپ لوگ پبلک مقام پر شراب پی رہے ہیں تھانے چلئے، تھانے چلئے۔ تھانے کا نام سنتے ہی سکینہ کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ گیا۔

میں نے پولیس والوں سے ڈانٹ کر کہا ہم تھانے وانے نہیں جائیں گے ہماری گاڑی کا نمبر نوٹ کر کے ہماری رپورٹ کر دو۔ پولیس والے میرا منھ دیکھنے لگے۔ اور انھوں نے پھر آئی آواز بڑھبڑے ڈرائیور سے کہا۔ بہادر سنگھ! گاڑی اسٹارٹ کر دو۔ اور قدسیہ باغ کے پھاٹک سے نکل کر ہماری نے جب نئی دہلی کی طرف گاڑی موڑی،

تو انھوں نے کہا نہیں نہیں سیدھے چیف کمشنر کے وہاں لے چلو۔ میں نے کہا ہم تو انڈیا گیٹ جانے کیلئے نکلے تھے، اس وقت چیف کمشنر کے وہاں جانے کا کیا تک ہے۔ انھوں نے کہا اب انڈیا گیٹ نہیں جائیں گے۔ اس لئے کہ یہ پولیس ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔ میں نے کہا گھا نس کھا گئے ہو، پیدل پولیس والے موٹر کا تعاقب کرینگے۔ انھوں نے کہا یہ باتیں نہ کرو، پولیس سب کچھ کر سکتی ہے۔ ہماری گاڑی موڑ دو چیف کمشنر کی طرف۔ شنکر پرشاد صاحب چیف کمشنر کے وہاں جیسے ہی گاڑی رکی، وہ اس قدر زور سے کوٹھی کی طرف بھاگے کہ گرتے گرتے بچے۔ اور اندر جاکر انھوں نے چیف کمشنر سے کہا، شنکر پرشاد صاحب، خدا کے لئے ہم کو بچائیے۔ پولیس ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔ شنکر پرشاد نے حیران ہو کر پوچھا، معاملہ کیا ہے، میں نے قہقہہ مار کر، سارا ماجرا بیان کر دیا۔ وہ بھی ہنسنے لگے۔ ہم سب کو ہنستا دیکھ کر وہ جامے سے باہر ہو گئے اور کہنے لگے خطرناک موقع پر ہنستے نہیں ہیں، اس سے خطرہ اور قریب آجاتا ہے۔ شنکر پرشاد صاحب آپ فوراً چودھری (آئی جی) کو فون کر دیں کہ وہ ان دونوں پولیس والوں کو گرفتار کر لیں۔

شنکر پرشاد نے کہا ارے سکینہ کیسی باتیں کر رہے ہو، انھوں نے کہا یہ موقع مباحثے کا نہیں، پرماتما کا واسطہ ابھی فون کر دو۔ شنکر پرشاد نے فون کر کے آئی جی کو اپنے گھر بلا لیا اور ہنس ہنس کر سارا واقعہ بیان کر کے کہا چودھری صاحب ان کی تسلی کر دیجئے۔ چودھری نے ان کو لاکھ لاکھ سمجھایا کہ آپ فکر نہ کریں، میں ان پولیس والوں کو بخوبی تنبیہہ کر دوں گا۔ لیکن ان کا خوف کم نہیں ہوا۔ اس کے بعد وسکی کا دور چلنے لگا۔ اور گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جب ہم لوگ فارغ ہوئے تو میں نے کہا آئیے سکینہ صاحب آپ کو گھر پہنچا دوں، انھوں نے قہر کی نظر سے دیکھ کر مجھ سے کہا آپ جائیں، اور گرفتار ہو جائیں۔ اس پر میں نے اور شنکر دونوں نے بڑے زور سے قہقہہ مارا۔ انھوں نے کہا جتنا چاہو دل کھول کر ہنس لو، ہم اس گھر سے قدم باہر نہیں نکالیں گے، شنکر پرشاد صاحب گاڑی بھیج کر ہمارے کپڑے منگا لیجئے۔

الغرض وہ دفتر میں رخصت کی درخواست بھیج کر پورے ایک ہفتے شنکر پرشاد ہی کے گھر رہے اور ساتویں دن، آئے تو، آئی جی کے ساتھ دفتر آئے۔

جب اس واقعے اور سکینہ کی زبان میں، اس خوفناک حادثے کو آٹھ دس دن گزر گئے، مجھے شوخی سوجھی اور فون پر ان سے یہ کہا سکینہ صاحب، پولیس ہتھکڑیاں لئے ہوئے میرے کمرے کی طرف آ رہی ہے، اتنا سنتے ہی میں نے ان کی چیخ اور کھٹاک سے فون گر جانے کی آواز سنی۔ اتنے میں چند احباب آ گئے، اور میں ان سے باتیں کرنے لگا۔ ابھی میں باتیں کر ہی رہا تھا کہ میرے دوست کنور مہندر سنگھ اسٹی مجسٹریٹ، میرے کمرے میں داخل ہوئے، اور مجھے دیکھتے ہی ان کے منہ سے نکل گیا "آگئیں"!

میں نے پوچھا کیا بات ہے، انھوں نے کہا یہ سکینہ بھی عجیب آدمی ہیں، انھوں نے ابھی مجھے فون کیا کہ فوراً آ جائیے، جوش گرفتار ہو چکے ہیں، اب میری باری آ رہی ہے۔

میں نے ہنس کر کہا، میں نے تو ان سے مذاق کیا تھا۔ کنور صاحب نے کہا اُن سے ایسا مذاق کرنا بیحد خطرناک ہے، وہ ایسے مذاق سے مر بھی سکتے ہیں، چلئے ان کے کمرے میں چلیں۔ اور جب کمرے میں جا کر دیکھا اور ان کو موجود نہیں پایا۔ تو میں نے کہا صرف دو باتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو وہ آپ کے وہاں گئے ہوئے ہیں یا شنکر پرشاد صاحب کے پاس کنور صاحب نے میرے کمرے میں آ کر اپنے اجلاس پر فون کر کے پوچھا، معلوم ہوا کہ وہ وہاں نہیں ہیں کتنے میں شنکر پرشاد کا فون آیا کہ جوش صاحب مجھے بتائیے کہ ہوا کیا۔ میں نے کہا کچھ بھی نہیں ہوا۔ خالی مذاق کیا تھا سکینہ سے انھوں نے کہا بڑا غضب کیا آپ نے، سکینہ کی حالت خراب ہے، وہ سات گلاس پانی پی چکے ہیں۔

کنور صاحب کو لے کر وہاں پہنچا۔ دیکھا کہ سکینہ کا چہرہ سفید ہو چکا ہے۔ میں قہقہہ مار کر ان سے لپٹ گیا اور کہا ارے اتنی سی دل لگی میں دم نکل گیا۔ انھوں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے بغور دیکھا، ایک حرف زبان سے نہیں کہا، اور آنکھیں نیچی کر لیں۔

میں نے اور کنور صاحب نے ان کو لاکھ لاکھ سمجھایا کہ ارے خدا کی قسم آپ سے مذاق کیا تھا، لیکن وہ کچھ بولے ہی نہیں۔ شنکر نے کہا ارے بھائی اب تو حواس درست کرو، ہنسو بولو، اور مذاق کا لطف اٹھاؤ۔ انھوں نے کہا شنکر صاحب، ہمارے گھر گاڑی بھیج کر ہمارے کپڑے منگا لیجئے، اب ہم آٹھ دس روز تک آپ ہی کے گھر میں رہیں گے۔ اور ہم لوگ جھک مار کر چلے گئے۔ اور جب خدا خدا کر کے، دس بارہ روز کے بعد آئی جی کے ساتھ وہ پھر دفتر آئے اور لنچ کے بعد بسترے پر میرے ساتھ بیٹھ گئے، تو انھوں نے بڑی متانت کے ساتھ کہا جوش ہمارے من کی بات سنو گے، میں نے کہا ضرور سنوں گا، تو انھوں نے کہا کہ جب پولیس والوں نے قدسیہ باغ میں ہم کو لوٹا تھا جب تک ہندوستان کے تمام اخباروں میں ان کی موت کی خبر چھپ نہیں جائے گی، اس وقت تک ہم اپنے کو سیف[1] (SAFE) نہیں سمجھیں گے۔

ہے دنیا کی میں کوئی مثال اس بے پایاں بزدلی کی۔؟

یہ میرے چل چلاؤ کا زمانہ ہے، دیکھئے سکینہ سے اب کبھی ملاقات ہو گی بھی کہ نہیں، میں مر جاؤں تو کوئی ان کو میرا اسلام پہنچا کر یہ کہہ دے کہ تمھارا سب سے بڑا چاہنے والا اس دنیا سے اٹھ گیا:
بر شما خوش باد، ناخوش ہائے دنیائے دنی!

[1] محفوظ

مانی جائسی

گورے رنگ اور متوسط قامت کے، خوش رو، بدگمان، سریع الغضب، خدمات فراموش، پریشان روزگاری میں کامل دوست، فراغت میں قطعی اجنبی، اوہام کی حد تک راسخ العقائد، بدرجۂ اتم نکتہ سنج، قیامت کے ذہین، نہایت خوش فکر غزل گو، بلا کے عاشق مزاج، اور ایسی رحم انگیز دردمندی سے غزل پڑھنے والے انسان تھے کہ یہ گمان ہوتا تھا کہ ان کے سینے میں ایک ایسا دل ہے جو صبح ازل سے شام ابد تک برابر پھٹتا ہی چلا جائے گا۔ اور لہجے میں ایسی دل گداز موسیقی تھی کہ بات کرتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ طبلے پر بول کٹتے چلے جا رہے ہیں۔

میری نوعمری کے زمانے میں وہ میرے چچا نواب محمد علی خاں کی سرکار میں بطور منشی ملازم تھے پرائیوٹ اور کچھ روز کے بعد میرے بڑے بے تکلف دوست بھی ہو گئے تھے۔ اور ایسے دوست کہ ایک مدت تک میں ان کو اپنے تمام دوستوں سے زیادہ چاہتا رہا تھا۔

وہ ملیح آباد کے اثنائے قیام میں میرے چچا کی فرنگی بیوی کے بھائی پر مر مٹے اور ہر آن اسی کا نام رٹا کرتے تھے اور جب اس سے ان کا دل بھر گیا تو لکھنؤ کی ایک خوبرو طوائف پر جس کا نام غالباً مہدی جان تھا، مرنے لگے تھے اور اس کے عشق میں جب ان کی حالت غیر ہونے لگی تھی تو میں نے اس طوائف کو ملیح آباد طلب کر کے ان کے حوالے کر دیا تھا۔ لیکن جب میں نے جھانکا تو یہ دیکھا کہ وہ اس کے پاؤں دبا دبا کر بری طرح رو رہے ہیں۔

میں نے ان کو بلا کر کہا یہ آپ کیا کر رہے ہیں، یہ پاؤں دبانے اور ٹسوے بہانے کا موقع نہیں ہے جائیے اور خوش فعلیاں کیجیے۔ انھوں نے بھرائی آواز میں کہا "اچھا" اور اندر جاتے ہی پھر اس کے پاؤں دبا دبا کر رونے لگے۔ اس بات کا لوگوں کو مشکل سے یقین آئے گا۔ لیکن یہ میری آنکھوں کا دیکھا واقعہ ہے کہ وہ میرے بار بار سمجھانے کے باوجود اس طوائف کے پاؤں رات بھر رو رو کر دبانے رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ جناب والا اس کم بخت عشق کی بھی ہزاروں شانیں ہوتی ہیں اور بعض اوقات تو یہ جذبہ انسان کو اس طرح دبوچ لیتا ہے کہ وہ کچھ کر ہی نہیں سکتا۔

یہ غالباً ۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے کہ میرے کل کے یار اور آج کے اجنبی دوست محمود اکبر آبادی نے آگرے سے مجھ کو اپنی شادی کا دعوت نامہ بھیجا تھا اور مانی سے میری شیفتگی پر آگاہ کر کے مجھ کو چکھی دینے کی خاطر یہ بھی

لکھا تھا کہ مانی بھی ان کی شادی میں شریک ہونے والے ہیں ۔ تو میں چالیس فی صد محمود کی شادی میں شریک ہونے اور ساٹھ فی صد مانی سے ملنے کے لئے، اتنا بڑا سفر اختیار کر کے حیدر آباد دکن سے آگرے گیا تھا۔

لیکن میں جب قیصر باغ میں اس وقت ان سے ملنے گیا جب کہ وہ راجہ صاحب محمود آباد کی سرکار میں انکی بیگم کی ریاست "بہرہ" کے منیجر کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے تو انھوں نے مجھ سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کی، اور میرے منہ پر یہاں تک کہہ دیا کہ جوش صاحب میں ضیاء عباس کے علاوہ اس دنیا میں کسی اور کو اپنا دوست ہی نہیں سمجھتا۔ اس بات نے میرا دل اس قدر توڑ دیا کہ میں نے ان کے پاس آنا جانا چھوڑ دیا۔

لیکن اس واقعے کے کئی برس کے بعد جب حکیم صاحب عالم نے مجھے اس امر سے آگاہ کر دیا کہ مانی کو راجہ صاحب محمود آباد نے چھوڑ دیا ہے اور وہ بیچارے کٹرہ ابوتراب خاں کے ایک ٹوٹے سے مکان میں بڑی عسرت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں تو مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے دوپہر کی پرواہ کی' سیدھا ان کے پاس پہنچا۔ مجھ کو دیکھ کر وہ پانی پانی ہو گئے، اور جب میں دوڑ کر ان کے گلے لگ گیا اور کہا جب تک میں زندہ ہوں' آپ پریشان نہیں رہ سکتے' تو شدید حیرت' بے پایاں شرمندگی' اور لامحدود تشکر کے باعث ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے' اور جھکی آنکھوں کے ساتھ انھوں نے کہا جوش صاحب میں نے آپ سے بڑا غیر شریفانہ برتاؤ کیا تھا۔ اگر کسی اور سے میں وہ برتاؤ کرتا تو عمر بھر وہ میری صورت نہ دیکھتا۔ میں نے فوراً بات کاٹ کر کہا۔ بس بس' مانی صاحب' مجھے شرمندہ نہ کیجیے ــــ اور ہماری دوستی پھر بحال ہو گئی۔

اور جب معاشی پریشانی میں گھر کر غالباً ۱۹۴۳ء میں وہ میرے پاس آئے اور انھوں نے مجھے یہ حکم دیا کہ میں سرکار ہند سے ان کا ادبی وظیفہ مقرر کرا دوں ــــ تو میں سیدھا مولانا ابوالکلام کے پاس گیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ ان کا وظیفہ مقرر کر دیں انھوں نے کہا' میں تو ان کو شاعر ہی تسلیم نہیں کرتا۔ اور میرا خیال ہے کہ آپ کا سا بالغ النظر آدمی بھی نہیں سمجھتا ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ یگانگت کی بناء پر آپ سفارش کر رہے ہیں۔ میں نے کہا مولانا وقت واحد میں آپ نے دو ٹھوکریں کھائی ہیں' ایک معنوی اور ایک لفظی' معنوی ٹھوکر تو یہ ہے کہ آپ مانی صاحب کو سرے سے شاعر ہی نہیں سمجھتے' یہ صحیح ہے کہ وہ بڑے شاعر نہیں' اور کوئی غزل گو بڑا شاعر نہیں ہو سکتا مگر ہمارے یہاں جو شعر کا معیار ہے اس پر نگاہ کر کے' میں ان کو ہزاروں غزل بافوں پر ترجیح دوں گا' اور "یگانگت" کا لفظ استعمال کر کے آپ نے لفظی ٹھوکر کھائی ہے۔ فارسی لفظ "یگانہ" میں یہ تائے عربی کہاں سے آ گئی' مولانا کے چہرے پر انفعال دوڑ گیا۔

پھر بھی انھوں نے سنبھل کر کہا یہ غلط العام ہے ــــ میں نے کہا جان کی اماں پاؤں تو یہ بات زبان پر لاؤں کہ یہ غلط العام نہیں' غلط العوام ہے۔ وہ شرمندہ ہو کر مسکرانے لگے۔ اور میں پنڈت جی کے پاس چلا گیا۔

ان کے سکریٹری نے کہا جوش صاحب' پنڈت جی اس وقت ایک نہایت ضروری کام کر رہے ہیں' انھیں بالکل فرصت نہیں ہے۔ میں نے کہا تو پھر آپ میرا نام لیکر یہ پوچھ آئیں کہ میں کب آؤں۔ سکریٹری صاحب نے

آکر کہا پنڈت جی سے آپ ابھی مل سکتے ہیں۔ میں پہنچا تو وہ ایک اونچے سے ڈسک پر کھڑے لکھ رہے ہیں، میں نے کہا اپنے استاد حضرت مانی جائسی کو آپ سے ملانے آیا ہوں۔ انھوں نے کہا آپ کا بھی کوئی استاد ہو سکتا ہے؟ بلایئے مانی نے اپنا دیوان پیش کیا۔ پنڈت جی نے کہا میں آپ کا بہت مشکور ہوں۔ میں نے کہا شاکر کہئے ــــ ایسے مواقع پر "مشکور" غلط ہے۔ انھوں نے ہنس کر کہا آپ کہاں تک میری زبان درست کریں گے۔ میں نے مانی صاحب کے ادبی وظیفے کی درخواست پیش کردی۔ انھوں نے فوراً منظور کر کے اس پر دستخط کر دیئے پنشن جاری ہو گئی اور مانی صاحب نے مجھ سے ملنا ترک فرما دیا۔

لیکن اگر آپ مجھ سے میرے دل کی بات پوچھیں تو میں بتاؤں کہ جب میں نے ان کے انتقال کی خبر سنی تو دیر تک روتا رہا اور آج بھی جب ان کی یاد آجاتی ہے تو کلیجہ مسوس کر رہ جاتا ہوں۔ ہائے مانی ہائے مانی۔

منے میرزا اثر لکھنوی

نہایت گورے رنگ، بڑی بڑی بھوری مونچھوں، کرنجی آنکھوں، اور سجل ناک نقشے کے اس قدر شگفتہ مزاج، اور مخلص انسان تھے ان سے مل کر دل باغ باغ ہو جاتا تھا، اور اُسی کے ساتھ ساتھ، وہ ایسے خوش فکر مرثیہ و غزل گو شاعر بھی تھے کہ اگر شدید قسم کی سنک، ان کا راستہ نہ روک لیتی تو اساتذۂ لکھنؤ میں وہ نہایت نمایاں مقام حاصل کر لیتے۔

وہ مجھ سے عمر میں بہت بڑے اور میرے باپ کے ملنے والے تھے، لیکن میری ہلکتی جوانی کی بے پایاں شوخی، اور ان کی ڈھلتی عمر کی شدید سنک نے کچھ اس طرح ایک دوسرے کی گردن میں باہیں ڈال دی تھیں کہ ہم دونوں میں ہم عمروں کی سی بے تکلفی پیدا ہو گئی تھی۔

جب کبھی کبھار میں دس پندرہ روز لکھنؤ نہیں جاتا تھا، وہ مجھ سے ملنے ملیح آباد آجایا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک روز وہ ملیح آباد آئے ہوئے تھے، اور ہم لوگ، اپنے احاطے کی الگنائی میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے، انھوں نے کہا، سنیئے ایک تازہ غزل کہی ہے؟ "قید رسم و رواج کیا کیجے"، کی طرح پر۔ جس کے دو شعر یاد رہ گئے ہیں

ہوس زر، بری سہی، لیکن
ہو اگر احتیاج کیا کیجے

ہم نے مانا کہ وہ کل آئیں گے
عقل حیراں ہے، آج کیا کیجے

دوسرا شعر سن کر میں نے کہا میں آپ کے اس "آج کیا کیجئے" کا حل آپ کو بتا دوں؟ انھوں نے میرے مسکراتے چہرے کو گھور کر دیکھا۔ میں نے اپنے سیدھے ہاتھ کی مٹھی بند کر لی اور ہاتھ ہلا ہلا کر کہا کہ شرر صاحب آج یہ کیجئے۔ وہ بگڑ گئے، اور کہنے لگے خدا ہماری سنک کا بیڑہ غرق کرے، جو ہم کو لونڈوں میں لا کر بٹھاتی اور ایسے ایسے فحش اشارات دکھاتی ہے۔ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے، بس ملاقات ختم، ہم ابھی لکھنؤ جا رہے ہیں۔ بڑی مشکل سے میں نے انھیں روکا۔ اور تھوڑی دیر میں وہ من گئے۔ اور جب ان کا مزاج نارمل ہو گیا تو میں نے کہا شرر صاحب ایک مصرع کہتا ہوں:۔ سینۂ بلبل میں چھالا پڑ گیا" اس پر ایک شعر کہہ دیجئے" "چھالا" قافیہ ہو گا۔ انھوں نے دو منٹ تک سوچا، اور اچھل کر کہا، لو جیسی طرح ہے، ویسا ہی لونڈھیائی شعر سن لو۔

لیٹنے میں۔ پھینک کر دل۔ یہ کہا

وہ پڑا ہے۔ جا اٹھا لا۔ پڑ گیا

چھوٹے دادا نے، قہقہہ مار کر کہا واہ کیا، بعدہٗ بنیدی لنڈھور شعر کہا ہے ـــ وہ ہنسنے لگے۔ اور جب میں نے یہ اعتراض کیا کہ اس شعر میں ردیف مہمل اور گونگی ہو کر رہ گئی ہے۔ تو، انھوں نے کہا، ردیف نہ مہمل ہے، نہ گونگی، بامعنی ہے اور آواز بھی دے رہی ہے صاحبزادے یہ ڈرامائی شعر ہے، اندر چلو، بیٹھا تخت پر بیٹھ کر اس شعر کو آنکھوں سے دکھا کر سمجھا دوں گا۔ وہ اندر جا کر تخت پر بیٹھ گئے، سیدھے ہاتھ کی مٹھی بند کر کے کہا دیکھو اس مٹھی میں عاشق کا دل ہے۔ یہ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ لیٹنے لگے، ابرار سے کہا تم عاشق بن کر سامنے کھڑے ہو جاؤ، اور جب ابرار عاشق بن کر ان کے سامنے کھڑے ہو گئے، تو لیٹتے لیٹتے، انھوں نے اپنی مٹھی کھول کر اس کو اس طرح جھٹکا دیا، گویا انھوں نے فرش پر ان کا دل پھینک دیا ہے اور دل پھینکتے ہی، وہ ابرار کی طرف نگاہ کر کے یہ کہتے ہوئے کہ "وہ پڑا ہے جا، اٹھا لا دھم سے لیٹ گئے۔ اور کہنے لگے، بتاؤ۔ اب پڑ گیا" یعنی لیٹ گیا، میں ردیف چسپاں ہوئی کہ نہیں ـ؟

اب ان کی سنک کے دو واقعے بھی سن لیجئے۔ میرے باپ کی زندگی کا واقعہ ہے، ایک روز وہ خاصہ تناول فرما کر، لیٹے اور شرر ان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے، کہ میرے باپ کے ایک شاگرد شباب لکھنوی اصلاح کے لئے ایک غزل لے کر آ گئے، میرے باپ پر غنودگی طاری تھی، انھوں نے فرمایا شرر صاحب آپ اصلاح دے دیں۔ انھوں نے، بڑی بے چارگی سے کہا، خاں صاحب میں کیونکر اصلاح دے سکتا ہوں۔ میرے پائنچے ہیں تو، گھٹنے کے اوپر، کھونچا لگ گیا ہے۔ ان کا یہ نرالا عذر سن کر میرے باپ نے قہقہہ لگا کر فرمایا کہ اگر مجھ کو اس حادثے کا علم ہوتا تو میں آپ سے اصلاح کے لئے ہرگز نہ کہتا، اس لئے کہ یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ جب کسی شاعر کے پائنچے میں، اور وہ بھی گھٹنے کے اوپر کھونچا لگ جاتا ہے، تو اس میں اصلاح دینے کی صلاحیت باقی نہیں رہ جاتی ہے۔ اور شرر یہ سمجھ کر کہ میرے باپ ان کا مذاق نہیں اڑا رہے ہیں، بلکہ ان کی

تائید کر رہے ہیں، بے حد خوش ہو گئے تھے۔ جب میں سینٹ پیٹرز کالج میں پڑھتا، اور لکھنؤ میں تعطیل کا زمانہ گزار کر آگرے جانے والا تھا تو میں نے شرر صاحب سے بہ محکم وعدہ لے لیا تھا کہ وہ میرے ساتھ آگرے چل کر دو ایک مہینے گزاریں گے۔

لیکن جب میں ابرار اور رئیس کو ساتھ لے کر، تانگے میں لدا پھندا وزیر گنج پہنچا اور ان کے مکان پر دستک دے کر پوچھا کہ شرر صاحب ہیں کہ نہیں، تو ان کی بیگم نے کہا جی ہاں ہیں، اور پھر اس "جی ہاں ہیں" کے ایک سیکنڈ کے بعد آواز آئی۔ "اچھا نہیں ہیں۔" اس "ہیں" اور "اچھا نہیں ہیں" سے میں سمجھ گیا کہ وہ گھر میں چھپے ہیں، اور یہ "اچھا نہیں ہیں" انھیں کے اشارے پر کہا گیا ہے۔ اتنے میں ان کے دروازے کا پردہ ہوا سے جنبش میں آگیا اور میں نے دیوار کے قدِ آدم آئینے میں دیکھ لیا کہ شرر اپنی بیگم سے منہ پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کر رہے ہیں۔ میں نے پکار کر کہا شرر صاحب خیریت اسی میں ہے کہ آپ فوراً باہر آجائیں، ورنہ میں ایک، دو، تین کہہ کر گھر میں گھس پڑوں گا۔ اور جب اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تو، "ڈونٹ ڈرے ین کا تو زمانہ تھا ہی" میں، ایک، دو تین کہہ کر ان کے گھر میں گھس گیا، وہ آئیں بائیں کرتے رہے، اور میں ان کو کھینچ کر باہر لے آیا۔ ان کی بیگم کی آواز آئی اور کرو پٹھانوں سے دوستی، اور اندر سے دروازے میں زنجیر لگائی۔

میں نے کہا آپ نے تو آگرے چلنے کا وعدہ کیا تھا، انھوں نے جواب دیا ہاں گلے گلے وعدہ کیا تھا، لیکن یکایک ایک بڑا ضروری کام نکل آیا ہے، کل اسے نمٹا کر، پرسوں شام تک آگرے آجاؤں گا۔" میں نے کہا ضروری کام کی ایسی تیسی، میں تو اسی وقت ساتھ لے جاؤں گا۔" انھوں نے کہا حضرت عباس کی قسم آج نہیں چل سکتا خواہ آپ مجھے مار ہی کیوں نہ ڈالیں۔ میں نے کہا تو اچھا ہم کو اسٹیشن تک تو پہنچا دو۔ وہ تانگے میں بیٹھ گئے، میں نے، تانگے میں کہا چلیے چلیے نا۔ انھوں نے کہا خون حسین کی قسم بالکل مجبور ہوں، ورنہ ضرور چلتا۔ اب تانگے سے ہمارا سامان اترنے لگا، اور ابرار کو روپے دے کر میں نے کہا کہ ہمارے ٹکٹ لے آؤ اور پلیٹ فارم ٹکٹ شرر صاحب کے لئے بھی لیتے آنا، اور جب ابرار بکنگ آفس کی طرف روانہ ہونے لگے تو حیرت ہوگئی اس بات پر کہ شرر صاحب نے پکار کر کہا، ابرار پلیٹ فارم کا نہیں۔ ہمارا ٹکٹ بھی آگرے ہی کا لے آؤ۔ دیکھی ہے آپ نے کبھی ایسی تگڑی سنک؟ جے 'جیا' تھا شرر لکھنوی کی!

آگرے کا ذکر ہے ایک روز شرر، ابرار، رئیس اور میں سب مل کر میرزا احمد زکریا صاحب ملک کے وہاں گئے، ملک صاحب، میرے باپ کے ننھیالی بھائی، اور آگرے کے رئیس اعظم و نامور غزل گو شاعر میرزا خادم حسین صاحب رئیس اکبر آبادی کے بڑے تیکھے اور بانکے فرزند تھے۔ میں نے راستے میں کہا شرر صاحب اس قدر عنایت ضرور کیجیے گا کہ کم سے کم پہلی ہی ملاقات میں ملک چچا کو اس بات کا پتہ نہ چل جائے کہ آپ سنکی ہیں، انھوں نے کہا اور آپ بھی اپنی سنک کو ظاہر نہ ہونے دیجئے گا۔ میں نے کہا، میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایسا ہی ہوگا اور آپ بھی اپنے وعدے پر قائم رہیں گے؟ انھوں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر، بڑے اعتماد کے ساتھ کہا قولِ مرداں

جانے دارد۔ اب ہم ملک صاحب کی خدمت میں پہنچ گئے۔ انھوں نے ہم لوگوں کو بڑی شفقت کے ساتھ گلے لگایا، میں نے شرر صاحب کا تعارف کرایا۔ انھوں نے بڑے تپاک کے ساتھ ان سے ہاتھ ملایا، اور صدر مقام پر بٹھا دیا۔ اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اتنے میں ملک صاحب نے چونک کر کہا معاف کیجئے گا۔ شرر صاحب میں چائے بھول گیا۔ ابھی حاضر کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر انھوں نے اپنے ملازم کو آواز دی۔ شرر نے کہا میرزا صاحب۔ چائے کی قطعی زحمت نہ فرمایئے ملک صاحب نے کہا جناب والا! بھلا چائے میں زحمت ہی کیا ہوتی ہے شرر صاحب نے کہا بات یہ ہے میرزا صاحب کہ میں چائے قطعاً پیتا ہی نہیں ہوں۔ اس لئے وہ ضائع ہو جائے گی۔ ملک صاحب یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ اب شاعری شروع ہو گئی۔ ملک صاحب نے پہلے اپنا کلام سنایا پھر شرر صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کی، انھوں نے کہا میرزا صاحب، مجھ ناچیز کا کلام سننے سے پیشتر چائے تو پلا دیجئے۔ یہ انوکھی بات سنتے ہی، میرزا صاحب کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اور چائے آگئی تو انھیں، بڑے شوق سے چائے پیتے دیکھ کر، وہ ہم سب لوگوں کو بار بار دیکھنے لگے۔

گھر آتے ہی میں نے اُن سے کہا "کیوں شرر صاحب آخر آپ نے ہم سب کی ناک کٹوا دی نا۔ پہلی ہی ملاقات میں یہ ظاہر کر دیا کہ آپ، معمولی نہیں، پرلے درجے کے سنکی ہیں، انھوں نے بات کاٹ کر کہا سنکی ہوں ہمارے دشمن، ہم نے بفضلہ، کوئی سنک کی بات نہیں کی ہے۔ میں نے کہا دیکھئے خیریت اسی میں ہے کہ قائل ہو جایئے، انھوں نے کہا قیامت تک قائل نہیں ہوں گا۔ میں نے پوچھا پرانی قائل کر دینے والی صورت پر عمل کروں؟ انھوں نے کہا سو بار عمل کر دیکھئے بندہ قائل نہیں ہونے کا۔ میں نے کہا رئیس وہی پرانا عمل۔ یہ سنتے ہی رئیس نے، ان کو چارپائی پر گرا کر، اپنا پہلوانی گھٹنا ان کے سینے پر رکھ کر پوچھا قائل ہوئے کہ نہیں، انھوں نے کہا نہیں، ہرگز نہیں، اب اور گھٹنا دبا کر پوچھا اب؟ کہا اب بھی نہیں، قطعی نہیں۔ اور اب سہ بارہ، جب رئیس نے اپنا گھٹنا ان کے سینے پر بہت، زور سے دبا کر پوچھا اور اب تو وہ چیخ چیخ کر کہنے لگے۔ قائل۔ قائل، قائل۔ اور ہم سب ہنستے ہنستے لوٹ گئے اور لطف یہ کہ تھوڑی دیر میں، وہ بھی قہقہے لگانے لگے۔

اب ایک آخری بات سنا کر جو آج تک فراموش نہیں ہو سکی ہے۔ ان کی داستان کو ختم کر رہا ہوں۔
ایک روز آغاز بہاراں کے جادو بھرے گنگا جمنی دھندلکے میں۔ جب کہ آسمان سے، زمین کے منھ پر مٹھاس اتر رہی تھی۔ ہم لوگ بہ ہر غالب سحر کی بانگوں، آمادۂ سفر تاروں، اور ترانہ خواں جھونکوں میں ڈوبے ہوئے۔ گومتی کے ساحل پر ٹہل رہے تھے۔ کہ، ایک دور کے مندر کے چراغ کی سہانی روشنی، اور گھنٹوں کی ملائم جھنکار نے، ہم کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور مندر کے دروازے پر کھڑے ہو کر، ہم جھومنے لگے۔ اور،

---

[۱] شرر صاحب ادیب ہیں۔

ایسا محسوس ہونے لگا کہ فرش زمیں بڑی آہستگی کے ساتھ جھنکتا ہوا عرش بریں کی جانب اُٹھتا چلا جا رہا ہے، اور کائنات بھیرویں میں ڈوب کر یہ رباعی گنگنا رہی ہے :۔

آتش پہ، مغاں نے، راگ گایا تیرا
ہندو نے، صنم میں جلوہ پایا تیرا
دہری نے کیا، دہر سے تعبیر تجھے
انکار، کسی سے بن نہ آیا تیرا

کہ اتنے میں ایک لالہ رخ طفل برہمن جس کا بھرا بھرا چہرہ، پگھلے ہوئے سونے جیسے ابل ابل اور چھلک رہا تھا، جس کی خواب آلودہ آنکھوں میں، شام اودھ کروٹیں لے رہی تھی، اور جس کے ماتھے کے قشقے میں صبح بنارس طالع ہو رہی تھی اپنے پھول سے گلے میں خیط ابیض اور قوس قزح کی سی آڑی زنار ڈالے ایسی تمکنت اسی لٹک کے ساتھ مندر سے برآمد ہوا۔ جیسے کہرے کے پیچ در پیچ بھبوکے نم ناک پلکوں میں کنوار کی شعاع اولیں مچلتی نظر آتی ہے۔ میں نے شفق صبح کی کوکھ سے پیدا ہونے والے اس طفل نوزائدہ کو دیکھا تو یا ہو کا نعرہ لگا کر سر دھننے لگا، اور شرر نے کلیجہ تھام کر آنکھیں بند کر لیں اور تھوڑے سے وقفے کے بعد انھوں نے میری طرف نظر اٹھا کر کہا سنیے ابھی ابھی اس فتنۂ دہر پر ایک شعر کہا ہے :۔

کوئی اس وقت برہمن کی صباحت دیکھے نکلے جب، رات کا جاگا ہوا، بت خانے سے !

ہائے وہ دھندلکا، ہائے وہ بالکا۔ ہائے وہ شرر ہائے وہ سماں اس گھڑی کا ایک ایک لمحہ میرے دل میں، آج تک، برچھی کی طرح چبھا ہوا ہے۔

رنگ گل، سینے میں چبھتا ہے کسے آواز دوں
بوئے گل، دل میں کھٹکتی ہے الٰہی کیا کروں

شاہ دلگیر اکبر آبادی

رسالہ "نقاد" کے مدیر، خاندان مشائخ کے چشم و چراغ، دراز قامت، دراز ریش، دراز دست، کوتاہ ہمت، بخل پسند، پر کیسہ تہی دست، کثیر السواد، قلیل المرباد، بخوشی میہمان بکراہت میزبان، عقاب بچہ، کبوتر مزاج، خانقاہ کی محراب میں قطب الاقطاب حسینوں کی جناب میں پارۂ سیماب، کیا کیا خصوصیات بیان کروں شاہ صاحب کے۔

وہ اس قدر تلملا جاتے تھے ماہ جبینوں کو دیکھ کر کہ ان کے حواس بجا نہیں رہتے تھے راہ لگی میں ان کے

ساتھ چلنا پھرنا بے حد خطرناک تھا اس لیے کہ جب کسی حسین چہرے پر ان کی نگاہ پڑ جاتی تھی تو وہ اپنے ساتھی کی پسلیوں پر اس قدر زور سے کہنی مارتے تھے کہ اس بے چارے کے منہ سے چیخ نکل جاتی تھی۔ اسی طرح جب وہ جھوم جھوم کر دیوانہ وار اپنا کلام سناتے تھے تو زور زور داد دینے والے کی ران پر اپنا پہاڑ سا ہاتھ اس قدر زور سے مارتے تھے کہ وہ غریب اچھل اچھل جایا کرتا تھا۔

ایک بار وہ ٹونڈلہ جنکشن تک پہنچانے گئے تھے، میری گاڑی کے بالمقابل ایک دوسری گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ اس گاڑی میں ایک نہایت قبول صورت عورت بیٹھی تھی، شاہ صاحب نے اسے دیکھ لیا، وہیں جم کر کھڑے ہو گئے۔ اور میری پسلیوں پر برابر کہنیاں مارنے لگے۔ میری پسلیاں پھوڑا ہو گئیں تو میں نے دو قدم پیچھے ہٹ کر اپنے قلی کو ان کے پہلو میں کھڑا کر دیا، وہ اس قدر محو تھے کہ انھیں اس کی کچھ بھی خبر نہیں ہوئی۔ اور اب انھوں نے پھر بڑے زور سے کہنی ماری، کہنی قلی کی پسلیوں میں لگی، اس کے سر سے ٹیر ابکس اور بستر گر پڑا اس نے ہائے رام کہا اور اپنی پسلیاں پکڑ کر پلیٹ فارم پر بیٹھ گیا اور مجھ دکھتی پسلیوں کے درد رسیدہ بدبخت کی گاڑی چھوٹ گئی۔

آگرے کے اثنائے قیام میں ایک روز مجھے شرارت سوجھی۔ فانی و مانی کو ساتھ لے کر شاہ صاحب کے وہاں پہنچا، ان دونوں کو شاہ صاحب کے داہنے بائیں بٹھا کر خود ایک گز کے فاصلے پر بیٹھ گیا اور ان سے کلام سنانے کی فرمائش کر دی! فانی و مانی فوراً تاڑ گئے میری شرارت کو۔ انھوں نے کہا جوش صاحب اپنی کرسی ہم دونوں کے درمیان لے آئیے۔ میں سمجھ گیا ان کی نیت اور اپنی جگہ سے یہ کہہ کر نہیں ہلا کہ ادھر ہوا خوب آرہی ہے۔ اب شاہ صاحب نے شعر خوانی شروع کر دی۔ فانی و مانی، بڑی آہستگی سے داد دینے لگے، اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ اگر زور سے داد دیں گے تو شاہ صاحب کا بھاری ہاتھ پڑنے لگے گا ان کی رانوں پر۔ اتنے میں جب انھوں نے اپنا یہ شعر سنایا ؎

تم کو نہیں مجھے تو نہایت عزیز تھا
وہ نامراد دل جو شہید جفا ہوا

تو ان دونوں کی چالاکی کا توڑ کرنے کے لیے ایک فلک شگاف نعرے کے ساتھ کہا سبحان اللہ سبحان اللہ شاہ صاحب نے بڑے زور سے جھوم کر فانی کی ران پر تڑاق سے ہاتھ مار دیا۔ فانی کانپ اٹھے میں نے کہا، شاہ صاحب مکرر ارشاد ہو ۔۔۔ اور انھوں نے جھوم کر دوبارہ شعر پڑھا ؎

تم کو نہیں مجھے تو نہایت عزیز تھا
وہ نامراد دل، جو شہید وفا ہوا

اب انھوں نے مانی کی ران پر اس زور سے ہاتھ مارا کہ وہ بلبلا کر رہ گئے۔
میں نے کہا شاہ صاحب خدا کے واسطے ایک بار اور۔ فانی و مانی نے مجھ کو گھور کر دیکھا اور شاہ صاحب

نے سہ بارہ — ارے تم کو نہیں ارے تم کو نہیں، ارے تم کو نہیں — مجھے تو ارے مجھے تو نہایت عزیز تھا۔ اب دونوں کی رانوں پر تڑا تڑ تڑا تڑ ہاتھ پڑنے لگے، اور میں ہنسی چھپانے کے لئے منہ پر ہاتھ رکھ کر جھومنے لگا۔

وہاں سے گھر آئے تو شاہ صاحب کے دونوں مضروب مجھ پر برس پڑے — دونوں نے اپنی رانیں کھول کر دکھائیں، جن میں نیل پڑ چکے تھے اور شاہ صاحب کی موٹی انگلیاں بنی ہوئی تھیں۔

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی

حضرت عزیز لکھنوی کے قابل ناز شاگرد، مجھ ہیچ مداں کے استاد بھائی، علم عروض و فن شاعری کے مرکزی استاد، فارسی و انگریزی ادب کے زبردست نباض، قلزم انسانیت کے منارۂ ضوبار، ممبر انتقاد کے خطیب اعظم، مسند زبان کے قاضی القضات اور مدینۂ تہذیب لکھنؤ کے طاق زریں کے ہزاروں بجھے ہوئے چراغوں کی قطاروں میں، ایک ایسے آخری اور تنہا چراغ تھے، جن کے گل ہو جانے سے تمام شہر پر نہیت اندھیرا محیط ہو کر رہ گیا۔ اور ہر ذرہ کراہ کراہ کر فریاد کر رہا ہے کہ !—

اک شمع رہ گئی تھی، سو وہ بھی خموش ہے!

ان کی موت، ایک فرد کی موت نہیں ایک پوری صدی، ایک پورے طرز معاشرت کی موت ہے، اور نصیر الدین حیدر سے لے کر حضرت جان عالم کے زریں دور تک، لکھنؤ کے اولیائے علم و آئمۂ ادب نے، شائستگی تہذیب، نفاست، لطافت، اور ادب کی نجابت کا جو دستور قائم کیا تھا، اور اس کے دوش بدوش انھوں نے جس وضع داری ایثار پسندی، تواضع شعاری، بزم گفتاری، شیریں لہجگی اور بلور مزاجی کو فروغ بخشا تھا، اس کا بھی جنازہ نکل گیا۔

سنسان منزل وادیٔ غربت ہے لکھنؤ
شاید کہ آتش آج وطن سے نکل گیا

میں نے حضرت عزیز کے مکان پر سب سے پہلے انھیں دیکھا تھا، اس وقت میری جوانی کی پہلی کرن پھوٹ رہی تھی اور وہ جوانی کی دوپہر سے گزر رہے تھے، میرے ان کے مابین چھوٹے اور بڑے بھائی کا سا برتاؤ تھا اور چونکہ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے، اس لئے میری آزاد خیالی پر وہ ناک بھوں چڑھاتے اور تو تو کا کرتے تھے۔

اور رفتہ رفتہ جب میرے اور ان کے درمیان خاصی بے تکلفی پیدا ہو گئی تو ایک روز میں نے کہا اثر صاحب، اگر اجازت ہو تو ایک بات عرض کروں، انھوں نے کہا بڑے شوق سے کہیے۔

میں نے کہا تمام ہندوستان آزادی حاصل کرنے کے لئے، فرنگی کے روبرو، خم ٹھونک کر میدان میں آچکا ہے محبان وطن دھڑا دھڑ نوکریاں چھوڑ چھوڑ کر کانگریس میں شریک ہو رہے ہیں اور آپ، حسین کے پرستار ہونے کے باوجود، ڈپٹی کمشنر کی کرسی پر بیٹھے عصر حاضر کے یزید فرنگی کا ساتھ دے رہے ہیں کیا جواب ہے اس کا آپ کے پاس؟ میری یہ بات سن کر ان کے چہرے کا رنگ ملگجا سا ہو گیا، کوئی چیز ان کی پتلیوں میں چبھنے سی لگی اور انھوں نے آنکھیں جھکا لیں۔ اور میں نے ان کے چہرے پر اس قدر کرب آمیز شرمندگی دیکھی کہ پھر تمام عمر ان سے اس موضوع پر بات ہی نہیں کی۔ ان کی شاعری کا میں کبھی قائل نہیں رہا، ان کی تمام بیشمار خوبیاں سر آنکھوں پر لیکن، ان کو اپنا کلام سنانے کا اس قدر ہوکا تھا کہ سامعین کی قوت برداشت کی ہڈیاں بھی بولنے لگتی تھیں۔ اس سلسلے میں صرف ایک واقعہ معرض تحریر میں لا رہا ہوں، جس کو پڑھ کر مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ بھی ادبی سانسیں لینے لگیں گے۔

ایک بار مجاز کو ساتھ لیکر میں کشمیر گیا۔ اس دور میں مہاراجہ کشمیر حکمراں، اور اثر صاحب کسی شعبے کے وزیر تھے۔ میں وہاں گیا تو تھا، یہ نعرہ لگا تا ہوا کہ:

عصیاں کی گھٹا کی چھاؤں میں دم لینے
"ممنوع شجر" سے لطف پیہم لینے
آواز دو کا شمیر آ پہونچا جوش
اللہ سے انتقام آدم لینے

لیکن وہاں پہنچا تو نواب جعفر علی خاں اثر کے ذوق غزل سرائی کی آہنی بھٹکی میں بند ہو گیا۔

ہاں تو سنیے کہ ہم کشمیر پہونچے تو دن ڈوب رہا تھا۔ میں نے کہا مجاز، اس وقت تو یہ مناسب معلوم ہو رہا ہے کہ شیخ عبداللہ اور اثر صاحب کو اپنے آنے کی اطلاع نہ دیں اور کسی ہوٹل میں ٹھہر جائیں۔ ہوٹل میں ہم نے اپنا شغل شروع کر دیا۔ اور جب مجاز نے برآمدے میں کھڑے ہو کر سری نگر پر نگاہ ڈالی تو کہا جوش صاحب یہ شہر تو ایسا ہے گویا ہم مار ہرے آ گئے ہیں۔ اس لطیفے پر ہنس ہنسا کر سو گئے۔

بہت تڑکے میں نے مجاز کو جگایا، انھوں نے لیٹے لیٹے، آنکھ کھول کر کہا معاف کیجئے یہ وقت کوؤں کے جاگنے کا ہے میں بستر نہیں چھوڑوں گا، میں نے انھیں جھنجھوڑ کر کہا ارے کم بخت، دم بھر میں صبح کا رنگا رنگی جلوس گزرے گا۔ اور تو اپنی بند آنکھوں کے پپوٹوں پر سے اس جلوس کو گزار دے گا، یہ کیسی غیر شاعرانہ حرکت ہے۔ ارے کشمیر میں صبح کیوں کر ہوتی ہے، یہ تو دیکھ لے۔ الغرض مجاز کو زبردستی ساتھ لیکر ٹہلنے چلا گیا۔ ابھی مشکل سے دو میل ٹہلا ہوں گا کہ دیکھا ایک کوٹھی کے پھاٹک کے ستون پر، نواب جعفر علی خاں کا بورڈ لٹکا

ہوئے ہیں۔ ہم کوٹھی میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ کوٹھی کے بالائی برآمدے میں پھاٹک کی طرف منہ کئے کھڑے ہیں انھوں نے ہم کو دور سے دیکھ لیا وہ لکڑی کے زینے سے کھٹ کھٹ کرتے نیچے آئے ہم سے بغل گیر ہوئے پوچھا یہاں کب آئے، میں نے کہا شام کو انھوں نے کہا ٹھہرے کہاں ہیں' نیڈوز ہوٹل میں انھوں نے بڑے شکایت آمیز لہجے میں کہا، میرے یہاں سیدھے کیوں نہیں چلے آئے، کیا مجھ کو مردہ سمجھ لیا تھا، اس کے بعد انھوں نے آواز دی 'کوئی ہے' اردلی دوڑ آیا انھوں نے اس کو حکم دیا کہ وہ ہوٹل سامان ہوٹل سے لے آئے اور بل ادا کر دے۔ میں نے کہا بل میں ادا کر دوں گا۔ انھوں نے کہا ہرگز نہیں اس مرحلے کے بعد وہ ہمیں اوپر لے گئے اور ہم کو برآمدے میں بٹھا کر ڈرائنگ کمرے میں داخل ہو گئے۔ اور زیادہ سے زیادہ ایک منٹ کے اندر ایک موٹی سی بیاض لے کر باہر آ گئے، اور ایک دم سے غزلوں کی گویا دنادن دنادن، دنادن چلانے لگے۔

جب اس طرح ڈیڑھ، دو گھنٹے گزر گئے تو میں بوکھلا گیا کہ ابھی تک نہ میں نے خط بنایا ہے نہ حمام و ناشتہ ہی کیا ہے۔ میں نے مجاز کو، اور مجاز نے مجھے، بے کسی کے ساتھ دیکھا۔ اور، اسی کے ساتھ ساتھ کلام کی داد بھی دیتے رہے۔ کہ اتنے میں سکرٹیری نے آکر کہا کہ سرکار، ساڑھے نو بج چکے ہیں، دس بجے مہاراج کی ڈیوڑھی پر آپ کو تشریف لے جانا ہے۔ انھوں نے، بڑی بے لطفی کے ساتھ، بیاض بند کر دی، سامنے والے کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ آپ کا سامان یہاں رکھا ہوا ہے۔ وہ مہاراج کے یہاں چلے گئے۔ اس غزلوں کے دنگڑے کے بعد، ہم نے خط بنایا، اور حمام و ناشتہ کر کے لیٹ گئے۔ اور مسلسل غزلیں سننے اور پیاپے داد دینے کی تکان، کی بنا پر، ہم کو نیند آ گئی۔ تین گھنٹے تک برابر ہم سوتے رہے اور جب آنکھ کھلی تو دیکھا گھڑی ایک بجا رہی ہے اور حضرت اثر ایک لمبوترا سا رجسٹر بغل میں دبائے، کمرے میں داخل ہو رہے ہیں۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی انھوں نے کہا، آپ کو کشمیر کی سیر کرانے آیا ہوں، میں نے کہا تو اتنا وقت دیجئے کہ دوبارہ نہا دھو کر، کپڑے پہن لوں، انھوں نے کہا میں آپ کو اسی طرح کمرے میں بیٹھے بیٹھے کشمیر کی سیر کرا دوں گا اور یہ کہتے ہی انھوں نے وہ لمبوترا سا رجسٹر کھول لیا۔ انھوں نے ابھی رجسٹر کھولا ہی تھا کہ اردلی نے آکر کہا سرکار لنچ طیار ہے۔ انھوں نے کہا آئیے لنچ کر لیں۔ لنچ کی میز پر بیٹھتے ہی طعام و کلام کے دہرے مشاغل بیک وقت جاری ہو گئے، اور ہمارا عجیب عالم ہو گیا، کانوں میں (مناظر کشمیر پر) نظمیں منہ میں نوالے، اور ہونٹوں پر، سبحان اللہ کے جھوٹے نعرے۔ اور اس طرح وہ لنچ، ہم دونوں کو تناول فرمانے لگا۔

اور خدا خدا کر کے، جب وہ کلام و طعام کا مرکب لنچ، ہم کو کھا کر ختم ہوا تو، ہاتھ دھو کر، ہم اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئے، اور شاید الٰہی مشکل سے دو تین ہی کروٹیں لی ہوں گی کہ وہ ایک چوکور بیاض لئے آ گئے، اور یہ کہہ کر نظمیں سنانے لگے کہ دیکھئے بدنصیب شاعرہ "سیفو" کی ناتمام نظموں کے ٹکڑوں کو جوڑ جوڑ کر یہ نظمیں کہی ہیں۔

اور جب نظمیں سنتے، پانچ بج گئے، تو میرا دماغ سنسنانے لگا، میں نے کہا میں دونوں وقت حمام

کرتا ہوں، آپ اجازت دیں کہ حمام کر کے چائے پی لوں، تاکہ تازہ دم ہو کر آپ کا کلام سنوں، میں غسل خانے چلا گیا، وہ مجازؔ کو، کلام سناتے رہے اور مجازؔ کی داد کی آواز بتدریج دھیمی ہوتی چلی گئی اور تھکی ہوئی آواز کی مری ہوئی "واہ واہ" ہوا میں تیرنے لگی۔ دتّی، ائے ائے اے وتّی ہے، ائے ائے، اے۔ میں حمام کر کے نکلا تو انھوں نے کہا، میاں مجازؔ تم بھی حمام کر آؤ، انھوں نے کہا میں تو صبح کو بھی نہیں نہاتا۔ یہ دوفیر آغسل جوشؔ صاحب ہی کو مبارک ہو۔ اتنے میں چائے آگئی، اور چائے کا آدھا آدھا گھونٹ پی کر وہ "سیفو" کی نظموں کے آخری ٹکڑے سنانے اور ہم دونوں داد دینے لگے۔

اتنے میں، بڑی کراہ کے ساتھ، آفتاب ڈوب گیا، فضا سادُھلی سلونی ہو گئی۔ اثرؔ صاحب نے ہم دونوں قربانی کے بکروں کو، بڑے شان دار ڈرائنگ روم میں لاکر بٹھادیا، بلب روشن کر دیئے ہیٹر جلادیا، اعلیٰ درجے کی دسکی کی بوتل، نہایت خوبصورت گلاس اور تلے کا جو کی ڈشیں ہمارے سامنے رکھوا کر بہت سی اگر بتیاں جلوادیں۔

اب ہم، دن بھر کے جھنجوڑے، بھنبوڑے اور روندے ہوئے، تھکے ماندے بندوں نے، اپنے اپنے پیمانے بھرے، "الحمدللہ" کہہ کر، دو دو گھونٹ پیئے، مجازؔ نے سگریٹ، اور میں نے سگار جلالیا۔ اور وہ ایک بغلی کمرے سے نکل کر آئے، ہمارے پہلو میں بیٹھ گئے۔ اور میر تقی میرؔ کے رنگ کی غزلیں، سنانے لگے۔ اور، میدانِ داد کے ہم دونوں کرائے کے ٹٹو، پھر دلکی، پوئی، لنگوری قدم اور سرپٹ کے جوہر دکھانے لگے۔

اور جب رات کے گیارہ بج گئے، تو مجازؔ کو، اُل اُلا کے قے ہو گئی، دوار دلی ان کو پکڑا کر خوابگاہ لے گئے، وہ فرش صاف کرنے لگے۔ اثرؔ نے میری طرف نگاہیں اٹھا کر، مجھے ٹٹولا کہ مجھ میں اگر دم باقی ہو تو وہ میرؔ کے رنگ کی غزلیں پھر سنانے لگیں، میں نے ان کے ارادے کو بھانپ کر گردن ڈال دی، اور محفل برخواست ہو گئی۔

اور صبح کے چار بجے میں نے جب مجازؔ کو جگایا، تو وہ یہ سمجھ کر کہ اثرؔ صاحب آ گئے، اس نے آنکھیں کھولے بغیر کہنا شروع کر دیا کہ سبحان اللہ جواب نہیں ہے اس شعر کا، اس داد پر جب میں ہنسنے لگا تو اس نے آنکھیں پھاڑ کر، مجھے دیکھا، اور اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کیا کہ جعفر علی خاں نہیں، جوشؔ صاحب آپ ہیں اور ہم دونوں اس وقت زندہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ جوشؔ صاحب کیا میری ماں نے مجھ کو صرف لٹنے کے لئے پیدا کیا تھا کہ جب میں جوان ہو جاؤں تو آپ کے ساتھ کشمیر جاؤں۔ اور کشمیر کی بسر کئے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ آپ میری بات مانیں، ابھی سویرا ہے، اس وقت یہاں سے چپ چپاتے بھاگ کھڑے ہوں اور کسی دُور کے ہاؤس بوٹ میں منتقل ہو جائیں۔ میں نے کہا اور یہ تمام سامان کیا ہم اپنے سروں پر لاد کے لے جائیں گے، اس نے کہا جس ہوٹل میں ہم نے کل رات بسر کی تھی وہیں ٹیکسیوں کا اڈا ہے، میں ٹیکسی کے ساتھ مزدور بھی لاؤں گا۔ ٹیکسی کو پھاٹک کے باہر ٹھہرادوں گا۔ اور مزدور یہاں سے سامان لے جا کر

ٹیکسی میں رکھ دیں گے۔ میں نے کہا بڑی اچھی تدبیر ہے، دیر نہ کرو، ابھی جاؤ۔

جب ٹیکسی آگئی اور سامان رکھ دیا گیا۔ میں نے کہا ڈرائیور صاحب ہم کو کسی ایسے ہاؤس بوٹ تک پہنچا دو جو یہاں سے دور ہو، اور ڈھونڈنے والے کو آسانی سے نہ مل سکے۔

ٹیکسی والے نے ہم کو غالباً ہائی کورٹ کی پشت کے ایک ایسے ہاؤس بوٹ میں لے جا کر ٹھہرا دیا، جو گزرگاہ عام سے دور تھا، وہاں پہنچ کر ہم دونوں نے اطمینان کی سانس لی۔ میں نے خط بنایا۔ حمام کیا۔ اور غسل خانے سے نکل کر جب ناشتے کی میز پر بیٹھا تو دیکھا مجاز سو رہا ہے۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اسکو جگاؤں، تنہا ناشتہ کیا، اور ٹہلنے نکل گیا۔ ٹہلنے میں زیادہ لطف نہیں آیا، اس لئے کہ حضرت اثر کے کلام کی لگاتار بارش سے میرا سر کپوہ چکا تھا، ہاؤس بوٹ میں جا کر سو گیا، دن کے ایک بجے آنکھ کھلی، دیکھا مجاز سو رہا ہے، اسے جگایا، دوپہر کے کھانے کا آرڈر دیا۔ مجاز سے کہا جلدی جلدی خط بنا کر نہا ڈالو، مجاز نے کہا کل خط بناؤں گا۔ میں نے کہا اچھا تو پھر حمام ہی کر آؤ۔ اس نے مسکرا کر کہا جوش صاحب اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم مسلمان ہیں پنڈت دوارکا پرشاد نہیں کہ اشنان کریں۔ میں نے کہا، یوں کہو کہ ہم گندے مشٹنڈے ہیں۔ ہم کو حمام سے کیا کام۔ اور مجاز نے، فقط دو چھوٹی کلیاں کر کے ناشتہ شروع کر دیا، اور مجھ کو گھن آنے لگی۔

کوئی چار بجے کے قریب جب میں نے دریا کا لطف اٹھانے کے لئے "شکارا" بلایا، اور شکارے پر اپنا افطار کا سامان رکھوا دیا، تو مجاز نے، بڑی بھیانک آواز سے کہا، جعفر علی خاں کی سی صورت کے کوئی صاحب، ہائی کورٹ کی سیڑھیوں سے نیچے اترتے چلے آرہے ہیں۔ میں نے کہا ابھی بھکیانہ نکالو منہ سے، کوئی اور ہوگا۔ مجاز نے کہا ارے جوش صاحب سچ مچ جعفر علی خاں چلے آرہے ہیں، آیئے سوفے کے نیچے لیٹ جائیں، میں نے کہا یہ تو شتر مرغ کی سی حرکت ہوگی، جو طوفان کے وقت ریگ میں اپنا منہ چھپا کر یہ سمجھ لیتا ہے کہ طوفان گزر گیا۔ اتنے میں دو تین وردی پوش آدمیوں کے ساتھ جعفر علی خاں ساحل پر آگئے، اور ان کے آدمی، کشتی بانوں سے ہمارے قیافے بتا کر پوچھنے لگے کہ وہ دونوں کس ہاؤس بوٹ میں ہیں۔

ہماری بدقسمتی دیکھئے کہ ہمارے ہاؤس بوٹ کا ملاح، جو سامان لینے باہر گیا ہوا تھا، وہ کم بخت ادھر سے گزرا۔ اور جب ہمارے قیافے بتا کر ہمارا پتہ پوچھا گیا، تو اس نے کہا آیئے میرے ساتھ، وہ ہمارے ہی ہاؤس بوٹ میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہم دونوں نے ان کو اپنی کشتی کی طرف آتے دیکھا تو ہم اس طرح سراسیمہ ہو گئے، جس طرح جیل سے بھاگے ہوئے چور، پولیس کو تعاقب میں آتا دیکھ کر، کانپنے لگتے ہیں۔

اتنے میں وہ آگئے، اور چھوٹتے ہی انھوں نے کہا، کیوں جوش صاحب، دوستوں کے گھر سے کوئی یوں بھی بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ اگر میرے یہاں کوئی تکلیف تھی، مجھ سے کہہ دیتے، میں اسے رفع کر دیتا۔ آپ کو معلوم نہیں، صبح جب میں آپ کے کمرے میں گیا اور کمرے کو خالی پایا تو میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی، میں نے اپنے آدمی، آپ کی تلاش میں چاروں طرف دوڑا دیئے، اور جس ہوٹل میں آپ ٹھہرے تھے۔

وہاں کے ایک ٹیکسی والے سے، جب یہ پتا چلا کہ آپ ہائی کورٹ کی پشت کے ہاؤس بوٹ میں ٹھہرے ہوئے ہیں، تو میں خود آیا اور آپ کو گرفتار کر لیا۔

ان کی شکایت سے میں شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا۔ اور کہا اثر صاحب یہ مجز ذا (مجاز) ہے جو مجھے آپ کے دولت کدے سے بھگا کر یہاں لے آیا۔ اس نے مجھ سے کہا کشمیر آنا اور ہاؤس بوٹ میں نہ ٹھہرنا ایک بے معنی سی بات ہے۔ انھوں نے کہا، مجھ سے کہتے ہیں، سرکاری ہاؤس بوٹ کا بندوبست کر دیتا میں نے آنکھیں جھکا کر کہا، بڑی غلطی ہوئی مجھ سے، میرا مزاج تو "دیوانہ را" ہوئے بس است" کا سا ہے، مجاز نے "ہو" کہا اور میں دیوانہ بھاگ کھڑا ہوا۔ میں دست بستہ آپ سے معافی کا طالب ہوں۔ آپ کریم ہیں، معاف فرما دیں۔

اثر صاحب نے مسکرا کر، مجھے گلے لیا۔ مجاز سے کہا تم بڑی بس کی گانٹھ نکلے۔ اس کی آنکھیں ربر پانے لگیں۔ اثر صاحب نے، ایک وردی پوش کو آواز دی۔ وہ آیا۔ انھوں نے کہا بوتل لاؤ، اس نے بوتل سامنے رکھ دی۔ مجاز، بوتل کی طرف، ہڑ بڑا کر ہمکنے۔ میں نے کہا، آفتاب ڈوبنے میں ابھی دس گیارہ منٹ باقی ہیں ٹھہر جاؤ، مجاز منہ بنا کر بیٹھ گئے۔ اور اثر صاحب نے اپنا کلام سنانا شروع کر دیا۔ اور ہماری جبر دریا کی تمنا پر پانی پھر گیا۔

دوسرے دن صبح کو ٹہل کر جب میں ہاؤس بوٹ میں آیا تو مجاز نے کہا، اب کیا کریں اثر صاحب نے تو گھر دیکھ لیا ہے۔ کسی اور ہاؤس بوٹ میں چلے چلیں۔ میں نے کہا وہ سمجھ جائیں گے کہ ہم ان سے منہ چھپا رہے ہیں۔ اس پر مجاز نے کہا تو پھر آج، ذرا جلدی کھانا کھا کر دو بجے ہی شکارے پر بھاگ کھڑے ہوں۔ اور گھوم گھام کر "نتھری اوک" والے جزیرے جائیں اور وہیں بیٹھ کر شغل کریں۔

اس تجویز پر عمل کر کے ہم لوگ دو بجے ہی شکارا منگا کر نکل گئے اور بہت سے مقامات کی سیر کر کے "نتھری اوک" کے جزیرے میں شام ہوتے ہی پہنچ گئے۔ بساط بادہ خواری بچھا دی گئی، اور دہ یک ہفتہ کو سلام کر کے پیمانے بھر لئے۔ اور آہستہ آہستہ پینے لگے اور مجاز نے بڑے دلولے کے ساتھ کہا اب پکڑ لیں ہم کو نواب جعفر علی خاں، اثر لکھنوی ان کی یہ آواز ابھی گونج ہی رہی تھی کہ دیکھا ایک شکارا دور سے ہماری طرف چلا آ رہا ہے۔ اتنے میں چاند کی روشنی تیز ہو گئی۔ دریا کا پانی چھلکنے اور گرم کرم کرنے لگا اور شیشوں کی آگ ہمارے جسم میں دوڑنے لگی۔ کہ اتنے میں وہ دور کا شکارا قریب آ گیا۔ مجاز نے شکارے کو غور سے دیکھا، ان کے کان کھڑے ہو گئے۔ مجھ سے کہا ارے جعفر علی خاں چلے آ رہے ہیں۔ میں نے کہا دیوانے ہو گئے ہو۔ انھوں نے کہا، ارے وہی عینک، ارے وہی پرشین کیپ۔ ارے وہی شیروانی ہائے رام، ہائے رے، اتنے میں شکارا ہمارے جزیرے سے آ کر لگ گیا۔ اور اثر صاحب اتر کر ہماری طرف آنے لگے، ہم کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے کہا۔ تو جہاں جا کے چھپا ہم نے وہیں دیکھ لیا۔ یہ مصرع سنا کر انھوں نے اپنا کلام سنانا شروع کر دیا۔

حکیم آزاد انصاری

رقّت انگیز حد تک نحیف اُلحثہ۔ چٹ کی طرح لانبے، ٹھنڈی پر سفید فرنچ کٹ داڑھی، سر پر بے پھندے کی، ترکی ٹوپی، چہرہ لانبا۔ نفاذ آنکھوں پر موٹے تالوں کی عینک سخن سنجوں کے امام مولانا حالی کے شاگرد۔ اور سہل ممتنع کے وحدہٗ لاشریک شاعر۔

حیدر آباد دکن میں ان سے تعارف ہوا تھا۔ اور پہلی ملاقات، کس قدر پھیکی سی رہی تھی۔

لیکن آہستہ آہستہ جب ان کے جوہر کھلنے لگے تو ہمارے مابین پینگ بڑھتے گیے۔

وہ اوپر سے خشک و بے رنگ نظر آتے تھے، لیکن اندر سے بے حد تر و تازہ اور رنگین تھے۔ اور اسی رنگینی کی بنا پر، وہ اپنے بیٹے، احسان احمد سے ناخوش ہو کر، جو کٹھ ملّا، اور اپنے باپ سے کھسانے والی بیوی کے اشاروں پر چلتا، اور بیوی کو باپ پر ترجیح دیتا تھا مستقل طور پر میرے پاس رہنے لگے تھے۔

ابرار ان کو چھیڑ کر لطف اُٹھاتے اور یہ کہا کرتے تھے کہ آزاد صاحب اگر آپ اپنی زبان کی موچ نکالنا چاہتے ہیں تو خدارا لکھنؤ جا کر، وہاں سال، دو سال قیام کیجیے۔ اور یہ ممکن نہیں تو ایک روز لکھنؤ کا ٹکٹ لیکر جائیے، چار باغ اسٹیشن پر اتر لیے اور وہاں کی کسی دیوار کو چھو کر ہی پلٹ آیئے، زبان آجائیگی آپ کو۔ اور آزاد صاحب، آپ تو آپ، زبان تو آپ کے استاد حالی کو بھی نہیں آتی تھی اور "وہ جو بر سے گا پانی تو جائے گا۔ دھل" کی حد تک، تعقید کے مرض میں گرفتار، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ مملکتِ تعقید کے وہ مطلق العنان بادشاہ تھے اور، آزاد صاحب، بگڑ جاتے اور دُو دُو تین تین دن تک ان سے بات نہیں کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے کسی "خدیجہ بی بی" کی لوحِ قبر کے واسطے ایک قطعہ کہہ کر، ابرار کو سنایا، جس کا قافیہ و ردیف تھا "عزت خدیجہ بی" "تربتِ خدیجہ بی" اور جب انھوں نے یہ شعر سنایا:۔

دل سے سارے عزیز کرتے تھے
عزت و حرمتِ خدیجہ بی

تو ابرار نے قہقہہ مار کر کہا، قرآن مجید کی قسم اب تو آپ گالیاں بھی بکنے لگے ہیں، انھوں نے تیوریوں پر بل ڈال کر کہا بھلا اس میں گالی کی کیا بات ہے۔ ابرار نے کہا، پہلے مصرع ہی میں ایک نگوڑی سی گالی بن گئی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:۔ دل سے۔ سارے عزیز۔ کرتے تھے؛ یعنی بڑے ولولے کے ساتھ، اُن مرحومہ کے، ایک دو نہیں، سارے عزیز ان کے ساتھ "کرتے تھے"۔ جناب والا "اس کرتے تھے" سے ذہن جس طرف منتقل ہوتا ہے۔ آپ اس سے واقف نہیں، خدا ہی کا بیٹا آئے گا، تو اس سے کہوں گا کہ بھائی اپنی ماں کی لوحِ مزار پر یہ قطعۂ تاریخ ہرگز نہ کھدوانا، ورنہ تمہاری والدۂ مرحومہ کی ناک کٹ کر رہ جائیگی۔

انھوں نے کہا لکھنؤ والوں کا مذاق متبذل ہے۔ اس لئے آپ کو میرے مصرعے میں ذم کا پہلو نظر آ رہا ہے۔ ابرار نے کہا جی ہاں یہ تو وہی بات ہوئی کہ اگر کسی حبشی کے گردے کے سے موٹے ہونٹوں کو دیکھ کر، ہم قہقہہ ماریں تو افریقہ والے یہ ارشاد فرمانے لگیں کہ تمہارا مذاق متبذل ہے۔ حضور والا متبذل چیز کو سن یا دیکھ کر، اعتراض کرنا تو اس امر کی دلیل ہے کہ اعتراض کرنے والا ابتذال سے کوسوں دور ہے۔ میں آپ کے اس مصرعے کے خاندان کے چند شعر اور مصرعے سناتا ہوں، آپ کو خود ہی پتا چل جائے گا کہ میرا اعتراض کس قدر درست ہے۔ سنیئے، ایک صاحب فرماتے ہیں "کھڑا ہے دیر سے در پر ترے۔ عشاق کا۔ مجمع" خدا لگتی کہیئے گا آزاد صاحب لفظ "مجمع" سے پہلے ہی ذم کا پہلو نکل آیا ہے کہ نہیں؟ اسی طرح ایک صاحب فرماتے ہیں۔

دل کو ہم اپنے، تسلی، شب غم دیتے ہیں
جس کو تم "دے" نہیں سکتے، اسے ہم دیتے ہیں

آپ سمجھے، لینے، دینے، کرنے، اور کرانے، میں کس قدر ذم کے پہلو ہیں؟

ایک اور مصرع سنیئے:۔ قید میں۔ یعقوب نے لی۔ گو نہ۔ یوسف کی خبر "خیال تو کیجئے۔ "خبر" تک آتے آتے، مبتدا ہی میں، ایک فحش بات نکل آئی کہ نہیں ایک اور صاحب ارشاد فرماتے ہیں "جو روح کو گھما دے جو قلب کو "تڑ" ۔ پا دے" آپ نے "پا دے" کے ساتھ یہ "تڑ" کی آواز سنی، فرمائیے کیا ارشاد ہے۔ لیکن پہلے منھ پر رومال رکھ لیجئے، اسی طرح ایک شاعر صاحب فرماتے ہیں:۔ ساقی ۔ مجھے۔ کوثر پہ۔ کھڑا کر کے دکھا دے۔" حضور والا، یہ فحش الثجا کی جا رہی ہے کس سے؟ حضرت علیؑ ایسے جلیل القدر امام سے استغفر اللہ بس ایک شعر اور سن لیجئے!۔

خدا کے واسطے۔ جلدی سے اب کہیں۔ گردن
کوئی۔ ملول کی۔ اس رہ گزار میں دبا رے

ارے دہائی لاٹ صاحب کی۔ حد کر دی ملولؔ صاحب۔ ذرا دیکھئے تو حضرت ملولؔ کس امر قبیح کی التجا فرما رہے ہیں۔ اور وہ بھی خدا کا واسطہ دے کر۔ انتہا کر دی بے شرمی و بے ادبی کی۔

اب ان مثالوں کی روشنی میں اپنا مصرع خود ملاحظہ فرمائیے "دل سے سارے عزیز۔ کرتے

تھے' ہائے مرجانے کے بعد خود خدیجہ بی اور ان کے ساتھ ساتھ' ان کے سارے عزیزوں کے ایک پوشیدہ شرمناک راز کو آپ نے افشا فرما دیا۔ انھوں نے کہا سمجھ میں آ گئی بات' واقعی بیہودہ مصرع ہے' بدل دوں گا اسے۔ یہ تھی انصاف پسندی حضرت آزاد کی۔

میں غزل کا مخالف اور وہ غزل کے شیدائی تھے۔ اس سلسلے میں اکثر میری ان کی دو دو چونچیں ہوا کرتی تھیں۔ اور' میری باتوں سے جل کر انھوں نے' میرے خلاف ایک بڑی اچھی رباعی کہی تھی آپ بھی سن لیں۔

کہتے ہیں کہ چھتی نہیں اب شان غزل　　ممکن ہو تو ڈھا دیجئے ایوان غزل
سرکار غزل میں پل کے غزل دشمنی یہ بیر　　افسوس ہے' اے نمک حرامان غزل

اور میں نے' اس قافیہ و ردیف میں' ایک جوابی فحش رباعی کہی تھی' جس کو اپنی شرمیلی قوم کے گوش گزار نہیں کر سکتا۔ ایک روز' شام کے وقت' جب کہ آزاد اور سید علی اختر' اختر "حیدر آبادی" میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میرا خانہ زاد سخاوت' مینا خانون اور گلاسوں کو' ایک جھلملاتی ٹرے میں لیکر آ گیا اگربتیاں جلا دیں۔ میں نے اپنا گلاس بنانے کے بعد' مزاحاً دو گلاس اور بھرے اور آزاد و اختر کے سامنے رکھ دیے۔ اختر گلاس سے ہٹ کر اس طرح پیچھے ہٹ گئے کہ نہیں ہٹتے تو وہ ڈنک مار دے گا۔ لیکن آزاد جمے بیٹھے رہے۔ میں نے اختر کے سامنے کا گلاس' یہ کہہ کر اٹھا لیا کہ :-

مے بگزار' مگن عرض کہ ایں جوہر ناب
پیش ایں قوم' بشورانۂ زمزم نہ رسد

اور آزاد سے کہا بسم اللہ اختر نے کہا خدا کے واسطے یہ اُمّ الخبائث ان کے سامنے سے ہٹا لیجئے' میں نے آزاد سے پوچھا کیا آپ بھی اس جوہر ناب کو اُمّ الخبائث سمجھتے ہیں؟ انھوں نے کہا نعوذ باللہ میں تو اسکو "عشق را پروردگار ے حسن را پیغمبرے" سمجھتا ہوں۔ اختر نے کہا آزاد صاحب' غالباً آپ مزاحاً ایسا کہہ رہے ہیں دل سے ایسا نہیں سمجھتے ہیں اس لئے کہ آپ خدا کے فضل سے مسلمان ہیں۔

انھوں نے کہا اختر صاحب' میرا لڑکا مسلمان اور کٹھ ملا ہے اور شاید اسی خطا پر حشر میں پکڑا بھی جاؤں گا۔ آزاد نے یہ کہا اور پیمانہ منھ سے لگا لیا۔ اختر اس طرح اچھل پڑے گویا بجلی کا جھٹکا لگ گیا ہے' اور ارے' رے' رے' لے' رے' کہتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔

اس روز کے بعد وہ میرے ساتھ برابر پینے لگے۔ پینے کے بعد' وہ کبھی بگڑتے نہیں' بشاش سے بشاش تر ہو جایا کرتے۔ اور بسا اوقات' دو پیگ پی کر کھڑے ہو جاتے اور پینے والوں کو چونچ دکھا دکھا کر' قوں' قوں' قوں' قوں' کی آوازیں نکالنے لگتے تھے۔

ایک بار جب وہ میرے ساتھ بمبئی گئے' اور اصغری بیگم کے وہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔

میں ان کو ساتھ لے کر سیر کرنے نکلا، اور دن بھر گھوم گھام کر سہ پہر کو گھر پلٹا، اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد، جب باہر جانے لگا تو میں نے کہا آزاد صاحب آپ بوڑھے آدمی ہیں، اب میرے ساتھ نہ چلیں، گھر ہی میں آرام کریں تو انھوں نے کہا بوڑھے تھوڑے ہوں گے آپ، میں تو بہتر سال کا نوجوان ہوں، آپ کے ساتھ چلوں گا۔ اور جب مالا بار کے باغ میں انھوں نے حبشیوں کے ایک پرے کو دیکھا تو چیخ ماری "ارے مر گئے!" تمام مجمع میں کھلبلی مچ گئی، لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے، ہر شخص انکی طرف دیکھتا کہ چیخ کی آواز انھیں کی جانب سے بلند ہوئی تھی، مگر ان کی سفید داڑھی دیکھ کر نظریں نیچی کر لیتا اور یہ خیال کرتا کہ اس عمر کا شخص، جو، بڑی سنجیدگی کے ساتھ، اپنی فرنچ کٹ داڑھی کھجا رہا ہے بھلا اس طرح چیخ مار سکتا ہے۔

افسوس کہ ہندوستان میں جیسی ہونا چاہئے تھی، ان کی قدر نہیں ہوئی۔ ہر چند وہ اپنے عصر کے بڑے بڑے مشہور شاعروں سے بمراحل بلند تھے، لیکن گمنام رہے، اور آج تک گمنام ہیں۔

وہ الفاظ کی نثری ترتیب کے ساتھ شعر کہتے ہیں اور اس ترتیب کے باوجود وہ اپنے افکار کی بلندی اور شعریت کی رنگینی کو مجروح نہیں ہونے دیتے تھے۔ نثری ترتیب کی پابندی کے ساتھ کہنے والے اور شعراء بھی گزر چکے ہیں مگر ان کی شاعری بول چال سے آگے نہیں بڑھ سکی مثلاً:-

جو دل سے لینے کا ڈھب جانتے ہیں — وہ ترکیب، ورکیب سب جانتے ہیں
یار کا سر چڑھ کے بوسہ لے لیا — آج تو ہم بھی بڑا جی ... کر گئے

وہ ہلے تب تمھارے وعدے پر
وہ تمھاری زبان سے نکلا؟

جب کہا اے دل زار تو اس نے یہ کہا — جی دل زار، دل زار کے ٹکڑے کر دے
ایک، دو، تین، چار، پانچ نہیں — سب خطائیں مری معاف کر دو
کہا خلوت میں مل بیٹھیں کہا خلوت میں مل بیٹھو — کہا ہیجان کا ڈر ہے کہا ہیجان تو ہوگا

میں نے کہا علاج دل دردمند کر
کہنے لگا وہ شوخ کہ بکواس بند کر

آپ خود ملاحظہ فرمائیں کہ ان اشعار میں رکھا ہی کیا ہے۔ لفظوں کے طوطے اڑا لئے گئے ہیں اور بس۔

اب نثری ترتیب میں آزاد صاحب کے اشعار آب دار ملاحظہ ہوں (طرح تھی" زماں اور بھی ہیں، مکاں اور بھی ہیں)

کبھی مے، کبھی درد مے کے علاوہ — مراعات پیر مغاں، اور بھی ہیں

فقط، وجہِ قربِ خدا ہی نہ سمجھو
مفاداتِ عشقِ بتاں اور بھی ہیں

اگر ارشادِ عالی ہو تو میں مایوس ہو جاؤں
بہت اغماض کی تکلیف فرمانے سے کیا حاصل

اگر آزاد سا درویش، نظر میں نہیں جچتا
تو جا، اور جا کے، اہل اللہ کی پہچان پیدا کر

دیکھنا، حضرت آزاد تو محفل میں نہیں
کہیں ہوئے نفوس فقرا آتی ہے

اک پائے مال جور سے، امید شکر جور
جا شکر کر کہ تاب شکایت نہیں رہی

فانیؔ بدایونی

تاج باختہ بادشاہوں، روزگار گزیدہ فن کاروں، امید بریدہ مریضوں، شب دریدہ محبوبوں، معشوق سوختہ عاشقوں، پریدہ رنگ بیوہ نوعروسوں، پسر مُردہ باپوں، اور پدر گم کردہ یتیموں کے خیمۂ سوگواری میں بیٹھ کر ــــــ مغموم قدرت نے ــــــ غم دوراں و غم جاناں کے آفات، درد کے مصائب اور شوپن ہار کی نامرادی کے طشت میں ــــــ دیوار گریہ کی مٹی کو ــــــ میر تقی میر کے آنسوؤں میں نم کر کے، گوندھا ــــــ اس مٹی سے ایک دبلا پتلا، گندمی رنگ کا پتلا بنایا۔ اس پتلے کے دھڑکتے دل میں تمام رنگ کی روح پھونک دی اور نام رکھ دیا اس کا فانی بدایونی۔ میں سب سے پہلے ان سے لکھنؤ میں ملا تھا، جہاں وہ اس طرح وکالت کرتے تھے کہ ہفتے میں، بمشکل دو ایک بار عدالت جاتے، زیادہ وقت محبوبہ کے گھر میں گھپاتے، اور فرصت کے اوقات میں، مقدمات کی مسلیں دیکھنے کے عوض، مجھ کو اپنی معشوقہ کی تصویر دکھاتے، اور پہروں اس کی داستانیں سناتے تھے۔

میں بھی اسی دور میں، خیر سے، عاشق تھا، اس لئے گھنٹوں ان کی صحبت میں بیٹھا کرتا تھا۔ ان کی محبوبہ لکھنؤ چھوڑ کر، جب آگرے چلی گئی تو وہ بھی "وکالت" کرنے آگرے چلے گئے اور میرے حالات نے مجھ کو حیدر آباد دکن پہنچا دیا۔ اور، بصورت من وہ کوچہ بار سوا شدم! کچھ روز کے بعد، وہ غم جاناں اور غم دوراں کے ستائے ہوئے حیدر آباد آئے۔ مہاراجہ سے ملا کر، میں نے ان کی ملازمت کی سبیل نکال دی۔ اور وہ کسی اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے، اور قیس عامری نے معلم کا لباس پہن لیا لیکن معلمی زیادہ دن چلی نہیں اور جب وہ ملازمت سے سبک دوش ہو گئے تو مہاراجہ کشن پرشاد نے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس زمانے میں وہ شاہزادہ معظم جاہ کی سرکار میں بھی جانے لگے لیکن کچھ بات نہیں بنی، اور انھوں نے وہاں اپنا وقت مفت ہی گنوایا۔

میرے تمام معاصرین میں وہ سب سے بمراحل بلند مرتبہ غزل گو شاعر تھے میں ان کی غم پرستی کا قائل نہ سہی لیکن یہ اعتراف ضرور کروں گا کہ ان کی غزل کا۔ قافیہ پیمائی سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں تھا ان کی ہر غزل ایک مخصوص مزاج اور ایک مخصوص طرز فکر کی حامل ہوتی تھی جس کی آج تک کوئی نقل بھی نہیں کر سکا ہے۔ زندگی کی مسلسل ناکامیوں نے ان بے چارے کو اس قدر ادھیڑ کر رکھ دیا تھا کہ زندگی کے دور آخر میں، ان کو اپنے انتہائی وفادار دوستوں پر بھی اعتماد باقی نہیں رہا تھا۔ اور وہ صرف یہیں تک آکر ٹھہر نہیں گئے تھے، بلکہ یہاں تک سمجھنے لگے تھے کہ ان کے تمام دوست، ان کی دشمنی پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں اور تو اور انھیں میری طرف سے بھی بدگمانی پیدا ہو گئی تھی کہ میں بھی ان کے درپے آزار ہو گیا ہوں۔ حالانکہ میں ان کا عاشق دوست تھا۔

ان کی بدگمانی اس قدر بڑھ چکی تھی کہ اگر وہ کسی مچھر کو اپنی طرف آتا دیکھ لیتے تھے، تو کہتے تھے ہو نہ ہو، یہ ملیریا کا مچھر میرے کسی دیرینہ رفیق نے اس لئے بھیجا ہے کہ یہ مجھے کاٹ لے، اور میں ملیریا میں گرفتار ہو جاؤں، وہ طبعاً غم دوست، اور نشاط دشمن انسان تھے اور معاشقہ و معاش کی پیہم ناکامیوں نے ان کو اس عقیدے پر قائم اور اس وہم میں مبتلا کر دیا تھا کہ ہنسنا یا قہقہہ لگانا ایک ناقابل معافی گناہ ہے، اور حیات انسانی ایک بے گور و کفن لاش ہے، اور لاش کے سرہانے کھڑے ہو کر ہنسنا سب سے بڑی شقاوت کا سب سے بڑا مظاہرہ ہے۔ جہاں تک کہ انسان کی دردمندی کا سوال ہے، میں ان کا، سو فیصد ہم خیال ہوں۔ اور کس کی یہ مجال ہے کہ وہ "قید حیات و بند غم، اصل میں دونوں ایک ہیں" کا انکار کر سکے۔ لیکن اس کے باوجود میرا یہ خیال ہے کہ دانائی اور ذہن کی توانائی کا یہ فرمان ہے کہ غم جب دل پر دستک دے، ہم اس کے دروازہ کھول دیں، اس کو مہمان ٹھہرائیں — لیکن دوسرے دن، کرن پھوٹنے سے بہت پیشتر ہی، ہم اس کو اپنے دل سے رخصت کر دیں۔ اس لئے کہ:

غم نہیں ہوتا ہے، آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن، شمع ماتم خانہ ہم

افسوس کہ میرے دوست فانی کو جیسے، اور بہر حال خوش رہنے کا یہ گر معلوم نہیں تھا وہ غم کو پالتے پوستے، پروان چڑھاتے، چھاتی سے لگائے رہتے، اور دودھ پلاتے تھے اور اسی بنا پر میں کہتا ہوں کہ وہ "ابوالحزن نہیں، ام الحزن تھے ان کے تمام احباب میں صرف ایک میں تھا کہ انھیں گاہ گاہ مسکرانے اور ہنسنے پر مجبور کر دیا کرتا تھا۔ ورنہ کہاں ہنسنا، کہاں فانی ایک بار میں نے دیکھا کہ وہ کسی داڑھی والے کے ساتھ موٹر میں جا رہے ہیں، ہر چند میں سن چکا تھا کہ کل ان کا ڈر بدایوں سے آ چکا ہے لیکن شام کو جب ان کے پاس پہنچا تو انتہائی سنجید گی

کے ساتھ ہیں نے پوچھا فانی صاحب کیا آپ کے والد ماجد تشریف لے آئے ہیں؟ انھوں نے کہا یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، ان کے انتقال کو پورا ایک زمانہ گزر چکا ہے، میں نے کہا پھر یہ آج کس کے ساتھ آپ ریلوے اسٹیشن کے سامنے سے موٹر میں بیٹھے جارہے تھے انھوں نے کہا۔ ارے بھائی وہ تو میرا بیٹا ہے، میں نے کہا مبارک ہو پسر پدر نما، اور وہ ہنسنے لگے۔

لیکن ہنسنے کے بعد ان کے چہرے پر خوف طاری ہو گیا کہ اب اس ہنسنے کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا اور جس قدر ہنسا ہوں، اسی قدر مزید رلایا جاؤں گا۔

ایک بار ہم لوگ شغل کر رہے تھے۔ میں نے کہا ارے فانی کبھی کبھار تو ایک آدھ پیگ پی لیا کرو۔ خدا جانے وہ اس وقت کس موڈ میں تھے، انھوں نے ایک گلاس پی لیا۔ لیکن جب میں نے ان کے گلاس میں دوسرا پیگ ڈال دیا، تو انھوں نے کہا بس میں نشا کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد وہ چارپائی پر لیٹ گئے۔ اشارے سے مجھے بلایا کہا ذرا سا جھک کر میری بات سنو، اور جب میں اپنے کان ان کے لبوں کے قریب لے گیا، تو انھوں نے بڑے ہمیرانہ انداز میں، بڑی آہستگی سے کہا دیکھو جوش تم شراب پی کر غم غلط کرتے ہو، غم اللہ کی بخشی ہوئی ایک بہت بڑی دولت، اور ایک گراں قدر امانت ہے اور اس کو غلط کرنا کفرانِ نعمت ہے۔ حشر کے دن یہاں تک تو ہو سکتا ہے کہ اللہ شرکو نسانک کو بخش دے۔ لیکن یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ غم غلط کرنے والوں کو بھی معاف فرمادے وہ پلان چٹ کے ذریعے سے "روحیں" بلایا کرتے تھے اور کچھ دن کے لئے انھوں نے مجھ کو بھی اس ڈھرے پر لگا دیا تھا۔ پلان چٹ لکڑی کا ایک قلب صورت آلہ ہوتا ہے، جس کے ایک طرف چھوٹے چھوٹے پہیئے، اور ایک طرف نسپل لگانے کا سوراخ ہوتا ہے، اور جب کسی کی "روح" بلانے کے واسطے ذہن پر زور ڈالا جاتا ہے تو وہ آلہ خود بخود معرض حرکت میں آجاتا اور کاغذ پر جوابات لکھنے لگتا ہے۔

ایک بار فانی، آزاد انصاری، علی اختر اور مودودی وغیرہ کے سامنے میں نے غالب کی روح کو بلا کر کہا تھا، اپنا اسم گرامی لکھ دیجئے، پلان چٹ نے "غالب مغلوب" لکھ دیا، میں نے کہا یہ مغلوبیت کیسی پلان چٹ نے جواباً یہ لکھا، اہل دنیا کی ناقدر شناسی کے باعث اب تک اپنے کو مغلوب سمجھ رہا ہوں۔ میں نے کہا میں پرسوں آپ کے مزار پر گیا تھا انھوں نے لکھا میرا قیام مزار میں نہیں ہے، میں نے پوچھا پھر کہاں ہے انھوں نے لکھا، اس مقام پر جس کا کوئی نام نہیں۔ میں نے پوچھا شراب [illegible] کیا ارشاد ہے انھوں نے لکھا ظرف لازم ہے میں نے آزاد انصاری کی [illegible] پوچھا یہ میرے داہنے طرف کون صاحب بیٹھے ہیں انھوں نے لکھا میرا پوتا ہے میں نے [illegible] انصاری، آپ کے پوتے کیسے ہو سکتے ہیں انھوں نے لکھا یہ میرے شاگرد

حالی کے شاگرد، اور اس رشتے سے میرے معنوی پوتے ہیں۔ ایک بار فانی نے ایک طوائف کی "روح" کو بلا کر مزاج پوچھا اس نے لکھا، آپ بے وفا کو میرے مزاج سے کیا سروکار آپ تو مجھ کو چھوڑ کر ایک قطار پر مرنے لگے تھے، اچھا ہوا کہ اس نے آپ سے دغا کی، اور میرا دل باغ باغ ہوگیا۔ ڈاکٹر واگرے نے ایک روز مجھ سے کہا گنگا دھر تلک کی روح کو بلا کر ان سے پوچھے ہندوستان کب آزاد ہوگا، تلک نے ہندی میں جواب لکھا۔ میں نے کہا واگرے صاحب ہندی میں نہیں جانتا آپ پڑھ کر بتائیں، ڈاکٹر نے کہا اس میں لکھا ہے۔ بیس اکیس برس کے بعد۔*

فانی صاحب نے ایک رات کو میر تقی میر کی روح کو بلا کر پوچھا اقبال کیسے شاعر ہیں پلان چٹ نے لکھا، میں ان کو آدھا شاعر مانتا ہوں اس لئے کہ وہ دوسروں کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں اور ان کی ذاتی پونجی بالکل ادھوری ہے۔

ایک بار مہاراجہ کشن پرشاد نے مجھے اور فانی کو پلان چٹ سیمنٹ بنا کر یہ کہا میں نام نہیں بتاؤں گا، آپ میری ذات میں ڈوب کر میرے مطلوب بزرگ کی روح کو بلائیں فانی نے کہا یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے جوش صاحب آپ کی مشق اب مجھ سے بڑھ چکی ہے آپ ہی بلائیں میں نے ذہن پر زور ڈالا اور خلاف معمول، تاخیر کے ساتھ، آلے میں حرکت پیدا ہوئی مہاراجہ نے کہا میرا اسلام کہہ دیجئے، آلے نے لکھا "خوش باش اور مہاراجہ رونے لگے میں نے دریافت کیا کہ آپ روئیوں پڑے انھوں نے کہا میں نے اپنے باپ کی روح کو بلا لیا اور ابھی میرے سوا یہ بات کسی کو معلوم نہیں کہ وہ میرے سلام کے جواب میں خوش باش کہا کرتے تھے اگر آپ میرے دل کی بات پوچھیں تو میں عرض کروں گا کہ جب تک روح کی حقیقت کا مکمل طور سے انکشاف نہیں ہو جائے گا، اور دو دو چار کی طرح یہ بات بھی ثابت نہیں ہو جائے گی کہ روح، دراصل ایک لافانی شے ہے، اور وہ بعض معلوم یا نامعلوم اسباب کی بنا پر خارج سے آکر انسانی جسم میں داخل ہو جاتی یا داخل کر دی جاتی ہے اور وہاں کچھ روز قیام کرنے کے بعد، جسم سے پرواز کر کے پھر خارج میں چلی جاتی ہے، اس وقت تک یہ مسئلہ قطعی طور پر ایک غیر علمی طور پر، ایک غیر علمی اور نامعتبر بنا رہے گا، اور پلان چٹ یا دیگر عملوں یا منتروں کی وساطت سے "روحوں" کا اس زمین پر طلب کیا جانا، اور ایک شعور کے مانند ان کا باتیں کرنا، سوالوں کے جواب دینا، یا معاملات دنیا پر متصرف و اثر انداز ہونا قابل تسلیم نہیں سمجھا جائے گا۔

ایک طرف ارباب نقل و روایت کا گروہ روح کے لافانی ہونے اور اس کے تصرفات کا قائل ہے، اور دوسری طرف ارباب عقل و درایت کی جماعت ہے، جس کا یہ خیال ہے کہ اعضائے انسانی اور ان کے وظائف کے توازن و ہم آہنگی سے جو حرارت عزیزی معرض وجود میں آتی ہے اسی کو

* یہ سوال غالباً ۱۹۲۲ء میں کیا گیا تھا۔

۔ ح کہتے ہیں، اور انسان کی موت کے بعد وہ دو ٹکرائے ہوئے ریلوے انجنوں کی اسٹیمر کے
یند ہوا میں منتشر ہو کر رہ جاتی ہے۔

الغرض جتنے منہ ہیں اتنی باتیں ہیں لیکن فرق اتنا ہے کہ ارباب نقل "کانوں" کے سہارے
اور ارباب عقل "کھوپڑی" کے بوتے پر رائے قائم کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ کھوپڑی کے مقابلے
میں کان کوئی وقعت نہیں رکھتے، اس لئے معقول آدمی ارباب عقل کی باتوں کو وزنی سمجھتے ہیں۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ پلان چٹ پر اگر ارواح کا تصرف نہیں ہوتا، تو پھر اس کی جنبش و نویسندگی کی
علت کیا ہے؟ سو میں یہ جواب دوں گا کہ اس کی علت ہے، خیال کی مرکوزیت کا دباؤ، اور دماغ
کے امواج برقی کا تموج وارتعاش۔ اور یہ جواب کوئی انوکھا جواب نہیں ہو گا، اس لئے کہ ہم بارہا
دیکھ چکے ہیں کہ "نظر بھر کر دیکھتے ہی"، پیپر ویٹ معلق ہو جانا، اور کرسی چھت سے جا کر لگ جاتی ہے جس
سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ خیال مادے پر تصرف کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔

اگر میرا یہ جواب سن کر کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ اگر یہ سارا خیال ہمارے دماغ ہی کا ہے تو پلان چٹ
کو ہمارے دماغ کا حلقۂ معلومات تک محدود و محصور رہنا چاہیئے تھا، لیکن بعض اوقات وہ آلہ ایسی
باتیں بھی معرض تحریر میں لے آتا ہے، جو ہمارے دائرہ علم سے قطعی خارج ہوتی ہیں، اس بنا پر تصرف
ارواح کے سوا اس کی اور کیا علت ہو سکتی ہے؟ تو میں یہ عرض کروں گا کہ انسانی دماغ کے گوشوں اور
تحت شعور کے تہ خانوں میں دنیا کا وہ کون سا علم ہے جو موجود نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم کو اب
تک اس کا پتا نہیں چل سکا ہے۔

صد حیف کہ ابھی تک نفس انسانی کا غرفہ ایک ربع سے زیادہ نہیں کھلا ہے، اس لئے ہم اپنے
علم اور اپنی ذات کو محدود سمجھ رہے ہیں۔

لیکن جب لاکھوں یا کروڑوں برس کے بعد غرفۂ نفس، پورے طور پر کھل جائے گا اور غنچۂ
انسانیت کھل کر گل شاداب بن جائے گا تو اس کی خوشبو آفاق کا محاصرہ کرے گی۔ اور ہم کو معلوم
ہو جائے گا کہ یہ تمام کائنات ہمارے نفس کے اندر سانس لے رہی ہے، اور یہ پورا نظام شمسی
ہمارے کاسۂ سر کا طواف کر رہا ہے۔

آغا شاعر قزلباش

داغ کے ممتاز شاگرد دہلی کے نامور استاد۔ روایات کے بندۂ اوہام کے پتلے بھوتوں چڑیلوں کے تصور سے لرزاں، بلند آوازوں سے ترساں۔ حقے کے دشمن۔ سگریٹ بازوں سے ان بن۔ آغاز میں زردار، انجام میں پریشاں روزگار۔ جوانی میں یوسف کنعاں، بڑھاپے میں آئینہ پریشاں بہر نفس کراہ، تحت اللفظ کے بادشاہ۔ اول اول، رند خرابات، آخر آخر مبتلائے صوم و صلوٰۃ پھر بھی پرستار خوباں شیریں حرکات۔ ایک روز، وہ میرے دریا گنج (دہلی) کے مکان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے، سر پر جرنیلی ٹوپی، اور اس پر لٹ پٹی، دستار بندھی ہوئی تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی فوجی کپتان بیٹھا ہوا ہے کہ اتنے میں چھوٹے دادا نے کھیر کھا کر۔ اس کا خالی ٹھلوا سنگین فرش پر تڑ سے ٹپک دیا، وہ اچھل پڑے، مجھ سے کان میں کہا ذرا چھوٹے دادا کو سمجھا دیجئے کہ میں یہ کمر بہیر آوازیں برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے چھوٹے دادا کو سمجھا دیا۔ لیکن وہ کب ماننے والے تھے، دوسرا ٹھلوا بھی خالی کر کے، تڑاق سے فرش پر دے ٹپکا، آغا صاحب پھر زور سے اچھل گئے۔ کہا اب یہاں نہیں بیٹھوں گا۔ میں نے بہت روکا، وہ نہیں مانے، اور جب تانگہ پر بیٹھ کر جانے لگے تو جھک کر مجھ سے کہا اپنے ان گھامڑ چھوٹے دادا سے گھر جا کر پوچھئے گا کہ وہ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں۔ انھوں نے "چھوٹے دادا" اس طرح دانت پیس کر کہا کہ ہر چند میں نے ضبط کیا، لیکن قہقہہ نکل ہی گیا، اور وہ تا حد نظر مجھے گھورتے چلے گئے۔

جاڑوں کا زمانہ تھا۔ ایک روز میں دوپہر ڈھلے، ان کے وہاں پہنچا، معلوم ہوا محلے کی مسجد میں نماز پڑھنے گئے ہیں، ابھی آجائیں گے۔ مجھے شرارت سوجھی، ان کے بستر پر سر سے پاؤں تک لحاف اوڑھ کر لیٹ گئے تھوڑی دیر میں وہ آئے، بستر کی جانب دیکھا، سمجھے ان کا کوئی بٹیا سو رہا ہے۔ وہ تخت پر، آہ آہ کر کے بیٹھ گئے، میرے لحاف کے اندر سے بھی آواز آئی آہ آہ

وہ چوکنا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے، اور یہ سمجھ کر کہ میرے کان بج رہے ہیں انھوں نے موزہ اتارتے ہوئے حسب عادت دوبارہ آہ آہ کی آواز نکالی۔ اور جب میرے لحاف سے اس کے جواب میں پھر، آہ آہ کی آواز بلند ہوئی تو وہ خیال کر کے ہو نہ ہو کوئی جن یا بھوت ان کی چارپائی پر دراز ہے چیخ مار کر کمرے سے باہر نکل گئے، اور دعائیں پڑھنے اور مولا مشکل کشا مدد دے کا نعرہ لگانے لگے۔ اور لحاف الٹ کر جب میں نے پوچھا ارے آغا صاحب ہوا کیا وہ میری آواز پہچان کر دوبارہ کمرے میں آئے اور کہنے لگے تو ایک دن دہلا کر مجھے مار ڈالے گا۔

ایک روز جھٹپٹے وقت بوتل جیب میں رکھ کر، میں ان کے یہاں پہنچا۔ زینے کی زنجیر کھڑکائی، ایک چھوکرا آیا۔ میں نے کہا آغا صاحب سے جا کر کہہ دو کہ ایک شاعر اپنی غزل پر اصلاح لینے آیا ہے اس چھوکرے نے آکر جواب دیا کہ آغا صاحب کی طبیعت خراب ہے۔ کل آئیے گا میں نے لڑکے سے کہا کاغذ اور پنسل لا دو وہ لے آیا۔ میں نے لکھا آغا صاحب قبلہ میرا نام ہے عبدالصمد خاں پشاور کا رہنے والا ہوں، آج رات کے دس بجے مشاعرہ ہے، خدا کے واسطے میری غزل بنا دیجئے میں اسکا فوری نذرانہ بھی پیش کروں گا، اور اگر آپ نے مجھے فوراً اوپر نہیں بلا یا تو میں آپکی تاک لگائے اوپر بیٹھا رہوں گا۔ سمجھے آپ

میرا پرچہ پڑھتے ہی انھوں نے اس خادم زادے سے کہا، ابے جلدی سے زینے کے دروازہ میں زنجیر لگا دے۔

جب دروازہ دھڑام سے بند ہو گیا، تو اوپر منہ اٹھا کر، اور آواز بدل کر میں نے پکارا آغا صاحب، آغا صاحب، میری آواز بلند ہوتے ہی بالا خانے کے برآمدے میں کھٹ پٹ سی ہوئی اور یہ دیکھا کہ وہ، اس زاویے کے ساتھ تیجے پر کھڑے ہوئے ہیں کہ اگر گولی ماروں تو ان کے نہ لگ سکے۔

میں نے بدلی ہوئی بھیانک آواز میں کہا کیا آپ آغا صاحب قبلہ ہیں، یہ سنتے ہی وہ فوراً پیچھے ہٹ گئے اور اپنی باریک آواز میں پوچھا، عبدالصمد خاں کیا آپ واقعی آپ مجھکو مار ڈالیں گے، میں نے جواب دیا بے شک آپ ایک آفریدی پٹھان کی بے عزتی کر کے زندہ نہیں رہ سکتے۔ دو استادوں کو جان سے مار چکا ہوں، اب آپ کی باری ہے یہ سنتے ہی ان کے رندھے ہوئے گلے سے "ایں، ایں، ایں" کی صدا کچھ ایسے کسی کے ساتھ نکلی کہ میرا قہقہہ نکل گیا۔ قہقہے سے وہ مجھے پہچان گئے جب میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ مجھے دیکھتے ہی دھڑام سے چارپائی پر گر گئے، میں دوڑ کر ان سے چمٹ گیا اور وہ ادھی ادھی سانسیں لے کر کہنے لگے، ذرا میرے سینہ پر ہاتھ رکھ کر دیکھ دل کیسا دھڑ دھڑ ہو رہا ہے، تیرا مذاق ایک دن میری جان لے لے گا اور تو دل تھام کر رہ جائے گا

ہائے زمانے کیوں ایسا مذاق کیا تھا۔ آہ، آہ، آہ، آہ

ایک روز کوئی چار بجے ان کے وہاں پہنچا، تو دیکھا کہ وہ رومال منھ سے ڈھانپے رو رہے ہیں، میں نے کہا ارے یہ وہی آٹھ پہر کا رونا دھونا یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ یہ پورا عالم کون و فساد ایک دیوار گریہ ہے، آپ اور فانی دو جھوٹی ہیں، جو اس دیوار کے سائے میں بڑے استقلال کے ساتھ بیٹھے مسلسل رویا کرتے ہیں، اور یہ کرا رحنی، ایک دائمی یوم عاشور ہے، جس میں آپ اور فانی علی الاتصال ماتم فرمایا کرتے ہیں۔ انھوں نے ڈبڈبائی آنکھیں اٹھا کر کہا میرے رونے کی ہنسی نہ اڑاؤ، میرا شباب بھی وہ عالم تھا کہ ہزاروں حسین عورتیں میرے پیاروں طرف منڈلایا کرتی تھیں، اور ایک رات کو تو عورت ایک چھری لے کر آ گئی تھی کہ اگر مجھ سے منھ پھیرا ؤ گے تو تمھاری گردن کاٹ دوں گی اور پھر اسی چھری سے خود کشی کر لونگی۔ لیکن اب...... یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگے میں نے تسلی دی، لیکن وہ روتے ہی رہے اور پھر کہنے لگے، جوانی میں جی بھر کے ہنسا تھا اب اس کا جرمانہ ادا کر رہا ہوں، کیا خوب کہا ہے میر انیس نے۔ روئے خزاں میں وہ، جو ہنسا ہو بہار میں سہ

پھر انھوں نے مجھکو قریب بلا کر نہایت دھیمی آواز میں کہا کہ ہمارے محلہ کا گرجا تم نے دیکھا ہے اس گرجا گھر میں ایک ادھیڑ سی میم صاحب رہتی ہیں، وہ جو کہا جاتا ہے چور، چوری سے گیا کیا ہیرا پھیری سے بھی گیا میں آتے جاتے اس امید میں کہ شائد اللہ کی کوئی صورت نکل آئے اور بڑھاپا مزلے سے کٹ جائے انکو گھورا کرتا تھا، اور وہ آنکھیں جھکا لیا کرتی تھیں لیکن، آہ" آج یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگے میں نے کہا پہلے بات ختم کر لیجئے پھر جی بھر کر رو لیجئے گا انھوں نے آنسو پونچھ کر کہا آج جب میں نے گلی میں کھڑے ہو کر اس میم کی طرف آنکھ اٹھائی تو...... اللہ کی آواز میں رقت پیدا ہو گئی میں نے کہا آغا صاحب بات تو پوری کہہ دیجئے انھوں نے کہا جب نکڑ لے میں نے اس کی طرف آنکھ اٹھائی تو اس نے میری طرف منھ کر کے تھوک دیا، ہائے تھوک دیا اتنا کہ وہ پھر رونے لگے کوئی دوسرا ہوتا تو شائد اس بات پر ہنس پڑتا لیکن مجھ پر رقت تاری ہو گئی، میں نے سوچا قدرت کس قدر سفاک ہے ہمکو پھول سا چہرہ دے کر پھر اسے بڈھے کی شکل میں تبدیل کر دیتی ہے کوئی حد بھی ہے اس بے کراں شقاوت کی۔



سردار روپ سنگھ

گورے چٹے، بالا بلند، کھڑے ناک نقشے کے خوش چشم، ہنس مکھ، لطیفہ سنج، سخن شناس انجمن آرا، مہمان نواز، یار باش، دوست پرور، اور خوبان نشیں روپ سنگھ سارنگیوں کی روں روں، طبلے کی تھاپ، مینا کی قلقل، مجیرے کی کھن کھن، گھنگھروؤں کی چھم چھم حسینوں کے خم و چم راگنیوں کے زیر و بم اور یاروں کے ادھم کے رسیا اور اپنے دور کے کھنیا تھے۔

وہ میری ننہال، دھول پور کے جاگیردار مہاراجہ کے پرلے یار لیکن آگے چل کر مہاراجہ کے معتوب سردار شراب خانہ ساز کے پرستار اور اختراعات کے اوتار تھے۔

آفتاب کے غروب ہوتے ہی ان کی انجمن میں صبح طالع ہو جاتی اور پیمانوں سے کرنیں پھوٹنے لگتی تھیں اور ڈاکٹر موہن لال، سردار تارا چرن، رن بیر سنگھ، محسن، سردار سپاکول صاحب خوش حال چند نگم (عرف نعینا) اور ٹھاکر پائی عرف "تیری پہائی" وغیرہ کے قہقہے اور انتری، مشتری اور ڈھولی کے زمزمے گونجنے لگتے تھے۔

ہر چند فرنگی کا لگایا ہوا، ہندو مسلم منافرت کا پودا تناور ہو چکا تھا، لیکن روپ سنگھ پر اس منحوس درخت کی چھاؤں تک نہیں پڑی تھی، ان کے زیادہ تر دوست مسلمان تھے، چھوت چھات سے انھیں دور کا بھی واسطہ نہیں تھا، وہ مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے انھیں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے تھے۔

سردار اجمیر سنگھ، انسپکٹر جنرل ان کے چھوٹے بھائی، پوجا پاٹ کے اتنے پابند تھے کہ انھوں نے کوٹھی کے ایک کمرے کو بت خانے میں تبدیل کر دیا تھا، روپ سنگھ اور ہم دونوں ان کا مذاق اڑاتے اور یہ کہا کرتے تھے کون سی ایسی صبح گھڑی آئے گی کہ تم بت خانے سے نکل کر سرانجانے میں داخل ہو جاؤ گے۔

---

[1] ان کا اس سے پیشتر بالتفصیل ذکر آچکا ہے اس لئے اختصار سے کام لوں گا [2] ان کے پاس شراب کا ایسا نایاب نسخہ تھا کہ انکی شراب کے آگے ولائتی شراب پانی بھرتی تھی [3] طوائفیں

ہر صبح کو اجیر سنگھ اور ان میں کھانا پکوانے کا اس قدر زبردست ہنگامہ ہوا کرتا تھا کہ اللہ کی پناہ بلا ناغہ اجیر سنگھ ان سے آکر پوچھا کرتے تھے کہ بھائی صاحب آج کیا پکے گا۔ اور اس پر دونوں بھائیوں کے درمیان آدھ گھنٹے دن تک مکالمت ہوا کرتی تھی کہ بکری کا گوشت نہیں، تیتر پکے گا، نہیں نہیں تیتر کے عیوض بٹیر پکیں گے ترکاریوں میں آلو، نہیں، نہیں آلو کے بجے گوبھی آئے گی، گوبھی نہیں ٹماٹر، اور میں اس مکالمت سے تنگ آکر بھاگ کھڑا ہوتا۔

ان کی صحبت کی ایک رات ایتک یاد ہے، جو بلا کی دلکش تھی، اور قیامت کی بھیانک بھی غالباً وہ ہولی یا دیوالی کے جشن کی رات تھی، دھول پور کی اندری، مشتری اور چھوٹی کے علاوہ آگرے سے بھی پچاس، پانچ حسین اور سُریلی طوائفیں بلائی گئی تھیں، اور دو بجے رات تک گانے بجانے، پینے پلانے کا سلسلہ قائم رہا تھا۔ اور طوائفوں کے ساتھ تمام بادہ خوران کرام نے بھی رقص فرمایا اور ہر نوعیت کا لطف اٹھایا تھا۔

اس جشن میں گوالیار کے ایک دیو پیکر سردار بھی شریک تھے جو صبح سات بجے سے آدھی رات کے بعد بھی مسلسل پی رہے تھے اور دو بجے رات کے قریب ابھری ابھری سانسیں لے رہے تھے ابھی محفل جمی ہوئی تھی کہ وہ گوالیار کے سردار صاحب اٹھے غسل خانے کی طرف دو قدم لڑکھڑاتے چلے اور دھڑام سے فرش پر گر پڑے، اور گرتے ہی دم توڑ دیا۔ اللہ اکبر ان کے دم توڑتے ہی وہ جشن جو ابھی نغموں کے دریا میں تیر رہا تھا اسقدر بھیانک ہوگیا کہ میں نے رئیس احمد سے کہا، آؤ اب یہاں سے بھاگ کھڑے ہوں ہم دونوں بھائی روپ سنگھ کے باڑے سے اپنے نانا کے باڑے کی طرف جانے کے لئے جو وہاں سے فقط چند قدم کے فاصلہ پر تھا، باہر نکلے باہر آتے ہی جب ہوا لگی اور سڑک کے ہر بلب میں دو دو بلب نظر آنے لگے تو میں سمجھ گیا کہ آج نشا بے حد تیز ہو گیا ہے، رئیس کو دیکھا، وہ بھی بری طرح لڑکھڑا رہے تھے۔ آج بڑا ہاتھی پچھاڑ نشا ہے آؤ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر چلیں، لیکن نشہ اس قدر شدید تھا کہ بار بار ہم بری طرح لڑکھڑاتے اور بار بار ہمارے ہاتھ چھوٹ چھوٹ جاتے تھے۔ رئیس داہنی طرف اور میں سڑک بائیں طرف پہونچ جاتا تھا۔ دو تین منٹ کا راستہ دس بارہ منٹ میں طے کر کے جب ہم نے حویلی میں قدم رکھا، تو میں نے کہا دیکھو رئیس نشا اس وقت اس قدر گھٹا ٹوپ اور گھنگھور ہے کہ ہم تم زینے پر چاروں ہاتھ پاؤں سے گھوڑے بن کر چڑھیں گے۔ ورنہ ہمارے سر پاش پاش ہو کر رہ جائیں گے۔

میری زندگی کا وہ پہلا اور آخری مرد افگن نشہ تھا۔ صبح کو، جب پہاڑ سا سر اور رالا کی طرح بھڑکتا معدہ لئے بیدار ہوا، کلیاں اور غرارے کر کے لیمو کا ایک پورا گلاس پیا۔ اور قسم کھائی کہ اب جیتک جیوں گا، چار پیگ سے زیادہ کبھی نہیں پیوں گا۔ اور اس قسم پر آج تک

قائم ہوں ۔ اور مرتے دم تک قائم رہوں گا۔

ایک بار ابرار دھول پور آئے اور روپ سنگھ کی صحبت میں شریک ہوئے اس وقت تک انھوں نے ناپی کر گالیاں دینا شروع کیا نہیں تھا لیکن بگڑنے لگے تھے۔

جب محفل برخواست ہوئی ، میں اور رئیس دونوں روپ سنگھ کی خواب گاہ میں لیٹ گئے اور ، ابرار سے کہا گیا کہ وہ زنانے مکان کے دروازہ کے سامنے کی کوٹھی میں جاکر سو رہیں۔

ابھی ہم لوگ کروٹیں بدل ہی رہے تھے ، کہ ابرار کی ، انتہائی نشے میں ڈوبی ہوئی آواز گونج اٹھی کہ ہر شخص اپنا ایڈوانٹیج خوب جانتا ہے ، روپ سنگھ نے کان کھڑا کر کے مجھ سے پوچھا یہ آدھی رات کو ایڈوانٹیج کی کیا بات ہو رہی ہے ابھی میں جواب نہیں دینے پایا تھا کہ روپ سنگھ کا پرانا خادم " انتا " بانپتا آیا اور کہنے لگا سردار صاحب بڑا غضب ہو گیا ۔ انتا نے کہا کہ ولاسنی زنانی ڈیوڑھی میں جا رہی تھی کہ ابار خاں (ابرار خاں) نے دوڑ کر ، اس کی کلائی پکڑ لی اور جب وہ کلائی چھڑا کر بھاگی ، ابار خاں اس کے پیچھے دوڑے ، اس نے جب بھاگ کر ، دروازہ اندر سے بند کر لیا تو ابار خاں نے پکار کر کہا ، " ہائے جانی مار ڈالو اور جب میں نے سمجھایا تو انگریزی بولنے لگے ، یہ سنتے ہی روپ سنگھ نے پوچھا اارے کیا غضب ہو گیا ، انتا ہمارے سر کی قسم یہ بھی ہوا ۔؟" اب میں گھر میں کیسے منھ دکھاؤں گا ، انتا ہمارے سر کی قسم یہ بھی ہوا ، اس انتا ہمارے سر کی قسم یہ بھی ہوا پر میرا قہقہہ نکل گیا۔

میں نے کہا واقعی بات تو بہت ہی بری ہوئی جس کا مجھا و بے حد افسوس ہے ، لیکن اس " انتا " ہمارے سر کی قسم ، کے ساتھ ساتھ " یہ بھی ہوا " کا اضافہ ، ارے اس پر کون ہنسی ضبط کر سکے ۔ روپ سنگھ ہر چند بہت پریشان ہو چکے تھے پھر بھی میری بات پر بے ساختہ ہنسنے لگے۔

اور اب میں نے انکی چیڑھ بنالی ۔ جب کوئی ایسی ویسی بات پیش آتی تھی ، میں ، اپنا ماتھا ٹھونک ٹھونک کر کہتا تھا ۔ " انتا ہمارے سر کی قسم یہ بھی ہوا "

روپ سنگھ ، تم مجھ سے پہلے چلے گئے ، یہ بڑی دغا کی تم نے میرے ساتھ تمھارے بعد ایک بار میں دھول پور گیا تھا ۔ تمھارے اداس پھاٹک کی طرف میں نے کیونکر نظر اٹھائی تھی ، یہ میرا ہی جی جانتا ہے ، میرے روپ ، بد مزہ ہو کر رہ گیا جینا تمھارے بعد ۔ ہائے میں کیا کروں کدھر جاؤں ۔

---

۵۱ مورقع سودمندی ۔

۵۲ نوجوان ملازمہ ۔

وصل بلگرامی

انگریزوں کی طرح گورے، بلند پیشانی، متوسط القامت، نورانی چہرے اور گھنی لال داڑھی کے، فرشتہ صورت، اور نپولین سیرت، انسان تھے۔

میری اتنی عمر آ چکی ہے، لیکن میں نے ان کا سا آہنی عزم و شیر دل انسان آج تک نہیں دیکھا ہے، وہ جب کسی بات پر کمر باندھ لیتے ہیں۔ تو وہ تمام امور جو دنیا بھر کے لئے ناممکن ہیں، انھیں پل بھر میں ممکن بنا دیا کرتے تھے۔

اگر وہ اس عہد میں پیدا ہوتے جب کہ ایک فرد کی حوصلہ مندی ملکوں کے نقشہ بدل دیا کرتی تھی تو مجھے یقین ہے کہ وہ ایک عظیم سلطنت کی بنا ڈال کر سکندر اعظم سے ٹکر لے سکتے تھے۔

حافظہ بے حد کمزور ہو چکا ہے ان کے صرف چند کارنامے یاد رہ گئے ہیں، ان کو پڑھ کر آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا تھے۔ اس دور میں جبکہ فرنگی حکومت کا رعب ہر طرف چھایا ہوا تھا، اور اسکا غرور زمین پر پاؤں نہیں رکھتا تھا ہم دونوں بمبئی کے ایک بہت شاندار ہوٹل میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے، اور بڑی بڑی مونچھوں کا ایک دھم دھوسر جغادری انگریز ہمارے سامنے کی میز پر شراب پی رہا تھا۔ میں نے وصل صاحب سے کہا جب جانیں کہ آپ اس گڈا ایڈ انگریز کو پان کھا دیں اور گلوری، چٹکی میں دبا کے اس کے پاس گئے اور اس سے کہا آپ کی صورت دیکھ کر مجھکو اندازہ ہوا ہے کہ آپ بہت بڑے آدمی ہیں لیکن دنیا آپ کے ساتھ انصاف نہیں کر رہی ہے میں مسلمانوں کا ہڈ لوپ ہوں چاہتا ہوں آپ سر بلند ہو جائیں، آپ منھ کھول دیں اس انگریز پر ان کی صورت اور ان کی باتوں کا اس قدر اثر پڑا کہ بے سوچے سمجھے اس نے اپنا منھ کھول دیا اور انھوں نے اس کے منھ میں گلوری رکھ کر، اس کی پیٹھ کو تھتھپایا، اور خدا آپکا بھلا کرے گا۔ کہتے ہوئے، میرے پاس آ گئے، وہ سٹپٹایا ہوا انگریز، ان کو غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھا، سر کو جنبش دے کر "تھینک یو" کہا اور غسل خانے چلا گیا۔

وہ راجہ صاحب کٹھوارہ والی کوٹھی، قیصر باغ والی کوٹھی، نچلی منزل میں رہتے تھے اور میں ان کے وہاں ٹھہرا ہوا تھا ایک روز جھٹپٹے کا وقت تھا کہ میری نظر پڑی ایک مرمر کے پتلے کی سی، بوڑھی میم صاحب پر، جو سامنے کی سڑک پہ حد سے زیادہ آہستہ خرامی کے

ساتھ بارہ دری کی طرف چلی جا رہی ہیں۔

میں نے کہا وصل صاحب کیا آپ میں یہ طاقت ہے کہ آپ ان چھیلا جان کی سست گامی کو برق خرامی میں تبدیل کر دیں۔

انھوں نے کہا بیشک یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کے سامنے کنوئیں کی جگت پر جو گھنے درختوں اور جھاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ جا کر کھڑے ہو گئے، اور میم صاحب کا انتظار کرنے لگے،

جب وہ رنگش رنگش کرتی گھنے درختوں کے نیچے سے گزرنے لگیں تو انھوں نے بڑے زور سے اِلّا اللّٰہ کا نعرہ لگا کر، اور اپنے مصنوعی دانتوں کو ذرا سا آگے نکال کر، اس طرح کٹ کٹ، کٹ کٹ، بجانا شروع کر دیا کہ وہ میم صاحب" اومائی گاڈ" کہتی ہوئی بھاگ کھڑی ہوئیں عمر اور مٹرکس کے لونڈے قہقہے مار مار کر تالیاں بجانے لگے۔

ایک روز شام کو وہ ملیح آباد آئے، کہا دیا نرائن نگم نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ میں آپکو صبح کی گاڑی سے کانپور لے جاؤں کل رات کو ان کے وہاں آپ کی دعوت ہے، جس میں آپکے دوست جگت موہن لال رواں، نیج بہادر سپرو اور جسٹس شاہ سلیمان بھی موجود ہوں گے۔ میں نے بیوی سے اجازت طلب کی، وہ بگڑ گئیں کہنے لگیں ابھی پرسوں ہی لکھنؤ سے آئے ہو چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے میں تم کو اتنی جلدی نہیں جانے دونگی میں وصل سے اپنی مجبوری ظاہر کر دی اور کہا نگم صاحب سے معذرت کر دیجئے گا۔ انھوں نے کہا ایسا نہیں ہو سکتا۔ آپ کو میرے ساتھ کل جانا پڑے گا میں نے کہا آپ میری بیوی کے مزاج اور ان کے ہٹ سے واقف نہیں وہ مجھے کسی طرح جانے نہیں دیں گی انھوں نے سینہ ٹھونک کر کہا اجازت میں دلاؤں گا یہ کہہ کر وہ کوٹھی سے باہر نکل گئے، میں نے کہا کدھر انھوں نے کہا "پتھر" وہ باہر جا کر ایک بہت بڑا نکیلا پتھر اٹھا لائے اور زینے کی آخری بالائی سیڑھی پر کھڑے ہو کر انھوں نے آواز دی میری چھوٹی بھاوج، ذرا آپ کی دروازے کی پٹ کی آڑ سے دیکھ لیں کہ میں کیسی طرح دم توڑتا ہوں۔ بیوی نے پٹ کی آڑ سے کہا، کیا بات ہے وصل صاحب، انھوں نے ہاتھ میں بڑا سا نکیلا پتھر، ہاتھ میں بلند کر کے کہا دیکھئے میں اس سے اپنا سر پھوڑ کر مر جانے پر تلا ہوا ہوں آپکو معلوم ہے کہ میں سید ہوں سنتا ہوں پٹھان سادات کی بڑی عزت کرتے ہیں اگر آپ جوش صاحب کو میرے ساتھ جانے کی اجازت نہیں دیں گی، تو میں پتھر اپنے سر پر مار کر خودکشی کر لوں گا۔ اور آل رسول کا خون آپ کی گردن پر ہو گا۔ یہ کہہ کر وہ اپنے ماتھے کے عین سامنے پتھر کو لے آئے، اور رو رو کر کہنے لگے آپ اجازت دیتی ہیں کہ نہیں۔ میں ایک دو تین کہونگا۔ اگر تین سنتے ہی آپ اجازت نہیں دیں گی تو سر پھوڑ کر آپ کے زینے پر ابھی ابھی شہید ہو جاؤں گا۔ دیکھئے۔ ایک۔ دیکھئے دو۔ اور دو کہتے ہی، جیسے

زینے پر ابھی ، ابھی شہید ہو جاؤں گا کہ بیوی نے کہا کہ بہت اچھا ، آپ انکو اپنے ساتھ لے جائیں مگر کل ہی واپس کر دیں ۔ یہ سنتے ہی انھوں نے تیتر پھینک دیا ۔ تیتر سیڑھی پر شکریئے کا سجدہ کیا تھے آنکھ مارتے ہوئے نیچے اتر گئے ۔

ایک بار ہم لوگ ریل میں سفر کر رہے تھے کہ کسی جنکشن پر ، ایک دولہا اپنی دلہن اور مٹھائی کے ٹوکرے کے ساتھ ہمارے درجے میں آکر ایک کونے میں بیٹھ گیا ۔

شوکت تھانوی نے مٹھائی کی طرف اشارہ کیا وصل نے جلدی سے آنکھیں بند کر کے وعدہ کر لیا اتنے میں بلی کے بھاگوں چھیکا ٹوٹا ۔ دولہا نے دلہن سے چہل پہل بازی شروع کر دی ، انکو موقع مل گیا وہ اپنے سیٹ سے اٹھے ، دولہا سے جاکر کہا تو شریف گھرانے کا بچہ معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ میں تیرے دادا کے برابر ہوں اور تو میرے سامنے اپنی دلھن سے چھیڑ چھاڑ کر رہا ہے ، اسکا شانا پکڑ کر بٹھا دیا ، وہ نوجوان ادب سے بیٹھ گیا ۔ اب انھوں نے مٹھائی کے ٹوکرے میں ہاتھ ڈال کر دو لڈو نکالے اور دولہا سے کہا ، بیٹا اسی بات پر ، لے ایک لڈو تو کھالے ، ایک میری بہو کو کھلا دے ، اور باقی لڈو میں تیری اور تیری دلہن کی طرف سے تیرے ہم سفروں میں بانٹے دے رہا ہوں ، وہ بھی کیا یاد کریں گے کہ انھوں نے ایک دولھا دلہن کے ساتھ سفر کیا تھا ، اور یہ کہہ کر انھوں نے سارا ٹوکرا ہم سب کو کھلا دیا ۔ گڑم دھم ۔

وہ تمام شعرائے لکھنؤ کی دوا اماں تھے ۔ جب کہیں کوئی بڑا مشاعرہ ہوتا تھا ، بانیان مشاعرہ ان کے پاس شعراء کی فہرست اور انکا کرایہ بھیج دیتے اور وہ سب کے گھروں پر جاکر انھیں مدعو کرتے ، ایک مرکز پر سب کو جمع کر کے اپنے ساتھ اسٹیشن لے جاتے اور ٹکٹ لے کر اپنی جیب میں رکھ لیا کرتے تھے ۔

ایک بار وہ اس قدر تاخیر کے ساتھ اسٹیشن پہنچے کہ گاڑی چھوٹ رہی تھی ، انھوں نے سارے شعراء کو بے ٹکٹ ہی ریل میں سوار کرا دیا اور کہا آگے چل کر کسی بڑے اسٹیشن پر گارڈ کو آگاہ کر دیں گے ۔ دو چار اسٹیشنوں کے بعد ایک نوجوان ٹکٹ چیکر نے ہمارے درجہ میں داخل ہو کر ہم سے ٹکٹ طلب کئے ہم سب نے دور بیٹھے ہوئے وصل صاحب کی جانب جو ٹکٹ چیکر کو دیکھتے ہی تسبیح پڑھنے لگے تھے ، اشارہ کر دیا ، اور سوچنے لگے کہ دیکھیں اب کیا گل کھلے گا ، ٹکٹ چیکر کو کن انکھیوں سے ، اپنی طرف آتا دیکھ کر انھوں نے آنکھیں بند کر کے سر جھکا لیا ۔ صورت انکی خاصا خدا کی سی تھی ، وہ ان کے سامنے آکر کھڑا ہو تو گیا لیکن ٹکٹ مانگنے کی جرات نہیں کر سکا ۔

اتنے میں پٹری بدلنے سے گاڑی میں جھٹکا لگا ، انھوں نے آنکھیں کھول دیں اور جب

بڑے اشراقی انداز میں انھوں نے ٹیکٹ چیکر کی طرف نگاہ اٹھائی اور اس نے کہا ٹکٹ، تو انھوں نے اس کے منھ پر تھپڑ مار دیا اور پوچھا، پہلے اپنے باپ کی خیریت بتا پھر مجھ سے ٹکٹ مانگ، میرا نام وصل بلگرامی، ٹکٹ چیکر نے بڑی غمناک آواز میں کہا کوئی ایک مہینہ ہوا کہ وہ انتقال فرما چکے ہیں یہ سنتے ہی وصل صاحب رونے لگے اور اس کو گلے سے لگا لیا۔ اور وہ بھی رونے لگا۔

اب ٹیکٹ چیکر کی کیا مجال تھی کہ انسے ٹکٹ مانگتا، الہ آباد اسٹیشن پر اس نے ہم سب کو چائے پلائی اور اپنے ساتھ لے جاکر ہم کو باہر پہونچا دیا۔

جنگ عظیم کے خطرناک دور میں ہم لوگ، وصل صاحب کی سرکردگی میں، اگوا لیار سے لکھنؤ جارہے تھے۔ اور ہم سے کٹے ہوئے فرسٹ کلاس کے ریزرو درجے میں ایک بڑا الا نبا تڑنگا اور عظیم انگیز فوجی افسر بھی اسی گاڑی سے سفر کر رہے تھے اور اسکی یہ شان تھی کہ ہر بڑے اسٹیشن پر چار پانچ گورے کھڑے ہوکر اس کے درجہ کے سامنے پہرہ دینے لگتے تھے، اس فوجی افسر کے ساتھ اسکی نہائیت پریجا پیکر لڑکی بھی سفر کر رہی تھی (ہم نے اس کو اس فوجی افسر کی لڑکی اس لئے سمجھا کہ وہ اس سے "ڈیڈی" کہہ کر باتیں کر رہی تھی)

جب کسی جنکشن پر گاڑی رکی تو وہ لڑکی اتری اور دھیلر بک اسٹال پر کتابیں دیکھنے لگی۔ نیاز فتح پوری نے کہا ہم آپ کو سورما تسلیم کرلیں گے، اگر آپ اس لڑکی کا بوسہ لے لیں۔ وصل نے کہا شرط بدلو اور جب پچاس روپئے کی شرط بدلی گئی تو وہ نیچے اترے اور دھیلر کی دکان پر جا کر اسے گھورنے لگے اور جب اس ماہ جبیں نے تیور بدل کر کہا تم کون گستاخ بوڑھے ہو تو انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس کو گلے لگا کر جھٹ سے اسکا بوسہ لے لیا۔ لڑکی نے چیخ ماری اسکا باپ پستول لے کر جھپٹ پڑا پہرا دینے والے گوروں نے بھی بڑھ کر انھیں حلقے میں لے لیا، اور وصل صاحب نے زور زور کر کہنا شروع کر دیا۔ ہائے میری بیٹی ہائے میری جوانا مرگ بیٹی کا چہرہ اسی کی بچی کا سا تھا، ہائے میری بیٹی، بالکل ایسی ہی تھی یہ سن کر اس فوجی کا دل پسیج گیا۔ انھیں اپنے درجے میں لے گیا کیک کھلائے چائے پلائی اور اپنی بیٹی کو ان کے پہلو میں بٹھا دیا۔ اور جب تک وہ جیا، انکی دوستی کا دم بھرتا رہا۔



ڈاکٹر کرنل اشرف الحق

متوسط القامت، نہ دبلے، نہ موٹے، سر داڑھی مونچھوں کے بال کھچڑی، کبھی گورے ہوں گے اب جل کر رنگ میٹیالا سا ہو گیا تھا۔ گولکنڈے (حیدرآباد دکن) کے سرکاری فوجی اسپتال کے انچارج۔ دہلی کے باشندے، مولوی عبدالحق محدث دہلوی کے پوتے مولوی نذیر احمد مفسر قرآن کے نواسے۔ اداسی کے باوجود بادہ خوار فحش نگار، اور پھکڑ بازی میں یگانۂ روزگار۔

ان کا سا، آٹھوں گانٹھ کمیت آدمی آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ وہ کسی خانے بھی بند نہیں تھے۔ وہ فحشیات کے شاعر تھے، اور تخلص تھا عریاں، "دیوان عریاں" کے نام سے ان کا کلام چھپ چکا ہے۔

وہ سونے کا وقت نکال کر، ہر وقت آدھے آدھے پیگ کے حساب سے پیتے رہتے تھے۔ رات کو گیارہ بجے سے صبح پانچ، بجے تک وہ سوتے اور غسل کر کے بیڑی سی انگنائی بیٹھے بیٹھے، طے کر کے، بیت الخلا جاتے اور وہاں سے آ کر پینا شروع کر دیا کرتے تھے۔ لیکن، بادہ خواری کے اس تواتر کے باوجود کیا مجال کہ وہ بہک جائیں، یا لڑکھڑانے لگیں ــــــ

ہر چند اسپتال دروازے کے سامنے ہی تھا لیکن وہ دو ایک دن کے علاوہ کبھی وہاں جاتے بھی نہیں تھے انھوں نے اسسٹنٹ ڈاکٹر پر تمام کاروبار چھوڑ رکھا تھا۔

اور جب بھی ان کا اسسٹنٹ ڈاکٹر ان کے مکان پر آ کر کسی مریض کا حال بیان کر کے ان سے اس کی دوا پوچھتا تھا۔ تو وہ ہمیشہ "اے، ڈی، ٹی" بنا دیا کرتے تھے۔ ایک روز میں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب یہ ہر مرض کی دوا، درود شریف" قسم کی کون دوا ہے "اے، ڈی، ٹی" کہ آپ ہر مریض کے واسطے اس کو تجویز کیا کرتے ہیں، انھوں نے قہقہہ مار کر کہا میاں اس کے معنی ہیں "Any dam Thing" یعنی جو بھی لغو چیز چاہو دے دو۔

وحید الدین صاحب سلیم عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر اور سید احمد خاں کے سابق سکریٹری اور بے حد پھکڑ آدمی تھے ایک دن انھوں نے کہا چلئے سلیم صاحب کے وہاں بڑا فقرہ باز بنتا ہے آج اس کو پیدل کا مات دوں گا۔

سلیم صاحب کے وہاں پہنچتے ہی، وہ ان کی طرف تھرکتے دوڑے، فوراً انکے گلے میں باہیں ڈال دیں اور انکو اس طرح ہلا ہلا کر جیسے کسی درخت کی جڑ سے اکھاڑا جاتا ہے۔ بڑے زور سے کہنے لگے ہائے میرا نیچری سانڈ۔ جوش، یہ نیچری سانڈ، سرسید کے مرتے ہی رسیاں تڑا کر، بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ برسوں کے بعد آج اسے پکڑ پایا ہوں اب نہیں چھوڑونگا یہ کہتے ہی انھوں نے ان کا بوسہ لے لیا، اور پھر وہی رٹ لگادی " ہائے میرا دم کٹا نیچری سانڈ اور سلیم صاحب اس قدر ہوا س باختہ ہوگئے کہ کھسیانی ہنسی ہنسنے لگے۔

ایک بار ایک نوجوان غالبا " پھول " کا مدیر میرے دفتر میں بیٹھا مجھ سے باتیں کر رہا تھا کہ وہ آگئے میں نے تعرف کرایا اور اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے اس کی ہتھیلی میں انگلی چبھودی۔ ان کی اس حرکت سے وہ نوجوان بپھر گیا، اور آمادہ بزد ہو کر پوچھا کیا آپنے مجھ کو آوارہ لونڈا سمجھ رکھا ہے اور انھوں نے مسکرا کر کہا جانی اگر یہ نہ سمجھتے تو یہ بات کرتے ہی کیوں۔

وہ نوجوان لڑتے کھڑا ہو گیا، میں نے شانہ دبا کر اسے بٹھا دیا، اور اشارے سے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب پیئے ہوئے ہیں۔

میرے دفتر دار الترجمہ کے ایک رکن، مولوی فدا علی صاحب ان کے بڑے دوستوں میں تھے، ایک دن وہ میرے پاس آئے تو فدا علی صاحب کی جانب اشارہ کر کے پوچھا جوش صاحب یہ کون سا جانور ہے، فدا علی صاحب اس وقت بڑے موڈ میں تھے، انھوں نے چھوٹتے ہی کہا میرا نام ہے ڈپٹی نذیر احمد انھوں نے کسی بڑے کونکتے پا جانے کے انداز میں کہا۔ " اچھا آپ میرے نانا جان ہیں یہ کہکر انھوں نے انگلیوں سے مثلث کی شکل بنا کر کہا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ خاکسار آپ ہی کی صاحبزادی کی اس چیز سے برآمد ہوا ہے اور مولوی فدا علی صاحب کا رنگ اڑ گیا اور منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

ایک بار مودودی صاحب کو ساتھ لے کر میں ان کے وہاں گیا وہ چار پائی اور ان کی بڑی لڑکی پٹی پر بیٹھی ہوئی تھی، مجھے دیکھتے ہی انھوں نے کہا جوش صاحب میں اس لڑکی کو لنڈن بھیج رہا ہوں تعلیم کے واسطے مودودی نہیں چاہتے تھے کہ وہ حیدر آباد سے جائے اس لئے انھوں نے کہا ڈاکٹر صاحب جوان بیٹی کو تنہا بھیجنا مناسب نہیں۔ یہ سنتے ہی انھوں نے اپنے داہنے ہاتھ کی انگلی کو اپنے بائیں ہاتھ کی ڈھیلی مٹھی میں بار بار داخل و خارج کر کر کے کہا کیوں مولانا مودودی صاحب زیادہ سے زیادہ یہ ہو جائے گا ہو جانے دیجئے

سلہ سید احمد خاں اور انکے رفقاء کو ان کے دور میں "نیچری" یعنی خدا کے منکر اور نیچر کے ماننے والے کہا جاتا تھا۔

لڑکی جھینپ کر بھاگ کھڑی ہوئی اور مولوی صاحب پسینے پسینے ہو کر رہ گئے۔

ایک دن شام کے وقت ایک لامبے قد کے ڈڑھیل مولانا صاحب ان سے ملنے آئے انھوں نے کہا ڈاکٹر صاحب سے مصافحہ کر کے ان کے ہاتھ آنکھوں سے لگا کر بڑی عقیدت سے چوم لئے، کہا میں بھی ابتری دہلی کا رہنے والا ہوں تقریباً یہاں آیا ہوا تھا کل جا رہا تھا میرے دل نے نہیں مانا کہ مولانا عبدالحق محدث کے پوتے اور مولوی نذیر احمد صاحب کے نواسے کی زیارت کئے بغیر چلا جاؤں یہ کہہ کر وہ نہایت ادب سے بیٹھ گئے ادھر ادھر کی باتیں کر کے انھوں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب آپکے ماشاء اللہ کتنے بچے ہیں۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا۔ جوش صاحب بتادیں؟ میں نے کہا یہ بھی کوئی سرکاری راز ہے اب انھوں نے اپنی شہادت کی انگلی انگوٹھے پر رکھ کر ایک حلقہ بنا لیا ایک تو یہ ہے اور پھر مثلث بنا کر کہا جناب والا اور دو یہ ہیں مولانا پر بجلی سی گر گئی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور وہ السلام علیکم کہہ کر فوراً چلے گئے۔



کنور مہندر سنگھ بیدی

سانولے سلونے، دراز قامت، وسیع القلب، متناسب الاعضاء، شگفتہ جبیں و وضعدار، خوش فکر بلند حوصلہ، شعراء پرور، دوست پرست، دشمن نواز لہجے کے کھانچوں کے باوصف خوش گفتار اور داڑھی کے باوجود خوبصورت انسان ہیں۔

ان کے جد اعلیٰ تھے، حضرت بابا گرو نانک۔ جنہوں نے سکھ مت کی اس نیت سے طرح ڈالی تھی کہ ہندو اور مسلم کی دوئی کو مٹا کر ان میں وحدت پیدا کریں، اور دونوں ایک بنادیں لیکن تاریخ کا یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ وہ دو کو ایک نہیں بنا سکے اور ان کی تمنا کے علی الرغم سکھوں کے اضافہ کے بعد، دو تین بن گئے۔

"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

لیکن ان کی وہ تمنا، ان کے بچے مہندر سنگھ نے پوری کر دی، جن کی ذات میں ہندو اور مسلم اور سکھ یہ تینوں گروہ مدغم ہو کر، ایک اکائی کے سانچے میں ڈھل چکے ہیں۔

تقسیم ہند سے قبل، وہ پنجاب کے بہت بڑے جاگیردار تھے اور اب صرف ایک معمولی سے قطعہ زمین کے مالک ہیں لیکن وہ جو کہا جاتا ہے کہ ہاتھی لاکھ لٹے پھر بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔ ان کے چشمہ فیض سے ہزاروں انسان بالعموم، اور سیکڑوں ادبا و شعراء بالخصوص آج بھی فیضیاب ہوتے رہتے ہیں:۔

میرے قیام دہلی کے ابتدائی دور میں وہ مجھ سے اسقدر قریب رہتے تھے۔ کہ میری موٹر انھیں کے بنگلہ میں رہا کرتی تھی اور جب میں صبح کو ان کے مکان جاتا تو یہ دیکھا تھا کہ سیکڑوں، ہندوؤں سکھوں اور مسلمانوں کے ان کے گرد ٹھٹ لگے ہوئے اور وہ سب کے کشور بکار میں سرگرم ہیں۔

بیوی ان کو بھی ناک کی قیامت چڑھی ہوئی اور کڑوی ملی ہیں اور ہر بھلے آدمی کے واسطے شاید یہ امر مقدر ہو چکا ہے کہ ان کو بیویاں زندگی بھر بھنبوڑتی رہیں:۔

میں نے انکو کبھی تھکتے نہیں دیکھا۔ وہ پچاسوں میل سفر کر کے مشاعرے جاتے تھے اور تین چار بجے مشاعرے سے فراغت پاکر، پھر اسی وقت، موٹر چلاتے، دہلی آتے اور نہا دھو کر مجسٹریٹی کرنے عدالت پہونچ جاتے تھے، میرا خیال ہے کہ ان کے اعصاب گوشت پوست کے نہیں فولاد کے بنے ہوئے ہیں ان کی وضعداری کے استحکام کیا بیان کروں میں جن دنوں ہندوستان جاتا ہوں وہ میرے گرد پروانے کی طرح گھومتے رہتے ہیں اور اس بار جب ۶۷ء میں دہلی جا کر میں نے آگرہ ہوٹل میں قیام کیا، تو ہر چند میں چیختا رہا کہ کنور صاحب میرے پاس کافی روپیہ ہے، لیکن وہ کسی طرح نہیں مانے اور میرے کمرے کا چودہ سو روپیہ کرایا، انھوں نے اپنی جیب سے ادا کر دیا اور "موتی محل" ہوٹل سے جو میرا کھانا آیا کرتا تھا اس حساب بھی زبردستی بے باق کر دیا۔ اس دور میں "ایسا" ورنہ ستانی ہا لبستم می رسد" کا برتاؤ کون کرتا ہے۔

صرف یہی نہیں کہ وہ ایک بہت اچھے غزل گو شاعر ہیں، بلکہ ان کی پوری زندگی غزل ہے اور اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس طرح غزل، مختلف و متضاد اشعار کا مجموعہ ہوتی ہے اسی طرح کنور صاحب کی ذات بھی مختلف و متضاد اشغال کا مجموعہ ہے یعنی مشاعروں کی صدارت کے فرائض، فلم اسٹاروں کی نمائش کا کام، کلبوں کا انتظام، کرکٹ میچوں کا اہتمام، رقص و سرور کا اہتمام، الکشنوں کی ڈوڑ دھوپ، مرغوں، تیتروں اور بٹیروں کی پالیوں کا بندوبست اور بنگلوں کا نظم و نسق، یہ تمام مشاغل، ان کی ایک ذات میں مجتمع ہو گئے ہیں۔ ہے کوئی جامع الاضداد شخص اس دنیا میں؟؟!

مگر حافظ شیرازی کا یہ قول :-

براین رواق زبرجد نوشتہ اند بزر
کہ جز نکوئی اہل کرم نہ خواہد ماند

صحیح ہے تو میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مہندر سنگھ جی کہ ان غیر معمولی انسانوں میں سے ہیں جو لوگوں کے ساتھ نیکی کئے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتے اس لئے انکا نام قیامت تک باقی رہے گا۔



پنڈت جواہر لال نہرو

وہ اپنی موہنی صورت کی جاذبیت، اپنے رنگ کی طلاقت، اپنی آنکھوں کی طروت اپنے لہجے کی غدوبت، اپنے تکلم کی موسیقیت، اپنے تبسم کی حلاوت، اپنے خاندان کی وجاہت اپنے دل کی آفاق در آغوش وسعت، اپنے مزاج کی بے نظیر شرافت اور اپنے کردار کی بے مثال نجابت کے اعتبار سے ایک ایسے انسان تھے جو اس کرہ خاکی پر صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اور جو یہ آواز بلند کر سکتے ہیں کہ :-

مت سہل ہمیں سمجھو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

انکا وجود ہندوستان کا افتخار ایشیا کا وقار، اور عالم انسانیت کا اعتبار تھا اور وہ اس عالم اجسام کے ایک ایسے ذی حیات تاج محل تھے، جسکو شام اودھ کی ملاحت اور صبح بنارس کی صباحت نے الہ آباد کے معنی خیز سنگم پر، گنگا جمنی چھینیوں سے تراش کر تعمیر کیا تھا۔

اس سے پیشتر دو تین مواقع پر انکا تذکرہ کر چکا ہوں۔ اس لئے ان کے متعلق جو باتیں بیان کرنے سے رہ گئی ہیں فقط وہی بیان کروں گا۔

ایک بار یہ سن کر وہ "کمبھ" کے میلے میں شریک ہونے کو الہ آباد گئے تھے، میرے تن بدن میں آگ لگ گئی میں غصہ میں بھرا، ان کے پاس گیا، اور کہا "اتو بروٹس[1]"؟

[1] شیکسپیئر نے اپنے ڈرامے "جولیس سیزر" میں لکھا ہے کہ سیزر نے جب یہ دیکھا کہ اسکا سب سے بڑا جان نثار فلسفی دوست بروٹس بھی اس پر قاتلانہ حملہ کرنے والوں کی صف میں کھڑا ہوا ہے تو

انھوں نے بڑی حیرت سے پوچھا کیوں صاحب میں نے وہ کون ایسی خلاف توقع بات کی ہے کہ آپ مجھ سے "اتو برد ٹس" کہہ رہے ہیں۔ میں نے کہا پنڈت جی، آپ تو بہت بڑھ چڑھ کر یہ دعویٰ کیا کرتے تھے کہ دنیا کے کسی مذہب سے بھی میرا کوئی تعلق نہیں ہے اور اس کے باوجود سنتا ہوں آپ کمبھ کے میلے میں، وہم کے شعلے کو ہوا دینے کے خاطر الٰہ آباد تشریف لے گئے تھے۔ انھوں نے کہا اگر میں وہاں پجاری کی حیثیت سے جاتا تو آپکو حق تھا کہ مجھ پر اعتراض کرتے لیکن میں تو وہاں پبلک مائنڈ... (مزاج عوام) کے مطالعہ کے واسطے گیا تھا، میں نے کہا جی نہیں آپ وہاں گئے تھے اپنے ووٹوں کی خاطر، رائے عامہ کو متاثر فرمانے کے لیئے، ابھی وہ جواب دینے کے لئے اپنے لبوں کو جنبش دے ہی رہے تھے کہ ڈاکٹر کاٹجو آ گئے، پنڈت جی نے ان سے کہا مسٹر کاٹجو مجھ پر جوش صاحب اعتراض کر رہے تھے کہ میں کمبھ کے میلے کیوں گیا تھا، کاٹجو نے کہا یہ خیر میلے کی بات ہے، ایک دن مجھے پوجا کرتے دیکھ کر جوش صاحب نے مجھ سے یہاں تک کہا تھا کہ کاٹجو صاحب آپ بالغ ہونے کے، باوجود پوجا کرتے ہیں اور جب میں نے ان سے پوچھا تھا کہ پوجا کرنا کوئی بری بات ہے؟ تو انھوں نے کہا تھا یہ ایسی بری بات ہے کہ اسے دیکھ کر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک صاحب ہلر آدمی کے دل پر ایسی کاری ضرب لگ جائے کہ وہ فوراً تڑپ کر مر جائے، یہ سن کر پنڈت جی نے قہقہہ مار کر کہا تھا جہاں تک پوجا کا تعلق ہے، میں بھی جوش صاحب کا ہم خیال ہوں اور اس پر کاٹجو کا منھ لٹک کر رہ گیا تھا۔ تقسیم ہند کے فوراً بعد سردار پٹیل نے اس وقت دہلی کے مسلمان چیف کمشنر کو جو علی گڑھ کے صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کے فرزند تھے، معطل تو نہیں کیا تھا، مگر زبانی احکام کے ذریعہ سے ان کے تمام اختیارات سلب کر کے، اس وقت کے ڈپٹی کمشنر مسٹر رن دھاوا[1] کے سپرد کر دیئے تھے اور بڑی دھوم دھام کے ساتھ مسلمان لوٹے اور قتل کئے جا رہے تھے اس بھیانک دور میں اگر جواہر لال کھل کر میدان میں نہ آ جاتے اور خوفناک گلیوں میں گھس گھس کر اور ہندوؤں کے منھ پر تھپڑ مار مار کر، وہ اس آگ کو نہ بجھا دیتے تو دہلی میں ایک مسلمان بھی زندہ نہ رہتا۔

بقیہ حاشیہ زمین اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی اور وہ فرط حیرت سے اس نے "اتو برد ٹس" (یعنی تم بھی اے بروٹس) کا نعرہ لگا کر اپنی تلوار پھینک دی اور یہ خیال کر کے کہ جب میرا ایسا جگری دوست اور اس قدر بڑا انسان بھی، میرے خلاف ہو گیا ہے تو اس کے سوا اور کوئی معنی ہو ہی نہیں سکتے کہ مجھ میں کوئی نہ کوئی ایسا زبردست عیب ضرور موجود ہے جس سے میری قوم اور میرے ملک کو نقصان پہنچ سکتا ہے، اپنی گردن جھکا لی اور اپنے کو قتل ہو جانے کے واسطے پیش کر دیا۔

---

[1] وہ اردو کے بڑے قدرداں ہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ "رن" بھی ہیں اور "دھاوا" بھی۔

اسی زمانہ کا یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ دہلی کے محلہ "سوئی والاں" میں ہندو جب ایک مسجد کے دروازے سے باجا بجاتے گزر رہے تھے اور مسلمانوں نے انکو بھگایا تھا، تو شہر کے ہندو کوتوال نے چوراہے پر کھڑے ہو کر مسلمانوں کو ماں بہن کی گالیاں دی تھیں اور جب مجھے اس بات کی خبر دی گئی تھی میں نے ایک محضر پر لوگوں کے دستخط لے لئے، اور ان سے جاکر کہا تھا کہ پنڈت جی اس خطا پر کہ مسلمانوں نے قانون شکنی کی تھی ان پر مقدمہ تو چلایا جا سکتا تھا، اور انکی گرفتاری بھی عمل میں لائی جاسکتی تھی مگر کوتوال شہر کو اس بات کا کوئی حق حاصل نہیں تھا کہ وہ تمام مسلمانوں کو چوراہے پر کھڑا کر کے ماں بہن کی گالیاں دیتا۔

انھوں نے کہا آپ کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے میں نے کہا میں ابھی وہیں سے آرہا ہوں آپ اس محضر کو ملاحظہ کیجئے۔ جس پر ہندوؤں کے بھی دستخط ہیں۔

محضر پڑھ کر وہ غصے میں کانپنے لگے، اور انسپکٹر جنرل پولیس کو اسی وقت فون پر ہدایت کی کوتوال کو فوراً معطل کر کے، اس کی تحقیقات کرو، اور مجھے اطلاع دو۔

ان کو اردو زبان سے بھی بڑی محبت تھی، انھوں نے مجھ سے ایک دن کہا تھا کہ اردو کے بارے میں میری ذاتی رائے اور ہے اور میری گورنمنٹ کی رائے اور ہے، لیکن میں گورنمنٹ پر اپنی رائے "تھرسٹ" کرنا (ٹھونسنا) نہیں چاہتا اس لئے کہ یہ عمل ڈیماکریسی (جمہوریت) کے خلاف ہے۔

ایک روز لکھنؤ اسٹیشن پر انھوں نے ریلوے حکام کو بلا کر بہت بری طرح پھٹکار کر کہا تھا کہ آپ لوگوں نے مجھ کو نرا جاہل بنا کر رکھ دیا ہے، ہر طرف ہندی کے بورڈ لگے ہوئے ہیں کچھ پتا نہیں چلتا کہ یہ کھانے کا کمرہ ہے یا لواٹری ہے۔

ایک بار جب پاکستان سے رخصت لے کر میں دہلی میں ان سے ملا، تو انھوں نے بڑے طنز کے ساتھ مجھ سے کہا تھا کہ جوش صاحب، پاکستان کو اسلام، اسلامی کلچر اور اسلامی زبان، یعنی اردو کے تحفظ کے واسطے بنایا گیا تھا، لیکن ابھی کچھ دن ہوئے کہ میں پاکستان گیا اور وہاں یہ دیکھا کہ میں شیروانی اور پاجامہ پہنے ہوئے ہوں لیکن وہاں کی گورنمنٹ کے تمام افسر سو فی صد انگریزوں کا لباس پہنے ہوئے ہیں مجھ سے انگریزی بولی جا رہی ہے اور انتہا یہ ہے کہ مجھے انگریزی میں ایڈریس بھی دیا جا رہا ہے، مجھے اس صورت حال سے بے حد صدمہ ہوا اور میں سمجھ گیا کہ "اردو، کے جو نعرے، ہندوستان میں لگائے گئے تھے، وہ سارے اوپری دل سے، اور کھوکھلے تھے۔ اور ایڈریس کے بعد جب میں کھڑا ہوا تو میں نے اس کا اردو میں جواب دے کر سب کو حیران و پشیمان کر دیا، اور یہ بات ثابت کر دی کہ مجھکو اردو سے ان کے مقابلے

میں کہیں زیادہ غنیمت ہے اور جوش صاحب معاف کیجئے، آپ نے جس اردو کے واسطے اپنے وطن کو تج دیا ہے اس اردو کو پاکستان میں کوئی منھ نہیں لگاتا۔ اور جائیے پاکستان، میں نے شرم سے آنکھیں نیچی کرلیں۔ ان سے تو کچھ نہیں کہا، لیکن ان کی باتیں سن کر مجھے یہ واقعہ یاد آیا میں نے پاکستان کے ایک بڑے شاندار منسٹر صاحب کو جب اردو میں خط لکھا اور ان صاحب بہادر نے انگریزی میں جواب مرحمت فرمایا تو راقم نے جواب الجواب میں یہ لکھا تھا کہ جناب والا میں نے تو آپ کو اپنی مادری زبان میں تحریر فرمایا ہے

چو کفر از کعبہ برخیزد، کجا ماند مسلمانی

اب چند واقعات ان کی ادب نوازی، ان کی غیر معمولی شرافت، اور ان کی بے نظیر نازبرداری کے بھی سن لیجئے۔

جب سنٹرل حکومت کے محکمۂ اطلاعات عامہ میں میرا تقرر سرکاری رسالے "آجکل" میں ہوگیا تو میں نے ان کو خط لکھا کہ میرے پرچے کے واسطے اپنا پیغام جلد بھیج دیجئے۔ اگر آپ تساہل سے کام لیں گے تو میری آپ کی زبردست جنگ ہو جائے گی۔ ایک ہفتہ کے اندر ان کا پیغام آگیا (جس کو "آج کل" فائل میں دیکھا جا سکتا ہے) اپنے پیغام کے آخر میں انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ میں یہ پیغام اس لئے بھیج رہا ہوں کہ جوش صاحب نے مجھ کو دھمکی دی ہے کہ اگر دیر ہو گئی تو وہ مجھ سے لڑیں گے، اور جب میں نے ان کے پیغام کے شکریئے میں ان کو خط بھیجا تو دبی زبان سے یہ شکایت بھی کردی کہ آپ نے میرے خط کا جواب خود اپنے ہاتھ سے لکھنے کے عوض، سکریٹری سے لکھوایا ہے میرے ساتھ آپ کو یہ برتاؤ کرنا چاہئے تھا۔

اور انکی شرافت دیکھئے کہ میری اس شکایت پر، انھوں نے خود اپنے ہاتھ سے مجھ کو یہ لکھا کہ مشاغل کے ہجوم کی بنا پر میں سکریٹری سے خط لکھانے میں مجبور ہو گیا تھا۔ آپ میری اس غلطی کو معاف فرمائیں۔

ایک بار میں ان کے وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہ دروازے پر کھڑے قدوائی صاحب سے باتیں کر رہے ہیں اور جیسے ہی میں نے برآمدے میں قدم رکھا اور ان سے آنکھیں چار ہوئیں تو وہ ایک سکنڈ کے اندر روپوش ہو گئے۔

میں نے قدوائی صاحب سے کہا کہ تو اب یہاں نہیں ٹھہرونگا، آپ پنڈت جی سے کہہ دیجئے گا کہ لیڈری اور پرائم منسٹری کو لیڈری اور پرائم منسٹری تک محدود رکھیں، اور اس کو اس قدر نہ بڑھائیں کہ وہ مائنڈ کی (بادشاہی) سے ٹکرانے لگے، قدوائی صاحب نے مسکرا کر پوچھا، کس بات پر آپ اس قدر بگڑ گئے ہیں، میں نے کہا اے آپ ابھی تو خود دیکھ چکے ہیں کہ میرے آتے ہی وہ روپوش

ہو گئے ہیں مزاج پرستی تو بڑی چیز ہے، انھوں نے مجھ سے صاحب سلامت تک نہیں کی۔ اتنے میں جواہر لال آ گئے، میں منھ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے کہا جوش صاحب معاملہ کیا ہے قدوائی صاحب نے سارا ماجرا بیان کر دیا، وہ میرے قریب آئے، اور مجھ سے کان میں کہا کہ مجھے اس قدر زور سے پیشاب آ گیا تھا کہ اگر ایک منٹ کی بھی تاخیر ہو جاتی، تو پاجامے میں نکل جاتا اور یہ عذر سن کر میں نے انھیں گلے لگا لیا۔

ایک مرتبہ کنور مہندر سنگھ بیدی نے مجھ سے کہا میرے وزیر شری سچر نے دہلی سے میرے تبادلہ کر دیا میں نے کہا یہ سچر ہیں یا مسٹر فچر وہ ہنسنے لگے کہا کیا خوب قافیہ ہے ہاں تو میں آپ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ آپ اور بیگم پٹودی، دونوں مل کر پنڈت جی کے پاس جائیں اور میرا تبادلہ رکوا دیں۔

دوسرے ہی دن ہم دونوں پرائم منسٹرز ہاؤس پہنچے، اپنے آنے کی اطلاع کی بیگم پٹودی کو فوراً بلایا گیا۔ اور میں منھ دیکھتا رہ گیا۔ جواہر لال کی اس بد وضعی پر مجھے تاؤ آ گیا، اور یہ سوچ کر میں وہاں سے اسی وقت چلا جاؤں گا۔ کہ ان سے پھر کبھی نہ ملوں، میں اٹھا ہی تھا کہ ان کے سکریٹری غالباً "پیارے لال صاحب آ گئے، انھوں نے میری طرف نگاہ اٹھا کر کہا کیا بات ہے جوش صاحب اس قدر زور سے پانی برس رہا ہے اور آپ اگ بگولا بنے کھڑے ہیں میں نے ان سے سارا ماجرا بیان کر کے کہا اب میں یہاں ٹھہرنے کا نہیں پیارے لال صاحب نے کہا آپ فقط دو منٹ میری خاطر سے ٹھہر جائیں میں ٹھہر گیا۔ وہ سیدھے ان کے کمرے میں داخل ہو گئے اور دو منٹ کے اندر اندر میں نے یہ دیکھا کہ وہ مسکراتے چلے آ رہے ہیں میرے قریب آتے ہی انھوں نے کہا جوش صاحب آپ کے تشریف لانے کی مجھے کسی نے اطلاع نہیں دی آپ نے کس سے اطلاع دینے کو کہا تھا۔ میں نے کہا بھلا کماری جی کو انھوں نے بھلا کماری کو بلا کر پوچھا تم نے جوش صاحب کے آنے کی اطلاع مجھکو کیوں نہیں دی، بھلا کماری نے کہا میں نے "لیڈیز فرسٹ" (پہلے خواتین) کے لحاظ سے جوش صاحب کا نام نہیں لیا پنڈت جی نے ڈانٹ کر کہا (نانسنس Non Sense) اور میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئے، اور کہا آپ بھی کنور مہندر سنگھ کا تبادلہ رکوانے کے خواہش مند ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں انھوں نے جواب دیا کہ یہ ڈیماکریٹ اصولوں کے خلاف ہے کہ میں اس معاملہ میں دخل دوں، میں نے کہا پنڈت جی، میں جانتا ہوں کہ آپ کا دماغ "میڈ ان انگلینڈ" (ساختہ انگلستان) ہے لیکن بعض حالات میں کچھ "ایکسپشنز" (مستثنیات) بھی بے حد ضروری ہوتے ہیں، میں جانتا ہوں کہ پرائم منسٹر سے کسی کے تبادلے کے منسوخ کرنے کا مطالبہ ایسا ہے جیسے ہم کسی ہاتھی سے کہیں کہ مینڈک سے ڈر کر ہماری دیا سلائی اٹھا لا لیکن آج تم ہاتھی سے دیا سلائی اٹھوا کر دم لونگا، وہ ہنسنے لگے اور تبادلہ منسوخ کر دیا۔

اس کے بعد ان کے محکمے کے وزیر "سچر" بوزن فچر نے بہت زور مارا لیکن پنڈت جی اپنی

ضد پہ قائم رہتے ۔

ایک مرتبہ میں گرمی کی تعطیل منانے کے لئے شملے گیا ہوا تھا۔ تین چار روز کے بعد معلوم ہوا کہ پنڈت جواہر لال بھی آگئے ہیں۔ میں نے انکی جائے قیام پر فون کیا، بدقسمتی سے رسیور اٹھایا ان کے ایک ایسے نودارد سکریٹری نے جو لہجے میں مدراسی معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے اپنا نام بتا کر کہا۔ میں پنڈت جی سے ملنا چاہتا ہوں اور آپ وقت مقرر کر کے ان کو مطلع کر دیں مجھے۔ اس مخلوط جنس نے کبھی میرا نام سنا ہی نہ تھا، اس نے بار بار مجھ سے میرا نام پوچھا، میں نے کہا جوش ملیح آبادی، لیکن اسکی سمجھ میں نہیں آیا، آخر کار میں نے جھلا کر کہا "بہت اچھا۔ او کے" اس نے کہا "مسٹر جاش" آپکے ...
"پارٹیکلرز (خصوصیات) کیا ہیں میں نے کہا جو شخص میرے پارٹیکلرز نہیں جانتا اس کو یہ حق نہیں ہے۔ کہ وہ ہندوستان میں رہے یہ سن کر اس نے کہا اوہ ایسے بولے گا، میں نے کہا اس سے زیادہ بولے گا اس نے کہا آپ ہولڈ کئے رہیں، ہم پنڈت جی سے پوچھ کر بتائے گا۔ اور دو منٹ کے بعد اس نے کہا پنڈت جی ایسا بولتا ہے کہ ہم یہاں ریسٹ (مزے) کرنے آیا ہے، آپ ڈلی میں ملو

یہ جواب سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے ام الشعراء سے کہا۔ وزیر اعظم بن جانے کے بعد پنڈت جی کا دماغ خراب ہو گیا ہے میں ابھی انکو ایسا خط لکھونگا کہ وہ ننگی کا ناچ ناچنے لگیں گے، بیوی نے کہا ہمارے سر کی قسم ابھی خط نہ لکھو اس وقت غصہ میں بھرے ہوئے ہو، نہ جانے کیا کیا لکھ مارو گے ۔

پانی پی کر تھوڑی دیر لیٹ جاؤ۔ مرتا کیا نہ کرتا، پانی پی کر لیٹ تو گیا۔ مگر دل کی آگ بھڑک رہی تھی۔ آدھ گھنٹے سے زیادہ لیٹ نہیں سکا بستر پر انگارے دہکنے لگے، میں اٹھ بیٹھا اور ایسا خط لکھا کہ اگر اس قسم کا خط کسی تھانے دار تک کو لکھ بھیجتا تو وہ بھی تمام عمر مجھے معاف نہ کرتا۔

خط روانہ کر دینے کے دوسرے دن اندرا گاندھی کا فون آیا کہ آج تین بجے سہ پہر کو میرے ساتھ چائے پیجئے، میں نے کہا بیٹی وہاں تمھارے باپ موجود ہوں گے میں ان سے ملنا نہیں چاہتا، انھوں نے مجھ سے کہا میں پتا جی کو اپنے کمرے میں بلاؤں گی ہی نہیں۔ میں تیار ہو گیا۔

شام کو جب بر آمدے میں پہونچا ایک چپراسی نے اندرا کے کمرے کی طرف اشارہ کر دیا اور جب میں انکے کمرے کی طرف بڑھا تو پیچھے سے آکر پنڈت جی نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا آیئے میرے کمرے میں، میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا انھوں نے میرا ہاتھ کھینچا اور مروت کے دباؤ میں آکر میں ان کے ساتھ ہو گیا ۔

ان کے کمرے میں پہونچا تو دیکھا میرے بزرگوں کے ملنے والے سر مہاراج سنگھ بیٹھے ہوئے

ہاں پنڈت جی نے کہا۔ مہاراج سنگھ یہ وہی جوش صاحب ہیں۔ جنھوں نے مجھ کو ایسا گرم خط لکھا کر شملے کی ٹھنڈک میں پسینہ آگیا، مہاراج سنگھ نے کہا، غنیمت سمجھیے کہ یہیں تک نوبت آئی ان کے بزرگوں سے آپ واقف نہیں۔ وہ جس پر گرم ہو جاتے تھے۔ اسے ٹھنڈا کر دیا کرتے تھے۔ پنڈت جی ہنسنے لگے گھنٹی بجائی اس مدراسی کو بلایا۔ اور جیسے ہی اس نے قدم رکھا وہ اس پر برس پڑے کہ تم نے مجھ سے بغیر پوچھے جوش صاحب کو ایسا بیہودہ جواب کیوں دیا۔ میں ابھی تمھارا ٹرانسفر کیے دے رہا ہوں، کل تم منسٹری آف کامرس میں چلے آنا۔

ان کا یہ برتاؤ دیکھ کر میں پانی پانی ہو گیا۔ اور انکی بے مثال رواداری و شرافت پر نگاہ کر کے میں ان کو گلے لگا کر رونے لگا۔

اب ان کی آخری شرافت و قدرشناسی کا ایک اور واقعہ سن لیجیے!۔

ان کے انتقال سے چند ماہ بیشتر، میں ہندوستان گیا، اور ان سے ملاقات کی تھی کہ آپ کسی دن میری جائے قیام پر آ کر، میرے ساتھ کھانا کھائیں۔ ہر چند میں ان کا دل توڑ کر بالکل آگیا تھا، لیکن اس کے باوجود میری دعوت قبول کر کے وہ میری قیامگاہ پر آئے، کھانا کھایا اور دو گھنٹے سے زیادہ بیٹھے رہے۔ اس دعوت میں ان کی آواز کے ضعف اور ان کے جسم کے جھکے پن سے اندازہ کر کے میرا دل بیٹھنے لگا۔ کہ اب وہ اپنی زندگی کے دن پورے کر چکے ہیں۔ چنانچہ وہی ہوا، اور میرے پاکستان واپس آجانے کے دو تین ماہ بعد وہ آسمان شرافت کا آفتاب ڈوب گیا، اور ہندوستان ہی میں نہیں سارے ایشیا میں تیرگی پھیل گئی۔

آسمان راحق بود، گر خون ببارد بر زمیں

انگلستان کو، شاہ شطرنج کو چھوڑ کر اس وقت کرۂ ارض پر جس قدر بھی منسٹر یا پرزیڈنٹ ڈکٹیٹر اور بادشاہ سلامت ہیں۔ وہ اپنے اپنے ملکوں میں اسقدر مغضوب و مبغوض ہیں کہ عامتہ الناس کے روبرو جب انکا نام لیا جاتا ہے تو وہ اس خوف سے ادھر ادھر دیکھ کر کہ کہیں حکومت کا کوئی پھٹو تو قریب و جوار میں نہیں ہے، ان کے نام بے تحاشا صلواتیں بھیجنے لگتے ہیں اور یہ ارباب اقتدار جب اپنے ملک سے باہر جاتے ہیں یا باہر سے اپنے ملک آتے ہیں تو چھوٹے چھوٹے خوشامد خورے لیڈروں کی دھمکیوں اور بے ضمیر پولیس کے ڈنڈوں کی ضربوں سے لوگوں کو لاریوں میں زبردستی بھر بھر کر، ریلوے اسٹیشنوں کے پلیٹ فارموں اور ہوائی جہازوں کے میدانوں میں اس لئے جمع کر دیا جاتا ہے کہ وہ ان کے ارباب اقتدار پر انگارے برسانے کی تمنائی ہاتھوں سے جھوٹے پھول برسانے اور در پردہ انھیں کوسنے دینے والی زبانوں سے ان کے حق میں "زندہ باد" کے کھوکھلے نعرے لگانے لگیں۔ اور مٹھائی کے وعدے سے ایک پھیلا ہوا بچہ ان کی گردن میں ہار

ڈال دیے جاویں اور فروخت شدہ اخباروں میں اس شاندار استقبال کی بڑی بڑی تصویریں شائع فرما دی جائیں۔

اور ان میں سے جب کوئی معزول ہو جاتا یا مر جاتا ہے تو لوگ اسکی معزولی یا موت پر مٹھائی بانٹتے اور شکرانے کے سجدے ادا کرتے ہیں، گویا اس کی ماں نے اسے کبھی جنا ہی نہیں تھا لیکن جواہر لال کا معاملہ قطعی اس کے برعکس تھا چند جنگجی اندھے لیڈروں کو چھوڑ کر ہندوستان کا بچہ بچہ ان کی محبت کا دم بھرتا تھا اور ان کے انتقال کے بعد بھی لوگوں پر انکی محبوبیت کا اسقدر سکہ بیٹھا ہوا تھا نہ بس وہ چلائے گئے تھے وہاں میں نے خود ان آنکھوں سے دیکھا تھا کہ صبح دوپہر اور شام کے وقت ہر عمر اور ہر طبقے کے زائرین کا اسقدر ہجوم رہتا تھا کہ سڑک رک جایا کرتی تھی اور لوگوں کی آہ فریکا سے فضا کانپتی رہتی تھی اسے کہتے ہیں حقیقی محبوبیت اور اسے کہتے ہیں سچا لیڈری۔ نہرو میں خود کامی و کمینگی نہیں تھی وہ بڑے آدمی بن ہی نہیں سکتے تھے اور اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ وہ اچھے سیاست داں نہیں تھے۔

بات یہ ہے کہ در اصل سیاست، پیغمبری کا ایک دوسرا نام ہے اور حقیقی سیاست وہ ہوتی ہے جو نوع انسان کو، پھولوں کی سیج پر لٹانے کے لئے خود خاک شگاف کانٹوں پر چلتی اور اللہ کے بندوں کا پیٹ بھرنے کے واسطے خود اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر کام کرتی ہے۔ لیکن آج کی سیاست اس قدر مسخ ہو چکی ہے کہ وہ نوع انسانی کو کانٹوں پر چلا کر جو دپھولوں کی سیج پر لیٹتی، اور اللہ کے کرور وں بندوں کے پیٹوں پر پتھر بندھوا کر فقط اپنا، اور اپنے بچوں کا پیٹ بھرتی ہے اور نہرو کی سیاست کی چونکہ موجودہ سیاست کے قطعی برعکس تھی، اس لئے جب کہا جاتا ہے کہ وہ اچھے سیاستداں نہیں تھے میں اس کی تائید کرتا ہوں اس لئے آج کے "اچھے سیاست داں" کے واسطے یہ لازمی شرط ہے کہ اصول خدمت و انسانیت کے اعتبار سے وہ قابل برداشت حد تک برا آدمی ہو (اے لافانی جواہر لال، روح انسانیت کا سجدہ قبول کر لے!)

سروجنی نائیڈو

یادہ، شاعری سے سرشار، گردہ شعراء کی غمگسار، آزادی کی شیدائی، محبت کی شہنائی لہجے میں ارغنوں، باتوں افسوں میدان جنگ میں، جھانسی کی رانی، ایوان امن میں قرۃ العین ثانی تقریریں نغمہ آب حیواں آواز میں جمال ماہ کنعاں۔ رشتہ صورت، ریشمی تاگے کا سا ہیں،

بولے حروف و حکایت گو گل بن کر گرد یا مدھو بین۔ چشمہ لولو و مرجان، بلبل ہندوستان اگر یہ دور مردوں میں جواہر لال اور عورتوں میں سروجنی کی سی ہستیاں نہ پیدا کرتا، تو پورا ہندوستان نابینا ہو کر رہ جاتا میں نے ان کو سب سے پہلے ۱۹۲۶ئ کے لگ بھگ حیدر آباد دکن میں دیکھا تھا اور ان کی شخصیت کی مقناطیسیت نے میرے دل کو ہمیشہ کے واسطے موہ لیا تھا۔

ان کے گلے میں رگیں نہیں، سارنگی کے کھنکتے ہوتے تار تھے۔ ان کے لہجے میں اس قیامت کا زیر و بم تھا کہ اس کے سامنے راگنیاں سرمہ در گلو ہو کر رہ جاتی تھیں، اور ان کے دل و دماغ کے ایوان میں شاعری کا وہ زمزمہ پرور موج تھا کہ اس کے روبرو چاندنی راتوں کا نغمہ بحر پانی پانی ہو کر رہ جاتا تھا۔

ہر چند اردو ان کی مادری زبان نہیں تھی، لیکن حیدر آباد کی اردو آب و ہوا نے انکو اردو اور فارسی کے مذاق میں اس طرح ڈھال دیا تھا، کہ فقط یہی نہیں کہ وہ بڑی روانی کے ساتھ اردو بولتیں بلکہ بڑی آسانی کے ساتھ اردو شاعری کو سمجھ لیتیں اور الفاظ پکڑ کر اس طرح داد دیتی تھیں کہ ان کو شعر سنا کر، جی خوش ہو جاتا تھا، آج تک یاد ہے مجھکو وہ رات، جب میں نے ان کو اپنی نظم انگیٹھی سنائی تھی اور وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی تھیں۔

انھوں نے میرے اس نظم، اور اسی کے ساتھ، میری اور بھی تیس، چالیس نظموں کا انگریزی میں نہایت اچھا ترجمہ کیا تھا افسوس کہ اس یادگار سرمائے کو، میرے لاابالی پن نے گم کر دیا۔

ان کی یوپی کی گورنری کے زمانے میں ایک بار میں لکھنؤ گیا، اور صبح کے وقت گورنمنٹ ہاؤس میں جب میں نے فون کیا کہ میں مسز نائیڈو سے بات کرنا چاہتا ہوں تو ان کے سکریٹری نے مجھ سے کہا کہ آپ پیغام دے دیں میں پہونچا دونگا، وہ خود بات نہیں کر سکتیں میں نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ میرے ان کے درمیان یہ رسم نہیں ہے۔ میں ریسیور اٹھائے ہوئے ہوں آپ ان سے جا کر یہ کہہ دیں کہ وہ مجھ سے بات کر لیں سکریٹری نے کہا آپ اپنا فون نمبر دے دیں، میں تھوڑی دیر میں آپ کو رنگ کرونگا

دس منٹ کے بعد گھنٹی بجی اور سروجنی کی آواز نے میرے کانوں میں رس گھول دیا انھوں نے پوچھا آپ کب آئے، میں نے جواب دیا ابھی آیا اور سب سے پہلے آپ کو فون کر رہا ہوں انھوں نے کہا سب سے پہلے آپ مجھ سے ملنے یہاں آجائیے، میں باتھ روم جا رہی ہوں، اگر آپ میرے باتھ روم سے نکلنے سے پیشتر یہاں آجائیں تو دو چار منٹ انتظار کریں ایسا نہ ہو کہ منھ پھلا کر کہیں چلے جائیں۔

یہ تھا سروجنی کا اخلاق، اب ان شرافتوں کو خوردبین لگا لگا کر ڈھونڈھتا پھرتا ہوں لیکن

کہیں پتا نہیں چلتا۔ ہائے کدھر چلے گئے وہ لوگ۔

زندگی کے آخری دور میں وہ بار بار بیمار پڑنے لگی تھیں اور میں بار بار پوچھتا تھا کہ اس بار بیمار پڑ جانے کی علت کیا ہے، وہ ہر بار مختلف اسباب بتا کر ٹال دیا کرتی تھیں، لیکن جب ایک مرتبہ جب میں نے زور دے کے بار بار بیمار پڑ جانے کی پھر علت پوچھی تو وہ اداس ہو کر کہنے لگیں جوش صاحب، آپ نہیں مانتے تو مجھے کہنا پڑ رہا ہے کہ اس کا سبب ہے میرا بڑھاپا عورت کے منھ سے اعتراف شیب سن کر میرا دل غمگین ہو گیا انھوں نے میری افسردگی کو بھانپ کر کہا آپ رنجیدہ نہ ہوں میرے بال تو سفید ہو رہے ہیں مگر آپ یقین رکھیں کہ میرا دل ابھی تک سیاہ ہے اور جب تک دل سیاہ ہے جوانی باقی ہے۔

میاں محمد صادق

دراز قامت، ژرف نگاہ، شب رنگ، صباح طینت۔ لاہور کے باشندے دونوں نگی کے پولیس افسر، عقیدے کے لحاظ سے قادیانی، نواہی سے بیزار، اوامر کے پابند، نماز پنجگانہ کے بغیر سانس لینے کو گناہ سمجھنے والے سخن سنج، شاعر نواز اخلاص شعار، مردم شناس عہدے کے اعتبار سے شب بلد اور پاکیزگی طبع و شرافت نفس کے نقطۂ نظر سے صبح صادق۔

یہ غالباً ۱۹۳۵ء کی بات ہے جب میں دہلی سے کلیم نکال رہا تھا اس وقت وہ دہلی خفیہ پولیس کے سینیئر سپرنٹنڈنٹ تھے، ہر چند ہمارے مابین بڑا تضاد تھا۔ وہ شرارت کے ساتھ دیندار تھے میں پابندی کے ساتھ بادہ خوار تھا (اور خدا کے فضل سے اب بھی ہوں) وہ حسینوں کی جانب نگاہ اٹھانے کو گناہ سمجھتے تھے، میں انکی طرف نگاہ اٹھانے کو عبادت سمجھتا تھا، وہ کانگریس کے دشمن تھے میں کانگریس کا دوست تھا وہ حکومت برطانیہ کے وفادار تھے میں بے باغی تھا، زبردست باغی تھا، اور اس تضاد کے باوصف، ہم میں گاڑھی چھنتی تھی ہم ایک دوسرے کے دوست اور جاں نثار دوست تھے،

اس محبت و حرمت کی علت یہ تھی کہ میاں صاحب شاعری کے اس قدر شیدائی تھے کہ میری عام "نمتادانیوں" سے چشم پوشی کر کے مجھ پہ جان چھڑکتے تھے اور میں ان کے اخلاص کا اس قدر پرستار تھا کہ ان کے تمام قصور معاف کر کے ان کا دم بھرتا تھا اور وہ لے یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ جب وہ دینی اشغال میں مغرق ہوتے تھے، میں انکو ہنساتا نہیں تھا اور جب میں انکو باغیانہ کلام سناتا تھا، وہ

بگڑتے نہیں تھے بلکہ داد دینے پر مجبور ہو جاتے تھے

میاں صاحب اس فکر میں رہتے تھے کہ مجھ کو وہ بنادیں، جسکو ابوالاعلیٰ مودودی کی اصطلاح میں "مرد صالح" کہا جاتا تھا اور یہاں یہ عالم تھا اور اب تک ہے کہ ع

مرد صالح کے تصور سے ہنسی آتی ہے

اور اسی جذبہ اصلاح کے تحت وہ میری ٹوہ میں رہا کرتے اور میری بیوی تک میری..... "بداعمالیوں" کی خبریں پہونچایا کرتے تھے۔

ایک بار میری غیر موجودگی میں، وہ میرے گھر آئے، سخاوت نے کہا کہ میاں، نواب صاحب سے ملنے رام پور گئے ہوئے ہیں۔ یہ سن کر انھوں نے میری تلاش میں خفیہ پولیس کے گرگوں کو لگا دیا، اور میرے جو اڈے ان کو معلوم تھے ان کے پتے بتا کر ہدایت کردی کہ وہ خاص طور سے مجھ کو وہاں تلاش کریں اور جب اپنے گرگوں کی معرفت ان کو پتا چل گیا کہ میں رام پور نہیں گیا، بلکہ دہلی کے فلاں محلہ میں اپنی محبوبہ کے وہاں جشن کر رہا ہوں تو انھوں نے میری بیوی کو خبر کردی اور انکی رہبری کے واسطے خفیہ پولیس کے ایک آدمی کو ان کے ساتھ کر دیا ــــ!

وہ تو کہئے خدا نے بڑی خیر کی میری بیوی کو میری قیام گاہ کی اس وقت خبر ہوئی جب میں وہاں سے رخصت ہو کر اپنے مکان کی جانب روانہ ہو چکا تھا، ابھی میرے تانگے نے آدھی مسافت طے کی تھی کہ آزاد صاحب انصاری نے گھبرا کر کہا، جوش صاحب آپکی بیگم موٹر میں آرہی ہیں۔ بیوی کو دیکھتے ہی میرا دل دھک سے ہو کر رہ گیا، آزاد صاحب نے مجھ سے کہا یہ جو دامنے ہاتھ پر تالاب ہے مجھے اسمیں پھینک دیجئے۔ اتنے میں بیوی کی موٹر تانگے کے سامنے آگئی۔

اور ہم دونوں اس طرح پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگے، جیسے چوہے دان میں پھنسا چوہا باہر کے تماشائیوں کو دیکھتا ہے لیکن اللہ نے ہم پر بڑا فضل کیا کہ بیوی نے ہم کو بڑی قہر کی نگاہ سے دیکھا، پھر سر کو، بڑی نفرت کے ساتھ جنبش دی اور شوفر کو حکم دیا کہ گاڑی موڑ کر گھر لے چلو اور جب انکی موٹر اوجھل ہو گئی، ہم دونوں نے اپنے کو اچھی طرح ٹٹول کر یہ دیکھا کہ ہم زندہ ہیں یا انتقال فرما چکے ہیں اگر وہ موٹر روک کر اس وقت پوچھ گچھ کرنے لگتیں تو ہم سے کوئی جواب بن نہ پڑتا، اور ہم بے ہوش ہو کر گر پڑتے، اور یہ بھی ہو سکتا کہ مر جاتے۔

اواخر ۱۹۴۷ء میں، جب میں ہندوستان کے سفر سے پلٹا تو دو چار دن کے واسطے لاہور میں ٹھہرا تھا، اسی اثنا میں ایک روز صبح کو ان سے ملنے گیا، اور خدا جانے کیوں انکی گلی کے نکڑ ہی پر میں نے ٹیکسی رکوا دی، اور اپنے رفیق سفر عیش ٹونکی سے کہا، اس گلی میں چلے

کی آواز آئی بھاڑ میں جائیں ایسی بے عزتی کی باتیں، میرا قہقہہ سن کر وہ ہنستے ہوئے باہر آ گئے اور زنانے کے دروازے کی طرف منہ کر کے کہا بیوی شرمانا نہیں ہماری تمھاری باتیں جوش صاحب کے کانوں تک نہیں پہنچی ہیں۔

نہاری کے بعد میں نے کہا سنو علامہ صاحب۔ آپ کے گھر آتے آتے موٹر میں ایک قصیدہ ہو گیا ہے آپ کی شان میں جس کے چند مصرعے مانی کے اور باقی اشعار راز میں خاکسار ہیں جس کے قوافی "یہاں" "وہاں" "ہاں" اور ردیف ہے "ہاں علامہ حیرت بدایونی" انھوں نے کہا اللہ اکبر، ایسی شیطان کی آنت کی سی لانبی ردیف اس دراز قامت ردیف نے اچھے شعر تو کہنے نہیں دیئے ہوں گے خیر بتائیے میں نے کہا سنئے۔

مکاں ہیں حضرت علامہ حیرت بدایونی

زماں ہیں حضرت علامہ حیرت بدایونی

انھوں نے کہا واللہ کمال کر دیا میری ایک ذات میں زمان و مکاں دونوں کو یکجا کر دیا ہے میں نے کہا اب شعر سنئے

نہایت نیک طینت ہیں مگر حد سے سوا کچھ بد،

گماں ہیں حضرت علامہ حیرت بدایونی

وہ یہ شعر سن کر پھڑک گئے، اور کہنے لگے "بدگماں" کے دو ٹکڑے کر کے پہلے مصرع میں "بد" اور دوسرے میں "گماں" لانا انتہائی مشاقی کی بات ہے میں نے کہا اور سنئے اور سر دھنئے۔

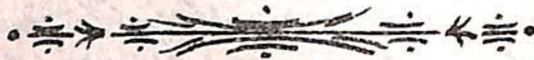
بڑے سنگین ہیں لیکن قمر چہروں کے جھرمٹ میں	کناں ہیں، حضرت علامہ حیرت بدایونی
سبک روحی میں ہیں یکتاں مگر میزانِ محشر میں	گراں ہیں، حضرت علامہ حیرت بدایونی
مجسم وا رہے ہیں رات بھر اور صبح کو یک سر	اداں ہیں، حضرت علامہ حیرت بدایونی
خضاب و خندہ و خوش لہجگی کے فیض سے اب تک	جواں ہیں، حضرت علامہ حیرت بدایونی
جسے مسجد میں پکارا، مے کدے سے یہ صدا آئی	یہاں ہیں، حضرت علامہ حیرت بدایونی
جھکے سجدے میں اور کعبہ میں پہنچے لوگ چیخ اٹھے	کہاں ہیں، حضرت علامہ حیرت بدایونی

پوچھئے نہیں علامہ کا کیا عالم ہوا۔ یہ اشعار سن کر قہقہے مار کر میرے سینے سے چمٹ گئے اور کہنے لگے خدا کی قسم دنیا میں کوئی اس ردیف کے ساتھ، ایسے شعر نہیں کہہ سکتا اس قدر مزا آیا کہ غسل واجب ہو گیا، بیوی نہانے کے لئے پانی گرم کر دو۔

ہم بکھرے ہوئے شاید کبھی نہیں مل سکیں گے اور ایک دوسرے کو دیکھے بغیر کوچ کر جائیں گے

کھڑکیاں چھپ گئیں، روزن در بند ہوئے۔ ہم نظر بند ہوئے

چلے گئے۔ داہنے ہاتھ پر جو تھا یا پانچواں مکان میاں صاحب کا ہے۔ دریافت کیجئے وہ مکان میں ہیں یا
ہیں۔ علیش کو بھیج کر، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ میرا دل کیوں دھڑکنے لگا ہے، اور
انھوں نے واپس آکر، جب ان کے انتقال کی خبر سنائی تو درو دیوار مجھ کو گھومتے نظر آنے لگے۔
میاں صاحب آپ اکیلے چلے گئے، مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتے تو کیا بگڑ
جاتا۔



علامہ حیرت

الگنی پر لٹکے ہوئے مفلر کی طرح دبلے پتلے اور غزل کے اس بیمارِ غم کے مانند نحیف و زار جو
ہر آن کراہتا رہتا ہے کہ "اجل سمجھتی ہے مجھ کو غبار بستر کا۔"
گورے چٹے اور بڑھاپے کے باوجود ایسا بھبھوکا سا رنگ رکھنے والے کی عمر و ریش
و بروتوں کی درازی، اس کو بچگانہ سمجھتی ہے اور چہرے کا وہ عالم ہے کہ حضرت مسیح کے حواری
معلوم ہوتے ہیں۔
مزاج میں اس قدر ظرافت اور شوخی ہے کہ روتوں کو ہنسا دیں اور مدرسوں کے لڑکے
ان کے روبرو اپنی چلبلیں بھول جائیں ہر چند قدیم شاعری سے وابستہ ہیں پھر بھی نہایت آبدار
شعر کہتے ہیں۔ رہنے والے بدایوں کے جہاں کے للا مشہور ہیں۔ مگر حیدر آباد دکن میں رہتے جگ بیت
گیا ہے پھر بھی زبان کی ستھرائی وہی ہے جو پہلے تھی اور جب دکن اردو بولنے پر آتے ہیں
تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ وہیں کے قدیم باشندے ہیں۔
کئی برس کی بات ہے کہ میں حیدر آباد گیا تھا انھوں نے میری نہاری کی دعوت کی تھی
...ن جالبی بھی میرے ہمراہ ان کے وہاں گئے تھے۔ نہاری کے واسطے جب تڑکے ان کے وہاں پہونچے
۔ ان کے ملاقات کے کمرے میں قدم رکھا تو اندر سے علامہ کی آواز آئی "کیا لائی ہو بیوی؟ بیوی
... کہا وضو کے لئے گرم پانی انھوں نے بڑے مزے کے ساتھ کہا۔ لیکن وہ زمانہ تھا کہ جب مجھ پر
... غسل واجب ہو جاتا تھا تو میرے نہانے کے لئے پانی گرم کرکے لایا کرتی تھیں، کہ پانی تیار ہے اور
... یہ دور آپ کا ہے کہ وضو کا پانی لئے سامنے کھڑی ہو، یہ سن کر میرا قہقہہ نکل گیا، اور انکی بیوی

سردار دیوان سنگھ مفتون

سیر چشم، کوتاہ قامت بلند حوصلہ، مہماں نواز شیر دل، دوست پرور، دشمن قاتل، سلطان شکار گدا نواز، بدترین دشمن اور بہترین دوست

جب وہ "ریاست" نکالتے تھے۔ ہر پنجشنبہ کے قلعوں اور ہر بادشاہوں کے ایوانوں میں زلزلے ڈالتے تھے والیان ریاست کی نیندیں حرام کر دی تھیں ان کے قلم نے بڑے بڑے فرمان روا کانپتے تھے ان کے نام سے۔

دہلی کا واقعہ ہے ایک روز سر شام، ایک ریاست کے وزیر اعظم میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ دیوان سنگھ آگئے۔ انھیں دیکھتے ہی وزیر اعظم کا رنگ فق ہو گیا۔ اور جب گلاس بھر کر، میں نے ان کے سامنے رکھا تو، انھوں نے دیوان سنگھ کی جانب اشارہ کیا کہ ان کے سامنے میں نہیں پیوں گا دیوان سنگھ نے انکو اشارہ کرتے دیکھ کر مجھ سے کہا جوش صاحب پرائم منسٹر صاحب سے کہہ دیجئے وہ شوق سے پئیں میں ان کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں لکھونگا۔ یہ والی ملک نہیں ہیں میں تو فقط والیان ملک پر حملہ آور ہوتا ہوں، جس کے یہ معنی ہیں کہ میں انسان کا نہیں سور کا شکار کھیلتا ہوں۔

ان کی سلطان شکاری کے واقعات سے تو ہندوستان اب تک گونج رہا ہے۔ اب ان کی گدا نوازی کا بھی ایک واقعہ، جوان کے ایک دوست نے مجھے سنایا تھا، سن لیجئے انھوں نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ کسی والی ریاست کے متعلق ایک ایسی دستاویز ان کے ہاتھ لگ گئی تھی جس میں انکے حرامی ہونے کا ثبوت موجود تھا، اس دستاویز کے زور پر وہ اس والی ریاست سے غالباً ساٹھ ہزار روپیہ حاصل کر کے گھر آئے اور نوٹوں کے بنڈل، بڑی بے پرواہی کے ساتھ میز کی دراز میں ٹھونس کر وہ مجھ سے باتیں کر رہے تھے، کہ ان کے شکستہ حال دوست آگئے، اور کھڑے کھڑے کہا سردار صاحب میں آپ سے ہمیشہ کے واسطے رخصت ہونے آیا ہوں، مجھ سے گلے مل لیجئے وہ کھڑے ہو کر ان سے گلے ملے اور انھیں زبردستی بٹھا کر کہا میر صاحب یہ ہمیشہ کے واسطے رخصت ہونے کے کیا معنی ہیں میر صاحب نے کہا، میرے پاس اس وقت بہت کام ہے، بس اتنا کہوں گا کہ کربلائے معلّٰی جا رہا ہوں، اور اب جیتے جی واپس

نہیں آؤں گا۔ اچھا خدا حافظ یہ کہہ کر میرے صاحب اٹھ کھڑے ہوئے، اور جیسے ہی زینے کی طرف جانے لگے دیوان سنگھ نے بڑھ کر انکو روک لیا اور کہا جب تک آپ اس کی وجہ نہیں بتائیں گے، بھگوان قسم، میں آپکو جانے نہیں دونگا یہ سن کر میرے صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے، اور کہا سردار صاحب یہ نہ پوچھئے اور مجھے جانے دیجئے، دیوان سنگھ ان کو کھینچ کر کمرہ میں لے آئے اور کہا جب تک آپ اس کی وجہ نہیں بتائیں گے میں قسم کھا چکا ہوں کہ آپکو یہاں سے جانے نہیں دوں گا۔ میرے صاحب نے کہا سردار صاحب میں اس قدر مقروض ہو گیا ہوں۔ کہ اب یہ بات ناممکن ہو گئی ہے کہ میں قرضہ ادا کر سکوں اس لئے جا رہا ہوں کہ کربلائے معلیٰ میں زندگی کے باقی دن گزار دوں، اچھا اب جانے دیجئے وقت کم ہے یہ کہکر میر صاحب پھر اٹھ کھڑے ہوئے دیوان سنگھ نے ان کا دامن پکڑ کر پوچھا آپ پر کس قدر قرضہ ہے میر صاحب نے کہا پندرہ ہزار روپئے۔

دیوان سنگھ نے کہا بس ؟ صرف ایک منٹ اور یہ کہہ کر انھوں نے گن کر بیس ہزار کے نوٹ میر صاحب کی جیب میں زبردستی ٹھونس دیئے میر صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، اور دیوان سنگھ نے ہاتھ جوڑ کر ان کے سامنے سر جھکا دیا ہے کوئی اس دور میں ایسا دوست پیدا اور کیا آج کا کوئی ارب پتی بھی اس دریا دلی کی جرأت کر سکتا ہے۔

ریاست کے دور میں انھوں نے بے حد کمایا۔ لیکن کبھی اپنے پاس کچھ نہیں رکھا کھایا پیا اور کھلا پلا دیا۔

اس لئے ان پر تونگری اور مفلسی کے دورے پڑا کرتے تھے لیکن اگر مفلسی میں کوئی دوست مہمان آجاتا تھا وہ خفیہ طور پر اپنے گھر کی چیزیں فروخت کر کے اس کی دعوت کیا کرتے تھے اور جب کوئی ان کی مفلسی کو بھانپ کر ان کو دعوت کرنے سے روکتا تھا تو وہ گڑ پڑتے تھے۔

مجاز نے آکر ایک دن مجھ سے کہا کہ کل تو سردار صاحب نے کمال ہی کر دیا، میں شام کو ان کے وہاں پہنچا۔ انھوں نے ملازم سے کہا بارہ درجن سوڈے کی بوتلیں لے آ۔ محلہ میں انکا بھرم تھا تھوڑی دیر میں بارہ درجن بوتلیں آگئیں انھوں نے ایک درجن بوتلیں رکھ کر نوکر کو حکم دیا کہ فلاں دکان پر جا کر ان کو فروخت کر دے، اور انکو فروخت کر کے جو روپیہ ہاتھ میں آئے اسکی ایک وسکی کی بوتل اور کچھ کھانے کا سامان لے آئے یہ تھی انکی مہمان نوازی کی شان۔

یہ غالباً ۱۹۲۷ء کی بات ہے جب میں دہلی سے "کلیم" نکال رہا تھا اور معاش اور معاشقے کے اعتبار سے وہ میرا بے حد پراگندہ حالی اور پریشان خیالی کا دور تھا اور اس پر طرہ یہ کہ میری بیٹی کی شادی سر پر آچکی تھی کہ وہ ایک روز شام کے وقت میرے گھر آئے

برانڈی کی بوتل ساتھ لائے (وہ برانڈی کو وسکی پر ترجیح دیتے تھے)

جب دور ختم ہو گیا تو انھوں نے کہا، میں بھائی سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں، میں نے سخاوت سے کہا سردار صاحب کو اوپر لے جائیے، میری بیوی اس وقت تک پردے کی پابند لیکن ان سے کا پردہ کرتی تھیں جب وہ میری بیوی سے باتیں کر کے نیچے آگئے، اور منٹ کے اندر رخصت ہو گئے اور جب میں اوپر گیا تو بیوی نے مجھ سے کہا سردار صاحب یہ نوٹوں کا بنڈل دے گئے ہیں وہ کہتے ہیں یہ رقم انھوں نے اپنے دوست، نواب بھاولپور سے خط لکھ کر منگائی ہے۔ دیکھی آپ نے دیوان سنگھ کی شرافت اور دوستی۔

ایک زمانے میں جبکہ وہ رفیع احمد قدوائی کے خلاف بڑے سخت مضامین لکھ رہے تھے اس وقت انکی مالی حالت بے حد خراب تھی۔ میں ان کے افلاس کا اندازہ کر کے سید صفا قدوائی صاحب کے پاس گیا، اور ان سے یہ کہا کہ قدوائی صاحب آپ منسٹر ہیں، حاتم دوران ہیں آپ کی دوست نوازی کے ڈنکے پٹے ہوئے ہیں۔ لیکن دوست نوازی کا کوئی بڑا وصف نہیں، ہلاکو، نیرو، چنگیز اور یزید بھی اپنے دوستوں کو نواز تھے۔ البتہ دشمن نوازی ایک ایسا وصف ہے جو انسان کو نبوت کی سطح پر لے جاتا ہے۔ آپ، ہلاکو وغیرہ کی سطح پر فائز رہیں گے، یا پیمبری کی سطح تک پہونچنا چاہیں گے، انھوں نے مسکرا کر کہا پہلیاں سی کیوں بجھا رہے ہیں، آپ جو مدعا ہو، اسے کھل کر کہئے۔ میں نے کہا دیوان صاحب آج کل سخت پریشان ہیں۔

انھوں نے یہ سنتے ہی گھنٹی بجائی، سکریٹری آیا، اس کے کان میں انھوں نے کچھ کہا، وہ چلا گیا، اور پانچ منٹ کے بعد وہ چیک لایا، چیک پر قدوائی صاحب نے دستخط کئے، اور کہا یہ چیک جا کر دیوان سنگھ کو دے آئیے وہ دس ہزار کا چیک لے کر، میں ان کے پاس گیا۔ انھوں نے کہا چلئے ابھی کیش کرالیں، چیک کیش ہو گئی تو وہ اس پر اصرار کرنے لگے کہ آدھی رقم آپ لے لیں اور جب میں نے انکار کیا تو وہ لڑنے پر آمادہ ہو گئے اور میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

میں یہ کہہ چکا ہوں کہ وہ بدترین دشمن بھی ہیں، اس کا بھی ایک واقعہ سن لیجئے میں پاکستان سے دہلی گیا اور ان کے پاس وہاں ٹھہرا ہوا تھا ایک صبح کو جب میں باہر جانے لگا۔ انھوں نے پوچھا آپ کہاں جا رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا ساغر سے ملنے کے لئے۔

ساغر کا نام سنتے ہی وہ اچھل پڑے، اور دوڑ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا، کہنے لگے میں آپکو ایک لمبے

منافق کے پاس جانے کی اجازت ہرگز نہیں دونگا۔ جس کو آپنے پنڈت جی سے کہہ کر ریڈیو میں نوکر رکھوایا تھا اور اس کا بدلہ اس نے یہ دیا کہ جب سے آپ پاکستان چلے گئے ہیں وہ آپ کے خلاف زہر اگلتا پھرتا ہے۔ میں نے کہا سردار صاحب میں نے ساغر کو نوکر نہیں رکھوایا۔ ساغر نے خود اپنڈت جی سے انکی ملازمت کا وعدہ لے لیا تھا۔ انھوں نے کہا یہ مجھے معلوم ہوا ہے لیکن جب کیسکر نے پنڈت جی کو دھوکہ دے کر، اس کا پتہ کاٹ دینا چاہا تھا اس وقت تو وہ آپ ہی تھے جس نے کیسکر کے فریب کا پردہ چاک کر کے اس کو نوکری دلوائی تھی، میں نے کہا سردار صاحب ساغر برا آدمی نہیں ہے اگر اس نے پاکستان جانے کے بعد میرے خلاف آواز بلند کی تھی، تو اسکا مقصد یہ تھا کہ وہ بیچارہ حکومت ہند پر اپنی وفاداری کا سکہ جما رہا تھا۔ اور یہ کوئی ایسی بری بات نہیں کہ میں اتنے پرانے دوست سے قطع تعلق کر لوں یہ سن کر دیوان سنگھ نے مارے غصہ کے کانپتے ہوئے کہا آپ آدمی نہیں "دیوتا" ہیں لفظ دیوتا کو اس قدر دانت پیس کر ادا کیا تھا گویا وہ کوئی موٹی سی گالی دے رہے ہیں اور جب میں خاموش ہو گیا تو انھوں نے کہا جوش صاحب جبتک میں دشمن کا خون چوس نہ لوں، مجھکو چین نہیں آتا میرے نزدیک دشمن کا مار ڈالنا ہی سب سے بڑا دھرم ہے۔

ہزار حیف ہندوستان کی ناقدر شناسی پر کہ وہ اب اپنا رسالہ بند کر کے دہرہ دون چلے گئے ہیں اور ڈیڑھ سو روپلی پنشن پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔

جب انکی اداسی پر نگاہ کرتا ہوں۔ دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں ہائے دیوان سنگھ کا بے نظیر انسان اور اس قدر پریشان۔ وائے بر کوری ہندوستان!



مولانا عبد السلام

وہ مشرقی علوم کے حرف آخر انسان اور شہنشاہ تھے۔ قرآن، حدیث، منطق، حکمت تصوف، عروض، معنی و بیان، علم الکلام، تاریخ، تفسیر، لغت، لسانی قواعد، ادب اور شاعری کے امام تھے جید عالم ہونے کے باوجود علماء کے سوء سنگ تشابہ سے بچنے کی خاطر،

انھوں نے داڑھی مونچھ کا صفایا کرادیا تھا، وہ تصوف و حسن پرستی کے متوالے اور اپنے عہد شباب میں تمام اولیہ ہند کے مزارات کے چکر لگاتے اور اپنی محبوبہ کو ساتھ لے کر تمام عرسوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔

لیکن زندگی کے آخری ایام میں اس قدر سختی کے ساتھ خلوت پسند ہو گئے تھے کہ تقریباً بیس یا بائیس[۲۲] برس کی مدت میں وہ اپنے دہلی کے ترکمان دروازے کی پتلی سی گلی کے بالاخانے سے کبھی ایک بار نیچے نہیں اترے تھے۔

میں اکثر انکی خدمت میں جاتا اور گھنٹوں ان سے استفادہ کیا کرتا تھا۔ وہ اس قدر کم آمیز ہو چکے تھے کہ انھوں نے مجھے یہ حکم دے رکھا تھا کہ جوش میاں جب تک کوئی شخص حسین یا عالم نہ ہو اسکو میرے پاس ہرگز نہ لانا۔ ایک روز میں ساغر کو انکے پاس لے گیا وہ خوش ہو کر کہنے لگے اچھی چیز لائے۔ باتوں باتوں میں جبر و قدر کا مسئلہ چھڑ گیا اور جب انھوں نے دیکھا کہ ساغر بھی اس مسئلہ پر لب کشائی کر رہے ہیں، تو انھوں نے کہا۔۔۔ صاحبزادے آپ خاموش رہیے اچھی صورت کے یہ معنی تو نہیں کہ آدمی خواہ مخواہ ایسے دقیق مسائل سے بھی آگاہ ہو جائے آپ پر تو وہی ضرب المثل صادق آتی ہے کہ "موت کی دھار[۱] نہ سوجھے میرا ہریالا بنا"۔

دہلی کی ٹکسالی بولنے والوں میں اب صرف وہی رہ گئے تھے وہ جب باتیں کرتے تو منھ سے پھول جھڑتے تھے اور جی چاہتا تھا کہ وہ پہروں یونہی بولتے رہیں اور جب اپنی باتوں میں وہ تخش کی آمیزش کر دیتے، تو خدا کی قسم مزا آجاتا تھا۔

ایک روز مولانا صاحب کی کج بحثی سے تنگ آکر انھوں نے کس مزے سے یہ کہا تھا۔ کہ مولانا حضرت حق نے مجھکو وہ طاقت بخشی ہے، کہ اگر میں آپکے حلقۂ زیریں پر اپنا عمود لحمی وارد کر دوں تو خون کے فوارے جاری ہو جائیں۔

میں ایک روز ان کے ساتھ برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا کہ زینے کے دروازے پر دیکھا کہ ایک داڑھیل کھڑے ہیں، جیسے ہی ان پر مولوی عبدالسلام کی نگاہ پڑی، انھوں نے اپنی آنکھیں بند کر کے اپنا الٹا ہاتھ ہلا کر کہا آپ کی ریش مبارک ناقابل برداشت ہے

---

[۱] یعنی بوڑھے تو اس قدر ہیں کہ پیشاب کرتے وقت ضعف بصارت کی بنا پر اپنے پیشاب کی دھار تک نظر نہیں آتی پھر بھی دولہا بننے کے تمنائی ہیں، دولہا جب دلھن کے گھر میں قدم رکھتا ہے تو ڈومنیاں گانے لگتی ہیں "مرا ہریالا بنا" کے معنی ہیں ہرا بھرا تر و تازہ، اور "بنا" دولھا کو کہتے ہیں)۔

لدی گاڑی بڑھ جائے اور اپنا سا منہ لے کر اتر گئے، میں نے کہا مولانا آپ کا یہ عمل اخلاق رسول
مخالف تھا انھوں نے فوراً "جواب دیا" لیکن اس قول خدا کے مطابق تھا کہ اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو

ایک روز انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں ریل میں اجمیر شریف جا رہا تھا، میرے ساتھ میری کاجل پوری
وبہ اور اس کی ماں بھی تھی کہ کسی اسٹیشن پر گاڑی رکی تو میرے ایک صوفی دوست بھی میرے درجے
آ گئے اور میری محبوبہ کو دیکھ کر انھوں نے "جل جلالہ" نعرہ بلند کیا، اور میں نے، اپنی محبوبہ کی ماں
طرف اشارہ کیا اور ان سے کہا جناب، اُم نوالہ بھی تو ارشاد فرمایئے، وہ جھینپ کر رہ گئے۔

ان کی آمدنی صرف تیس روپئے ماہانہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس قدر خوددار اور قانع
ے کہ۔

ایک بار میں انکے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک وردی پوش نوجوان نے آ کر کہا نیچے ہز ہائی نیس
......کھڑے ہوئے ہیں، آپ اجازت دیں تو حاضر ہوں، انھوں نے کہا اگر وہ میرے سامنے آ کر
کہیں کہ میرے تاج سے عبدالسلام کی جوتی اونچی ہے۔ تو شوق سے لے آیئے ورنہ گاڑی بڑھا دیں
ہائی نس کی عقیدت دیکھئے، وہ اوپر آ گئے، انھوں نے وہ الفاظ بڑے خلوص سے ادا کئے اور دو
زانو ہو کر بیٹھ گئے۔

ایک بار خواجہ حسن نظامی نے ان کے پاس آ کر کہا مولانا آزاد آپ کے دیدار کے مشتاق ہیں
فرصت نہ ہو تو کل میرے ساتھ ان کے وہاں تشریف لے چلئے، یہ سنتے ہی انھوں نے بگڑ کر کہا خواجہ
صاحب اگر آپ کے علاوہ کوئی دوسرا ایسی بات کہتا تو میں فوراً اسکو موٹی سی گالی دیتا۔ جایئے اور
ابوالکلام سے کہہ دیجئے کہ وہ یہاں نو من تیل لے کر آئیں اور میرا .... گھنٹے تک مسلسل
ہلائیں اور اس کے بعد مجھے اپنے وہاں بلائیں، یہ سن کر خواجہ صاحب کا رنگ فق ہو گیا وہ صرف دو
منٹ اور بیٹھے، اور پھر چلے گئے۔

ایک دن ان کے پاس پہنچا تو میرے دوست نواب مہدی یار جنگ، وزیر تعلیمات حیدر آباد
ان کے کوٹھے سے، اترتے ملے۔ صاحب سلامت اور معانقے کے بعد میں نے پوچھا۔ خدانخواستہ
مزاج ناساز گار ہے، انھوں نے کہا آپ میرے پاس آئیں گے تو بتاؤں گا، مجھے افسوس ہے
کہ حسن نظامی نے مجھ کو مولوی عبدالسلام کے پاس بھیج کر بیٹھے بٹھائے ذلیل کرایا۔
اوپر گیا دیکھا کہ مولوی عبدالسلام غصے میں بھرے بیٹھے ہیں۔ میں نے کہا مولانا کیا بات ہے،
انھوں نے کہا ابھی حیدرآباد دکن کے ایک وزیر صاحب جن کا خطاب ہے نواب مہدی یار جنگ
میرے پاس اس غرض سے آئے تھے کہ میں ان کو مسئلہ وحدۃ الوجود سمجھا دوں، میں نے
کہا کہ دنیا کے تمام علوم میں جو علم آپ کو سب سے زیادہ مستحضر ہو اسکا نام بتایئے، میں اس علم

کے مصطلحات میں یہ مسئلہ آپکو سمجھا دونگا، انھوں نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد کہا علم معنی و بیان۔ سو جوش میاں، اللہ آپ کا بھلا کرے میں نے علم معنی و بیان ہی کے مصطلحات میں وہ مسئلہ دو حضرت حق کے فضل و کرم سے ان کو سمجھا دیا۔

وہ اس قدر خوش ہوئے کہ انھوں نے جھک کر میرے ہاتھ چوم لئے، اور کہنے لگے آپ میرے ساتھ حیدرآباد تشریف لے چلیں میں نے کہا اب تو کوٹھے سے بھی نیچے نہیں اترتا ہوں، اتنا بڑا سفر کیسے کرونگا۔ اس پر انھوں نے جب مجھ سے یہ کہا کہ مولانا میں وہاں جا کر آپکو حضور نظام سے ملاؤنگا وہ آپکا اس قدر وظیفہ مقرر فرمائیں گے کہ یہ کمرہ چھوڑ کر آپ دہلی میں ایک کوٹھی تعمیر کرا کے اس میں رہنے لگیں گے۔

تو میاں جوش میرا ناریل (سر) چٹخ گیا، میں نے کہا آپ کے نزدیک کیا یہ بات ممکن ہے کہ میں اس جاہل کے سامنے اپنی وجاہت کی علمی کمر میں ذلت کی پیٹی باندھ کر جاؤں اس مسخرے کو "خداوند نعمت" اور اپنے کو "فدوی" کہوں نواب فہدی یار آپکو اس بات کا علم نہیں کہ میرے مولائے زبرین، بمراحل بہترین نظام کی مونچھوں کے بالوں کو خون جہل بڑھاتا ہے۔ جائیے گاؤ بڑھائیے۔

غلام نرگس مست تو تاجدارانند



مولانا عبداللہ عمادی

قد بوٹا سا، دماغ باون گز کا، چہرہ کتابی، داڑھی گھنی، عربی و فارسی کے ہفت قلزم، دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کے ناظر امور مذہبی، نخشن پسند وغیرہ متقی، بردباری کے ساتھ ظریف منہ پر لوگوں کے علم کی تعریف کرنے میں بلند آہنگ ان کے پیٹھ پیچھے ان کے جہل کا اعلان کرنے میں بیباک مزاح کے مواقع پر بے ساختہ قہقہہ مارنے پر مجبور عقل معاش سے بہرہ مند، نظام دکن کے تقوے سے کبھی لرزاں و ترساں اور عمل پر اکسانے والے شاعر ایک بار مودودی اور میں نے سازش کی کہ انھیں

...ائف کے کوٹھے پر لے جایا جائے ہم نے جھٹ سے ایک چھوٹا دعوت نامہ لکھا جس میں (مولانا)... عبدالقدیر بدایونی نے ان کو دن کے دو بجے گیارہویں شریف میں شریک ہونے کے لئے بلایا تھا۔ بہانے چکمے میں آ گئے ہم انکو موٹر میں بٹھا کر "محبوب کی مہندی" لے گئے جو طوائفوں کا محلہ تھا۔ ابھی موٹر سے اتر کر ہم طوائف کے کوٹھے پر چند قدم چلے ہی تھے کہ مولانا عمادی کے ایک دیرینہ دشمن کامل صاحب نے موٹر سے گذرتے ہوئے ہم کو دیکھ لیا کامل صاحب نے موٹر سے سر نکال مولانا عمادی کو بڑے غور سے دیکھا اور بڑے معنی خیز انداز سے اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا گذر گئے۔

مولانا عمادی اپنے دشمن کی نگاہ اور اس کے سر کی معنی خیز جنبش تاہم دیکھ کر سمجھ گئے کہ کچھ دال میں ہے ضرور"۔ اور سمجھے یہ لوگ کسی غیر مستحسن جگہ لئے جا رہے ہیں انھوں نے مجھے اور مودودی کو بڑے سے دیکھا ہم لوگ بے حد سنجیدہ بنے رہے۔ انھوں نے پوچھا یہ آپ لوگ مجھے کہاں لئے جا رہے ہیں مودودی کہا ارے آپ اس قدر جلد بھول گئے ہم لوگوں کو مولانا عبدالقدیر صاحب نے گیارہویں شریف شرکت کے لئے مدعو فرمایا ہے۔ اب ہم لوگ سیڑھیوں پر چڑھنے لگے آگے آگے وہ پیچھے پیچھے میں، میرے پیچھے مودودی اور مودودی کے پیچھے جہاں تک میرا خیال پڑتا ہے انکے چھوٹے بھائی سید ابوالخیر علی مودودی بھی تھے۔

یہ سوچ کر مولانا عمادی دن دہاڑے رنڈی کے کوٹھے پر چڑھ رہے ہیں۔ مجھے بڑے زور کی ہنسی آ گئی، عمادی صاحب نے گھبرا کر پوچھا، یہ آپ کس پر ہنس رہے ہیں۔ میں نے کہا، مودودی صاحب نے گدگدا دیا ہے۔ اتنے میں ایک بڑھیا کوٹھے سے اترتی نظر آئی، عمادی صاحب سنک تو چکے ہی تھے، انھوں نے پوچھا، مائی یہ کس کا مکان ہے۔ اس بڑھیا نے کہا پتری (طوائف) کا۔ "پتری" سنتے ہی مولانا اچھل پڑے، ان کی داڑھی کے بال کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے ہمیں بڑے قہر کی نگاہ سے دیکھا وہ اپنے بڑے بڑے پائنچے ہلاتے اور ہم لوگوں کو دھکا دیتے ہوئے بڑی تیزی کے ساتھ موٹر میں بیٹھے نہیں بلکہ گر پڑے اور گر کر ہانپنے لگے اور جب موٹر کے قریب آ کر ہم نے قہقہے مارے تو وہ زخمی شیر کے مانند بپھر کر کہنے لگے آپ لوگوں نے میرے باوجود دشمنی کی ہے میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گا آپ کو معلوم ہے کہ میرے پاس جو علم ہے وہ ہندوستان بھر میں کہیں قدر نہیں اس لئے میں نے دکن میں آ کر پناہ لی ہے، اگر کامل نے... تک یہ خبر پہنچا دی تو میں نے یہاں سے نکال دیا جاؤں گا، ہندوستان کی کسی مسجد کے ... میں مجھکو جگہ دی جائے گی اور جمعرات جمعرات گوشت اور بھی گائے کا گوشت ملے گا۔ یہ ... کی مذاق ہے کہ کسی کے پیٹ پر لات ماردی جائے۔ ہم نے کہا"

مولانا! آپ مزاح المومنین پر اس قدر بگڑ رہے ہیں، انھوں نے کہا آپ مزاح الکافرین کو مزاح المومنین کا خطاب دے رہے ہیں، اس واقعہ کے بعد انھوں نے ہم سے ملنا ترک کر دیا۔ اور ہماری دفتری زندگی بے حد بے لطف ہو کر رہ گئی۔

جب اُن کے غصّے اور ترکِ تعلق پر کچھ اوپر ایک مہینہ گزر گیا تو مودودی نے مجھ سے کہا پہلے آپ مولانا کے پاس جائیں اور منانے کی سعی کریں وہ نرم ہو جائیں گے تو مجھے بھی بلا لیجئے گا۔

میں بھی کڑا کر کے ان کے کمرے میں داخل ہوا اور دیکھا کہ وہ اپنے کمرے سے اتر کر ایک نشیبی حلقے کی نالی پر بیٹھ کر پیشاب کر رہے ہیں میرے ذہن میں فوراً ایک تیر بہدف تدبیر آگئی میں دبے پاؤں ان کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا اور جھک کر ان کو پیشاب کرتے دیکھنے لگا میرا سایہ پڑتے ہی انھوں نے بڑی گھبراہٹ سے مڑ کر دیکھا، فوراً کمر بند باندھ کر کھڑے ہو گئے مجھ سے بگڑ کر کہا یہ کیا حرکت تھی، آپ ستر بینی کا بھی ذوق رکھتے ہیں؟ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا مولانا گستاخی تو ضرور ہوئی مگر الحمدللہ یہ تماشا تو کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ انھوں نے منہ جھٹک کر کہا "تماشا کیسا ہے؟" میں نے کہا، مولانا قصور ... معاف آپ کا پیشاب کرنے والا عضو آپ کے لب ہائے مبارک سے اس قدر مشابہت رکھتا ہے گویا دو چار مہینے کی مسلسل تجارت کے بعد آپ کا منہ بالکل سمٹ کر نیچے لٹک پڑا ہے یہ سنتے ہی ہنسی کے مارے ان کے دونوں شانے ہلنے لگے اور ان کا سینہ اچھلنے لگا اور مجھ سے کہا، بڑا نام در خیال ہو گیا ہے آپ کو، اگر اس مضمون بلکہ کو آپ نظم کر دیں تو میں آپ کے تمام ذنوب معاف کر دوں گا

دوسرے ہی دن اسی مضمون کا ایک دس بارہ بند کا مسدس کہہ کر میں ان کے گھر پہنچا دیکھا، وہ لیٹے ہوئے ہیں، انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا کسی قدر بخار ہے معاف کیجئے گا اٹھ نہیں سکتا۔ میں نے کہا، آپ آرام فرمائیں، میں ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور کہا میں نے امتثال امر ایک مسدس کہا ہے "تشابہ تام" کے نام سے۔ انھوں نے کہا فوراً سنائیے اور دوسرے ہی بند پر وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور جھوم جھوم کر داد دینے لگے اور داد دینے میں اس قدر بار بار ہنسے کہ پسینہ آگیا، کہنے لگے، لیجئے بخار اتر گیا، انشاءاللہ آپ کو جزائے خیر دے، وہ مسدس اس قدر عریاں یعنی فحش ہے جیسے میری دیہاتی گنیا دلہن کی سی شرمیلی قوم برداشت نہیں کر سکتی۔ صرف اس کا ایک بند اور ایک بیت بڑی حد تک معتدل ہے، وہ سن لیجئے:

مشکل ہے فرق اسفل و اعلیٰ خدا کی شان   کہسار کا ہے کاہ میں جلوا، خدا کی شان
پنہاں میں تاب چہرہ پیدا خدا کی شان   صورت ہے جیسی ویسا ہی .... خدا کی شان

دنیا اے فتنہ ساز کے کرتوت دیکھئے
لٹکا ہوا ہے چاہ میں ہاروت دیکھئے

اور بیت ملاحظہ ہو:۔

میاں نظامی علم و فن کی گراہ کھولتا ہوا
پہنے ہوئے عبا، عربی بولتا ہوا

میں ان کے متعلق لکھ چکا ہوں کہ وہ مزاح کے مواقع پر بے ساختہ قہقہے مارنے لگتے اور نظام دکن سے لرزتا اں و ترساں رہتے تھے۔ اس کا بھی ایک واقعہ سننے کے قابل ہے۔ ایک روز نظام کے وہاں ڈنر تھا، ابھی نظام برآمد نہیں ہوئے اور مولانا مجھ سے باتیں کر رہے تھے کہ ایک بہت بوڑھے اور بڑے جاگیردار آئے جن کی گردن میں رعشہ اور چہرے پر سفید گل پھٹے تھے مولانا نے بڑے ادب کے ساتھ لپک کر انسے مصافحہ کیا وہ مصافحہ کر کے دو قدم پیچھے ہٹے تو میں نے ان کے کان میں کہا۔ آپ دیکھ رہے ہیں جاگیردار صاحب کو، یہ تو بالکل میاں کی پھکڑ، اور "پیسے میں" آپ ہی آپ ہیں یہ سنتے ہی وہ ہنسی کے مارے بے قابو ہو گئے، پھیں پھیں کرتے کھمبے کے پیچھے چلے گئے اور پیٹ پکڑ کر ہنسنے لگے اور یہ خیال کر کے کہ میں کہیں نظام کے سامنے انکو ہنسا دوں وہ کھمبے کے پیچھے سے غائب ہو کر مہمانوں کے غول میں جا گئے اور میں ہاتھ ملا کر رہ گیا کہ شکار ہاتھ سے نکل گیا۔

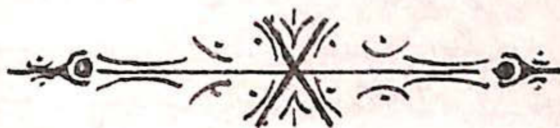
اتنے میں نظام برآمد ہو گئے دربار جم گیا اور قوالوں نے بہ بر تو این مسند شاہانہ مبارک باد بادشد" گانا شروع کر دیا قوالی ختم ہوئی تو نذریں پیش کرنے والے تمام غلامان زریں کمر آقائے زمیں گمدگار کی جناب میں نذریں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنے کو قطار باندھ کر صف بستہ ہو گئے اور:۔

کیوں وہ صیاد کسی صید پہ توسن ڈالے
صید جب خود ہی چلے آتے ہیں گردن ڈالے

کا تماشا ہونے لگا۔ میں عمادی صاحب کے شکار کے لئے گوشے میں دبک کر کھڑا ہو گیا۔ اور نذروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

جب آدھی رات سے زیادہ نذریں پیش ہو چکیں، میں نے دیکھا کہ مولانا چاروں طرف نظریں دوڑاتے چلے آرہے ہیں، میں ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا اور مولانا یہ خیال کر کے کہ میں غالباً آگے کی صف میں ہوں گا۔ ایک صاحب کے پیچھے جا کر کھڑے ہو گئے اور میں دبے پاؤں جا کر ان کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اور جب انھوں نے یہ دیکھا کہ اب میری نذر کی باری آرہی ہے، انھوں نے ایک اشرفی اور چار روپئے جیب سے نکال کر رومال میں لپیٹ لئے اور اپنی پشت

پر ہاتھ باندھ لئے۔ میں نے ان کا رومال اچک لیا انھوں نے اچھل کر مجھے دیکھا، بڑی بے کسی سے کہنے لگے برائے خدا اس وقت مزاح نہ فرمایئے ورنہ مجھکو ہنسی آجائے گی اور بھرے دربار سے نکال دیا جاؤنگا، اتنے میں انکی باری آگئی، میں نے انکا رومال انکو دے دیا لیکن وہ میرے اس مذاق سے اس قدر نروس ہو چکے تھے کہ نظام کی خدمت میں نذر گزارنے کے بدلے وہ شہزادوں کو ہاتھ کے سامنے جاکر جھک گئے، اور نظام نے گرج کر کہا ارے ادھر آؤ مولانا قاموس اللغات اتنے اتنے بڑے بڑے ہنڈاں (ہانڈے) جل رہے ہیں اور تمھاری نظر مجھ پر نہیں پڑ رہی ہے مولانا جھپٹ کر نظام کے روبرو چلے گئے اور نذر پیش کردی الٹے قدموں ہٹے اور ستون سے ٹکرا کر گر پڑے نظام نے قہقہہ مارا اور میں نے ستون کی آڑ سے کہا۔ آداب عرض ہے مولانا



فراق گورکھپوری

مجموعۂ اضداد، آمیزۂ بلور و فولاد۔ گاہ نسیم بوستاں گاہ، صرصر بیاباں، گاہے خضر درگاہ، گاہے، گم کردہ راہ۔ گاہ شبنم برگ تاک۔ گاہ شعلۂ جوالۂ بے باک گاہ یزداں بآغوش گاہ اہرمن بہ دوش۔

رند قدح خوار، گوہر شاہ دار۔ آسمان خوش لہجگی کے بدر، انجمن آگہی کے صدر۔ اولیائے ذہانت کے قافلہ سالار، اقلیم ژرف نگاہی کے تاجدار۔ نجو و پناہ، نقاد نگاہ، مہبط جبریل، شاعر بزرگ و جلیل۔

اپنے فراق کو میں قرنوں سے جانتا اور انکی خلاقی کا لوہا مانتا ہوں۔ مسائل علم و ادب پر جب وہ زبان کھولتے ہیں تو لفظ و معنی کے لاکھوں موتی رولتے ہیں اور اس افراط سے کہ سامعین کو اپنی کم سوادی کا احساس ہونے لگتا ہے۔

وہ بلا کے حسن پرست اور قیامت کے شاہد باز ہیں اور یہ وہ ذکاوت مخصوصہ ہے جو دنیا کے تمام عظیم فنکاروں میں پائی جاتی ہے۔ کچھ زہاد صالحین پر آوازے کستے ہیں اور وہ انکے توفیقوں

کے کھوکھلے پن پر دل ہی دل میں ہنستے ہیں لیکن انکی راتوں سے ہشار پینے سے پیشتر وہ غمگسار پیتے ہی دشمن خونخوار بن جایا کرتے ہیں نہایت استعجاب آمیز قلب کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انکا اپنی رفیقۂ حیات سے جو برتاؤ ہے ــــــ وہ سینۂ انسانیت کا ایک ہولناک گھاؤ ہے، اور ان کے شدائد سے تنگ آکر انکا بیٹا خود کشی کر چکا ہے۔

وہ ایک دُہری شخصیت کے انسان ہیں، کبھی مسیح دوراں ہیں اور کبھی موسئی عمراں، کبھی مہکتے گلزار۔ کبھی اپی تلوار۔ دہلی کے دوران قیام میں ایک بار وہ مجھ سے بھی بہت ہی بری طرح الجھ پڑے تھے اس وقت اگر میں اپنی بیٹھنولی کا گلا نہ گھونٹ دیتا تو بڑا خون خرابہ ہو جاتا۔ اس رات کی صبح کو میں نے ان پر ایک نظم کہی تھی، جس کا صرف ایک شعر یاد ہے۔

نہ عطا کر مگر مجھے معبود
بھول کر بھی شب وصال فراق

پی کر لڑ پڑنا اور محفل کو درہم برہم کر دینا اب ان کی گزک بن چکا ہے۔ اس لئے ان کو برا نہ کہئے۔ ان پر ترس کھائیے اور ان کی راتوں سے دامن بچائیے۔

ایک بار کشمیر کے ہاؤس بوٹ میں وہ اور ساغر میرے ٹھہرے ہوئے تھے، فضا نہایت خوشگوار اور جھیل کی موجیں نغمہ بار تھیں۔ دور چلنے لگا اور دو جام خالی کر کے انہوں نے ساغر کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے پوچھا، یہ سامنے کون بیٹھا ہوا ہے، میرا ماتھا ٹھنک گیا میں نے کہا دیکھو فراق ہم کو (پی کر) گزک نہ بنانا وہ چپ ہو گئے لیکن پھر کے کرب سے، پتا چلنے لگا کہ رنگ پر آنے والے اکے واسطے ان کا تسمہ ایڑیاں رگڑ رہا ہے، اور اب ان سے رہا نہیں گیا، انھوں نے کہا جوش تم خواہ بتاؤ یا نہیں بتاؤ میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے سامنے ساغر بیٹھا ہوا ہے، میں نے کہا پھر تم سے کیا غرض انھوں نے اپنی گول گول آنکھوں کو گردش دے کر کہا اس لونڈے سغرا (ساغر کی تصغیر) کو بھی خدا کی شان یہ دعوا ہے کہ میں شاعر ہوں حالانکہ خدا کی قسم، میرا بٹلر اس سے کہیں اچھے شعر کہتا ہے۔ اب کہا تھا ان کی آرزو پوری ہو گئی۔ ساغر یہ سنتے ہی جامے سے باہر ہو گئے اور دونوں میں گتھم گتھا ہو گئی۔

ایک بار علی سردار جعفری کسی مشاعرے میں شریک ہونے الہ آباد گئے، اور ان کے وہاں قیام کیا انھوں نے جی کھول کر ان کی تواضع کی اور خوب کھلایا پلایا، اور جب موٹر میں بیٹھ کر دونوں مشاعرے کی طرف روانہ ہوئے تو مشاعرے کے پھاٹک پر کھڑے ہو کر فراق کا جی چاہا تھوڑی سی گزک کر لیں یہ خیال آتے ہی بانیئے مشاعرے سے انھوں نے کہا، سن لیجئے جناب یا تو فراق مشاعرے میں..

شرکت کرے گا یا علی سردر[1] بانیٔ مشاعرہ نے لاکھ لاکھ سمجھایا اور علی سردار نے کہا فراق صاحب میں تو آپ کا مہمان ہوں، لیکن وہ نہیں مانے پھاٹک پر تماشائیوں کے ٹھٹ لگ گئے اور وہ علی سردار کو برا بھلا کہتے ہوئے اپنے گھر چلے گئے اور صبح کے وقت اسی رات کے سردر کی گردن میں بانہیں ڈال کر مسکرانے لگے۔

لیکن ابھی جب میں دہلی گیا تو ان کے مزاج کا تغیر دیکھ کر دنگ ہو گیا۔ وہ دہلی میں کسی مشاعرے کی شرکت کے لئے آئے اور اپنے شاگرد گرگ کے وہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں پہنچا تو دوڑ کر انھوں نے گلے لگا لیا۔ اور ہر چند رات کے بارہ ایک بجے تک وہ میرے ساتھ پیتے رہے لیکن آخر تک وہ قطعی بگڑے نہیں بلکہ لڑائی کا گوشہ نکالنے کے عوض انھوں نے اتنے لطیفے سنائے کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ ان میں سے ایک لطیفہ آپ بھی سن لیجئے۔

انہوں نے کہا، پرسوں ہم سب کو ہمارے ایک ماہر آثار قدیم دوست نے بہت تڑکے اپنے گھر بلایا اور کہا کہ وہ دہلی کی ایک ایک تاریخی اینٹ سے ہمیں آگاہ کر دیں گے۔ چونکہ یہ جاڑے کا موسم ہے ہم نے خیال کیا کہ انھوں نے صبح کے وقت بلایا ہے۔ اس لئے ناشتے کا انتظام انھیں کے گھر پر ہوگا۔ چنانچہ ہم تینوں موٹروں پر بیٹھ کر ان کے دہاں پہنچ گئے اور جب یہ دیکھا کہ وہاں ناشتے کا کوئی انتظام نہیں ہے اور وہ قطب جانے کی جلدی کر رہے ہیں تو ہم سوچ کر مطمئن ہو گئے کہ وہاں جا کر ناشتہ کرائیں گے، لیکن جب وہاں بھی ناشتہ کا کوئی بند و بست نہیں دیکھا تو ہم پریشان ہو گئے اور وہ ہمیں ایک سے دوسری جگہ اور دوسری جگہ سے تیسری جگہ لئے پھرتے رہے یہاں تک کہ دوپہر کے کھانے کا وقت بھی گزرنے لگا اور بھوک سے ہم سب کا برا حال ہو گیا۔ اس وقت مجھ کو شرارت سوجھی اشارے سے میزبان کو ایک گوشے میں لے جا کر میں نے کہا جناب والا اب تو یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ میرے ساتھ ۔ ۔ ۔ کر دیں۔ ماہر آثار دوست نے بڑی حیرت سے مجھ کو دیکھا اور کہا۔ فراق صاحب آپ اس قدر سنجیدہ ہو کر مجھ سے ایسی فحش بات کی فرمائش کر رہے ہیں۔ میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ جناب بھوک اس قدر لگی ہے کہ میں سوچنے لگا ہوں کہ آخرکار کچھ تو پیٹ میں جائے۔

میں نے قہقہہ مار کر کہا۔ ارے مر گئے اس "کچھ تو پیٹ میں جائے" کی بلاغت کا کوئی ٹھکانہ نہیں اور تمام لوگ پیٹ پکڑ کر ہنسنے لگے۔

لگے ہاتھوں ایک واقعہ اور بھی سن لیجئے ہم لوگ احمد آباد، بمبئی کے کسی مشاعرے کی شرکت کے واسطے گئے اور ایک بالاخانے کے بڑے وسیع و تاب ناک ہال میں فرش پر بیٹھے

---

[1] "سردار" کی تحقیر و تصغیر

شغل کر رہے تھے کہ ایک اجنبی نوجوان نے آ کر کہا میں حضرت فراق گورکھپوری سے ملنے آیا ہوں وصل نے کہا یہ ہیں فراق صاحب، اس نوجوان نے لپک کر ان کے ہاتھ چوم لئے اور دو زانو ہو کر بڑے ادب سے بیٹھ گیا۔ فراق نے کہا آپ کا نام؟ اس نے اپنا نام بتانے کے بعد دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا میں آپ کو کل کا ایک واقعہ سنانے آیا ہوں، اجازت ہو تو عرض کروں فراق نے کہا ضرور کہئے آپ تو بڑے نستعلیق نوجوان معلوم ہوتے ہیں۔ اس نوجوان نے کہا پرسوں میں بازار سے گزر رہا تھا دیکھا کہ برات کا ایک بہت بڑا جلوس رکا ہوا ہے سڑک کا ہجوم دم بخود کھڑا ہوا ہے میں نے پوچھا یہ ماجرا کیا ہے ایک صاحب نے بتلایا کہ دولہا جس ہاتھی پر سوار ہے وہ ہاتھی زمین پکڑ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ لاکھ لاکھ آنکس مارے جا رہے ہیں مگر وہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر رہا ہے اور چونکہ دولہا کی سواری کا راستے میں رک جانا فال بد خیال کیا جاتا ہے اس لئے دولہا کے باپ کے حواس اڑے ہوئے ہیں ابھی وہ آدمی مجھ سے یہ کہہ ہی رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ پندرہ سولہ برس کا لڑکا دوڑا ہوا آیا اور اس نے دولہا کے باپ سے کہا کہ اگر میں ہاتھی کو ابھی ابھی چلا دوں تو کیا آپ مجھے پچاس روپئے دیں گے؟ دولہا کے باپ نے کہا ارے پچاس نہیں سو روپئے دوں گا۔ یہ سن کر اس لڑکے نے اچک کر ہاتھی کے کان میں ایک بات ایسی کہی کہ وہ بے ساختہ دم دبا کر بھاگنے لگا۔ فراق نے پوچھا اس لڑکے نے کیا کہا تھا؟ اس نوجوان نے بڑی متانت سے کہا کہ اس لڑکے نے اس کے کان میں یہ کہا تھا کہ ابے سالے تیرے پیچھے فراق آ کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ یہ سنتے ہی ہم سب کے فلک شگاف قہقہوں سے ہال کی محراب گونجنے لگی۔ اور وہ نوجوان فوراً بھاگ کھڑا ہوا اور فراق کی آنکھوں کے دونوں ڈھیلے پہیوں کے مانند گھومنے لگے۔

آخر میں میں یہ کہوں گا ...... "کہ ہندوستان نے ابھی تک فراق کی عظمت کو پہچانا نہیں، عصر کا تقاضہ ہے کہ وہ انکو سر آنکھوں پر جگہ دے اور انکو بہ ہمہ وجوہ مطمئن کر کے اپنے دامن کو مزید دھبوں سے بچا لے اور نمک حرامی کے داغ سے اپنی پیشانی کو بچائے۔

جو شخص یہ تسلیم نہیں کرتا کہ فراق کی عظیم شخصیت ہندوستان کے ماتھے کا ٹیکا، اردو زبان کی آبرو اور شاعری کی مانگ کا صندل ہے۔ وہ خدا کی قسم کور مادرزاد ہے۔

زندہ باد فراق ——

پائندہ باد فراق



وحید الدین سلیم

پانی پت کے باشندے، حالی کے ہم وطن ذی علم، حیدرآباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر، سید احمد خاں کے سابق سکریٹری، اردو زبان کے مزاج داں و قوام "وضع اصطلاحات" کے مصنف، غیر معمولی ادراک و ذہن، بے حد بذلہ سنج، نیچریوں کے استاد، مبلغ و الحاد بڑے جاندار تمتشاعر، اور کنجوسی میں قارون کے قبلہ و اللہ گرامی۔ لیکن جسم اس قدر بھدّا اور صورت ایسی ناقابل برداشت کہ الامان و الحفیظ۔ ان کے چہرے کا رنگ اس قدر گٹھا اور لبدھڑ تھا گویا بہت پرانا چکٹا ہوا گڑوا تیل جما ہوا ہے اور ان کے رخساروں پر ایسی بے آبرو کر دینے والی داڑھی لٹکی ہوئی تھی کہ جب نگاہ اس کی جانب اٹھتی تھی تو ہزاروں گدھ دیکھنے والوں کی پیٹھوں پر آکر بیٹھ جاتے اور بیٹ کرنے لگتے تھے، اور ان کے وزن سے آنکھیں جھک جاتی تھیں مگر دماغ اس قدر خاذ و جان دار تھا کہ بڑھاپے میں بھی، جب کہ دماغ نئے نئے خیالات قبول کرلینے سے انکار کر دیتا وہ برجستہ خیال کو با آسانی قبول کر لیتے تھے اور گھڑی کی سکنڈ کی سوئی کی طرح انکا دماغ ہمیشہ چلتا اور کھٹ کھٹ کرتا رہتا تھا۔

ہر چند پرانے زمانے میں ان کی تنخواہ ایک ہزار تھی جو آج کے دس ہزار کے برابر ہے، لیکن انھوں نے کبھی باورچی یا خدمتگار نہیں رکھا، ہم دوستوں سے تقاضے کر کر کے اپنی دعوتیں کرایا کرتے تھے، اور جس روز دعوت نہیں ہوتی تھی کسی گھٹیا سے ہوٹل میں جا کر ڈیڑھ آنے میں شلجم شیر ہو جاتے تھے۔ انکو پان کا بے حد شوق تھا مگر دوستوں کے سامنے جب پاندان کھولتے تھے تو کتھے چونے کی کلھیوں میں انگلیاں ڈال ڈال کر چاٹنے لگتے تھے، تاکہ گھن کھا کر کوئی ان سے پان نہ طلب کر سکے۔

وہ گھر میں بڑے پائنچوں کا ڈھیلا ڈھالا پائجامہ پہنتے تھے، تاکہ اٹھنے بیٹھنے اور لیٹنے میں مسک نہ جائے، اور آدھے دھڑ سے ننگے رہتے تھے ایک روز انھوں نے پانی سے بھرا ایک بڑا سا مٹکا اٹھایا، جس سے ان کی توند دب گئی اور پائجامہ گھٹنوں پر آگیا ان کو بالکل ننگا دیکھ کر میں نے آنکھیں بند کرلیں اور انھوں نے قہقہہ مار کر کہا نادیدے جی بھر کے مجھے

ننگا دیکھ لے ایسے مواقع روز روز نہیں آیا کرتے ۔

ایک دن صبح چار بجے، ایک نعت کا میرے دماغ پر نزول ہوا، اور اس قوت کے ساتھ کہ مسلسل تین روز تک وہ مجھ پر نازل ہوتی رہی اور میں کمرے میں بند اور شراب سے مست ہو کر پیغمبر کے مانند لکھتا رہا، چوتھے روز جب وہ مکمل ہو گئی میں سید محمد وحید الدین صاحب کے پاس پہنچا اور بڑے ولولے کے ساتھ انھیں وہ نعت سنانے لگا اور مجھے بے تحاشا بے تکلفی کے ساتھ داد دینے لگے۔ مجھ کو چاہیئے تھا کہ میں انکی دبی ہوئی ہنسی میں جھولتی ہوئی داد کو دیکھ کر مزید اشعار سنانے سے انکار کر دیتا مگر اس وقت مجھ پر نعت خوانی کا اس قدر شدید جذبہ طاری تھا کہ میں اسکو محسوس نہیں کر سکا، اور شعر سناتا چلا گیا، لیکن جب ایک شعر پر ان کے منھ سے ایک خارا شگاف قہقہہ نکل گیا، اور پیک سے ان کا سفید سویٹر لال ہو گیا تو میں اپنی کاپی کو بند کر کے حیرت سے ان کا منھ تکنے لگا۔ اور میری سراسیمگی کا اندازہ لگا کر، جب دوبارہ قہقہہ مارتے مارتے ہوئے انھوں نے کہا صاحبزادے کیسی الوہیت اور کیسی نبوت، کس چکر میں پڑے ہوئے ہو تو مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا اپنا سا لے کر میں وہاں سے اٹھ گیا۔ آجتک یاد ہے مجھ کو وہ پشیمانی ۔

ذرا زمانے کی ستم ظریفی تو ملاحظہ فرمایئے کہ ان بے چارے نے زبردستی کی دعوتوں اور گھٹیا قسم کے ہوٹلوں میں تمام عمر کھانا کھایا زندگی بھر باورچی خانہ نہیں دیکھا ان کے مکان کا چولہا کبھی گرم نہیں ہوا اور کوڑی کوڑی کر کے جب تیس چالیس ہزار روپئے جمع کر لئے تو ان کو موت آ گئی وہ تمام دولت ان کی اکلوتی بیٹی کو ملی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ انکا وہ تمام روپیہ اللہ کا مولوی، داماد، نمازیں پڑھ پڑھ کر ہضم کر گیا اور ڈکار تک نہ لی ۔

دکھ جھیلیں بی فاختہ۔ اور اوے کوّے انڈے کھائیں۔ محمد ڈھول بنا کے اور اچھے ملا بجا لے واہ ری دنیا ہائے



سید جالب دہلوی

میں اپنے ذہن کو مبالغے سے پاک کر کے، بلا خوف البطال ڈنکے کی چوٹ پر دعویٰ کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص معلومات عامہ حاصل کرنے کی دھن میں کامل ساٹھ برس تک، اس روئے زمین

آغا حسن عابدی

یونائیٹڈ بنک کے صدر میرے آسمان (لطف) کے بدر، اور میرے محسن ذی قدر ہیں جس وقت حکومت کے عتاب نے مجھکو سمندر میں گرادیا تھا آغا صاحب بھی بھیم جی کے دوش بدوش کشتی لے کر آ گئے تھے، انھوں نے بھی بھیم جی کے ساتھ ساتھ مجھکو غرق ہونے سے بچایا تھا آغا صاحب اپنے بنک کو فروغ دینے کے واسطے سے

ایک جا رہتے نہیں عاشق ناکام کہیں
دن کہیں رات کہیں صبح کہیں شام کہیں

پر عمل کرتے ہوئے ہمیشہ اندرون و بیرون ملک دوروں پر دورے کیا کرتے ہیں۔ دو دو دن کراچی میں رہتے ہیں انتیس ۲۹ دن باہر اس لئے میں ان سے فقط ایک بار مل سکا ہوں۔

انکو جب میری آنکھوں نے دیکھا نہیں تھا اس وقت ان کے بارے میں میرے کانوں نے یہ سنا تھا کہ آغا صاحب ایک بے فیض و بے وفا انسان ہیں اور اس قدر کہ انسان کے آڑے وقت کام آنے کو ایک لایعنی فعل سمجھتے ہیں۔ لیکن جب میں ان سے ملا اور میری الفاظ آنکھیں ان کی طرف اٹھیں تو میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے کے خال و خد اور ان کی آنکھوں کے رنگ میں ایک ایسا انسان جھلک رہا ہے جو خیر مجسم کے علاوہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا، اور جب میرے کانوں نے ان کے دھیمے لہجے کو گرفت میں لیا تو ایسا محسوس ہوا کہ جھٹپٹے کے وقت میٹھے پانی کی نہر بہہ رہی ہے ـــــ لگے ہاتھوں ایک بات اور بھی کہہ دوں بعض مسائل پر جب میں نے ان سے تبادلہ خیال کیا تو پتہ چلا کہ وہ ایک ذی علم اور صاحب فکر انسان بھی ہیں اور اس وقت مجھے خیال آیا کہ وہ ہر چند دنیوی اعتبار سے ایک نہایت کامیاب شخص ہیں۔ لیکن قدرت نے ان کو اس اورنگ علم سے محروم کر کے جس کے وہ مستحق تھے ان کو سونے کی سولی پر چڑھا کر ان پر بہت بڑا ظلم کیا ہے اور وہ اس صورت حال کی افسوس ناک مثال ہیں جس کو عربی میں "ظلم" اور انگریزی میں مس پلیس منٹ (MIS PLACE MENT) کہا جاتا ہے۔



مصطفےٰ زیدی

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے

اس ماہ رخسار، نادرہ گفتار، بلند کردار، باخلاص شعار، سعادت مدار اور پریم اوتار نوجوان بچے کے ——— پیدائش سکونتی اور سجادہ دانی ——— فن وطن ہیں۔ الٰہ آباد، پاکستان اور میرا دل (اللہ اکبر میرا دل، فرش پر عرش کا حامل) یہ ایک انوکھی نوک پلک کا ہونہار شاعر ہے ہر چند قدیم روش کو ترک کر کے، یہ جدید ڈھرے پر آ گیا ہے لیکن اس کے کلام میں ائمۂ ادب کی سی شان پائی جاتی ہے، اس کی شاعری اس قدر بلند تخیل اور اس درجہ بلند طرز بیان کی حامل ہے کہ لبا اوقات سر دھننے اور اسکا منہ چوم لینے کو جی چاہتا ہے اور کبھی کبھی تو یہ تمنا پیدا ہو جاتی ہے کہ کاش میں بھی ایسا کہہ سکتا اللہ نظر بد سے بچائے۔

جب لندن چلا گیا تھا میں کہہ رہا تھا ؎

سر دیکھنا ابھی سر اٹھی ردی
سخت بے مہری کی یہ کامی ردی

اس بچے کے حالات نامساعد ہو چکے ہیں، یہ وہ وقت ہوتا ہے، کہ جب اقربا و احباب منہ پھیر لیا کرتے ہیں۔ مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ یہ جوش اس کے واسطے جان تک دینے کو تیار ہے۔ مصطفیٰ زیدی اپنا دل نہ ٹوٹنے دو، تم ایک دولت بیدار ہو، تم کو اپنی قدر اور حفاظت کرنا ہے ؏



مجازؔ!

صد حیف کہ میں یہ لکھنے کو زندہ ہوں کہ مجازؔ مر گیا۔

یہ کوئی مجھ سے پوچھے مجاز کیا تھا، اور کیا ہو سکتا تھا! مرنے وقت تک اسکا فقط ایک ربع دماغ کھلنے پایا تھا اور اس کا یہ سارا کلام اس ایک ربع کھلاوٹ کا کرشمہ ہے۔ اگر وہ بڑھاپے کی عمر تک آتا تو اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر تھا۔

مگر افسوس کہ پینا اس کو کھا گیا۔

میں نے اس جوانا نِ مرگ کو مخاطب کرکے ایک "پند نامہ" کہا تھا وہ میری نظم سن کر رو دیا تھا کہ آپکو مجھ سے کس قدر محبت ہے۔ مگر اس پر عمل نہیں کر سکا۔ اور عمل کر تا بھی تو کیسے؟۔

بارہا کہہ چکا ہوں کہ یوں تو دنیا کے ہر کام میں اعتدال برتنا بے حد مشکل ہے۔ لیکن شراب میں اعتدال کا قائم رکھنا تقریباً "محال ہے۔

مجازؔ اعتدال برت نہ سکا اور جوانی ہی میں یہ کہتا گزر گیا۔

ہم مے کدے کی راہ سے ہو کر گزر گئے ورنہ سفر حیات کا بے حد طویل تھا

ایک روز کسی اللہ کے بندے نے اسکو سمجھایا تھا کہ دیکھو جوشؔ صاحب کی طرح شراب کی ایک معینہ مقدار کو گھڑی سامنے رکھ کر ایک معین وقت میں پیا کرو تو اس نے جواب دیا تھا کہ جوشؔ صاحب تو گھڑی سامنے رکھ کر پیتے ہیں۔ میرا بس چلے تو میں گھڑا سامنے رکھ کر پیا کروں میں اس کو بار بار سمجھایا کرتا تھا کہ تو نے علم سے رشتہ منقطع کر لیا ہے یہانتک کہ اخبار تک نہیں دیکھتا ہے اپنے علم و مطالعہ کو بڑھا لیکن وہ نہیں مانا۔

یہ بمبئی کا ذکر ہے، میں ایک سمندر کے سامنے کے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا مجاز و ساغر بھی میرے ہم پیالہ تھے آسمان پر شفق تھی زمین پر سمندر، اور میز پر شیشہ و ساغر اور ہوا کمبخت ایسی ملائم چل رہی تھی کہ جی چاہتا تھا ناچنے لگوں، جب ہمارا کیف خوب گھٹ گیا تو مجاز نے اٹھ کر ساغر کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ ساغر بھی اس سے چمٹ گئے مجاز نے کہا میرا "سفروا" ارے میرا "سفروا" ساغر بھی اس کا ماتھا چوم کر "ارے میرا مجزوا، میرا مجزوا"

کہنے لگے ابھی یہ اختلاط ہو ہی رہا تھا کہ مجاز نے، ساغر کا چشمہ سے بوسہ لے لیا اور مٹک مٹک کر کہنے لگا۔

مگر ایک بات ہے، مگر ایک بات ہے، ساغر نے کہا کیا بات ہے، مجاز نے کہا مگر یہ بات ہے کہ پیارے تو شاعر بالکل نہیں ہے۔ ہنستے ہوئے ساغر نے رونا شروع کر دیا مجاز پھر ان کے گلے لگ گئے، پیارے میں تجھکو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ تیر اکوئی جواب نہیں ساغر نے رونا بند کر دیا۔

مجاز نے کہا تجھ سے اس قدر محبت کے بعد بھی خدا کی قسم میں تجھکو شاعر تسلیم کر ہی نہیں سکتا، مگر ایک بات ہے، مگر ایک بات ہے، اور ساغر پھر رونے لگے۔

جب میں نے دیکھا کہ بار بار مجاز ساغر کو گلے لگا لگا کر "مگر ایک بات ہے" سے رلا رہا ہے تو میں نے کہا "مجاز ختم کر اس تکرار کو بیٹھ جا خاموش صوفے پر۔ اور مجاز جب بیٹھ گیا تو ساغر نے بسور کر مجھ سے کہا یہ مجاز بھی عجیب آدمی ہے، مجھ سے محبت بھی کرتا ہے اور میرا دل بھی توڑتا ہے یہ سنتے ہی مجاز پھر کھڑا ہو کر، ساغر کی بلائیں لے کر کہنے لگا پیارے مجھ کو معاف کرو، میں تم سے بیحد محبت کرتا ہوں، خدا کے لئے ہنسنے لگو نہیں تو میرا دل پاش پاش ہو جائے گا ساغر ہنسنے اور قہقہے لگانے لگے اور عین اسی عالم میں مجاز نے کہا "مگر ایک بات ہے" ساغر نے پھر رونا شروع کر دیا۔

ہائے رے ان راتوں کو کہاں سے ڈھونڈھ کر لاؤں۔

ایک دن وہ میرے پاس آیا اور آتے ہی تخت پر گر کر ہنسنے اور لوٹنے لگا، میں نے پوچھا تو اس نے بتایا ابھی ایک نیا تماشا دیکھ کر آ رہا ہوں۔ میں خانصاحب کے یہاں بیٹھا تھا کہ ان کے نوکر نے آ کر کہا باورچی نے یہ کہلا بھیجا ہے کہ ہماری تنخواہ بڑھا دیجئے ورنہ ہم نوکری چھوڑ دیں گے

خان صاحب نے بگڑ کر کہا بلاؤ باورچی کے بچے کو۔"

باورچی آیا تو انھوں نے ڈپٹ کر پوچھا کیا کہا تھا۔ بھیجا تھا تو نے مجھ سے، اس نے کہا میں نے کہلوا بھیجا تھا کہ ہماری تنخواہ بڑھا دیں ورنہ۔

خاں صاحب نے اس کی زبان سے "ورنہ" سنتے ہی ڈنڈا اٹھا لیا، اور کہا ہاں کہو "ورنہ" کے بعد کیا کہو گے؟ اور باورچی نے سر جھکا کر جواب دیا ورنہ اسی تنخواہ میں نوکری کرتے رہیں گے۔

میں نے ایک دن پوچھا "مجاز تمھارے والدین تو بڑے صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں، پھر تمھاری

سلہ ساغر کی پیار بھری

باده خواری کو وہ کیونکر برداشت کرتے تھے۔ اس پر اس نے بے ساختہ کہا ہم تو صاحب بعض والدین اس قدر خوش قسمت ہوتے ہیں کہ انکی اولاد سعادت مند ہے اور میں ایک ایسا خوش قسمت بیٹا ہوں جسکے والدین بیحد سعادتمند واقع ہوئے ہیں۔ جواب سے پھڑک گیا۔

ایک بار دہلی میں وہ مجھ سے بے حد ناخوش ہو گیا تھا وہ "تازہ تازہ" دماغی اسپتال سے بظاہر تندرست ہو کر آیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ہر چند اس کو افاقہ ہو چکا ہے۔ لیکن مرض کا ازالہ نہیں ہوا ہے۔

ایک روز اس نے دہلی کے چیف کمشنر کو فون کیا کہ مجھے سو روپئے بھیج دیجئے۔ میں نے اس بات پر بہت پھٹکارا اور کہا تو نے اپنی اور پوری شاعروں کی قوم کی عزت خاک میں ملا کر رکھ دی ہے۔ اس نے میرے منہ پر تو کچھ نہیں کہا، لیکن یہ شعر لکھ کر میرے پاس بھیج دیا۔

جو گزرتی ہے قلب شاعر پر   شاعر انقلاب کیا جانیں

حیف دنیا کے کارخانے پر یہاں جو راتیں پل بھر ہنساتی ہیں، وہ مرتے دم تک رلاتی ہیں۔

تار جاں، رشتہ سوزاں ہے، یہ معلوم نہ تھا   موت کی لرزش مژگاں ہے، یہ معلوم نہ تھا
مہلت مختصر صحبت یاراں سست بنیاد   مستقل ماتم یاراں ہے، یہ معلوم نہ تھا
گنبد نشہ بالیدہ و محراب سر دار   سایہ ابر گریزاں ہے، یہ معلوم نہ تھا
برگ سبزہ، ورق نسترن و تختہ گل   چادر قبر بہاراں ہے یہ معلوم نہ تھا
آب خم خانہ ہستی و شراب ہستی   شب غم گور غریباں ہے یہ معلوم نہ تھا



میرے دور کی چند عجیب ہستیاں

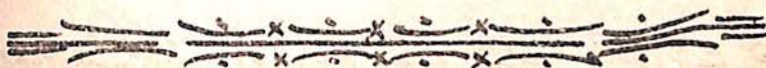
میر سخاوت حسین

وہ اودھ کے کسی قصبہ کے سادات میں سے ایک نہایت دبلے پتلے، پڑھے لکھے ادب دوست، موسیقی پرست اور نہایت مہذب انسان اور میرے یہاں منشی کی حیثیت سے ملازم تھے، لیکن کھانسی ان کی چڑھ تھی، یہ ناممکن تھا کہ ان کے سامنے کوئی کھانسے وہ چھوٹتے ہی، اس کو گالی نہ دیں۔

اگر مجھ کو ان کی اس نرالی عادت کا علم ہوتا، تو انھیں ملازم نہ رکھتا، یا کم سے کم اپنی صحبت میں نہ بیٹھنے دیتا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ میرے پاس لکھنؤ کے چند اکابر علم و ادب بیٹھے ہوئے تھے، کہ ان میں کسی کو کھانسی آ گئی اور میر صاحب پاجامہ سے باہر ہو کر ان کو گالیاں دینے لگے۔ میں نے اپنے خدمت گار جگنو سے کہا گدی میں ہاتھ دے کر انھیں محفل سے نکال دو ـــــ وہ روتے ہوئے چلے گئے۔

جب محفل بھیانک ہو کر برخاست ہو گئی اور میں نے ہزاروں معافیوں کے ساتھ سب کو رخصت کر دیا تو میر صاحب کو بلا کر میں نے بے حد ڈانٹا ڈپٹا ـــــ میر صاحب بیچارے کانپنے لگے اور کان پکڑ کر قسم کھائی کہ وہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہیں کریں گے لیکن اس کے دوسرے ہی روز جب میں زینے سے اتر کر ملاقات کے کمرے کی طرف جا رہا تھا، میں نے ملاقات کے کمرے سے اپنے ایک دوست محمود علی خاں کے کھانسنے اور اسی کے ساتھ ساتھ میر صاحب کی "دھت تیرے کی تیری ماں کی۔۔۔۔۔۔" آواز سنی غصے میں ـــــ پھر ان کے کمرے میں گیا۔ اور ڈانٹ کر کہا کیوں میر صاحب ـــــ پھر وہی گالم گلوچ" مجھے دیکھتے ہی وہ اچھل پڑے، چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں

انکا یہ عالم دیکھ کر میرا دل پسیج گیا بڑی نرمی سے میں نے کہا، آپ تو قسم کھا چکے تھے انھوں نے بڑی بے کسی کے ساتھ کہا، خاں صاحب میری ایک بات سن لیجئے میں نے کہا آپکو لکھنؤ کی تہذیب نے کاڑھا ہے، کیا آپ گالی کا کوئی جواز پیش کرنا چاہتے ہیں انھوں نے کہا حضور یہ صحیح ہے کہ لکھنؤ نے مجھ کو خراد پر چڑھا دیا ہے لیکن آپ اس امر پر کیوں غور نہیں فرماتے کہ مجھکو موسیقی سے بڑی شگفتگی ہے میں نے کہا چولی دامن کا ساتھ ہے انھوں نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ حضور ہے اور سو فی صدی ہے یعنی یہ ایک امر لازمی ہے کہ جب بھی کوئی کھانسے سر اور تال میں کھانسے آواز کو راگ میں ڈھال کر کھانسے لیکن یہ سالے تو بالکل بے سُرے کھانستے ہیں، کھو کھو، کھو کھو، آخ تھو۔"
اور مجھکو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔



ناظم الدین حسن!

مضافات لکھنؤ کے رہنے والے اور لکھنؤ میں بیرسٹری کرتے تھے لاٹوش روڈ پر ان کی پیلی کوٹھی موکلوں سے گھری رہتی تھی وہ بھوپال میں صدر المہام اور حیدر آباد میں چیف جسٹس بھی ہو گئے تھے ان کی ہر سانس خود ساختہ اصول میں جکڑی ہوئی تھی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ اصول پرستی کے فیل پا میں مبتلا تھے ان کے مکان کی تمام چھوٹی بڑی چیزیں ایک بڑے سے رجسٹر میں ٹکی ہوئی تھیں، اور ہر چیز طاق مچان یا میز پر ایک خاص زاویئے کے ساتھ رکھی، اور جب اٹھائی جاتی تو بالکل اسی زاویئے پر دوبارہ رکھ دی جاتی تھی۔

ایک بار انھوں نے ملازم کو دیا سلائی اٹھا لانے کا حکم دیا، دیا سلائی سے کام لے کر انھوں نے ڈبیا ملازم کے حوالے کر دی اس نے اسے میز کے بیچوں بیچ رکھ دی انھوں نے اس پر دو روپیہ جرمانہ کر دیئے کہ دیا سلائی پہلے میز کے مشرقی گوشہ میں رکھی ہوئی

تھی، اس نے دسواں میں کیوں رکھ دی ایک بار لکھنؤ کے چند نوجوانوں نے اپنے مسلم کلب کے افتتاح کی ان سے درخواست کی وہ پہنچے اور بورڈ پر نگاہ پڑتے ہی انھوں نے افتتاح کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ لفظ کلب سے ذہن منتقل ہوتا ہے "کلب" کی جانب اور عربی میں "کلب" کے معنی ہیں کتا" جب آپ لوگ اس بورڈ پر "مسلم کلیب" درج کرائیں گے تو میں بخوشی افتتاح کر دونگا۔

ایک مرتبہ وہ امین آباد پارک میں اپنی گاڑی سے اترے اور اترتے ہی غور اُچھرتی نکالی اور پھل خریدنے لگے اتنے میں انکے ایک بے تکلف دوست ادھر آ نکلے انھوں نے کہا سبحان اللہ یہ گرمیوں کی رت اور پھر رات کا وقت اور اس پر آپ کی یہ چھتری عجائب ہیں آپ کا انھوں نے کہا اگر عقل موٹی ہو تو آپکی نسی، میرے کپڑے نماز کیلئے ہیں اگر کسی بدتمیز چیل نے بیٹ کر دی تو کیا ہوگا

ان کا معمول تھا کہ وہ رات کے گیارہ بجے تک لکھتے پڑھتے تھے، انکا ملازم خاص، ٹھیک گیارہ بجے ان کے کمرے میں داخل ہو جاتا، اور اگر ان کو لکھنے پڑھنے میں مشغول پاتا تھا تو انکے حسب حکم وہ انکو زبردستی کرسی سے اٹھاتا، انھیں گھسیٹ کر چارپائی پر گراتا۔ اور صبح کو اس اصول پرستی کا انعام پاتا تھا۔

جب انھوں نے اپنے بیٹے ناظر الدین حسن کو تعلیم کے واسطے لندن بھیجا، تو ایک مولوی صاحب کو بھی ساتھ کر دیا تھا کہ وہ انکی نگرانی کریں اور ہر ہفتہ انکے تمام اعمال کا کچا چٹھا لکھتے رہیں

کوئی چار پانچ مہینہ کے بعد انھوں نے مولوی صاحب کو لکھا، کہ آپ ناظر کے تمام حالات تو لکھتے ہیں۔ مگر یہ کبھی نہیں لکھتے کہ اس اثناء میں اسکو کتنے بار بدخوابی ہوتی ہے آئندہ سے پوچھ کر بدخوابی کا حال ضرور لکھئے اس لئے کہ اگر بدخوابی کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو مجھے پتا چل جائیگا کہ ناظر نے بدچلنی شروع کر دی ہے۔

اس طرح وہ اپنی بہو بیٹیوں کی خاموشیوں" (ایام کی گدیاں) کو بھی اپنی تحویل میں رکھتے تھے تاکہ انھیں انکی صحت کے اعتدال کا پتا چلتا رہے۔

اپنے دکن کے قیام میں وہ ہر صبح کو باغ عامہ ٹہلنے جایا کرتے اور ایک وقت معین پر گھر واپس آجاتے تھے، ایک روز وہ حسب معمول ٹہل رہے تھے کہ نظام دکن کی سواری آگئی، تمام باغ رعب شاہی سے کانپنے لگا۔ انھوں نے کوئی پرواہ نہیں کی اور ٹہلتے رہے نظام نے اپنے مصاحبوں سے پوچھا یہ کون الول جلول آدمی ہے انھوں نے کہا" سرکار یہ چیف جسٹس ناظم الدین حسن ہیں جب سے یہ آئے ہیں ہائی کورٹ میں ناانصافی اور رشوت ستانی کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ نظام نے کہا انھیں بلاؤ جب وہ نظام کے سامنے گئے تو انھوں نے شاہی آداب کے مطابق جھک کر

سلام نہیں کیا اور السلام علیکم کہہ کر سیدھے کھڑے ہو گئے۔ میر صاحب گھبرا گئے کہ دیکھیں اس گستاخی کا نتیجہ کیا ہوگا نظام اپنے موڈ میں تھے مسکرا کر پوچھا آپ یہاں روز ٹہلنے آتے ہیں انھوں نے کہا جی ہاں اس کے بعد نظام نے ایک اور سوال کیا، تو انھوں نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا، اب ٹہلنے کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ اچھا السلام علیکم اور جواب دیے بغیر فوراً اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

ایک بار جب وہ بھوپال میں تھے۔ بیگم صاحب نے گاڑی بھیجی کہ فلاں "کاغذات دیتے" لے کر فوراً آجایئے وہ گاڑی میں بیٹھ کر فوراً روانہ ہو گئے جب گاڑی یہاں کا آدھا راستہ طے کر چکی انھوں نے کوچبان سے گھبرا کر کہا گاڑی روک دو گاڑی رکتے ہی وہ اتر پڑے اور اپنے مکان کی طرف پیدل چلنے لگے کوچبان نے کہا حضور گاڑی میں بیٹھ جائیے انھوں نے کہا نہیں پیدل جاؤں گا۔ تم یہیں کھڑے رہو اور جب کوچبان نے بہت اصرار کیا تو انھوں نے کہا میں کاغذات گھر میں بھول آیا ہوں بھول جانا میری غلطی ہے۔ خطا کروں میں اور سزا بھگتیں گھوڑے یہ کون سا انصاف ہے۔

ایک بار انھوں نے چند احباب کو کھانے پر مدعو کیا لوگ دیر میں پہونچے تو وہ تمام مہمانوں کو احاطے کے ایک گوشے میں لے گئے اور کھدی ہوئی زمین کی طرف اشارہ کر کے کہا آپ حضرات دیر کر کے آئے ہیں دیکھئے آپکا کھانا یہاں دفن کر دیا گیا ہے۔

"السلام علیکم"

انکے قرابت دار، ہر جمعہ کو ٹھیک چار بجے ان کے پاس آیا کرتے تھے، اور یہ معمول تھا کہ دو بسکٹ اور ایک چائے کی پیالی ان کی خدمت میں ہمیشہ پیش کی جاتی تھی۔

ایک بار وہ انکی غیبت میں پہونچے، ملازم نے دو بسکٹ اور ایک چائے کی پیالی پیش کردی چائے پی کر وہ ایک رجسٹر کے ورق گردانی کرنے لگے، اور ایک صفحہ پر انھوں نے جب یہ دیکھا کہ انکے نام کے نیچے ہر جمعہ کو دو بسکٹ اور ایک چائے کی پیالی بمد خیرات لکھی ہوئی ہے تو انھوں نے ان کے یہاں آنا جانا ترک کر دیا، اور انھوں نے اسی صفحہ پر لکھ دیا "خیرات بند"

ایک بار وہ انٹرویو لینے بیٹھے، اور ساٹھ درخواست گزاروں میں ایک بھی منتخب نہیں کیا گیا اس لئے کہ ایک سو سے ایک تک الٹی گنتی نہیں گن سکا۔

جب وہ بھوپال میں صدر المہام تھے، ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا، تمام اکابر شہر تعزیت کے لئے ٹوٹ پڑے، اور جب چپراسی ایک تھال میں صدہا کارڈ لے کر ان کے پاس پہونچا تو انھوں نے پوچھا یہ اس قدر آدمی آج کیوں آئے ہیں چپراسی نے کہا سرکار کی والدہ کی تعزیت

کے لئے آئے ہوئے ہیں۔

انھوں نے چپراسی سے باآواز بلند کہا ان لوگوں سے پوچھو ہماری والدہ سے انکا کیا تعلق تھا کہ وہ تعزیت کے لئے آگئے ہیں برآمدے تک انکی یہ آواز پہنچی تو تمام آنے والے افتاں و خیزاں وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

علی گڑھ کے ایک گمنام پٹھان شاعر

وہ اپنے مکان کے چبوترے پر ٹکٹکی لگائے بیٹھے رہتے تھے کہ کوئی شاعر ادھر سے گزرے اور وہ اسکو اپنا کلام سنائیں۔۔۔۔ اور جب کوئی شاعر ان کے ہاتھ چڑھ جاتا تھا وہ اسکو اپنے کمرے میں لے آتے بڑی مدارات کرتے، اور اپنا کلام سنانے لگتے تھے۔

یہاں تک تو کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ ہزاروں شاعروں کو ہوکا ہوتا ہے اپنا کلام سنانے کا، مگر ان میں یہ عجیب بات تھی کہ جب وہ کسی شاعر کو پھانس کر اپنے کمرے میں لے آتے تھے تو ان کا مدھا ہوا ملازم تینوں دروازوں میں باہر سے زنجیر لگا دیا کرتا تھا کہ پھنسا ہوا شاعر بھاگ نہ سکے جب ۔۔۔۔۔۔۔ باہر سے دروازے بند ہو جاتے تھے تو وہ الماری کھول کر اپنا دیوان نکال لاتے، اور غزلیں سنانا شروع کر دیا کرتے تھے، اور سننے والا جب انکو داد دیتا تھا تو ہر داد پر بڑے تحکمانہ انداز سے وہ حکم دیتے تھے، کھڑے ہو جائیے، اور جب وہ حیرت زدہ ہو کر کھڑا ہو جاتا تھا تو اس کو اس طرح بھینچ کر گلے لگاتے تھے کہ اس کی پسلیاں بولنے لگتی تھیں۔

ذرا تصور کی آنکھوں سے یہ سماں دیکھئے کہ گمنام پٹھان شاعر صاحب اپنا کلام سنا رہے ہیں اور سننے والا واہ واہ سبحان اللہ کہہ رہا ہے اور اس بیچارے داد دینے والے کو بار بار یہ حکم دیا جا رہا ہے کھڑے ہو جائیے، کھڑے ہو جائیے اور جب وہ تھکا ماندہ کھڑا ہو جاتا ہے تو اسکو بڑے زور سے گلے لگایا جا رہا ہے۔ العظمتہ للہ کوئی حد بھی اس عذاب

مسلسل کی۔

اور ایک صاحب نے تو یہاں تک بیان کیا تھا کہ جب بار بار کھڑے ہونے اور بار بار گلے ملنے سے تھک کر انھوں نے یہ کہا تھا کہ اب مجھ میں بار بار کھڑے ہونے کا دم باقی نہیں رہا ہے۔ تو ان پٹھان شاعر صاحب نے اپنے تبغیر، الغافیلین ڈنڈے کی طرف اشارہ کر کے کہا اٹھئے نہیں تو اس سے آپکا سر توڑ دوں گا



بنی شیر خاں

ملیح آباد کے محلہ صدر پور کے زمیندار تھے گٹھے ہوئے اتنے کہ خدا کی پناہ تمام عمر مقدمہ بازی اور فوجداری میں گذار دی انکی داڑھی پٹی رہتی اور بڑی بڑی مونچھیں کھڑی رہتی تھیں اور ان کے نام کا بلا اتیفک "شیر" تھا اس لئے وہ ہر آن حملہ پر آمادہ رہتے تھے اور میرے باپ کے جانثاروں میں ان کا درجہ بہت بلند تھا، وہ ایک روز میرے باپ کے انتقال کے بعد آئے اور کہا اللہ بخشے صاحب نے میری مصیبت کے وقت دس ہزار روپیہ دیئے تھے پرونوٹ لکھائے بغیر اب میں وہ روپیہ واپس کرنے آپکے پاس آیا ہوں یہ کہہ کر انھوں نے دس ہزار کے نوٹ میری میز پر رکھ دیئے۔

میں نے کہا بنی شیر خاں میرے خیال میں میرے باپ نے یہ روپیہ ایک دوستانہ پیش کش کی صورت سے آپ کو دیا تھا اگر یہ قرض کا معاملہ ہوتا تو آپ سے پرونوٹ ضرور لکھوا لیتے، اس لئے میں رقم قبول نہیں کر سکتا میرے انکار سے وہ آزردہ ہو گئے اور چہرے سے ایسا معلوم ہونے لگا کہ میں نے ان کے سر کی ایک بڑے بار کھا تم نے نہیں دیا اور ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ اٹھ کر چلے گئے۔

ایک بار بر کہا رت تھی وہ اپنے آموں کے باغ میں بیٹھے موسم کا لطف اٹھا رہے تھے بھنگوں نے انکی ایک آنکھ پر حملہ شروع کر دیا انھوں نے ہاتھ ہلا ہلا کر بار بار بھنگوں

بھنگے آم کی فصل میں بیٹھے آدمی کی آنکھ میں گھس جانے کی سعی کیا کرتے ہیں

کو بھگایا لیکن ٹھہر ٹھہر کر وہ ہر بار حملہ کرتے رہے اور جب وہ تنگ آگئے تو انھوں نے
جھلا کر اپنی آنکھ پر اس قدر زور سے گھونسہ مارا کہ ڈھیلا نکل آیا اور انھوں نے ایک موٹی
سی گالی دے کر بھنگوں سے کہا لو سالوں اب کس چیز پر حملہ کرو گے آنکھ گئی پیر گئی۔



"محمد شیر خاں"

"کنول ہار" محلہ ملیح آباد کے پٹھان میرے باپ کی ڈیوڑھی کے سپاہی، مازبردست
ڈیل ڈول، کام میں بڑے مرد، اعضاء کے اعتبار سے قوی ہیکل، عقلی نقطۂ نظر سے گھل
اور اب اعتراف قصور کے معاملے میں رشک جبل آدمی تھے وہ آئے دن غلطیاں کرتے،
لیکن اپنی غلطی کو تسلیم کر لینے کو سور کا گوشت سمجھتے تھے اور اس وضع میں انکو اس قدر
رسوخ حاصل تھا کہ اگر پیسے پر رکھ کر انکی ایک ایک بوٹی کاٹی جاتی پھر بھی وہ اعتراف قصور کا
ننگ برداشت نہیں کرتے۔

میرے باپ کی یہ سنت جاریہ تھی کہ وہ آموں کی فصل میں اپنے تمام احباب کو آموں
کے ٹوکرے بھیجا کرتے اور خریف و ربیع کے زمانے میں اپنے لکھنؤ کے احباب کے پاس غلہ
رساول ترکاریاں اور گھی روانہ کیا کرتے تھے ایک بار یہ خدمت محمد شیر خاں کے سپرد ہوئی
کہ وہ لکھنؤ جاکر حضرت جلال کی خدمت میں گھی کا پیپا دے آئیں۔ صبح کو وہ لکھنؤ گئے،
اور دوپہر کو منہ پھلائے گھی کا پیپا اٹھائے ملیح آباد آگئے آتے ہی میرے باپ کو جھک
کر سلام کیا اور کہنے لگے میں حضور کے حق نمک سے ادا ہو گیا اگر حضور کے حق نمک کا پاس
نہ ہوتا تو جلال خاں کو اٹھا کر دے مارتا میرے باپ نے ڈپٹ کر فرمایا، محمد شیر زبان
بند کرو، اور یہ بتاؤ کہ کیا ہوا۔ انھوں نے کہا جلال خاں نے گھی کا پیپا واپس کر دیا
مجھکو ڈانٹا، پھٹکارا، گنوار کہا، بس حضور کے خیال سے میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا
نہیں تو........ میرے باپ نے بات کاٹ کر کہا حضرت جلال بہت شائستہ آدمی ہیں
تم نے ضرور کوئی ایسی بات کی ہوگی کہ انکے غصہ آگیا۔ بتاؤ تم نے کیا کیا تھا انھوں نے

کہا لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ میں نے تو کوئی بات نہیں کہی تھی وہ بیکار بیکار خوخیانے لگے، میرے باپ نے کہا محمد بشیر، تم اور اپنی خطا مانو، یہ ہو ہی نہیں سکتا دوسرے دن میرے باپ محمد بشیر خاں کو دیکھتے ہی جامہ سے باہر ہو گئے، اور کہنے لگے خاں صاحب اس جانگلو کو میرے سامنے سے ہٹا دیجئے کہ میرے باپ نے انکو ہٹ جانے کا اشارہ کیا، اور جب وہ مارے غصے کے داڑھی کو اپنے منھ میں چباتے ہوئے باہر چلے گئے۔ تو جلال نے میرے باپ سے کہا خاں صاحب میں اذ نانے میں بیٹھا تھا، آپ کے اس سپاہیا نے اپنے لٹھ کے گونے سے میر ادروازہ اس قدر زور سے کھٹ کھٹایا کہ میری بیگم اچھل پڑیں اور کہنے لگیں ہے ہے۔ اب لکھنؤ میں یہ بھی ہونے لگا ہے یہ تو قیامت کے آثار معلوم ہوتے ہیں ابھی میری بیگم نے اتنا ہی کہا تھا، کہ ہم پر آسمان ٹوٹ پڑا یعنی باہر سے آواز آئی جلال خاں ہوت، میری بیوی نے کانوں میں انگلیاں دے لیں، ناد علی پڑھنے لگیں، میں غصّہ کے مارے کانپنے لگا، دروازہ کھول کر دیکھا کہ ایک جانور داڑھا پھٹکا دے اور ایک مپیا کاندھے پر اٹھائے منھ کھولے کھڑا ہے۔ میں نے کہا تم آدمی ہو یا جانور اس نے آپ کا نام لے کر کہا آپ نے مجھے بھیجا ہے۔ میرے حواس ٹھکانے نہیں تھے، میں نے کہا چلے جاؤ میرے سامنے سے خانصاحب اس شخص نے مجھے اس قابل نہیں رکھا کہ اہل محلہ کو منھ دکھا سکوں

کنجو خاں

وہ بھی کنول ہار کے رہنے والے، اور بیماری ڈیلہ داڑھی پر، سپاہیوں کے زمرے میں شامل تھے وہ اس قدر سرخ و سفید گورے چٹے تھے آنکھیں اس قدر کنجی تھیں اور داڑھی اس غضب کی بھورتی تھی کہ ہو بہو انگریز پادری معلوم ہوتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ انکی داڑھی اس بلا کی جھاڑ کی جھنکاری ہاتھی پچھاڑا اور سرس کے درخت کی طرح سپید سے بالوں کی تھی اور انکی مونچھوں کے لوے اس قدر گھنے اور ریش پوستہ تھے کہ ان کا منھ غور سے دیکھنے کے بعد بھی نظر نہیں آتا تھا۔

ہے لکھنؤ زبان ہے یعنی اے جلال ہو گھر ہیں یا اے جلال خاں اگر ہو تو بولو۔

ایک روز وہ کہیں گاؤں کی طرف سے گزر رہے تھے، دیکھا کہ گاؤں کے حاشیے کے کنویں پر گاؤں کی چند لڑکیاں پانی بھر رہی ہیں، انھوں نے ان لڑکیوں سے پانی مانگا ان میں سے ایک شوخ لڑکی نے ٹھٹھول کی راہ سے پوچھا کھاں[1] صاحب تمہرے منھ کہاں ہے کہ پانی مانگت ہو؟" یہ سنتے ہی انھوں نے اپنی داڑھی اور مونچھوں کو جدا کر کے کہا "اور یہ منھ نہیں تو کیا تمھارے لہنگے کے اندر کی چیز ہے"؟ اور یہ فحش جواب سن کر ساری لڑکیاں بھاگ کھڑی ہوئیں۔

ایک مرتبہ انھوں نے اپنے کھیت کے قریب ایک موٹے تازے ہرن کو دیکھا کہ وہ گھٹنوں گھٹنوں دلدل میں پھنسا کھڑا ہے، نکلنے کی کوشش کر رہا ہے، لیکن نکل نہیں سکتا انھوں نے خوشی سے اچھل کر کہا سالے روز ہمارا کھیت چر جایا کرتے تھے آج بیٹے تمہارے کباب کھائے جائیں گے یہ کہہ کر انھوں نے اپنی لنگی کے ایک گوشہ کو اس کی گردن میں ڈال کر خوب مضبوط گرہ لگا دی اور پورا زور لگا کر، اس کو دلدل سے نکال لیا۔ دلدل سے نکلتے ہی ہرن نے زور سے ایک جھٹکا دیا، انکی لنگی کھل گئی، وہ لنگی سمیت بھاگ کھڑا ہوا وہ ننگے ہو گئے۔ اور آس پاس کے کھیتوں کے لڑکوں نے تالیاں بجانا شروع کر دیں، انھوں نے دوڑ کر ایک لڑکے کو پکڑ لیا اس کی لنگی چھین کر باندھ لی وہ ننگا ہو کر رونے لگا، انھوں نے کہا اب اور تالیاں بجا، ننگے کنجو خاں پر اسی وقت وہ سیدھے خلیل خاں کے پاس گئے خلیل خاں بڑے دھاوت شکاری تھے ان کی گولی سے جب ایک دن انھوں نے اس ہرن کو ہلاک کروا دیا، تو اسے گاڑی میں لدوا کر محلے میں لے آئے اور اس کی دونوں ٹانگیں چیر چیر کر لو، لوگوں سے کہا اس حرامزادے نے کنجو خاں کو ننگا کر دیا تھا اب دیکھ لو بھائیو، اس سالے کو بالکل ننگا۔

ایک دن وہ اپنی آموں کی بغیہ بچا رہے تھے کہ بڑے زور کی کالی آندھی اٹھی، وہ بلبلا کر اپنی جھونپڑی سے نکل آئے اپنی پگڑی آسمان کی طرف بلند کر کے گڑگڑا گڑگڑا کر دعا مانگنے لگے کہ اے اللہ میں بے حد غریب آدمی ہوں میری بغیہ کا ایک آم بھی نہ گرنے پائے نہیں تو سال بھر فاقے ہونگے اور بیٹی کی شادی بھی نہیں کر سکوں گا اے اللہ میرے منھ میں روزہ ہے، کہتے ہیں روزہ داروں کی دعائیں سن لیتا ہے، میرے باغ کو بچا لے اللہ نے انکی دعا نہیں سنی اور آندھی نے انکی تمام کیریاں زمین پر بچھا دیں اور کئی درخت بھی توڑ ڈالے۔

---

[1] خاں صاحب تمھارا منھ کہاں ہے کہ پانی مانگ رہے ہو۔

اب کنجو خاں کو اللہ میاں پر غصہ آگیا، انھوں نے اپنی جھونپڑی کو آگ لگا دی کٹیا کو ڈنڈے میں پھنسا کر، پیٹھ پر لاد لیا مٹکے سے آبخورہ بھر کر ہاتھ میں لے لیا آسمان کی طرف بگڑ کر آنکھیں اٹھائیں، اور کہا جناب ہم نے دانت نکال نکال کر آپ سے دعا کی کہ ہماری لنگیسہ کا ایک آم بھی نہ گرنے پائے آپ نے ہماری دعا قبول نہیں کی، یہ کہہ کر آبخورہ منھ سے لگالیا پورا آبخورہ پی گئے، اور کہا یہ لیجئے ہم نے روزہ توڑ ڈالا۔ اب آپ بڑے پٹھان ہیں تو کل سے روزہ رکھا لیجئے گا (اور پھر مرتے مر گئے لیکن کنجو خاں نے کبھی روزہ نہیں رکھا۔



امیر احمد خاں

اچھے خاصے با فراغت، زمین دار میرے دادا کے مختلف البطن بھائی کے بیٹے تھے، نہایت پاک نفس، بڑے فیاض، افیون کے زبردست رسیا اور بے حد گالی دیتے تھے بندھی ٹکی معرفت گالیوں سے انھیں کوئی تعلق نہیں تھا، وہ نئی نئی گالیاں ایجاد کیا کرتے تھے۔ اگر میرے قارئین کی اکثریت تمسخر ملی نہ ہوتی تو میں انکی تمام نرالی گالیاں درج کر کے یہ دکھا دیتا کہ ان میں خلاقی کا مادہ کس قدر تھا۔

انکے ایک خاص مصاحب تھے محمد اکبر خاں ایک دن انھوں نے لہر میں آکر انھیں بالکل نئی تراش کی گالیاں دیں، اکبر خاں روٹھ گئے، آنا جانا ترک کر دیا۔

کوئی ایک ہفتہ کے بعد وہ انھیں منانے ان کے گھر پہونچے اکبر خاں نے کہا خاں صاحب آپ بہت گالیاں دیتے ہیں انھوں نے کہا ------ تم سالے ہو ہی اسی قابل کہ تمھیں روز گالیاں دی جائیں۔ اکبر خاں نے کہا میاں ہم اتنے ہی برے ہیں تو آپ ہم کو منانے کیوں آئے ہیں۔ انھوں نے کہا کیا کریں کمبخت چودھویں صدی ایسی ہے کہ کبر خاں اب تم سے حرامی بھی ڈھونڈے کہیں نہیں ملتے۔ اس پر اکبر خاں ہنس

پڑے اور مر گئے

ان کے انتقال کا واقعہ بھی سن لیجئے ایسی وضعداری کے ساتھ مرنا کس کے بس کی بات ہے ان پر جب کرب نزع طاری ہوا، انھوں نے اپنی بیوی سے کہا خدا کے لئے مجھکو جلدی سے اٹھا کر بٹھا دو بیوی نے کہا ارے غضب خدا کا، یہ وقت بیٹھنے کا ہے انھوں نے کہا جلدی کرو میری اطاعت تم پر فرض ہے میرا جی چاہتا ہے کہ اس حرامزادی موت کو ایک گالی دے کر تو مروں، بیوی نے رو کر کہا ارے کلمہ پڑھو انھوں نے ہاتھ جوڑ کر مجھے بٹھا دو اور جب بیوی نے بٹھا دیا تو انھوں نے مٹھی بند کر کے بایاں ہاتھ ہلایا اور کہا لے حرامن یہ موت یہ موڑا سا ڈاپو نا ۔۔ اور سدھار گئے۔



ہدایت اللہ خاں

ملنا نے جب انھیں دیکھا ان کی عمر ستر سے متجاوز ہو چکی تھی، تھے تو کمزور مگر ذرا ذرا سی بات میں لٹھ پونگے پر آمادہ ہو جاتے اور قوی سے قوی نوجوانوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے وہ میرے چچا کے وہاں ملازم تھے اور گھنٹہ بجانے کے سوا ان سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔

ایک روز بیرٹے کے سپاہیوں نے ان سے کہا ہدایت اللہ خاں تمھیں کچھ خبر بھی ہے تمھاری مونچھوں پر تو چنگاریاں اڑتی ہیں اور تمھارے پوتے کو خلیل خاں باغوں باغوں لئے پھرتے ہیں۔ یہ سنتے ہی وہ غصّہ کے مارے بل کھا گئے، داڑھی کے بال کھڑے ہو گئے اور کہا، اچھا آنے دو خلیل خاں کو ڈیوڑھی پر۔

دوسرے دن وہ دوپہر کا گھنٹہ بجا رہے تھے، ابھی پورے بارہ ۱۲ بجانے نہیں پائے تھے کہ خلیل خاں آ گئے

انھوں نے گھنٹے کی مگری فوراً پھینک دی کھڑے ہو گئے کمر باندھ کر اور کہا کہیں کھاں ہم تم سے یہ پوچھتے ہیں کہ تمھیں ہمرے کالے پوتے میں کیا بھا آدت ہے کہ تم اس

سسرے کو باگن باگن لئے پھرت ہو۔
(خلیل خاں ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تمھیں ہمارے کالے پوتے میں کیا مزا آتا ہے
کہ تم اس بدمعاش کو باغوں باغوں لئے پھرتے ہو)
آؤ آج دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ خلیل خاں بڑے ظریف تھے انھوں نے کہا ہدایت
اللہ خاں یہاں تو لوگ بیچ بچاؤ کردیں گے بڑے باغ چلو اور وہاں جاکر اپنا حوصلہ نکال
لو خلیل خاں اکڑتے اور ہدایت اللہ خاں ہانپتے کانپتے باغ پہونچ گئے۔ خلیل خاں نے
کہا ہدایت اللہ تم بوڑھے آدمی ہو تم پہلے وار کرو۔ انھوں نے کہا اچھا اور لاٹھی اٹھاکر
ان پر حملہ کر دیا خلیل خاں نے ان کی لاٹھی اپنی لاٹھی پر روک کر کہا "فش" ہدایت خاں
"پھس پھس کیا کرت ہے۔ اور لے (فش فش کیا کہہ رہا ہے اور لے) کہہ کر دوسری لاٹھی
ماری اس لاٹھی کو بھی خلیل خاں نے اپنی لاٹھی پر روک کر کہا "فش" ہدایت اللہ خاں نے
پھس پھس کیا کرت ہے" اور لے کہہ کر پھر لاٹھی ماردی الغرض ہدایت خاں نے ان کے دس
پندرہ لاٹھیاں پھس پھس کیا کرت ہے اور لے کہہ کر ماردیں اور آخر کار پھس پھس کیا
کرت ہے اور لے کہہ کر بے ہوش ہو گئے۔



محبوب شاہ مجذوب

ذرا سی دھوتی باندھے ننگ دھڑنگ آدمی تھے، کبھی کبھی ملیح آباد آتے اور
میرے پھپا نواب احمد خاں کی ڈیوڑھی میں ٹھہرا کرتے اور ایک ردی کا غذ لئے گلیوں
میں پھرتے اور لوگوں سے کہا کرتے تھے بھیا اس پر دسخط کھت؟ (دستخط) کردو ہمری
(ہماری) سادی (شادی) ٹھیر جا ہے۔
ان کو روپیہ پیسے یا کھانے پینے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ جب کوئی ان کو روپیہ

دیتا تھا تو وہ "ارے یو کا ٹھیکرا دیوت ہو (ارے یہ کیا ٹھیکرا دیتے ہو) کہہ کر اسے پھینک دیا کرتے تھے۔ البتہ پھیا جب ان کے روبرو کھانا رکھ دیتے تو ذرا سا چکھ کر سیر کی فرمایش کیا کرتے تھے۔

لوگ جب ان سے اپنے بارے میں کوئی بات پوچھتے تھے تو وہ سیدھا جواب نہیں دیتے اور "ارے گنے کے کھیت لاگے ہیں، کھوب (خوب) گنے کھاؤ کھیا نے (خزانے بھرے ہوئے ہیں) کھوب مجے (مزے) اڑاؤ" کہہ کر ٹال دیا کرتے تھے۔

میں ایک زمانے میں ایک لڑکی پر جسکی منگنی ہو چکی تھی بہت بری طرح عاشق ہو گیا تھا پہل اس لڑکی نے کی تھی اس لئے میرا عشق جنون کی حد تک پہونچا ہوا تھا کہ محبوب شاہ ملیح آباد آگئے۔ میں ان کو اپنی نو تعمیر کوٹھی "قصر سحر" میں لے گیا۔ میری بیوی مائیکے گئی ہوئی تھیں میں نے محبوب شاہ سے کہا آؤ میرے لحاف میں لیٹ جاؤ، وہ لیٹ گئے میں نے ان سے پوچھا، دیکھو میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں اگر گنے کے کھیتوں اور خزانوں کا نام لوگے تو یہ تمھاری کچھو ڈاڑھی نوچ کر رکھ دونگا وہ مسکرائے اور کہا یو کا مرہی باتیں کرت ہو" (یہ کیا بیہودہ باتیں کرتے ہو) ہم پرائی مہریا کو تمھیں کیسے دلائی دیں" ہم دوسرے کی بیوی کو تمھیں کیونکر دلادیں) یہ بات سن کر مجھے حیرت ہو گئی کہ انھیں میرے دل کی بات کا پتہ کیسے چلا۔

ایک روز میں نے ان کو اپنے کمرے سے ملے ہوئے کمرے میں سلایا۔ صبح چار بجے ان کے کمرے میں پہونچا تو دیکھا جو گدا اور لحاف میں نے ان کو دیا تھا وہ پائنتی لپیٹا رکھا ہے اور وہ آدھے دھڑ سے ننگے چارپائی سے پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ میں نے کہا محبوب شاہ، ارے اتنی سخت سردی میں اور ننگے بیٹھے ہو۔

انھوں نے کہا بھیا سوتے بن نہیں پڑت ہے، ندیا کنارے ڈگن لگائے بیٹھن ہیں، نہ جانے کب کھٹکار ہو جائے۔ (بھیا سوتے بن نہیں پڑ رہا ہے ندی کے کنارے مچھلی پکڑنے کی چھڑ لگائے بیٹھے ہیں نہ جانے کب مچھلی کے کانٹا نگل جانے کی کھٹکار ہو جائے)۔

میں نے کہا یہ سب بے وقوفی کی باتیں ہیں وہ بہت ہنسے اور کہنے لگے "ابھی تو ان باتن کو بے دکوفی کہت ہو جب ہم تم کا کے مدینے اڑائی کے لے جیہیں تب تم کا پتا چلیئے گا، ابھی تو کھوب مجے کرو کھوب کوٹھن پر چڑھو کھوب گنے کھاؤ"۔ (ابھی تو ان باتوں کو بے وقوفی کہہ رہے ہو جب ہم تم کو لے مدینہ اڑا کر لے جائیں گے اس وقت تم کو پتہ چلے گا۔ ابھی تو خوب مزے کرو خوب کوٹھوں پر چڑھو خوب گنے کھاؤ)۔

حیدرآباد جانے سے کوئی ایک سال پہلے جب کہ حیدرآباد جانے کا تصور بھی میرے دماغ میں نہیں تھا وہ میرے پاس آئے اور چھوٹتے ہی کہنے لگے ہم نے تمرے نام لکھ دینا ہے اکبر پور، وہاں کھوب مجے کرنا" (ہم نے تمھارے نام اکبر پور لکھ دیا ہے وہاں خوب مزے کرنا) میں نے کہا اکبر پور تو میری بیوی کے نانا کے گاؤں کا نام ہے انھوں نے کہا "تمرا اکبر پور دکھن ماں ہے (تمھارا اکبر پور دکن میں ہے)

اسکے ایک سال کے بعد میں حیدر آباد روانہ ہو گیا اور جب دو چار برس کے بعد رخصت لے کر وطن آیا تو دیوے کے عرس میں چلا گیا۔ صبح کا وقت تھا دیکھا کہ محبوب شاہ چلے آرہے ہیں۔ انھوں نے جھپٹ کر مجھے گلے لگا لیا۔ میں نے کہا یہاں کیسے آنا ہوا کہنے لگے "دعا سلامن کے لئے"۔ میں نے کہا لو محبوب شاہ انگور کھاؤ، انھوں نے دو ایک انگور کھا کر کہا، مجھے غور سے دیکھا اور ایک شہر کا نام لے کر کہا۔ "ببیا وہاں گدم نہ رکھیو، نہیں تو کانجی ہور میں بند کر دیئے جیہو"۔ (ببیا وہاں قدم نہ رکھنا، ورنہ کانجی ہوز، یعنی مجلس مویشیانِ آوارہ" میں بند کر دیئے جاؤ گے۔



الویرو!

اس اٹلی کے باشندے سے حیدر آباد دکن میں ملاقات ہوئی تھی۔ چہرہ خوانی میں اسے اس قدر بصیرت حاصل تھی کہ وہ آدمی کی صورت دیکھتے ہی اس کے خیالات معلوم کر لیتا اور پوچھے بغیر ہی سوالات کے جواب لکھ کر دے دیا کرتا تھا۔

ایک بار سید امین الحسن صاحب بسمل اور نواب اصغر یار جنگ کے ساتھ میں ان سے ملنے جا رہا تھا تو میں نے ان سے موٹر میں یہ کہا کہ میں الویرو سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں فرنگی راج کب ختم ہوگا۔ میرے دونوں دوستوں نے کہا یہ سوال غلط ہے ہم لوگ نظام سے وابستہ ہیں۔ اس لئے ہم کو سیاسی جھگڑوں میں نہ پڑنا چاہیئے۔

لے چونکہ حیدر آباد سب سے بڑی ریاست تھی، شاید اسی بنا پر اُسے "ایک پور" کہا تھا۔

سے دو چار روز کے اندر یہ خبر مجھ تک پہونچ گئی کہ میں اپنی جس معشوقہ سے ملنے جانے والا تھا اسکے شوہر نے میرا خط پکڑ لیا تھا اور میرے پھانس لینے کے انتظامات مکمل کر لئے گئے تھے۔

اب جب اس بات پر غور کر لیتا ہوں کہ بعض افراد مستقبل کے واقعات سے کیوں آگاہ ہو جاتے ہیں تو اس کے سوا کوئی اور بات سمجھ میں نہیں آتی کہ بعض لوگوں کے پاس ایک چھوٹا راستہ ہوتا ہے جو مستقبل کو اپنے آنکڑے میں پکڑ لیتا ہے۔ وہ چھوٹا سا سنہ کن کیمیاوی تغیرات کا نتیجہ ہوتا ہے ابھی تک اس کا پتہ نہیں چل سکا ہے۔ الاماں یہ کائنات اور یہ انسانی دماغ دونوں ایسے قلزم ہیں کہ ابھی تک کسی کو انکی تھاہ نہیں مل سکی۔ پیمائش قلزم پہ وہ کیا قادر ہو۔ قطرے کی جسے تھاہ نہیں ملتی ہے پھر کر اے انسان کے ذوقِ تجسس کہ ابھی تیری آسودگی کا وقت نہیں آیا ہے۔

جب ہم اس کے یہاں پہونچے تو ہم لوگوں کے سوالات کے جوابات قلم بند کرنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ " آپ نے موٹر میں جو سوال ڈراپ کر دیا ہے (نظر انداز) میں اس سے واقف ہوں لیکن میرا یہ اصول ہے کہ میں سیاسی سوالات کا جواب نہیں دیا کرتا۔ ہاں اتنا ضرور کہونگا کہ سیاسی حیثیت سے آپ بڑے خطرناک قسم کے آدمی ہیں۔ اور زیادہ مدت تک یہاں نہیں رہ سکیں گے لیکن آپکا مستقبل بہت شاندار ہے۔

ایک بار مہاراجہ کشن پرشاد کی مجلس میں انھوں نے اکبر حیدری سے کہا۔ سر اکبر حیدری اس وقت آپ کے دل میں جو بات ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں بتا دوں ۔: اکبر حیدری یہ سن کر اچھل پڑے اور کہا " آپ بر سر عالم میرے دل کی بات نہ بتائیں ورنہ بڑا غضب ہو جائے گا اس نے ایک پرچہ پر وہ بات لکھ دی۔ اکبر حیدری دنگ ہو کر رہ گئے۔ اس کے کمال کا اعتراف کیا اور پرچہ کو چاک کر کے جیب میں رکھ لیا۔



مشیر احمد خاں رامپوری

ان کے بزرگ رام پور سے آکر ملیح آباد میں رہنے لگے...... وہ پستہ قامت گورے چٹے اور کچھ داڑھی والے تھے۔ ان کے مزاج میں اس قدر ظرافت تھی کہ خدا کی پناہ، روتوں کو ہنسا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا

میرے باپ کے بڑے مخلص و رفیق اور نہایت بے تکلف دوست، تصوّف کے شیدائی عرسوں کی شرکت کے رسیا، درویشوں، صوفیوں، سداسہاگنوں کے مستقل میزبان میرے بچپن کے یار مختار احمد خاں کے باپ اور میرے چچا نواب محمد علی خاں کے بھتیجے داماد تھے۔

ان کے یہاں ہمیشہ دس بیس درویش ٹھہرے رہا کرتے۔ انگنائی میں دیگیں چڑھی رہتی اور ہندوستان کے ہر عرس میں وہ دس بارہ آدمیوں کے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے ان کی جائیداد تنگ اور حوصلے بے حد وسیع تھے۔ آخر کار چھوٹی جائیداد، بڑے حوصلوں کا ساتھ نہ دے سکی۔ اور وہ دانے دانے کو محتاج ہو کر رہ گئے اور میرے

باپ کے سہارے زندگی بسر کرنے لگے۔

ابھی افلاس کو بمشکل ایک سال ہوا تھا کہ انکی صاحبِ جائیداد و لاولد بہن کا انتقال ہوگیا اور انکی جائداد انھیں مل گئی۔

جائداد ملتے ہی ان کے وہاں درویشوں کا میلہ پھر لگ گیا۔ پھر دیگیں چڑھ گئیں پھر قوالیاں ہونے لگیں اور حُم غفیر کے ساتھ وہ عرسوں میں شریک ہونے لگے کچھ روز کے بعد وہ جائداد بھی ختم ہوگئی، اور پھر مفلسی کا دور آگیا۔۔۔۔ دیگیں ٹھنڈی ہوگئیں۔ اور مہمانوں کی چہل پہل سے گھر خالی ہوگیا اور میرے باپ کو پھر بات بٹانا پڑا۔

کوئی کچھ سات مہینے اس تنگی میں گزرے تھے کہ ان کے کسی لاولد قرابت دار کا انتقال ہو گیا ان کی جائداد ان کو مل گئی اور پھر وہی اللّے تللّے شروع ہوگئے۔

وہ جائیداد بھی جب مہمان اور عرسوں کی نذر ہوگئی تو ایک اور لاولد قرابت دار سدھار گئے اور ان کی جائداد بھی انھیں مل گئی اور پھر وہی رنگ رلیاں ہونے لگیں میرے باپ کا اس اثناء میں انتقال ہوگیا وہ جائداد بھی برباد ہوگئی ان کے پاس کچھ نہیں رہا اور وہ اسی عالم افلاس میں بیمار پڑ گئے اور جب انکی حالت خراب ہوگئی تو ان کے ایک رئیس دوست مرزا عابد علی بیگ نے چاہا کہ ان کا علاج کرادیں، انھوں نے کہا مرزا اب میرا علاج بیکار ہے، اب کوئی قرابت دار ایسا نہیں رہا ہے کہ اس کی جائداد مجھے مل جائے۔ اس لئے مجھے اب چین سے مرجانے دو۔ بس ہو چکا جینا۔

اور اس کے چوتھے روز اس مردِ بے پروا کا انتقال ہوگیا۔

ایسے مست مولا اب کبھی پیدا نہیں ہونگے۔

آفریں باد بر ایں ہمت مردانۂ تو!

مولوی احمد حسین

میں نے زندگی میں دو ایک کے علاوہ ان کا سا پُر اسرار و صاحب کردار انسان آج تک نہیں دیکھا ہے۔

ان کی دنیوی حیثیت تو بس اس قدر تھی کہ وہ سرکارِ نظام میں غالباً تیس روپے ماہانہ

کے ایک معمولی کلرک تھے لیکن ان کی انسانی حیثیت اس قدر رفیع تھی کہ میرا سا بیگانہ یقین و بے عقیدہ شخص یہ کہنے پر مجبور ہے کہ کروڑوں انسانوں میں سے کہیں دو ایک کو اس قدر بلندی حاصل ہوتی ہے۔ عربی فارسی علم کلام اور فلسفے پر ان کو بڑی قدرت حاصل تھی لیکن افتاد مزاج کی بنا پر وہ تصوف کی طرف جھکے ہوئے تھے پھر بھی وہ کبھی کائنات کے حقائق اور وحدت النفس و آفاق کے مسائل پر اس قدر ژرف نگاہی کے ساتھ روشنی ڈالا کرتے تھے کہ انکی بوسیدہ چٹائی پر بیٹھ کر تخت طاؤس نگاہوں سے گر جاتا تھا۔

میں سب سے پہلے ان کی اعلائے کلمۃ الحق کی جراتِ بیباک کا ایک عجیب واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن وہ واقعہ ہوا تھا کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن وہ واقعہ ہوا تھا کس ماحول میں جب تک آپکو اسکا علم نہیں ہوگا اس وقت تک آپ اس واقعہ کی اہمیت نہیں سمجھ سکیں گے۔

اس لئے اس امر کا بتا دینا ضروری ہے کہ اس واقعہ کا تعلق تھا ہز اگزالٹڈ ہائی نس میر عثمان علی خاں بہادر نظام دکن کی ذات سے۔

یوں تو ہندستان کی دیسی ریاستوں کا ہر مطلق العنان فرماں روا، علم بریدگی جہالت پروردگی، گرم و سرد ناچشیدگی، ہمہ وقت آزار امیدگی، خوشامد گزیدگی، ذہنی ژولیدگی اور آمریت پیوستگی کے باعث اس قدر متکبر ہوتا تھا کہ فراعنہ کا تبختر اور ہامان و شیطان کا غرور انکو دیکھ کر لرزہ بر اندام ہو جاتا تھا۔ لیکن نظام۔ اللہ اکبر۔ جس طرح ان کی ریاست سے عجب و غرور میں بھی سب سے زیادہ تھا۔ اور انسان تھے اور انسان نہیں خدا معلوم ہوتے تھے اور انکے روبرو بڑے بڑے ہندی کوب انسانوں کی پنڈلیاں کانپنے لگتیں اور بڑے بڑے زہر سورماؤں کے زہرے سے آب ہو جایا کرتے تھے۔

اور یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ نظام کا طنطنہ اور دبدبہ کس قدر شیر افگن تھا۔ اب سنئے، تیس روپلی ماہانہ کے ایک معمولی کلرک مولوی محمد حسین کا واقعہ یہ۔

حیدر آباد کی ایک درگاہ میں جس کا نام ہے "خواجہ کا چلا" بڑے دھوم دھڑکے سے ہر سال قوالی ہوا کرتی تھی اور کبھی کبھی نظام بھی آیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار وہاں پہلی صف میں نظام اور دوسری صف میں عین نظام کے پیچھے مولوی احمد حسین بیٹھے ہوئے تھے کہ حسب دستور قیام سے پیشتر قرائت ہونے لگی اور خوش گلو قاری نے سورۂ رحمٰن جو قرآن کی جان ہے اس طرح پڑھنا شروع کر دی کہ تمام محفل جھومنے لگی۔

ابھی تمام ارباب درگاہ قرات کے جھولے میں جھول رہے تھے کہ نظام مہاراجہ کشن پرشاد سے کچھ سرگوشی کرنے لگے۔ رعب شاہی سے قاری کے رشتۂ آواز میں جھنگی پیدا ہو گئی اور

قرأت ہکلانے لگی۔

کس کی مجال تھی کہ نظام کو ٹوک دیتا مگر واہ ری جرأت مردانہ کہ احمد حسین کے سے مسکین آدمی نے جھک کر نظام سے کہا کہ اثنائے قرأت میں باتیں کرنا سوء ادب ہے، آپ خاموش ہو جائیں نظام نے مڑ کر انکو دیکھا و نکھٹو را مار یلڈی کو توال شہر جو پولیس کے دستہ کے ساتھ نظام کے روبرو ہاتھ باندھے کھڑا تھا، ان کی طرف گرفتار کرنے کے واسطے جھپٹا لیکن نظام نے "نکو نکو" (نہیں نہیں) کہہ کر اسکو روک دیا۔

قاری کی رندھی آواز کھل گئی قرأت پھر پینگ لینے لگی اور لوگ جھومنے لگے۔ لیکن ایک مختصر سے وقفہ کے بعد نظام نے مہاراجہ کشن پرشاد سے پھر سرگوشی کا آغاز کر دیا۔ یہ دیکھ کر وہ بپھر گئے پہلے تو انھوں نے "سوء ادب" ہی کہا تھا، اس بار انھوں نے بآواز بلند کہا، اثنائے قرأت میں باتیں کرنا بدتمیزی ہے خاموش ہو جائیے اور مزید بدتمیزی نہ کیجئے "۔

ان کی یہ آواز سن کر حاضرین تھرّا اٹھے قاری کی آواز گلے میں دفن ہو گئی، کوتوال پھر جھپٹا نظام "نکو نکو" انھیں گرفتار نہ کرو ان کا نام اور پتہ لکھ کر ابھی کنگ کوٹھی آجاؤ کہہ کر کھڑے ہو گئے اور مہاراجہ کشن پرشاد کو ساتھ لے کر درگاہ سے چلے گئے۔

تمام حاضرین محفل اس دبلے پتلے مسکین مولوی احمد حسین کو دیکھنے کے لئے جس کی بوسیدہ شیروانی آستینوں سے اس کی کہنیاں جھانک رہی تھیں، اس کے گرد جمع ہو گئے اور حیرت میں ڈوبی ہوئی تعریف کرنے لگے۔

لوگوں کی مدح سرائی کے جواب میں انھوں نے یہ کہا کہ آپ حضرات نے یہ قول سنا ہے کہ بڑوں کی صحبت نے مجھ کو بڑا بنا دیا ہے؟ میاں پہلے سارے مسلمان ایسے ہی تھے اب چونکہ وہ لوگ باقی نہیں رہے ہیں اس لئے میں ایک نمایاں فرد معلوم ہونے لگا ہوں اور کوتوال جب ان کا نام اور پتہ پوچھنے آیا تو انھوں نے اپنا نام اور پتہ بتانے کے بعد اس سے کہا کہ بہتر تو یہ ہے کہ مجھے گرفتار کر لو اور مجھے پھانسی کے تختہ پر لٹکا دو کہ سچ بولنے والے کا ہمیشہ یہی انجام ہوا کرتا ہے کوتوال ان کو حیرت سے دیکھنے لگا اور اس کا کوتوالی کا گھٹا ہوا بدن پیلا ہو کر اس کے کھلے ہوئے منہ پر لٹکنے لگا۔

ابھی درگاہ سے آکر وہ گھر میں بیٹھے ہی تھے کہ ایک وردی پوش نے آکر کہا مہاراجہ کشن پرشاد بہادر تشریف لائے ہیں انھوں نے کہلا بھیجا کہ مہاراجہ نے ان کے سامنے ایک ایک ہزار کے دس توڑے رکھ کر کہا مولوی صاحب یہ دس ہزار روپے سرکار والا تبار نے، آپ کی جرأت ایمانی سے خوش ہو کر آپ کی خدمت میں بھیجے ہیں انھیں قبول فرمائیے۔

انھوں نے بڑی مسکنت سے کہا سرکار تک میرا شکریہ پہنچا دیجئے۔ میں ان کا ایک ادنیٰ سا

نمک خوار ہوں یہ انکی شرافت کی بڑی دلیل ہے کہ سزا کے عوض وہ مجھکو جزا دے رہے ہیں لیکن مہاراج سرکار کی خدمت میں جاکر عرض کر دیجئے کہ گناہ حق فرد ختنی نہیں ہے اگر تا اس لئے میں یہ روپیہ قبول نہیں کر سکتا مہاراجہ نے ان کو بڑی حیرت سے دیکھا فرط جذبات سے کچھ بول نہیں سکے ان کے ہاتھ چوم لیئے اور سر جھکا کر رخصت ہو گئے۔

اس کے بعد شاہی فرمان نکلا کہ مولوی احمد حسین کو نوکری سے سبک دوش کر کے گھر بیٹھے تین سو روپیہ تاحیات دیئے جائیں اسکو بھی انھوں نے قبول نہیں کیا اور یہ لکھ بھیجا کہ میری نوکری بحال رکھی جائے میں ۔ بیس روپئے ماہانہ میں اچھی طرح زندگی بسر کر رہا ہوں مجھکو تین سو روپیئے کی ضرورت نہیں ہے۔"

دیکھا آپ نے اس ہڈیوں کے مالے کا آہنی کردار ؟ اس صدی میں اگر انکا کوئی ہمسر گذرا ہو تو خدارا مجھکو اس کے نام سے آگاہ کیا جائے۔

وہ مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے اور میں دل ہی دل میں اپنے سے کہا کرتا تھا ۔

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ کیا جانیئے تو نے اسے کس حال میں دیکھا

ہمارے مابین بظاہر کوئی وجہ اشتراک نہیں تھی ، وہ تھے منا جاتی ، اور میں تھا ... رند خراباتی خدا جانے وہ میری کون سی ادا تھی جس نے انکا دل موہ لیا تھا۔

وہ کہا کرتے تھے کہ آپکا تمام کلام الہامی ہے اور آپکی شراب نوشی مراقبہ ہے حالانکہ میں بخوبی جانتا ہوں کہ میری شاعری الہام ہے نہ میری شراب نوشی مراقبہ ہے۔

اب انکا ایک دوسرا واقعہ بھی سن لیجئے جس کی نوعیت پہلے واقعہ سے بالکل مختلف ہے اور جس کو میں آج تک نہیں سمجھ سکا ہوں۔

مجھ پر خدا کے فضل و کرم سے جب شاہی عتاب بجلی کی طرح گرا تو وہ ایک دن میرے پاس آئے اور کہنے لگے آپ کے خراج مبارک میں اب کتنے دن باقی ہیں۔ میں نے کہا صرف آٹھ دس دن۔ انھوں نے کہا تو پھر ایسا کیجئے کہ اس اثنا میں آپ میرے پاس ہر شام کو دو گھنٹے کے لئے آجایا کیجئے اس لئے کہ مجھے آپ کے کانوں تک چند ایسے نکات پہونچانا ہیں جو فقط آپ تک پہونچا دینے کے واسطے مجھے ودیعت فرمائے گئے ہیں۔ میں نے کہا مولوی صاحب جھٹ پٹے کے سانولے رنگ کی چھاؤں میں تو میں کالا پانی[1] پیا کرتا ہوں۔ انھوں نے کہا کوئی پروا نہیں۔ آپ میرے سامنے بیٹھ کر پی سکتے ہیں۔ آپ میری باتیں سن سن کر جس قدر بھی کالا پانی پیئں گے اسی قدر گورے ہوتے چلے جائیں گے۔

چنانچہ اسی دن شام ہوتے ہی میں ہینڈ بیگ میں بوتل ، پیمانہ ، گلاس ، گھڑی ، اور ـــــ

---

[1] شراب

اگر بتیاں ڈال کر ان کے وہاں پہنچ گیا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ کھڑے ہو گئے اور کہا آیئے میرے ساتھ میں نے آپ سے باتیں کرنے کے لئے دس دن کے واسطے یہیں پڑوس میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا ہے میں نے کہا شاید اس لئے کہ آپکے گھر میں بادہ نوشی نہ کی جائے انھوں نے کہا نہیں یہ بات نہیں ہے میں جو باتیں آپکے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں وہ باتیں اگر آپکے سوا کسی اور کے کان میں پڑ گئیں تو وہ گمراہ ہو کر رہ جائے گا آپکو معلوم ہے کہ عرق گل جسے گلاب کہا جاتا ہے بیمار کے جسم میں داخل ہو کر باغم اور تندرست کے جسم میں حیات آفریں ہو جاتا ہے۔ یہی حال بعض خیالات کا ہے کہ وہ نادان کیلئے زہر اور دانا کے لئے تریاق بن جاتے ہیں۔

الغرض آٹھ دس دن تک برابر انھوں نے بڑے ٹھوس مسائل مجھکو سمجھائے، یہ بھی بتایا کہ عبادات مقصود بالذات نہیں بلکہ ذریعہ مقاصد ہیں اور اسی لپیٹ میں الفاظ کے داخلی و خارجی معانی و مفاہیم عوام و خاص کے جداگانہ احکام تنزیہی و تشبیہی نکات اور محرک اوّل کے مجازی و حقیقی تخیئل پر بھی روشنی ڈالی اور اسی کے ساتھ ساتھ تکوین و تخلیق ارتقاء و بقائے اصلح مادّہ و روح طریقت و شریعت، جزاء و سزا، جہنم و جنّت، روح و مادّہ، جبر و قدر، امر و نواہی معاش و معاد، حیات و موت، قضاء و قدر، واجب و ممکن اور ذات و صفات کے بارے میں ایسے خیالات کا اظہار کیا کہ ان پر کٹھ ملا کی بارگاہ سے بآسانی کفر کا فتویٰ صادر کیا جا سکتا ہے سب سے زیادہ انھوں نے زور دیا انفس و آفاق کی وحدت پر، انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اگر ہم خدا کے تصور سے دست بردار بھی ہو جائیں پھر بھی موجودات کی وحدت میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا، تمام کائنات غیبیت کی زنجیر میں جکڑی ہوئی ہے غیریت کا کہیں وجود ہی نہیں ہے، اسماء و اشکال کے حجابات ہم کو دھوکا دیتے ہیں اور ان حجابات کو ہٹا دیں اور ان حجابات کو ہٹا دیں تو معلوم ہو جائے کہ تمام کائنات کی تکوینی ماہیات ایک ہے خواہ ہم روحانی نقطہ نظر سے دیکھیں، خواہ مادی، ہم کو وحدت الوجود کا قائل ہونا پڑے گا اس لئے کہ کونین ایک حقیقت واحدہ کثیر الاسماء و الاشکال ہے۔

اسی کے دوش بدوش انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اسلام نے جو توحید پر اس قدر زور دیا ہے اسکا منشاء بھی صرف اس قدر ہے کہ لوگ اپنے کو ایک باپ کے بیٹے اور ایک دوسرے کو حقیقی بھائی بہن سمجھیں اور اگر خدا میں تعدد ہو جائے گا تو لوگ سگے بھائی بہن نہیں رہیں گے جس کے یہ معنی ہیں کہ خدا وحدت در حقیقت انسان و آفاق کی وحدت کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔

ان راتوں کی آخری رات بڑی عجیب ہو گئی تھی، وہ یکایک خاموش ہو گئے اور پھر، ہا تھ ہلا ہلا کر ارے توبہ، ارے توبہ کے نعرے لگانے لگے۔ میں ان سے بے تکلف ہو چکا تھا، میں نے کہا ارے یہ مجازیب کے سے شندے آپ کیا کر رہے ہیں۔ انھوں نے آنکھیں کھول کر مجھ سے کہا میر عثمان علی خاں کا مال دیکھ رہا ہوں توبہ توبہ یہ تھون خراب، یہ ذلیلتی، یہ بے چارگیاں میں نے کہا، جناب والا میں ان شعبدوں کا قائل نہیں انھوں نے کہا، میرے بعد آپ کو معلوم ہو جائے گا ــــــ یہ کہا اور وہ سر جھکا کر پھر خاموشی کے سمندر میں ڈوب گئے، میں حیران ہو گیا کہ یہ آج انھیں ہو کیا گیا ہے ابھی میں نے اپنا آخری جام ختم کیا تھا کہ انھوں نے آنکھیں کھول کر مجھے گھورنا شروع کر دیا، میں نے کہا حضرت یہ آج آپ کو ہو کیا گیا ہے، انھیں یہ سن کر جھرجھری آ گئی میں ہنسنے لگا وہ سنجیدہ رہے لوچھا......... احادیث کے باب میں آپ کا کیا خیال ہے میں نے جواب دیا کہ عہد بنو امیہ میں ٹکسال احادیث کی ایسی زبردست دارالضرب کھول دی گئی تھی۔ اور ایسی جھوٹی حدیثیں وضع کی گئی تھیں کہ اب جھوٹی سچی حدیثوں میں فرق کرنا بے حد مشکل ہو چکا ہے احادیث کی اب یہ صورت ہو گئی ہے جیسے پلاؤ کی دیگ تو دوں سے اتار کر زمین پر رکھ دی گئی ہے، ایک کتے نے ٹانگ اٹھا کر پیشاب کر دیا، پیشاب کے قطرے ہوا سے اڑ کر دیگ میں پہونچ گئے یہ صحیح ہے کہ ہر چاول ناپاک نہیں ہوا لیکن ہر چاول مشتبہ ضرور ہو گیا انھوں نے پوچھا صحت احادیث کا معیار آپ کے نزدیک کیا ہے، میں نے کہا لے دے کے صرف یہی ایک معیار ہے کہ جو احادیث قرآن کے آیات و مزاج کے مطابق ہیں، ان کو صحیح اور اس صورت حال کے برعکس احادیث کو غلط سمجھا جائے۔

انھوں نے کہا بے شک یہ معیار بہت اچھا ہے لیکن اس سے بھی اچھا معیار آپکو بتلاؤں میں نے کہا لے دے کے صرف یہی ایک معیار ہے کہ جو احادیث قرآن کی آیات و مزاج کے مطابق ہیں انکو صحیح اور اس صورت حال کے برعکس احادیث کو غلط سمجھا جائے۔ انھوں نے جواب دیا ظاہری وفات سے کچھ نہیں ہوتا رسول آج بھی اسی طرح زندہ ہیں جیسے کل تھے، میں نے کہا یہ آپ کیسی باتیں کرنے پر اتر آئے ہیں، خیریت تو ہے۔ مزاج کیسا ہے، وہ مسکرائے اور کہنے لگے میاں جوغی یہ دو باتیں آپکے واسطے مقدر ہو چکی ہیں پہلی بات تو یہ ہے کہ جب آپ اپنی عمر کے دور آخر میں داخل ہو جائیں گے قدرت آپ سے ابلاغ کی توحید کا کام لے گی آپ النفس و آفاق کی وحدت کا آوازہ بلند کریں گے، اور وہ آوازہ وحدت کا کام لے گی اور دوسری بات یہ ہے کہ جب آپکو کسی حدیث کی صحت میں شک ہو گا، آپ براہ راست خود رسول سے جا کر پوچھ لیں گے۔

یہ سن کر میں نے بہت زور سے قہقہہ مارا اور کہا مولانا یہ آخری رات دیوانگی کی رات ہے

. نیرالتوں تک تو آپ معقول رہے اور آج مجذوبوں کی سی بڑ مار رہے ہیں ۔ آپکا دالی قدرت اور مجھ سے کام لے اور رسول کو زندہ فرما کر مجھے ان کی سرکار تک پہنچا دے آپکو میرے نشکک کا بخوبی علم ہے اب رہے میرے اعمال سو آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ میں آپکے سامنے بیٹھا شراب پی رہا ہوں یعنی اسلامی نقطۂ نظر سے میرے افکار اور میرا کردار ایسا ہے کہ آپکا خدا مجھ کو پسند نہیں کر سکتا اور اس حالت میں آپکی یہ پیشن گوئی قطعی طور پر غلط ہے ۔

میری یہ بات سن کر وہ اچھل پڑے کہنے لگے نشکک نردبان معرفت ہے جو آپکو بام یقین تک ایک روز پہونچا دے گا۔ اب رہی آپکی بادہ خواری سو میں کہہ چکا ہوں کہ یہ آپکا مراقبہ ہے ، اپنی شراب کو آپ گناہ سمجھ رہے ہیں ، ایسا کر لینا " گناہ ہے۔

میں نے پھر قہقہہ مار کر کہا ، آج کی رات تو بڑے مزے کی رات ہے ، پی میں رہا ہوں اور بہک رہے ہیں آپ وہ ہنسنے لگے اور کہا آپ کے قہقہے قضا و قدر کے دھارے کو نہیں موڑ سکتے جو کچھ پیش آنے والا ہے ، آپ خود دیکھ لیں گے ۔ میں نے کہا اب میں اجازت چاہتا ہوں آیئے گلے مل لیں پھر دیکھئے کبھی ملاقات ہوتی ہے کہ نہیں انھوں نے بڑی گرمجوشی سے گلے لگا کر کہا میں ایک مہینہ تک خواب میں آپ کے پاس آتا رہونگا اور جب آپ مطمئن ہو جائیں گے خواب میں آنا ترک کر دونگا اور ہاں یہ بھی سن لیجئے کہ اپنے انتقال سے پورے چھ مہینہ پیشتر آپ جہاں کہیں بھی ہوں گے آپ سے ملنے آؤنگا ۔

چنانچہ انھوں نے جو کہا تھا وہی کیا ایک ماہ برابر وہ میرے خواب میں آتے بد ایتیں کرتے رہتے اور انتقال سے چھ مہینے پہلے دہلی میں آکر مجھ سے مل بھی لئے ، یہ کیا طلسم تھا میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا ہے یا تو میرے ذہن کی طاقت تھی جو برابر میرے خواب دکھاتی رہی یا ان کا تصرف تھا ، کوئی فیصلہ کرے لیکن موت سے ٹھیک چھ مہینے قبل آنا یہ تو ایسی بات ہے جس کو میں اپنے ذہن کا کارکردگی سے قطعاً منسوب نہیں کر سکتا میں سمجھتا ہوں کہ میرا جہل مجھ کو ہلاک کر کے چھوڑ دے گا ۔

نوابزادہ مصطفٰے علی خاں

میرے چچا نواب محمد علی خاں ، تعلقہ دار "سہالی مئو" کے فرزند یعنی میرے چچا زاد بھائی لیکن بھائی کم اور دوست بہت زیادہ ہیں ۔ اگر وہ فقط بھائی ہوتے تو ان سے ڈرتا

اس لئے کہ میرے خاندان کے بھائی بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔

وہ جوانی میں نہایت خوبرو تھے چچا نے ان کو بڑے ناز و نعم سے پالا اور مسوری کے انگلش اسکول میں داخل کر کے یہ چاہا تھا کہ وہ علم حاصل کرلیں، لیکن بد شوق تھے اسکول میں داخل کر کے یہ چاہا تھا کہ وہ علم حاصل کرلیں، لیکن بدشوق تھے۔

چچا جان انکو بہت چاہتے تھے لیکن خلف اکبر نے ہونے کی بناء پر ان کو تعلقہ دار نہیں بنا سکے تعلقداری ان کے بڑے بھائی حامد علی خاں کو سونپی لیکن اس کے نام اس قدر معین ما باغ اور گزارہ لکھ دیا کہ اگر وہ جائداد باقی رہ جاتی تو کئی پشتوں تک چلتی۔ لیکن صد حیف کہ میرے بھائی کی افتاد ے چھوٹے سے کمرے میں بڑی اداسی کے ساتھ دن پورے کر رہے ہیں۔ آسمان راحق بود، گر خوں ببارد بر زمیں!

اب انکی داستان بربادی بھی سن لیجئے اور اس امر پر بھی غور کیجئے کہ جذبات کا طوفان انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ خدا بخشے ان باپ یوں کہ بے حد حسن پرست تھے حسین عورتوں اور طوائفوں سے ان کا گھر بھرا رہتا تھا اور چونکہ مصطفیٰ علی کا لڑکپن ان حسینوں کی زلفوں کی چھاؤں میں بسر ہوا تھا اس لئے بچپن ہی سے وہ تماشبینی کے سانچے میں ڈھل چکے تھے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ باپ کے مرتے ہی وہ ایسے کھیل کھیلے کہ گھر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

سب سے پہلے وہ سندیلے کی ایک طوائف پر۔ "اب تو ہر سانس میری آپ کا افسانہ ہے" کی حد تک ریجھ گئے جب وہ مر گئی کچھ روز اس کا سوگ منانے کے بعد پھر تو انھوں نے سیکڑوں طوائفوں پر یکے بعد دیگرے مرنا شروع کر دیا، اور جائداد دھڑا دھڑ بکنے لگی۔

خبر کرو میرے خرمن کے ساکنانِ چمن کو! (خبر کرو میرے خرمن کے خوشہ چینوں کو!)

ان کو بربادی کی شاہراہ پر سرپٹ دوڑتے دیکھ کر ان کے قرابت داروں اور بہی خواہوں نے لاکھ لاکھ سمجھایا کہ دیکھو بھائی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ۔ عیاشی کرو بجٹ بنا کر اپنے حدود میں رہو لیکن وہ نہیں مانے اور سمجھانے والوں کو سے جھڑک جھڑک کر کہا کہ خاں صاحب فضول خرچی ہماری عادت میں داخل ہے آئندہ نہ سمجھائیے گا، ورنہ قطع تعلق کر لوں گا۔

وہ جب اپنی زمین کا کوئی ٹکڑا فروخت کرتے اور روپیہ جیب میں آتا تو دس منٹ ضائع کئے بغیر وہ ریل، ٹیکسی، بس، تانگے یا اکے میں بیٹھ کر "گولڈن نائٹ" (شب زریں) منانے کے لئے لکھنؤ چلے جایا کرتے تھے تاکہ ان کی جیب کے سکوں اور گولڈن نائٹ کے لمحوں کے مابین کوئی فصل پیدا نہ ہونے پائے۔

اور جب ان کے پاس پانچ سات روپے باقی رہ جاتے تھے تو اعلیٰ سگریٹ کے بدلے بیڑی پیتے ہوئے ملیح آباد آجاتے اور تقریباً فاقے کرنے لگتے اور اس عالم میں اپنے بچوں کے اترے ہوئے چہرے دیکھ کر روتے اور اسراف سے توبہ کیا کرتے تھے لیکن جیسے ہی باغ یا زمین کے کسی دوسرے حصّے کے فروخت کر دینے میں کامیاب ہو جاتے تھے تو اپنے فاقوں اور اپنے بچوں کے اترے ہوئے چہروں کو فراموش کر کے وہ گھبراہٹ کے ساتھ پھر گولڈن نائٹ منانے کے واسطے لکھنؤ چلے جاتے تھے۔

ایک بار وہ بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ جائداد کے خریداروں نے یہ سوچ کر کہ وہ ہر حالت میں جائداد بیچ ڈالنے پر تلے ہوئے ہیں خریداری سے انکار کر دیا تھا اور دس ہزار کی زمین... ہر حالت میں دو ہزار میں فروخت کرنے پر مجبور ہو جائیں گے اس زمانے میں چائے کے سیٹ اور چاندی سونے کے برتن بیچ بیچ کر انھوں نے اپنا اور اپنے تینوں بچوں کا پیٹ پالا اور ہر آن رویا کرتے اور قسمیں کھاتے تھے کہ اب روپیہ برباد نہیں کروں گا۔

لیکن ایک روز لکھنؤ کے چوک کی اس قدر یاد آئی کہ انھوں نے اپنی باقی تمام جائداد کو پونے مولی گاجر کی طرح بیچ ڈالی اور روپیہ ہاتھ آتے ہی "گولڈن نائٹ" منانے کے واسطے فوراً لکھنؤ چلے گئے اور جب پائی پائی خرچ ہو گئی تو منہ لٹکائے ہوئے ملیح آباد آگئے تینوں بچوں کو گلے لگا کر اس قدر روئے کہ پڑوسیوں کے مکان گونجنے اور دل ہلنے لگے۔

جائداد تو ختم ہو گئی تھی اب یہ فکر دامن گیر ہو گئی تھی کہ کھائیں گے کیا۔ معلوم نہیں انھوں نے وہ مصیبت کا دور کیونکر گزارا اور کھانا کیونکر کھایا۔ اسی اثنا میں جب برکھا رت آگئی پانی رم جھم برسنے لگا کوئلیں کوکنے اور پپیہے بولنے لگے تو ان کو انگڑائیوں پر انگڑائیاں آنے لگیں۔ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس کئی لاکھ روپے کے محل کو جو باپ نے عطا فرمایا تھا اور جس کی صرف دو منزلہ ڈیوڑھی کی قیمت تھی دس ہزار صرف تین ہزار روپیوں میں بیچ ڈالا اور روپیہ جیب میں آتے ہی بلا تاخیر "گولڈن نائٹ" منانے کے واسطے لکھنؤ روانہ ہو گئے گرم۔ دھم ہا گرم دھم۔

آواز دو کہ جنبشِ دو عالم کو جوش نے　　قربانِ یک تبسمِ جانانہ کر دیا

زاہد علی خاں

وہ بھی ہمارے ملیح آباد کے کاہ جسم، کوہ عزم، آہن کردار، آفات کوب خوف نا آشنا بات

گے پکے، دھن کے پورے، ضد کے سچے، طبعاً تنک مزاج، غضباً شعلہ مزاج، جھک کر ملو تو شاخِ سایہ دار، اکڑ دو تو آپی تلوار۔ بانکے ترچھے، ہٹیلے اور بڑے چھوٹے اور بے حد جھلاہٹ کے پٹھان تھے۔

انھیں اپنے بھائی غالب علی خاں سے جو بقیدِ حیات ہیں بڑی محبت تھی، لیکن باپ کے مرنے کے بعد انھوں نے اپنے اس چہیتے بھائی کو جائداد سے محروم کر کے اس کے شرعی و قانونی حقّے پر قبضہ کر لیا تھا وہ بے ایمان اور بدنیت انسان نہیں تھے۔ پھر انھوں نے ایسا کیوں کیا اس کی علت بھی سن لیجئے۔

باپ کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی نے ان سے کہا کہ بھائی صاحب جائداد کا بٹوارہ کر کے میرا حصّہ مجھے دیدیجئے یہ پیام سن کر وہ جامے سے باہر ہوگئے انھوں نے کہا میں باپ کے بعد اس کو بھائی نہیں اپنا بیٹا سمجھتا ہوں اور ارادہ کر چکا ہوں کہ اسکو آدھے سے زیادہ حصّہ دونگا لیکن اب چونکہ اس نے غیریت برت کر بٹوارے کا پیغام بھیج دیا ہے، اس لئے جب تک میں زندہ رہونگا بٹوارہ نہیں ہونے دونگا۔ غلبوا (غالب کی تصغیر) سے کہہ دو وہ جو چاہے کر کے دیکھ لے، میں اس کے حصّہ کے باغوں اور زمینوں پر عمر بھر قابض رہونگا۔ اب اس کی جائداد "(جائداد پدر) نہیں جائے دادِ دگر" ہو چکی ہے۔

غالب علی خاں نے یہ جواب سن کر عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ مقدمے میں کوئی پیچیدگی تو تھی ہی نہیں دو چار پیشیوں کے بعد فیصلہ ہوگیا اور جس وقت جج نے یہ حکم سنایا کہ آدھی جائداد غالب علی خاں کے نام کر دی جائے تو انھوں نے کہا جج صاحب آپکا یہ فیصلہ آپ کے کاغذات تک محدود رہے گا۔ اس سے جائداد پر ذرہ برابر اثر نہیں پڑے گا۔ جج نے کہا، خانصاحب آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں انھوں نے کہا میں یہ کہہ رہا ہوں جس دن آپکی طرف سے جائداد کا بٹوارہ کر کے خندقیں کھود دی جائیں گی اور حدبندی کے پتھر نصب کر دیے جائیں گے اس کے دوسرے ہی دن زاہد علی خاں تمام خندقوں کو بھروا کر اور حدبندی کے تمام پتھروں کو پھینک کر پھر پوری جائداد پر قبضہ کر لیں گے۔ اور آپ منھ دیکھتے رہ جائیں گے۔

جج نے کہا خانصاحب آپ عدالت کی توہین کر رہے ہیں اس کا نتیجہ کیا ہوگا آپکو معلوم ہے؟ انھوں نے انتہائی بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر کہا، مجھ کو سب معلوم ہے۔ لیکن اس سے کچھ ہوگا نہیں، غلبوا کو جائے داد نہیں مل سکے گی قبضہ تو زندگی بھر زاہد علی خاں ہی کا رہیگا

جج نہایت ہی شریف آدمی اور پٹھانوں کے مزاج شناس و ہمدرد تھے ان سے کہا خانصاحب آپ اپنے الفاظ واپس لیں انھوں نے کہا یہ کام زنخوں کا ہے اور جب مجبور ہو کر

اس نے انکو تین مہینے کی سزا کا حکم سنایا تو انھوں نے کہا بہت اچھا منظور لیکن اس میرے خدمت

کار "چینو" کو بھی جو میرے پیچھے کھڑا ہے تین مہینے کی سزا دیدیجئے ورنہ وہاں میرا حقہ کون بھرے گا۔ جج کو ہنسی آ گئی انھوں نے کہا جو شخص جرم نہ کرے اسکو کیونکر سزا دی جائے۔ انھوں نے یہ کہہ کر کہ جج صاحب بھلا جرم میں دیر ہی کیا لگتی ہے۔ خدمت گار کو حکم دیا ہے چینو! کھول دے پاجامہ اور کر دے پیشاب۔

چینو نے فوراً دھل دھل پیشاب کر دیا اس کو بھی تین مہینہ کی سزا ہو گئی اور وہ اس کو ساتھ لئے جیل چلے گئے، صبح کے وقت جب رول کال کے وقت جیلر نے آواز لگائی زاہد علی حاضر ہے تو انھوں نے کہا ابے گیدی خر، زاہد علی خاں تشریف رکھتے ہیں کہہ کر پکار، ہم کوئی چوری چکاری کر کے تو جیل میں نہیں آئے ہیں، ہم کوئی تو یہاں انتظاماً بھیجا گیا ہے، جیلر کوئی بھلا آدمی تھا انکی بیٹھک کار سنی اور پی گیا۔

جیل کاٹ کر جب باہر آئے سیدھے ملیح آباد پہونچے، پہنچتے ہی بٹوارے کے تمام آثار مٹا کر پھر پوری جائداد پر قابض ہو گئے پھر مقدمہ چلا کر پھر سزا ہوئی، پھر چینو کو اسی طرح ساتھ لیا اور سزا کاٹ کر جب پھر آئے تو پھر بھائی کی جائداد پر قبضہ کر لیا اور جب تک وہ مر نہیں گئے بٹوارہ ہو ہی نہیں سکا۔

میرے نزدیک "جالک ہٹ" "راج ہٹ" "تریا ہٹ" میں اگر پٹھان ہٹ کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ اضافہ نہایت مناسب رہے گا۔

میر یارقی لکھنوی

لکھنؤ کی وضع داری کے مکمل نمونے، پچاسی برس کی عمر میں بھی خوبصورت، پیدل چلتے پھرتے دو چار میل روز ٹہلتے، اوسط درجے کے شاعر، اعلیٰ درجے کے انسان اور
چنداں کہ خدا غنیست ما محتاجیم
کی حد تک نادار اور اس پر بھی صاحب کردار۔

ایک بار میرے باپ نے تخلیئے میں ان سے پوچھا، میر صاحب یہ کیا بات ہے کہ آپ بہت بار ہمارے یہاں تشریف لائے لیکن ایک بار بھی میرے ساتھ کھانا تناول نہیں فرمایا

ہیں۔ پہلے تو انھوں نے احترامِ افلاس کے باعث ٹالنے کی سعی کی لیکن جب میرے باپ نے اصرار کیا تو انھوں نے ادھر ادھر دیکھ کر جواب دیا کہ خانصاحب آپکے دسترخوان پر آپ کے جو احباب دونوں وقت کھانا کھاتے ہیں، میرا معاملہ اُن سے مختلف ہے، میرے باپ نے کہا۔ میں آپکی بات نہیں سمجھا تفصیل فرمایئے۔ انھوں نے کہا شرم کی بات ہے میں کہنا نہیں چاہتا۔ میرے باپ نے اپنے سر کی قسم دے کر پوچھا، تو انھوں نے سر جھکا کر کہا خانصاحب اصولی بات یہ ہے کہ اگر میں آپ کے پاس دس بار کھانا کھاؤں تو مجھ پر لازم ہے کہ کم از کم ایک بار تو آپکو بھی مدعو کروں، لیکن میں اس قدر مفلس ہوں کہ کھانا تو درکنار آپکو چائے پر بھی مدعو نہیں کر سکتا اس لئے کیا منہ لے کر آپکے ساتھ کھانا کھاؤں

ان کی یہ بات سن کر میرے باپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور کہا میر صاحب آپ نے مجھ سے بغیریت برت کر اب تک مجھ سے یہ بات پوشیدہ رکھی اس کے جواب میں انھوں نے ایک رباعی سنائی :-

آں کس کہ کباب می خورد ہا می گزرد — آں کش کہ شراب می خورد ہا می گزرد
سرمد کہ بکاسۂ گدائی، نان را — تر کردہ بآب می خورد، می گزرد

یہ سن کر میرے باپ نے میرے کان میں کہا جاؤ اپنی ماں سے پچیس ۲۵ اشرفیاں لے آؤ لیکن رومال میں لپیٹ کر لانا جب میں اشرفیاں لے آیا میرے باپ نے مجھ سے فرمایا، باہر چلے جاؤ، میں باہر جا کر دروازے کی آڑ میں کھڑا ہو کر دیکھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ میرے باپ کھڑے ہو گئے اور وہ اشرفیاں رومال پر رکھ کر اس طرح ان کے سامنے پیش کیں جیسے کسی بادشاہ کو نذر دی جاتی ہے۔ میرے باپ کی اس پیش کش کو دیکھ کر وہ تلملا کر کھڑے ہو گئے اور بھرائی آواز میں کہنے لگے خان صاحب ہم سادات پر صدقہ حرام ہے۔ میرے باپ نے کہا میر صاحب آپ برادرانہ پیشکش کو صدقہ کا نام دیتے ہیں۔ خونِ حسینؑ کا واسطہ اس کو قبول فرما کر مجھکو عزت بخشئے یہ سن کر وہ رونے لگے اور کہا خونِ حسینؑ کی قسم میں اسے قبول نہیں کرونگا اور آپ نے اصرار کیا تو آپکی خدمت میں آنا جانا ترک کر دونگا۔

اس واقعہ کے کچھ روز بعد وہ میرے باپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ خدمت گار مٹھائی کا تھال لے آیا، تھال احباب میں گردش کرنے لگے اور جب تھال ان کے سامنے آیا تو چونکہ انکی وضع میں یہ بات داخل تھی کہ وہ کسی کے یہاں کچھ کھاتے پیتے نہیں تھے اسلئے انھوں نے خدمتگار کو دوسری طرف تھال لے جانے کا اشارہ کیا میرے باپ نے

کہا میر صاحب آپکو معلوم ہے آج محرم کی ساتویں تاریخ ہے کیا آپ حضرت امام حسینؓ کی نذر سے بھی انکار فرما دیں گے۔

یہ کہہ کر انھوں نے برفی کی ڈلی اٹھائی برفی ابھی ان کے ہاتھ میں ہی تھی کہ حامد علی خاں بیرسٹر آگئے اور خلاف وضع ان کے ہاتھ میں برفی کی ڈلی دیکھ کر انھوں نے مزاحیہ انداز میں پکار کر کہا۔ میر بارق صاحب دیکھ لیا یہ سنتے ہی انکی آنکھوں میں آنسو آگئے اور برفی کی ڈلی فوراً تھالی میں رکھ دی یہ دیکھ کر حامد علی خاں کے ہوش اڑ گئے دوڑ کر انھوں نے ان کے پاؤں پکڑ لیئے اور کہا میر صاحب یہ تو مزاح المومنین کے زمرے کی بات تھی مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ آزردہ ہو جائیں گے حضرت عباسؑ کی قسم معاف فرمایئے انھوں نے کہا بیرسٹر صاحب آپ کو یہ خیال نہیں آیا کہ آپ کی یہ آواز کوٹھے سے کی گرہی تھالی کے مانند سڑک تک پہونچ جائے گی اور سننے والے یہ سوچنے لگیں گے کہ خدا جانے بارق کون ایسا فعل شنیع کر رہا تھا بیرسٹر صاحب یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ بارق صاحب دیکھ لیا اب جب تک کچھ چھپٹا نہیں ہو جائے گا میں تیجے نہیں اترونگا یہ تھی لکھنؤ والوں کی تہذیب اور یہ تھا انکی عزت نفس کا معیار!!

منشی واحد علی ابرؔ قدوائی

نہایت وجیہہ اور نہایت کلّے ٹھلّے کے انسان تھے چہرہ شاداب تھا سر پر گنجان پٹے تھے منھ پر گھنی داڑھی تھی، رئیسانہ ٹھاٹ باٹ تھا سرکار رام پور میں میر منشی تھے شاندار انگرکھا اور بانکی ٹوپی ان کی خاص وضع تھی۔

ایک بار میں جب رام پور گیا چونکہ وہ میرے باپ کے دوست تھے انکی خدمت میں میں بھی حاضر ہوا بڑی محبت سے پیش آئے کہا میں اس وقت ایک ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں۔ لیکن میاں کل میرے ساتھ کھانا کھانا دوسرے دن چھوٹے دادا کو لے کر وہاں پہونچا انھوں نے شاہی کھانا کھلایا کھانے کے بعد وہ ہم کو دوسرے کمرے میں لے گئے وہاں

یہ دیکھا کہ ہر کرسی کے پاس ایک چھوٹی سی میز اور ہر میز پر سوڈے کی دو دو بوتلیں اور چورن کی ایک ایک شیشی رکھی ہوئی ہے اور سامنے تختوں کا پچھو کا لگا ہوا ہے۔

جب ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے تو وہ تخت پر متمکن ہو کر مختلف صندوقچیوں سے غزلوں کے پرچے نکال نکال کر تاروں میں لٹکانے لگے ابھی انکا وہ عمل جاری تھا کہ انکے چھوٹے بھائی منشی احمد علی شوق ایک بڑی لانبی سی بیاض لئے آ گئے اور چھوٹے بھائی کی مشغولیت سے فائدہ اٹھا کر اپنے کلام کو سنانے لگے اور خدا جھوٹ نہ بلائے ایک سانس میں ستاون ستر غزلیں سنا ڈالیں وہ اور بھی سناتے مگر یہ دیکھ کر کہ چھوٹے بھائی کی غزلوں کے پرچے چھ سات جھاڑوں کی مانند تاروں میں لٹک رہے ہیں اور انکے ہونٹ فیر کرنے کے لئے بار بار کھل رہے ہیں انہوں نے بادل ناخواستہ اپنی بیاض بند کر دی اور اس کے فوراً بعد انہوں صاحب نے جسم کے تین تین جھٹکوں اور آواز کے چار چار ٹھنکوں کے ساتھ کر جناب سنانا شروع کر دیا اور ہماری داد کی آوازوں سے چھت گونجنے لگی۔

ہر غزل سنانے سے پیشتر وہ یہ کہتے تھے کہ جوش میاں یہ دیکھئے میر کے رنگ میں غزل کہی ہے اور یہ غالب، ناسخ، آتش، مومن اور مصحفی کے رنگ کی غزل ہے اور میں بار بار دل میں کہتا تھا کہ یہ کیسے شاعر ہیں جو ہمیشہ دوسرے شعرا کے رنگ میں کہتے ہیں اور انکا ذاتی رنگ ہے ہی نہیں ——— جب رات کے بارہ بج گئے تو چھوٹے دادا کی قوت برداشت نے جواب دے دیا وہ ایک دم سے کھڑے ہو گئے مجھ سے کہا بھائی شبیر حسن خاں اب تو ہمارا دم نکلا جا رہا ہے السلام علیکم یہ کہہ کر انھوں نے چک اٹھائی اور باہر نکل گئے انکی اس حرکت سے مجھ پر گھڑوں پانی پھر گیا۔ میں نے کہا ابر صاحب قبلہ، چھوٹے دادا اجڈ پٹھان ہیں معاف کیجئے کہ میں انکو ساتھ لے کر یہاں آ گیا انھوں نے جھینپی مسکراہٹ سے کہا مجھکو حیرت ہے پٹھانوں میں آپ اور آپ کے والد گرامی کیسے پیدا ہو گئے آپ اس کا خیال نہ کریں سوڈے کی بوتلیں اور چورن کھائیں تاکہ غذا ہضم ہو جائے ——— اب مجھکو معلوم ہوا کہ چونکہ ہم کو دیر تک جگانا تھا اس لئے سوڈا اور چورن رکھ دیا گیا تھا۔ میں نے چورن کھا کر ابھی سوڈا پیا ہی تھا کہ انھوں نے پھر کلام سنانا شروع کر دیا۔ ——— اب رات کے تین بج گئے میرے اور حاضرین کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگی لیکن وہ غزلیں پڑھتے رہے آخر کار جب پو پھٹی اور اذان کی آوازیں گونجنے لگیں تب انھوں نے ہمارے داد سے پھٹے ہوئے گلوں کی چرمر آوازوں اور شب بیداری کے روندے ہوئے چہروں کا اندازہ لگا کر ارشاد فرمایا شاید آپ لوگوں کو نیند آ رہی ہے اچھا خدا حافظ، لیکن یاد رکھئے کل بھی آپ یہیں کھانا کھائیں گے ——— ہم کھد بداتی کھوپڑیوں اور سنسناتے اعصاب کے ساتھ گھر

سے نکل کر جب سواری کی طرف جانے لگے تو شوق صاحب نے کہا آپ سب حضرات میرے کمرے میں تشریف لے آیئں یہیں منھ ہاتھ دھو کر ناشتہ فرمالیں پھر جاکر سورہیں یہ دعوت سُن کر ہماری پنڈلیاں کانپنے لگیں۔ لیکن اودھ کی وضع داری ہمارے کان پکڑ کر ہم کو ان کے کمرے میں لے کر چلی گئی۔ وہاں پہنچ کر ہم نے جو ابھی ضروری سے فراغت کی اور منھ ہاتھ دھو کر ناشتہ کیا ناشتہ ختم کر کے ہم اٹھنے ہی والے تھے کہ شوق صاحب نے اپنی بیاض کھول دی اور ہم کو غزلوں پر دھر لیا میرا عالم یہ ہو گیا کہ مجھے اس کا پتہ نہیں رہا کہ میں زمین پر ہوں یا آسمان پر اور یہ قدوائی صاحب کلام سنا رہے ہیں یا اونٹ بول رہا ہے۔

اس کے بعد میں نے دل میں یہ بات ٹھان لی کہ مرجاؤں گا لیکن ان دونوں بھائیوں کے پاس کبھی نہیں پھٹکوں گا اب دو واقعات اور سن لیجئے۔ میں قاضی خورشید احمد، ابرار حسن خاں، رفیع احمد خاں، مانی اور حامد علی خاں لیکر علی گڈھ جو بلی میں شریک ہو گیا ہوا تھا۔ ایک روز ڈائننگ ہال میں ہم لوگ پہونچے تو یہ دیکھ کر دم نکل گیا کہ وہاں ابر صاحب بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں ہم نے چاہا الٹے پاؤں نکل جائیں اتنے میں انھوں نے ہمیں دیکھ لیا ہم سب نے بھی سلام کیا انھوں نے ہمیں گلے لگایا اور اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ مانی صاحب نے میرے کان میں کہا ہم لوگ بہت آہستہ آہستہ کھائیں گے وہ پہلے سے کھا رہے ہیں ہماری کوشش یہ ہونا چاہئے کہ وہ ہم سے پہلے اٹھ جائیں۔

ابر صاحب نے مجھے چپکی دینے کے واسطے کہا میاں جوش اب ہم بھی تمہاری طرح چڑیوں اور کھیتوں پر نظمیں کہنے لگے ہیں۔ میں نے کہا کسی وقت حاضر ہو کر سنوں گا، انھوں نے کہا، ارے کسی وقت کی بات نہیں اسی وقت آپ سب کو میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔ میں نے کہا، بہت اچھا، دل دھڑ دھڑ کرنے لگا ہم لوگوں نے گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھا اور سر جھکا لئے اتنے میں وہ کھانے سے فارغ ہو کر ہمارے انتظار میں پھاٹک پر جاکر کھڑے ہو گئے مانی نے کہا گھبرائے نہیں ادھر اوٹ کے پیچھے ہاتھ دھونے چلئے، تدبیر سمجھ میں آ گئی ہے۔

اوٹ کے پیچھے جاکر مانی نے چاقو سے بڑا سا شگاف کر دیا اور ہم لوگ چوروں کی طرح اس شگاف سے نکل کر بھاگ کھڑے ہوئے لیکن اس قدر گھبرائے ہوئے تھے کہ بھاگے تو عین پھاٹک کے سامنے سے ابر نے ہمکو بھاگتے دیکھا تو ان کے منھ سے چیخ نکل گئی اور چلا چلا کر انھوں نے کہا ارے میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں مہذب شعراء گیدڑوں کی طرح بھاگے چلے جا رہے ہیں۔۔ ارے ارے ہائے اب دوسرا واقعہ بھی سماعت فرمالیجئے۔ لکھنؤ کا ذکر ہے ایک بار ہم لوگ یعنی مولانا صفی، حضرت عزیز، نواب یقین صاحب بلیغ، میرزا صاحب شرر، محمد صاحب بہادر اور حکیم منے آغا صاحب فاصل ایک چھکڑے سے بمدان کو ملے کر کے حامد علی بیرسٹر کی عیادت کو جا رہے تھے

کہ دیکھا اکبر صاحب گھوڑا گاڑی پر اسی طرف چلے آرہے ہیں مولانا صفی نے ہم سب سے ارشاد فرمایا کہ مسیح کی بھیڑوں اس املی کے تنے کے پیچھے دبک جاؤ ورنہ یہ آنے والا بھیڑیا سب کو کھا جائے گا ہم سب تنے کی آڑ میں ایک دوسرے سے مل کر کھڑے ہو گئے۔ اور جب ان کی سواری درخت سے قریب ہو کر گزرنے لگی۔ اتنے آدمیوں کو ایک درخت کیا چھپا سکتا تھا، انھوں نے ہمیں دیکھ لیا گاڑی رکوا دی ہماری طرف آنے لگے ہمارے منہ تتہیا کے سے ہو گئے۔

اور جب وہ قریب آ گئے تو ہم لوگ بڑے مداہنت آمیز تبسّم کے ساتھ ان کے مقدم کے واسطے آگے بڑھے، انھوں نے مسکرا کر پوچھا یہ املی کے نیچے کیا ہو رہا تھا؟ صفی صاحب نے کہا ذرا دم لینے کھڑے ہو گئے تھے اب یہاں سے حامد علی خاں کی عیادت کے واسطے جائیں گے۔ اکبر صاحب نے کہا اس املی کی چھاؤں کے نیچے میری ایک تازہ غزل سن لیجئے یہ سنتے ہی ہم سب بد حواس ہو گئے اور انھوں نے غزل شروع کر دی اور ہم واہ واہ سبحان اللہ پر مجبور ہو گئے لکھنؤ کا معاملہ تھا دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک بھیڑ سی لگ گئی اور بھیڑ والے بھی داد دینے لگے اور جب انھوں نے تیسری غزل شروع کر دی اور مجمع سے ایک آواز آئی ارے املی کے نیچے آم بک رہے ہیں تو مولانا صفی نے کہا راستہ میں کلام سنانا لکھنؤ کی تہذیب اور آپ کی شان کے خلاف ہے ہم سب در کے دولت پر حاضر ہو جائیں گے اور خوب جی بھر کر آپ کے کلام سے فیض یاب ہوں گے بد مزہ ہو کر جیب میں غزل رکھتے ہوئے اکبر صاحب نے کہا تو پھر آپ تمام حضرات کل غریب خانے پر افطار کریں اور ماحضر بھی تناول فرمائیں اب بات پکی ہو گئی نا؟ مولانا صفی نے کہا بالکل پکی بات اور اکبر صاحب یہ کہہ کر کہ دیکھئے میں آپ کو مولا کی ذات کی قسم دیتا ہوں کہ کل آپ حضرات ضرور تشریف لائیں۔" رخصت ہو گئے۔

جب وہ ہم سے وعدہ لے کر چلے گئے تو صفی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ جب ہم کو حسب وعدہ اکبر صاحب کے یہاں جانا اور اس ماہ رمضان میں سولی پر چڑھنا ہی ہے تو یہ کیجئے کہ کل چار بجے آپ سب غریب خانے پر آجائیے اکبر صاحب میرے مکان کے قریب ہی گونگے نواب کی کوٹھی میں رہتے ہیں۔ اور ہم سب "عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے" کی صورت سے ایک ٹولی بنا کر چلیں گے۔

دوسرے دن حسب قرار داد ہم سب مولانا صفی کے یہاں پہنچے انھوں نے کہا "آئیے ہم سب آپس میں گلے مل لیں خدا جانے پھر کبھی ملاقات ہو گی بھی یا نہیں۔ اور جب ہم لوگ گلے مل چکے تو انھوں نے زنانے دروازے کی طرف منہ کر کے بڑے دردناک لہجہ میں کہا "بیگم ہمارا کہا سنا معاف کرنا" اور جب اندر سے آواز آئی، ہے ہے۔ کیا بات ہے، ارے جلدی کہئے یا مولیٰ مشکل کشا مدد۔ تو مولانا صفی نے کہا ہم سب منشی واحد علی صاحب اکبر کا کلام سننے جا رہے ہیں ہمارا کہا سنا معاف کرنا۔ اور ہنستے ہنستے ہم سب کا برا حال ہو گیا۔

"حکیم دانش لکھنوی"

جسمانی حیثیت سے بے حد کمزور اور شعری نقطۂ نظر سے بڑے تگڑے تھے، پہلے ان کے دو شعر سن لیجئے ...... رونے والے رو چکے اور ہنسنے والے ہنس چکے، ایک پرانہ واقعہ ہے خانہ ویرانی میری اپنی رفعت پر بہت عرش بریں کو ناز تھا لی گئی سنگ در جاناں کو پیشانی مری۔

مجھکو آج تک ان کا آخری مشاعرہ یاد ہے اس مشاعرے سے کوئی ایک مہینہ پیشتر وہ نابینا ہو چکے تھے اور ان کے اس شعر پر۔

دیکھ سکتا ہوں نہ ساقی کو نہ مے خانے کو   آخری دور ہے بھر دے کوئی پیمانے کو

تمام حاضرین رونے لگے تھے اور مشاعرہ مجلس عزا میں تبدیل ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ لکھنوی تہذیب کے مکمل اور آخری نمونے تھے۔ ایک روز وہ حضرت عزیز کے وہاں بیٹھے تھے کہ ظریف صاحب آگئے اور آتے آتے انھوں نے کہا میری جیب کٹ گئی اور منی بیگ غائب ہو گیا۔ یہ سنتے ہی دانش صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا زبان سے ایک حرف بھی نہیں کہا جوتے پہنے بستر اٹھائی اور اٹھ کر جانے لگے حضرت عزیز نے حیران ہو کر پوچھا، حضرت (حضرت) خیریت تو ہے انھوں نے کہا عزیز صاحب خیریت ہوتی تو یہاں سے جاتا کیوں۔ عزیز صاحب اور تمام لوگ کھڑے ہو گئے پوچھا للہ کچھ تو بتائیے ماجرا کیا ہے؟ انھوں نے کہا عزیز صاحب لکھنؤ کا سا شہر اور وہاں کی محفل ادب اور وہاں فحاشی ہونے لگے۔

ظریف نے کہا قبلہ و کعبہ یہ آپ فرما کیا رہے ہیں انھوں نے ظریف صاحب کی طرف نظر اٹھا کر پوچھا۔ آپ نے یہاں آتے ہی کیا ارشاد فرمایا تھا ظریف نے کہا میں نے آکر یہ سانحہ بیان کیا تھا کہ میری جیب کٹ گئی اور منی بیگ غائب ہو گیا۔ یہ سنتے ہی انھوں نے کہا، نعوذ باللہ، نعوذ باللہ عزیز صاحب اس نکتہ کو پا گئے انھوں نے کہا حکیم صاحب انگریزی میں روپئے کو "منی کہتے ہیں"۔ انھوں نے بات کاٹ کر کہا حضرت انگریزی سے ہمیں کیا غرض ہماری زبان میں تو یہ لفظ فحش ہے۔ لکھنؤ میں اور فحاشی، استغفر اللہ، استغفر اللہ" کہتے ہوئے صاحب سلامت کئے بغیر وہ چلے گئے۔ ظریف اپنا سا منہ لے کر رہ گئے اور حضرت عزیز ان کی طہارت زبان پر سر دھننے لگے۔

ایک روز انھوں نے مجھ سے پوچھا، صاحبزادے آپ کہاں رہتے ہیں میں نے کہا لاٹوش روڈ کی گلی میں، انھوں نے لاٹوش روڈ سن کر منھ پیٹ لیا کہنے لگے میاں آپ کا سا شیریں مقال اور ان ثقیل حروف کے اندر جہاں نیز سے "ٹ" بھی ہے "ڑ" بھی ہے اور "ڈ" بھی لا ٹوش روڈ، جب تک آپ ان حرف ثقیل کے اندر رہیں گے آپکے پاس ہرگز ہرگز نہیں آ سکتا۔

کا ٹھونش ٹروڈ" معاذ اللہ لا ٹھونش روڈ۔ توبہ توبہ استغفر اللہ!

نواب ستم علی خاں قہر

وہ میری ماں کے بڑے بھائی اور میرے ماموں[1] تھے جب میں نے چاہا کہ ان پر قلم اٹھاؤں تو میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا۔ آپ ان کے حالات شوق سے لکھیں مگر ان کا نام تحریر نہ کریں صرف ایک "نواب صاحب" لکھیں اور یہ بھی ظاہر نہ ہونے دیں کہ وہ آپ کے ماموں تھے ورنہ دونوں کی بے عزتی ہو جائے گی۔ لیکن یہ سوچ کر میں نے ان کے مشورے پر عمل نہیں کیا کہ ماموں کے عیب سے بھانجا متاثر نہیں ہو سکتا اور ماموں کا عیب تو ایک قطعی نفسیاتی بیماری کا نتیجہ تھا اور نفسیاتی بیماری کو عیب میں شمار نہیں کیا جا سکتا اس لئے میں نے ان کا نام اور اپنا رشتہ بیان کرنے میں پس و پیش سے کام نہیں لیا۔

وہ بہاسعت و طول پور کے سب سے بڑے جاگیردار تھے ان کی شادی نواب صاحب رامپور کے خاندان کی دہری بیگم سے ہوئی تھی جو شادی کے کچھ روز کے بعد ماموں سے روٹھ کر رامپور چلی گئی تھیں اور پھر کبھی پلٹ کر نہ آئیں۔

ماموں جان شاعری میں میر تفضل اور دوسیات میں مفتی میر محمد عباس کے شاگرد تھے رئیسوں کو بالعموم علم سے کوئی سروکار نہیں ہوتا مگر وہ علم کے پرستاروں میں سے تھے فارسی، عربی، ہیئت، منطق، حکمت، موسیقی، تاریخ، تفسیر، احادیث، علم کلام، اسماء الرجال، طب اور کیمیا پر ان کو اسقدر عبور حاصل تھا کہ بڑے بڑے علماء و صوفیا ان سے فیض حاصل کیا کرتے تھے۔ اسی کے دوش بدوش وہ اس قدر متقی بھی تھے کہ کبھی ان کی ایک وقت کی نماز بھی قضا نہیں ہوئی تھی اور سحری کے بعد ہمیشہ آنسوؤں سے روتے دکھا کرتے تھے۔

ان کے سر پر پٹے اور منہ پر گھنی داڑھی تھی جسے کبھی ایک بار بھی نہیں منڈوایا تھا۔

وہ سنی سے شیعہ ہو گئے تھے۔ تعزیہ داری، مرثیہ گوئی اور عزاداری میں ان کے یہاں حد غلو تھا عمر کے آخری حصہ میں وہ صوفی ہو گئے تھے اور ہندوستان بھر کے عرسوں میں بڑے خشوع و خضوع کے

---

[1] میرے تین سوتیلے ماموں نواب محمد اکرم علی خاں اور نواب محمد احسن علی خاں تھے، افسوس کہ ان سب کا انتقال ہو چکا ہے ان میں سے میرے بڑے ماموں نواب اکرم علی خاں کی شادی ایک ہز ہائی نس کی لڑکی کے ساتھ ہوئی تھی ـــــ وہ ممانی بھی اب دنیا سے سدھار گئی ہیں۔

ساتھ شریک ہوا کرتے تھے لیکن علم کی اس جامعیت اور تقشف کی اس شدت کے باوجود ان کو بے حد شوق تھا دروغ گفتاری کا۔ آغاز تاریخ سے لے کر اس عالم کون و فساد میں جس قدر بھی دروغ گو انسان ہو چکے ہیں وہ ان سب سے قطعی طور پر مختلف تھے ان کی دروغ گوئی کسی مادی فائدے کے حصول کا ذریعہ نہیں بلکہ مقصود بالذات تھی۔ یعنی دروغ انکا ایک ایسا عجیب گھوڑا تھا جس پر وہ قطع مسافت کے لئے نہیں بلکہ فقط جلب مسرت کے واسطے سوار ہوتے اور سود کے بجائے زیان حاصل فرمایا کرتے تھے اور اسی جذبہ میں مبلغ شش ہزار سالانہ برائے پرورش کذب کی بھی ایک مد ہوا کرتی تھی اب میں آپکو ان کے چند واقعے سناتا ہوں جس سے "برائے پرورش کذب" کی بات سمجھ میں آجائے گی۔

ایک بار وہ بلیح آباد تشریف لائے میں نے اپنے ایک دوست مختار احمد خاں کی پریشانی کا حال ان سے کہا۔ انھوں نے فرمایا مختار کو بلاؤ۔ مختار آئے تو انھوں نے بگڑ کر کہا، تو بے حد نالائق ہے تو نے آج تک مجھ سے اپنی پریشانی کا حال نہیں کہا تیرا باپ میرا دوست ہے میری زندگی میں تو مصیبت اٹھائے یہ ہو نہیں سکتا میں اجمیر شریف ہوتا ہوا دسمبر کی سترہویں کو دھول پور پہونچ جاؤنگا تو اٹھارویں کو دھول پور آجانا میں تجھ کو آٹھ دن کے اندر مہاراجہ دھول پور کی سرکار میں نوکری دلوا دونگا۔ مختار نے ان کی اس بے حد شفقت سے متاثر ہو کر ان کا شکریہ ادا کیا اور یہ وعدہ کر کے کہ میں اٹھارویں کو دھول پور پہونچ جاؤنگا، چلے گئے۔

ان کے جاتے ہی انھوں نے مجھے حکم دیا کہ مختار کو دوبارہ بلا بھیجو مختار سامنے آئے تو انھوں نے کہا، ایک نالائقی تو تو نے یہ کی کہ مجھ سے اپنا حال نہیں بتلایا اور تیری دوسری نالائقی یہ ہے کہ تو نے مجھ سے کرایہ طلب نہیں کیا یہ کہہ کر انھوں نے اپنے خادم خاص محمد کو آواز دی اور اس سے کہا میاں مختار کو دو سو روپیے لا دو انکی اس بے کراں سرپرستی سے مختار کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور جب مختار اٹھنے لگے تو انھوں نے بطور تاکید کہا دیکھو بیٹا سترہویں کو ضرور دھول پور پہونچ جانا یہ کہہ کر انھوں نے اپنا منھ پیٹ لیا اور توبہ توبہ کر کے فرمایا میں نے جلدی میں سترہویں کہدیا یہ بات منھ سے غلط نکل گئی اللہ اس بیغرارادی جھوٹ کو معاف فرمائے دیکھو سترہویں کو نہیں اٹھارہویں کو دھول پور پہنچ جانا، سمجھ گیا؟ سترہویں کو نہیں اٹھارہویں کو آجانا اور اس یقین کے ساتھ آنا کہ آٹھویں دن تو ضرور نوکر ہو جائے گا۔

مختار ٹھیک اٹھارویں دسمبر کو دھول پور پہنچ گئے، کوٹھی کے ایک آراستہ کمرے میں ان کو

---

۱ یہ شدت اس لئے اختیار کی گئی تھی کہ یہ بات مختار کے دل میں ترازو ہو جائے کہ وہ کس قدر شدت کے ساتھ راست گفتار آدمی ہیں۔

ٹھہرادیا گیا۔ ادھر خدمت گار ان کے واسطے مختص کر دیئے گئے، نہایت اعلیٰ درجہ کا کھانا اور ناشتہ آنے لگا اور ایک سواری مختص کر دی گئی ان کی سیر کے واسطے۔ اب کیا تھا مختار رئیسانہ زندگی بسر کرنے لگے اور نواب صاحب نے اس بات کا مزہ لینا شروع کر دیا کہ مختار کو یقین ہے کہ میں اس کو دلی کے اندر ملازمت دلادوں گا حالانکہ میں اس کو نوکری دلواؤں گا ہی نہیں ہے۔

جب مختار کو دھول پور آئے ہوئے آٹھواں دن ہو گیا تو وہ صبح ہوتے ہی تیار ہو کر بیٹھ گئے کہ آج نواب صاحب ضرور نوکری دلادیں گے لیکن جب شام ہو گئی تو انھیں معلوم ہوا کہ نواب صاحب آگرے تشریف لے گئے ہیں۔

اور جب اس متواتر کشمکش و پیچ میں چار مہینے گزر گئے تو مختار نے جی کڑا کر کے نواب صاحب کو ان کا وعدہ یاد دلایا، نواب صاحب نے کہا کیا کروں استخارہ نہیں آرہا ہے جس دن استخارہ آجائیگا اس دن تم نوکر ہو جاؤ گے مختار نے کہا میں تو آپ کے سائے میں بڑی آرام کی زندگی بسر کر رہا ہوں لیکن میرے اہل و عیال...... یہ سنتے ہی نواب صاحب نے چھاتی پیٹ لی کہا۔ مجھ سے بڑی چوک ہو گئی یہ کہتے ہی محمد کو حکم دیا کہ جب تک میاں مختار کی نوکری نہیں لگتی دو سو روپئے ماہانہ ان کی بیوی کے نام منی آرڈر کرتے رہو۔

مختار کے سر سے بڑا بار اتر گیا اور نواب صاحب ہر رات کو تکئے پر سر رکھ کر اس بات کا مزہ لوٹنے لگے کہ اس بات کا مختار کو یقین کامل ہے کہ میں استخارہ آتے ہی اس کو نوکر رکھا دونگا حالانکہ میں اس کو کبھی نوکر رکھاؤں گا ہی نہیں۔

الغرض آٹھ آٹھ دن کے وعدوں اور استخارہ کی امیدوں پر انھوں نے کچھ اوپر دو برس تک مختار کو اپنے گھر مہمان رکھا اور ہر ماہ ان کے گھر منی آرڈر بھی جاتا رہا۔

اور آخر کار ان کو اس نیم کے نیچے لے جا کر جس کو آخری جھوٹ سینچا کرتا تھا[1] انھوں نے مختار کو ایک ہزار روپیہ دے کر کہا تم کچھ روز کے لئے اپنے بال بچوں سے مل آؤ استخارہ آتے ہی میں تم کو ڈبل تار دے کر بلا بھیجونگا اور نوکری دلادوں گا حالانکہ یہ ایک امر طے شدہ ہے کہ میں اس کو نوکری دلاؤنگا ہی نہیں۔ صرف مختار ہی نہیں سیکڑوں آدمی اسی طرح ان کے گھر مہمان رہے اور بعض تو آٹھ آٹھ دن کے وعدوں پر آٹھ آٹھ برس امیدواری کر کے اور ایک ایک ہزار روپیہ لے کر رخصت ہو گئے اور وہ "حالانکہ" کا مزہ لوٹتے رہے۔ ایک بار وہ ملیح آباد تشریف لائے اور شام کو لکھنؤ جاتے وقت یہ فرما گئے کہ کل رات کو پلٹ آؤں گا میرے لئے کھانا بھی پکوا کر رکھنا، میں انکا مزاج شناس ہو چکا تھا میں نے کوٹھی نہیں پکوائی اور اسٹیشن پر سواری بھی...

---

[1] اس کے بعد وہ نیم خشک ہو کر رہ گئی

میں سمجھ گیا ماموں لکھنؤ میں لیٹے اس بات کا مزا لے رہے ہونگے کہ بھانجے نے سواری بھیجی اور گھوڑا بھی پکڑوالی ہوگی "حالاں کہ" میں ملیح آباد جاؤں گا ہی نہیں۔

ایک بار انھوں نے لوہے کی نو سلاخوں پر سونا چڑھوا دیا اور ایک سلاخ ٹھوس سونے کی بنوائی ان سلاخوں کو لے کر وہ اپنے لکھنؤ کے ایک نواب دوست کے وہاں پہونچے اور فرمایا کہ میں کربلائے معلیٰ کی زیارت کے لئے جا رہا ہوں یہ سونے کی دس سلاخیں اپنے توشہ خانے میں رکھا دیجئے واپسی پر لے لونگا لیکن اپنے سنار پر مجھے اعتبار نہیں ہے۔ اس لئے کسی معتبر سنار کے پاس بھیج کر جنچوا لیجئے کہ ان میں کھوٹ تو نہیں ہے اور جب لکھنوی دوست اس پر آمادہ ہو گئے تو انھوں نے سونے کی ٹھوس سلاخ ان کے آدمی کے حوالے کر دی اور سنار نے جانچ کر تصدیق کر دی کہ وہ خالص ٹھوس سونے کی ہے۔

اور جب تین ماہ کے بعد وہ کربلا سے پلٹے اور ان دوست سے ملنے گئے تو انھوں نے توشہ خانے سے وہ سلاخیں منگائیں اور کہا، نواب صاحب چوں کہ آپ نے جنچوا کر یہ سلاخیں رکھی تھیں مجھے اپنے ملازموں پر اعتبار نہیں، اس لئے ایک سلاخ دے دیجئے تاکہ میں اس کو سنار کے وہاں بھیج کر جنچوا لوں۔ نواب صاحب نے لوہے کی پالش شدہ سلاخ ان کے حوالے کر دی اور جب سنار نے یہ کہلا بھیجا کہ یہ لوہے کی سلاخ ہے جس پر سونے کا پانی چڑھا ہوا ہے تو ان کے لکھنوی دوست کے ماتھے سے عرق انفعال ٹپکنے لگا اور وہ اس بات کا مزہ لوٹنے لگے کہ نواب صاحب سمجھ رہے ہیں کہ میں کربلا گیا تھا" حالانکہ "میں کربلا گیا ہی نہیں اور اس کے ساتھ ساتھ میرے دوست کو اس بات کا بھی یقین ہے کہ ان کے نوکروں نے میری دس ٹھوس سونے کی سلاخیں اڑا کر ان کی جگہ پر لوہے کی سلاخوں میں سونا پھیر دا کر رکھ دیا ہے "حالاں کہ" ایک کے علاوہ کوئی سلاخ سونے کی تھی ہی نہیں۔

لکھنؤ کا ذکر ہے ایک بار میں سید نجم الحسن صاحب قبلہ کی خدمت میں بیٹھا تھا کہ ایک منی آرڈر آیا پانسو روپے کا، روپے گن کر قبلہ و کعبہ نے مجھ سے فرمایا کہ یہ منی آرڈر آپ کے ماموں جان نے بھیجا ہے کوئی پندرہ روز ہوئے کہ وہ لکھنؤ تشریف لائے تھے اور مجھ سے فرمایا تھا کہ انکی جیب کٹ گئی ہے، میں ان کو دو سو روپیہ بطور قرض دے دوں چنانچہ یہ منی آرڈر اسی سلسلہ میں آیا ہے لیکن دو سو روپیہ کے عوض انھوں نے پانچ سو بھیج دیئے ہیں میں یہ روپیہ واپس کر دونگا میں نے کہا آج رات کو میں ڈھول پور جا رہا ہوں انھوں نے ماموں کے نام خط لکھ کر وہ تین سو روپیہ میرے حوالے کر دیئے میں ڈھول پور پہونچا ماموں جان نانا کے پاس بیٹھے تھے میں نے قبلہ و کعبہ کا خط اور یہ کہہ کر وہ تین سو روپیئے ان

کے حوالے کر دیئے کہ آپ نے قبلۂ کعبہ سے صرف دو سو قرض لئے تھے لیکن پانچ سو روپے کا منی آرڈر بھیج دیا! اس پر انھوں نے یہ ترائد۔ قم واپس کر دی ہے نانا جان نے بھڑک کر کہا کیوں، رستم علی تو قرض مانگتا اور مجھے بدنام کرتا پھرتا ہے۔ انھوں نے کہا میری جیب کٹ گئی تھی اس لئے قرض مانگنا پڑا لیکن میں نے دو سو نہیں ایک سو ننانوے قرض لئے تھے اور یہ کہہ کر وہ دل ہی دل میں اس بات کا مزہ لیتے کہ حالانکہ "میری جیب نہیں کٹی تھی لیکن میں نے قبلہ اور والد گرامی دونوں کو جیب کٹنے کا یقین دلا دیا اور "حالاں کہ" میں نے پورے ۲ دو سو روپیہ لئے تھے مگر بقدر یک روپیہ دھوکہ دے کر ایک سو ننانوے کا یقین دلا دیا۔

ایک بار عرس میں شریک ہونے کے واسطے وہ اجمیر شریف تشریف لے گئے وہاں ایک جوان اور گدیدی طوائف حشمت جہاں سے ان کی مڈبھیڑ ہو گئی اور انھوں نے اپنے چشم و ابرو سے حشمت جہاں کو یقین دلا دیا کہ میں تجھ پر بری طرح عاشق ہو گیا ہوں اور انھیں اپنا عاشق صادق دیکھ کر وہ معشوقانہ ادائیں دکھانے لگی تو وہ اس بات کا مزہ لوٹنے لگے کہ یہ بیوقوف مجھ کو اپنا عاشق سمجھ رہی ہے حالانکہ میں اس کا عاشق ہوں ہی نہیں اور پھر اس "حالاں کہ" کا مزید لطف اٹھانے کے لئے انھوں نے اس سے فرضی نکاح بھی کر لیا اور اسکو اس کے بیٹے بھانجی بھانجے سمیت لے کر دھولپور لے آئے اس کو اپنے گھر کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا لیکن چونکہ وہ شریعت کے سختی کے ساتھ پابند تھے انھوں نے اسے کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ طوائف تادم مرگ کوئی پچیس ۲۵ تیس ۳۰ برس تک ان کے گھر بھر پر مسلط اور ان کے مال و متاع پر قابض رہی اور وہ اس پچیس ۲۵ تیس ۳۰ برس کی طویل مدت تک اس کا مزہ لیتے رہے کہ اس طوائف کا بیٹا مجھکو ابا جان کہہ رہا ہے اور وہ طوائف مجھکو اپنا شوہر سمجھ رہی ہے، حالاں کہ نہ میں اس لڑکے کا ابا جان ہوں نہ اس طوائف کا شوہر۔

کیسا یہ کرۂ ارض اور یہ عالم کون و فساد اپنی تمام حیرت ناکیوں کے باوجود اس نوعیت کے کذب کی کوئی نظیر پیش کر سکتا ہے اور تمام نوع انسانی میں سے ایک فرد بھی آج ایسا گذرا ہے جس نے علم و فضل اور تقشف و طہارت کے باوجود دروغ بافی سے اس قدر لطف اٹھایا ہے

شوم فدائے دروغے کی راست مانند است!

چھدّو خاں

ملیح آباد کے بڑے زمینداروں میں سے تھے زندگی بھر ریل میں نہیں بیٹھے، جب کبھی مقدمات کی پیروی کے لئے لکھنؤ یا اپنے موضع کی "تحصیل دستوبی" کے واسطے شاہجہاں پور جاتے تو ادھے[1] پر سفر کیا کرتے تھے آگے آگے ان کا ادّھا ہوتا تھا اس کے پیچھے تین ادھے اور ہوتے تھے جن پر کھانے کا سامان، بکرے اور سپاہی لدے ہوا کرتے تھے۔ لاکھ لاکھ لوگوں نے سمجھایا کہ ریل پر سفر کیا کیجئے مگر انھوں نے کبھی کسی کی بات نہیں مانی اور ہمیشہ یہ کہا کہ خاں صاحب! جو سواری ہمارے اشاروں پر نہیں چلی رکتی اس پر بیٹھنا بیکار ہے۔

ان کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ جو شخص ان کے غصے بھر کی یا گالی کا فوراً جواب نہیں دیتا تھا اس کو وہ پٹھانوں کے زمرے سے خارج کر کے اس سے قطع تعلق کر لیا کرتے تھے۔

اور تیسری خصوصیت یہ تھی کہ جو ملازم ان کے پکارتے ہی دو سکنڈ کے اندر اندر حاضر نہ ہو جائے وہ اسے چھڑا دیا کرتے تھے اور اسی بنا پر "نادر شاہی" حکم کی طرح "چھدّو خانی" حکم دور دور تک مشہور تھا۔

ان کا یہ ایک بندھا ٹکا اصول تھا کہ جب کوئی پٹھان ان کے پاس نوکری کے لئے آتا تھا وہ مسکرا کر اس سے پوچھتے تھے کہ آپ خدمت گاروں کے زمرے میں آسکیں گے؟ اور جب وہ جواب دیتا کہ ہم پٹھان ہیں خدمت گاری سے تو ہمارے باپ دادا بھی نہیں واقف تو وہ خوش ہو جاتے اس کے متعلقین کے بارے میں دریافت کرتے کہ وہ سب کس قدر ہیں، اور جب معلوم ہو جاتا تو اس کے بال بچوں کی تعداد پر نگاہ کر کے وہ اس کی اسی قدر تنخواہ مقرر کر دیتے اور چونکہ خشک تنخواہ[2] کے وہ قائل نہیں تھے اس لئے وہ پوچھتے تھے کہ خاں صاحب آپ کتنی روٹیاں کتنی دال اور کس قدر گوشت کھائیں گے اور کتنا دودھ پئیں گے؟۔ اور جب وہ جواب دیتا میں آٹھ روٹیاں اور پاؤ بھر گوشت کھاؤں گا اور آدھ سیر دودھ میں میرا کام چل جائے گا تو وہ اپنے منشی قمر الدین خاں کو حکم دیا کرتے تھے، "قمری، دارد" یعنی اے قمر الدین خاں اس کا نام فہرست ملازمان میں درج کر لو مع خوراک۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک بار ان کی بیوی نے کہا کہ تیس سپاہی کی روزانہ آٹھ روٹیاں مقدر کی گئی تھیں اس کے دستر خوان سے آج ایک روٹی بچ کر آ گئی ہے۔ وہ یہ سن کر باہر آئے اس سپاہی کو بلایا اور کہا خاں صاحب آج آپ نے ایک روٹی کم کھائی ہے یہ بات ہمارے

---

[1] چھوٹی بیل گاڑی۔

[2] تنخواہ بے خوراک۔

آپ کے معاہدے کے خلاف ہے۔ سپاہی نے کہا حضور آج میری طبیعت خراب تھی انھوں نے کہا نہیں کھا سکتے تھے تو اپنی بچی روٹی گھر لے جاتے یہ کہہ کر انھوں نے اپنے منشی قمرالدین خاں کو پکارا اور ایسے کہا۔ "قمری یہ خانصاحب نہ دارد" (یعنی یہ برخواست کر دیئے گئے) سپاہی نے بڑی لجاجت سے کہا حضور! مجھے "نہ دارد" نہ کریں، ایک ماہ بعد پھر دارد ہو جائیں گے۔

ایک مرتبہ انھوں نے خدمت گار کو پکارا، خدمت گار دو تین منٹ کے بعد آیا، انھوں نے پوچھا، دیر کیوں کی؟ اس نے کہا پانی بھر رہا تھا انھوں نے کہا میرے پکارتے ہی تم پر یہ بات لازم ہو گئی تھی کہ کسی کہ فوراً ہاتھ سے چھوڑ کر دوڑ پڑتے اتنا کہہ کر انھوں نے حکم دیا، قمری، یہ خدمت گار نہ دارد"۔ .... وہ سال میں تین مرتبہ غریبوں کو کھانا کھلایا کرتے تھے، ایک بار انھوں نے تمسخر کے طور پر کسی غریب آدمی سے پوچھا کبھی ایسا کھانا تمھارے باپ نے بھی کھایا تھا، اس نے کہا میرا باپ جو کھانا کھاتا تھا وہ آپکے باپ نے بھی نہیں کھایا ہوگا، انھوں نے پوچھا تمھارے باپ کیا کھاتے تھے؟ اس نے کہا جوار کی سوکھی روٹی اور چٹنی، وہ ہنس پڑے اور کہا تم سچ کہتے ہو اگر تم مجھکو پلٹ کر جواب نہ دیدیتے تو میں تم کو ابھی ابھی نکلوا دیتا۔

ایک مرتبہ ان کے ایک خدمت گار نے آکر ان سے کہا کہ حضور، آپ کے رحیم الدین خاں سپاہی آج یہ کہہ رہے تھے کہ چھدو خاں کی نادر شاہی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی اب کی تنخواہ مل جائے تو میں ان کی نوکری چھوڑ دونگا اور نہ چھوڑوں تو میرے نطفے میں فرق ہو۔ یہ سن کر انھوں نے رحیم الدین خاں کو بلایا اور کہا خاں صاحب آپ کی مستعدی سے ہم بہت خوش ہیں آج سے آپکی تنخواہ دگنی کر دی جاتی ہے، مزے سے رہیئے اور پکار کر کہا۔ "قمری! یہ خاں صاحب آج سے دگنے دارد" سپاہی خوش ہو گیا اور بے حد جی لگا کر کام کرنے لگا اور جب وہ ایک مہینے کام کر چکا انھوں نے اسے بلا کر دونی تنخواہ دے دی اور قمرالدین خاں سے کہا "قمری رحیم الدین خاں کو آج سے نہ دارد" رحیم الدین خاں نے پوچھا حضور میری کیا خطا ہے تو انھوں نے کہا آپ نے کچھ دن پہلے کہا تھا کہ اب چھدو خاں کی نوکری کروں تو میرے نطفے میں فرق ہے لیکن جب میں نے تنخواہ دونی کر دی تو آپ نے لالچ میں آکر اپنے آپ پر گالی چڑھا لی بس اب آپ جائیں" قمری! نطفے کا فرق "نہ دارد"۔

ایک بار ان کے سپاہی نے شکایت کی کہ حضور پرسوں سے میرا دودھ نہیں آرہا ہے وہ غصے میں بھرے گھر پہنچے اور اپنی بیوی سے گرجتی آواز میں کہا اشرف کی ماں تم نے چھدو خاں کا دودھ بند کر دیا ہے ان کی بیوی نے کہا کیا کروں تین بھینسوں نے دودھ دینا چھوڑ دیا

سلہ وہ "دارد" اور "نہ دارد" کے الف کو پورا کھینچ کر زبان پر لاتے تھے۔ "دارد" اور "نہ دارد"

ہے۔ صرف ایک بھینس دودھ دے رہی ہے اس کا دودھ کثرت کے بعد اشرف پی لیتا ہے انھوں نے کہا اشرف خاں دودھ پیئیں اور داتّہ کو دودھ نہ ملے اچھا ابھی چھٹی کا دودھ یاد دلائے دیتا ہوں باہر آکر انھوں نے للکار کر کہا قمری چاروں بھینس نہ دارد قمر الدین خاں حیرت سے انکا منھ تکنے لگے انھوں نے کہا میرا منھ کیا تک رہے ہو قمر الدین خاں نے کہا بھینسوں کا "نہ دارد" میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے، انھوں نے کہا اس کے یہ معنی ہیں کہ فوراً قصائیوں کو بلاؤ اور چاروں بھینسوں کو ذبح کرا ڈالو قمر الدین خاں ان کے بڑے پرانے خیر خواہ تھے انھوں نے کہا بھینسوں کو کس خطا میں ذبح کر ڈالا جائے گا، انھوں نے کہا اشرف کی ماں نے ہمارے "داتّہ" کا دودھ "نہ دارد" کر دیا ہے۔ اس لئے ساری حرام زادی بھینس "نہ دارد" قمر الدین خاں لاکھ لاکھ چیختے رہے مگر انھوں نے چاروں بھینسیں ذبح کرا کے ان کا گوشت غریبوں میں کھڑے کھڑے تقسیم کرا دیا۔

ایک دن وہ اپنے باغ میں بیٹھے قمر الدین خاں سے باتیں کر رہے تھے کہ ان کے بیٹے اشرف خاں نے آکر سلام کیا، انھوں نے پوچھا لکھنؤ ہو آئے بیٹے نے کہا جی ہاں ابھی ابھی لکھنؤ سے آیا ہوں اور آپکو سلام کرکے گھر جاؤں گا اتنے میں انکی نظر بیٹے کی جوتی پر پڑ گئی جامے سے باہر ہو کر پوچھا اس جوتے کا کیا نام ہے، بیٹے نے کہا، باوا اس کا نام ہے "ڈاسن"[1] انھوں نے کہا، پٹھان کا پوت اور نخری جوتی، اس جوتی کی ماں کی ... قمری نکال چاقو اور ٹکڑے ٹکڑے کر دے اس چھنال جوتی کے، یہ ڈاسن کی جوتی اشرف کی پھٹنو کی کو ڈس لے گی اور جوتی کو کٹتے ٹکڑے دیکھ کر جب اشرف خاں کی آنکھوں میں آنسو آگئے تو انھوں نے کہا۔ ایسے زنخے جورو کے..... دور ہو جا میری نظروں سے اور جب اشرف خاں سر جھکا کر اندر چلے گئے تو انھوں نے، قمری! اشرف "نہ دارد" قمر الدین خاں اچھل پڑے ان کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا، پوچھا، خاں صاحب بہادر بیٹا اور "نہ دارد" یہ کیونکر ہو سکتا ہے انھوں نے کہا وہ نہ دارد ہو سکتا ہے عاق ہو جانے کے بعد قمر الدین خاں نے کہا، اتنی ذرا سی بات پر۔ انھوں نے کہا، یہ ذرا سی بات ہے؟ میں نے اسے گالی دی اس نے پلٹ کر جواب نہیں دیا قمر الدین خاں ان کی ضد سے واقف تھے دوڑے ڈیوڑھی پر گئے اور لونڈی سے کہا بڑا غضب ہو گیا، خاں بہادر اشرف خاں کو عاق کر دینے پر تل گئے ہیں جلدی بی بی کے پاس جا کہہ وہ انھیں گھر بلا کر سمجھا دیں۔ گھر میں کہرام مچ گیا لونڈی نے ڈیوڑھی سے پکار کر کہا میاں آپ کو بیوی بلا رہی ہیں وہ اندر گئے تو بیوی نے سر پیٹ کر کہا ہے ہے یہ کیا اندھیر ہے ایک نگوڑی جوتی پر بچے کو عاق کیے دے رہے ہو انھوں نے کہا یہ نگوڑی جوتی کی بات نہیں میں نے اس کو گالی دی وہ پی گیا، پلٹ کر مجھکو گالی نہیں دی اگر وہ اصلی پٹھان ہوتا تو فوراً مجھے بھی گالی دیتا

---

[1] بیٹے کا نام

ان کی بیوی نے کہا ارے یہ تو سوچو بیٹا باپ کو گالی کیسے دے سکتا ہے انھوں نے کہا یہی تو تمھاری بھول ہے پٹھان، باپ تو باپ، اللہ کو گالی کو برداشت نہیں کر سکتا اشرف سے کہو مجھے پلٹ کر گالی دے نہیں تو، ان کی بیوی نے منت کر کے بیٹے سے کہا ارے تو بھی گالی دے دے جب بیٹے نے پس و پیش کیا تو انھوں نے کہا، دیکھ ایک دو تین کہتا ہوں اگر تین پر گالی نہیں دیگا تو اپنے سات پشتوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ کھڑے کھڑے عاق کر دوں گا یہ کہہ کر انگلی اٹھائی اور کہا ایک، بیٹا چپ رہا، پھر انھوں نے کہا دو، انکی بیوی نے بیٹے کے منھ پر تھپڑ مار کر کہا دے دے گالی نہیں تو دودھ نہیں بخشونگی اور جب انھوں نے بڑے عزم کے ساتھ انگلی اور سر اٹھا کر کہا تین تو اشرف نے کہا، ابے زنخے جورو کے ...... تو انھوں نے دوڑ کر بیٹے کو گلے لگا لیا، منھ چوما اور پیٹھ پر ٹھونک کر کہا تو پٹھان، تیرا باپ پٹھان تیرا دادا پٹھان۔ اور گھر سے نکل کر بڑی گرجتی آواز میں کہا، قمری، اشرف "دارد"۔

میرے معاشقے

پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں زنانہ ازلی، بسم اللہ کے گنبد میں پالا گیا تھا اور میرے باپ نے مجھکو اس بے پایاں احتیاط کے ساتھ پروان چڑھایا تھا کہ آج کل اس احتیاط کے ساتھ لڑکیوں کی بھی پرورش نہیں کی جاتی ہے ...... اور اسی بنا پر مجھ میں کنواری لڑکیوں کی سی جھجک پیدا ہو گئی تھی اور کسی مردانہ جرأت کا تو ذکر ہی کیا مجھ میں اس قدر شرمیلا پن پیدا ہو گیا تھا کہ جب اپنے باپ کی بھری محفل یا کسی مشاعرے میں جاتا تو دل دھڑکنے اور پنڈلیاں کانپنے لگتی تھیں۔ اور یہ

گوری دھیرے سے چلو، گگریا چھلک نہ جائے

کا عالم طاری ہو جایا کرتا تھا۔

میرے انتہائی شرمیلے پن کے سیکڑوں واقعات میں سے فقط ایک واقعہ سن لیجئے اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ میں نام خدا کس حد تک شرمیلا تھا۔

لکھنؤ کا ذکر ہے میرے باپ کہیں باہر تشریف لے جا چکے تھے کہ ایک روز شام کے وقت مجھ سے کہا، میرے باپ کی ڈیوڑھی کے ایک رنگین مزاج تماش بین منہ چڑھے سپاہی، سبحان علی خاں عرف سبحن نے مجھ سے کہا، منجھلے بھیا، چلئے آج آپ کو چوک گھما لائیں۔

میں ان کے ساتھ ہو لیا اور وہ مجھکو لئے ہوئے ایک طوائف کے کوٹھے پر چڑھ گئے۔ طوائف پر نظر پڑتے

ہی مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ بلا کی حسین تھی۔ میں قیامت کا شرمیلا، اس کی جوانی بھرپور، میں شرم سے سے چکنا چور۔ میرے اندر چھپے ہوئے شاعر نے کہا اس کے مکھڑے سے نظریں نہ ہٹاؤ اور میری تربیت نے حکم دیا کہ آنکھیں نہ ملاؤ۔ تربیت کا حکم غالب آیا اور میں ہڑبڑا کر فرش پر بیٹھ گیا میری لانبی لانبی پلکیں جلدی جلدی جھپکنے لگیں اور فراوانیٔ شرم سے اس کے کمرے کے قالین کے ریشے نوچنے لگا۔

طوائف کے مجرے تو بارہا دیکھ چکا تھا لیکن طوائف کا چہرہ ابھی تک نہیں دیکھا تھا اسلئے بدن میں کپکپی پیدا ہو گئی طوائف تو چنچل چلبلی، چٹاخ پٹاخ تماش بینوں کی خوگر تھی مجھ کو سر کے لے کر پاؤں تک دیکھنے لگی جس طرح کوئی سلوتری گھوڑے کو آنکتا ہے۔ تھوڑی دیر تک تو وہ مجھے گھورتی رہی لیکن جب میں ٹس سے مس نہیں ہوا تو اس سے رہا نہیں گیا، اور اپنا ماتھا اس نے اوپر چڑھا کر کہا "اے ہے صاحبزادے میرا تو جی اب اوبھا جا رہا ہے۔ اے اللہ کچھ تو منہ سے بولئے سر سے کھیلئے۔

اُس کے ایسا کہنے سے میں اور بھی شرما گیا اور میرے قالین کے ریشے نوچنے کی رفتار اور تیز ہو گئی سجن نے کہا "منجھلے بھیّا" میں نے ہاتھ کے تحکمانہ اشارے سے انہیں روک دیا اب وہ طوائف میرے نزدیک آ گئی میری ٹھوڑی میں ہاتھ ڈال کر کہا ہے ہے کیا چپ شاہ کا روزہ رکھ کر آئے ہیں آپ ارے للہ کچھ تو بولئے، میری چھاتی پھٹی جا رہی ہے اس کی اس التجا سے مجبور ہو کر آپ جانتے ہیں میں نے کیا جواب دیا؟ نہیں آپ اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ سنئے مجھ سے۔

میں نے کن انکھیوں سے اسکو دیکھا اور شیشے کی طرح درکتی آواز میں ـــــ رک رک کر اس سے کہا کہ ایک مہینہ کے بعد میرا امتحان شروع ہونے والا تھا۔ اللہ سے دعا کیجئے کہ میں پاس ہو جاؤں میری یہ التماس سن کر طوائف ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ گئی اور سجن بھی پیٹ پکڑ کر ہنسنے لگے۔ میں زمین میں گڑ کر رہ گیا۔

طوائف نے ہنسی کے دورے سے نجات پائی تو میری طرف بڑی شوخی سے نگاہ اٹھائی اور کہا، صاحبزادے یہ طوائف کا کوٹھا ہے خواجہ غریب نواز کی درگاہ نہیں اور میرے ماتھے سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ جس طرح ایک چاول کو دیکھ کر پوری دیگ کا پتہ چلا لیا جاتا ہے اسی طرح مندرجہ بالا ایک واقعہ سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میری اٹھان کیسی تھی،

جی ہاں، میرے باپ نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، مجھ کو "وہ" بنا دینے میں جس کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی اصطلاح میں "جوانِ صالح" اور اہلِ نظر کی زبان میں "مخنّث" کہا جاتا ہے۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں جس کو اللہ رکھے اسے کون چکھے میرے باپ کی یہ تمنا پوری نہیں ہوئی اور قدرت کی ہمت و غیرت نے یہ بات کسی طرح بھی گوارا نہیں فرمائی کہ میں شاعر کے بجائے مولانا بخش اللہ بن کر رہ جاؤں۔ مطرب کو چھوڑ کر، موذن سے دل لگا دوں، مکھڑوں کے تلوں

سے نظر بچا کر تسبیحوں کے دانے گھماؤں، صہبا کے شیشوں سے قرابت کا رشتہ کاٹ کر اُن شگوفوں کے ڈھیلوں سے اپنا شجرہ نسب ملاؤں۔ شراب کے پیالوں میں تیمم کے بدلے وضو کے بدھنوں میں غوطے کھاؤں اور کالی زلفوں میں گھیری چھاؤں سے بھاگ کر سفید داڑھیوں کی چلچلاتی دھوپ میں جا کر بیٹھ جاؤں۔ کس قدر صادق آتا ہے یہ شعر مجھ پر ع

کوئی کمی نہ کی تھی دلِ بے قرار نے
مجھ کو بچا لیا میرے پروردگار نے

اب سنئے میری گھٹن کیونکر دور ہوئی اور قوت و حیات کی بے پایاں شفقت نے "اندک اندک عشق در کار آور دبیگانہ را" کے طور پر مجھے کس حکیمانہ توقف و تدریج کے ساتھ فردوسِ ادب کی جانب موڑا۔۔۔۔ سب سے پہلے میرے ذوقِ جمال کو مرتب و مہذب بنانے کی نیت سے اس نے افق کا گریبان پھاڑ کر نازل کر دیا مجھ پر طلوعِ صبح کا قرآن۔۔۔۔ اب کیا تھا مشرق کی زریں دھاریوں سے اترنے لگے میرے ذہن پر آیات پھولوں کے الوان کے رنگ و بو سے اڑنے لگے میرے سر پر جبرئیل مرغانِ سحر کے چہچہوں سے گونجنے لگی میری محرابِ وجود میں نغماتِ داؤد۔ اور آنے لگی ہر طرف سے یہ آواز ع

ادب سے دیکھ چمن میں بہاریں پھولوں کی
جھلک رہی ہیں پیشانیاں رسولوں کی

اسی کے دوش بدوش اس نے سیپیوں، قمقموں، جھاڑ کے قلموں، حریر و پرنیاں کے تھانوں، انگیٹھیوں کے انگاروں، چاندی کی ریزگاریوں، سونے کی اشرفیوں اور تتلیوں کے پروں کی دھاریوں پر چھا دیں میری نگاہیں۔

پھر وہ لے آئی میرے سامنے، چاندنی راتیں، دمکتے ستارے، جھلکتے چاند، بھری برسات کی کالی گھٹائیں، کوکو، پی ہو کی صدائیں اور رم جھم رم جھم بھیگی ہوائیں۔

اور جب یہ سب بھیگ گئیں میری مسیں تو اس معلمہ نے موڑ دیئے میری جانب کاکل و رخسار کے گنگا جمنی دھارے کڑکا دی میرے سر پر توجہ اس نے جوانیوں کی زریں کمانیں۔ اور چلانے لگی میرے دل پر شامِ اودھ اور صبحِ بنارس میں ڈھلے ہوئے نکیلے مکھڑوں کے بان۔ اور پھر ع

عشق جنبید زخواب و فتنہ برہم زد
فتنہ برپا شد و نشتر برگِ آدم زد

کے بعد میری عملی تربیت کا آغاز کر دیا گیا۔

سب سے پہلے یہ واقعہ پیش آیا کہ ہمارے گھر کی کسی تقریب میں ایک پٹاخا سی کمسن، اور بلور اندام طوائف مجرے کے لئے آئی، اس کے گالوں کی جلد بنارسی ساری کے مانند باریک تھی ناک کی نتھ بتا رہی تھی کہ ابھی تک اس کا پنڈا کورا ہے اور اس کے شلوکے میں ہلکا سا جھول

پڑنا شروع ہو گیا تھا معاذ اللہ!

جب اسکی پتلی انگلیوں میں کھلاوٹ کا باب میرے تار وجود پر مچلنے لگی، مضراب اور جب وہ ناچتے ناچتے بالکل قریب میرے آگئی اور انعام کے لئے بیٹھ گئی تو اس کی شربتی پشواز کا ملائم سرا میرے ہاتھ کی پشت سے مس ہو کر اس طرح سرسرایا کہ میری پور پور میں تیز بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ اٹھنے لگی ایک بھاپ سی میرے مسامات سے ہوا سنکنے اور پو سی پھٹنے لگی میرے جسم کے اندر ے

اک دامن حریر کے لمس خفیف سے
لو دے اٹھا ہے خون رگ جاں کبھی کبھی

یہ تھا میرا پہلا آپریشن، جو برگ یاسمن کی دھار سے کیا گیا تھا اب سنئے دوسرا واقعہ لڑکپن سے لے کر جوانی تک مجھ پر درد سر کا دورہ پڑا کرتا تھا ایک دن جب درد سر کا دورہ پڑا تو رجیا میرا سر دبانے لگی، وہ کھڑی بیل کی سرو قامت شہابی رنگ والی چودہ برس کی رجیا ہمارے گھر کے چوکی دار بدلو گدی کی بیٹی تھی۔

سر دبانے میں وہ بار بار میرے منھ کی طرف جھکی تو اس کی سانسوں کی کچی خوشبو میرے دل میں چبھنے لگی اور اس کی ملائم ملائم ہتھیلیوں کی میٹھی میٹھی گرمی ایک ایسے جزیرے میں لے گئی مجھے جہاں پکے اناروں پر بھونرے منڈلا رہے تھے ـــ اور سیکڑوں قوس قزح کی سی باہیں میری گردن میں پڑتی چلی جا رہی تھیں اور اس کا یہ اثر ہوا کہ میرا درد میرے سر سے منتقل ہو کر دوڑنے لگا میری پور پور میں میں نے رجیا کی طرف نظر اٹھائی اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور ابھی اس کے آنکھوں کے ڈوروں کی زبان کھلی ہی تھی کہ میری ماں کی مغلانی ہماتی خانم آ گئیں اور وہ طلسم یہ بھرتے ہوئے ٹوٹ کر رہ گیا۔ جناب والا یہ طلوع صبح کی جگمگاہٹوں سے لے کر رجیا کی ہتھیلیوں کی گرماہٹوں تک کے تمام واقعہ تو ایسے تھے جیسے ڈھیلے بانوں کی مار ـــ اب سنئے گھن کا ماجرا۔

ایک دن جب گلابی جاڑے کی نوخیلی صبح اپنے بستر پر بیٹھی آنکھیں مل رہی تھی میرا تمام گھر حسب دستور محو خواب اور میں حسب عادت بیدار ہو کر اپنی انگنائی کے ہرے بھرے نیم کے نیچے کھڑا جھوم رہا تھا کہ نیم کے قریب میں کی کوٹھری میں رہنے والی جوبنٹی لونڈی جھورن میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور بے مجھے گھورنے لگی اور جب میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں ایک نا قابل فہم رنگین سی ملتجاہٹ ہے اس کے ہونٹوں میں ابھار میں ایک نامعلوم سا تقاضا ہے اور اس کا ٹھڈی تک ابھرا سینہ، گہری سانسوں کے گرداب میں اوپر نیچے ہو رہا ہے تو میں نے پوچھا جھورن کیا بات ہے اس نے کہا اے جنتی ٹولا کے منجھلے بھیا میری کوٹھری میں ذری بہ چلے چلو تو بات

بتاؤ میری کوٹھڑی بڑی گرم گرم ہے۔
مروت کے مارے انکار نہیں کر سکا وہ آگے آگے چلی میں اسکی گرم سانسوں میں لپٹا ہوا کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔
کوٹھڑی میں قدم رکھتے ہی کڑوے تیل کی خوشبو سے میری سانسیں بوجھل ہو گئیں۔ چراغ کی بامروت روشنی نے میرے کان میں ایک ایسی بات کہی جسے میں سمجھ نہیں سکا۔
ظہورن نے بڑے چاؤ اور بلا کے سبھاؤ کے ساتھ کہا منجھلے بھیا ذری لیٹ جاؤ میں تمھارے پاؤں داب دوں ــــ میں بڑی معصومیت کے ساتھ لیٹ گیا اس نے مجھ پر رضائی ڈال دی ــ اور رضائی کے اندر ہاتھ ڈال کر بڑے نپے تلے انداز سے میرے پاؤں دابنے لگی تھوڑی دیر پاؤں دابتی رہی اور اس کے بعد...... میں نے تڑپ کر کہا ارے یہ کیا ظہورن اس نے اپنے سیدھے بات سے میرا منھ بند کر دیا اور ارے اللہ، ارے اللہ، ارے اللہ نعرے لگانے لگی ؎ من خدا ئے بت شوخ کہ بہنگام وصال
بمن آموخت خود آئینِ ہم آغوشی را (مولانا شبلی)
اس گھن یا یوں کہیئے کہ اس آپریشن کے بعد میری بے جا حیا کا مادۂ فاسد کلیتہً نہ سہی لیکن بڑی حد تک میرے جسم سے نکل گیا، اور پھر موڑ دی قدرت نے میری باگ، جادہ، عشق بازی کی جانب۔ دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند[۵۱]
بندہ پرور ایک بار نہیں، میں اٹھارہ بار عشق کر چکا ہوں۔
لوگ کہتے ہیں قیامت آئے گی تو کوئی زندہ نہیں رہے گا لیکن مجھے دیکھئے کہ اٹھارہ قیامتیں میرے سر سے گذر چکی ہیں اور ابھی میں زندہ ہوں اور شاخ حیات پر اونگھا نہیں۔ عوطا بلکہ جی بھر کے آج بھی چہچہا رہا ہوں ۔ آفریں باد بریں ہمت مردانہ ما !!
اپنے معشوقوں کے ذکر سے پہلے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ چند ایسی اہم باتوں پر روشنی ڈال دوں کہ غلط فہمیوں کا امکان باقی نہ رہے۔
۱۔ سب سے پہلے اس امر کو ذہن نشین کر لیجئے کہ جہاں تک کہ محبوبوں کے دل موہ لینے کا تعلق ہے میرا ایک معاشقہ بھی ناکام نہیں رہا۔ اور یہ بات صرف یہیں تک نہیں رہی بلکہ یہاں تک بھی ہوا کہ حسین عورتوں نے خود میرے سے عشق کیا اور بعض نے تو یہاں تک مجھ کو چاہا کہ مجھ میں نازِ معشوقہ پیدا کر دیا آپ میرے ان مندرجہ ذیل اشعار کو دیکھیں (جو میرے مجموعوں میں طبع ہو چکے ہیں) تو میرے قول کی تصدیق ہو جائے گی۔

---

[۵۱] گلو گرفتگی

سنہ ۱۹۲۰ء

میری پرستش اور تیری بزم ناز — آفریں اے شاہد عاشق نواز
اک مرے دل کی تسلی کے لئے — زلزلے میں آگئے اور تمکین ناز
یہ ترا رخ اور گرد خستگی — یہ تبسم لب اور حرف سوز و ساز
آہ سوزاں اور تیرے لعل لب — اشک خونیں اور تیری چشم ناز
جس کے قدموں پر ہو خود فطرت کا سر — وہ بڑھے اور مجھ سے ملنے کو نماز

سنہ ۱۹۲۰ء

ہنوز یاد ہے وہ رنگ اضطراب ترا — بھرا تھا درد کے نغموں سے جب رباب ترا
وہ ابتدائے محبت کی تند راتوں میں — بساطِ غم پہ مچلتا ہوا شباب ترا
وہ آنسوؤں کے دھندلکے میں چشم تر بیہوشی — وہ کروٹوں کے تلاطم میں فرش خواب ترا
وہ بات بات میں چھالا سا اک جھپک اٹھنا — نظر جھکا کے وہ لہجہ دم خطاب ترا
وہ تیر زلف کے خم سے میری پریشانی — وہ اپنی سانس کی خوشبو سے اضطراب ترا
قزہ کی طرح جھپکتا ہوا وہ میرا سوال — وہ دل کی طرح دھڑکتا ہوا جواب ترا

سنہ ۱۹۳۰ء

دل نے بخشا تھا تقاضائے زلیخا تجھ کو — یاد ہے وہ خلش عہد تمنا تجھ کو
ہر گھڑی میری حضوری کی تمنا تھی تجھے — ہر نفس میری جدائی کا تھا دھڑکا تجھ کو
راستے سے کوئی آواز جب آجاتی تھی — میری آواز کا ہو جاتا تھا دھوکا تجھ کو
تھرتھراتا تھا مرا درس تحمل تجھ پر — زہر لگتا تھا مرا وعدۂ فردا تجھ کو

۳۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرے غم ناقدین میری معاشقانہ شاعری کے باب میں یہ کہتے ہیں کہ اس میں میر تقی میر اور فانی بدایونی کا سا غم نہیں پایا جاتا۔

اگر ناقدین غور سے میری معاشقانہ شاعری پر نگاہ ڈالیں تو انھیں پتہ چل جائے گا کہ عنصر غم کا اس میں کمی نہیں لیکن میرے اور حضرت میر وغیرہ کے غم میں فرق یہ ہے کہ ان کا غم شکستگی دل پر اور میرا غم معشوقوں کی مفارقت پر مبنی تھا میرے کلام میں ہجر کی جھلکیاں تو فرد گونجی ہوئی ہیں مگر شکست دل کی جھنکار کا رونا کیوں کر موجود نہیں ہے۔ اب آپ خود ہی انصاف کریں جس کا دل کبھی توڑا ہی نہ گیا ہو وہ شکست دل کا رونا کیوں کر رو سکتا ہے۔

جناب عالی! روتے دھوتے تو وہ ہیں جنہیں معشوق منہ نہیں لگاتے دربانوں سے انکو ذلیل کراتے ان کی آنکھوں کے سامنے غیروں سے چھاتی سے لگاتے اور بڑی بے حیائی کے ساتھ عاشق کی زبان

سے کہلاتے ہیں ۵ لے شب وصل غیر بھی کاٹی تو مجھے آزمائے گا کب تک

اگر بدنصیب دشمناں میں جوانی میں ایسے شرمناک حادثہ کا شکار ہو جاتا تو خدا کی قسم بے حیا معشوق اور سالے رقیب دونوں کو موت کے گھاٹ اتار کر رکھ دیتا۔

۲۔ دوسری بات یہ کہنا ہے کہ میں اس نکتے سے بخوبی واقف ہوں کہ عاشقی پر سماں پڑتی ہے ایک تو معشوق کی بے اعتنائی و کج ادائی پر نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ عاشق پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے

(الف) اس سے عاشق احساس کمتری کا جذبہ زبوں ہو کر رہ جاتا ہے اور قدر شدت کے ساتھ کہ جب وہ آئینہ دیکھتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی غارتشینا یعنی کتا اس کے روبرو کھڑا دم ہلا رہا ہے۔

(ب) احساس کمتری کے گھن سے شیشۂ انا کے چکنا چور ہو جانے کے بعد اس کا دل اس قدر بجھ جاتا ہے کہ قرابت داروں اور یاروں کو منہ دکھانے سے جھجکنے اور شرمانے لگتا ہے اور گوشہ نشین ہو جاتا ہے۔

(ج) جب اس کی غم میں ڈوبی ہوئی گوشہ نشینی پر ایک مدت گزر جاتی ہے تو اس کے دل میں اقرباء و احباب کی جانب سے یہ گمان پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ سب کے سب بھی میرے معشوق کے مانند سراسر نامہربان اور سراپا ناقابل اعتماد ہیں اور بعض اوقات تو فانی بدایونی کی طرح وہ تمام عالم کو اپنا دشمن سمجھنے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ معاشرے کے واسطے ایک زہر ملا انسان بن جاتا ہے۔

(د) اس تمام صورتِ حال کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ اگر اس کے عشق میں جان کم ہوتی ہے تو رفتہ رفتہ اس کے عشق پر اداس پڑ جاتی ہے اور گاہ گاہ کی ایک آہِ سرد کے سوا کچھ اور باقی نہیں رہتا لیکن اگر عشق قوی اور حوصلہ ضعیف ہوتا ہے تو وہ آہستہ آہستہ گھل گھل کر مر جاتا ہے اور حوصلہ بھی عشق کے مانند قوی ہو تو خودکشی کر لیتا ہے یا خود معشوق کو موت کے گھاٹ اتار کر رکھ دیتا ہے

۳۔ آیئے اب دوسری شق یعنی سازگار و غم گسار معشوق کی جدائی کے اثرات پر نگاہ ڈالیں جدائی دو قسم کی ہوتی ہے ایک طویل، ایک مختصر۔۔۔ طویل یادوں میں شعلہ بار دریائے وار جذبات رکھنے والا عاشق یا تو کڑھ کڑھ کر مر جاتا ہے یا خودکشی کر لیتا ہے یا عاشق میں اگر زیادہ حدت نہ ہو تو کچھ روز تڑپتے رہنے کے بعد اس کے جذبات پر اوس پڑ جاتی ہے اور بالآخر صبر آ جاتا ہے اور کہنے لگتا ہے کہ

طول فرقت سے بہت بے تابیاں کم ہو گئیں۔

اور پھر :-

اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں

کا عالم طاری ہو جاتا ہے لیکن گاہ گاہ کی جدائی اس سے قطعی مختلف ہوتی ہے۔ وہ عشق کو فاقوں سے نہیں مارتی اسے غذا دیتی ہے وقت کو ٹھہرا اور زندگی کو ٹھٹھرا دینے والی یک رنگی سے بچاتی ہے اور متواتر عیش و تسلسلِ قربِ محبوب کے تیخ کدے سے بار بار باہر نکل کر شعلۂ عشق کو ہوا دیتی ہے۔

قدرت کو چونکہ مجھے زندہ اور بشاش رکھنا اور مجھ سے کام لینا تھا اس لئے اس نے بڑی توسط آمیز دیدہ دری کے ساتھ مجھ کو معشوقوں کی جان لیوا بے اعتنائی اور ولولہ سوز طویل جدائی کے تہلکوں سے ہمیشہ محفوظ رکھا اور اسی کے ساتھ ساتھ میری ذہنی پرورش و تربیت کی خاطر یہ انتظام بھی کر دیا کہ مجھ کو بار بار مفارقت سے ڈسوایا، لیکن کبھی مفارقت کو اس قدر طویل نہیں ہونے دیا کہ سارا کھیل ہی بگڑ کر رہ جائے اور اس مشفقانہ و مدبرانہ صورتِ حال نے ایک حکیمانہ توازن قائم کر کے مجھ کو زمزمہ و شیون، کرب و کیفیت اور نیش و نوش کے بین بین رکھا اس طرح عشرت دریدگی و حزن گزیدگی دونوں سے بچا لیا۔

طغیان نازبین کہ جگر گوشۂ خلیل
آرد بزیر تیغ و شہیدش نمی کند

اب رہا یہ بات کی میں نے قیس و فرہاد کے مانند ایک لیلیٰ اور ایک شیریں سے عشق کرنے کے بدلے، اٹھارہ معشوقوں سے عشق کیوں کیا؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ عمر بھر کے واسطے کسی ایک کو اپنا کر رکھنا اور کسی کا ایک ہو کر رہ جانا میرے بس کا روگ نہ تھا اس لئے کہ میرے نزدیک صورتِ حال معشوقیت کو زوجیت کے بیسلے خانے میں قید کر دینے کی بدمزاقی، بہتے پانی کو بند کر دینے کی عفونت انگیزی جذبات نہ ہو کا احتیاس قانونِ لغزات کی خلاف ورزی ذوقِ تنوع کی بے توصلگی نفسور کی تہی و سطلی اور تخیل کا افلاس ہے۔

اس لئے میری طبع رواں نے یہ جمود اختیار نہیں کیا اور "بہتا دریا، جوگی چلتا اچھا" کے جادے پر ہمیشہ گامزن رہا۔ پروانہ کبھی نہیں بنا۔ کہ

پھر نہ کچھ دیکھا بجز یک شعلۂ پر پیچ و تاب
شمع تک تو ہم نے بھی دیکھا کہ پروانہ گیا

کی سی کھوکھلی داستانِ عبرت بن کر رہ جاتا، اس کے برعکس میں نے بھونرے کی زندگی کو اپنا ہر گل نو دمیدہ پر منڈلایا، اس کا گن گایا، اس کی خوشبو پی، اس کا رنگ چکھا، اس پر کانی

گھٹاؤں کے سائے بن گایا ، گونجا اور پھر یہ کہتا ہوا اڑ گیا :-

در ہیچ مقام نہ گزار دبد رنگے

از بوئے ہوئے بر داز رنگ برنگے

مجھ پر جمال نے بار بار جال پھینکے ، میں بار بار گرفتار ہوا اور ہر بار یہ کہتا ہوا جال سے نکل گیا کہ :-

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں

جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

اگر قیس و فرہاد کا کوئی جانشین یہ ارشاد فرمائے کہ جوش صاحب معاف فرمائیے کیجئے اس صورت حال کو عشق نہیں عیاشی کہتے ہیں تو میں یہ جواب دوں گا کہ بھئی مجھ کو میرے اس اہتمام کی متعلق خبر نہیں کہ میں نے عشق و عیاشی کو ہمیشہ ایک بہت بڑے احترام آمیز فاصلے پر رکھا ہے اور ان قلبی و جسمانی دھاروں کے مابین میں نے ایک ایسا پردہ ہمیشہ حائل رکھا ہے کہ وہ کبھی اور کسی عالم میں کبھا ایک دوسرے سے ہم آغوش نہیں ہونے پائے جی ہاں میں نے جی بھر کے عیاشی کی ہے لیکن اس طرح کہ رات ہوتے ہی اس کی شمع جلائی اور صبح ہوتے ہی بجھا دی دیکھو عیاشی کا وطن تنے انہیں دیا بلکہ اسے ایک رات کا مسافر خانہ بنائے رکھا اور ایسا مسافر خانہ جس پر صبح کی پہلی کرن بھی نہیں ٹپتو سی ۔ میں نے کسی آوارہ یا بازاری عورت سے بھی ایک بار بھی عشق نہیں کیا اور زندگی میں ایک بار بھی ان کے انتظار میں چشم براہ و گوش بر آواز بن کر نہیں بیٹھا۔

البتہ عشق کو میں نے کلیجے سے لگایا سر آنکھوں پر بٹھایا ، راتیں جلائیں پچھاڑوں پر پچھاڑیں کھائیں ہچکیوں سے دل کو ڈسایا ، تڑپایا ، تلملایا ، نکیئے بھگوئے پلکوں میں آنسو پر وکے ، تارے گنے اور تلواروں کی دھاروں پر کروٹیں بدلیں ، جان لیوا خطروں کو ٹھوکر لگائی موت کے سامنے آنکھیں نہیں جھپکائیں اور ایک دن تو یہاں تک ہوا کہ میں مانسون کی ہیجانی موسم میں اس امر کے باوجود کہ میں تیرنا نہیں جانتا الا اللہ کہہ ، ہو نکتے سمندر میں جھم سے کود پڑا ۔

بندہ نواز اپنے کو اگر ایسے ہولناک تہلکے میں ڈال دینا عیاشی ہے تو خدا کے واسطے بتائیے کہ پھر عشق نام ہے کس چڑیا کا ؟

جی ہاں ، ، میں نے عیاشی کی ہے جی بھر کر ، لیکن عشق بازی کی ہے جی سے گزر کر ۔ عیاشی نے میرے جسم کی کھیتیاں لہلہائیں ، عاشقی نے میرے ذہن کی کلیاں چٹکائیں ۔ عیاشی نے لذات حواس سے دوچار کیا عاشقی نے نشاط شعور سے سرشار کیا عیاشی نے گردن کو نقرئی بانہوں سے اُجالا عاشقی نے گردن میں قوس قزح کا زریں ہار ڈالا ۔

عیاشی نے موج ہائے رنگا رنگ میں ترایا ۔ عاشقی نے گرداب جوئِ جگر میں گھمایا ،

عیاشی نے نقدِ ٹھکروں کی چاندنی دکھائی۔ عاشقی نے میرے سامنے انفس و آفاق کی نقاب اٹھائی۔ عیاشی نے میرے حیوان کو تھپتھپایا۔ عاشقی نے میرے انسان کو جگایا اور قلب گداختہ کی دولتِ بیدار مرحمت فرماکر مجھ کو شاعری اور حب نوع انسانی کا راستہ دکھایا۔

میرا جسم بھی متمول ہے۔ میری روح بھی مالامال ہے اب کمی کس چیز کی رہی ہے۔

خدا کے فضل سے یوسف جمال کہلائے — اب اور چاہیئے کیا ہو سپہری جل جائے

اس قدر طویل یعنی ضروری دیباچہ پڑھ چکنے کے بعد آئیے میرے صحیفۂ عاشقی کی سعادتِ قرأت حاصل فرمائیے

لیکن یہ بھی سن لیجئے کہ اب میرا حافظہ اس قدر گھٹا ٹوپ ہو چکا ہے کہ اپنے بہار سے اٹھارہ معشوقوں کو بیان نہیں کرسکتا بہت سے واقعات قطعی بھول چکا ہوں اور جو یاد بھی ہیں وہ بھی وہ بھی آدھے بجلا چکے ہیں اس لئے نیم حافظہ نشیں معاشقوں ہی پر روشنی ڈال سکونگا۔

دہرائی جائے گی نہ اب داستانِ عشق — کچھ وہ کہیں سے بھول گئے ہیں کہیں سے ہم

اے حافظے ہر قدم پر ساتھ نہ چھوڑنا ہر موڑ پر منھ نہ موڑنا اور نظام جبر ما اے عظیم دکار فرما آفاقی توانائی اور اے شہر آفاق اور نا معلوم شہریار، اے گلوں کو رنگ و بو، بلبلوں کو باد کھٹاؤں کو امنگ بھوروں کو ترنگ برہمنوں کو نیاز بتوں کو ناز شاعروں کو دلولہ نگاہ حسینوں کو جمال مہر عطا فرما ہے تو نے میری جوانی کو عاشقی پر مامور فرمایا تھا تیرے حکم سے مجال نہ تھی تجھکو سرتابی کی۔ اور اب جب کہ میں تیری فرمانبرداری کرکے بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اربابِ منبر و محراب مجھ سے کہتے ہیں اے روسیاہ تو نے عبادت کے عوض ساری جوانی گنوادی کافر زلفوں کے سائے میں یوں اے سیاہ کار، کیا جواب دیگا قیامت کے روز۔ تیار ہو جا دہکتی آگ کے واسطے میں دراز ریش بچوں سے کیا الجھوں۔ صرف اس قدر کہونگا کہ اگر مجھ کو دوزخ میں جھونکا گیا تو میں اس کے پھاٹک کی محراب پر آتشیں حروف میں یہ عبارت کندہ کردونگا کہ زمین ہی طرف آسمان پر عدل و انصاف کا کوئی پتہ نہیں پایا جاتا۔

بچو کفر از کعبہ برخیزد، کجا ماند مسلمانی!

چور سے کہو چوری کرے شاہ سے کہو تاکتا رہے۔ قربان اس معدلت گستری کے۔

اَلَا یَا اَیُّہَا السَّاقِی اَدِرْ کَاساً وَّ نَاوِلْہَا۔

کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا۔

ہائے میں اپنی داستانِ محبت کیوں کر لکھوں۔ حافظے کے ایوان میں بڑی تاریکی ہے خدارا واپس آجاؤں۔ اے میری جوانی کے گونجتے، گرجتے، کھٹکتے، گنگناتے، چہچہاتے۔ اور

ہاں ہاں برس پڑو اے شب غم کے قطرو برس پڑو اور میرے برگ حیات سے ٹپک پڑو میرے لمحو۔ رنگین و شاداب بنا دو بتانے، میرے دیدوہ خشک سے، اے آنسوؤں کی بوندو۔ ابل پڑو، اے میری ترنگوں کے خشک چشموں گرج اٹھو میرے سفید سر پر۔ اے میری برکھا کی کالی گھٹاؤ، لو دینے لگو، اے میرے شبستانوں کی بجھی شمعوں بھبوت جاؤ۔ اے میرے گلابی جاڑوں کی کرنوں جھڑی لگا دو، اے میری کھوئی ہوئی برساتو، دمک اٹھو۔ اے خوابیدہ چاندنی راتوں کوک اٹھو اے میرے امرئیوں کی خاموش کونپلیوں۔ لفطیب ہو جاؤ، دوبارہ، اے میرے رامش و رنگ کے خاک آسودہ نغموں، جھنک اٹھو اے میرے ساز شکستہ کے تاروں۔ اور جگمگا اٹھو اے مجھ پر صحیفۂ انسانیت نازل کرنے والے، نیکیلے اور صبیح مکھڑوں۔

ہائے ماہ و سال کی دبیز تاریکیوں کے اپچھے ہوئے پچھے۔ ان پچھوں کے پیچ و خم میں کہرے طرح جھلمل ہو رہے ہیں کچھ واقعات اور چند چہرے جیسے دور کے جنگل کے جگنو۔ جیسے کہرے میں بھاگتے آہو، جس طرح دل سے آنکھوں کی طرح جاتے ہوئے آنسو اور جیسے خواب کے بن میں کوئی کی کوکو۔۔۔۔ سامنے ایک رنگ و بو کا میلہ سا لگا ہوا ہے گویا تاریک جنگل میں دیئے ٹمٹمارہے ہیں کوئی لمحہ اور کوئی مکھڑا نقاب الٹ کر سامنے نہیں آرہا ہے۔

اچھا اب میں اس میلے اور دور دور کی اس لپلپاہٹوں کی لپیٹ کی جانب خود بڑھوں شاید کچھ نظر آسکے۔ لیجئے میں پچاس قدم آگے بڑھ گیا ہاں اب تو کچھ واقعات اجاگر ہو رہے ہیں۔ کچھ مکھڑوں سے نقاب بھی ہٹ رہی ہیں۔ دوربین نے بڑی مدد کی۔ ارے یہ صف اوّل میں کون کھڑا مسکرا رہا ہے؟ ہاں یہ تو "س۔ ح" کا مکھڑا ہے۔ ذرا اور قریب آؤ، میرے بچھڑے محبوب کہ تم پر قلم اٹھا سکوں بڑی مہربانی کی تم نے کہ میرے پاس آگئے۔

اب۔ آپ "س۔ ح" کے حالات سنیں۔ بسم اللہ

سلہ ان مکھڑوں کے نام:۔ س۔ ح + ع۔ ج + الف الف خ + م۔ ج + ت۔ د + ش۔ د + الف۔ ن + ک۔ د + ع۔ ج + الف۔ خ + ر۔ ب + مس میری + مس گلینسی + م۔ ب + ر۔ ک + ط۔ ج + ج۔ ب + اور ع۔ خ =

س، ح

یہ نام خنداں:- جوانی راتوں، مرادوں کے دن کا واقعہ ہے جب کہ میری عمر نے کھیل کود کے میدان سے نکل کر، میری بھیگی مسوں کے ساحل پر ابھی قدم ہی رکھا تھا کہ ایک روز چراغ جلے ایک ببھبو کا سا یورو شین لڑکا، میرے چچا کے ہاتھی پر سوار، میرے گھر کسی تقریب میں شریک ہونے کے لئے پہنچا تھا۔ وہ گلابی جاڑے کی ٹھنڈی سہانی شام، وہ جلسے کی دھوم دھام اور وہ اُمردِ گل فام۔ وہ پھاٹک پر بجتی شہنائی اور ہاتھی پر وہ اس طفل پری زاد کی رعنائی، دھری تو بولے رام دہائی۔

اگر میر تقی میر اسے دیکھ لیتے تو:- "اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں" کی رسم ترک فرما دیتے اور انشا اللہ خاں انشا- ارے رے رے۔ ارے رے رے۔ ارے رے رے کہہ کر زمین پر بیٹھ جاتے۔

ارے ہاتھی کے سر پر اس کا جھلجھلاتا ابراں چہرہ:-

بنرے پر اُنی دیک رہی تھی گویا"

میں نے اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے، مانی صاحب جالیسی سے (جواب میرے بٹو بڑکم اور بے تکلف دوست زیادہ ہو چکے تھے، کہا خدا کے واسطے اس کو میرے پہلو میں لاکر بٹھا دیجئے۔

مانی صاحب جو پہلے ہی سے اس کو دل دے چکے تھے، بڑی علیت کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور اس کو بڑے چاؤ سے لاکر میرے پہلو میں بٹھا دیا اور اس طرح کے بیٹھتے ہی میرے بائیں پہلو میں گرمی محسوس ہونے لگی اور مانی اسکو اس حسرت کے ساتھ دیکھنے لگے کہ مجھے ان پر ترس آنے لگا۔

اتنے میں ناچ گانا ہونے لگا اور طوائف ہر چند خوب رو اور کم سن تھی مگر "س۔ ح" کے مقابل کو پ چہرے کے سامنے ایسی نظر آنے لگی گویا گیس کے سنسناتے ہنڈے کے سامنے ریلوے ٹی والے کا دیا ٹمٹما رہا ہے۔

میرے کان مطربہ کی ٹھمریوں کے جھولے میں جھول رہے تھے اور میری آنکھیں اس کے گلابی چہرے سے اٹھتی ہوئی لوؤں پر رقص کر رہی تھیں اور ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا عرب کی "ہزار راتیں" اس ایک رات میں سمٹ کر آ گئی ہیں۔ میں نے اس پر اس طرح نظریں جما دیں کہ اس کے رخساروں کی جلد میں سوئیوں کی طرح چبھنے لگیں۔ اس نے مڑ کر مجھے دیکھا ایک ہی نظر میں جان گیا میرے دل کا عالم۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ یوں مسکرایا کہ میرے سر پر بنارس کی صبح طالع ہو گئی۔ اور "ہم تم ہمارے ہم تمہارے ہو گئے" کا بغیر ملفوظ پیمان ہو گیا اور ہمارے چہروں کے رنگ میں آپی تلواروں کی دھار چمکنے لگی اور دونوں پر ایسی ربود طاری ہو گئی کہ زبانوں سے ایک حرف بھی نہیں نکل سکا۔

اور جب پچھلے پہر محفل برخواست ہونے لگی اس نے بڑے لونج کے ساتھ مجھ سے کہا ہاتھ ملایا اور خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گیا۔

اس کے جاتے ہی خیمہ بھائیں بھائیں کرنے لگا، ہر گوشے سے ہائے ہائے کی صدائیں آنے لگیں اور بجھی ہوئی مشعلوں کا دھواں میری آنکھوں میں لگنے لگا۔

جب مانی بھی ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ رخصت ہو گئے، محل سرا میں آکر بستر پر دراز ہو گیا بستر کی شکنوں میں دھار پیدا ہو گئی، لاکھ لاکھ کروٹیں بدلیں، نیند نہیں آئی۔ میری زندگی میں وہ عشق کی رات تھی۔

اتنے میں گھڑیال نے چار بجے کا گجر بجایا، ٹھن ٹھن ٹھن ٹھن، اور چلنے لگا میرے دل پر گھن۔ یہ سوچ کر کہ اب نیند نہیں آنے کی، بستر سے اٹھا، پڑھنے کے کمرے میں گیا اور کتاب اٹھالی کہ اس سے جی بہلاؤں۔

کتاب کے ورق پر خیمہ نصب ہو گیا، مجرا ہونے لگا، حروف کا پنے پھیلے شیشے کی محراب بن گئے اور اس محراب میں "س۔ح" کا چہرہ دمکنے لگا۔

آپ بھی وہ شعر سن کر لیں کہ میری عاشقانہ شاعری کی ابتدا انھیں سے ہوئی۔

آئیں اسکول کے احباب سیف درد میرا ۔۔۔ گرم کر دے گا لہو، ہر نفس سرد میرا
ایک تنکا بھی اگر آنکھ میں پڑ جاتا ہے ۔۔۔ آدمی ہے کوئی ایسا جسے چین آتا ہے
چین لینے دیں بھلا کیا مجھے ایسی آنکھیں ۔۔۔ جن کے پردوں میں سمائی ہوں کسی کی آنکھیں
اپنی آنکھوں کی اذیت کو بھلا دیتا ہوں ۔۔۔ میز سے بڑھ کے کتاب ایک اٹھا لیتا ہوں
روبرو آنکھ کی جس وقت کتاب آتی ہے ۔۔۔ اک جھلک صفحۂ قرطاس پہ پڑ جاتی ہے
دیر تک کچھ نظر آتا نہیں بجلی کے سوا ۔۔۔ دفعتہً ہوتی ہے ہر سطر میں جنبش پیدا
حرف دبے جاتے ہیں کچھ دیر میں رفتہ رفتہ ۔۔۔ صاف کھنچ جاتا ہے ہر لفظ پہ چہرہ ان کا

صبح ہوتے ہی مانی صاحب کے وہاں پہنچا۔ وہ دادا میاں کی بارہ دری کے پھاٹک کے اوپر والے کمرے میں رہتے تھے میں نے زینہ طے کر کے دروازہ کھٹکھٹایا اندر سے۔ رہانسی آواز آئی "کون" میں نے اپنا نام بتایا دروازہ کھل گیا وہ میرے گلے لگ کر رونے لگے میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے پوچھا کیا بات ہے انھوں نے کہا کیا پوچھتے ہو رات کو اس نے میری طرف نگاہِ غلط انداز سے بھی نہیں دیکھا۔

بھرتی رہیں وہ آنکھیں پلکوں کے سائے سائے

ان کا دل رکھنے کی خاطر میں نے کہا مانی صاحب یہ بات نہیں ہے، اس نے آپ کی طرف کئی بار

نگاہ اٹھائی، آپ ایسے منھ لٹکائے بیٹھے تھے کہ دیکھ نہیں سکے۔

یہ سن کر انکا چہرہ بشاش ہوگیا اور کہا "تیری آواز مکے اور مدینے"

انھوں نے پوچھا تمھاری چھٹیاں کب ختم ہو رہی ہیں۔ میں نے کہا پرسوں انھوں نے کہا تو میں "س۔ح کو پرسوں تمھارے پاس لے کر آؤں گا لکھنؤ میں۔

اس کے تیسرے روز میں لکھنؤ پہونچ گیا اور پہونچنے کے دوسرے ہی دن مانی صاحب آگئے آتے ہی انھوں نے بڑے اہتمام سے خط بنایا دیر تک غسل کیا اور ناشتہ کر کے جب باہر جانے لگے تو کہا آج شام کو اسے لے کر میں تمھارے پاس آؤں گا۔

اس کے تیسرے روز میں لکھنؤ پہونچ گیا اور پہونچنے ہی کے دوسرے دن مانی صاحب آگئے آتے ہی انھوں نے بڑے اہتمام سے خط بنایا دیر تک غسل کیا اور ناشتہ کر کے جب باہر جانے لگے تو کہا آج شام کو میں اسے لے کر باہر آؤں گا ان کے جاتے ہی میں اپنے مکان کی صفائی و آرائش میں مشغول ہو گیا ہر گوشے میں جھاڑو دلائی، میز پر کرسیاں بچھوائیں، گملوں میں پانی ڈلوایا چھت گیری درست کرائی چھت میں لٹکے ہوئے قمقموں کو دھلوایا، لیمپ صاف کرائے اور نیا لیمپ خرد وایا جس میں جھاڑ کے سے رنگین قلم لٹکے ہوئے تھے ایک موتیوں کی جھلجھلاتی چک خریدی اسے زینے کے بالائی دروازے پر لٹکا دیا۔

آرائشوں سے فارغ ہو کر کوئی تین بجے لیٹ گیا تاکہ آرام کرنے سے چہرے پر تازگی آجائے پانچ بجے بستر سے اٹھا کٹی کور صابون سے خوب مل مل کر نہایا چالیس ہزار مارکہ کی چھالیٹن کا پائجامہ اور بنارسی ریشم کا کرتا پہنا، کرتے میں حنا کا عطر ملا اور ہمہ تن انتظار ہو کر بیٹھ گیا

غلغلہ ہے جو ان کے آنے کا ——— رنگ دیکھو غریب خانے کا

روح کو آئینہ دکھاتے ہیں ——— در و دیوار مسکراتے ہیں

آج گھر گھر بنا ہے پہلی بار ——— دل میں ہے خوش سلیقگی کی بیدار

جمع سامان ہے عیش و عشرت کا ——— خوف دل میں فریب قسمت کا

سوز قلب کلیم آنکھوں میں ——— اشک امید و بیم آنکھوں میں

چشم بر راہ، شوق کے مارے ——— چاند کے انتظار میں تارے،

جب دن ڈوب گیا، سائے بھاری اور ملگجے سے ہو گئے، ٹھنڈی ہوا دبے پاؤں چلنے لگی، وقت کے منھ پر سانولاپن دوڑ گیا۔ مدھماتی شام اور دودھ کی بیٹی رومانی فضا کے ماتھے پر مچلنے لگیں اور لیمپوں کی روشنی ہمکنے لگی تو خدا خدا کر کے نازک قدموں کی آہٹ سے زینہ بجنے لگا۔ میں چھلانگ لگا کر زینے کے دروازہ پر پہنچ گیا اور دیکھا کہ نام خدا "س۔ح" چلا آ رہا ہے

اور مانی ایک مرید یا مصاحب کے مانند اس کے پیچھے پیچھے آرہے ہیں میرا دل بلبلوں اچھلنے لگا۔ سیڑھیوں سے اوپر آتے ہوئے اس کا چہرہ ایسا معلوم ہوا گویا آفتاب ابھر رہا ہے اور یوسف کی پیشانی کنوئیں کی جگت سے طلوع ہو رہی ہے اوپر آکر جب اس نے مجھ سے مسکرا کر ہاتھ ملایا تو میرے وجود کے مینارے پر شہنائی سی بجنے لگی۔

مانی صاحب نے شکریہ طلب آنکھوں سے مجھے دیکھا میری پلکوں کی جھپک نے انکا شکریہ ادا کیا۔

اب ہم جگمگ جگمگ کمرے میں آگئے "س۔ح" میرے پہلو کی کرسی پر بیٹھ گیا اور مانی باورچی خانے چلے گئے۔ اور مجھ پر یہ

یوں ہم اس شوخ کو پہلو میں لئے بیٹھے ہیں
کوئی دیکھے تو یہ سمجھے کہ پیئے بیٹھے ہیں

کا عالم طاری ہو گیا، اتنے میں مانی آگئے، علی شیر خاں سپاہی اور نوروز باورچی نے میز پر مٹھائیوں میووں پھلوں کی بھری پلیٹیں، بالائی کی قابیں اور چائے کا سامان چن دیا۔ جب کھانا پینا ہو چکا تو کمرے پر گہری خاموشی طاری ہو گئی، میں نے لاکھ لاکھ کوشش کی مگر بولا نہیں گیا الفاظ کو زبان پر کھینچ کر لاتا تھا تو وہ راستے ہی میں گر پڑتے تھے۔ یعنی ۔ کل ان کے آگے شرح تمنا کی آرزو
اتنی بڑھی کہ نطق کو بیکار کر دیا

میں نے گھبرا کر اسے دیکھا اس نے میری جانب نگاہ اٹھائی اور جھپکتی پلکیں باتیں کرنے لگیں اس جمود کو توڑنے کی نیت سے مانی صاحب نے کہا، سب کہنے کی باتیں ہیں اور کچھ بھی نہ کہا جاتا، ہم دونوں نے شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔

پھر مانی صاحب نے کہا شبیر اپنی وہ نظم تو سناؤ:-
دفعتہً ہوتی ہے ہر سحر میں جنبش پیدا

میں نے جی کڑا کر کے وہ نظم سنائی ہر چند وہ تھا بو روشین مگر لکھنؤ کی ماں کی گود میں پلا ہوا تھا اس نے جی کھول کے مجھے داد دی اور مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت آمیز حیرت ہوئی کہ میرے اشعار اس کی آنکھوں کے پردوں میں چھپ رہے ہیں۔ مانی سے رہا نہیں گیا اپنے اظہار عشق کی خاطر انھوں نے کہا میری ایک تازہ غزل بھی سن لیجئے۔ میں نے کہا ارشاد۔

اور انھوں نے ایسی درد بھری بھیگتی ٹھہر ٹھہر کر بہتی اور چھالے کی طرح تپکتی آواز میں اپنی غزل سنائی گویا ایک کلیجہ ہے جو مل مل کے دامن کی طرح برابر پھٹتا ہی چلا جا رہا ہے اس کے بعد جی کڑا کر کے میں نے س۔ح سے پوچھا کیسا مزاج ہے اس نے ذرا سا مسکرا

کمر کہا ۔ اچھا ہاہوں ۔ ہائے اس اچھا ہاہوں کی مٹھاس ۔

اب اس نے کہا اجازت ہے ۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کیا جواب دوں میں نے گھبرا کر کہا اچھا کیا جائیے گا اس نے بڑی نرمی سے کہا اگر آپ اجازت دیدگے تو میں نے بڑی بے کسی کے ساتھ سر جھکا کر کہا بہت اچھا ۔

اور جب وہ گلے لگ کر چلا گیا تو مانی اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے ۔ میں نے کہا کہئے کیسے مزاج ہے انھوں نے غصّہ میں سر اٹھا کر کہا میں تم سے بات کرنا نہیں چاہتا ارے ڈوب مرنے کی بات ہے کہ معشوق جانے کی اجازت طلب کرے اور عاشق صاحب بہادر اکھڑپن سے ارشاد فرمائیں اچھا کیا جائیے گا اس اچھا کیا جائیے گا کی ایسی کی تیسی پٹھان لاکھ لکھنؤ میں پروان چڑھے مگر لٹھ ہی رہتا ہے لٹھ نر الٹھ ۔

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود
گرچہ با آدمی بزرگ شود

ان کی اس ڈانٹ پھٹکار سے میں کٹ کر رہ گیا اور دل ہی دل میں لعنت بھیجنے لگا اپنے اجڑپن پر ۔

اور اس بڑھاپے میں بھی " اچھا کیا جائے گا " کا لٹھ پن جب یاد آجاتا ہے تو اپنے پر لعنت کرنے لگتا ہے ، اچھا کیا جائیے گا ، پر شیطان کی پھٹکار ، ایک بار نہیں ہزار بار ۔

ع ۔ ن

سیتا پور برانچ اسکول میں ہم دونوں ہم جماعت تھے ۔ پورا کلاس ایک محمل تھا اور اس کی ذات لیلیٰ ۔ ہر لڑکا چاہتا تھا کہ اس کا دوست بن جائے اس کا غرور حسن کبھی کو منھ نہیں لگاتا تھا ۔ صرف لڑکوں ہی کی نہیں ۔ اساتذہ کی نظریں بھی اس کی طرف بار بار اٹھتی تھیں لیکن وہ ۔

بمکتب می رود طفل پری زاد — مبارک باد مرگ نو با ستاد

کبھی کی طرف نگاہ نہیں اٹھاتا تھا ۔ غرور حسن کے ساتھ ساتھ اس کو اپنے خاندان کی وجاہت اور اپنے باپ کے سرکاری عہدے کی جلالت پر بھی بڑا ناز تھا ۔

اس کی آنکھیں میری طرف اٹھتی تھیں تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کا چہرہ میرے تصور جمال کے سانچے میں ڈھالا گیا اور میری آنکھوں کے مشورے سے اس کے خد و خال تراشے گئے ہیں ۔ ہر چند وہ میری آنکھوں کی دعائے مستجاب تھا ۔ لیکن اس کے تجزیہ پر نگاہ کر کے میں اس سے بات نہیں

کرتا تھا۔ کئی مہینے اسی کشمکش میں گذر گئے میں اس کے قریب جانے سے بھاگتا لیکن درپردہ اس کی جانب دوڑتا رہا۔ بڑھتا چلا گیا ہوں اسی کی طرف کچھ اور یوں بھی ہوا ہوں اس سے گریزاں کبھی کبھی

ایک دن اسکول جاتے ہوئے میری اس سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ میں نے خود داری، وطلب گاری کی ملی جلی کیفیت سے اس کی جانب نگاہ اٹھائی تو اس نے مجھے غور سے دیکھا اور نجتی ہوئی آواز سے پوچھا، تمھارا نام شبیر ہے؟۔ میں نے کہا ہاں میرا نام یہی ہے۔ اس نے پوچھا کہاں کے رہنے والے ہو میں نے جواب دیا ملیح آباد کا، اس نے بشاش ہو کر کہا۔ ارے وہ ہمارے لکھنؤ کا ہی ایک محلہ ہے تم شیعہ ہو کہ سنی؟ میں نے کہا آدھے سے زیادہ شیعہ، اس نے کہا پورے شیعہ بن جاؤ تو میرے تمھارے پینگ بڑھ جائیں۔ میں نے کہا پہلے مجھ سے پینگ بڑھاؤ، پھر پورا شیعہ بناؤ یہ سن کر اس کی سونے کی سی ورق کی طرح باریک چہرے کے نیچے ایک رنگ دوڑنے لگا وہ میری طرف دو قدم بڑھا اور میرے قریب آ کر اپنے ماتھے سے میرے ماتھے پر زور سے ٹکر ماردی اس کے ٹکر مارتے ہی میرے بدن میں لہر تیزی سے دوڑنے لگا ٹکر ہر چند زبردست لیکن بلا کی میٹھی تھی ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے اور اس نے بڑے تحکم کے ساتھ اپنی بلوریں انگلی اٹھا کر مجھ سے کہا، آج اسکول کے بعد میرے گھر چلنا ہو گا۔ میری باچھیں کھل گئیں۔ اور کہا ضرور چلو نگا۔

کہتے ہیں شکر خورے کو شکر اور موذی کو ٹکر" لیکن یہ کہاوت اس موقع پر بالکل الٹی ہو کر رہ گئی اس ٹکراؤ کے بعد میں اس کے گھر جانے لگا محبت دن دونی رات چوگنی بڑھنے لگی اور اس میں اس قدر غلو پیدا ہو گیا کہ جس دن کسی مجبوری کی بنا پر اس کے گھر نہیں جاتا تھا تو منھ کا مزا پھیکا پھیکا سا محسوس ہوتا تھا۔

میں اس کے جمال کی شرح کیوں کر کروں، الفاظ پر جب اس کے حسن کا بار ڈالتا ہوں تو ان کی پنڈلیاں کانپنے لگتی ہیں۔ میرے نزدیک رب جمال نے بڑی کیمیاوی دیدہ دری کے ساتھ، سب سے پہلے تو دادی کشمیر کی رو پہلی چاندنی اور صبح کوہسار کی سنہری کرنوں کو ہلکی سی شعلے کی آنچ پر رکھ کر پگھلایا پھر تخت الناس میں نچوڑ دیا پھر چنبیلی اور موتیوں کے ہونٹ کو خوب حل کر کے اوپر سے گھول دیا اور پھر اوپر سے پگھلا ہوا سونا ٹپکا دیا اس کے بعد کھرل میں کٹے ہوئے موتیوں کا باریک سفوف اس پر چھڑک دیا اور اس کے بعد اس نیم سیال مرکب کو نسیم شمال کی راہ گذار میں رکھ دیا اور جب وہ جم گیا تو اس سے اس کی موہنی صورت تراش لی۔

ایک دن بڑے دن کی چھٹی منانے کے لئے ہم دونوں سیتاپور سے لکھنؤ کی طرف روانہ ہوئے

خوش قسمتی سے ہمارا ڈبہ خالی تھا، ہم نے بڑی بے تکلفی کے ساتھ سفر کیا۔
ہماری گاڑی جب کسی اسٹیشن پر ٹھہرتی تھی میرا دل دھک دھک کرنے لگتا تھا کہ کہیں کوئی مسافر نہ آدھمکے اور ہمارے طلسم کو توڑ ڈالے مگر اللہ کا ہزار ہزار شکر کہ آخر تک کوئی مسافر نہیں آیا اور ہم موج کرتے رہے سچ کہا ہے کسی نے "اَلسَّفَرُ وَسِیْلَۃُ الظَّفَرِ" رات ہوتے ہی وہ میرے زانو پر سر رکھ کر سو گیا اور چودھویں کی چاندنی اس کے سفید گالوں پر جذب ہونے لگی اس وقت اس کے چہرے سے جو اثر میں نے قبول کیا تھا آج تک دل پر نقش ہے۔ ہائے ہائے وہ چھلکتی چاندنی اور ہائے وہ اسد کا دمکتا چہرہ۔ ایک روز لکھنؤ میں اس نے کہا شبیر کل آنا تو اشرفیاں لیتے آنا اور جب میں اپنی ماں سے دو اشرفیاں لے کر اس کے پاس گیا اور ریشمی رومال میں رکھ کر میں نے وہ اشرفیاں پیش کیں اس نے کہا اپنے پاس رکھو میں تو تمہیں آزما رہا تھا میں نے غصہ میں آ کر وہ اشرفیاں کوٹھے سے نیچے پھینک دیں اس نے گھبرا کر کہا ارے یہ تم نے کیا کیا۔ میں نے کہا تم دو کوڑی کی اشرفیوں سے میری محبت کا امتحان لے رہے تھے یہ دیکھو میری محبت یہ کہتے ہی میں نے میز سے چھری اٹھائی اور اپنے سینے میں مار لی۔ دھل دھل خون بہنے لگا اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اس نے جلدی سے اپنی قمیض کا دامن پھاڑ کر پانی سے تر کیا اور زخم پر رکھ دیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو کا مینہ برسنے لگا

اتنے میں اسد کا گردے کی سی داڑھی والا منہ بولا "چچا" آ گیا ۔۔۔ وہ ہم دونوں کی یکجائی سے خار کھاتا تھا اس نے مجھ کو لہولہان "ع۔ح" کو زار و قطار روتے دیکھا تو کمبخت لال پیلا ہو کر پوچھنے لگا سچ بتاؤ یہ کیا تماشا ہو رہا ہے۔ "ع۔ح" نے بڑی لجاجت کے ساتھ کہا شبیر چھری لے کر سیبوں کے ٹوکرے کی طرف بڑھے ٹھوکر لگ گئی گر پڑے اور چھری سینے میں لگ گئی۔ اس خبیث نے کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑا کر کہا یہاں تو سیبوں کا کوئی ٹوکرا نظر نہیں آ رہا ہے۔ "ع۔ح" نے کہا چچا وہ ٹوکرا ابھی ابھی کوئی اٹھا کر اندر لے گیا ہے۔ اس کا نام بتاؤ اس نے کہا جب وہ ٹوکرا کمرے سے لے کر نکل رہا تھا میں نے فقط اس کی گدی دیکھی تھی، نام کیا بتاؤں۔ چچا نے دانت پیس کر کہا کل کا چھوکرا اور مجھے الو بنا رہا ہے ابھی تیرے باپ سے جا کر شکایت کرتا ہوں یہ کہہ کر وہ نیچے اتر گئے اور ہم دونوں ہراساں ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے کہ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ "ع۔ح" نے مجھ سے کہا اگر ابا تمہیں بلائیں اور یہ پوچھیں تو کیا جواب دو گے۔ میں نے کہا میں کیا جواب دوں گا یہ فیصلہ کر چکا ہوں اس نے کہا وہ میرے باپ ہیں تم بھی اپنا باپ سمجھ کر انکو جواب دینا، بھٹنوی پر نہ اتر آنا کہ اتنے میں داڑھی والا مردود چچا آ گیا اور کہا تم دونوں کو مرزا صاحب

یعنی (ع ۔ ح) کے والدِ ماجد نے بلایا ہے۔ ہم دونوں انکی خدمت میں پہنچے اور انھوں نے بکمال شفقت نظر اٹھائی اور فرمایا شبیر تم کو نہیں معلوم ہمارے تمھارے خاندان کے کتنے پرانے تعلقات ہیں۔ تمھارے پر دادا نواب فقیر محمد خاں گویا اور میرے دادا.... کے مابین برادرانہ تعلقات تھے مجھے یقین ہے کہ تم پٹھان اور عالی خاندان ہو جھوٹ نہیں بولو گے اور جو واقعہ ہوگا سچ سچ بتا دو گے۔ میں نے کہا چچا جس طرح میرے پر دادا اور آپکے دادا کے درمیان برادرانہ تعلقات تھے ویسے ہی میرے اور "ع ۔ ح" کے درمیان برادرانہ تعلقات ہیں انھوں نے میری برادرانہ شفقت کو آزمانے کے لئے مجھ سے کہا کل دو اشرفیاں لیتے آنا میں سمجھا انھیں ضرورت ہے میں لے آیا اور جب میں اشرفیاں انکو دینے لگا انھوں نے کہا مجھکو ضرورت نہیں میں تو فقط تمھیں آزمارہا تھا یہ سن کر مجھے غصہ آگیا میں نے اشرفیاں نیچے پھینک دیں اور اپنے سینے میں چھری مار لی۔

مرزا صاحب نے "ع ۔ ح" سے کہا آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا آج انھوں نے اپنے چھری ماری ہے کل تمھارے چھری مار دیں گے۔ پٹھان کا پوت گھڑی میں اولیا و گھڑی میں کجبت۔ اور بیٹے کو سمجھانے کے بعد مرزا صاحب نے اس مردود چغل خور چچا کو طعن آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے بالاخانے پر آگئے "ع ۔ ح" نے فرطِ خوشی سے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں بڑے دن کی چھٹیاں منانے کے بعد اب ہم پھر سیتاپور آگئے اور زندگی مزے سے گذرنے لگی۔ "ع ۔ ح" کے ایک انشی پچاسی برس کے معلم اس کے گھر میں رہتے تھے۔ انھوں نے۔ ع ۔ ح کے ایماء سے مجھ پر شیعیت کا گہرا رنگ چڑھانا شروع کر دیا اور جب میں پکا شیعہ بن گیا تو اس نے بڑی دھوم دھام سے میری دعوت کی اور کہا اب میں ہمیشہ کے لئے تمھارا ہو گیا اور میری ہڈیوں کے گودے تک اس کی محبت اتر گئی۔

اسی اثناء میں یہ ایک بہت بڑا المناک سانحہ پیش آیا کہ میرے باپ نے مجھ کو تحریر فرمایا کہ میں سیتاپور ہر اشنج اسکول سے نام کٹا کر فلاں تاریخ کو لکھنؤ پہنچ جاؤں وہ مجھے حسین آباد ہائی اسکول میں داخل کرا دیں گے اور میرزا حبیب حسین صاحب ہڈ ماسٹر کی نگرانی میں رکھیں گے۔ جب یہ خط پہنچا زمین میرے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ دل اس زور سے دھڑکا گویا منھ سے نکل جائے گا اور جب میں نے وہ خط "ع ۔ ح" کو دکھایا۔ وہ چارپائی پر گر گیا.... آنکھوں سے آنسوؤں کا دجلہ بہنے لگا وہ اجلا اجلا پھول سا چہرہ دھلے کپڑے کی طرح سفید ہو گیا میں نے اس کا ٹھنڈا ہاتھ کلیجے سے لگایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جانتا ہے آسمان لئے کہ چپے سے یار کے آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر

اور آخر کار اس کے چوتھے دن بعد نالہ فغاں سیتاپور سے رخصت ہو گیا۔

بنو امیدی تتریں از کوئے او بار سفر بستم
خدا صبرے کند روزی دل امید دارم را

مس میری روسالڈ!

یہ اس دور کا ذکر ہے جب میں لکھنؤ کے چرچ مشن ہائی اسکول میں زیر تعلیم اور لاٹوش روڈ کی گلی کے ایک منزلہ مکان میں رئیس احمد اور ابرار کے ساتھ رہتا تھا۔

وہ ایک وسیع اور دو منزلہ مکان تھا اس مکان کے ایک حصہ میں مس میری روسالڈ اپنی سوتیلی جوان بیوہ ماں مسز روبی روسالڈ کے ساتھ رہتی تھی۔ زینہ ہم دونوں کا مشترک تھا اور آتے جاتے ہم دونوں کی مڈبھیڑ ہو جایا کرتی تھی اور ہم ایک دوسرے کو مقناطیسی نظروں سے دیکھا کرتے لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے۔

ہماری خواب گاہوں کے درمیان پتلا سا زینہ تھا اور جب ہم بستروں پر لیٹتے تھے تو فریقین دیر تک ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن سنا کرتے تھے۔

ایک روز سر شام ہم دونوں زینے چڑھ رہے تھے وہ آگے تھی پیچھے۔ اس کے پونڈر کی خوشبو میرے وجود کا احاطہ کئے ہوئے تھی کہ یکایک اس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور "اوگاڈ ہائے اللہ) کہہ کر زینے پر بیٹھ گئی اور بڑے کرب کے ساتھ پیٹ پکڑ لیا میں نے انگریزی میں پوچھا آپ کو کیا تکلیف ہے، اس نے کہا میرے پیٹ میں شدید درد ہونے لگا ہے آپ مجھکو سہارا دے کر میری خواب گاہ تک پہونچا دیں او مائی گاڈ، او مائی گاڈ۔

میں نے لپک کر اس کی چھلاسی کمر میں ہاتھ دیا اور سہارا دے کر اسے اسکی خواب گاہ میں پہونچا دیا وہ بستر پر لیٹ کے تڑپنے لگی۔ میں نے کہا، میں ابھی ڈاکٹر کو لاتا ہوں اس نے کہا نہیں پہلے آپ میرا پیٹ سہلا دیں اگر اس سے افاقہ نہ ہو تو پھر ڈاکٹر کو بلا لائیں۔

میں بڑے انہماک کے ساتھ اس کا پیٹ سہلانے لگا، اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ایسا معلوم ہوا کہ اس کے درد میں تخفیف ہو رہی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں مجھے بڑے تشکر سے دیکھا اور کہا، اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو یہ سامنے کی سوڈے کی بوتل کھول کر مجھے پلا دیجئے۔

میں بوتل کھول کر گلاس میں سوڈا بھرا اور پیش کر دیا وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور کہا۔۔۔۔

آپ بیٹھ جائیے زرا ... بیٹھ نے ایک گھونٹ پی کر گلاس اس کو دے دیا، وہ پیٹنے لگی اور اسی طرح پینے لگی، گویا سوڈے کے ساتھ وہ مجھ سے کہا، میری ماں باہر گئی ہوئی تھی اس لئے اکیلے جی گھبرائے گا۔ تھوڑی دیر اور بیٹھ جائیے۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا نہیں میرے بستر پر بیٹھ جانے۔ میں اس کے بستر پر بیٹھ گیا اس نے حضرت مسیح کی بڑی تصویر جو اس کے سرہانے آویزاں تھی چادر ڈال دی۔ اس کے بعد میرے اور اس کے تعلقات بہت گہرے ہو گئے اور ایلا راس کی سوتیلی ماں پر ترجیح گئے اور دونوں میں گاڑھی چھننے لگی۔ ایک روز ہم لوگ حضرت گنج کے ایک شاندار ہوٹل میں چائے پی رہے تھے کہ دو گورے جو نشے میں دھت تھے وہاں آ گئے، میری اور اس کی ماں کو برا بھلا کہنے لگے کہ تم یوریشن ہو کر نیٹو آدمیوں کے حلقہ میں بیٹھی ہوئی ہو۔ میں نے ان کو ڈانٹا کہ بدتمیزی نہ کرو۔ ہمارا ہی نمک کھاتے ہیں اور ہمیں پر غراتے ہیں ایک گورے نے میری بات ان سنی کر کے مس میری کی جانب ہاتھ بڑھایا میں نے اس کے سر پر ڈنڈہ مار دیا، دوسرا گورا بڑھا تو ابرار نے اس کے سر پر اچار کی بھری بوتل مار دی، اچار آنکھوں میں ہو گیا تو وہ بلبلا گیا اور دونوں گورے بھاگ کھڑے ہوئے ایک روز اس کی کتیہ دو منزلے سے انگنائی میں گر کر دم توڑنے لگی، میری نے چیخ کر مجھ سے کہا، ارے سامنے برانڈی کی بوتل رکھی ہوئی ہے جلدی لے آیئے۔ میں نے کہا میں برانڈی کی بوتل نہیں چھو سکتا اس نے مجھے قہر سے دیکھا دوڑ کر بوتل اٹھائی اور نیچے اتر کر دم توڑتی کتیا کے جبڑے چیر کر کوئی آدھی بوتل اس کے منھ میں انڈیل دی اور یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہو گئی کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد کتیا کی حالت بہتر ہو گئی۔ اور کلیلیں کرنے لگی۔

اس نے مجھ سے کہا، تم نے برانڈی کا معجزہ دیکھا جو بیمار مردوں کو جلا سکتی ہے تم اس کو ہاتھ تک نہیں لگا سکتے۔ شرم شرم شرم۔

ایک شام کو اس نے مجھ سے کہا جب تم سہ پہر کو ٹہلنے جاتے ہو تو روز ایک حبشی نوجوان آتا اور میرے کمرے کی طرف منھ اٹھا اٹھا کے کچھ گاتا اور پھر چلا جاتا ہے کل تم ٹہلنے نہ جانا اور یہیں بیٹھنا اور اس کالے حبشی کا دماغ صحیح کر دینا دوسرے دن میں ٹہلنے نہیں گیا اور ٹھیک، پانچ بجے سڑک سے آواز آنے لگی۔

مارے ہیں جوان لاکھوں اے رشک چمن تو نے۔ اے رشک چمن تو نے، اے رشک چمن نرے بن کے دلہن تو نے۔

میں نے جھانک کر دیکھا وہی حبشی نوجوان تھا، ڈنڈا لے کر میں نے اس کی ایسی ٹھکائی کر دی کہ پھر اس نے کبھی گلی کا رخ نہیں کیا۔

بس میری نے مسکرا کر کہا تم تو بہت بڑے "نائٹ" ہو جو گوروں کو بھی پیٹتا ہے اور کالوں کو بھی۔ ارشد اور نے میرے معاشقے کی خبر میرے باپ تک پہنچی وہ نہایت ودشمند انسان تھے ابرار کو بلا کر انھوں نے ارشاد فرمایا کہ وہ فرنگی لڑکی اگر مسلمان ہو جائے اور پردہ یقینی اختیار کر لے تو میں بڑی خوشی سے تیار ہوں کہ شبیر سے اس کا عقد کر دوں۔

جب میں نے میری کے سامنے اپنے باپ کی یہ دونوں شرطیں پیش کیں تو اس نے کہا ڈارلنگ میں تمہارے لئے پردہ نشینی کی کٹھن تو برداشت کر لونگی لیکن اسلام کبھی قبول نہیں کرونگی اس لئے کہ یہ گندہ و نکما دین ہے یہ سنتے ہی مجھکو تاؤ آگیا عشق کو جذبۂ اسلام نے دبوچ لیا میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سامنے رکھا ہوا بھاری اسٹول اس کو کھینچ مارا، وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی اسٹول ایک لکڑی کی الماری پر لگا اس کا پٹ چور چور ہوگئیں میں آذر سے عیسائی مذہب کو برا بھلا کہتا باہر نکل آیا۔

اس کے بعد میں اس کے یہاں پھر کبھی نہیں گیا اور لکھنؤ کی سکونت ترک کرکے آگرے کے سینٹ پیٹرز کالج میں داخل ہوگیا اس واقعہ کے کوئی سال بھر کے بعد جب چھٹیوں میں لکھنؤ آیا تو نہ جانے کیونکر پتہ چل گیا وہ عین دوپہر کے وقت میرے پاس آئی اور جب میں نے اس کی جانب نظر اٹھائی تو دیکھ کر میرے دل کو بڑا بھاری دھکہ لگا کہ صرف ایک سال کی مدت میں اس کا آدھا حسن برباد ہوچکا ہے اور وہ شام کے مرجھائے ہوئے پھول کی مانند معلوم ہو رہی تھی۔

مجھ سے آنکھیں چار ہوتے ہی وہ دوڑ کر مجھ سے چمٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی میری بھی ہچکیاں بندھ گئیں، اور آواز گلے میں پھنسنے لگی اس نے مجھ سے کہا ڈارلنگ تمہاری محبت مجھکو کھا گئی مجھکو معلوم نہیں تھا کہ تم کہاں چلے گئے ہو ورنہ میں وہیں پہونچتی تمہاری جدائی کے ہاتھوں ڈارلنگ مجھ کو دق کا مرض ہوچکا ہے۔ میری سانس سے دور ہٹ کر بیٹھو میں اس وقت تمہارے پاس اس لئے آئی ہوں کہ آج سے ایک سال قبل میں نے جو اسلام کی توہین کی تھی تم اسے معاف کر دو اب میں اس دنیا سے جا رہی ہوں جانے والے کا یہ حق پیدا ہو جاتا ہے کہ اسے دل سے معاف کر دیا جائے ڈارلنگ جو اسٹول تم نے کھینچ کر مارا تھا کاش وہ میرے لگ جاتا میں اسی وقت مر جاتی لیکن یہ دن نہ دیکھتی۔

میں نے اسے بڑی گرم جوشی کے ساتھ چمٹا لیا۔ میری آنکھیں پھر برسنے لگیں میں نے کہا پیاری میری میں تمہیں دل سے معاف کر رہا ہوں اور میں تم کو مرنے نہ دونگا میرے پاس جو کچھ ہے سب تمہارے علاج پر نثار کر دونگا۔ تم گھبراؤ نہیں شبیر تم میرا علاج نہ کراؤ اب میں بچونگی نہیں اور ہاں ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے سے پہلے میں تم کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ تمہارے چلے جانے کے بعد میرے پیٹ سے تمہاری لڑکی پیدا ہوئی تھی ہو بہو تمہارا نقشہ تھا اور سیدھے پاؤں کی انگلی میں جو تل ہے وہ بھی اس نے وراثت میں پایا تھا۔ ہائے وہ مر گئی یہ کہہ کر اسکی آواز رندھ گئی اس کے گورے گورے گالوں پر ملگجا پن سا دوڑنے لگا میرے منھ سے چیخ نکل گئی اور سہ بارہ آنسو نکلنے لگے۔

میں نے اس کے علاج پر اپنی ماں سے لے لے کر ہزاروں روپئے صرف کر دیئے ڈاکٹروں پر ڈاکٹر بدلے انکے بورڈ بٹھائے بڑے بڑے نامی طبیبوں کو بلایا لیکن ہائے وہ بچ نہیں سکی اور مجھے دغا دے کر وہاں چلی گئی جہاں سے کوئی پلٹ کر نہیں آتا

اس کا پھول سا چہرہ منوں مٹی کے نیچے دفن ہے اور مجھ سخت جان کی پیری اب تک اس زمین پر سانس لے رہی ہے یہ کتنی عبرت انگیز اور شرمناک بات ہے۔

پس از معشوق جینا عشق کو بدنام کرنا ہے ... خدا بخشے مجنوں کو بخشے مر گیا اور ہم کو مرنا ہے

ہائے اے میری مس میری، صرف ڈھائی یا تین سال کی قلیل مدت کے لئے تیرے گلستان جمال نے مجھ پر پھول برسائے اور اب تیری موت پچاس سال سے انگارے برسا رہی ہے مسرت کی عمر کسقدر قلیل اور غم کی عمر کس قدر طویل ہوتی ہے۔

ہم کو صرف ایک بوند بھر تبسم کی لہر یا تیرا کر آنسوؤں کے بے شمار گرداب میں ہمیشہ کے لئے غرق کر دیا جاتا ہے۔ ارے یہ کیسا کارخانہ ہے، اے تازہ وارد دان بساط ہوائے گل مجھ سے عبرت حاصل کرو اور خوشی کے حصول سے ہاتھ اٹھا لو مگر تم ایسا نہیں کر سکتے سفاک قدرت تمھاری جوانی کو تازیانے مار مار کر حصول مسرت کے میدانوں کی جانب ایک ظالم چرواہے کی طرح ہنکائے گی اور پھر مسرور ہونے کے جرم میں تم کو مرتے دم تک رلائے گی۔ ہائے ہ

ایڑیوں سے کھائیں ہیں خاروں کی لاکھوں برچھیاں میں نے
وہ دو سانسیں جو لی تھیں بوئے گل کے درمیاں میں نے

،۔۔ گھمایا جا رہا ہوں اس خطا پر دشت عبرت میں
،۔۔ کیا تھا کیوں طواف حجلۂ ہائے دل براں میں نے

در قہر کشا الٹش کیوں نہ مجھ پر بند ہو جاتا،
کہ کھولے تھے کبھی بند قبائے مہ وشاں میں نے،

،۔ جھکایا جا رہا ہوں اس لئے پائے گدائی پر
،۔ کہ پہنا تھا علی الرغم قضا۔ تاج شہاں میں نے

عبار وقت کی چادر پڑی ہے فرق سیمیں پر۔،
کہ بخشی تھی جوانی کو قبائے کہکشاں میں نے۔،

، ٹپکتی ہیں دل صد پارہ سے اب خون کی بوندیں
، لپٹ کے تھے ہائے کیوں رنگین لبوں سے گلستاں میں نے

گرایا ہے مجھے قدرت نے خوش چشموں کی نظروں سے ،۔،
کہ اپنی سمت پھیری تھیں ہزاروں انکھڑیاں میں نے ،۔،

ہیں یہ ہونٹوں پہ قفل اس جرم میں دنیا نے ڈالا ہے
کہ گونگی ادھ کھلی آنکھوں کو بخشی تھی زباں میں نے

کھیلا کس سے کہ بالآخر بجبر قسمت رامش ہے،
سُنا ہے داگ کے ڈوروں سے پوشاک فغاں میں نے

وہاں بیٹھے ہوئے ہیں بھکیوں کے ہر طرف پہرے
جہاں آباد کی تھیں مرغیوں کی بستیاں میں نے

نظر آتے ہیں کا نور و کفن کے اب وہاں ڈھیر ہے
جہاں کھولا تھا بازار دھر بر پرنیاں میں نے

وہاں قبروں کی لوحوں کے پڑے ہیں دور تک پتھر
سجائی تھی جس انگنائی میں شیشے کی دکاں میں نے

مس گلینسی

لکھنؤ کے ایک اسپتال کی خوب رو، خوش چشم اور کم سن لیڈی ڈاکٹر تھی جب میرے نکاح کی تنسیخ کا مقدمہ چل رہا تھا۔ اس وقت میرے باپ نے اس کو ملیح آباد بھیجا تھا کہ وہ میری منکوحہ کا معائنہ کر کے اس کے بلوغ کا سرٹیفکیٹ دیدے۔

جب وہ ملیح آباد سے معائنہ کر کے آ گئی تو میرے باپ نے مجھے بھیجا کہ میں اُس سے اپنی منکوحہ کے بلوغ کی سند لے آؤں۔

میں: "میرے باپ کو اگر یہ معلوم ہوتا کہ میرے اور گلینسی کے درمیان معاشقہ ہو جائے گا تو وہ کبھی مجھ کو اس کے پاس نہ بھیجتے۔

میں اُس کے وہاں پہنچا۔ ابھی برآمدے کر رہا تھا کہ دیکھا ایک نہایت خوب رو، اور کم عمر عورت غسل خانے سے نکل کر اپنی خواب گاہ میں کھڑی اپنی بھوری زلفیں نچوڑ رہی ہے اور چونکہ میں نے اس کو پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا اس لئے اسے پہچان نہیں سکا اتنے میں اسکی نظر میری طرف اٹھ گئی اس نے کھڑکی کا پٹ کھول کر انگریزی میں پوچھا آپ کون ہیں میں نے کہا جوش اس نے بڑی چھالو لی کے ساتھ کہا اوہ۔۔۔۔۔۔ "Ebullition Agitation heat" (ولولہ، ہلچل، حرارت) اس کے انداز سے میں نے بھانپ لیا کہ تیر نشانہ پر بیٹھ گیا ہے۔ میں نے مسکرا کر پوچھا اور آپ کون ہیں اس نے سر کو جنبش دے کر کہا، مس گلینسی، میں نے کہا صرف ایک Glance، ایک اچٹتی نظر کے واسطے آیا ہوں در آنکھیں

جھکا کر متبسم ہوئی اور پوچھا اور کوئی کام ہے میں نے کہا آپ میری منکوحہ کے معائنہ کی خاطر پنج آباد گئی تھیں
میں اسکی رپورٹ لینے آیا ہوں اس نے کہا میری خواب میں آ جائیے۔
وہ میرے بالکل سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئی اس کے سنہرے بال شانوں پر بکھرے ہوئے
تھے اور غسل صبوحی کی تازگی و بالیدگی اس کے دونوں گل گوں پر چل رہی تھی اس نے پوچھا آپ نے اپنی
ہونے والی دلہن کو دیکھا ہے میں نے کہا نہیں اس نے کہا آپ بڑے خوش قسمت ہیں آپ کی بیوی
کا رنگ بالکل ہم لوگوں کا سا ہے۔ وہ بے حد خوبصورت ہے میں نے کہا۔ بالکل آپ کی طرح
اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔
اتنے میں اسکا ملازم ثقافی ہیرا ایک کارڈ لے آیا اس نے کارڈ پڑھ کر میز پر رکھ دیا۔ کہا ٹھہرو
اور میری بیوی کے بلوغ کی سند میرے حوالے کر کے کہا، آپ غسل خانے کے دروازے سے باہر چلے
جائیں، جب میں جانے لگا اس نے کہا اب کب آئیے گا، میں نے کہا کل صبح کو، اس نے کہا صبح کو
نہیں شام کو آئیے گا ٹھیک ۷ بجے۔
جب میں نے جاکر اپنے باپ کو سرٹیفکیٹ دیا۔ وہ نہایت دانا تھے انھوں نے میرے چہرے
کی طرف نگاہ اٹھا کے فرمایا یہ تمھارا چہرہ اس وقت کیسا ہو رہا ہے؟
دل میں چور تھا باپ کی اس دیدہ وری سے گھبرا گیا اور آنکھیں جھک گئیں میری اس حالت سے
میرے باپ معاملے کی تہ تک پہونچ گئے کچھ دیر خاموش رہے اور پھر ارشاد فرمایا، میں نے تمہیں
اس ڈاکٹر کے پاس بھیج کر بڑی غلطی کی دیکھو خبردار اب اس کے پاس نہ جانا ہرگز نہ جانا میں نے
بڑی معصومیت آمیز سعادت سے کہا بہت اچھا اور دل ہی دل میں کہا خدا کی قسم جاؤنگا اور
ضرور جاؤنگا۔ بابا تو جلوہ رخ جاناں نہ دیدہ!
دوسرے دن ٹھیک سات بجے میں اس کے وہاں پہنچ گیا، وہ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولے
کھڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ گلاب کی کلی کی طرح چٹک گیا بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا
ہاتھ کیا تھا دھنکی روئی کا گالا، اور اس لہجے میں میرا مزاج پوچھا، جیسے انگیٹھی میں فرطِ
حرارت سے کوئلہ چٹک جاتا ہے تڑاق سے۔
مجھ کو وہ بڑے تپاک سے ڈرائنگ روم میں لے آئی بوائے (خادم) کو بلا کر ٹوٹی پھوٹی
اردو میں حکم دیا۔ کہ تم برآمدے میں بیٹھ جاؤ اگر کوئی آئے تو کہہ دینا مس صاحب گھر پر نہیں ہیں
یہ کہہ کر اس نے ڈرائنگ روم کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ مجھے خواب گاہ میں لے گئی کھڑکیوں
کے پردے گرا دیئے اور صوفے میں میرے پہلو میں آکر بیٹھ گئی۔ پوچھا وسکی پیو گے یا برانڈی
یا بیئر؟ میں نے کہا میں پیتا نہیں ہوں آپ شوق کریں اور میں آپکی آنکھوں سے پیونگا وہ

بئیر کی بوتل اٹھالائی اور پینے لگی ۔ جب آدھی بوتل ختم ہوگئی ، اس کے چہرے پر طلوع صبح کی سی دھاریاں مچلنے لگیں اور آنکھوں کے ڈورے ابھر آئے ۔

اب اس نے صوفے کی ٹیک پر اپنا سیدھا ہاتھ اس طرح پھیلا کر رکھ دیا کہ وہ میری گردن سے مل گیا مجھ کو جھرجھری سی آ گئی ۔ میں نے بھی اپنا ہاتھ اس طرح پھیلا دیا اور ہمارے پہلوؤں کے درمیان اب ہاتھوں کا وجود باقی نہیں رہا دوسری بوتل ختم کرکے وہ آہستہ سے میری طرف کھسک آئی میرے پہلو میں انگیٹھی سی جلنے لگی اور اعصاب کے اندر دھمال سا ہونے لگا ۔

اس کے بعد وہ اٹھی ، روشنی بند کر دی پھر میرے پہلو سے لگ کر بیٹھ گئی ۔ تاریکی میں اس کا سکھڑا اور بھی دمکنے لگا ۔

اب اس نے اپنا گال میری طرف بڑھا دیا ۔ میں نے اس کے گالوں کا رنگ ، اور اس کی جلد کی خوشبو ، ڈغڈغا کر پی لی ۔ اور پھر ہم دونوں کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہا ۔

اس کے بعد ایک دھیما سا بلب اس نے جلا دیا اور اس کے چہرے پر طوفانی رات کا پچھلا پہر مچلتا نظر آنے لگا ۔ ارے جمال کی دوشیزگی ابھر آئی — !

میں نے دیکھا گھڑی پونے نو بجا رہی ہے ، میں اپنے باپ سے حضرت گنج کی سیر کا بہانہ کر کے آیا تھا اور عرض کر دیا تھا نو بجے تک آ جاؤں گا اس لئے میں نے اجازت طلب کی ، اس کا منھ اتر گیا نہیں نہیں صبح ۵ بجے تک یہاں ٹھہرنا ہے " اس نے بڑے تحکم سے کہا عشق اس قدر جلد گھل مل جاتا ہے گویا برسوں کے پرانے تعلقات ہیں یہاں ماہ وسال کی گردشیں ، ایک لمحے کے اندر گھومنے لگتی ہیں ۔ میں نے بڑی نرمی سے کہا میرے باپ بہت سخت آدمی ہیں میں ان سے نو بجے تک آنے کا وعدہ کر کے آیا ہوں ۔ وقت پر نہیں پہونچا تو بڑا غضب ہو جائے گا ۔ اس نے کہا اچھا کھانا تو کھا لو میرے ساتھ میں نے کہا کھانا کھا لونگا تو باپ پوچھیں گے یہ کھانا کہاں سے کھا کر آیا ہے ۔

اس رات کے بعد میرے اس کے پینگ یہاں تک بڑھ گئے کہ ہم دونوں دوسرے تیسرے دن ملنے لگے ۔ اور ہر بار ایک تشنگی سی لے کر جدا ہوئے ۔

اس نے بے حد کوشش کی مجھے شراب پلانے کی لیکن میں اس قدر کھرا اور احمق تھا کہ ہر بار بڑی خوبصورتی سے ٹال دیا ۔

ایک بار رات کے وقت ہم لوگ تانگے میں گزر رہے تھے (ٹھنڈی سڑک سے ہو کر) وہ میرے پہلو میں تھی اور علی بشیر خاں ، سپاہی موٹا سا لٹھ کا ندھے سے لگائے کوچ بان کے پاس بیٹھا تھا کہ قیصر منزل کلب سے ایک کار تیزی کے ساتھ نکلی اس کی روشنی مس گلینسی کے چہرے پر پڑی اس انگریز نے اپنی ... آرڈی کر کے سڑک پر ٹھہرا دی اور ڈارلنگ کہہ کر پکارنے

لگا، اس کی آواز نشے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ تانگے والے نے کہا صاحب بہادر راستہ دیجئے
اُس نے تانگے والے کو گالی دی، میں نے کہا علی شیر خاں! اس بندر کا دماغ درست کر دو۔
علی شیر خاں نے اس کی کھڑی موٹر کے پاس جا کر کہا، آپ ہمارا راستہ روکے ہوئے کیوں
کھڑے ہیں؟ اس نے گلینسی کی طرف اشارہ کیا کہ اسے بھیج دو۔ شیر علی خاں نے اس کے منھ
پر تھپڑ مار دیا۔ وہ موٹر سے اتر کر ہاتھا پائی کرنے لگا۔ میں تانگے سے کود پڑا اور گندی زبان
کا ہنٹر اس پر برسانے لگا۔ اتنے میں بہت سے لوگ جمع ہو گئے اور وہ انگریز موٹر اسٹارٹ
کر کے بھاگ کھڑا ہوا۔ گلینسی نے میری پیٹھ ٹھونکی، اور کہا مجھے اس بات پر بڑا فخر ہے کہ میں
تمہارے جیسے بہادر آدمی کے پہلو میں بیٹھی ہوں۔

جب تانگہ آگے بڑھا تو جھٹکوں نے برا حال کر دیا اور وہ کہنے لگے۔ آج ہی تمہاری موٹر کو
خراب ہونا تھا یہ بھی کوئی سواری ہے۔ "شیک، شیک، شیک"
(لو زندگی، لو زندگی، لو زندگی) اس نے "شیک" کو اس طرح ادا کیا کہ میرے تمام بدن میں
سنسنی پیدا ہو گئی۔

ایک رات جب میں گلینسی کی خواب گاہ میں بیٹھا ہوا تھا اور وہ میرے زانو پر بیٹھی بیئر پی
رہی تھی کہ اس کے خواب گاہ کا دروازہ یکایک دھڑام سے کھل گیا اور ایک لمبا تڑنگا ادھیڑ عمر کا انگریز
جو اس کا چچا یا ماموں تھا ہاتھ میں پستول لئے کھڑا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا گلینسی اور میں دونوں
گھبرا کر کھڑے ہو گئے اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ دھڑام سے مجھ پر گولی چلا دی گلینسی نے سقف شگاف
چیخ ماری اور لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑی، نشانہ خطا ہو گیا تھا، میں نے جست کر کے اس کی کلائی پکڑ
لی اور پستول چھیننے لگا۔ اس کشمکش میں اس نے دوسری گولی چلا دی جو چھت میں جا کر لگی اور
میں نے جھٹکا دے کر پستول چھین لیا اتنے میں اس کے نوکر چاکر اور پڑوس کے بنگلوں کے دس بیس
آدمی خواب گاہ میں آ گئے انھوں نے اس انگریز کو پکڑ لیا اس کے بعد تھوڑی دیر میں پولیس آ گئی اور
ہمارے بیانات قلم بند کرنے کے بعد اس انگریز کو تھانے لے گئی۔

اس تھانے کا انچارج میرے باپ سے واقف تھا، اس نے صبح ہوتے ہی خبر میرے باپ تک
پہنچا دی، میرے باپ نے مجھ کو طلب کیا۔ میں کانپتا ہوا ان کے سامنے گیا انھوں نے بڑی بھاری
آواز میں ارشاد فرمایا، میں نے منع کر دیا تھا کہ اس ڈاکٹرنی کے وہاں ہرگز نہ جانا، لیکن تم نے میری
بات نہ مانی یہ کہہ کر میرے منھ پر اس قدر زور سے تھپڑ مارا کہ میں چکرا کر گر گیا میری ماں ہانپتی کانپتی
آ پہنچی اور پوچھا یہ کیا قصہ ہے میرے باپ نے سارا ماجرا بیان فرما دیا میری ماں نے اپنے زانو پر
میرا سر رکھ کر کہا اگر تو تو سمندر پار شیطان کے کان بہرے تیرے گولی لگ جاتی ننھے، تو ہائے

میں کیا کرتی ہائیں تو زندہ درگور ہو کر رہ جاتی، ہائے ماں اللہ آمین سے پالے اور بچہ اپنے کو آفت میں ڈالے..... اس کے بعد میں ایک چھوٹے سے کمرے میں قید کر دیا گیا۔ اور در و دیوار کے سناٹے سے گلینیسی گلینیسی کی آوازیں آنے لگیں۔

میرے باپ نے پولیس کی منھ بھرائی کر کے مقدمے کو تو ختم کرا دیا لیکن مجھ کو قید سے باہر نہیں نکالا۔ ایک روز شام کے وقت جب کہ میں اپنے زندان میں اداس بیٹھا ہوا تھا ایک بڑی مانوس آواز میرے کان میں آئی، دل نے کہا ہو نہ ہو یہ تو گلینیسی کی آواز ہے۔ میں سلاخوں دار کھڑکی کے پاس گیا اور دیکھا کہ گلینیسی میری ماں کے قدموں پر سر رکھے یہ درخواست کر رہی ہے کہ خدارا شبیر کو ایک نظر دکھا دیجئے اور میری رفیق القلب ماں ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ کہہ رہی ہیں کہ میاں (میرے باپ) باہر گئے ہوئے ہیں۔ ان کی واپسی تک، ٹھہر جاؤ اور گلینیسی قدموں سے سر اٹھا کے بڑی بے کسی کے ساتھ میری ماں کو دیکھ رہی ہے۔

یہ منظر دیکھ کر میرا کلیجہ پھٹنے لگا، خاندانی آداب کا پاس اور عزت کا احساس، اگر میرے منھ پہ ہاتھ نہ رکھ دیتا تو ایسی چیخ مارتا کہ میرے زندان کی چھت پھٹ جاتی۔

میں نے بڑے زور سے اپنے سینے کو دبایا، دانتوں پر دانت جما کر، اپنی آہوں کو روکا اور دل پر اس قدر دھکا لگا کہ میں دھڑام سے فرش پر گر پڑا، گرتے ہوئے میز پر پاؤں لگا اور میز پر رکھی ہوئی اچاری پتھر کے فرش پر گر کر تراق سے ٹوٹ گئی۔ میری ماں گھبرا کر کھڑی ہو گئیں جھپٹ کر میرے زندان کا دروازہ کھولا اور ہائے میرے بچے کہہ کر زمین پر بیٹھ گئیں اور میرے سر کو اپنے زانو پر رکھ کر زار و قطار رونے لگیں۔

گلینیسی کو موقع مل گیا، وہ میرے کمرے کی طرف جھپٹی، ابھی دہلیز تک ہی پہنچی تھی کہ میرے باپ آ گئے۔ انھوں نے یہ خلاف توقع سماں دیکھا تو دنگ ہو کر رہ گئے اور ڈانٹ کر فرمایا، ڈاکٹرنی! نکل ــــ! ابھی میرے باپ کچھ اور نہیں کہنے پائے تھے۔ کہ وہ بابا کہہ کر ان کے قدموں سے لپٹ گئی، میرے باپ لاکھ تند خو پٹھان سہی مگر شاعر تھے۔ ان کا دل پسیج گیا۔ اسے زندان میں لیکر آ گئے اور وہ میرا اترا ہوا منھ دیکھ کر رونے لگی۔

میں نے باپ کی موجودگی کے باعث اس کی طرف آنکھ نہیں اٹھائی اور اپنی رسوائی سے میرا تمام بدن ٹھنڈا ہو گیا۔

میرے باپ نے کہا ڈاکٹرنی۔ اگر تو مسلمان ہو جائے اور پردہ نشینی اختیار کرنے پر تیار ہے تو میں شبیر سے تیرا نکاح کرا دوں گا۔ میں دلوں کو توڑنے کا گناہ نہیں کر سکتا۔

گلینیسی میرے باپ کی بات کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکی، سو ایسے انداز میں اس نے میرے باپ

کی طرف نگاہ اٹھائی۔

میرے باپ نے مجھ سے ارشاد فرمایا ہشبیر اس کو میری بات انگریزی میں سمجھا دے ، میں شرم کے مارے بول نہیں سکا ، تو میرے باپ نے کہا ، میں تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ انگریزی میں اس ڈاکٹر کو میری بات سمجھا دے ۔ میں نے آنکھیں اٹھائے بغیر انگریزی میں اس کو بات سمجھادی اس نے کہا پاپا سے کہہ دو مجھ کو یہ دونوں شرطیں منظور ہیں ۔

میرے باپ نے فرمایا اس سے کہہ دو جمعرات کے روز وہ یہاں آجائے فرنگی محل چل کر مولانا عبدالباری کے سامنے مشرف با سلام ہو جائے اور نوکری سے استعفیٰ دے دے میں جمعہ کے دن اس کا نکاح پڑھا دوں گا ۔ میں گلینسی کو یہ بات بھی سمجھادی اور اس نے خوشی کے ساتھ منظور کرلی بدھ کے دن سر شام اس کے وہاں پہونچا تو اس کے بنگلے پر کچھ اس طرح کی سوگ واری دیکھی تو مجھے یقین ہوگیا کہ خدا نخواستہ میں کسی نہایت علم ناک سانحہ سے دوچار ہونے والا ہوں ۔

جب ڈرائنگ روم میں قدم رکھا تو ایک شخص نے یہ کہہ کر اس کی خواب گاہ تک جانے سے مجھے روک دیا کہ مس گلینسی پر دل کا بے حد شدید دورہ پڑا ہے ان کو گیس دی جارہی ہے یہ سنتے ہی مجھ پر بجلی گر پڑی دل زور زور سے دھڑکنے لگا ٹھنڈا پسینہ آنے لگا تمام بدن میں کپکپی پیدا ہوگئی اتنے میں وہ آدمی اپنی خواب گاہ میں داخل ہوا ، میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا وہ بے ہوش پڑی ہوئی تھی ۔ ڈاکٹر نے مجھ سے کہا آپ باہر چلے جائیں میں ڈرائنگ روم میں آگیا اور بوجھل قدموں کے ساتھ اس کونے سے اس کونے کے درمیان ایک ایسے عالم میں ٹہلنے لگا جو الفاظ کی گرفت میں نہیں آسکتا ۔

اور کوئی آدھ گھنٹے کے بعد جو میری نظروں میں ہزاروں صدیوں کے برابر تھا ، ڈاکٹر نے باہر آکر کہا افسوس کہ وہ مرگئی ، میں اسے بچا نہیں سکا ، میں نے چیخ ماری اور گر کر بیہوش ہوگیا اور وہیں گر گیا ۔ جب رات گئے ہوش آیا پہلے تو دیر تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ میں کہاں ہوں اور یہ میری حالت کیا ہے جب تھوڑی دیر میں حواس درست ہوئے تو دیکھا کہ میں اسپتال کے اسپشل وارڈ میں ہوں اور میرے باپ میرے روبرو ننگے سر کھڑے دعائیں مانگ رہے ہیں ۔

میری آنکھ کھلتے ہی میرے باپ میری طرف جھکے اور مسرت آمیز نرمی سے پوچھا ، بیٹا طبیعت کیسی ہے میں نے نقاہت بھری آواز میں کہا میاں میں اچھا ہوں میرے باپ سجدۂ شکر لانے میں گر گئے میرے سر سے صدقہ اتار اگیا اور تمام اسپتال میں مٹھائی تقسیم کی گئی ۔

گلینسی کی موت نے مجھ کو ادھ موا کر دیا زندگی میری نظروں میں بے معنی اور سپاٹ ہو کر رہ گئی مجھ کو ہر روز دس بجے دن کے بعد خفیف بخار آنے لگا اور چہرہ اس قدر اتر گیا کہ میرے باپ

کو سخت تشویش پیدا ہو گئی وہ مجھ کو نینی تال لے گئے ابرار اور مختار کو میرا جی بہلانے کے لئے ساتھ لے لیا میرے باپ میرے ساتھ نہیں ٹھہرے ایک دوسری کوٹھی میں قیام کیا اور صبح و شام ڈاکٹر کو لے کر آتے رہے۔

جب کوئی چار مہینے کے بعد مدّہم سے خفیف بخار سے مجھ کو نجات حاصل ہو گئی اور میرا رنگ ٹھہرنے لگا تو ملیح آباد لے آئے اور ایک سال تک لکھنؤ جانے نہیں دیا۔ کہتے ہیں وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ یہ بات صحیح ہے لیکن سو فی صد صحیح نہیں۔ ہر چند وہ اگلی سی اداسی باقی نہیں لیکن بار بار دل میں برسوں کسک ہوتی رہی اور اب بھی جب اس عمر میں بھی گلیستی کی موت یاد آ جاتی ہے تو کلیجہ پکڑ کر رہ جاتا ہوں۔ ہائے وہ اپنا دین بدل رہی تھی پر وہ نقشینی کی گھاٹی پر آمادہ ہو گئی تھی مرنے سے ایک روز پیشتر استنجے ابھی دے چکی تھی اور جمعہ کو دلہن بننے والی تھی بدھ کو ہمیشہ کے واسطے سو گئی۔

دل می رود ز دستم صاحب دلاں خدارا ‏ ‏ درد اکہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

کشتی شکستگانیم اے بادِ شرطہ برخیز ‏ ‏ باشد کہ باز بینم آں یارِ آشنا را

م بیگم

یہ ایک دیسی ریاست کا ذکر ہے۔ میں ایک نواب صاحب کی حویلی میں ٹھہرا ہوا تھا۔ چھوٹے دادا اور ابرار میرے ساتھ تھے۔

اس حویلی کے ایک گوشے میں ایک دوسری حویلی تھی، جس میں نواب صاحب کے فرزند رہتے تھے ایک دن میری غیر موجودگی میں ابرار اپنا سامان اٹھا کر چھوٹی حویلی میں منتقل ہو گئے اور رہنے لگے اس کے بالاخانے پر۔ میں نے ابرار سے اس انتقال مکانی کا سبب دریافت کیا تو بغلیں جھانکنے لگے، مجھ کو یقین ہو گیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔

میں شام ہوتے ہی ان کے پاس پہنچ گیا۔ مجھ کو دیکھ کر ان کے منہ پر کلو نجی سی دوڑ گئی، میں نے پوچھا ابرار کیا بات ہے انھوں نے بڑی بے کسی کے ساتھ کہا۔ کیا بتاؤں میرے پیٹ میں لو لگ گئی ہے۔ ابرار یہ پیٹ میں لو لگنا کیا ہوتا ہے۔ یہ تو پورے جسم کو جھلسا دیتی ہے اور تمھارا تمام بدن چھوڑ کر صرف پیٹ پر تمھارے لو کا اثر ہوا ہے، کیا گھانس کھا گئے ہو؟ یا مجھے چندھلا

لیے؛

ابرار نے کہا شبیر حسن خاں، قرآن مجید کی قسم سچ کہہ رہا ہوں۔ کہ اتنے میں سامنے کے دروازے کا ــــــ آدھا پٹ کھلا اور اس سے جھانکا، ام بیگم نے ــــــ اللہ اکبر وہ اس کی اٹھتی جوانی وہ شہابی رنگ، وہ دھانی دوپٹہ اور وہ کتابی مکھڑا۔ میں ایک ہی نظر میں اس پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا، اور جب ایک پل کے بعد اس نے پٹ بند کر لیا تو میں نے کہا، جناب ابرار حسن خاں صاحب اثر ملیح آبادی :-

جلوے میری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کبھی وہ اڑیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

وہ جو آپ کے پشت مبارک میں لو لگ گئی ہے، اس کو میں نے دیکھ لیا ہے اور اس کو دیکھ کر میرے بھی سینے میں لو لگ گئی ہے۔ کہیے کیا ارشاد عالی ہے۔؟

ابرار نے کہا شبیر حسن خاں قرآن مجید کی قسم یہ بات نہیں۔ میں تو اس لڑکی سے واحد شاہد ہی نہیں، قرآن مجید کی قسم آج پہلی بار اس کو دیکھا ہے۔

میں نے کہا خاں صاحب اگر آپکا بیان صحیح ہے تو مجھ کو یہ سوچ کر بڑا اطمینان ہو رہا ہے کہ میرے آپ کے مابین رقابت کا قدم نہیں آنے پائے گا جگنو سے کہئے میر البتہ یہیں لے آئے ابرار کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں، انھوں نے کہا شبیر حسن خاں یہ کمرہ بڑا خطرناک ہے یہاں رات کو بچھو نکلتے ہیں۔ اور ایک دن تو ایک کالا سانپ بھی رینگ کر اس سامنے والی نالی میں داخل ہو گیا تھا۔ میں نے کہا ابرار حسن خاں پھر آپ اس خطرناک جگہ کیوں قیام فرمائیں۔

انھوں نے کہا میری جان قرآن مجید کی قسم آپکی جان کی کسی قیمتی نہیں ہے۔ میں نے کہا بجا ارشاد فرمایا آپ عشق کی خاطر اپنی جان کو خطرے میں ڈالے ہوئے ہیں میں بھی اس کی خاطر اس خطرے کو اپنے سر لے رہا ہوں بلائے جگنو کو اور منگائے میر البتہ ابرار کا منھ ذرا سا نکل آیا وہ بوڑھوں کی طرح جھکے جھکے اٹھے، جگنو کو دھڑکتے دل سے آواز دی جگنو موجود نہیں تھا اسے تلاش کرنے کیلئے زینے سے اتر کر بڑی حویلی چلے گئے اتنے میں وہ دوبارہ پٹ کھلا اور بے اس تکلف سے کہ گویا بت کدے کا در کھلا۔ میں نے اس مکھڑے کی طرف نگاہ اٹھائی۔ دل حسن کی شفق میں ڈوب گیا اس نے کن انکھیوں سے مجھے دیکھا، اس کی نظروں نے بات کی، میری نگاہوں نے جواب دیا۔ آنکھوں کی زبان اس قدر سلجھی، صاف، اور دوٹوک ہوتی ہے کہ غلط فہمی کا امکان ہی نہیں رہتا آنکھوں کی بات چیت ہواؤں میں نہیں تیرتی، خون کی لہروں میں ڈوب جاتی ہے ایک دل کہتا ہے دوسرا دل سمجھتا ہے۔

نگاہ ہے معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

اور ہم دونوں کے مابین معاہدہ ہو گیا۔

اتنے میں ابرار آ گئے۔ انھوں نے پٹ بند ہوتے اور میرے چہرے پر عرفان راز و نیاز کھلتے دیکھ لیا۔ سُن سے ہو کر رہ گئے۔ ان کے چہرہ کی بشاشت کا مجسمہ گر گیا، وہ میرے سامنے اپنی دیانت اور طاقت کھو کر خاموش ہو کر بیٹھ گئے اور میرے بچھے ہوئے بستر کو اس طرح دیکھنے لگے گویا انکی قبر کھود دی گئی ہے۔ میں نے کہا ابرار تم کہو تو میں اپنا بوریہ بدھنا اٹھا کر بڑی حویلی میں چلا جاؤں تھوڑی دیر انھوں نے کچھ سوچ کر جواب دیا آپکے ہمارے آپکے درمیان ایک شریفانہ معاہدہ ہو جائے۔ آپ یہیں رہیں لیکن ہم دونوں اپنے اپنے در بانٹ لیں۔ ایک در کے نیچے الگنائی میں گائے بندھی ہوئی ہے ایک در کے نیچے گھڑونچی رکھی ہوئی ہے آپ جو اور چاہیں پسند کر لیں، میں نے کہا گھڑونچی والا در مجھے دے دو گائے والا در تم لے لو، میرے در کا تعلق ہو گا پانی سے اور تمھارے در کا دودھ سے۔ ابرار نے یہ تقسیم منظور کر لی اور اب ہم دونوں اپنے اپنے دروں میں اس پری ذات کی چلت پھرت دیکھنے کے لئے اس طرح دن دن بھر بیٹھنے لگے۔ جیسے ماہی گیر دریا میں جال ڈال کر ساحل پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ ارے میں یہ کہنا بھول گیا کہ جب ہمارے مابین دروں کی تقسیم ہوئی تھی تو ابرار نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ دیکھئے ہم دونوں بڑی ایمانداری کا کھیل کھیلیں گے۔ اگر وہ میرے در کے سامنے زیادہ۔ آپ کے در کے سامنے زیادہ آیگی یا آیگی ہی نہیں تو آپ اس کے عشق سے دست بردار ہو جائیں گے اور معاملہ اس کے برعکس ہوا تو میں دست بردار ہو جاؤنگا۔

جب ہم ٹکٹکی لگا کر دروں میں بیٹھنے لگے تو اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ اس پری زادنے ادبدا کر میرے در کے نیچے کی انگنائی میں آنا اور اوپر آنکھیں اٹھانا شروع کر دیا اور ابرار بیچارے کا در سونا ہو کر رہ گیا۔ میں کیا بتاؤں اس کے آنکھیں اٹھانے کا انداز، قاعدہ ہے بجلی اوپر سے نیچے گرتی ہے لیکن جب وہ انگنائی ہے میرے در کی طرف آنکھیں اٹھاتی تھی تو نیچے سے اوپر بجلی گرنے لگتی تھی۔

اس کی متواتر بے اعتنائی سے ابرار کا دل ڈوبنے لگا مجھ سے انکی یہ حالت دیکھی نہیں گئی میں نے کہا ابرار میں اب کل ہی بڑی حویلی میں اٹھ جاؤنگا۔ ابرار نے گلے لگا لیا اور کہا نہیں تم بڑی حویلی میں ہرگز منتقل نہیں ہو سکتے۔ تمہیں یہیں رہنا پڑے گا۔

ان باتوں میں رات کے نو بج گئے اور ہم دونوں کھانا کھا کر سو گئے۔

غالباً آدھی رات گذ ری ہوگی مجھے ایسا محسوس ہوا گویا کوئی نہایت ملائم چیز میرے تلوؤں سے مَس ہو رہی ہے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا ــــ اور یہ دیکھ کر دنگ ہو گیا کہ وہ آفت روز گار میرے تلوؤں سے اپنے گال لگائے بیٹھی ہے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہے۔ میں نے اُٹھ کر کھینچ کر کلیجے سے لگا لیا، اس نے ابرار کی چارپائی کی طرف اشارہ کیا میں

اسے دوسرے کمرے میں اٹھا لے گیا۔

ٹھیک دوپہر کو پھر جب وہ نیلے پیلے دوپٹہ ڈال کر اور موباف باندھ کر رخصت ہونے لگی تو اس نے کہا، میرے ابا میری اس شادی سے خوش نہیں ہیں، وہ کوشش کر رہے ہیں کہ مجھے طلاق دلا کر گو ابرار سے بیاہ دیں اور میری دوسری شادی کر دیں، اب میں آپ کے سوا کسی دوسرے مرد کو ہاتھ نہیں لگانے دونگی۔ کل آپ جا رہے ہیں۔ میں آپکو مجبور نہیں کر سکتی اس لئے کہ آپ کی اماں جان نے تار دے کر آپ کو بلایا ہے۔ لیکن میرے سر کی قسم سات دن کے اندر آجائیے گا، اگر آپ اگر آپکی اماں جان نے تار دے کر آپ کو بلایا ہے لیکن مجھے مجبور کریں گے دوسری شادی پر میں زہر کھا کر مر جاؤنگی۔

میں نے اسکو سینے سے لگا لیا اور کہا سات دن تو بہت ہوتے ہیں میں چوتھے یا پانچویں دن ہی آجاؤنگا اور تمکو اگر یہ لے جا کر اپنے ایک قرابت دار کے گھر میں رکھونگا۔ اور وہاں سے ہم دونوں پھر لکھنؤ چلے جائیں گے۔ دیکھو بالکل نہ گھبرانا میرا وعدہ پکا ہے۔ وہ میرے گلے میں باہیں ڈال کر رونے لگی اور میرے آنسو بھی بہنے لگے۔

دوسرے دن جب گاڑی میں بیٹھ کر اسٹیشن جانے لگا تو اس نے بالاخانے کے دریچے سے مجھکو جھانک کر دیکھا اس کی موتیوں کی سی آب دار آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور بیر سی آنکھیں چیخ رہی تھیں کہ وقت پہ آجانا۔

ملیح آباد پہنچا تو معلوم ہوا کہ ابرار نے میری ماں کو سارا کچا چٹھا لکھ بھیجا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اگر شبیر ریاست میں رہا تو میری جان خطرے میں پڑ جائے گی۔

ماں سے میں نے شرم کے مارے ابرار کے خط کا کچھ نہیں پوچھا لیکن جب تیسرے دن میں نے اس ریاست کے سفر کی اجازت طلب کی تو انھوں نے فرمایا اگر تو وہاں گیا تو دودھ نہیں بخشونگی میرے سر کی قسم وہاں قدم نہ رکھنا۔ ماں کی اس شدید تاکید کو دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ ابرار کے خط والی بات صحیح ہے ایک طرف تو ماں کا احترام اور ایک طرف اپنے وعدۂ محکم کا پاس۔ میں عجب کشمکش میں پڑ گیا اور دل میں کچھ ایسا دھکا لگا کہ بلبلا کر مجھ پر بخار چڑھ آیا اور ایکسو پانچ ڈگری تک پہونچ گیا گھر بھر میں کہرام مچ گیا دن میں چار چار پانچ پانچ بار ڈاکٹر عبدالکریم آنے لگے بار بار میرے سر پر برف رکھی گئی دو دو گھنٹے کے بعد پاؤں میں جونکیں لگائی گئیں تین تین گھنٹے میں دوائیں پلائی گئیں منتیں مانی گئیں ہر صبح کو قرآن کی آیتیں دم کی گئیں پھر بھی بیس روز سے پہلے بخار نہیں اترا اور میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا۔

ابھی میں پورا تندرست ہونے نہیں پایا تھا کہ میرے پاس اس ریاست سے میرے ایک

محرم راز کا خط آیا کہ م۔ بیگم کو اس کا باپ گوالیار لے کر چلا گیا۔ وہاں اس کی شادی ٹھہرائی لیکن اس نے خودکشی کرلی۔ خط میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا، جوڑی آگئی۔ جوڑی کے بعد بخار آگیا اور ایک دم سے ایک سو تین ڈگری ہو گیا۔

کہاں تک بیان کروں اپنی دردمندی۔ جسم کو بخار جلا رہا تھا اور دل میں اس نامراد کی خودکشی کے شعلے بھڑک رہے تھے اور ہر بُنِ مو سے ہائے ہائے کی آوازیں آرہی تھیں اللہ دشمن کو بھی وہ دن نہ دکھائے۔ حیرت اس بات پر ہے میں کم بخت مر کیوں نہیں گیا۔

اللہ اکبر یہ تیغ در دست و کفن بر دوش قاتل زندگی

جہاں بسمل گہ درد است آسائش کہ دید ایں جا؟

بقدر سخت جانی ہر کسے بر خود دار طپید ایں جا!

صاحب زہر عشق نے عشق کے باب میں کتنی سچی بات کہی ہے :-

بس میں ڈالے نہ کبریا اس کے رحم دل میں نہیں ذرا اس کے

مار ڈالا تماش بینوں کو زہر کھلوا دیا حسینوں کو

بیکاری!

ایک بار مختار احمد خاں ملیح آبادی سے ملنے اور سیر کرنے کلکتے جا رہا تھا، چھوٹے دادا، جگنو اور علی حسین خدمت گار ہم سفر تھے۔

میرے ڈبے میں ایک سیٹ پر ایک بوڑھا انگریز لیٹا ہوا تھا، اور ایک سیٹ پر ایک دراز قامت گل چہرہ، چھریری لڑکی، آدھی لیٹی، کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ درمیانی سیٹ پر بیٹھ گیا اس کے نکیلے چہرے کی فوج ہائے رنگا رنگ سے نکل نکل کر ایک سنہرا آنکڑا بار بار میری طرف آتا اور میری نظروں کو اپنی گرفت میں لے کر اس کے گالوں کی طرف لے جاتا تھا یہ مشغلہ تادیر جاری رہا لیکن وہ مطالعہ میں اس قدر مستغرق تھی کہ اسے خبر بھی نہیں ہوئی کہ میں کب ڈبے میں داخل ہوا وہ کیسی ترسی نظروں سے اس کو دیکھ رہا ہوں۔

میں نے اس کی کتاب پر نظر جمائی تو دیکھا کہ وہ شکسپیر کا ڈراما "رومیو جولیٹ" کا مطالعہ کر رہی ہے میرے دل نے کہا آثار اچھے ہیں۔ نتیجہ بھی آثار سے اچھا ہی نکلے گا۔ انشاء اللہ۔ تھوڑی دیر میں ہوا بہت ہی تند ہو گئی اور وہ اپنے شیشے والی کھڑکی بند کرنے کی کوشش

کرنے لگی۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ اس نازک بدن سے کھڑکی نہیں سنبھل رہی ہے اور اس کی گوری گوری کلائیاں لچکی جا رہی ہیں۔ میں اس قدرت کے عطا کردہ زریں موقعہ سے فائدہ اٹھانے کے واسطے جلدی سے اس کے قریب گیا اور شیشہ چڑھا دیا اس نے میری طرف نگاہ اٹھائی اور مجھ پر نظر پڑتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ گویا اس نے کوئی چیز جلدی سے نگل لی۔ مسکرا کر بہ شکریہ ادا کیا ہاتھ سے کتاب رکھ دی اور ماتھے سے لٹیں ہٹانے لگی، اور میں نے دل ہی دل میں کہا مبارک ہو میاں جوش۔ سر شام گاڑی کسی اسٹیشن پر رکی تو وہ بوڑھا ہمسفر اتر گیا اور میں دعائیں مانگنے لگا کہ اب کوئی دوسرا مسافر آخر تک نہ آئے۔

جب گاڑی وہاں سے چلی اور کوئی مسافر ہمارے درجہ میں نہیں آیا۔ میرا دل باغ باغ ہو گیا اور یہ دیکھ کر اور بھی خوشی ہوئی کہ اس لڑکی کے چہرے پر اس صورت حال سے بحالی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ اب ہماری نگاہوں کے جلد جلد مبادلے ہونے لگے۔ لیکن ایک دوسرے سے بات کرنے کی جرأت نہیں ہوئی اور میں سوچنے لگا کہ بچپن کی تربیت انسان کو کس قدر شرمیلا بنا دیتی ہے۔ اب آفتاب ڈوب گیا اور میں اپنے طلوع کی تیاری کرنے لگا، بوتل کھولی کاگ بولا کھٹاک، بیچ سے دیا سلائی لگائی، اگر بتی جلائی، گلاس بھرا چمچے سے سوڈا کو گردش دی، جھاگ اٹھے چمچا گلاس سے نکالا، گیس کی پتلی سی کمر لچکنے لگی، ایک گھونٹ مازیر لب بسم اللہ کہہ کر پیا، تین منٹ کے اندر طبیعت اجاگر اور امنگ بیدار ہو گئی۔

جب دوسرا جام بھرا اس نے آہستہ سے کہا رام رام۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے اس نے کہا اگر کی بیتی ہر دے میں اترتی چلی جا رہی ہیں، میں نے کہا بجھا دوں؟ اس نے کہا، نہیں ایک بتی اور جلا دیجئے میں نے دوسری بتی جلا کر کہا، آپ کہاں جا رہی ہیں۔ اس نے کہا اندور میں اس نے دریافت کیا، اور آپ میں نے کہا لکھنؤ اس کے چہرے پر دھواں سا دوڑ گیا۔ اس نے پوچھا آپکا نام، میں نے کہا جوش۔ میں نے پوچھا آپ کا نام؟ اس نے کہا ر۔ کماری اس نے کچھ ایسی للک سے اپنا نام بتایا جیسے کوئی کسی مفلس کو خزانے کا پتہ بتاتا ہے۔ میں نے دریافت کیا آپ کرتی کیا ہیں؟ اس نے کہا فرسٹ ایر میں پڑھتی ہوں۔ تیسرے جام کا گھونٹ پینے کے بعد میں اپنا بستر درست کرنے کے بہانے سے بامقصد لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور اس کی طرف اس طرح جھک گیا کہ میرے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر جا کر ٹک گئے اس کے منھ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی میں معافی طلب کرتا سیدھا ہونے لگا تو اس نے اپنے ملائم ہاتھوں سے میری دونوں کلائیاں پکڑ لیں، اور کہا جلدی سے بیٹھ جائیے نہیں تو گر پڑیے گا یہ کہتے ہی اس نے اپنے پاؤں سمیٹ لئے اور میں اس کے بستر پر لیٹ گیا۔ اس نے کہا ڈرنک بری

چیز ہے۔ یہ آدمی کو گرا دیتی ہے۔ میں نے کہا، آپکو کیا معلوم اس نے کہا ابھی ابھی تو آپ ہی کو گرتے ہوئے دیکھا ہے اور میرے پتا جی بھی ڈرنک پینے اور ڈگمگانے لگتے ہیں۔

یہ کہہ کر اس نے اپنے بال کھول دیئے سدری اتاری گھڑی کلائی سے اتار کر سرہانے رکھ دی میرے پہلو سے پہلو گرا دیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گور کھیلنے لگی اور میں اس کے چھلکتے ساغر جمال میں ڈوب گیا۔

صبح آنکھ کھلی ایک عجیب شیریں تبسم کا مبادلہ ہوا اور ایسا لگا جیسے ہم ایک عرصہ دراز سے ایک دوسرے کے آشنا ہیں اور "آپ سے گذر کر "تم" کی نوبت آگئی۔

محبت کتنے برسوں کے فاصلے ایک چھلانگ میں طے کر لیتی ہے۔

وہ ایک جادو کے جزیرے کی پری کی مانند بستر سے اٹھی، الجھے بال سلجھائے اور میری سیٹ پر بیٹھ کر اس نے ایک شاہزادی کی مانند کہا تم کلکتے نہیں جاؤ گے بنارس میں اتر جاؤ گے میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا جو حکم ہو دیوی جی کا۔

پھر اس نے کہا اب تم جوش نہیں جوشی ہو اپنا پرانا نام بھول جاؤ میں نے کہا بہت اچھا بڑے کا۔ اتنے میں ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی بوڑھا خادم آ گیا غسل کے سارے سامان غسل خانے میں رکھ دیا اور جب وہ نہا کر نکلی فضا پر صبح بنارس طلوع ہو گئی۔

اس نے اپنے کالج اور سڑک کا نام بتایا کہا کہ میرے کالج کے بالکل سامنے ایک نہایت عمدہ ہوٹل ہے، تم اس میں ٹھہر جانا۔ میں انٹرول میں ملنے آؤں گی، اور دیکھو بنارس اسٹیشن پر بالکل اجنبی بن جانا۔

دوسرے اسٹیشن پر چھوٹے دادا کے کمپارٹمنٹ گیا ان سے کہا اب میں بنارس میں اتر رہا ہوں اس کے بعد کلکتہ جاؤں گا چھوٹے دادا نے منہ بنا کر حسب دستور کہا ہم تو پہلے ہی کہتے تھے آخر بنارس میں کیا کام نکل آیا بھائی شبیر حسن خاں یہ اس لڑکی نے شاید نیا گل کھلایا ہے جو آپ کے ڈبے میں سفر کر رہی ہے دیکھئے ہندو مسلم نفرت کا آغاز ہو چکا ہے۔

میں نے کہا چھوٹے دادا آپ اطمینان رکھیں۔

جو دل چھین لینے کا ڈھب جانتے ہیں + وہ ترکیب ہر ترکیب سب جانتے ہیں

چھوٹے دادا نے ملازموں کو خبر کر دی اور جب بنارس کا اسٹیشن آیا میں نے اس لڑکی سے بیگانگی اختیار کر لی مجھے منہ سے اترا اور اس کے بتائے ہوئے ہوٹل میں جوشی کے نام سے ایک کمرہ لے کر ٹھہر گیا۔

کمرے میں پہنچ کر چھوٹے دادا نے کہا بھائی شبیر حسن خاں ہمکو آپکی یہ باتیں پسند نہیں

بنارس میں ٹھہرنا بہت خطرناک ہے، میں نے بنارس اسٹیشن سے پہلے ہی تینوں لوٹے کپڑے کے تھیلے میں بند کر دیئے تھے کہ کوئی یہ نہ بھانپ سکے کہ ہم مسلمان ہیں، آپ کہتے ہیں وہ یہاں دو پہر گزارے گی اگر کسی کو اس پتہ چل گیا اور پتہ چلنے میں دیر ہی کیا لگتی ہے تو ہم سب یہیں قتل کر ڈالے جائیں گے۔ دیکھئے ہم سب پہلے ہی سے کہے دیتے ہیں۔ میں نے کہا چھوٹے دادا پٹھان ہو کر آپ ایسی ڈر جانے والی بات کر رہے ہیں انھوں نے کہا پٹھان ہونے سے کیا ہوتا ہے ایک کی دو۔ دو کی چار ایک آدمی ایک مجمع کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے کہ اتنے میں دروازہ کھلا وہ ایک مزدور کو ساتھ لئے کمرے میں آئی مزدور سے کہا یہاں اتار دو مزدور نے سامان رکھ دیا اور اجرت لے کر چلا گیا چھوٹے دادا اور دونوں خدمت گار بھی کمرے سے نکل کر برآمدے میں چوکنا ہو کر بیٹھ گئے اس نے ڈبے کھول کھول کر میز پر مٹھائی اور پھلوں کا انبار لگا دیا اپنی جیب سے نہایت خوبصورت سونے کی گھڑی نکال کر اپنے دست ناز سے میری کلائی پر باندھ دی ایک بنڈل کھول کر دو دھوتیاں اور دو شربتی کرتے میرے سامنے رکھ کر اس نے کہا کل بہت تڑکے گنگا جی کے گھاٹ پر یہ دھوتی باندھ کر اور کرتا پہن کر آجانا اور ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو جانا میں تم کو .... مندر لے چلونگی۔

یہ کہہ کر اس نے لپٹا ہوا زنانہ نکالا اور کہا اسے گلے میں ڈال لینا اس کے بعد ایک ڈبیہ سے چندن نکال کر کہا، اسے چلتے وقت ماتھے پر لگا لینا۔

میں نے اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر کہا .... کہ ڈارلنگ یہ کیا ہو گی یا آلسٹ کریم لگوا دو گی۔ اس نے بڑے مزے سے کہا تمھارا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا اور تمھاری باتیں آلسٹ کریم اور ریلیں نے پہنچ کر سینے سے لگا لیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد چھوٹے دادا غضب وخوف کی اپنی مونچھوں اور گالوں پر سبھلائے کمرے میں آ گئے اور میں نے سارا ماجرا ان سے بیان کر دیا ان کے ہوش اڑ گئے کہا ارے غضب خدا کا بنارس کے مندر میں ہندو بن کر جاؤ گے اگر خدانخواستہ کسی نے تم کو پہچان کر شور مچا دیا تو کیا کرو گے یہ کلکتہ کا سفر تو بڑا خطرناک ثابت ہوا، ہم تو پہلے ہی کہتے تھے میں نے کہا چھوڑئیے بھی ان باتوں کو، یہ مٹھائی اور پھل کھائیے اور وہ تمام خطروں کو یکسر بھول کر کھانے پر ٹوٹ پڑے اور خود ان کے بقول کھاتے کھاتے تکے اڑا دیئے۔

میں صبح جب گنگا کی طرف پورا ہندو بن کر چلنے لگا چھوٹے دادا کانپنے لگے، مجھکو بہت سمجھایا میں نے انکی بات نہیں مانی، پھر جگنو سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ منجھلے بھیا اگر جانے کی ٹھان لی ہے تو مجھکو اور علی حسین کو ساتھ لے چلئے ہمارے ہاتھوں میں ڈنڈے ہیں اور جیب میں چاقو میں نے کہا جگنو کوئی خطرے کی بات نہیں تمھارا میرے ساتھ جانا مناسب نہیں۔ یہ کہہ کر میں روانہ ہو گیا اور جب راستے میں مڑ کر دیکھا تو جگنو اور علی حسین نظر آئے

بیوں نے کہا تجھ سے دور رہو ما ، بھنوں نے اپنی رفتار سست کر دی۔ گھاٹ پر پہونچا تو صبح طلوع ہو رہی تھی ہائے وہ دھندلکے کا جادو بھرا گھاٹ ، وہ گنگا مائی کا گنگنانا تا پاٹ ، وہ الھڑدن کے قدم اٹھانے کا ڈھنگ ، جیسے چلتے پھرتے رنگ ، گوری نس نس چلیو مورے سنگ ۔

وہ بہکی بہکی جوانیاں وہ حسن کی دھندلی دھندلی گل فشانیاں۔ وہ متوالی ڈبکیاں وہ نندا سی انکھڑیاں ، وہ دھندلکے میں الھڑ کنیاں کا ریلا گویا خواب میں پریوں کا میلا۔ وہ بھیگی ململ کی ساریوں کی عریاں ساما نی گویا کہرے میں برستا پانی سنگ مرمر کے مجسموں کی جوانی وہ پلکوں کی جھپکوں میں بجتی شہنائیاں ، وہ لہروں میں ڈوبی گداز نیاں وہ آشنان کا نکھار ، وہ مکھڑوں کا جھنکار ، وہ نسیم صبح کی سرسراہٹیں ، وہ گلابی مسکراہٹیں ، وہ گمرد نکے لچکاؤ وہ بے ناتج کے بھاؤ ، وہ ڈھلے ڈھلے گال وہ چھکے خدوخال لہروں میں وہ ہلکی ہلکی سارنگیاں وہ دوپٹوں میں بھیگی بھیگی نارنگیاں ۔

خورشید طلوع ہو رہا ہے

افسانہ شروع ہو رہا ہے

اور جادو بھری سہانی وفضائیں میرے من مندر کی وہ دیوی میرے سامنے آئی گویا گوکل بن میں صبح مسکرائی ۔ اور ...... اس نے بھیگے ہوئے بالوں سے جو جھٹکا پانی

جھوم کے آئی گھٹا ، ٹوٹ کے برسا پانی

پھر اس نے مجھے آواز دی ، جوشی بھیا ، میرے پیچھے پیچھے آؤ اور میں جوشی بھیا کے مرے میں ڈوبا ہوا اگر دن ڈال کر اس کے ساتھ ہو لیا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک جمال و جلال میں ڈوبا ہوا مندر نظر آیا اس نے اشارہ کیا ، اور میں خدا کا نام لے کر بیت خانے میں داخل ہو گیا۔ اور بھجن سننے لگا ، اور بھجنوں ، گھنٹوں اور ٹیٹوں میں ڈوب کر جاری ہو گیا ، میرے دل کی زبان پر " لا موجود الا اللہ " اس عالم استغراق میں ایک جانب میری نگاہ اٹھی دیکھا کہ ایک صاحب مجھ کو عجیب کشمکش کے عالم میں گھور رہے ہیں ، میرا دل سن سے ہو گیا اس خیال سے میرے رونگٹے کھڑے اگر مجھکو پہچان کر اگر انھوں نے اعلان کر دیا کہ کیا یکو یا سمائے اس مندر میں ایک ملچھ مسلمان بیٹھا ہوا ہے تو میں پل بھر میں دیوی کے چرنوں میں بھینٹ چڑھا دیا جاؤنگا چھوٹے دادا نے سچ کہا تھا کہ تم بڑا خطرناک کام کر رہے ہو۔

دل سے آواز آئی عشق بازی کرو ، اور پھر بھی مرنے سے ڈرو ، مرنا تو ایک نہ ایک دن ہے ہی وہ بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے تو یہ کہیں بہتر ہے کہ معشوق کے قدموں میں جان دے دی اور یا آواز بلند کہو بکیشِ عشق مرا می گشتند و غیرت نیست ، تو بہتر بر سم بام اگر خوش تماشا نیست ارے شیخ و خنجر بہ پا پوش قلندر ! یہ سوچ کر میں نے اپنی نظر گھورنے والے کی جانب پھر نظر اٹھائی اس نے مسکرا کی

جنبش سے مجھے سلام کیا۔ میں بھی اسی طرح گھورنے والے کی جگہ پھر جانب نظر اٹھائی اسی نے ہاتھ
کی جنبش سے مجھے سلام کیا میں نے بھی اسی طرح سلام کا جواب دیا اور اس یقین کے ساتھ کہ مجھکو پہچان
لیا گیا ہے قتل پر آمادہ ہو کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں بھجن ختم ہو گئے۔ مجمع برخواست ہونے لگا وہ بھی کھڑی
ہو گئی باہر چلنے کا اشارہ کیا میں اس کے پیچھے پیچھے مندر کے باہر آ گیا۔

ابھی ہم دونوں چند قدم ہی چلے تھے کہ پشت سے آواز آئی، جوش صاحب آداب عرض ہے میں نے
مڑ کر جواب دیا دیکھا کہ یہ وہی صاحب ہیں جو گھور رہے تھے انھوں نے قریب آکر کہا بندے کا نام بدری
پرشاد بدر ہے میں نے آپکو الہ آباد کے مشاعرہ میں دیکھا تھا میں نے کہا آپ سے مل کر بہت خوشی
ہوئی اور میں آپکی ادب نوازی اور شرافت کا قائل ہو گیا کہ آپنے مجھکو مندر میں دیکھا اور خاموش رہے
انھوں نے کہا بندہ پرور میں کائستھ ہوں ہمارا اور مسلمانوں کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے آپ شاعر
کی حیثیت سے مندر، مسجد اور گرجا گھر سب جگہ میں محبت رکھتے ہیں۔ آپ کا قیام کہاں ہے میں جی
بھر کے آپ سے ملنا چاہتا ہوں،

وہ آدمی شریف اور بے خطر تھے، لیکن اس خوف سے کہ وہ ہوٹل میں آئیں اور ان سے اس کی
مڈبھیڑ ہو جائے میں نے کہا میں آج سہ پہر کو ہی کلکتہ چلا جاؤنگا۔
انھوں نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور یہ شعر سنا کر چلے گئے۔

میاں کعبہ و بت خانہ فرق یک گام است
میاں شیخ و برہمن، ہزار با فرسنگ

جب میرے اور بدر صاحب کے مابین بات چیت ہو رہی، وہ تھوڑے سے فاصلے پر کھڑی سن
رہی تھی اس کے چہرے کا عجیب عالم تھا اور اس قدر ڈری ہوئی تھی کہ چہرے پر ایک رنگ آرہا اور
ایک جا رہا تھا۔ راستے بھر وہ کچھ نہیں بولی، اور ہوٹل پہونچتے ہی وہ دھڑام سے گر پڑی مجھ سے
کہا جلدی پانی لاؤ پانی پی کر وہ اٹھ بیٹھی کہنے لگی جب وہ آدمی تم سے بات چیت کر رہا تھا میری
چھاتی دھک دھک ہو رہی تھی کہ ہے رام اب گیا ہو گا میں نے کہا پیاری تمھارے پریم میں مرجانا سو
زندگیوں سے بہتر ہے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آنکھیں پونچھتی ہوئی کالج چلی گئی۔

اتنے میں چھوٹے دادا کمرے میں آ گئے اور منھ پھلا کر کہنے لگے، بھائی شبیر حسن خاں، اس
خطرے میں کب تک پڑے رہو گے میں نے کہا بس دو چار دن اور رہونگا،

لیکن ر۔ کماری نے میرے پاؤں میں زنجیریں ڈال دیں، کچھ اوپر ایک مہینے تک مجھے روکے
رکھا، کیا بتاؤں ہر دن عید تھا اور ہر رات شب برات۔
ایک دن وہ انٹرول میں بے حد گھبرائی ہوئی آئی چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اس نے جلدی

جلدی سانس لے کر کہا میرے پتاجی کو میرے پریم کا پتہ چل گیا ہے یہ خبر اس ہوٹل کے کسی آدمی نے ان تک پہونچادی ہے۔ پتاجی کے تیور بہت برے ہیں۔ میں تو سب کچھ بھگت لونگی تم آج ہی بلکہ ابھی ابھی یہاں سے چلے جاؤ میں کرسمس کی چھٹی میں اپنی چاچی سے ملنے لکھنؤ آؤنگی اپنا پتہ لکھ دو میں نے اپنا پتہ لکھ دیا اس نے کہا اچھا رام رام یہ کہہ کر وہ رک گئی اور چیخ مار کر میرے گلے میں باہیں ڈال کر زار و قطار رونے لگی میری بھی ہچکیاں بندھ گئیں اور ہم دیر تک چمٹے ہوئے روتے رہے اور اس کے بعد وہ مجھے مڑ مڑ کر دیکھتی رہی اور رخصت ہو گئی۔ اور میرے دل پر بجلی گر پڑی اور میں اسی وقت بنارس سے رخصت ہو گیا۔

جاتا ہے آسماں لئے کوچے سے یار کے آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر

ط ۔ ج

ایک بار میرا قیام تھا ایک بہت بڑے شہر میں اور میرے پڑوسی تھے ایک چالیس سال کے نواب صاحب وہ شعر تو معمولی کہتے تھے لیکن سخن سنجی میں ان کو بڑی دست گاہ حاصل تھی۔ میں گاہ گاہ ان کے محل میں جایا کرتا تھا اور شاعری کے ساتھ ساتھ گلنے بجانے کی صحبتیں بھی گرم ہوا کرتی تھیں۔ ایک روز کوئی دس بجے میں ان کے یہاں پہونچا دیکھا کہ اطاق پذیرائی (ڈرائنگ روم) خالی پڑا ہوا تھا میں سوچنے لگا کہ یہ وقت تو ان کے موجود ہونے کا ہے آخر وہ کہاں چلے گئے۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ نکلی کمرے سے۔۔۔۔۔۔ بوا ایک مخملی تھیلی اٹھائے میری طرف بڑھیں میں ٹھٹک گیا بوا نے مجھے سلام کر کے تھیلی میری طرف بڑھادی میں نے کہا اس میں کیا ہے، انھوں نے اہا ایلا چکیاں میں نے پوچھا کس نے بھیجی ہیں۔ بوا نے کہا بی بی جان نے بھیجی ہیں۔ میں نے پوچھا یہ بی بی جان کون ہیں انھوں نے اپنے ہاتھوں کی دسوں انگلیاں، اپنے ماتھے پر چٹخا کر کہا، ایسے میں قربان جاؤں نواب صاحب بہادر کی منجھلی صاحب زادی ہیں۔ میں نے بھونچکا ہو کے کہا بوا میں نے تو آج تک انھیں دیکھا ہی نہیں انھوں نے کہا آپ دیکھتے کیسے، وہ تو جھم جھم پردے میں رہتی ہیں البتہ وہ آپکو اس اد کمرے کے کمرے سے بار بار دیکھ چکی ہیں میاں کہنے کی بات نہیں کیا کہوں یہ ٹانگ، کھولوں تو لاج وہ ٹانگ کھولوں تو لاج۔ میں نے کہا ایسی بھی کیا بات ہے کچھ تو بتلاؤ بوا انھوں نے اپنی سفید چونڈی کھجلا کر کہا میاں بات یہ ہے کہ انھوں نے جب سے آپکو دیکھا ہے، بس آپ ہی کا دم بھرتی رہتی ہیں کونوں کھدروں میں بیٹھ بیٹھ کر آپ کے لئے روتی ہیں۔ میں نے بی بی جان کو ایک عمل بتا دیا ہے وہ ہر جمعرات کو آدھی رات

کے وقت پاؤں کنوئیں میں لٹکا کر آپ سے ملنے کے لئے وہ عمل پڑھا کرتی یہ بات آپ تک رہے اگر بی بی جان نے سن لیا تو میرے سر پر ایک بال بھی نہیں رہیگا۔

میں نے پوچھا نواب صاحب کہاں ہیں انھوں نے بتایا کہ وہ شہر کے شکار کے لئے کہیں باہر گئے ہوئے ہیں، اور بیگم صاحب اپنی امی جان سے ملنے کے لئے اپنے میکے تشریف لے گئی ہیں۔

میں نے وہ لچکے پیٹھے کی نخلی تھیلی بوا کے ہاتھ سے لے لی اتنے میں بالاخانے کے دروازے کی چٹخنی کھلنے کی آواز آئی، بوا نے کہا سرکار وہ برقعہ پہنے اُدھر اُٹھا، میں تو دیکھا کہ ایک بجلی ہے جو ادھ کھلے پٹ میں لپ لپا رہی ہے میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں اس نے مجھ پر نظر ڈالی اور پٹ بند کر لیا ایک تیر تھا جو میرے دل میں تراز ہو کے رہ گیا اور ہال پر اندھیرا چھا گیا۔

بوا نے کہا اوپر چلئے میں قریب سے بی بی جان کا مکھڑا دکھا دوں اور جب میں بوا کے پیچھے پیچھے اوپر گیا اور دو قدم اس کی طرف بڑھائے تو وہ ہائے اللہ کہتی بھاگ گئی۔

رک گئی نبض عاشق جان باز

اف رے تیرا فرار کا انداز

بوا نے کہا ابھی اللہ رکھے بچی ہیں آپ کو دیکھ کر شرما گئیں میں نے پوچھا اب کیا ہو گا انھوں نے چھاتی ٹھونک کر کہا، میں آپ کو ملا کر دم لوں گی۔

دوسرے دن بوا میرے پاس آئیں اور کہا میں نے آپکا انتظام کر دیا ہے میرا خاوند نواب صاحب کی ڈیوڑھی کا چوکیدار ہے آپ رات کے دو بجے آئیں، میں ہال کا دروازہ اندر سے کھلا رکھونگی میرا خاوند آپکو زنانے مکان کے دروازے تک پہونچا دے گا کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے گی۔

میرا تمام دن اس خوشی میں گذر گیا کہ آج رات کو ۲ بجے بی بی جان کے پاس جانا ہے دل بار بار قلقاریاں مارتا رہا، بار بار آسمان کی طرف دیکھتا رہا کہ یہ خبیث آفتاب کب ڈوبے گا دوپہر کا کھانا بھی نہیں خوشی میں کھو گیا میلو کے واسطے بیٹا، نواب صاحب کا محل، بوا کا چہرہ اور بی بی جان کا جلوہ، آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا خیال آیا کہ اگر میرے لئے تو کچھ ہو گا ہر ہو گئی تو شاید میری جان چلی جائے اپنی جان کی پرواہ نہیں لیکن اگر اس نازنین کی رسوائی ہو گئی تو ساری زندگی اس کی بیکار ہو کر رہ جائیگی میں بوڑھوں کی طرح سوچنے لگا۔ پھر یہ خیال آیا کہ نہ جاؤں، بیوی گھر میں موجود ہے میں اس سے شادی تو کر نہیں سکونگا، کیوں اس کے پاس جاؤں میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ میری سوئی ہوئی جوانی بیدار ہو گئی اس نے میرے منھ پر طمانچہ اور دل پر گھونسہ مارا بی بی جان کا تصور میرے دماغ میں ابھرا اور کہا کہ تو نہیں گیا تو بی بی جان کا ننھا سا دل ٹوٹ جائے گا، میں دیوانہ جوانی کے بہکانے میں آگیا اور رات کے دو بجے جانے کے خیال میں ڈوب گیا۔

خدا خدا کرکے دن ڈوبا میں نے غیر معمولی اہتمام کے ساتھ نہا دھو کر حجامت بنوائی، خوب ملا ملا کر حمام کیا اچھے اچھے کپڑے پہنے کپڑوں میں عطر لگایا سامنے چنبیلی کے پھولوں کی ٹوکری رکھی ہوئی تھی اس کو منہ کے قریب لا کر بڑی بڑی گہری سانسوں کے ساتھ سونگھا اور بار بار سونگھا تاکہ دماغ میں تازگی اور چہرے پر شگفتگی آجائے اور جب پونے دو کا وقت ہو گیا گویا کٹی کو صابون سے منہ دھویا پھول پھر سونگھے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی کرتے کی جیب میں پستول رکھا ہاتھ میں ڈنڈا لیا اور گھر سے پاؤں نکل گیا ویران گلی پر نگاہ ڈالی، اور ننگے کھڑے ہو گئے سچ ہے چور کا دل ہی کتنا ہوتا ہے۔

کوٹھی کے پھاٹک پر پہونچا بوا کے شوہر نے جھک کر سلام کیا۔ ہاں ہٹ ہٹ سے ہو کر بتانے مکان کے دروازے پر گیا۔ بوا نے میری بلائیں لیں، اور مجھکو بی بی جان کی خوابگاہ میں پہونچا دیا۔

خوابگاہ کی سجاوٹ اور خوشبوؤں کی لپیٹ کیا بیان کروں جنت کا تصور آ جا کر رہ گیا، بی بی جان سر سے لے کر پاؤں تک رضائی اوڑھے بیٹھی ہوئی تھی میں نے پٹی کے پاس کھڑے ہو کر اس کے اعضاء کے پیچ و خم دیکھے، خون موجیں مارنے لگا آہستہ سے اس کی مسہری پر بیٹھا، چپکے سے رضائی کھینچی آہستہ سے اس نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا میں نے اس کی گوری گوری کلائیاں منہ سے ہاتھ ہٹانا چاہا اس نے زور لگایا، میں نے اس سے زیادہ زور لگا کر ہاتھ ہٹا دیئے۔ اور چاند سا مکھڑا جگمگانے لگا اور آرسی مصحف کا مزا آ گیا۔ وہ داہنی پٹی کی طرف ذرا سی سرک گئی میں اس کے معطر پہلو میں لیٹ گیا۔

میں نے کہا میری بی بی جان اس نے آنکھیں بند کر لیں میں نے کہا بالکل بہو ہی لگی ہو، اس نے آنکھیں نہیں کھولیں تبسم کی لہریں گلابی ہونٹوں پر دوڑ گئیں۔ میں نے کھینچ کر اس کو سینے سے لگا لیا میرا دھڑکتا دل اس کے دل پر ضربیں مارنے لگا۔ ہر چند گلابی جاڑے کی رات تھی لیکن میں پسینے میں ڈوب گیا صبح ساڑھے چار بجے جب میں رخصت ہونے لگا تو اس نے ایک ایسے انداز سے میری طرف نگاہ اٹھائی کہ۔

"بسیار شیوہاست بتاں را کہ نام نیست"

میں نے کہا بی بی جان، چلتے وقت تو کچھ بات کرو اس کے چہرے پر ایک عجیب کیفیت نمودار ہوئی اور بڑی آہستگی سے کہا آگ لگے اس دل کو اس سے تو کہیں اچھا تھا کہ مر جاتی میں نے کہا بی بی جان رخصت کے وقت تو ایسی باتیں نہ کرو سلامت رہو تم ہزار برس اتنے میں بوا آ گئیں انھوں نے روانگی کا اشارہ کیا اور میں اس پر نظر ڈالتا ہوا اپنے گھر چلا آیا ۔۔۔ اب میرا یہ معمول ہو گیا تھا کہ ہر تیسرے چوتھے اس پری دش کے پاس رات کے دو بجے جاتا اور صبح کے چار ساڑھے چار بجے گھر پلٹ آتا۔

اے کہ در کوے خرابات مقامے داری	جمِ وقتِ خودی ار دست بجامے داری
اے کہ با زلف و رخ یار گزاری شب و روز	فرصت باد کہ خوش صبحی و شامے داری

اب ایک رات کا حال سنئے جو بڑے قیامت کی رات تھی اور داد دیجئے اس جرأت رندانہ

اور ہمت مردانہ کی جو عاشقوں کے دل کے علاوہ اور کہیں پائی نہیں جا سکتی ایک روز حسب معمول
میں دو بجے رات کو وہاں پہنچا دیکھا کہ خلاف عادت دربان پڑا سو رہا ہے میں نے آہستہ سے اس کو
جگایا وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا میں نے پوچھا یہ آج تم سو کیسے رہے تھے اس نے کہا آج ناغے کی رات
ہے میری گھر والی اپنی خالا کے وہاں گئی ہوئی ہے وہ کہہ گئی تھی آپ آج نہ آئیں میں نے کہا تم کو چاہیے
تھا مجھ کو آ کر خبر کر جاتے، اس نے کہا سرکار کے پاس گیا تھا آپ کوٹھی پر نہیں تھے بس آ گیا۔
خدمت گار جگنو سے کہہ آیا تھا کہ وہ آپ سے کہہ دے۔

میں نے کہا جگنو نے تو مجھ سے کچھ نہیں کہا اس نے کہا حضور اس میں میرا کیا قصور ہے میں نے اب
کہا اب تو میں آ گیا ہوں اندر جا کے بغیر مانوں گا نہیں، اس نے حیران ہو کر کہا جائیے گا کیسے اندر سے
دروازہ کون کھولے گا۔ اس کی یہ بات سن کر میں سوچنے لگا، اور بالآخر ایک تدبیر میری سمجھ میں
آ گئی میں نے اس سے کہا پائیں باغ جاؤ اور ہرابی کی رسی لے آؤ اس نے بھونچکا ہو کر کہا خان
صاحب آپ نے کیا کہا رسی، اس نے پوچھا رسی کیا کیجئے گا میں نے کہا لے آؤ تو بتاؤں گا۔

جب وہ رسی لے آیا تو میں نے کہا اس کوٹھی کے پیچھے گرے ہوئے محل کی اینٹوں کی جو پہاڑی بنی ہوئی
ہے۔ ادھر چلو ہم اس پہاڑی کے ذریعہ اس کوٹھی کی چھت پر چڑھ جائیں گے وہاں پہنچ کر تم
میری کمر میں رسی باندھ کر مجھے اس طرح انگنائی میں اتارنا جیسے کوئیں میں ڈول ڈالا جاتا ہے
میری اس خطرناک تجویز کو سن کر وہ بے حد خوف زدہ ہو گیا اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں
اور بار بار اپنا سر کھجانے لگا اور ہاتھ جوڑ کر اس نے کہا سرکار یہ کام مجھ سے نہیں ہو سکے گا آپ
بڑے آدمی ہیں آپ کا تو کچھ نہیں بگڑے گا میں غریب مار ڈالا جاؤں گا۔

میں نے کہا میں تمہاری جان کا محافظ ہوں تمہارا بال بیکا نہیں ہو گا یہ دیکھو میری جیب میں پستول
ہے، اگر نواب صاحب نے تم کو چھوڑ دیا، میں اس سے دگنی تنخواہ پر تم کو ملازم رکھ لوں گا اور کل صبح کو
تم کو دو سو روپیہ بھی دوں گا، بالکل خوف نہ کھاؤ۔ اور میرے ساتھ ساتھ آؤ۔

اس نے کہا، بہت اچھا سرکار مگر یہ کام ہے بہت جان لیوا۔ میں نے کہا بہت آسان ہے پرواہ نہ کرو۔
ہم دونوں اس گرے ہوئے مکان کے انبار پر سے گھوڑے بن کر چڑھے اور گھٹنے کے بل منڈیر کی
طرف رینگتے لگے۔ بڑی مصیبت یہ تھی کہ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اس کوٹھی کے دائیں جانب کے مکان
میں ایک دمے کا مریض برابر کھانس رہا تھا۔ ابھی داہنے طرف کی مکان میں ایک عابد شب زندہ
درود پڑھ رہا تھا، دونوں طرف جگاہر ہو رہی تھی لیکن میں ہمت نہ ہارا اور جب رینگتا انگتا
منڈیر کے قریب پہنچ گیا تو ایک کالا سانپ عین میرے منہ کے سامنے کھڑا ہو کر پھنکارنے مارنے
لگا۔ العظمۃ للہ وہ خوف ناک سماں وہ موت کا سامنا۔

میں اسکو کیوں کر مارتا اس لئے کہ اس پر ڈنڈا اچلاتا تو سیارا گھر جاگ اٹھتا اس لئے میں نے آنکھیں بند کر لیں دربان دور ہٹ کر بیٹھ گیا اور سانپ کے پھنکار دبنگی ہوا میرے ماتھے کو چھونے لگی اور بھیانک موت میرے دل پر دستک دینے لگی میں نے دل میں کہا شوق سے ڈس بیبہ لیجے سانپ صد حب۔

میں اسی طرح دو تین منٹ تک یقینی موت سامنے بیٹھا رہا اتنے میں پھنکار کی آواز بند ہو گئی میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھ کر جان میں جان آگئی کہ ناگ دیوتا رخصت ہو چکے ہیں۔

دربان کو مڑ کر دیکھا تو وہ کانپتے ہاتھوں سے اشارہ کر رہا تھا کہ اتر چلئے میں نے بڑے [illegible] اشارے سے ہدایت کی کہ وہ میری کمر میں رسی باندھ دے اس نے کانپتے ہاتھوں سے میری کمر میں رسی [illegible] دی اور دونوں ہو کر مجھکو نیچے اتارنے لگا نیچے پہونچتے ہی میں نے رسی کمر سے کھول دی دربان نے اوپر کھینچ لی اور میں بی بی جان کی خواب گاہ میں پہونچ گیا۔

لیکن جب میں نے یہ سماں دیکھا کہ اس کی مسہری کی پائینتی والی چارپائی پر ایک مُر مرے کے تھیلے کی سی بڑی بی بستر پر لیٹی خراٹے لے رہی ہیں تو زمین پیر میرے پاؤں کے نیچے سے نکل اور اس قدر بدحواس ہو گیا کہ بی بی جان کی مسہری کے نیچے لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ وہ کون سا جتن کروں کہ فتنۂ خوابیدہ کی آنکھ کھل جائے اور وہ ان بڑی بی کو وہاں سے چلتا کر دے۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دیکھا ایک بڑی گھونس میری طرف آرہی ہے جیسے ہی وہ میری طرف آئی وہ میں نے زور سے ہاتھ جھٹک دیا وہ گھبرا کر بھاگی تو میز سے ٹکرا گئی۔ اور میز پر رکھی ہوئی صراحی دھڑ سے زمین پر گر پڑی۔ صراحی کے دھڑاکے سے بڑی بی کی آنکھ کھل گئی اور وہ چور چور کہتی باہر نکل گئیں ان کے جاتے ہی میں اس کے بستر پر آگیا پہلے تو وہ گھبرا گئی پھر اس نے لبستر پر اپنے دونوں پاؤں کھڑے کر کے مجھ کو ان کے جوف میں لے لیا اور اوپر سے رضائی اوڑھ لی۔

بڑی بی کی صدا سن کر بی بی جان کے چچا کمرے میں داخل ہوئے پوچھا بیٹی کیا بات ہے اس نے کہا چچا جان میرا پیر لگنے سے صراحی گر پڑی اور اچھو خانم نے چور چور کا غل مچایا چچا نے ہنس کر کہا اچھو خانم تو ہولا خبطا ہے ہی بی بی جان نے کہا چچا اب اس کو میرے کمرے میں نہ بھیجئے گا کمبخت اس زور سے خراٹے لیتی ہے کہ نیند اچٹ جاتی ہے۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ جب اس کے چچا اس سے باتیں کر رہے تھے میرا گھٹتا اسکے گھٹنے سے مس ہو رہا تھا اور ڈرنے کے بجائے مجھکو ہنسی آرہی تھی چچا کے جاتے ہی اس نے اندر سے کمرہ بند کیا اور جب میں نے اس سے پورا ماجرا بیان کیا کہ میں کن کن خطروں سے گزر کر اس تک آیا ہوں وہ دنگ رہ گئی کہنے لگی اگر تمہارے دشمنوں کو کچھ ہو جاتا تو میں زہر کھا کر سو رہتی۔ یہ کہتے ہی اس کی ہچکیاں بندھ گئیں اتنے میں چار بجے کا گجر بجنے لگا وہ مجھکو گودھے میں لے کر باہر نکلی اور دبے پاؤں مجھکو گلے لگا کر رخصت کر دیا اور دروازہ اندر سے بند۔

کرلیا اس کے بعد نواب صاحب شکار کے اتنے دلدادہ تھے کہ پورے خاندان کو لے کر اودھ فارسٹ چلے گئے اور میں ویران ہو کر رہ گیا میری زندگی کے گلستان میں خاک اڑنے لگی حیات کے منہ کا ذائقہ بدل گیا۔ یاروں کے جمگھٹے اور راتوں کے جلسے کھوکھلے اور سپاٹ ہو کر رہ گئے شامیں ہی نہیں صبحیں تک اداس ہو گئیں اور طلوع کی رنگینیاں دیکھ کر ایسا محسوس ہونے لگا گویا میں مرتد ہو چکا ہوں اور اپنے رسول کے سامنے جھینپا جھینپا کھڑا ہوا ہوں ۔

اس کی مفارقت نے مجھکو وہ بچہ بنا دیا جس کا دودھ چھڑا دیا جاتا ہے اور ہر گھڑی کہ اس کا منہ تہنیا کا سا ہو جاتا ہے ۔

اب مجھ سے نہیں رہا گیا میں نے رخصت سفر باندھا اور اودھ فارسٹ جانے کے لئے اسٹیشن روانہ ہو گیا راستے میں کمبخت موٹر خراب ہو گئی اسٹیشن پہونچا تو ریل چھوٹ چکی تھی میں سن سے رہ گیا میں نے قلی سے کہا اگر کوئی مال گاڑی جا رہی ہو تو میں فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے کر[1] اس میں روانہ ہو جاؤں قلی نے کہا ایک مال گاڑی آدھ گھنٹے میں اسی طرف جانے والی ہے۔ میں بکنگ۔ آفس گیا بکنگ۔ بابو نے کہا وہ مال گاڑی نہیں فوجی گاڑی ہے اس میں آپ سفر نہیں کر سکتے۔ میں نے باہر آکر قلی سے کہا مجھے فوجی گاڑی تک پہونچا دے وہ مجھے یارڈ لے گیا۔ دور سے گاڑی بتا دی ہینڈ بیگ میرے حوالے کیا اور اجرت سے دگنا معاوضہ لے کر چلا گیا اور میں گلے میں بیگ ڈال کر گاڑی چھوٹنے کے انتظار میں زمین پر بیٹھ گیا...... چونکہ وہ جنگ عظیم کا زمانہ تھا اور فوجی گاڑیوں تک کسی کو جانے نہیں دیا جاتا تھا اس لئے میں بڑے کشمکش و پنج کے عالم میں یہ سوچتا ہوا بیٹھا رہا کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو جاسوسی کے جرم میں کھڑے کھڑے گولی مار دی جائے گی یا گرفتار کر لیا جاؤں گا خدا خدا کر کے انجن نے گیارہ بجے سیٹی دی اور میں لپک کر گارڈ کے ڈبے کے پیچھے بمپر پر بیٹھ گیا گاڑی کی رفتار تیز ہوئی تو میرے جسم کا توازن بگڑنے لگا میں نے جھک کر بمپر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اتنے میں یوروپین گارڈ نے پیچھے کی کھڑکی کھول دی مجھے بیٹھا دیکھ کر اچھل پڑا پستول جیب سے نکال کر تان لیا اور ڈپٹ کر پوچھا (WHO IS THERE) (تم کون ہو) میں نے بڑی مردانہ آواز میں کہا (Shut up that is love affair I am going to my beloved) (خاموش یہ معاملہ عشق ہے)

گارڈ اگر ہندوستانی ہوتا تو ضرور گولی مار دیتا۔ مگر وہ انگریز فوجی منچلا انگریز تھا میرا یہ مردانہ جواب سن کر اس نے کہا ہا بر یو ہا بر یو (شاباش بہادر) اور دونوں ہاتھوں سے مجھ کو اندر کھینچ لیا۔ اس نے لالٹین اٹھا کر غور سے میرا منہ دیکھا اور مسکرا کر کہا oh an exact lover's face "(اور پھر بڑی نرمی کے ساتھ اس نے کہا۔

Please sit down mister lover I am also a lover)

[1] ریلوے کا یہ قاعدہ ہے کہ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے کر مال گاڑی میں گارڈ کے ڈبے میں سفر کیا جا سکتا ہے

"(بیٹھ جائیے مسٹر عاشق میں بھی عاشق ہوں)
میں بیٹھ گیا تو اس نیک مرد نے مجھکو بیئر پلائی بھنا ہوا گوشت کھلایا اور جب میرا اسٹیشن آ گیا تو میرے ساتھ آکر مجھ کو گیٹ سے باہر نکال دیا۔

سفینہ اپنا کنارے جب آ لگا غالبؔ   خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیئے

اس کے بعد جب ہم نواب صاحب کے ساتھ ان کے وطن آ گئے تو دو تین دن کے بعد سننے میں آیا کہ بی بی جان کی شادی ہو چکی ہے۔ یہ خبر توپ کے گولے کی طرح میرے دل پر لگی اور جب حسب دستور رات کے دو بجے اس سے ملاقات ہوئی تو اس خیال سے کہ اس کی شادی ہونے والی ہے وہ مجھے دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ہر چند وہ میرا جوانی کا دور تھا لیکن مجھ پر اس وقت پیرانہ مآل اندیشی طاری ہو گئی میں نے سوچا کہ اس سے میرا عقد تو ہو نہیں سکتا اور وہ ہمیشہ بن بیاہی رہے گی اس کا بھی امکان نہیں اس کی شادی جس سے ٹھہری ہے وہ صحت و شباب کے اعتبار سے ایک کمزور دکم خوراندہ رئیس زادہ ہے، اس کی صورت میں بھی کوئی دلکشی نہیں عقل کے اعتبار سے بھی نہایت کمزور ہے اس کی اور میری پرانی ملاقات بھی ہے اگر اس کمرو اور کمزور شخص سے اس کی شادی ہو جائے گی تو وہ کسی طرح بی بی جان کے دل کو موہ نہیں سکے گا اور اسی کے ساتھ ساتھ شادی کے بعد پردے زردے کی یہ سختی بھی نہیں باقی رہے گی۔ میں جب چاہوں گا اس سے باآسانی مل سکونگا
ان تمام باتوں پر غور کر کے میں نے بی بی جان کے دل میں یہ بات اتار دی کہ وہ اپنی شادی سے پریشان نہ ہو صورت منطقی تھی لیکن خدا بانی ہوتی ہے اس لئے لوہے لگ گئے اس کو سمجھانے میں ایک ہفتہ تک میں برابر بڑے لیکچر دیتا رہا تب جا کر اس نے خود کشی کا ارادہ ترک کیا اور بمجد اصرار سے بھی دست بردار ہو گئی کہ میں اُسے لے کر کہیں دوسرے شہر بھاگ جاؤں۔
لیکن جب شادی کا دن آیا صبح کو اس کے گھر سے نوبت بجنے کی آواز آنے لگی تو میرا دم لبوں پر آ گیا سارا منطق بھول گیا اور آنکھوں سے آنسوؤں کا مینہ برسنے لگا۔
میری اس کیفیت کا کسی قدر اندازہ مندرجہ ذیل نظم[1] سے لگایا جا سکتا ہے۔

کدھر ہے اے موت! آ کہ غم سے لبوں پر اب جان آ رہی ہے
وہ شمع جو یادگارِ شب تھی، اسے بھی آندھی بجھا رہی ہے۔
دہائی حسن خجستہ خو کی، کہ رسم عالم کی فتنہ خیزی
بچھڑے ہوؤں کو ملا رہی ہے، ملے ہوؤں کو بچھڑا رہی ہے،

---

[1] مطبوعہ "نقش و نگار" ایسے بے کراں شدید عذاب غم میں یہ نظم کہی گئی۔ جب شعر کہنا امکان سے خارج تھا۔

ادھر نغری کی مست لہریں لئے ہوئے ہیں پیامِ شادی + ادھر نسیمِ سحر کی جنبش ترانۂ غم سنا رہی ہے
ادھر عروسی لباس زر میں دمک رہا ہے کسی کا مکھڑا + ادھر کسی کی خوشی کو دنیا سیاہ کفن پہنا رہی ہے
ندیم پیغام بر تھی میری، صبا کو یہ آج کیا ہوا ہے + ادھر بجھاتی چلی ہے شمعیں، ادھر شگوفے کھلا رہی ہے
ادھر کلیجہ میں تھرتھراتا ہے شعلۂ مرگ ناگہانی + ادھر شبستانِ رنگ و بو میں حیات نو مسکرا رہی ہے
ادھر عرق ہے میری جبیں پر، ادھر دمکتی ہے جوش افشاں + ادھر لبوں پر ہیں سرد آہیں، ادھر صبا گنگنا رہی ہے

کیا وہ تباہ کیا گیا عشوۂ روزگار نے	اور	مارا ہے جس غریب کو حسنِ دغا شعار نے
اب وہ شہیدِ التفات دل کی گرہ کسے دکھائے	اسی	بند کیا درِ طرب جس پہ گشودِ کار نے
سمجھے گا کون نکتہ رس اس کی حدیثِ خونچکاں	سلسلہ کی	جس کا لہو بہا دیا تیغِ وفائے یار نے
کون یقین لائے گا کس سے کہو رہے یہ ماجرا	ایک	لوٹ لیا مرا چمن عربدۂ بہار نے
مصحفِ انبساط نے آیۂ حزن پیش کی	دوسری	فتح سے دور کر دیا نصرتِ کردگار نے
مجھ کو درِ نشاط نے اشک علم عطا کئے	نظم بھی	شامِ شکست نذر کی صبحِ ظفر شکار نے
حسن کے جذبِ عشق نے دل کو تباہ کر دیا	اس	پھول کی روح کھینچ لی شبنمِ اشکبار نے
بھیس میں آ کے عشق کے جوش تجھے مٹاؤں گا	لیجئے	مجھ سے قسم یہ کھائی تھی حسنِ ستم شعار نے

ج ب ع خ

ایک بار دفتر سے گھر پہنچا تو یہ دیکھا کہ میری بیوی تخت پر متمکن ہیں اور صوفے پر ایک بیس اکیس[20, 21] برس کی نہایت قبول صورت خاتون بیٹھی ہوئی ہیں میں یہ سمجھ کر کہ کوئی پردہ نشین میری بیوی سے ملنے آئی ہوئی ہیں۔ جب الٹے پاؤں باہر جانے لگا تو میری بیوی نے رکتی سی آواز میں کہا یہ تم سے ملنے کو مدراس سے آئی ہیں ۔ ۔ ۔ میں پلٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور بیوی کی طرف بڑے معصومانہ انداز میں دیکھنے لگا کہ وہ اس خاتون کا مجھ سے تعرف کرا دیں۔

جب بیوی کچھ نہیں بولیں اور منھ پھلا کے گم سم بیٹھی رہیں تو میں ایک عجیب کشمکش میں پڑ گیا بیوی کی موجودگی میں یہ ہمت تو پڑتی نہیں کہ اس آنے والی سے براہ راست بات کروں آخر کار تنگ آ کر میں نے بیوی سے پوچھا آپ کون ہیں، بیوی نے کہا تم خود پوچھ لو میں کیا کروں نگاہوں کے اس آنے والی نے عجیب کشمکش و پیچ کے عالم میں نظر اٹھائی اور کہا میں آپ کے ملنے کے لئے مدراس آئی ہوں میرا نام ہے "ج۔ب" رہنے والی یو۔پی کی ہوں مگر قیام ہے مدراس میں، میرے دل میں تین شخصیتوں یعنی ابو الکلام آزاد، انور پاشا اور آپ سے ملنے کی تمنا تھی، انور پاشا کا انتقال ہو گیا مولانا ابو الکلام آزاد سے مل چکی اور آج آپ سے ملنے آئی ہوں مجھے شاعری سے بیحد شوق ہے

آپ کی کتاب "روح ادب" شروع سے آخر تک مجھے یاد ہے میں آپکی بے حد عقیدت مند ہوں میں نے آج سے کئی برس پہلے آپکی ایک نظم "جنگل کی شہزادی" کا یہ آخری شعر جب پڑھا تھا۔

مڑ کر جو میں نے دیکھا امید مر چکی تھی
پٹڑی چمک رہی تھی گاڑی گزر چکی تھی

تو میں رونے لگی تھی اور ابھی میں رو ہی رہی تھی کہ نانی جان آ گئیں، انھوں نے مجھ سے پوچھا اری کیوں رو رہی ہے میں نے کہا جوش صاحب کو آپ جانتی ہیں۔ انھوں نے کہا ہاں جانتی ہوں میں نے کہا تو جوش صاحب ریل میں سفر کر رہے تھے جنگل میں گاڑی رکی اور ریل سے اتر کر جنگل کی سیر کرنے لگے اور اس قدر محو ہو گئے کہ گاڑی چھوٹ گئی اور وہ جنگل میں رہ گئے۔ نانی جان اللہ سے دعا کیجئے کہ انکی جان بچ جائے میری نانی جان نے قہقہہ مار کر کہا ارے دیوانی تو شاعروں کی بات پر نہ جا یہ روز مرتے اور روز جیتے ہیں۔

چاہئے تو مجھے تھا کہ یہ ماجرا سن کر میں اس سے گھل مل کر باتیں کرتا مگر بیوی سامنے بیٹھی ہوئی تھی اس لئے میں ایک نہایت اعلیٰ درجے کے بیوقوف آدمی کی طرح اس کی طرف دیکھ کر گدی کھجانے لگا۔

اس نے مجھکو غور سے دیکھا، معاملہ کی تہ تک پہنچ گئی اور ادھر ادھر کی دو چار باتیں کر کے اس نے کہا آپکا مکان شہر سے دور ہے، یہاں کوئی ٹیکسی نہیں مل سکے گی میں جس ٹیکسی پر آئی تھی اسے رخصت کر دیا ہے اگر آپکو زحمت نہ ہو تو مجھکو میری سہیلی کے مکان تک پہنچا دیجئے، جس کے پاس میں ٹھہری ہوئی ہوں میں ایک عجیب ادھیڑ بن میں پڑ گیا، جاتا ہوں تو بیوی کو ناگوار گزرے گا نہیں گیا تو اس کو رنج ہو گا۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔

آخر یہ فیصلہ کر کے کہ اسے اس کی جائے قیام تک پہونچا آؤں میں اٹھا بیوی کی جانب نگاہ نہیں اٹھائی اس سے کہا چلئے میں پہونچا آؤں

وہ شہر سے چھ سات میل کے فاصلے پر ٹھہری ہوئی تھی جب میری گاڑی ایک بہت بڑے بند کی سڑک سے گزرنے لگی اس نے کہا جوش بڑی پیاری سڑک بچھی ہوئی ہے ذرا گاڑی روک دیجئے کہ یہ منظر دیکھ لوں جب گاڑی رک گئی اس نے بڑی لگاوٹ سے مجھے دیکھا اور اپنی بھری انگیا سے ایک پرچہ نکال کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔ پرچہ پڑھا تو اسے اظہار عشق سے لبریز پایا میرے ہاتھ کانپنے لگے ط۔ج کی مفارقت کا گھاؤ ابھی مندمل نہیں ہوا تھا اور اس وقت تک میرے دل سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں میں نے جیب سے قلم نکالا اور اس کے پرچے کی پشت پر یہ لکھ کر کہ میں آج تک بری طرح زخمی ہوں کسی نئے زخم کی تاب نہیں لا سکتا ایک نہایت طویل بیداری کے بعد اب کو شش کر رہا ہوں سو جاؤں مجھ کو جگایئے نہیں۔ میرے جواب کو پڑھ کر اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ آنکھوں میں نمی آ گئی اس نے بڑی بے کسی کے ساتھ کہا تو پھر مجھے یہیں اتار دیجئے میری سہیلی کا مکان قریب آ گیا ہے

میں پیدل چلی جاؤنگی ۔ یہ سن کر میں کانپ گیا اس کا ہاتھ اپنے سینے سے لگا کر کہا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں
آپکو یہیں اتار دوں آپکو میرے دل کا حال نہیں معلوم آپکی طرف میرا دل کھنچ رہا ہے مگر دل نے فوراً اس
ٹوٹ جانے کے بعد آس بندھ جانے کی نظر سے مجھے دیکھا اور کہا آپکا شکریہ ۔
راستے بھر وہ خاموش رہی اسی خاموشی میں ہزاروں باتیں تھیں جنہیں کانوں نے نہیں دل نے سن
لیا ۔ میں نے دل میں کہا میاں جوش خدا پھر کسی نئے جھگڑے میں نہ پڑ جانا ، سنبھالے رہو اپنے کو اب
عشق کیا تو مر کر رہ جاؤ گے خاں صاحب ۔

اتنے میں اسکی سہیلی کا مکان آگیا میں نے موٹر سے اتر کر دروازہ کھولا وہ اتری ، پوچھا تھوڑی دیر
بیٹھئے گا بھی نہیں میں نے کہا خود میرا دل بھی یہی چاہتا ہے کہ بیٹھ جاؤں اور پہروں بیٹھوں مگر پھر کسی
وقت آؤنگا اس نے بڑی حسرت سے مجھے دیکھا میں نے اس خیال سے کہ کہیں اس کا حسن معصوم میرے
دل کو زخمی نہ کر دے ، فوراً آنکھیں جھکا لیں ، اور جلدی سے روانہ ہو گیا ۔

گھر آیا بیوی کو آگ بگولہ پایا مجھے دیکھتے ہی برس پڑیں اور کہا اور تو اب میری آنکھوں کے سامنے
تم عشق بازی کرنے لگے ہو میں نے کہا اشرف جہاں اللہ اللہ کرو تم میری ایک شرافت اور مروت کی
بات کو اللہ اللہ کہہ رہی ہو ، میں عشق الٰہی تیری پناہ یہ سن کر انھوں نے میرے گریبان پر
ہاتھ ڈال دیا اور اسے چر سے پھاڑ ڈالا اور کہا جوتیوں سمیت آنکھوں میں نہ گھسو میں نے کہا خدا کے
واسطے بات سمجھنے کی کوشش کرو اور سوچو کہ کوئی اتنا بڑا اسفرٹلے کر کے میرے گھر آئے اور گڑگڑا کر کے
کہے کہ مجھکو میرے جائے مقام تک پہنچا دو اور میں اسکو ٹکا سا جواب دیدوں ، یہ بات شرافت کے
خلاف ہے ارے تم شرافت کو بھی عشق بازی سمجھتی ہو یہ تو بڑا اندھیر ہے ۔

بیوی نے کہا اچھا قسم کھا کر بتاؤ اس پچپنیدی کے ساتھ اس کے گھر جا کر بیٹھے تھے کہ نہیں میں نے تو
اس گھر میں قدم تک نہیں رکھا ۔

بیوی نے کہا تم سر پر قرآن رکھ کر قسم کھا سکتے ہو ، سانچ کو آنچ نہیں لے آؤ قرآن وہ قرآن لے
آئیں میں سر پر قرآن رکھ کر قسم کھائی ، ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا ، کہنے لگیں ، ناحق میں نے تمہارا
گریبان پھاڑ ڈالا ۔ لاؤ سی دوں ۔

اس واقعہ کے دو تین دن بعد ، میں دفتر میں بیٹھا تھا ، چپراسی نے آکر کہا کوئی بیگم صاحب
آپ سے ملنے آئی ہیں اور ٹیکسی میں بیٹھی آپکا انتظار کر رہی ہیں نیچے اترا تو دیکھا وہی ہے صاحب سلامت
کے بعد اس نے کہا موٹر میں آجائیے میں بیٹھ گیا تو اس نے کہا کہ آپ آنے کا وعدہ کر کے گئے تھے لیکن
آئے نہیں ۔

اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے شوفر سے کہا باغ ...... ہو باغ میں دو گھڑی

اس نے کہا آیئے اس کنج میں تھوڑی دیر بیٹھ جایئے۔
کنج میں بیٹھتے ہی اس نے کہا جوش صاحب آپ کا کلام پڑھ کر میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ آپ کا دل موم کی طرح نرم ہے لیکن دیکھا تو وہ پتھر نکلا صحیح بتایئے شعر آپ خود کہتے ہیں یا کوئی آپکو لکھ کر دیدیتا ہے میں نے کہا میں آپکے پاس کل آنے والا تھا، آنا اور ضرور آتا آپ اس قدر بدگمانی سے نام کیں جیب ساز گاری کی بناء پر کل پر موں نہیں آسکا اس نے مسکرا کر کہا جس کی طبیعت ناسازہ ہوتی ہے اس کا چہرہ کیا ایسا ہوتا ہے، اب میں آپکو چھوڑنے والی نہیں اس وقت میرے ساتھ...... نہر کے کنارے چلئے یہ کہتے ہی وہ اٹھ بیٹھی، موٹر میں آتے ہی اس نے شوفر سے کہا پہلے مجھ یہاں سے لائے ہو وہاں لے چلو اور جب گاڑی اس کی قیامگاہ پر آکر رکی اس نے کہا جوش صاحب اندر آیئے میں نہر پر اپنی سہیلی کو بھی لے چلونگی۔

گھر پہونچتے ہی اس کی سہیلی آگئی، سرخی دلائی اوڑھے اور اس کا سہرا منھ پر ڈالے ہوئے میں نے اسکی طرف نگاہ اٹھائی تو میں نے ایسا محسوس کیا گویا افق کے گریباں سے آفتاب طلوع ہو رہا ہے اور جب اس نے اپنی گوری ہتھیلیوں پر رکھ کر مجھے پان دیا تو میں نے دیکھا اس کے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی پر مہندی کا ہلکا سا ہلال بنا ہوا ہے اور اس ہلال کے اندر مہندی ہی سے لکھا ہوا ہے "جوش" میں نے اپنے آپکو حد سے زیادہ سنبھالنے کی کوشش کی پھر بھی میرے تمام بدن پر کپکپی سی طاری ہوگئی۔

بس یار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

الغرض کھانے پینے کا سامان لے کر ہم تینوں...... نہر کی طرف روانہ ہوگئے راستے میں مجھے خیال آیا کہ بیوی پریشان ہونگی اور بدگمان بھی میں نے ایک موڑ پر گاڑی رکوادی، اور اپنے ایک دوست سے بیوی کو ٹیلیفون کرادیا کہ آج میرے گھر جلسہ ہو رہا ہے اس لئے جوش صاحب کو میں نے روک لیا ہے وہ کل دوپہر تک گھر پہونچ جائیں گے۔

...... نہر کے کنارے پہنچ کر ہم ریسٹ ہاؤس میں ٹھہر گئے میں نے کہا ہم تھوڑی دیر آرام کر لیں یہ کہہ کر میں لیٹ گیا۔ یہ کہیے ہوئے مجھے آدھا یا پون گھنٹہ ہوا ہوگا کہ۔ ج۔ ب نے آکر میرے پاؤں دبانا شروع کر دیئے اور سہیلی کو حکم دیا کہ وہ بھی میرے پاؤں دبائے سہیلی نے کہا باجی میری ہمت نہیں پڑ رہی ہے۔ لیکن جب اس نے اسے ڈانٹا تو وہ بھی آکر پاؤں دبانے لگی۔

میں نے کہا ارے یہ آپ کیا کر رہی ہیں ہیں برائے خدا ایسا نہ کیجئے میں شرم کے مارے کٹا جا رہا ہوں لیکن وہ نہیں مانتی ما ادر میں دس پندرہ منٹ کے بعد شرم کی تاب نہ لاسکا اور اٹھ کھڑا ہوا، اور منھ ہاتھ دھونے کے لئے غسل خانے چلا گیا میرے غسل خانے میں داخل ہوتے ہی ج۔ ب آگئی اور دروازہ بند کر کے اپنی سہیلی کو بھی وہیں بلالیا۔

مجھ سے ان دونوں کی موجودگی کے باعث اچھی طرح منھ نہیں دھویا گیا اور جب میں سیدھا منھ دھو کر میں تولیہ کی طرف بڑھا تو ج۔ ب نے کہا نہیں تولیہ نہیں میں اپنے دوپٹہ سے آپکا منھ پونچھ دوں گی میں کیا کرتا اس نے اپنے دوپٹہ سے میرا منھ پونچھا پھر اس نے مجھ سے کہا آپ کرسی پر بیٹھ جائیے اور سہیلی کو حکم دیا کہ وہ جگ سے میرے پاؤں دھلا دے اس نے تعمیل کی اور جب میرے پاؤں دھل گئے تو دوپٹہ کے عوض اس کی سہیلی نے اپنی زلفیں کھول کر میرے پاؤں پونچھنا شروع کر دیئے میں اس کی اس وضع سے گھبرا گیا پاؤں کھینچ لئے اور شرم کے مارے پسینے پسینے ہو گیا۔

اب شام ہو گئی ریسٹ ہاؤس کے بوائے کے تھیلے میں گلاس سوڈے اور بوتل رکھوا کر ہم نہر کے ایک ایسے کنارے پر جا کر بیٹھ گئے جدھر کوئی آتا جاتا نہیں ہائے وہ رنگین شام، وہ سامنے وہ گلفام وہ چھلکتا جام وہ آنکھوں آنکھوں میں کلام ـــــــ وہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے وہ آسمان پر ابر کے ہلکے ہلکے ٹکے، وہ لہروں میں ڈوبتے سورج کا سونا، وہ چار مدہ بھری انکھڑیوں میں جادو ٹونا۔

جب میں نے اس حلقہ جمال میں دو پیگ ختم کر کے تیسرا پیگ بنا کر سامنے رکھ لیا، تو ج ب نے مجھ سے پوچھا وہ "جنگل کی شہزادی" سچ مچ تھی یا خیالی تو میں نے کہا میں نے آج تک کوئی خیالی اور ہوائی نظم نہیں کہی ہے۔ اس نے جب آپ اس کو بھول گئے ہمیں بھی بھول جائیں گے میں نے کہا ایسا نہیں ہو گا میرا دل ایک مرقع ہے جس میں اس کی تصویر اب تک لگی ہوئی ہے۔ اس نے کہا آنکھیں بند کر لیجئے اور میرے سر کی قسم جب تک میں نہ کہوں میچے رہیئے۔

جب میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے میری آنکھ کا بوسا لے لیا، مجھ پر ایک ناقابل شرح کیفیت طاری ہو گئی پھر اس نے سہیلی سے کہا آ تو دوسری آنکھ کا بوسہ لے لے اس نے کہا باجی میرا حیاؤ نہیں پڑ رہا ہے۔ میری طرف سے آپ ہی بوسہ لے لیں اس نے جب میری دوسری آنکھ کا بھی بوسہ لے لیا، اور میرا سر ہوا میں اڑنے لگا اس نے کہا اب آنکھیں کھول دیجئے اور مجھے دنیا بدلی ہوئی نظر آنے لگی۔

چوتھا پیگ ختم کر کے میں نے کہا اب اندھیرا ہو گیا ہے آیئے ریسٹ ہاؤس چلیں۔

ناہموار ساحل سے جب موٹر کی طرف چلا، ایک بہت نکیلا پتھر میرے گھٹے میں چبھ گیا اور خون نکلنے لگا۔ ج۔ ب نے اپنا پہو پھاڑ کر سوڈے میں تر کیا اور میرے گھٹے پر باندھ دیا۔

اب ہم آکر موٹر میں بیٹھ گئے میری بائیں طرف ج۔ ب اور داہنی طرف اس کی البیلی سہیلی ع۔ خ بیٹھ گئی۔

موٹر نے ابھی بمشکل آدھا فرلانگ ہی طے کیا ہوگا کہ اس کی سہیلی نے مجھ سے کہا ذرا اپنا گٹا دکھا دیجئے۔ میں نے گٹا اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے اپنی کلائی میرے گٹے پر چسپیہ کر دی۔

ج۔ب نے پوچھا کیا کر رہی ہے اس نے کہا باجی میں نے اپنی کلائی کو دانتوں سے لہولہان کر کے اس کو جوش صاحب کے گٹے پر اس لئے چسپاں کر دیا ہے کہ جوش صاحب کے خون سے میرا خون مل جائے۔

یہ سنتے ہی ج۔ب سہیلی سے بگڑ گئی کہنے لگی ہیں تو یہاں تجھے تفریح کرانے لائی تھی تو تو جوش صاحب سے عشق لڑانے لگی۔

سہیلی نے روہانسی آواز میں کہا باجی آپ انسانی ہمدردی کو عشق لڑانا کہہ رہی ہیں مجھے آپ سے یہ امید نہ تھی اتنا کہہ کر اس نے پلو سے منہ چھپا لیا اور رونے لگی۔

اب ہم ریسٹ ہاؤس پہنچ گئے میں نے دیکھا ج۔ب کی آنکھوں میں رقابت کی سرخی اور "ع۔خ کی انکھڑیوں میں گھٹن کی ملگجاہٹ پائی جاتی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ میں نے یہ بات بھی بھانپ لی کہ ج۔ب کے مزاج میں نپولین کی سی سختی اور ع۔خ کے مزاج میں حضرت مسیح کی نرمی کارفرما ہے۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی اس نے ع۔خ کو حکم دیا کہ تم سامنے والے کمرے میں چلی جاؤ تمہارا کھانا وہیں بھیج دیا جائے گا وہ اداس ہو کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اس کے اس طرح چلے جانے سے میرے دل کو بڑا دھکا لگا لیکن زبان سے کچھ نہیں کہہ سکا۔

وہ ریسٹ ہاؤس کی رات عجیب رات تھی جس میں شیرینی بھی تھی تلخی بھی کیف بھی تھا کرب بھی۔ ج۔ب کی موجودگی کا نوش بھی تھا اور ع۔خ کا غیر موجودگی کا نیش بھی۔

میرے دل کی بات آپ پوچھیں تو میں کہوں کہ ہر چند ج۔ب" کی بھرپور جوانی اور اس کے رخساروں کی گل فشانی بے حد نظر فریب تھی، لیکن ہائے اس کی سہیلی "ع۔خ کا مکھڑا اور اس مکھڑے پر اس کی مسکینی کا جال، میرا دل لوٹ کر اس پر آچکا تھا۔

اب سنیئے اللہ کا کرنا کیا ہوا، اس واقعے کے دو ماہ بعد، جب میں ج۔ب کا تار پاکر مدراس گیا، اور اس کے وہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کے پانچویں دن "ع۔خ" ب بھی اپنے بھائی کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔

اس کو دیکھتے ہی میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ وہ دوڑ کر "ج۔ب" سے لپٹ گئی۔ ج۔ب نے [illegible] نے چہرے کی تلخی میں جھٹ سے نقاب ڈالی کر اس کا ماتھا چوم لیا۔

ع۔ خ نے اس کے یعنی ج۔ ب کے چہرے کی تلخی محسوس کر لی تھی، اس لئے اس کو اپنے ماتھے پر چوم لئے جانے سے کوئی خوشی نہیں ہوئی، اور اس کی جھکی پلکوں کی چھاؤں میں مومن کا یہ شعر پیٹتا نظر آیا۔

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی، سر کے بل گیا

ج۔ ب نے ہم دونوں کی طرف بار بار نظر اٹھائی اور بڑی تلخی کے ساتھ میرے کان میں کہا آگ دونوں طرف لگی ہے اور میں بیچ میں کھڑی جل رہی ہوں۔

اس کو دوسرے کمرے میں لے جا کر کہا تمہارا یہ خیال غلط ہے مجھکو محبت تم سے ہے اور ترس اس پہ آتا ہے کہ اس بیچاری کی صحت روز بروز گرتی چلی جا رہی ہے۔

ج۔ ب نے کہا اچھا کہو تم میرے ہو یا اسکے؟ میں نے قسم کھا کر کہا تمہارا اور صرف تمہارا ہوں اس نے کہا عورت کی سے زیادہ کوئی محبت کی نظر کو پہچان نہیں سکتا تمہاری نظریں بتلا رہی ہیں کہ تم اس ہڈیوں کے مارے پر دل جان سے فدا ہو چکے ہو۔

بات تو اس نے سچی کہی تھی لیکن میں نے دھاندلی اور بے ایمانی سے کام لے کر اس سے کہا تم دھوکا کھا رہی ہو کہہ چکا ہوں کہ اس کی صحت کی خرابی پر مجھکو بڑا ترس آتا ہے تم ترس کھانے والی نظر کو محبت کی نظر سمجھ بیٹھی ہو۔ یہ تمہاری بڑی نادانی ہے ارے کہاں تم کہاں وہ۔

چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک

اس کے چہرے پر بحالی آ گئی اور یہ اطمینان ہو جانے کے بعد کہ میں صرف اسی کو چاہتا ہوں اس نے ع۔ خ کو جو باہر بیٹھی ہوئی تھی، بڑے پیار سے آواز دی کہ یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو یہاں چلی آؤ، وہ کبک دری کی طرح قدم اٹھاتی خوش خوش آئی اور میرے سامنے کے صوفے پر بیٹھ گئی میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ "ع۔ خ" کی جانب نگاہ نہیں اٹھاؤں گا۔ اس لئے کہ ایسا کیا تو پکڑا جاؤں گا۔ میں سختی سے آنکھیں جھکا کر بیٹھ گیا ——— لیکن اسے کیا کرتا میرے چہرے پر پھر پھراہٹ ہونے لگی اور وہ الف ہو گیا اتنے میں ج ب کوئی چیز لانے کے لئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے بے حد عجلت کے ساتھ ع۔ خ کی طرف نگاہ اٹھائی اس نے میری جانب دیکھا نظروں میں دو دو باتیں ہو گئیں اور اس نے اپنے سینے پر گھونسہ مار لیا۔

راہ معاف کیجئے یہ ایک بڑی ان مل بے جوڑ بات لکھ رہا ہوں، یعنی آج ۲۳ نومبر ۱۹۶۷ء کو پونے تین بجے سہ پہر کے وقت جب کہ میں اس منظر کو تمام کر کے آگے بڑھنے والا تھا میری وفادار بیوی

"ح۔ب" نے پٹ کی آڑ سے یہ ماجرا دیکھ لیا وہ کمرے میں آ گئی "ع۔ خ" سے کہا کہ آؤ میں تمہارا کمرہ تمہیں دکھا دوں، اور وہ دونوں دوسرے کمرے میں چلی گئیں اور میرا دل دھڑکنے لگا کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔

ع۔خ کو اس کے کمرے میں بٹھا کر وہ میرے پاس آ گئی، اسکا منھ پھولا اور چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ میرے پہلو میں بیٹھ کر اس نے کہا، کیوں صاحب یہ نظروں کا ملاؤ اور چھاتی کا کٹاؤ کیسا تھا۔

میں نے کہا تمہارے جاتے ہی دروازہ کھٹ سے بولا، میری نظر اٹھ گئی، اتنے میں تمہاری سہیلی کو کھانسی آ گئی، فوراً کرب سے اس نے اپنے سینے پر گھونسہ مار لیا یہ دونوں عمل فطری تھے اس میں بدگمانی کی کیا بات ہے۔

اس نے بگڑ کر کہا میں ان باتوں میں نہیں آنے کی، کان کھول کر سن لیجئے صاحب میں دیکھ کر بھی ہاتھ سے نکلنے نہیں دونگی، اب مجھے آپ اور اس پر سختی کرنا ہوگی۔ میں نے کہا تم شوق سے سختی کرو سرِ تسلیم خم ہے لیکن وہ سختی ایک بدگمان دل کی بیجا سختی ہوگی۔

اتنے میں ایک نوعمر بے حد گھبرایا ہوا آیا اس نے ح۔ب سے کہا خالہ جان سلام میری ماں نے

بقیہ صفحہ ۱۳ کا ... سختی کا سایہ ہاتھ میں لے آئیں اور کہا جلدی سے گئی کمرے کے اندر پی لو اور نگہے ہاتھوں وہ سنگھاڑے اور بتاشے بھی کھا لو جو میں نے تمہارے واسطے منگائے ہیں اور کھا پی کر تھوڑی دیر کے واسطے آرام کر لو۔ صبح نو بجے سے لگاتار لکھ رہے ہو اب تین بجے کا عمل ہے بس لکھنا بند کر دو۔

میں نے دل میں سوچا کہ اگر ان کو پتہ چل جائے کہ میں اپنے حالات عشق لکھ رہا ہوں تو پیالہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ جائے اور مجھ پر برس پڑیں کہ آج بھی میرے دل میں جوانی کی یادیں مچلتی رہتی ہیں۔

پھر میں نے سوچا کہ ہر چند میں ان کی سرکار جمال کا نمک حرام ہوں، پھر بھی ان کی محبت میں کمی نہیں آئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی میرے دل میں نہیں آیا کہ جو زریں پروں کا چڑیا میرے جوانی کی موتی چگنے کے لئے مجھ پر ٹوٹ پڑی تھیں میری جوانی کے ختم ہوتے ہی وہ پھر امار کر اڑ چکی ہیں اور ہزاروں دل شکنیوں کے باوجود میری بیوی آج تک میری محبت کا دم بھر رہی ہیں۔

اللہ کرے میری محراب پیری کی یہ شمع تاباں، کم سے کم اس وقت تک روشن رہے جبتک کہ میرا چراغ حیات گل نہ ہو جائے۔

عشق و محبت میں بنیادی فرق ہے کہ عشق کا نشہ جوانی کے بعد اتر جاتا ہے اور محبت کا نشہ جوانی کے بعد اور بھی چڑھ جاتا ہے اور ہر آن تیز سے تیز تر ہوتا چلا جاتا ہے

دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔ جلدی میرے ساتھ چلئے ج۔ب بدحواس ہو گئی مجھ سے کہا میری بڑی بہن
کے دل پر دورہ پڑا ہے میں انکی تیمارداری کے واسطے جا رہی ہوں اللہ خیر کرے رات گئے آ جاؤں گی
لیکن نہ آ ئی تو آپ پریشان نہ ہونا تعجب ہوگا یہ کہتے ہی وہ دیوانہ وار اٹھی اور تیزی کے
ساتھ زینہ طے کر کے مکان سے چلی گئی، اور میں زینہ کا دروازہ بند کر کے، اپنے
کمرے میں آ گیا۔

میں سر جھکائے بیٹھا تھا دبے پاؤں ع۔خ آ گئی پوچھا باجی کہاں گئی ہیں
میں نے سارا ماجرا بیان کر دیا اور اس کے پہلو میں جا کر بیٹھ گیا۔
اس نے ڈبڈبائی آنکھیں میری طرف اٹھائیں اور کہا میں یہاں ناحق آئی
باجی نے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ سے پردہ شروع کر دوں۔ اور پھوٹ پھوٹ
کر رونے لگی میں نے اس کو سینے سے لگا لیا، اور کہا تم انکی سختی کی پرواہ نہ
کرو، وہ میرے دل پر حکومت نہیں کر سکتیں، ان کی مجال نہیں کہ تمھاری محبت کو
میرے سینے سے نکال دیں اس نے پوچھا آپ میرے ہیں میں نے اس کا ہاتھ چوم کر
کہا، تمھارا نہیں تو اور کس کا ہو سکتا ہوں اس کے لبوں پر تبسم آ گیا اور میں
نے اس کو آغوش میں لے لیا۔

صبح ہوتے ہی ج۔ب آ گئی۔ اس کے چہرے پر شب بیداری کے آثار تھے میں
نے پوچھا خیریت تو ہے۔ اس نے کہا خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ کہ میری بہن کی
جان بچ گئی لیکن یہ تمھارا چہرہ کیسا ہو رہا ہے۔ کیا رات بھر جاگتے رہے ہو میں
نے کہا تمھاری مفارقت نے سونے نہیں دیا، ہچکیاں لے لے کر رات گزاری ہے
اور پھر اس خیال سے بھی پریشان رہا۔ کہ تمھاری بہن پر دل کا دورہ پڑا ہے،
دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اس نے پوچھا ع۔خ تو اس طرف نہیں آئی تھی، میں
نے کہا تمھارے جاتے ہی میں نے اپنا کمرہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ کوئی نو بجے
تمھارا ملازم کھانا لے کر آیا تھا۔ بس اتنی دیر کے لئے دروازہ کھولا۔ کھانا کھایا
نہیں گیا۔ تمھاری جدائی میں در و دیوار سے رونے کی صدائیں آ رہی تھیں، دو چار
الٹے سیدھے لقمے نگل کر نوکر کو رخصت کر دیا اور بستر پر لیٹ کر کروٹیں لینے لگا
اللہ نے صبح ہوتے ہی تمھاری چاند سی صورت دکھائی تو جان میں جان آ گئی۔
میری اس مکمل ایکٹنگ کا اس پر بڑا اثر پڑا اس نے مجھے بڑھ کر سینے سے لگا لیا
اور کہا آؤ ہم دونوں رات بھر کے جاگے ہوئے دو گھڑی لیٹ کے سو جائیں۔

ہم دونوں کوئی دس بجے سو کر اٹھے، نہائے دھوئے، ناشتہ کیا، اور نو کر سے اس نے کہا۔ ع۔خ کے کمرے میں ناشتہ پہنچا دو۔

ان مراحل کے بعد اس نے کہا آج سر شام سمندر کے ساحل پر چلیں گے اور شام ہونے ہی جب ہم روانہ ہونے لگے۔ ع۔خ کالا برقع اوڑھے آئی اور کہا باجی ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے باجی یہ سن کر چند سکنڈ خاموش ہو گئیں اور پھر، کہا، اچھا تم بھی چلی چلو۔

ج۔ب نے مجھ کو موٹر کے دروازے کے پاس بٹھایا بیچ میں خود بیٹھی اور ع۔خ کو اپنے پہلو میں بٹھایا، اور ٹیکسی روانہ ہو گئی ساحل کی طرف۔

ع۔خ نے "ج۔ب" کی آنکھ بچا کر اور اپنے ہاتھ کو اُن کے پیچھے دراز کر کے میرے ہاتھ میں ایک پرچہ دے دیا، جس کو میں نے جلدی سے شیروانی کی جیب میں رکھ لیا۔

ج۔ب سنک گئی اس نے موٹر رکوا دی، مجھ سے کہا فٹ پاتھ پر آیئے اور وہاں پہنچ کر اس نے کہا اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ مرد مرغوں کی طرح کئی کئی مرغیوں پر حکومت کریں آپ صاف صاف بتا دیں آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں یا ع۔خ سے میں نے کہا اللہ مری بدگمانی پہلے بھی کہہ چکا ہوں میں تم سے محبت کرتا ہوں اس نے قلم یا کاغذ لے کر مجھ سے کہا یہ بات اس کاغذ پر لکھ دیجئے، میں نے بادل نخواستہ وہ بات لکھ دی اس نے کہا یہ پرچہ اپنے ہاتھ سے ع۔خ کو دے دیجئے، میرا ہاتھ کانپنے لگا اس نے پرچہ میرے ہاتھ سے چھین کر ع۔خ کو دے دیا اس نے پرچہ پڑھا اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

اب ہم ساحل پر آ گئے لہریں بجلی کی روشنی میں جگمگ چمک رہی تھیں مان سون کا زمانہ تھا سمندر اچھل اچھل کر ہونک رہا تھا اور اس کے سیاہ بخارات بھوتوں کی صورت میں پرواز کر رہے تھے۔

ع۔خ عین سمندر کے کنارے جا کر کھڑی ہو گئی اس کے اس طرح ہٹ کر کھڑے ہو جانے سے میرے دل پر بڑی چوٹ لگی، مگر منہ سے اف نہیں کی۔

اتنے میں پاور ہاؤس کی کسی خرابی پر روشنیاں گل ہو گئیں، ج۔ب نے مجھ سے کہا منظر بھیانک ہو چکا ہے، آیئے گھر چلیں یہ کہتے ہی اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں طے کرنا شروع کیں۔ میں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا ع۔خ کہیں نظر نہ آئی ــــ میں نے اس سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا، اور دیوانہ وار اس کا ہاتھ لے کر پکارنے لگا اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا اتنے میں بجلی چمکی مجھ بدبخت نے یہ دیکھا کہ وہ سمندر کی بپھری

موجوں میں ہچکولے کھا رہی ہے۔

ہر چند مجھے پیرنا نہیں آتا اور گہرے ٹب میں بھی ڈوب سکتا ہوں لیکن میں نے پرواہ نہیں کی اور جھم سے سمندر میں کود پڑا۔

سمندر کی موجیں ساحل کی طرف آ آکر مجھے میری طرف ڈھکیل رہی تھیں میرا ایک ہاتھ ساحل کے چبوترے پر ٹکا ہوا اور دوسرا ہاتھ اسے پکڑنے کے واسطے بڑھا ہوا تھا کہ اتنے میں کسی اللہ کے بندہ نے مجھ سے کہا یہ چھتری لیجئے اور اس کی موٹھ اس کے برقعہ میں پھنسا کر اسے کھینچ لیجئے۔

اتنے میں سمندر کی موجیں زیادہ تیزی کی ساتھ میری طرف آنے لگیں میں نے حواس درست رکھتے ہوئے چھتری کے ہینڈل کو اس کے برقعہ میں پھنسا کر اسے اپنی طرف کھینچنا شروع کیا اور دل میں ارادہ کیا کہ اگر اسے اوپر نہ لا سکا تو چبوترے پر سے ہاتھ ہٹا کر خود کو بھی سمندر کے حوالے لیکن قسمت نے میری مدد کی اس نے اس کے برقعہ سے الجھے ہینڈل کو زور سے کھینچنا شروع کیا۔ اور جب وہ قریب آگئی تو میں نے اس کی کلائی پکڑ لی اور اسے ساحل کی سیڑھیوں کی طرف کھینچنے لگا، اس نے چیخ مار کر کہا مجھ کو اب زندگی کی طرف واپس نہ لے جاؤ یہ کہہ کر وہ بے ہوش ہو گئی اور میں اس کو کھینچ کر ساحل کی طرف لے آیا اور چبوترے پر لٹا دیا ہزاروں تماشائیوں نے مجھ کو حلقے میں لے لیا۔ ج۔ ب نے کہا اب کیا کرو گے میں نے کہا اسپتال لے جاؤں گا۔

میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ دوڑ کر ٹیکسی لے آیا لوگوں نے میری مدد کی اور پھر اسے ٹیکسی میں ڈال کر ایک یوروپین اسپتال میں لے گیا اور ایک ادھیڑ انگریز نرس کی سرکردگی میں تین چار ہندوستانی نرسیں اس کی تیمارداری میں سرگرم ہو گئیں۔ ج۔ ب اس کی پٹی کے پاس کھڑی ہو گئی اور میں پاگلوں کی طرح برآمدے میں ٹہلنے لگا اور اسپتال کا عملہ مجھکو غور سے دیکھنے لگا ــــ ایک جوان یوروپین نرس نے مجھ سے کہا آپ گھبرائیے نہیں وہ جلد ہوش میں آجائے گی آپ اس کرسی پر بیٹھ جائیں کرسی پر بیٹھتے ہی مجھکو چکر پہ چکر آنا شروع ہو گئے، وہ جوان نرس دوڑتی ہوئی کمرے میں گئی اور دوا کا ایک گلاس دے کر کہا اسے فوراً پی لیجئے میں نے دوا پی لی۔ سر کا چکر تھوڑی دیر میں کم ہو گیا۔

کوئی سوا گھنٹے کے بعد جب اسے ہوش آیا تو اس کی نحیف آواز سنائی دی جوش، جوش، جوش، میں دیوانہ وار اس کی طرح دوڑ پڑا اور اس نے مجھے دیکھ کر آنکھیں

بند کر لیں اور آنکھوں کے کونوں سے آنسو ابلنے لگے۔

ادھیڑ نرس نے اشارے سے کہا کہ میں اس کے ساتھ برآمدے میں چلا جاؤں برآمدے میں پہونچ کر اس نے انگریزی میں پوچھا آپکا نام۔ میں نے کہا جوش، اس نے کہا یہ جوان عورت جو کمرے میں کھڑی ہوئی ہے، یہ اس مریضہ کی کون ہے میں نے کہا بڑی پرانی سہیلی اس نے پوچھا آپ مریضہ کے قرابت دار ہیں؟ میں نے کہا "نہیں میں" پھر اسنے سوال کیا آپ مریضہ کو کب سے جانتے ہیں میں نے کہا دو تین مہینہ سے میں تو اس کمرے میں کھڑی ہوئی خاتون کا ملنے والا ہوں۔

پھر اس نے سوال کیا اس پرانی سہیلی پر تو کوئی اثر نہیں تھا، آپ تو مریضہ کو فقط دو ماہ سے جانتے ہیں، آپ اس قدر بے تاب کیوں تھے، میں نے جواب دیا کہ میں شاعر ہوں شاعروں کے دل نرم ہوا کرتے ہیں، پھر اس نے دریافت کیا مریضہ نے ہوش میں آتے ہی اپنی پرانی سہیلی کے بدلے، آپ ایک نئے آدمی کو پکارا میں نے جواب دیا اسے ایک عظیم سانحے کے باعث اس کے حواس میں پراگندگی آ گئی ہے۔

نرس نے میرے چہرے کو بغور دیکھا، اندر چلی گئی، اور فون کرنے لگی، میرا ماتھا ٹھنک گیا ہو نہ ہو پولیس کو بلا رہی ہے۔ اور اس کو شبہ ہو گیا ہے کہ یہ عاشقانہ خود کشی کا واقعہ ہے۔

اس وقت مجھے وہ پرچہ یاد آگیا جو "ع۔خ" نے مجھے موڑ میں دیا تھا اس لئے اسے دیکھنے کے لئے میں غسل خانے چلا گیا پرچہ نکالا وہ بھیگ کر خراب ہو چکا تھا۔ صرف پہلی سطر پڑھ سکا جس میں اس نے یہ لکھا تھا کہ میری زندگی باجی اور آپ کی بیوی کے واسطے عذاب بن گئی ہے۔ اس لئے۔۔۔۔۔۔اس کے آگے پڑھا نہیں گیا میں نے پرچہ پھاڑ کر نالی میں بہا دیا اور سیدھا ع۔خ کے پاس جا کر کہا پولیس اگر بیان لینے آئے، تو میرے سر کی قسم تم یہ کہنا کہ میرا پاؤں پھسل گیا تھا۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہ کہنا۔

اتنے میں پولیس آگئی اور ایک سارجنٹ نے اس سے پوچھا آپ سمندر میں کیسے گر گئی تھیں۔ اس نے کہا پاؤں پھسل گیا تھا۔ سارجنٹ نے دریافت کیا آپکو کسی نے دھکا دے دیا تھا اس نے کہا نہیں، اس نے سوال کیا کیا آپ کے دل کو کسی نے دھکا دے دیا تھا۔ اس نے زبان سے تو کہا نہیں لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ تو خیریت یہ ہوئی کہ سارجنٹ اس کے سرہانے ڈیسک پر کہنیاں ٹیکے، اس کا بیان لے رہا تھا وہ اس کے آنسو دیکھ نہیں سکا ورنہ بڑی آفت آ جاتی۔

جیسے سارجنٹ بیان لے کر چلا گیا تو میرے پیٹ میں سانس آئی نرس نے مجھ سے کہا چونکہ
یہ خاتون بے حد نازک اور کمزور ہے، ایک رات بھر اس کو اسپتال میں رکھونگا اور اس کی
حالت قابل اطمنان ہوئی تو کل دوپہر کو چھٹی دے دونگی ـــــ اور آپ جائیں صبح خبر
لینے آئیں۔

ج۔ ب نے کہا جوش صاحب آپ گھر چلیں... میں اس کے ساتھ دروازے تک گیا
اور اس سے کہا تم جاؤ میں رات یہیں بسر کرونگا اس نے کہا رہئے گا کہاں میں نے کہا اسی
لان پر اس نے کہا سردی میں اکڑ جائے گا..... اور مینھ برسنے لگے گا اور میں نے جواب
دیا برآمدے میں چلا جاؤنگا یہ سن کر اس نے بڑے طنز سے کہا اوفوہ، آپ تو بڑے جانباز
عاشق نکلے میں نے سر جھکا لیا اور وہ سخت بدمزہ ہو کر چلی گئی۔

اب میں غم خوردہ لان پر جا کر بیٹھ گیا اور پان کی ڈبیا نکالنے کے لئے جیب میں
ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا جیب کٹ چکی ہے اور روپیہ کا بٹوا غائب ہے۔ دھک سے
ہو کر رہ گیا خیال آیا کہ اب کیا ہوگا صبح کو اسپتال کا بل کیونکر ادا کر سکونگا۔ سوچا
ج۔ ب سے جا کر روپیہ لے آؤں غیرت نے گوارہ نہ کیا اور پھر یہ بھی سوچا کہ وہ یہاں
سے آٹھ دس میل دور رہتی ہے ٹیکسی کا کرایہ کہاں سے لاؤنگا اس سے کرایہ بھی دلواؤں
قرض بھی مانگوں یہ میرے بس کا روگ نہیں۔

حسن اتفاق ہے وہ نوجوان لیڈی ڈاکٹر جس نے مجھے برآمدے کی کرسی پر بٹھا کر
دوا پلائی تھی، برآمدے سے گزر کر جب کسی کمرے کی طرف مڑنے لگی تو مجھ پر اس کی نظر
پڑ گئی اس نے ادھر ادھر دیکھا اور دبے پاؤں میرے پاس آکر پوچھا کیا آپ تمام رات اس
لان پر گزار دیں گے میں نے کہا جی ہاں اس نے کہا آپکو بڑی تکلیف ہوگی میں نے جواب دیا
کہ میں جھیل لونگا اس نے کہا یہ نہیں ہو سکتا آپ میرے کمرے میں چل کر آرام کریں ـــ میں
ساتھ ہو لیا ــــ اپنی خوابگاہ میں پہونچ کر اس نے جلدی جلدی تمام کھڑکیوں کے
پردے گرا دیئے دروازہ بند کر لیا بڑی مہربانی کے ساتھ مجھے صوفے پر بٹھا دیا الماری کھولی
برانڈی اور بیئر کی بوتل نکالی سامنے کی میز سے دو گلاس اور سوڈے کی بوتلیں اٹھا
لائی برانڈی میرے سامنے رکھ دی اور خود بیئر پینے لگی۔

جب ہم دونوں پی چکے۔ تو وہ تلے انڈے اور توس لے آئی اور ایک گدے لگی
بید کی بینچ پر تکیہ لگا کر مجھے لٹا دیا کمرے کی لائٹ گل کر دی غسل خانے کا دھیما بلب
جلا دیا، اور مسہری پر جا کر لیٹ گئی۔

میں نے لاکھ لاکھ چاہا کہ سو جاؤں مگر نیند نہیں آئی کروٹوں پر کروٹیں بدلنے لگا اور دیکھا کہ وہ لیڈی ڈاکٹر بھی کروٹوں پر کروٹیں بدل رہی ہے۔

ابھی میں اسی کرب کے عالم میں تھا کہ وہ بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی مسہری سے اٹھی آہستہ آہستہ میری طرف آئی اور جھک کر میرا منہ دیکھنے لگی اور جب میں نے اسکی طرف آنکھیں اٹھائی اس نے بڑی دھیمی آواز میں پوچھا کیا نیند آ رہی ہے میں نے شیخ پر بیٹھے ہوئے کہا بالکل نہیں اس نے میری کلائی پکڑ کر کہا چلئے میرے بستر پر، وہاں نیند آجائے گی میں اٹھا اور اس کی مسہری پر جا کر لیٹ گیا اور اس نے اپنا ہاتھ تکئے کے طور پر میرے سر کے نیچے رکھ دیا اور میری نیند اور بھی اچاٹ ہو گئی۔

صبح جاگتے ہی ہم دونوں نے تبسم کا تبادلہ کیا تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا بل بتا دیجئے تاکہ میں اپنی قیام گاہ پر جا کر روپیہ لے آؤں اس نے آنکھیں جھکا کر کہا بل میں ادا کر دونگی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ آپ میرے پاس آتے جاتے رہیں گے۔ میں نے اسکا شکریہ ادا کیا وہ مجھ سے بغل گیر ہو گئی اور تھوڑی دیر کے بعد اسکا دوبارہ شکریہ ادا کیا اور ہفتے کی شام کو ملنے کا وعدہ کر کے میں اسپتال سے باہر آگیا اور گیٹ پر کھڑے ہو کر سوچنے لگا کہ بل تو وہ خیر ادا کر دے گی لیکن نرسوں وغیرہ کو انعام کہاں سے دونگا اور ع۔رخ کو ٹیکسی پر لے جاؤنگا تو کیا جیب سے کرایہ دلاؤنگا اور فرض کیجئے کہ یہ بھی ہو گیا تو میں اس عالم افلاس میں یہاں رہونگا کیونکر پھر خیال آیا کہ تار دے کر گھر سے روپیہ منگا لوں لیکن سوال یہ ہے کہ تار کیسے دوں۔

میرا سر چکرانے لگا اور کبیر کا یہ دوہا یاد آگیا ایک دن آنٔ پھنسوگے پیارے جیسے بن کا ہرنا۔

اسی ادھیڑ بن میں جب گھنٹہ سوا گھنٹہ گزر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ریاست دتیا کے دیوان قاضی سر عزیز الدین صاحب موٹر سے گزر رہے ہیں جیسے ہی ہماری آنکھیں چار ہوئیں قاضی صاحب نے موٹر رکوالی دوڑ کر میرے گلے مل گئے اور کہا آپ دولت غیر مترقبہ اور مدرس میں آپ کب آ گئے اور یہاں اس طرح اداس کیوں کھڑے ہوئے ہیں۔

میں نے کہا اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ اس نے آپکو اس وقت میرے پاس بھیج دیا اگر آپ کے سے بے تکلف دوست کے بدلے کوئی اور آتا تو میں اسے اپنا عالم کیونکر بیان کر سکتا تھا

قاضی صاحب نے گھبرا کر کہا جلدی کہئے بات کیا ہے میں نے کہا جیب کٹ گئی ہے اور پورے تین ہزار غائب ہو چکے ہیں۔ قاضی صاحب نے کہا کوئی اپنی پوری پونجی بٹوے میں

رکھ کر باہر نکلتا ہے۔ آپکے میرے ساتھ وہ مجھے اپنی قیام گاہ پر لے گئے اور پانچ ہزار کے نوٹ ایک پرس میں بھر کر میرے حوالے کر دیئے میں نے ان کا شکریہ ادا کر کے کہا میں گھر جا کر یہ رقم واپس کر دونگا۔ انھوں نے کہا (میرا گریبان پکڑ کر) مجھ سے اور اس قدر غیریت کی باتیں۔ اب ناشتہ کر کے جائیے گا اور کل رات کا کھانا میرے ساتھ کھائیے گا

میں غسل اور ناشتہ کر کے جانے لگا انھوں نے کہا آپ میری گاڑی پر جائیں تاکہ میرا شوفر آپکا گھر دیکھ لے اور کل آپکو یہاں لے کر آجائے۔

میں انکی موٹر پر اسپتال پہونچا ع۔ خ کو بحال پایا، دل کی کلیاں کھل گئیں اس نے پوچھا باجی ساتھ نہیں آئیں میں نے کہا وہ تو رات ہی کو چلی گئی تھیں اس نے پوچھا آپ کہاں رہے۔ میں نے کہا اسپتال میں اس کی آنکھوں میں کامیابی اور تشکر کے آنسو آگئے۔

جب اسے لے کر ج۔ ب کے وہاں پہونچا تو اس نے چھوٹتے ہی کہا کہ اگر تم ڈوب جاتیں تو ہم لوگ پولیس میں کھنچے کھنچے پھرتے میں نے سوچا الٰہ اکبر رقابت بھی بڑی بد بلا ہوتی ہے۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ اگر تم خدا نخواستہ ڈوب جاتیں تو میرا دل شق ہو جاتا یعنی اسکے نہ ڈوبنے کی اس کو اس لیئے خوشی ہوئی کہ وہ پولیس میں کھنچے کھنچے پھرنے کے عذاب سے بچ گئی۔

اللہ رقابت کی ڈاہ سے بچائے

وہ دونوں سہیلیاں ابھی تک خدا کے فضل و کرم سے بقید حیات ہیں، ایک کلکتہ میں رہتی ہے ایک مدارا س میں۔

میں جب ہندوستان جاتا ہوں تو فرض کر کے ان دونوں سے ملتا ہوں اور جب ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں تو ہماری نظر سیکڑوں افسانے کہنے لگتی ہے تمام مناظر اور تمام واقعات ہمارے سامنے گردش کرنے لگتے ہیں۔ اور ہمارے مابین کے تمام رنگین مکالمے گونجنے لگتے ہیں ہمارے کانوں میں۔

ابھی ڈھائی برس کی بات ہے کہ میں ہندوستان گیا اور ع۔ خ کو تار دے کر دہلی بلا بھیجا۔

مدت کے بعد جب ہماری آنکھیں چار ہوئیں فریقین ڈوب گئے ماضی کے سمندر میں اور ایک دوسرے سے بات نہ کر سکے۔

اس ملاقات سے متاثر ہو کر میں نے اسی زمانے میں جو چند رباعیاں کہی تھیں آپ بھی انھیں سُن لیں۔

مدھم مدھم ہے ضو فشانی اس کی
سونی سونی ہے راج دھانی اس کی
طالع ہو میرے دل کے افق پر اے موت
مائل بغروب ہے، جوانی اس کی

پہلے تو ہوا غروب میرا چہرہ
پھر یار قمر جبیں کا اترا چہرہ
شاید میرے چہرہ کو منانے کے لئے
اس شوخ نے بھیجا ہے خود اپنا چہرہ

اک گونج سی تن بدن میں لہراتی ہے
اک تان سی زندگی پہ بل کھاتی ہے
پازیب اتارے انھیں جگ بیت چکا
جھنکار ہے لیکن کہ نہیں جاتی ہے

ك وہ رباعیاں مندرجہ ذیل تمہید کے ساتھ میرے ایک مجموعہ میں شائع ہو چکی ہیں، حسن و عشق کا باہمی ارتباط شباب کے مہکتے خیاباں سے ہوتا ہوا جب شیب کے دہکتے ریگستان میں قدم رکھتا ہے اور تسلسل عشق و درازی عمر کے گرم و سرد بھگو دیا جب آگے بڑھ کر ایک ہو جاتے ہیں تو تھکی ہوئی زندگی کے سامنے ایک ایسا رندھا رندھا سا حل آجاتا ہے کہ اس کی بے پناہ اداسیوں پر نگاہ کر کے اگر روتے روتے آنکھیں پھوٹ جائیں اور دھڑکتے دل رک جائیں تو یہ ایک ایسا متوقع احادثہ ہوگا کہ کبھی دیکھنے والے کو اس پر تعجب کرنے کی جرأت نہیں ہو سکے گی کون اس عبرت ناک صورت حال کا اندازہ کر سکتا ہے کہ نامراد ماہ و سال کا وزن جب گردن کو سنگ کر دیتا ہے تو اس وقت ماضی کی طرف مڑ کر دیکھتے ہیے گردن کے اعصاب اور دل کی رگوں پر کیا قیامت ٹوٹ پڑتی ہے جس پر کبھی بیتا پڑی نہ ہو وہ کیونکر سمجھ سکتا ہے کہ جب چاہنے والے کا چہرہ اور محبوبہ کا مکھڑا ابھر جاتا ہے اور الٹی اتاہ یہ کسی کے عالم میں فریقین کی تو گر جہاں آنکھیں جب ایک دوسرے کا اترا ہوا منھ دیکھتی ہیں تو وہ [illegible] اس قدر جانکاہ کا ہوتا ہے کہ دھرتی، زمین آسمان ہی نہیں

انجام کے ہر آغاز کو دیکھا میں نے
ماضی کے ہر انداز کو دیکھا میں نے
کل نام ترا لیا تو بوٹے گل سے
نادیر اس آواز کو دیکھا میں نے

بے مانگی نیاز، وہ افلاس گداز
ناداری عشوہ، وہ تہی دستئ ناز
کوتاہ نگاہوں کو بتاؤں کیوں کر
کیا حادثہ عظیم ہے عمر دراز

آنسو آنکھوں میں کس لیے ہیں اے جان
جھوٹا ہے یہ آئینہ مری بات کو مان
میری آنکھوں میں دیکھ اپنا مکھڑا
تو کیوں ہے اداس اداس تیرے قربان

پانی کی جھڑی ملہار گاتی تھی کبھی،
بدلی ہر آن گھڑ گھڑاتی تھی کبھی،
میری نگری سے اے گزرنے والے
برکھا اس دیس میں آتی تھی کبھی،

چہرے ہیں اداس اداس گم سم طرفین
اچھا ہے کہ اندھی ہی رہے بیت کی رین

خود سنگ دل موت کراہتے پر مجبور ہو جاتی ہے جوانی کے تلخ و شیریں عشق پر تو ہزاروں دیوان موجود ہیں لیکن وقت گزیدہ عشق و حسن پر غالباً اب تک کسی شاعر نے قلم نہیں اٹھایا ہے۔ شاید میں پہل کر رہا ہوں لیکن اس شرمندگی کے ساتھ کہ جو میرے دل پر بیت چکی اور بیت رہی ہے اس کا کروڑواں حصہ سپرد قلم نہیں کر سکا ہوں۔

لہجوں ہی سے ہم دیکھیں گے اک دوسرے کو
آئے نہ چراغ اب ہمارے مابین

کاش اہلِ چمن باغباں کو سمجھائیں
جھونکوں کو یہ حکم دے کر دھومیں نہ مچائیں
تا صبح کو غنچوں کے چٹکنے کی صدا
مرجھائے ہوئے پھول نہ سننے پائیں

تیری زلفوں میں ہے کہانی میری
تیری پلکوں میں پر فشانی میری
یہ جو تیری آنکھوں میں ہیں غلطاں ڈورے
گزری تھی انہیں سے کل جوانی میری



[illegible]

مصنف کی تحریر کا عکس